فاعتبروا یا اولی الابصار
القرآنی
آپ بیتی
سوانح
برکۃ العصر، شیخ الحدیث، قطب العالم
حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی
ثم المہاجر المدنی قدس سرہ
۲
ناشر مکتبہ عمر فاروق
4/501
شاہ فیصل
کالونی
کراچی

فاعتبروا یا اولی الابصار القرآن

نمبر ۶ تا ۷

سوانح

برکۃ العصر، شیخ الحدیث، قطب العالم

حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی

ثم المہاجر المدنی قدس سرہ

نام کتاب .... آپ بیتی جلد دوم
مؤلف .... حضرت مولانا محمد زکریا الکاندھلوی قدس سرہٗ
اشاعت دوم .... جدید تصحیح شدہ ایڈیشن
ضخامت 544
قیمت ....
ناشر .... فیاض احمد 021-4594144-8352169
موبائل 0334-3432345
مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی نمبر ۴، کراچی نمبر ۲۵

قارئین کی خدمت میں

کتاب ہٰذا کی تیاری میں تصحیحِ کتابت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، تاہم اگر پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو التماس ہے کہ ضرور مطلع فرمائیں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں ان اغلاط کا تدارک کیا جا سکے۔

۔جزاء کم اللّٰہ تعالیٰ جزاءً جمیلاً جزیلاً۔

''آپ بیتی نمبر۶''

فصل نمبر ۳

فصل نمبر ۴

فصل نمبر ۵

فصل نمبر ۶

فصل نمبر ۷

فصل نمبر ۸

فصل نمبر ٩

فصل نمبر ۱۴

فصل نمبر ۱۷

......☆☆☆☆☆☆......

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡم ط

اس ناکارہ کا ارادہ آپ بیتی نمبر ۵ کے بعد اس سلسلہ کو ختم کر دینے کا تھا، لیکن میرے بہت سے احباب کے خطوط کثرت سے اس مضمون کے آئے کہ ان رسائل سے بڑا نفع پہنچا اور تربیت کے لیے یہ مضامین بڑے مفید ثابت اس کے پیش نظر ناکارہ کا خیال ہوا کہ اپنے اکابر کے طرز تعلیم و تربیت اور ان کے زہد و ورع و اخلاص اور علمی انہماک کے واقعات جو اپنے بزرگوں سے سنے یا دیکھے، مختصراً لکھ دیئے جائیں کہ ان کا پڑھنا، پڑھانا یقیناً موجب برکت ہے، اس لیے اس رسالہ کو سترہ (۱۷) فصلوں پر تقسیم کر دیا گیا۔ حق تعالیٰ ان مضامین کو سب دوستوں کے لیے نافع اور موجب برکت بنائے۔ آمین

محمد زکریا کاندھلوی

آپ بیتی نمبر۶

بسم اللّٰہ الرَّحمٰن الرَّحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہٖ الکریم

امابعد! یہ آپ بیتی کچھ اس بُری طرح ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی کہ کئی دفعہ اس کو ختم کر چکا ہوں لیکن پھر کسی نہ کسی جانب سے آ کر میرا ہاتھ دبا لیتی ہے۔ آپ بیتی نمبر۵ کو خلفاء کے مضمون کے متعلق اور نسبت کی تحقیق پر ختم کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ اب اس کا سلسلہ نہیں چلانا، تاکہ اس وقت میں کوئی علمی کام کیا جائے۔ گو اس وقت اپنے امراض ظاہرہ و باطنہ کی وجہ سے کسی علمی کام کا نہ رہا۔ پھر بھی دلی تمنا یہ تھی کہ جو سانس باقی ہے وہ حدیث پاک ہی کے مشغلہ میں گزر جائے، لیکن بہت سے احباب کے خطوط کثرت سے اس مضمون کے پہنچے کہ یہ رسائل بہت نافع ہیں اور تربیت میں مفید۔ بعض دوستوں کے خطوط اس مضمون کے آئے کہ ہم ان کو اپنے مدارس میں داخل درس کریں۔

متعدد جگہ طباعتوں کی خبریں تو بہت کثرت سے پہنچتی رہتی ہیں۔ وہ خطوط جو اس سلسلہ کو باقی رکھنے کے متعلق آتے رہے، ان کو تو یہ جواب لکھتا رہا یہ کوئی مقصود سلسلہ نہیں تھا، بلکہ آنکھ بنوانے کے لیے علی گڑھ کے فارغ وقت میں آنکھ بند کر کے پڑے پڑے جو متفرق قصے ذہن میں آتے رہے، وہ میرے دوست لکھتے رہے۔ یہ کوئی مقصود تالیف نہیں، لیکن شاید کہیں لکھوا چکا ہوں کہ میرے سفر حجاز کی طویل غیبت نے یہ بار بار ہوتی رہی۔ میرے بعض عزیز بچوں کو بالخصوص میرے نواسہ عزیز شاہد سلمہٗ کو کتب خانہ پر مسلط کر دیا اور وہ بعض اہم خطوط چھانٹ چکے ہیں۔ جن کے متعلق ان کا اصرار ہے کہ یہ خزینہ ضرور محفوظ ہو جائے۔ بعض خطوط کے سننے کے بعد تو میری بھی رائے ہوئی کہ ضرور محفوظ ہو جائیں۔ ورنہ بعد میں دیمک اور کیڑوں کی نذر ہوں گے، اس لیے جو کچھ یاد آیا اس کو چند فصلوں کے ذیل میں لکھوا رہا ہوں۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر١:

اکابر کا طرزِ تعلیم

اس سلسلہ کی سب سے اہم چیز میرے اکابر کا طرزِ تعلیم ہے۔اس کے متعلق جب میں خاص طور سے اپنے دوستوں کو کوئی قصہ سناتا ہوں تو ان کا اصرار ہوتا ہے کہ یہ کام ضرور محفوظ ہونا چاہیے۔اس پر میری بھی رال ٹپک جاتی ہے،اس لیے کہ موجودہ طرزِ تعلیم سے مجھے انتہائی نفرت ہے،اس لیے کہ میرے خیال میں (اللہ مجھے معاف فرمائے) آج کل کے طرزِ تعلیم میں اخلاص کچھ کم معلوم ہوتا ہے،خدا نہ کرے بلکہ اپنا علو شان اور معاصرین اور مدرسین پر تفوق روز افزوں ہے۔

حضرت سہارنپوری موجودہ طرز تعلیم کے مخالف تھے

میرے اکابر بالخصوص میرے والد صاحب اور میرے حضرت قدس سرہٗ اس طرزِ تعلیم کے بہت مخالف رہے۔جیسا کہ آپ بیتی کے مختلف مواقع میں یہ مضمون بکثرت گزر چکا ہے کہ میرے حضرت اس کے بہت شدید مخالف تھے۔بلکہ اکابر مدرسین کو مجمع میں تنبیہ بھی فرمادیا کرتے تھے کہ مجھے ہرگز یہ پسند نہیں ہے کہ ابتداء میں تو لمبی لمبی تقریریں کی جائیں اور سال کے ختم پر اوراق گردانی کی جائے۔میرے حضرت قدس سرہٗ کے زمانے میں کوئی کتاب نہ تو خارج از اوقاتِ مدرسہ ہوتی تھی نہ رات کو ہوتی تھی اور نہ جمعہ کو ہوتی تھی،صرف حضرت قدس سرہٗ کے اخیر زمانہ تعلیم میں جب اسفار کی کثرت ہوئی اور میرے والد صاحب قدس سرہٗ سال کے ختم پر ایک دو ماہ کے لیے گنگوہ بُلائے جاتے تو وہ جمعہ کو پڑھاتے یا کچھ حصہ خارج از وقت مدرسہ پڑھاتے۔رات کو پڑھانے کے حضرت خاص طور سے اس وجہ سے بھی مخالف تھے کہ طلبہ کو مطالعہ اور تکرار کا وقت نہیں ملتا۔اس لیے اس پر بڑی شدت سے نکیر فرماتے اور چونکہ وہی اثر اس سیہ کار میں بھی ابتدائے تعلیم سے مرکوز ہے،اس لیے اس کا خلاف بہت ہی چبھتا ہے۔

(١) میں آپ بیتی کے مختلف مواقع پر اپنے والد صاحب کا بھی یہ نظریہ لکھ چکا ہوں،وہ فرمایا کرتے تھے کہ موجودہ مدارس کا یہ طرز کہ مدرس تقریر کرتا رہے اور طلبہ کا کرم ہے سنیں یا نہ سنیں۔مدرس تقریر کرتا رہے اور طلبہ اِدھر اُدھر نظری تفریح کرتے رہیں کے بہت ہی خلاف تھے۔ان کا ارشاد تھا کہ اس حالت میں استعداد کیسے پیدا ہوسکتی ہے۔آپ بیتی نمبر٢ پر اپنے طلب علم کے قصہ میں لکھ چکا ہوں کہ ان کا مشہور مقولہ یہ تھا کہ اُستاد کا کام چپ بیٹھنا ہے طالبِ علم کی غلطی پر اُوں،

ہُوں کر دینا اور زیادہ غلطی پر کتاب منہ پر پھینک کر مار دینا چاہیے، کتاب کی جلد ٹوٹ جائے، چاہے اس کی ناک۔ اگرچہ اس وعید کی نوبت میرے سامنے نہیں آئی۔ اس کو میں آپ بیتی نمبر۲ میں مفصل لکھ چکا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں فارغ التحصیل علماء کی مقداریں تو ہزاروں لاکھوں تک پہنچ رہی ہیں، لیکن جہاں کہیں سے مدرس کی طلب آتی ہے تو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ ان کا طرز یہ تھا کہ طالب علم اتنا مطالعہ دیکھے کہ کتاب حل کر کے اُستاد کو سنادے اور جو اشکال کرنا ہو کرے۔

موجودہ مدرسین کا یہ عذر: کہ یہ طرز پندرہ بیس طلبہ میں تو چل سکتا ہے، سو (۱۰۰) دوسو (۲۰۰) طلبہ کی جماعت میں نہیں چل سکتا، بندہ سیہ کار کی نگاہ میں دو وجہ سے نا قابل التفات ہے۔ اول تو اہلِ مدارس کی یہ خواہش ہے کہ ہمارے مدرسہ کے طلبہ تعداد میں بہت زیادہ ہوں بندہ کو پسندیدہ نہیں۔ بلکہ ہر جماعت میں اتنے طلبہ لیے جائیں جن کو ایک مدرس سنبھال سکے اور زائد کو انکار کر دے۔ جہاں طلبہ کی کثرت ہے وہاں مدارس کی کثرت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ بعض مدارس کے مدرسین و مہتممان طلبہ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ دوسو (۲۰۰) طلبہ کی جماعت میں سے مدرسین لاعلی التعیین کسی طالب علم سے کہہ دے کہ عبارت پڑھو۔ اس سے کم از کم عبارت اور مطلب دریافت کرے اور کوتاہی پر تنبیہ کرے تاکہ پھر ہر طالب علم کو یہ فکر پیدا ہو کہ نہ جانے کل کس کا نمبر آ جائے۔ میرے والد صاحب کا یہ طرزِ تعلیم ان کے مخصوص شاگردوں میں خاص طور سے میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور مولانا عبد اللہ صاحب گنگوہی من اجل خلفاء مرشدی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ جو میرے والد صاحب کے خاص طور سے شاگرد رشید تھے اور انہوں نے تین برس میں ساری کتابیں میرے والد صاحب سے پڑھی تھیں اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی میرے والد صاحب سے اس طلب پر کہ مجھے اپنے دو عزیزوں کے واسطے (یعنی مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام پاکستان اور مولانا شبیر علی صاحب سابق مہتمم خانقاہ اشرفیہ جو بعد میں کراچی تشریف لے جا کر انتقال فرما گئے) ایک اچھا مدرس چاہیے۔ اس پر میرے والد صاحب نے مولانا عبد اللہ صاحب کو تجویز کیا تھا جس کی تفصیل اکمال الشیم کے مقدمہ میں مذکور ہے۔ مولانا شبیر علی صاحب اُستاد مولانا عبد اللہ صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:

میرے اُستادِ محترم (یعنی مولانا عبد اللہ صاحب) کے اُستاذ الاساتذہ (مولانا محمد یحییٰ صاحب) نے عمر بھر کسی کو پڑھایا نہیں بلکہ گھول کر پلایا ہے تو شاگرد رشید کیوں نہ ایسے ہوتے۔ چنانچہ جب استاذ کے سپرد کیا گیا تو اول مجھے کچھ اردو پلائی پھر فارسی شروع کرادی۔ اس زمانے میں آمدنامہ وغیرہ سے فارسی شروع کرائی جاتی تھی۔ مگر استاذِ محترم کو تو گھول کر پلانا تھا۔ لہٰذا میری تعلیم کے

لیے ایک مستقل کتاب تیسیر المبتدی شروع فرمائی۔ گھول کر پلانے کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ جب میری عمر چودہ (۱۴) سال کی تھی تو ہدایہ مشکوٰۃ وغیرہ سب مجھے گھول کر پلا چکے تھے۔ مولانا ظفر احمد صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی کی ابتدائی تعلیم و دیگر حالات

مولانا عبداللہ صاحب کو ابتدائی تعلیم صرف ونحو ادب میں کامل مہارت تھی۔ میں نے میزان، منشعب، پنج گنج کے ساتھ ساتھ تیسیر المبتدی پڑھی تھی۔ حصہ صرف ختم ہونے کے بعد نحو میر کے ساتھ اس کا حصہ نحو پڑھا تھا۔ مولانا اس زمانہ میں ہم سے اردو کی عربی اور عربی کی اردو بنوایا کرتے تھے۔ عصر کے بعد سیر و تفریح کو جاتے اور ہمیں ساتھ لیتے۔ خود قرآن شریف پڑھتے جاتے اور ہم سے قرآن کے صیغے دریافت کرتے جاتے اور نحوی ترکیب بھی پوچھتے جاتے، اسی طرح نحو میر پڑھنے کے زمانے ہی میں مجھے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق ہوگئی۔ میں نے اسی زمانہ میں اپنے ایک ساتھی کو دیوبند خط لکھا تو اس میں عربی کے چند اشعار بھی لکھے تھے جن میں سے ایک شعر یاد ہے۔

انا ما رأيتک من زمن فـاز داد فـی قـلبـی الشـجـن

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرا یہ خط دیکھ لیا تو بہت ہی دھمکایا کہ ابھی سے شعر و شاعری کا مشغلہ شروع کر دیا، ابھی تو محنت کرنے اور یاد کرنے کا زمانہ ہے۔ مگر مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ میں نے اگرچہ ظفر کو شعر و شاعری پر دھمکایا ہے مگر آپ کی خوبی تعلیم کا مجھ پر بہت اثر ہوا کہ نحو میر پڑھنے والے کو عربی شعر بنانے کی لیاقت ہوگئی۔ اگرچہ شعر کیا تھے محض تک بندی تھی، مگر نحوی ترکیب صحیح تھی۔ میں نے مولانا عبداللہ صاحب مرحوم سے میزان، منشعب پنج گنج، نحو میر، شرح مأۃ عامل، ہدایۃ النحو اور ادب کی ایک کتاب ''الـطـریف و الادیب الـظـریف'' اس کے بعد قدوری اور ترجمہ قرآن پڑھی تھیں۔ یہ زمانہ ۱۳۲۳ھ کا تھا۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کو مکشوف ہوا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وصال قریب ہے، اس لیے حضرت حکیم الامت نے استاذ مرحوم سے کہا کہ آپ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت ہیں اب مولانا کا وقت قریب ہے آپ مدرسہ تھانہ بھون سے چھ ماہ کی رخصت لے کر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں چلے جائیں۔ مولانا عبداللہ کی غیبت میں ترجمہ قرآن کا کچھ حصہ مولانا شاہ لطف رسول سے اور تلخیصات عشر کا کچھ حصہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھا اور بقیہ اپنے بڑے بھائی مولانا سعید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھتا رہا۔ پھر حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ میں نے تو تفسیر بیان القرآن لکھنا شروع کر دی ہے۔ اب مجھے درس کا وقت نہیں ملے گا۔ میں تم دونوں (مجھے اور بھائی سعید مرحوم) کو اپنے خاص تلامذہ کے پاس کانپور

کے مدرسہ جامع العلوم میں داخل کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں، وہاں تکمیل کرلو۔ چنانچہ ہم دونوں کو ساتھ لیا اور جامع العلوم کانپور میں داخل کرادیا۔

جب میرا امتحان داخلہ مولانا محمد اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بردوانی نے لیا تو پوچھا آپ نے اب تک کیا پڑھا ہے۔ میں نے وہی کتابیں گنادیں جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ فرمایا کہ نہ آپ نے کافیہ پڑھا اور نہ شرح جامی اور نہ مختصر المعانی، تو اب کیا پڑھنے کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ اگر تھانہ بھون میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تو میں اس وقت ہدایہ، جلالین، مشکوٰۃ اور تیسیر الاصول پڑھتا۔ فرمایا بغیر نور الانوار اور مختصر المعانی کے آپ مشکوٰۃ، جلالین کیسے پڑھ لیں گے۔ اچھا اس وقت ہدایہ آخرین پڑھنے والا جہاں سے پڑھ رہا ہے اس سے آگے آپ پڑھیں۔ میں نے عبارت صحیح پڑھ دی۔ فرمایا ترجمہ کیجئے، میں نے ترجمہ بھی صحیح کردیا۔ فرمایا مطلب بیان کیجئے، میں نے کہا اس عبارت کا تعلق ذرا اُوپر سے ہے، ذرا اُوپر سے دیکھ لوں۔ اتنا سنتے ہی فرمایا تم ہدایہ، مشکوٰۃ، جلالین ضرور پڑھ لوگے۔ یہ ہدایہ آخرین پڑھنے والے نہ عبارت صحیح پڑھتے ہیں نہ ترجمہ صحیح کرتے ہیں اور نہ ان کو اس کی خبر کہ کس مضمون کا تعلق کس سے ہے۔ چنانچہ نام داخل کردیا اور حضرت حکیم الامت سے عرض کیا یہ تو آپ کی کرامت ہے کہ بغیر شرح جامی، مختصر المعانی، نور الانوار پڑھے مولوی ظفر ہدایہ آخیرین کی عبارت صحیح پڑھ گئے اور ترجمہ بھی صحیح کردیا۔ حالانکہ نہ پہلے سے مطالعہ کیا نہ کتاب کو دیکھا۔ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ ہنسنے لگے اور فرمایا کہ یہ کرامت نہیں بلکہ تعلیم کی خوبی ہے۔ ہمارے یہاں مولوی عبداللہ صاحب ابتدائی تعلیم بہت اچھی دیتے ہیں کہ نحو میر اور ہدایۃ النحو پڑھنے والوں کو عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی بنانے کی پوری مشق ہوجاتی ہے۔ فقط

افاضات یومیہ میں لکھا ہے کہ ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں حضرت حکیم الامت نے ارشاد فرمایا کہ یہ جو آج کل مدارس میں اساتذہ نے ایک طرز اختیار کیا ہے کہ طلبہ کی مرضی پر اسباق رکھے جاتے ہیں، یہ بالکل ہی غلط طرز ہے۔ اس طرز میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ طالب علم کی استعداد اور قوت کو دیکھ کر کتاب کا انتخاب کریں۔ تا کہ آیندہ کے لیے محنت کارآمد ہو۔ دوسرے طلبہ کے دماغ اور اخلاق خراب ہوتے ہیں۔ ایسے برتاؤ سے اساتذہ کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں ایسی ہی باتوں کی بدولت مدارس میں خرابیاں پیدا ہوگئیں۔

(افاضات یومیہ ٦/٢: ص ۳۱۴، ۲٦۵)

مظاہر علوم ... حدید طلبہ

میں امتحان لے کر آیندہ کی کتابیں تجویز کرتے ہیں، جس میں ممتحن کی رائے بہت اہم ہوتی ہے۔ مگر جب تک طلبہ میں پڑھنے کا ذوق تھا وہ صحیح صحیح کتابیں پڑھی ہوئی لکھتے تھے۔ اس پر بھی ممتحن ان کی استعداد کے موافق ان کو بعض کتابوں میں پہلے لوٹا دیتے تھے۔ جوں جوں بدذوقی بڑھتی جاتی ہے، طلبہ بے پڑھی کتابوں کو پڑھی ہوئی لکھ دیتے ہیں، جو اپنی ذہانت سے کامیاب ہو جاتا ہے وہ اس پر فخر کرتا ہے۔ حالانکہ اگر ان کو ذوق ہو تو ان کو جو کتابیں پڑھی ہوئی بھی خام ہوں، ان کو مطلوبہ کتابوں میں لکھوانا چاہیے کہ ایک آدھ سال کی تاخیر سے اگر استعداد میں پختگی آ جائے تو ان ہی کے لیے کارآمد ہے۔ جو طلبہ قدیم پہلے سے پڑھتے ہوتے ہیں۔ دفتر سے ایک رجسٹر پر ان کی سابقہ کتابیں لکھی جاتی ہے اور حسب نصاب مجوزہ آیندہ کی کتابیں بھی مطلوبہ کتب کے خانہ میں لکھ دی جاتی ہیں۔ بعد ظہر اکابر مدرسین اجتماعی حیثیت سے بیٹھ کر اس پر نظر کرتے ہیں، جو کتاب مدرسین کے نزدیک کسی وجہ سے اس کی استعداد کی وجہ سے مناسب نہیں ہوتی، اس کی جگہ دوسری کتاب تجویز کی جاتی ہے۔

جب تک میرے حضرت قدس سرہٗ کا دور رہا حضرت خود بھی تشریف فرما ہوتے تھے۔ اس وقت تو کسی طالب علم کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ مدرسین کی تجویز کے خلاف لب کشائی نہیں دل سے بھی اس پر گراں ہو اور اکابر کی تجویز کو سعادت سمجھتے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ کے بعد حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب دام مجدہم کے دورِ نظامت میں یہ ناکارہ بھی اس مجلس میں شریک ہوا کرتا تھا اور مدرسین کی تجویز کو حکماً منواتا تھا۔ طلبہ بعض اپنے اعذار بیان کرتے اور مدرسین ان کو قبول کر لیتے تب تو خیر ورنہ رجسٹر میں لکھوا دیتا کہ اب تو مدارس کی کثرت ہے جہاں آپ کی مرضی کے مطابق تعلیم ہو وہاں تشریف لے جائیں۔ اب تیسرے دور میں قانون تو یہی ہے اور یہ ناکارہ دس بارہ برس سے اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس اہم مجلس میں شرکت سے معذور ہو گیا۔ اس لیے سنا ہے کہ بعض طالب علم اصرار سے اپنی درخواست منظور کرا لیتے ہیں، جو بندہ کے خیال میں بھی بقول حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ اپنے حق میں اچھا نہیں کرتے۔ طالب علم کی استعداد اور اس کے مناسب کتاب جتنے اساتذہ سمجھ سکتے ہیں، وہ بے وقوف کہاں سمجھ سکتے ہیں۔

میرے والد صاحب کا طرزِ تعلیم

میں آپ بیتی نمبر ۲ میں اپنے والد صاحب کا طرزِ تعلیم تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ وہ صرف کے قواعد زبانی لکھوا کر اور پھر دو حرف ''بت'' مجھے لکھوا کر مجھ سے صیغے بنواتے، جس کی تفصیل پہلے

گزر چکی۔ میں نے صرف میر، پنج گنج تین چار دن میں سنادی تھی۔ نحو میر کے زمانہ میں اُردو سے عربی، عربی سے اُردو بنوانے کا زور تھا۔ نحو میر کے ساتھ مختصر چہل حدیث پڑھانے کا خاص دستور تھا ہدایۃ النحو اور کافیہ کا سبق ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ جس میں کافیہ اصل اور ہدایۃ النحو اس کے تابع۔ جتنی صبح کو ہدایۃ النحو پڑھی اتنی شام کو کافیہ پڑھی۔ کافیہ کی ترتیب اصل ہوتی تھی۔ اسی طرح قدوری اور کنز پڑھی۔ صبح کو قدوری بطور مطالعہ کے اور اسی مقدار کی کنز شام کو۔ میں پہلے لکھوا چکا ہوں کہ اس سیہ کار نے شرح جامی کاندھلہ کے سفر میں صرف تین دن میں پڑھی تھی۔ پڑھتے ہوئے ہمیں پتہ نہ چلا کہ حاصل محصول کیا بلا ہے۔ جب شرح جامی مدرسہ میں پڑھائی تب پتہ چلا کہ حاصل محصول تو بڑے معرکہ کی بحث ہے اور الحمد للہ اٹھارہ دن میں پڑھی تھی۔ اس کی تفاصیل تو یہ ناکارہ اپنی تعلیم میں آپ بیتی نمبر ۲ پر لکھوا چکا ہے یہاں تو صرف اکابر کا طرزِ تعلیم و تدریس دکھلانا ہے۔

حضرت گنگوہی کی ابتدائی تعلیم اور ذکاوت کے واقعات

(۲)...... قطب الارشاد حضرت اقدس مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کی ابتدائی تعلیم کا تفصیلی حال تذکرۃ الرشید میں مفصل لکھا ہے، اس میں صفحہ اٹھائیس پر لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ ایسے ہم سبق اور ساتھی بنے کہ آخرت میں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ اللہ جل شانہٗ نے فلک علم کے ان منیرین کو وہ ذکاوت عطاء فرمائی تھی کہ میر زاہد قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے۔ کہیں کوئی لفظ دریافت کرنا ہوتا تو دریافت کر لیتے تھے باقی ترجمہ تک بھی نہیں کرتے تھے۔ مولانا کے دوسرے شاگردوں کو یوں خیال ہوتا تھا کہ کچھ سمجھے سمجھائے نہیں یوں ہی ورق گردانی کرتے اور کتابوں کے ختم کرنے کا نام چاہتے ہیں۔ چنانچہ کسی نے مولانا سے کہہ بھی دیا، مگر مولانا مملوک العلی صاحب نے یہ جواب دیا:

''میاں میرے سامنے طالبِ علم بے سمجھے چل نہیں سکتا۔'' اور دوسری جگہ صفحہ اُنتیس (۲۹) پر لکھتے ہیں کہ گنگوہی قدس سرہٗ نے مشکوٰۃ شریف شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مراقد ہم کو پڑھ کر سنائی یعنی ترجمہ وغیرہ کچھ نہیں۔ آگے لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی ان دونوں منیرین اور قمرین کے درمیان کسی مسئلہ پر بحث ہو جاتی اور گھنٹوں تک رہا کرتی۔ اُستاد نور اللہ مرقدہم بھی بہت غور سے ان دونوں کے مباحثہ کو سنتے اور ہمہ تن اس طرف متوجہ ہو جاتے اور کبھی لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے اور خاص وعام کا مجمع ہو جاتا۔

ایک مرتبہ ایک اُستاد نے دونوں کی تقریر سن کر یہ کہا: ''قاسم ذہین آدمی ہے، اپنی ذہانت سے قابو میں نہیں آتا ورنہ اس مسئلہ میں رشید احمد حق پر ہے۔''

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت امام ربانی کی ذکاوت فطری تھی مولوی ڈپٹی کریم بخش صاحب مقنن ریاست گوالیار نے جو دہلی کے طالب علمی کے زمانہ میں حضرت کے ہم سبق رہ چکے ہیں۔ ایک مرتبہ مولوی اسماعیل صاحب گنگوہی سے فرمایا کہ تمہارے حضرت سے ملاقات ہوئے مجھے پچاس سال ہوئے، اب تو حضرت کے علم کی شہرت ہونی ہی چاہیئے ہم نے طالب علمی کے زمانہ میں دیکھا ہے کہ سارے طالب علم مولوی صاحب سے ڈرتے تھے اور مدرسہ کے طلبہ نے مولانا کا لقب ''ھل من مبارز'' رکھ چھوڑا تھا۔ آگے لکھتے ہیں جس زمانہ میں حضرت گنگوہی مولانا کریم بخش صاحب پنجابی کی خدمت میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک ولایتی طالب علم آیا جس کا دعویٰ تھا کہ مجھے کوئی پڑھا نہیں سکتا۔ وہ شافیہ پڑھتا تھا۔ مولوی کریم بخش صاحب کو ولایتی کا دعویٰ پسند نہ آیا۔ اُستاذ نے حضرت امام ربانی سے کہا کہ یہ جار بردی ہے۔ اس طالب علم کو سبق پڑھا کر آؤ، یاد رکھنا اگر نیچا دیکھ کر آئے تو سر گنجا کر دوں گا۔ حضرت امام ربانی کتاب بغل میں دبا کر اُٹھے اور سیدھے ولایتی کے پاس پہنچے، باتوں باتوں میں کتاب کھولی اور بحث شروع کر دی۔ یہاں تک کہ ولایتی طالب علم حیران ہو گیا اور کہا کہ ہم کو پوری کتاب دہرا دو۔ اس وقت حضرت نے کتاب بند فرمائی اور کہا پڑھانا منظور نہیں، صرف تیری ناک کاٹنی تھی۔ جن علماء کے متعلق تجھے یہ خیال ہوا کہ پڑھا نہیں سکتے اُن کے ادنیٰ شاگرد نے زِچ کر دیا اور حضرت اُستاذ سے آکر کہا کہ حضرت پڑھا آیا اور مات کر آیا۔

حضرت گنگوہی فرماتے تھے کہ مختلف اساتذہ کے یہاں ہم نے پڑھا مگر تسکین نہیں ہوتی تھی مگر حضرت مملوک العلی صاحب کے یہاں اطمینان ہوا اور مولانا نے بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کرادیں۔ گویا اُستاذ نے گھول کر پلا دیا۔ آگے لکھتے ہیں کہ حضرت گنگوہی کا دہلی میں قیام چار سال رہا، جس میں منطق وفلسفہ ادب وہیئت، ریاضی، تفسیر اصول اور فقہ معانی وغیرہ پڑھی۔ زمانہ طالب علمی میں حضرت قدس سرہٗ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کا دوسرے کو پڑھانے کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

حضرت گنگوہی کی تدریس

یہ تو طالب علمی کا مختصر حال ہے۔ اس کے بعد گنگوہ کے قیام میں ہر فن کی مختلف کتابیں پڑھائیں۔ مگر ۱۳۰۰ھ کے بعد سے صرف دورۂ حدیث کا معمول رہ گیا تھا، جو شوال میں شروع ہو کر شعبان میں ختم ہو جاتا۔ تمام دورہ کی کتابیں حضرت خود ہی پڑھاتے، ابتداء میں صرف صبح کو سبق ہوتا تھا، جو اشراق کے بعد شروع ہو کر چاشت کے وقت ختم ہو جاتا اور ختم سال پر ایک گھنٹہ ظہر کے بعد بھی شروع ہو جاتا۔ ایک شخص صحاح ستہ کی سب کتابیں مع مؤطائین دس (۱۰) گیارہ مہینے

میں پڑھادے۔ آج کل کے محققین کی نگاہ میں بے چارہ کیا پڑھاتا ہوگا، لیکن حضرت قدس سرۂ کا دورۂ حدیث اس قدر مشہور تھا کہ دُور دُور سے مدرسین پڑھنے کے واسطے آیا کرتے تھے۔

خوانِ خلیل کے جام نمبر ۲ کے ضمیمہ پر میں نے لکھوایا تھا کہ مولانا احمد صاحب رامپوری کا دورہ ۱۵ شوال کو شروع ہوا اور ۷ اشعبان ۱۳۰۴ھ کو ختم ہوا۔ اس سے اگلا سال جس میں مولانا سعید الدین صاحب رامپوری تھے۔ ۲۱ شوال ۱۳۰۴ھ کو شروع ہوا، تاریخ اختتام تو نہیں ملی، لیکن حسب معمول شعبان ۱۳۰۵ھ میں ختم ہوا ہوگا۔ ۸ھ سے حضرت قدس سرۂ نے امراض اور عوارض کی کثرت سے سالانہ دورہ کو ملتوی فرمادیا تھا اور تین چار سال کے تعطل پر میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے اصرار اور حضرت سہارنپوری قدس سرۂ کی سفارش پر کہ میری درخواست پر ایک دورہ اور پڑھا دیجئے۔ اس پر حضرت قدس سرۂ نے یکم ذیقعدہ ۱۱ھ کو ترمذی شریف شروع کرائی جو صرف ایک گھنٹہ ہوتی تھی کہ امراض کی کثرت اور عوارض کی شدت کی وجہ سے اس سے زیادہ وقت نہ ملا۔ اسی وجہ سے یہ دورہ دو سال میں ہوا اور ترمذی ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ کو یعنی چودہ ماہ کے اندر ختم ہوئی۔ اس کے چار دن بعد ابوداؤد شریف شروع ہوئی، یعنی ۲۲ ذی الحجہ پنجشنبہ کو شروع ہوئی۔

اس کے بعد چونکہ نزول آب کے آثار بھی شروع ہو گئے تھے۔ اس لیے بقیہ کتب کو عجلت سے طلبہ کے اصرار پر ختم کرایا اور ۷ ربیع الاول پنجشنبہ ۱۳۱۳ھ کو ابوداؤد ختم فرمائی اور اس کے بعد بخاری شریف دو دن بعد ۹ ربیع الاول شنبہ کے دن شروع ہوئی اور یکم جمادی الاولیٰ جو جلد اول ختم ہو کر اور اس کے بعد جلد ثانی شروع ہوئی، جو ۱۷ جمادی الثانیہ کو ختم ہوئی اور اس کے بعد چونکہ نزول آب کی شدت ہوگئی تھی، اس لیے نہایت عجلت میں دو ماہ کے اندر مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ پوری فرمائی اور ۲۳ شعبان ۱۳۱۳ھ کو یہ دورہ ختم ہوا، اس کے باوجود حضرت قدس سرۂ کی جامع تقاریر کو کب الدری علی جامع الترمذی ''لامع الدراری علی جامع البخاری'' کے نام سے مطبوع ہو چکی ہیں اور ان ہی کے بقدر الدر المنضود علی سنن ابی داؤد غیر مطبوع ہے، نیز میرے والد صاحب قدس سرۂ کی مختصر تقاریر مسلم شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ بھی موجود ہیں، جن کی طباعت کی تمنا دل کے دل ہی میں رہی۔ حضرت گنگوہی قدس سرۂ کی تدریس کتب کا یہی معمول تھا جو اُوپر لکھا گیا۔ ان میں ترمذی شریف پر محدثانہ، فقیہانہ کلام زیادہ ہوتا تھا اور بخاری شریف کے درس میں تراجم پر کلام ان کے علاوہ بقیہ کتب میں کوئی حدیث غیر مکرر یا کوئی نئی بات ہوتی تو اس پر کلام ہوتا۔

آج کل ماشاء اللہ ۵، ۶ مدرس مل کر ۱۱، ۱۲ گھنٹے پڑھا کر دورہ ختم کراتے ہیں اور اخیر میں اس سے بھی زیادہ عجلت ہوتی ہے جو قطب عالم کو نزول آب کی وجہ سے کرنی پڑتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی حضرت قطب عالم کی نظر طلبہ کی اصلاحات پر بھی رہتی۔ تذکرۃ الرشید صفحہ ۹۵ میں لکھا ہے، اس کے

ساتھ ہی آپ کی نظر طلبہ کی نشست و برخاست، حرکات و سکنات، رفتار و گفتار، چال ڈھال، وضع قطع غرض ہر ظاہری حال پر برابر قائم رہتی تھی کہ کوئی طرز خلاف شروع تو نہیں ہے۔ اگر کسی کو اپنے پڑھے ہوئے علم پر عمل کا شائق نہ دیکھتے تو اس کی اصلاح کا زبان اور دل سے خیال رکھتے تھے۔ اشارہ سے، تصریح سے، ترغیب سے، ترہیب سے، نرمی سے، سختی سے جب تک متبع شرع نہ ہو جاتا اس وقت تک آپ کو بے چینی رہتی تھی۔

حضرت امام ربانی آنے والے طلبہ میں اہلیت اور صلاحیت کا بھی بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ جس طالبِ علم میں کجی پاتے یا یہ سمجھ جاتے کہ پڑھنے کے بعد اس سے ضلال یا اضلال کا اندیشہ غالب ہے اس کو کبھی سبق شروع نہ کرواتے بلکہ لطائف الحیل سے ٹال دیتے یا وہ روکھا برتاؤ فرماتے تھے جس سے وہ خود بددل ہو کر چلا جائے۔

دوسری جگہ تذکرہ الرشید جلد اول صفحہ ۱۹۹ میں لکھا ہے۔ حضرت کی صاحبزادی صاحبہ نے قرآن پاک کے ختم کرنے کے بعد باپ سے قرآن پاک کے ترجمہ پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو حضرت امام ربانی طلبہ کے درس کے بعد جب کھانے کے لیے مکان تشریف لے جاتے تو اول اہلیہ مرحومہ قرآن مجید سنا کر صاف کیا کرتیں اور پاؤ پارہ سنایا کرتیں اس کے بعد صاحبزادی صاحبہ کو ترجمہ قرآن مجید پڑھایا کرتے اور جب صاحبزادی صاحبہ نے ترجمہ شروع کیا تو رشتہ داروں کی چند لڑکیاں بھی اس لذیذ نعمت میں شرکت کے لیے شامل ہو جاتیں۔ چنانچہ عام فہم اردو زبان میں آیات کا ترجمہ پڑھاتے اس ضمن میں ضروریاتِ دین کی تعلیم فرماتے جاتے۔ مسائل بتاتے، اتباع شرع کی رغبت دلاتے خدا کی نافرمانی سے ڈراتے اور تہذیب اخلاق کی تاکید فرماتے جاتے تھے۔ یہ نسوانی درس حضرت امام ربانی کی طرف سے تقریباً آدھ گھنٹہ کا وعظ ہوتا تھا۔ جس میں مستورات کی اصلاحِ نفس کا حق ادا کیا جاتا تھا۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی ابتدائی تعلیم اور ذکاوت کے واقعات

(۳)..... اعلیٰ حضرت مولانا الحاج محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کے تفصیلی حالات تو مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی سوانح قاسمی کی تین جلدوں میں لکھ چکے اور اس کا متن متین اعلیٰ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ کا بہت وجیز قابلِ دید نہایت اختصار کے ساتھ علیحدہ چھپ چکا ہے۔ مولانا مناظر احسن صاحب کی لکھی ہوئی کتاب اسی کی شرح ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ لکھتے ہیں (صفحہ ۲۴) کہ مولانا احقر سے چند ماہ بڑے تھے۔ ان کی پیدائش شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ میں ہے اور تاریخی نام خورشید حسین ہے میرے والد صاحب جب حج

سے واپس تشریف لائے تو مجھے اور مولانا مرحوم کو دہلی ساتھ لے گئے۔ آخری ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں روانگی ہوئی اور ۲ محرم ۶۰ھ کو دہلی پہنچے اور ۴ محرم کو سبق شروع ہوئے۔ مولانا تو کافیہ پڑھتے تھے اور میں میزان وگلستان پڑھتا تھا۔ والد صاحب مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا اور جمعہ کی تعطیل کی شب میں صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا مولانا کا معمول تھا۔ مولانا سب چیزوں میں ساتھیوں سے عمدہ رہتے تھے۔ ہمارے مکان کے قریب مسجد میں طالب علموں کا مجمع رہتا تھا۔ ان سے پوچھ پاچھ ہوتی اور جب مولانا کا نمبر آتا تو مولانا سب پر غالب رہتے۔ پھر مولانا ایسے آگے بڑھے کہ کوئی ساتھ نہ چل سکا۔

منطقی کتابیں میر زاہد قاضی، صدرا، شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے جیسے حافظ منزل سناتا ہے۔ کہیں کہیں کوئی لفظ دریافت فرماتے اور ترجمہ نہ کرتے۔ حضرت گنگوہی کے قصے میں یہ واقعہ گزر چکا ہے۔ والد صاحب نے مولانا کو کہہ دیا تھا کہ اقلیدس پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تم خود مطالعہ کرو۔ چند دنوں میں مولانا نے مطالعہ کرلیا۔ اس واقعہ کی شہرت ہوئی۔ طلبہ نے پوچھ پاچھ کی، مگر مولانا کب مات کھانے والے تھے۔ اسی زمانہ میں منشی ذکاء اللہ صاحب چند مشکل سوالات اقلیدس کے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے۔ ان کے حل کرلینے پر مولانا کی اور شہرت ہوئی۔ سوانح یعقوبی میں تو یہ قصہ بہت مختصر ہے ارواح ثلثہ میں صفحہ ۲۵۴ میں لکھا ہے کہ مولانا کا نام تو کالج میں داخل تھا لیکن بطور خود پڑھتے تھے اور امتحان کی شرکت لازمی تھی۔ چنانچہ جب امتحان کا زمانہ آتا تو رام چندر جو بڑا مہندس تھا، ہندسہ کا اُستاذ تھا، اس نے مولانا نانوتوی کو بھی داخل ہندسہ کرنا چاہا، لیکن مولانا مملوک العلی صاحب نے کہہ دیا تھا کہ قاسم درس میں تو داخل نہ ہوگا امتحان میں شریک ہوگا۔ جب امتحان کا زمانہ آیا تو مولانا نے فرمایا کہ بھائی قاسم! اقلیدس کا امتحان دینا ہوگا، اس کے اوپر اشکال دیکھ لینا۔ مولانا نانوتوی نے ایک رات میں اقلیدس دیکھی۔ کالج میں اس کی شہرت ہوگئی کہ فلاں طالبِ علم بغیر پڑھے ہندسہ کا امتحان دے گا اور رام چندر کو بھی اس کی خبر ہوگئی۔ تب اس نے اپنے مایہ ناز شاگرد مولوی ذکاء اللہ صاحب کو جو فن ہندسہ میں صاحب تصانیف بھی تھے، بُلا کر چند مشکل سوالات سمجھا دیئے اور حضرت کی خدمت میں بطور امتحان بھیجا۔ اس کے جوابات کے بعد مولانا نے فرمایا کہ چند سوالات میں بھی کرتا ہوں۔ چنانچہ کیے، مگر وہ جوابات سے عاجز رہ گئے۔ مولانا مناظر احسن صاحب لکھتے ہیں (صفحہ ۲۵۱ جلدا) کہ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم طریقہ سے عربی زبان میں ان چیزوں کی تعلیم مولانا مملوک العلی صاحب سے وہ پاچکے تھے، صرف دیکھ لینا اور حساب کی مشق کرلینا کافی تھی۔

ارواح ثلاثہ میں یہ لکھا ہے کہ ایک انگریز مہندس نے اشتہار دیا تھا کہ اگر کوئی شخص مثلث کے

زاویہ کو تین حصوں میں دلیل سے ثابت اور منقسم کردے تو ڈیڑھ لاکھ روپے انعام ہے۔ مظفر نگر کے منصف صاحب بھی فن ریاضی اور ہندسہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ انہوں نے اس پر دلائل قائم کیے اور اپنے زعم میں اس کو ثابت کر دیا اور میرٹھ پہنچے۔ وہاں کے ایک حاکم اعلیٰ کو وہ دلائل دکھلائے۔ اس نے کہا کہ بالکل صحیح ہے۔ آپ اس کا اعلان کریں ضرور آپ انعام کے مستحق ہوں گے، لیکن ان کو اطمینان نہ ہوا کہ اگر اس پر مولانا ایک نظر ڈال لیں تو اطمینان ہو جائے۔ اتفاق سے مولانا نانوتوی کا مظفر نگر آنا ہوا تو منصف صاحب نے ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب (جو بعد میں حضرت گنگوہی کے خاص لوگوں میں تھے) سے کہا کہ کوئی ایسا وقت میسر آ سکتا ہے جس میں مولانا نانوتوی اس پر ایک نظر ڈالیں۔ انہوں نے کوشش کی مگر وقت نہ مل سکا، یہاں تک کہ مولانا کی روانگی کا وقت آ گیا اور اسٹیشن پر تشریف لائے تو گاڑی میں دس بارہ منٹ باقی تھے تو منصف صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ میری تحریر کو ذرا سنا دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا سے ذکر کیا اور مولانا سے منظوری پر منصف صاحب نے وہ تحریر سنائی۔ اس کو سرسری طور پر مولانا نے سنا اور فرمایا کہ سب صحیح ہے مگر دلیل کا فلاں مقدمہ نظری ہے، حالانکہ اقلیدس کے تمام دلائل کی انتہا بدیہیات پر ہوتی ہے۔ چونکہ وہ صاحب فن تھے فوراً سمجھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے منصف صاحب سے ہنس کر کہا کہ تمہیں کیا مصیبت آئی تھی کہ تم نے مولانا کو یہ تحریر سنائی اور اپنی ساری کاوش دماغ کو غلط ثابت کر دیا۔ تم اعلان کر دیتے اشتہار دینے والے کیا سمجھتے۔

مولانا محمد یعقوب نور اللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا امتحان میں شریک نہ ہوئے۔ سب اہل مدرسہ کو بالخصوص ہیڈ ماسٹر کو جو اس وقت انگریزی کے مدرس اول تھے بہت رنج ہوا۔ اسی دوران میں والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ میں بمرض یرقان صرف گیارہ دن بیمار رہ کر انتقال ہو گیا۔ لخلخہ سنگھانا اور پنکھا کرنا ہم سب کا معمول تھا۔ ہم سب تو سو جاتے مگر مولوی صاحب برابر بیٹھے رہتے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب حضرت کی سوانح میں لکھتے ہیں کہ غالباً ایک سال نانوتوی نے اپنے استاذ مولانا مملوک العلی صاحب سے تنہا تعلیم حاصل کی اور جب ۱۲۶۱ھ میں مولانا گنگوہی بھی دہلی پہنچ گئے تو یہ دونوں حضرات ساتھ ہو گئے۔ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی کیفیت درس وتدریس مفصل تو نہیں ملی چیدہ چیدہ حالات کہیں کہیں ملتے ہیں۔ حضرت کی سوانح جلد اول صفحہ کے حاشیہ پر قاری طیب صاحب زادمجدہم تحریر کرتے ہیں کہ میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ منطق وفلسفہ وغیرہ کی بڑی بڑی کتابوں کی تدریس کے موقع پر جب طالب علم صفحہ ڈیڑھ صفحہ کی عبارت پڑھ لیتا تو حضرت کی عادت شریفہ تھی کہ اس سبھی عبارت کا مطلب چند لفظوں میں بیان کر کے فرماتے کہ بس ان کا مطلب یہ ہے۔ اب تم قاسم کی سنو اور پھر

اس علم وفن سے متعلق مکنون علوم وفنون کا دریا بہہ پڑتا۔

ایک موقع پر مولانا عبد العلی صاحب (جو بعد میں مدرسہ عبد الرب دہلی کے محدث ہوئے) نے عرض کیا کہ نہیں! ہم قاسم کی نہیں سنتے، ہمیں تو کتاب کا مطلب اس کی عبارت سے سمجھا دیا جائے۔ اس کے بعد حضرت والا ان کی بہت رعایت فرمانے لگے اور جب وہ کتاب کا مطلب اور عبارت کتاب سے پوری طرح سمجھ جاتے تب حضرت اپنے علوم کی تقریر شروع فرماتے۔ مولانا مناظر احسن صاحب دوسری جگہ جلد اول صفحہ ۴۱۸ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دار العلوم کی روایت سے نقل فرماتے ہیں کہ مولانا چھتہ میں جب اقلیدس پڑھاتے تھے اور شکل کھینچنے کی ضرورت پڑتی تھی تو چٹائی کا کونہ اُٹھا کر زمین میں اُنگلی سے شکل کھینچ کر بتا دیتے تھے۔ نہ پرکار تھی نہ اوزار۔ اس قصہ کو ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۵۶ میں بھی نقل کیا ہے۔ (از زکریا اس چیز میں ہمارے مدرسہ کے صدر مدرس حضرت مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری رحمہ اللہ تعالیٰ بھی حضرت نانوتوی کے متبع تھے۔ کاغذ پر یا سلیٹ پر خط کھینچ کر شکل ہاتھ سے بنا دیتے تھے)۔ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرۂ نے اپنے اساتذہ کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب میں دیوبند میں پڑھتا تھا تو خالی گھنٹہ میں حضرت نانوتوی قدس سرۂ کے جلالین کے درس میں شریک ہوتا تھا۔

(تمہید تربیت السالک: ص۲)

حضرت نانوتوی قدس سرۂ کی بھی حضرت حکیم الامت پر ان کی فطری سعادت کی وجہ سے خصوصی شفقت تھی۔ ایک مرتبہ نانوتوی قدس سرۂ نے حکیم الامت سے پوچھا کہ کیا کتابیں پڑھتے ہو؟ حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ مجھ پر اس سوال کا کچھ ایسا رعب پڑا کہ میں کتابوں کے نام بھول گیا۔ حضرت نانوتوی قدس سرۂ نے اس کو محسوس فرما کر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع فرما دیں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ دیکھو ایک تو پڑھنا ہوتا ہے اور ایک گننا ہوتا ہے۔ محض پڑھنا کافی نہیں گننے کی بھی ضرورت ہے۔ پھر ایک قصہ سنایا کہ ایک عالم تھے جو ہدایہ کے حافظ تھے۔ ان سے ایک دوسرے عالم نے جو ہدایہ کے حافظ نہ تھے لیکن ہدایہ کو خوب سمجھ کر پڑھا تھا۔

ایک مسئلہ کا ذکر آیا، حافظ ہدایہ نے پوچھا کہ یہ مسئلہ کونسی کتاب میں ہے، غیر حافظ نے کہا ہدایہ میں ہے۔ انہوں نے کہا ہدایہ میں نہیں ہے، ہدایہ تو مجھے حفظ یاد ہے، اس میں تو کہیں نہیں ہے۔ غیر حافظ نے کہا یہ مسئلہ تو ہدایہ ہی میں ہے اور ہدایہ منگا کر مسئلہ دکھایا، جس میں وہ مسئلہ بعینہٖ تو مذکور نہ تھا لیکن اس سے مستنبط ہوتا تھا۔ جس کی تقریر پر حافظ ہدایہ نے بہت افسوس سے کہا بس جی حقیقت میں ہدایہ کو تم نے ہی پڑھا ہے، ہم نے گویا پڑھا ہی نہیں محض حفظ کر لینے سے کیا ہوتا ہے۔

اھ حضرت نانوتوی نے یہ قصہ نقل فرما کر ارشاد فرمایا کہ یہ فرق ہے پڑھنے اور گننے میں۔
(اشرف السوانح: ص ۱۳۵)

حضرت سہارنپوری کا طلب علم اور طرز تعلیم

(۴)..... سیدی و مرشدی حضرت الحاج مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے طلب علم اور تدریس کے واقعات تو تذکرۃ الخلیل میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ مجھے اس وقت اکابر کے طرز تدریس ہی پر متوجہ کرنا ہے، اس لیے مختصراً اسی نوع کے قصے ذکر کرنے ہیں۔ یہ پہلے لکھوا چکا ہوں کہ میرے حضرت اس کے شدید مخالف تھے کہ ابتداء میں لمبی تقریریں کی جائیں اور آخر میں رمضانی حافظ کی طرح ورق گردانی کر دی جائے، یہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ اس سلسلہ میں حضرت قدس سرہٗ نے اکابر مدرسین کو مجمع میں ڈانٹا ہے کہ مجھے یہ طرز بہت ناپسند ہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کے یہاں جب تک ترمذی شریف، بخاری شریف مستقل ہوتی رہی اور صبح کے پہلے دو گھنٹوں میں سبق تھا۔ ماہ صفر کے کسی حصہ میں ترمذی شریف ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے ختم ہونے کے بعد اس کی جگہ بخاری شریف شروع ہو جاتی تھی۔ اول کے چند ایام چھوڑنے کے بعد حضرت قدس سرہٗ جب سبق شروع کراتے تو جہاں سبق کے شروع کا نشان رکھا ہوا ہوتا تھا، سبق کے شروع میں اس نشان کو نکال کر اور پانچ ورق گن کر پانچ ورق کے بعد وہ نشان رکھ دیتے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی اور بارہا اس کو بہت غور سے دیکھا کہ دوسرے گھنٹے کے ختم پر وہ پانچ ورق بھی ختم ہو جاتے نہ تو کبھی گھنٹہ بچتا نہ کبھی ورق بچتا۔ میں بہت کثرت سے اس منظر کو غور کرتا رہا۔ اس میں احکام کے ابواب بھی آتے اور رقاق و آداب کے بھی آتے تھے، تقریر بھی کم و بیش ہوتی تھی لیکن ان پانچ ورقوں میں تخلف نہیں ہوتا۔ میں بہت سوچا کرتا تھا کہ کیا بات ہے؟ کبھی سمجھ میں تو نہیں آئی۔ البتہ آخر سال جس میں یہ سیہ کار خود بخاری شریف میں شریک تھا نابکاری سے اس کوشش میں تھا کہ حضرت دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہ سمجھ کر اجازت دے دیں۔ جس کی تفصیل شاید اپنی طلب علم کے سلسلہ میں مفصل لکھوا چکا ہوں۔ اس میں البتہ اس دستور میں ضرور فرق پڑا کہ شروع میں رات بھر شروح و حواشی دیکھ کر صبح کو اتنے طویل اشکالات کیا کرتا کہ شروع کے ایک دو مہینے میں ایک دو اوراق سے زیادہ نہیں ہوئے اور سال کے اخیر پر آدھا پون پارہ روز پڑھا کرتا تھا۔ آپ بیتی نمبر۲ میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ ۱۴ھ میں دار العلوم سے مظاہر علوم کی صدر مدرسی پر تشریف لائے اور حضرت قدس سرہٗ کی چند سالہ تدریس کو مختصراً یہ ناکارہ مظاہر علوم کی رودادوں سے نقل کر کے تذکرۃ الخلیل کی طباعت کے وقت مولانا میرٹھی کی خدمت میں بھیج چکا تھا اور تفصیل میرے رسالہ احوال مظاہر علوم میں کئی سال کی تعلیم حضرت قدس سرہٗ کی ملے گی۔

۱۵ھ ایک سالہ تعلیم جو مدرسہ کی رُوداد میں طبع ہوئی، وہ یہ ہے کہ بخاری شریف تمام، ابو داؤد شریف تمام، ترمذی شریف تمام، مسلم شریف تا صفحہ ۳۰، پھر غالباً کسی دوسری جگہ منتقل ہوگئی۔ شرح نخبۃ الفکر تمام، شرح عقائد مع خیالی تمام، حسامی بقدر نصاب، مقامات حریری ۲۵ مقالے، ملاّ جلال دو مرتبہ تمام، سلم العلوم تصورات، ملاّ حسن تمام، میر زاہد رسالہ تمام، غلام یحیٰ تمام، حمد اللہ تا صفحہ ۷۹، مطول تا نصاب تلخیص المفتاح تا صفحہ ۵۰۔ ایک سال میں ان سولہ (۱۶) اہم کتابوں کا پورا کرنا ظاہر بات ہے فضول تقریروں کے ساتھ تو ہو نہیں سکتا۔ میرے حضرت قدس سرۂ کی تقریر بہت ہی جامع مختصر ایسی ہوتی تھی کہ شائقین سبق کے درمیان ہی نوٹ فرمالیا کرتے تھے۔ اگر کوئی اشکال حواشی و شروح کا کوئی کرتا تو حضرت ذرا تفصیل سے اس کا جواب دے دیتے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الخلیل صفحہ ۱۹۵ میں حضرت قدس سرۂ کی تدریس کا معمول تحریر فرمایا ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ میرا خود بھی تجربہ یہی ہے کہ آپ کی تقریر مختصر اور جامع ہوتی تھی صاف اور عام فہم لفظوں میں عبارت کا ترجمہ کرتے اور مطلب سمجھاتے اور آواز زیادہ اونچی نہ ہوتی، مگر پھر بھی ۵۰، ۶۰ طلبہ کے دائرہ تک با آسانی پہنچتی تھی۔ مفہوم عبارت سمجھانے کے بعد آپ طلبہ کو شبہ اور اعتراض کا موقع دیتے اور پھر مُسکرا کر جواب دیا کرتے تھے۔ بات کرنے میں آپ کے دہن سے پھول جھڑتے اور تقریر گویا موتیوں کی لڑی ہوتی تھی۔ اخیر زمانہ عمر میں آپ کی آواز مرتعش ہوگئی تھی، مگر تسلسل و حلاوت وہی تھا جو جوانی کے زمانہ میں تھا۔

بڑے درجہ کی پندرہ سولہ ضخیم کتابوں کا ختم سال سے قبل تمام کرا دینا آپ کے لیے معمولی بات تھی اور کامل چھ ساتھ گھنٹے درس دینا اور دماغ و زبان سے کام لیے جانا آپ کی عادت بن گیا تھا۔

میرے حضرت قدس سرہٗ کا معمول بڑے اہتمام سے مدرسین کے اسباق کی نگرانی کرنا تھا۔ مگر اس کا بھی بڑا ہی عجیب طرز تھا۔ حضرت کا خاص معمول یہ تھا کہ خصوصی مہمانوں کو مدرسہ اور دار الطلبہ دکھانے خود تشریف لے جاتے اور گشت کرتے ہوئے مدرسین کے اسباق کے سامنے بھی دو دو چار چار منٹ قیام فرماتے۔ اس سے اس ناکارہ کو بھی بہت سابقہ پڑا۔ شاید لکھوا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ اس سیہ کار کو زور کا بخار ہو رہا تھا اور مشکوٰۃ شریف کا سبق ہو رہا تھا۔ میرے حضرت قدس سرۂ جدہ کے سفیر ہند کو لے کر دار الطلبہ تشریف لے گئے۔ مجھے حضرت کی تشریف بری کا احساس نہیں ہوا۔ حدیث مصراۃ کی بحث تھی۔ دفعتاً حضرت قدس سرۂ پر نظر پڑ گئی، میری زبان لڑکھڑا گئی اور حضرت بڑھ گئے، بعد میں طلبہ نے بتایا کہ حضرت تقریباً ۱۵ منٹ سے کھڑے ہوئے تھے، اسی طرح دوسرے مدرسین کے اسباق میں بھی مہمانوں کے ساتھ جاتے رہے، بعض سبقوں میں ۵ منٹ بعض میں ۷ منٹ تک کھڑے رہتے۔ مدرس بچارے کو کیا خبر کہ آج کوئی مہمان آدے گا اور

حضرت اس کو ساتھ لے آئیں گے۔ لیکن مدرسین کو اس کا فکر مستقل سوار رہتا۔

حضرت شیخ الہند کا طرز تعلیم

(۵)...... حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کا طرزِ تعلیم جیسا کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ذکر محمود نمبر۴ پر تحریر فرمایا، یہ تھا کہ جس کو حضرت حکیم الامت کے الفاظ میں نقل کراتا ہوں۔ عادت شریفہ تقریر کتاب میں یہ تھی کہ اکثر نفس مطلب پر اکتفا فرماتے تھے۔ جس کا نتیجہ کتاب کا جلدی نکلنا، کتاب سے طالبِ علم کو کامل مناسبت اور اس سے کامل استعداد ہو جاتا تھا۔ حسن وجاذبیت و وضاحت تقریر میں مولانا کا ثانی غالباً اب تک بھی ذہن میں نہیں ہے۔ ''ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یوتیہِ مَن یَشاءُ'' آگے نمبرے پر تحریر فرماتے ہیں''۔ معمول یہ تھا کہ جب طالب علم عبارت پڑھ چکتا تو لمبی سے لمبی عبارت کا نہایت مختصر اور جامع خلاصہ ایسا بیان فرمادیتے کہ پھر طالبِ علم کو اس کی تفصیل کو سمجھ لینا آسان سے زیادہ آسان ہو جاتا۔ گویا اس تفصیل کا اس اجمال پر منطبق کرنا ہی رہ جاتا اور مطلب سمجھنے میں ذرہ برابر گنجلک نہ رہتی تھی۔ اس کی یہ برکت تھی کہ کتابیں اس قدر جلد جلد ختم ہوتی تھیں جیسے کوئی مشین میں ڈھالتا ہو۔ حتیٰ کہ ہدایہ اخیرین کا ایک معتد بہ حصہ بلا ترجمہ ہی نہایت سہولت سے پڑھنا یاد ہے۔ آگے نمبر۹ میں لکھتے ہیں، حدیث میں کبھی کبھی طلبہ کی درخواست پر خود بھی عبارت پڑھتے جس کی روانی اور مفہوم لہجہ کا لطف مشاہدہ ہی سے معلوم ہو سکتا ہے اور خوبی یہ کہ درمیان درمیان ایسے وقفات لطیفہ بھی ہوتے کہ جس کا دل چاہے اپنے شبہات وسوالات اطمینان سے حل کر سکے۔ اس حالت کے جوابات میں ایک خاص اختصار اور اسکات کی شان ہوتی تھی۔

حضرت حکیم الامت ذکر محمود کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں طالب علمی کے زمانہ میں ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں دیوبند حاضر ہوا تو اس وقت حضرت شیخ الہند مدرس چہارم تھے۔ میرے اسباق میں ملاحسن، مختصر المعانی حضرت شیخ الہند کے پاس ہوئی۔ آگے نمبر۶ میں لکھتے ہیں کہ فراغ درسیات تک میرے اسباق حضرت شیخ الہند کے پاس مسلسل رہے۔ معقولات میں حمد اللہ، میر زاہد رسالہ، میر زاہد، ملا جلال اور حدیث میں متعدد کتب جن کی تفصیل رسالہ سبع سیارہ میں ہے اور فقہ میں ہدایہ اخیرین، سبع سیارہ میں حضرت حکیم الامت نے بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف کا تو کچھ حصہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور حضرت شیخ الہند سے پڑھنا لکھا ہے۔ بقیہ کتب ابوداؤد شریف، نسائی شریف، ابنِ ماجہ اور موطا امام ملک حضرت شیخ الہند سے پڑھنا لکھا ہے۔

اشرف السوانح میں جا بجا آتی رہی ہے۔ اشرف السوانح صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے کہ طلبِ علم کے زمانہ میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کسی سے ملتے جلتے نہ تھے یا تو پڑھنے میں لگے رہتے یا اگر کسی وقت فرصت ہوتی تو اپنے اُستادِ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اوّل کی خدمت میں جا بیٹھتے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کہیں تشریف لے گئے تو اپنے دوسرے استاذ حضرت مولانا سید احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت مولانا نے آمد کا سبب پوچھا تو حضرت حکیم الامت نے صاف کہہ دیا کہ آج حضرت مولانا تشریف لے گئے ہیں، خالی وقت ہے اس لیے آ گیا ہوں۔

آگے جلد ا صفحہ ۴۶ اشرف السوانح پر لکھتے ہیں کہ حضرت کا طرزِ تعلیم اس قدر سلیس ونفیس تھا کہ جو طالب علم دو چار سبق بھی حضرت والا سے پڑھ لیتا پھر کسی اور اُستاذ سے اس کی تسلی نہ ہوتی۔ چنانچہ حضرت والا فرمایا کرتے ہیں کہ میں جب پڑھاتا تھا تو اپنے اُوپر بہت تعب برداشت کر کے پہلے سے سبق کی تقریر کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا پھر پڑھاتا تھا۔ اس لیے میری ساری تقریر نہایت سلیس اور سہل اور باترتیب ہوتی تھی، جس کی وجہ سے مشکل سے مشکل مضامین بھی طالب علم کے لیے پانی ہو جاتے تھے اور باآسانی ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ گو مجھ کو تو سہل کر کے تقریر کرنے میں بہت تعب ہوتا تھا، لیکن طلبہ کو کسی مقام کے سمجھنے میں ذرا اُلجھن نہ ہوتی تھی۔

چنانچہ صدرا میں ایک مشہور مقام ہے، مثنات بالتکریر جو بہت ہی مشکل سمجھا جاتا تھا، جب کتاب میں وہ مقام آیا تو میں نے قبل اس کے کہ طالب علم کو اس کی اطلاع دوں اس کے مضمون کی ایک سلیس تقریر کر دی، لیکن یہ نہیں معلوم ہونے دیا کہ یہ تقریر کسی مشکل مقام کے متعلق ہے بلکہ یونہی سرسری طور پر اس مضمون کی تقریر کر دی۔ چونکہ میں نے بہت ہی سہل کر کے تقریر کی تھی۔ طالب علم کی سمجھ میں خوب آ گئی۔ ان طالب علم کا نام مولوی فضل حق تھا۔ وہی مدرسہ جامع العلوم سے سب سے پہلے فارغ التحصیل ہونے اور بعد فراغ عرصہ تک قنوج میں مدرس بھی رہے۔ جب انہوں نے اقرار کر لیا کہ میں خوب سمجھ گیا تب میں نے کہا کہ یہ وہی تو مقام تھا جس کو مثنات بالتکریر کہتے ہیں۔ بس یہ سنتے ہی وہ چونکنے ہوئے تو میں نے کہا بس بس اب نہ ڈرو اب تو پار ہو گئے، پھر میں نے پوچھا، اب بتاؤ یہ بھی کوئی مشکل مقام تھا؟ انہوں نے کہا کہ اجی ہم کو تو اس سے بہت ہی ڈرا رکھا تھا، لیکن یہ تو کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ اس پر میں نے یہ شعر پڑھا:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا

مقام تو واقعی مشکل تھا، لیکن میں نے اس کی تقریر ایسی بے فکری اور سلاست سے کی کہ نہایت سہولت کے ساتھ ان کی سمجھ میں آ گئی۔ البتہ خود مجھ کو سہل کر کے بیان کرنے میں بہت تعب اٹھانا پڑا۔ دوسرے کا بوجھ میں نے اپنے اوپر لے لیا اور میں پڑھانے میں ہمیشہ یہی کرتا تھا اور آج کل اساتذہ اپنے اوپر ذرا مشقت نہیں ڈالنا چاہتے۔ بات یہ ہے کہ شفقت نہیں رہی محض ضابطہ پری رہ گئی ہے۔ حضرت یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے پڑھاتے وقت ضرورت سے زائد تقریر نہیں کی، صرف حل کتاب پر اکتفا کیا، زوائد سے طالب علموں کا بھی وقت ضائع نہیں کیا اور میں اسی کی تاکید اپنے ماتحت مدرسین پر بھی رکھتا ہوں بلکہ کبھی کبھی جا کر ان کے پڑھانے کی جانچ بھی کیا کرتا تھا۔ اساتذہ زیادہ تر اپنی قابلیت کے اظہار کے لیے نکات ودقائق کی تقریریں کیا کرتے ہیں جن سے کتاب کے اصل مطلب میں بھی خلل ہو جایا کرتا ہے، بعض یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جب تک اس قسم کی تقریریں نہ کی جائیں استاد کی مہارت کے متعلق طلبہ کی تسلی نہیں ہوتی لیکن طلبہ کی یہ تسلی دیکھنی چاہیے یا ان کا نفع، ان کا نفع تو اسی میں ہے کہ اصل کتاب کو اچھی طرح حل کر دیا جائے کیونکہ استعداد اسی سے پیدا ہوتی ہے اور جب استعداد پیدا ہو جائے گی تو پھر نکات ودقائق خود ہی سمجھ میں آنے لگیں گے، لہٰذا استاذ کا اصل مطمح نظر یہی ہونا چاہیے۔

افاضات یومیہ حصہ دہم ملفوظ صفحہ ۶۸ میں لکھا ہے کہ میں (یعنی حضرت تھانوی) 'جب جامع العلوم کانپور میں مدرس اول تھا، میں نے اپنے ایک ہم وطن طالب علم کو ایک منتہی طالب علم کے حوالے کر دیا کہ ان کو فصول اکبری پڑھا دو، ایک بار میں نے متعلم کا امتحان لیا تو انہوں نے فن کے متعلق بہت اِدھر اُدھر کی تحقیقات بیان کیں، جب امتحان لے چکے تو میں نے استاد کو بلایا کہ تم کو میں نے فصول اکبری پڑھانے کے لیے کہا تھا یا شرح فصول اکبری؟ کہنے لگے 'فصول اکبری!' میں نے کہا تم نے ان کو فصول اکبری کی شرح پڑھائی ہے، کیونکہ جو مضامین اِدھر اُدھر کے بیان کیے ہیں وہ فصول اکبری میں کہاں ہیں؟ وہ خاموش ہو گئے، پھر میں نے کہا کہ تم اس طالب علم کے سامنے نفس کتاب کا مطلب بیان کر دیا کرو اس سے ان میں استعداد پیدا ہو گی' پھر فرمایا کہ کتاب میں مصنف سے کہیں کہیں غلطیاں بھی ہوتی ہیں تو اس غلطی کی تاویل اور توجیہ بھی نہیں کرنی چاہیے، جیسا کہ عام مدرسین کی عادت ہے بلکہ ظاہر کر دینا چاہیے کہ یہاں مصنف سے غلطی ہوئی ہے ورنہ ان غلطیوں کی تاویل اور توجیہ کرنے سے شاگردمیں یہی مضر عادت تاویل کی پڑ جاتی ہے، دوسرے تاویل کی ضرورت ہی کیا ہے مدرس مصنف کا ذمہ دار تو نہیں ہے، مدرسین کا منصب تو صاف ناقل کا ہے اس کے ذمہ صرف تصحیح نقل ہے کہ یہ بتا دے کہ کتابوں کی عبارت کا مطلب یہ ہے اور کتاب کا حل کر دے، خواہ کتاب غلط ہو یا صحیح ہو، البتہ اگر کوئی مضمون غلط ہو اس کا غلط ہونا ظاہر کر دے،

بس کافی ہے۔ اس سے طالب علم میں استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح خارج کتاب مضامین بیان نہ کرے، کیونکہ یہ اِدھر اُدھر کی باتیں یاد تھوڑا ہی رہتی ہیں، جب وہ باتیں طالب علم کو یاد نہیں رہ سکتیں پھر ان کو بیان کر دینے سے فائدہ ہی کیا ہوا۔

تسہیل تعلیم البیان صفحہ ۲۲ پر تحریر فرمایا ہے کہ جب سبق پڑھایا جائے تو سبق کو ایسا سمجھایا جائے کہ طالب علم اس کو خوب سمجھ لے جو کتابیں سبقاً پڑھائی جاتی ہیں، ان میں بعض تو صرف ونحو، منطق ومعانی وغیرہ کے علوم ہوتے ہیں جو مقصود نہیں، مگر علم کا وسیلہ ہیں، ان کی تقریر اس طرح کرائیں کہ کتاب کی عبارت پڑھوائی جائے اور اس کے مضامین کو حل کر دیا جائے، زیادہ طول نہ دیا جائے، اس میں علاوہ صفائی تقریر کے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ان کو پڑھانے کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

ہمارے بزرگوں کے پڑھانے کا طریقہ بھی یہی تھا کہ وہ حضرات محض کتابوں کو حل کرا دیتے تھے اور زیادہ کچھ نہ بتاتے تھے، البتہ کوئی خاص بات بتانا ضروری ہوئی تو اس کو بیان فرما دیتے تھے اور اگر پڑھانے میں کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی تو صاف کہہ دیتے کہ یہ مقام ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ طریقہ حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے موروث چلا آتا ہے اس میں ایک نفع یہ ہے کہ طالب علم کو مدرس پر ہمیشہ بھروسہ رہتا ہے کہ مجھے جو کچھ بتایا جا رہا ہے صحیح ہے، ورنہ طالب علم کو مدرس پر ہٹ دھرمی کا شبہ رہتا ہے اور جھک جھک میں وقت خراب ہوتا ہے، غرضیکہ درس اور تقریر کے وقت نفس مطلب بیان کریں اور زیادہ تحقیقات کو بالکل حذف کر دیں، کیونکہ یہ تقریریں کتاب پڑھانے کا طریقہ بتانے کے لیے کی جاتی ہیں، طبیعت کی جولانیاں دکھانے کے لیے نہیں، پھر درس کے وقت جو فضولیات بیان کی جاتی ہیں وہ یاد بھی نہیں رہتیں اور وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔

مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم گنگوہی کہتے تھے کہ جب میں دہلی مدرس ہو کر گیا تو ولایتی طالب علم میرے سپرد ہوئے اور سلّم شروع ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ تحقیق سے پڑھو گے یا سیدھا سادہ؟ کہنے لگے ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے۔ میں نے رات کو بہت کتابیں دیکھ کر صبح کو نہایت تحقیق سے پڑھایا۔ دوسرے دن میں نے پھر یہی سوال کیا انہوں نے کہا ہم تو تحقیق سے پڑھیں گے کہا کہ اگر تحقیق سے پڑھو گے تو کل جو کچھ میں نے بتایا تھا، اس کو میرے سامنے بیان کر دو تاکہ مجھے یہ اندازہ ہو کہ تم میں تحقیق پڑھنے کی قابلیت ہے یا نہیں؟ یہ سن کر سب کے سب میرا منہ تکنے لگے اور ایک بھی بیان نہ کر سکا۔ تب میں نے ان سے کہا کہ تم نے باوجودیکہ مجھ سے یہ تقریریں سنی ہیں دوبارہ بیان نہ کر سکے اور میں نے باوجودیکہ اس مقام پر استاذ نے یہ تقریریں نہیں کی تھیں، پھر بھی تحقیقات بیان کر دی آخر اس کا کیا سبب ہے؟ معلوم ہوا کہ اصل چیز استعداد کا پیدا ہونا ہے جو کتاب کا مطلب سمجھ لینے سے پیدا ہوتی ہے، ان تقریروں سے استعداد پیدا نہیں ہوتی،

اس لیے کتاب کے اصل مطلب کو خوب سمجھنے کی ضرورت ہے تب وہ سمجھے اور کتاب کے سمجھا دینے پر کفایت کی غرض مدرس کے لیے لیکچر کا طرز بہت مضر ہے۔
میں نے اپنے پڑھانے کا ہمیشہ یہی طرز رکھا کہ کتاب کو حل کر دیا، زائد باتیں کبھی بیان نہ کیں اور وہ بھی اس طرح کہ بڑے بڑے مشکل مقامات بھی طالب علم کو مشکل نہیں معلوم ہوئے۔ فقط
اس نابکار زکریا کو بھی مولانا صدیق احمد صاحب گنگوہی جیسا واقعہ پیش آیا۔ مدرسہ میں ایک مرتبہ کنز الدقائق کا سبق ایک معمر بزرگ جو بہت ہی متقی صاحب استعداد تھے ان کو دیا، انہوں نے کتاب کا مطلب واضح طور پر سمجھایا اور رموز واختلافات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، طلبہ نے ایک ہفتہ کے بعد مہتمم صاحب کی خدمت میں شکایت پیش کی، اس نابکار کو حدیث کے پڑھنے کی ابتداء ہی سے اختلاف علماء کا چسکا پڑ گیا تھا، میں نے مہتمم صاحب کی خدمت میں شکایت پیش کی کہ کنز کا سبق اس ناکارہ کو دے دیا جائے اور ان شاء اللہ جتنے اختلافات بین السطور ہیں ان سے زیادہ بیان کروں گا مگر شرط یہ ہے کہ اگلے دن پہلے دن کا سبق سنا کروں گا اور جو شخص اختلافات بیان نہیں کر سکے گا، اس کو کنز سے نکال دوں گا۔ طالب علم نے اپنی درخواست واپس لے لی، اس میں تو شک نہیں کہ مدرسین کی تقریر بہت ہی فضول اور زائد ہونے لگی، لیکن اس کے ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ طلبہ کو پڑھنے پڑھانے سے کوئی خاص غرض نہیں رہی وہ بھی صرف اتنا ہی دیکھنے لگے کہ کون سے مدرس کے یہاں تقریر لمبی ہو۔

حضرت مولانا الیاس صاحب کا طرز تعلیم

(۷)...... میرے چچا جان حضرت مولانا الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق میں اپنے والد صاحب کے طرز تعلیم میں لکھوا چکا ہوں کہ ان کا مخصوص طرز ان کے مخصوص شاگردوں میں خوب نمایاں رہا۔ مولانا عبد اللہ صاحب کے متعلق تو والد صاحب ہی کے ضمن میں مختصر حالات لکھے جا چکے۔ میرے چچا جان کے متعلق بہت مختصر حالات بھی کہیں کہیں آپ بیتی میں گزر چکے ہیں کہ میری فارسی کی تعلیم زیادہ تر چچا جان سے ہوئی وہ زمانہ چچا جان کے نہایت ہی مجاہدات کا اور ''تبتل الی اللہ و انقطاع عن الدنیا'' کا تھا۔ روزے بھی کثرت سے رکھا کرتے تھے، نوافل کا سلسلہ بھی مغرب سے عشاء تک رہا کرتا تھا۔ میں آپ بیتی نمبر۲ میں لکھوا چکا ہوں کہ ان کا طرز تعلیم یہی تھا کہ میں مطالعہ دیکھ کر جاتا۔ وہ آنکھ بند کیے ہوئے بیٹھے رہتے، جانے کے بعد ایک میں اور میرا ساتھی ایک کتاب کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتے اور سبق شروع کر دیتے اور اپنے ہی مطالعہ سے عبارت کا ترجمہ کرتے، سبق کا مدار اپنے مطالعہ پر تھا، معمولی غلطی پر چشت کرتے اور

فحش غلطی پر ایک اُنگلی سے کتاب بند کر دیتے گویا سبق ندارد۔

میرے چچا کا جو طرزِ تعلیم تھا اس کے متعلق ایک عجیب قصہ ماہنامہ ''تذکرۂ دیوبند'' محرم ۷۸ھ میں نظر سے گزرا تھا کہ مامون الرشید جب تقریباً پانچ برس کا ہوا تو بڑے اہتمام سے اس کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی، دربار میں جو علماء اور مجتہدین فن موجود تھے ان میں سے دو شخص یعنی کسائی نحوی اور یزیدی قرآن پڑھانے کے لیے مقرر ہوئے، مامون کا سن ہی کیا تھا، مگر طباعی اور فطانت کے جواہر ابھی سے چمک رہے تھے کسائی کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ مامون کو پڑھنے کے لیے کہتا تھا اور آپ چپکا سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا، مامون کہیں غلط پڑھ جاتا تو فوراً کسائی کی نگاہ اُٹھ جاتی، اتنے اشارے سے مامون متنبہ ہو جاتا اور عبارت کو صحیح کر لیتا۔

ایک دن سورۂ صف کا سبق تھا، کسائی حسبِ عادت سر جھکائے سن رہا تھا، جب مامون اس آیت پر پہنچا ''یا ایھا الذین امنو لم تقولون مالا تفعلون ''(اے ایمان والوں وہ بات کیوں کہتے ہو؟ جو کرتے نہیں) تو بے اختیار کسائی کی نظر اُٹھ گئی، مامون نے خیال کیا کہ شاید آیت کے پڑھنے میں کچھ غلطی کی، مگر جب پھر مکرر پڑھا تو معلوم ہوا کہ صحیح پڑھی تھی، تھوڑی دیر کے بعد جب کسائی چلا گیا تو مامون ہارون کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اگر حضور نے کسائی کو کچھ دینے کے لیے کہا تو ایفاء فرمائے ہارون نے کہا کہ ہاں! اس نے قاریوں کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی تھی جس کو میں نے منظور بھی کیا تھا، اس نے تم سے کچھ تذکرہ کیا، مامون نے کہا، نہیں ہارون نے کہا پھر تم کو کیونکر معلوم ہوا، مامون نے اس کا ماجرا عرض کیا اور کہا کہ خاص اس آیت پر کسائی کا دفعۃً چونک پڑنا بے وجہ نہیں ہو سکتا۔ ہارون اپنے کمسن بیٹے کی اس ذہانت سے نہایت متعجب اور خوش ہوا۔ (عیون الحدائق مطبوعہ یورپ: ص ۳۴۴)

یزیدی مامون کا صرف معلم نہ تھا بلکہ اتالیق بھی تھا اور مامون کے عام افعال و عادات کی نگرانی اس سے متعلق تھی، اس فرض کو یزیدی نہایت سچائی سے ادا کرتا تھا۔ ایک دن یزیدی اپنے معمول پر آیا۔ مامون اس وقت محل میں تھا، خدام نے یزیدی کے آنے کی اطلاع کی، مگر کسی وجہ سے مامون کو باہر آنے میں دیر ہوئی، نوکروں نے موقع پا کر یزیدی سے شکایت کی کہ آپ جب تشریف نہیں رکھتے تو صاحبزادے تمام ملازمتوں کو نہایت دق کرتے ہیں۔ مامون جب باہر آیا تو یزیدی نے چھ سات بید مارے، اتنے میں خادموں نے وزیر السلطنت جعفر بن یحیٰ برمکی کے آنے کی اطلاع کی۔ مامون فوراً آنسو پونچھ کر فرش پر جا بیٹھا اور حکم دیا کہ اچھا آنے دو، جعفر حاضر ہوا اور دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ یزیدی کو ڈر پیدا ہوا کہ مامون جعفر سے کہیں میری شکایت نہ کر دے۔ جعفر چلا گیا تو یزیدی نے پوچھا کہ میری شکایت تو نہیں کی؟ مامون نے سعادت مندانہ لہجہ میں کہا

''استغفر اللہ'' میں ہارون رشید کوتو کہنے کا نہیں جعفر سے کیا کہوں گا، کیا میں یہ نہیں سمجھتا کہ تادیب تعلیم سے مجھ کو کس قدر فائدے پہنچیں گے۔ (منتخب کتاب المختار فی نوادر الاخبار: ص ۱)

علی میاں نے مختصر حالات چچا جان کے طرز تعلیم کے لکھے ہیں اور بالکل صحیح لکھے ہیں وہ ان کی سوانح کے صفحہ ۱۱۶ پر لکھتے ہیں کہ حدیث کا سبق پڑھاتے تو پہلے وضو کرتے پھر دو رکعت نفل پڑھتے۔ از زکریا میں نے اپنے دوستوں میں قاری سعید مرحوم کو بھی اس کا بہت پابند دیکھا، جب وہ ترمذی کا سبق پڑھانے جاتے تو بہت اہتمام سے وضو کرتے دو رکعت نفل پڑھتے اس کے بعد ترمذی شریف کا سبق پڑھانے دار الطلبہ جاتے۔ آگے علی میاں لکھتے ہیں کہ حضرت دہلوی نے فرمایا کہ حدیث کا حق تو اس سے زیادہ ہے یہ اقل درجہ ہے، حدیث پڑھاتے وقت کسی سے بات نہ کرتے، کوئی معزز آدمی آجاتا تو درس چھوڑ کر اس کی طرف التفات نہ فرماتے، مدرسہ کے اسباق اور طلبہ کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتے، بڑی جانکاہی اور جانفشانی کے ساتھ طلبہ کو چھوٹے بڑے سبق پڑھاتے، بعض ایام میں اسّی اسّی طلبہ مختلف اسباق کے چھوٹے بڑے خود پڑھاتے یا طالب علم سے پڑھواتے، مشغولیت اور انہماک کا اندازہ اس سے ہوگا کہ کسی زمانہ میں مستدرک حاکم کا درس صبح کی نماز سے پہلے ہوتا تھا، مولانا طریق تعلیم اور کتب درس میں اپنا مخصوص طرز اور ذاتی رائے رکھتے تھے۔ (یہ وہی ہے جس کو میں اپنے والد صاحب کے طرز تعلیم میں لکھوا چکا ہوں کہ خود چچا جان نے بھی اسی طرز سے پڑھا) مطالعہ پر زیادہ زور تھا، چاہتے تھے کہ سبق ایسا تیار کر کے لایا جائے کہ ہُوں کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے عبارت کی صحت عربیت اور صرف ونحو کے قواعد کے عملی اجراء کی طرف خاص توجہ تھی، کتابوں میں عام مدارس کے نصاب ونظام کی پابندی نہ تھی، بہت سی ایسی کتابیں زیر درس تھیں جن کی تعلیم کا مدارس میں رواج نہیں ہے۔ مسائل کے ذہن نشین اور مستحضر کرنے اور طلبہ میں تفہیم کی قدرت پیدا کرنے کے لیے نئی نئی صورتیں اختیار فرماتے جو بہت مؤثر اور کارگر ہوتیں۔

مولانا کو مدرسہ کی ظاہری حالت اور تعمیر کی طرف بالکل توجہ نہ تھی آپ کے رفیق قدیم حاجی عبدالرحمن نومسلم مرحوم کی سعی پر مولانا کی طبیعت کے خلاف دہلی کے بعض حضرات نے کچھ حجرے تو تعمیر کروا دیے۔ مولانا واپس تشریف لائے تو سخت ناراض ہوئے، مدت تک حاجی صاحب سے نہیں بولے اور فرمایا کہ اصل چیز تعلیم ہے کہ جب سے مدرسوں کی عمارت پکی ہوئی تعلیم کچی ہوگئی۔

حضرت شاہ اسحاق صاحب کا ایک پادری سے مناظرہ

طرز تعلیم کے سلسلہ میں ولی اللہ خاندان کا ایک عجیب طویل قصہ ارواح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ دہلی

میں ایک پادری آیا جو بہت ہی مشہور پادری اور لستان تھا، اس نے علماء دہلی کو مناظرہ کا چیلنج دیا، اس وقت خاندان عزیزیہ کے مخالف علماء کو ایک موقع ملا، انہوں نے پادری کو پٹی پڑھائی کہ خاص طور سے یہاں شاہ اسحاق صاحب بہت مشہور عالم کہلاتے ہیں، ان کو خاص طور سے مناظرے کی دعوت دے، اس نے یہ سن کر کہ حضرت شاہ صاحب بہت مشہور علماء میں ہیں، شاہ صاحب کو دعوت دی، شاہ صاحب چونکہ بہت سیدھے اور کم گو تھے زبان میں بھی معمولی لکنت تھی، اس لیے مخالفین کو خیال ہوا کہ آج اس خاندان کو زک دینے کا بہت اچھا موقع ملے گا، بہت خوشیاں منائیں، احباب نے بھی شاہ صاحب سے درخواست کی کہ آپ اپنا کسی کو وکیل بنا دیں، مگر شاہ صاحب نے فرمایا:

''اس نے مجھ کو ہی دعوت دی ہے میں ہی مناظرہ کروں گا وکیل بنانے کی ضرورت نہیں۔''

اس سے احباب کو فکر تھی۔

بادشاہ بھی حضرت شاہ صاحب کے مخالفین میں تھا، اسی کی موجودگی میں مناظرہ قرار پایا، اس لیے وقت مقررہ سے پہلے ہی بہت بڑا مجمع لال قلعہ میں پہنچ گیا، اللہ کی قدرت جب وہ پادری حضرت شاہ صاحب کے سامنے آیا تو بدن پر لرزہ پڑ گیا، زبان گونگی ہوگئی اور ایک حرف بھی زبان سے نہ نکلا، جب کچھ دیر ہوگئی تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:

''آپ کچھ فرمائیں گے یا میں ہی کچھ عرض کروں۔''

پادری نے کہا:

''آپ ہی فرمایئے۔''

شاہ صاحب نے بہت زور وشور سے اسلام کی حقانیت اور عیسائیت کا بطلان مدلل فرمایا۔''

پادری بالکل ساکت تھا نہ حضرت شاہ صاحب کے کلام پر کوئی اعتراض کیا نہ کوئی اپنی طرف سے سوال کیا۔

جب اس کا عجز سب پر کھل گیا تو حضرت شاہ صاحب نے ان مخالف علماء کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

''ہمارے خاندان کا قاعدہ رہا ہے کہ وہ تفسیر قرآن شریف سے پہلے تورات وانجیل اور زبور پڑھا دیا کرتے تھے، کیونکہ بغیر ان کتابوں پر عبور ہوئے قرآن شریف کا لطف نہیں آتا۔ اس قاعدے کے موافق مجھے بھی یہ سب کتابیں پڑھائی گئی تھیں، اس لیے میں عیسائی مذہب سے ناواقف نہیں ہوں اور پھر فرمایا کہ اگر اسحاق کو ذلت اور شکست ہوئی تو کچھ بات نہ تھی کیونکہ مجھے علم کا دعویٰ ہی کب ہے لیکن اسلام تو تمہارا بھی تھا اس سے تمام مخالفین پر پانی پڑ گیا اور مناظرہ ختم ہو گیا۔'' (ارواحِ ثلاثہ: ص۱۱۴)

فصل نمبر۲

طلبہ کی تربیت اور اس کی اہمیت

میرے اکابر نور اللہ مرقدہم کے یہاں طلبہ کے آداب پر بھی خصوصی نگاہ رہتی تھی۔ اول تو اس زمانہ میں اکابر اساتذہ کا احترام طلبہ کے اندر کچھ ایسا مرکوز تھا کہ اب وہ باتیں یاد آ کر بہت ہی رنج و قلق ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ قدہٗ کو بھی اس کا بہت ہی احساس تھا، افاضات یومیہ حصہ ششم مطبوعہ تھانہ بھون صفحہ ۳ پر ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

''فلاں مدرسہ میں ایک وقت میں اکابر کی ایسی جماعت تھی کہ ہر قسم کی خیر و برکات موجود تھیں، ظاہر کے اعتبار سے بھی اور باطن کے اعتبار سے بھی اس وقت تعمیر اتنی بڑی نہ تھی مگر ایک ایسی چیز اتنی بڑی تھی کہ مدرسہ خانقاہ معلوم ہوتا تھا، ہر چہار طرف بزرگ ہی بزرگ نظر آتے تھے، اب سب کچھ ہے اور پہلے سے ہر چیز زائد ہے مگر وہی چیز نہیں جو اس وقت تھی گویا جسد ہے روح نہیں۔''

میں نے مہتمم صاحب سے کہا تھا کہ اگر اس موجودہ حالت پر مدرسہ نے ترقی بھی کی، تو یہ ترقی ایسی ہوگی جیسے مر کر لاش پھول جاتی ہے جو کہ ضخامت میں ترقی ہے مگر پھولنے کے بعد وہ جس وقت پھٹے گی اہل محلہ اہل بستی کو اس کا تعفن پاس نہ آنے دے گا۔

اس زمانہ خیر و برکت میں ایک مرتبہ مدرسہ میں ایک انجمن قائم ہوتی تھی ''فیض رساں'' اس کا نام رکھا گیا، ایک لڑکا تھا فیض محمد اس کے نام پر انجمن کا نام رکھا گیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے سنا تو فرمایا خبیثو! ایک ایک آؤ، سب کو ٹھیک کر دوں گا، میں انجمن قائم کراؤں گا اور سب نالائقوں کو نکالوں گا، بس فیض کی بجائے حیض جاری ہو گیا، اب تو اسی جگہ ایک دو کیا پچاسوں انجمنیں ہیں تعلیم و تربیت ختم اور اب تو نہ استاد کا ادب رہا، نہ مہتمم صاحب کا ادب رہا، نہ پیر کا ادب رہا، نہ باپ کا ادب، اب چاہیں انجمنیں قائم کریں یا کمیٹیاں قائم کریں، اسباق پڑھیں یا نہ پڑھیں، کون پوچھ سکتا ہے، کون مؤاخذہ کر سکتا ہے، اس ناکارہ نے اپنے اکابر کے سامنے جو طلبہ کا طرز دیکھا اور وہ اکابر کی برکت سے بغیر کہے اکابر کی توجہ اور طلبہ کی سعادت سے ہم لوگوں کی طالب علمی کے زمانہ میں یہ چیزیں طلبہ میں ایسی پختہ تھیں کہ ان پر کہنے یا ٹوکنے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی، لیکن اس ناکارہ کو اپنے مدرسی کے زمانہ بالخصوص حدیث پاک کی تدریس کے زمانہ میں جو ۱۳۴۰ھ سے شروع ہو گیا تھا، حدیث کے متعلق مقدمۃ الحدیث، مقدمۃ الکتاب پر مختصر کلام کے بعد اپنے اصول عشرہ خاص طور سے بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی

اور پہلے دن یہ دس اصول بتا کر (اس ناکارہ کی بداخلاقی کا زور تھا) اس لیے صاف یہ بھی کہہ دیا کرتا تھا کہ میں ان چیزوں کے خلاف زبان سے نہیں کہوں گا ہاتھ سے کہوں گا، اس زمانہ میں اس ناکارہ کی علمی سلسلہ میں تو زبان زیادہ چلتی تھی، لیکن طلبہ کی عملی حالت پر بجائے زبان کے ہاتھ زیادہ چلتا تھا، اس ناکارہ کے اصول عشرہ جن پر مجھے خاص طور سے زور تھا وہ یہ ہیں:

(۱)...... سبق کی غیر حاضری میرے یہاں سخت ترین جرم تھا میرے حاضری کے رجسٹر اس زمانے کے موجود ہیں سالوں کے درمیان میں (ب) بیماری کی تو کہیں کہیں ملے گی یا (ر) رخصت کی، لیکن (غ) غیر حاضری کا برسوں میں بھی تلاش سے مشکل سے ملے گا۔ ہمارے مدرسہ کے مدرس دوم مولانا منظور احمد خان صاحب نور اللہ مرقدہٗ بہت ہی رحم دل بہت ہی متواضع تھے ان کے رجسٹروں میں (غ) بہت ملتا تھا اور ان کا خاص مقولہ جو بار بار انہوں نے مختلف سالوں میں طلبہ سے کہا کہ زکریا کے سبق میں حاضری کا کوئی ثواب نہیں، وہ تو ڈر کے مارے ہے، ثواب میرے یہاں کی حاضری میں ہے چونکہ اکابر کا مجھ سیہ کار پر اعتماد بھی تھا، اس لیے میری بے جا حرکتوں پر اکابر کی طرف سے دارو گیر نہیں ہوتی تھی، میرے یہاں جو طالب علم اس زمانہ میں غیر حاضر ہوتا تو میں اس سے دوسرے دن یہ کہہ دیتا کہ میں نے تمہارا نام ابوداؤد شریف یا بخاری شریف میں سے کاٹ دیا ہے، بجائے اس کے کہ میں آپ کی شکایت مہتمم صاحب کے یہاں غیر حاضری کی کروں، اب آپ مہتمم صاحب کے یہاں میری شکایت جا کر کریں کہ اس نے بغیر حکم اہتمام کے میرا نام کتاب میں سے کاٹ دیا ہے، اب آپ دوبارہ مہتمم صاحب کا حکم لائیے کہ آپ کا نام کتاب میں داخل کردوں، میں آپ کا نام کاٹ چکا ہوں

(۲)...... صف بندی کا اہتمام نماز کی صفوف کی طرح سے کسی کا آگے بیٹھنا کسی کا پیچھے بیٹھنا بے ترتیب بیٹھنا اس سیہ کار کو بہت ہی گراں گزرتا تھا۔

(۳)...... وضع قطع کے اوپر بھی اس سیہ کار کو بہت ہی زیادہ شدت سے اہتمام رہتا تھا، علماء سلف کی وضع قطع کا خلاف اس سیہ کار کو بہت ہی گراں گزرتا تھا، بالخصوص ڈاڑھی کے معاملہ میں اول تو اس زمانہ میں مدرسہ کا فارم داخلہ ہی ایسے شخص کو نہیں ملتا تھا جو ڈاڑھی منڈاتا تھا، لیکن اگر کسی مجبوری سے یا طالب علم کے عہد و پیمان پر داخلہ کا فارم مل بھی جاتا تو اس سیہ کار کے سبق میں حاضری کی اجازت نہ تھی۔

ایک صاحب نہ معلوم کس وجہ سے اس حرام فعل کے ارتکاب کے باوجود دورہ میں داخل ہوگئے، اس سال میرے یہاں ابوداؤد شریف ہوتی تھی، وہ حضرت مہتمم صاحب اور اکابر مدرسین کی سفارش بھی لائے کہ ان کا نام ابوداؤد شریف میں داخل کردیا جائے، مگر اس سیہ کار نے عذر کردیا کہ

جب تک ڈاڑھی کا نمو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتا داخلہ سے معذور ہوں۔ اس طالب علم کو بھی اس پر ضد یا غصہ تھا کہ میرے معاصرین بلکہ بعض اکابرین کے یہاں بھی اس کا نام داخل ہے اور مجھے شدت سے انکار، مگر اس سیہ کار نے اپنی بدخلقی کی وجہ سے اخیر تک ان کا نام نہیں داخل کیا، لیکن چند سال بعد ان صاحب کا خط بیعت کی درخواست لیے آیا، مجھے یاد آ گیا۔ میں نے ان کو لکھا کہ میری بدخلقی اور تشدد کا تم تجربہ کر چکے ہو، ایسی حالت میں مناسب ہے کہ تم کسی حلیم وبردبار شیخ کی طرف متوجہ ہو، اس صاحب نے بہت اصرار سے لکھا کہ میرے لیے تمہارے ہی جیسے متشدد کی ضرورت ہے۔

(۴)......اس ناکارہ کی عادت یہ تھی کہ ''کتاب الحدود'' وغیرہ کی روایات میں جو فحش لفظ آ گیا جیسا انکتها یا امصص بظر اللات وغیرہ الفاظ ان کا اُردو میں لفظی ترجمہ کرنے میں مجھے کبھی تامل نہیں ہوا، میں نے کنایہ سے ان الفاظ کا ترجمہ کبھی نہیں بتایا، میرے ذہن میں یہ تھا کہ جیسا اردو میں ان کا ترجمہ ہے ویسے ہی عربی میں ان کے اصل الفاظ ہیں، میں اپنی ناپاک اور گندی زبان کو سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی پاک زبانوں سے اونچا نہیں سمجھتا تھا، لیکن اسباق کے شروع میں اپنے اصول عشرہ میں اس پر نہایت شدت سے متنبہ کرتا تھا کہ ان فحش الفاظ پر اگر کوئی شخص ہنسا، جس سے وہ حدیث پاک کے ترجمہ کی بجائے گالی بن جائے تو سبق ہی میں پٹائی کروں گا اور میں خود بھی ترجمہ کرتے وقت ایسا منہ بنا تا تھا جیسا بڑا غصہ آ رہا ہو، جس کی وجہ سے اول تو طالب علم کو ہنسنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، لیکن اس پر بھی اگر کوئی بے حیاء تبسم بھی کر لیتا تو میں اس کی جان کو آ جاتا تھا۔

(۵)......کتاب کے اوپر کہنی وغیرہ رکھ دینا بھی جیسا کہ بعض طالب علموں کی عادت ہوتی ہے اس سیہ کار کے یہاں نہایت بے ادبی اور گستاخی تھی، اس پر پہلے ہی دن نہایت زور سے نکیر اور تنبیہ کر دیا کرتا تھا اور اس سے بڑھ کر نمبر۲ کتاب پر کہنی رکھ کر اور ہاتھ پر منہ رکھ کر سونا تو اس سے بھی بڑا سخت ظلم تھا اس پر نہایت شدت سے تنبیہ تو پہلے ہی دن کر دیتا تھا اور اس زمانہ میں اس سیہ کار کا بدن چونکہ نہایت ہی ہلکا پھلکا سوکھی لکڑی کی طرح سے تھا اس لیے بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ طالب علم نے حدیث پڑھی اور میں نے تقریر کی اور جب طالب علم نے دوسری حدیث شروع کی تو میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر نہایت پھرتی سے سونے والے کو ایک تھپڑ مار کر اپنی جگہ بیٹھ جایا کرتا تھا، دورہ کے طلبہ نہایت متحیر رہ جاتے کہ یہ کیا ہو گیا، مگر چونکہ لوگوں کو میری عادت معلوم ہو گئی تھی اس لیے وہ سمجھ جایا کرتے تھے کہ کوئی غریب سو گیا ہوگا، میں اس میں اکابر مدرسین کی اولاد اور مخصوصین کی بھی بالکل رعایت نہیں کرتا تھا۔

میرے حضرت میرے مرشد میرے آقا نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کے ایک عزیز کی بھی عادت تھی، مجھے کئی دفعہ اس کے ساتھ یہ عمل کرنا پڑا میرے حضرت کے یہاں میری شکایت بھی پہنچی مگر میرے حضرت کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے، میری شکایت پر ہمیشہ ہی تسامح فرمایا بلکہ طرف داری فرمائی، اس شکایت پر بھی میرے حضرت کا جواب یہ تھا کہ کیا میں اس کو (زکریا کو) اس بات پر تنبیہ کروں کہ تم نے حدیث کی بے ادبی پر کیوں مارا۔

(۷)...... حدیث پاک کے سبق میں خاص طور سے بیٹھنے پر بھی میں خصوصی تنبیہ شروع سال میں کر دیتا تھا کہ چوکڑی مار کر نہ بیٹھیں، دیوار سے ٹیک لگا کر نہ بیٹھیں، حدیث پاک کی کتابوں کا نہایت ادب ظاہراً و باطناً ملحوظ رکھیں، کسی نقل و حرکت سے حدیث کی کتاب کی بے ادبی ظاہر نہ ہو۔

(۸)...... لباس پر بھی میں خصوصی تنبیہ شروع میں کر دیتا تھا، میں ان سے کہا کرتا تھا کہ دنیا میں سینکڑوں مذاہب سینکڑوں طریقے لباس کے ہیں، مگر ایک چیز میں تم خود ہی غور کر و کہ مقتداؤں کا لباس ایک ہے یعنی لمبا کرتا، لمبا چوغا، چاہے مسلمان ہو چاہے پادری ہو، چاہے مجوس ہو، چاہے ہنود ہو، بالخصوص اونچا کرتا سرین تک اور تن پائجامہ کی تو میں بہت تشنیع کیا کرتا تھا کہ ایسے لوگوں کو نماز کی صف اول میں ہر گز نہیں کھڑا ہونا چاہیے کہ وہ زبان حال سے دوسروں کو بے حیائی کے ساتھ اپنے اعضاء مستورہ کا حجم دکھلا رہے ہیں۔

(۹)...... ائمہ حدیث اور ائمہ فقہ کے ساتھ نہایت ادب اور نہایت احترام اور ان پر اعتراض چاہے قلبی ہی کیوں نہ ہو ہر گز نہ کیا جائے بعض لوگ حنفیت کے زور میں دوسرے ائمہ پر اور بعض بیوقوف ائمہ حدیث پر تنقیدی فقرے کہتے ہیں یہ مجھے بہت نا گوار ہوتا تھا میں نے قطب الارشاد حضرت گنگوہی کا ایک مقولہ بچپن میں سنا تھا غالباً ''تذکرۃ الرشید'' میں یہ قصہ لکھا بھی گیا کہ حضرت قدس سرہٗ نے حنفیت کی تائید میں کوئی تقریر فرمائی جس پر طلبہ جھوم گئے کسی نے جوش میں کہہ دیا کہ اگر حضرت امام شافعی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس تقریر کو سنتے تو رجوع فرما لیتے، تو حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا توبہ توبہ ''استغفر اللہ'' حضرت امام ربانی اگر موجود ہوتے تو میری یہ تقریر ایک شبہ ہوتی اور حضرت مجتہد اس کا جواب فرما دیتے، اب تو چونکہ ائمہ مجتہدین موجود نہیں ہیں ان کے اقوال ہمارے سامنے ہیں ان اقوال میں ہم حضرت ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اقرب الی القرآن والحدیث پاتے ہیں اس لیے اس کی تائید کرتے ہیں ورنہ مجتہدین میں سے کوئی ہوتا تو ان کی اتباع کیے بغیر چارہ نہ ہوتا، اوکما قال

(۱۰)...... مجھے اس پر بھی بہت زور تھا اور ابتداء ہی میں طلبہ کو اس پر متنبہ کر دیا کرتا تھا کہ معاصر مدرسین کا کوئی قول آپ نقل کریں تو شوق سے مگر مدرس کا نام ہر گز نہ لیں، اس سلسلہ میں چونکہ

حضرت عبدالرحمن صاحب نوراللہ مرقدۂ صدرالمدرسین کے یہاں ترمذی شریف ہوتی تھی اوراس سیہ کار کے یہاں ہمیشہ ابوداؤد شریف اوران دونوں کی روایات ابواب فقہیہ کے طرز پر ہوتی تھیں اوراس زمانہ میں طالب علم کچھ سمجھدار بھی تھے، وہ میری اور مولانا مرحوم کی تقریر میں جب اختلاف پاتے تو بڑے زور سے مجھ پر یا مولانا پر اعتراض کرتے۔

مجھے معلوم ہوا تھا کہ مولانا مرحوم نے بھی اپنے سبق میں اس پر نکیر کی تھی کہ تم شیخ کا نام لے کر مجھے مرعوب کرنا چاہتے ہو، جو اعتراض کرنا ہوا کرے بغیر شیخ کے نام کے کیا کرو۔ میں نے بھی اس پر کئی سالوں میں کئی دفعہ طلبہ پر نکیر کی کہ مولانا کا نام لے کر اعتراض ہرگز نہ کریں کہ مولانا کا نام سننے کے بعد اس پر رد کرنا بے ادبی ہے اور سکوت کرنا اپنی رائے کے خلاف کو قبول کرنے کے ہم معنی ہے۔

حدیث کی کتابیں تو دوسرے حضرات مدرسین کے یہاں بھی ہوتی تھیں مگر اس سیہ کار اور مولانا کے سبقوں میں یہ چیزیں کثرت سے پیش آیا کرتی تھیں "تلک عشرۃ کاملۃ" پر یہ ناکارہ شروع ہی میں ایک زوردار تقریر کرتا تھا اور پھر سال بھر تک ان میں سے ہر نمبر کے خلاف پر تنبیہ کرتا تھا، اس نمبر میں میں نے ایک چیز لکھوائی ہے کہ میرے حضرت کے یہاں سے اس نابکار کی شکایات تو ہوتی ہی رہتی تھیں، کچھ سچ بھی ہوتی تھیں اور کچھ حاسدین کی شفقتوں کا بھی ظہور تھا مگر میرے حضرت کو اللہ بہت ہی بلند درجات عطاء فرمائے، مجھے یاد نہیں کہ کسی شکایت پر اس سیہ کار پر عتاب ہوا ہو، اسی واسطے اخلاق درست نہ ہوئے۔

میں نے نمبر۲ میں لکھوایا کہ میری شکایات پر حضرت نے بجائے مجھے کچھ فرمانے کے میری حمایت ہی فرمائی، ایک بہت ہی عجیب قصہ اس وقت یاد آ گیا کہ ۴۴ھ کے حج میں اعلیٰ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدۂ بھی تشریف فرما تھے اور انبالہ کے ایک بزرگ حضرت رائے پوری نوراللہ مرقدہ کے مخلص اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بھی مخلص اور ان دونوں کی وجہ سے اس سیہ کار پر بھی بہت شفقتیں فرمایا کرتے تھے، یعنی حافظ محمد صدیق صاحب انبالوی بھی اس سفر میں ساتھ تھے، ان کی بچی غالباً سات، آٹھ سال کی عمر ہوگی مگر پنجاب کا نشوونما یوپی سے بڑھا ہوا رہتا ہے اور پنجاب میں پردہ کا رواج بہت ہی شاذ و نادر ہے، بالخصوص بچوں کے حق میں، وہ بچی اگر زندہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی ہر نوع کی مدد فرمائے، دین و دنیا کی ترقیات سے نوازے مر گئی ہو تو اللہ تعالیٰ مغفرت فرما کر اپنے جوار رحمت میں زیادہ سے زیادہ قرب عطاء فرمائے۔

وہ اماں جی کو مسجد نبوی میں پانچوں وقت نماز کے لیے لے جایا کرتی تھی کہ اس کا مکان بھی حضرت قدس سرہٗ کے مکان کے قریب ہی تھا، میں نے ایک دفعہ اس بچی کو یہ کہا کہ اری تو بڑی

ہوگئی بغیر برقع کے نہ آیا کر، اس نے منہ پھیر کر گویا عملی انکار کیا، زبان سے کچھ نہیں کہا مسجد میں جاتے آتے کبھی کبھی سڑک پر وہ نظر پڑ جاتی تھی۔ دوسرے دن جب وہ نظر پڑی تو میں نے پھر ٹوکا کہ میں نے کہا تھا برقع بنانے کو تو نے بنایا نہیں، اس نے کوئی حرکت تو نہیں کی مگر چپ ہو کر چلی گئی۔ ایک آدھ دن بعد وہ پھر نظر پڑی، میں نے آواز دے کر اس کا نام لے کر کہا کہ میں نے تجھے کئی دفعہ برقع بنانے کو کہا تو نے اب تک نہیں بنایا۔ اب کے بغیر برقع کے دیکھا تو ایک دھول رسید کروں گا۔

وہ بجائے اماں جی کو نماز میں لے جانے کے روتی ہوئی گھر چلی گئی اور اماں جی کی اس دن حرم کی نماز فوت ہوگئی، اس کو بلا کر پوچھا تو اس نے سارا قصہ سنا دیا اور اماں جی نے ناراضگی کا اظہار فرما دیا کہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے اور اس سے بڑھ کر ان کے بھائی میرے مخدوم جناب الحاج مقبول احمد جن کا ذکر پہلے بھی آ گیا بہت ہی ناراض ہوئے، مقدمہ میرے حضرت قدس سرہٗ تک پہنچا، اماں جی نے بھی حرم کی نماز فوت ہونے پر بہت ہی ناراضگی کا اظہار فرمایا، حضرت قدس سرہٗ نے اس لڑکی کو بلایا وہ واقعی یا مصنوعی بہت روتی ہوئی گئی، حضرت نے بہت ہی شفقت سے محبت سے پیار سے اس سے فرمایا کہ:

پیاری بچی! بات یہ ہے کہ تو اس (زکریا) کو تو دیکھ ہی رہی کیسا مسٹنڈہ بن رہا ہے اور وہ کسی کے قابو کا تو ہے نہیں اگر اس نے تیرے تھپڑے مار دیا تو تو گر پڑے گی اور اگر اس پر میں نے اس کے تھپڑ مارا تو اس پر تو کوئی اثر ہو نا نہیں الٹی میری ہی انگلیاں دکھ جائیں گے، اس لیے میری سمجھ میں تو یوں آوے، اچھا یہی ہے کہ تو برقع ہی بنا لے۔

جو حضرات مجھ پر خفا ہو رہے تھے ان کا تو ایک ہی فقرہ ہمیشہ کا تھا کہ حضرت اس کی بات تھوڑی ٹال سکیں، لیکن اس کے والد مرحوم کو جب یہ سارا قصہ پہنچا تو بے چارے اسی وقت جا کر بازار سے برقع کا کپڑا لائے، گھر میں مشین تھی، کئی نے مل کر اس کو جلدی جلدی سی لیا اور نماز کے وقت برقع اوڑھ کر آئی تو میں نے بھی اس کو بہت شاباشی دی، حضرت قدس سرہٗ کا ایک واقعہ لکھواتا ہوں واقعے یاد آجاتے ہیں۔

میرے حضرت قدس سرہٗ کو میری ناپاکی، گندگی، نالائقوں کے باوجود حسنِ ظن بہت تھا اور شفقت اس سے بھی زیادہ، دو واقعے اس وقت میرے ذہن میں زور سے آئے، یاد نہیں کہیں لکھوا چکا ہوں یا نہیں، میرے والد صاحب قدس سرہٗ کے وصال تک تو حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کی زیادہ نوبت نہیں آتی تھی لیکن والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے بعد ۳۵ھ میں بذل کے شروع ہو جانے کی وجہ سے اور اس سیہ کار کی طرف ڈاک منتقل ہو جانے کی وجہ سے حضرت

کی تشریف آوری پر کنجی حضرت سے لے کر حجرہ کھول کر ڈیکس اور خطوط ڈاک وغیرہ نکال کر لانا اس سیہ کار ہی کے ذمہ تھا اور اس دوران میں ڈاک لانے یا رکھنے کے لیے یا کسی خط کی تلاش کے لیے بار بار حجرہ میں جانا بھی ہوتا تھا۔

حضرت قدس سرہٗ کے ڈیکس میں ایک صاحب کی امانت ایک طلائی زیور مختصر سا رکھا ہوا تھا وہ چوری ہو گیا، متعدد لوگوں نے کہا کہ اس کی آمد و رفت ہر وقت رہتی ہے اسی نے اُٹھایا ہوگا، ان کی بدگمانی بے محل بھی نہ تھی کہ آٹھ ہزار کا مقروض تھا اور اس کے باوجود فضول خرچ، مگر حضرت قدس سرہٗ سے جب کسی نے کہا کہ یہ اس کا کام ہے تو حضرت نے بے ساختہ فرمایا کہ یہ کام اس کا نہیں بعض بے ادب لوگوں نے حضرت سے کہا بھی کہ حضرت کو بہت ہی حسن ظن شروع ہی میں ہو گیا، ابھی اس کا حال بھی معلوم نہیں ہوا، بچہ ہے مگر حضرت ہر دفعہ بے ساختہ یہ فرماتے تھے کہ اس کا کام نہیں، میرے رب کے احسانات کی تو کوئی انتہا ہی نہیں، ہفتہ عشرہ نہیں گزرا تھا کہ چور کا پتہ بھی چل گیا اور اس نے اقرار بھی کر لیا اور چیز واپس بھی آ گئی، تب میری جان میں جان آئی کہ اور مالک کا شکر تو یہ ناپاک کیا ادا کر سکتا تھا کہ اب تک کسی ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہ ہو سکا۔

اسی کے ساتھ ایک دوسرا واقعہ بھی یاد آیا، مجھے تو یاد ہے کہ میں لکھ چکا ہوں مگر میرے احباب جو ہر وقت آپ بیتی پر لپٹے رہتے ہیں شدت سے انکار کرتے ہیں کہ یہ واقعہ نہیں آیا، مگر ایک دوست نے بتایا کہ آپ بیتی نمبر۴ حضرت قدس سرہٗ کے احوال میں یہ مفصل قصہ گزر چکا، مجھے تو اس قصہ کا آخر جزء صرف حضرت قدس سرہٗ کی شفقت اور اعتماد بیان کرنا ہے کہ جب حاجی صاحب نے فرمایا کہ زکریا بھی تو کل خانعالم پورہ کی سیر کرنے گیا تھا اس سے پوچھ لیجئے تو میرے حضرت قدس سرہٗ نے بے ساختہ فرمایا کہ یہ نہیں گیا حاجی صاحب کو غصہ آ گیا کہنے لگے ایسی بھی خوش اعتقادی کیا، یہ تو سامنے بیٹھے ہیں ان سے دریافت فرمالیں اور میں چپ لرز رہا تھا، حضرت قدس سرہٗ نے دوسری مرتبہ فرمایا "نہیں نہیں یہ نہیں گیا" حاجی صاحب نے غصہ میں فرمایا کہ آخر اس سے دریافت تو کر لیں حضرت نے مجھ سے پوچھا، میں نے عرض کیا کہ حضرت وہاں تو نہیں گیا، میں نے سنا کہ حاجی خلیل صاحب کا گھر گر گیا تھا وہاں گیا تھا حضرت نے فرمایا یہ صحیح ہے وہاں ضرور گئے ہو گے، لیکن خانعالم پورہ کا پانی ان کے مکان کے قریب تک پہنچ گیا تھا اس لیے وہ دریا سارا سامنے ہی تھا ان صاحب کو تو میرے جواب پر بہت غصہ آیا مگر بات واقعی یہی تھی۔

یہ حاجی خلیل صاحب مرحوم بڑے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ سے بیعت اور حضرت مولانا عبد القادر صاحب اور میرے والد صاحب کے جاں نثاروں میں تھے اور بڑے غریب آدمی تھے، میرے والد صاحب اکثر رات کو ان کے یہاں جاتے اور وہ بڑی خاطریں کرتے کھانا اور چائے

اور یہ اور وہ مگر اخیر میں ان سب کی قیمت سے زیادہ میرے والد صاحب چپکے سے دے دیتے، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب بھی کبھی کبھی ان کے مہمان ہوتے اور ان کی مسجد میں قیام کرتے اور وہ مع مہمانوں کے بڑی فیاضی سے دعوتیں کرتے اور چپکے سے اس ناکارہ سے کہہ دیتے کہ میرے پاس تو پیسے ہیں نہیں پیسے آپ کو دینے ہوں گے اور یہ ناکارہ بہت ہی مسرت اور خوشی اپنے والد صاحب کے اتباع میں پیش کیا کرتا تھا کہ میرے حضرت قدس سرہٗ کو ان کا بڑے حضرت رائے پوری اور میرے والد صاحب سے خصوصی تعلق کا حال خوب معلوم تھا اسی لیے حضرت نے بے ساختہ فرما دیا تھا کہ وہاں ضرور گئے ہوں گے، میرے حضرت قدس سرہٗ کے حسنِ ظن اور شفقتوں کے قصے تو کئی یاد آئے مگر اس وقت تو مضمون کچھ اور چل رہا تھا۔

محدثین نے طالب حدیث کے آداب بہت کثرت سے لکھے ہیں جن کو یہ ناکارہ مقدمہ اوجز میں مختصر طور سے لکھ چکا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ طالب علم کے لیے سب سے پہلے جو چیز واجب ہے وہ تصحیح نیت ہے یعنی علم کے حاصل کرنے میں مقصود صرف اللہ کی رضا ہونی چاہیے اگر مدرسی کرے تو بھی پیسوں کی نیت سے نہ کرے بلکہ اشاعت علم کو اپنا مقصد سمجھنا چاہیے اور جو تنخواہ مل جائے اس کو اللہ کا عطیہ سمجھنا چاہیے، محدثین نے لکھا ہے کہ اغراض دنیا کی نیت سے علم حاصل کرنے سے بہت ہی زیادہ احتراز کرنا چاہیے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص علم دین کو دنیا کی غرض سے حاصل کرنا چاہے اس کو جنت کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔ حماد بن سلمہ کا مقولہ ہے:

’’جو حدیث پاک کو غیر اللہ کے لیے پڑھے وہ اللہ کے ساتھ مکر کرتا ہے اللہ جل شانہ سے کثرت سے توفیق اور اعانت علی الصواب والسداد کی دعاء کرتا رہے اور اخلاق حمیدہ اپنے میں پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کرتا رہے اور اس کے بعد انتہائی انہماک سے طلب علم میں مشغول ہو کسی دوسری طرف ذرا بھی توجہ نہ کرے۔

یحییٰ بن کثیر کا مقولہ ہے ’’بدن کی راحت کے ساتھ علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔‘‘

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’وہ شخص کامیاب نہیں ہے جو علم کو کاہلی اور لاپرواہی سے حاصل کرے بلکہ جو شخص نفس کی ذلت اور معاش کی تنگی کے ساتھ حاصل کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔‘‘

اور یہ تو مثل مشہور ہے ’’من طلب العلی سهر الليالی‘‘ جو اونچا مرتبہ حاصل کرنا چاہے وہ راتوں کو بیدار رہے اور طالب علم کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے استادوں کا نہایت احترام کرے۔ مغیرہ کہتے کہ ہم استاد سے ایسا ڈرتے تھے جیسے لوگ بادشاہ سے ڈرا کرتے ہیں، حدیث پاک میں بھی یہ حکم ہے کہ جن سے علم حاصل کرو ان سے تواضع سے پیش آؤ۔

اپنے شیخ کو سب سے فائق سمجھے، حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ ہے:

''جو اپنے استاد کا حق نہیں سمجھتا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا، استاد کی رضا کا ہر وقت خیال رکھے اس کی ناراضگی سے پرہیز کرے، اتنی دیر اس کے پاس بیٹھے بھی نہیں جس سے اس کو گراں ہو، استاد سے اپنے مشاغل اور جو پڑھنا ہے اس کے بارے میں خاص طور سے مشورہ کرتا رہے اس سے نہایت احتراز کرنا چاہیے کہ شرم اور کبر کی وجہ سے اپنے ہم عمر یا اپنے سے عمر میں چھوٹے سے علم حاصل کرنے میں پس و پیش کرے۔''

اصمعی کہتے ہیں:

''جو علم حاصل کرنے کی ذلت نہیں برداشت کرے گا، وہ عمر بھر جہل کی ذلت برداشت کرے گا۔''

یہ بھی ضروری ہے کہ استاد کی سختی کا تحمل و برداشت کرے یہ نہایت اختصار سے مقدمۃ اوجز سے چند اصول نقل کیے گئے ہیں اور یہ تو نہایت مشہور مقولہ اور نہایت مجرب ہے کہ استاد کی بے حرمتی سے علم کی برکات سے ہمیشہ محروم رہتا ہے اور والدین کی بے حرمتی کرنے والا روزی سے ہمیشہ پریشان رہتا ہے، لوگ آج کل بہت ہی بے روزگاری اور معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہیں، لیکن وہ غور کریں تو اپنی جوانی کے زمانہ میں والدین میں سے کسی کی بے حرمتی کی ہوگی، مجھے تو اس کا بہت تجربہ ہے، محدثین اپنے استاد کی جلالت شان پر بہت ہی زور دیتے ہیں۔

حضرت تھانوی کا ملفوظ آداب

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ افاضات یومیہ (حصہ نہم) میں فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے حدیث پڑھتا تھا تو اس زمانے میں حضرت مولانا گنگوہی کے یہاں بھی حدیث کا دورہ شروع ہو گیا اور طالب علم یہاں ٹوٹ ٹوٹ کر وہاں جانے لگے مگر مجھے الحمد للہ کبھی اس کا وسوسہ بھی نہیں ہوا کہ وہاں چلا جاؤں حالانکہ میرا یہ عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی مولانا محمد یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب سے علم و فضل میں بہت بڑھے ہوئے تھے لیکن باوجود اس کے جب کسی نے مجھ سے چلنے کے لیے کہا تو میں نے یہی جواب دیا کہ جس دن مولانا فرما دیں کہ میں نہیں پڑھاتا اس وقت کسی دوسرے کو ڈھونڈوں گا، بلا ضرورت مولانا کو نہیں چھوڑونگا۔ (اشرف السوانح)

میں نے اس واقعہ کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ بچپن میں جب کلام مجید حفظ فرما رہے تھے تو والد ماجد نے کسی وجہ سے حضرت والا کے استاد کو بدلنا چاہا، لیکن حضرت والا کسی طرح راضی نہ ہوئے

اور مچل گئے کہ نہیں میں تو ان ہی سے پڑھوں گا یہاں تک کہ والد صاحب مجبور ہو گئے اور انہیں استاد کو رکھنا پڑا۔

حکایات صحابہ میں لکھا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ جو استاد کی قدر نہیں کرتا وہ کامیاب نہیں ہوتا۔''

حکایات صحابہ میں بہت قصے علمی انہماک کے باب میں اساتذہ کی قدر اور علمی انہماک کے گزر چکے ہیں اس باب کو بھی طلبہ کو ضرور دیکھنا چاہیے۔

افاضات یومیہ میں دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ہم نے حضرت مولانا یعقوب صاحب کو چھوڑ کر مولانا گنگوہی کی خدمت میں جانے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ بڑے مدرس کو چھوڑ کر چھوٹے مدرس سے پڑھا اور سند ان سے بھی نہیں لی بلکہ جب سند فراغ اور دستار بندی کا وقت ہوا تو ہم لوگ یعنی جن جن کی جلسہ میں دستار بندی ہونی تجویز ہوئی تھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت ہم نے سنا ہے کہ جلسہ میں ہماری دستار بندی کی جائے گی اگر یہ حکم ہے تو ہمیں انکار نہیں اور اگر ہمارے اختیار کو بھی اس میں دخل ہے تو ہم باادب عرض کرتے ہیں کہ اسے موقوف فرمادیا جائے، اس واسطے کہ ہمیں کچھ آتا جاتا تو ہے نہیں، مدرسہ کی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کی دستار بندی کی گئی تو لیجئے ہم سند کے لیے تو کیا کہتے، کہا تو یہ کہا اور ملتی ہوئی دستار بندی کو اپنی طرف سے روک دیا اور یہ نہیں کہ تکلف سے بلکہ سچے دل سے۔

جب ہم لوگوں نے یہ کہا تو مولانا کو جوش آ گیا اور فرمایا:

''کون کہتا ہے کہ لیاقت نہیں، اس کو تم جانو یا ہم جانیں، ہم اساتذہ کے سامنے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اور تم لوگوں کو یہی سمجھنا چاہیے ورنہ قسم خدا کی جہاں جاؤ گے تم ہی تم ہو گے میدان خالی ہے۔''

یہ فقرہ کہ میدان خالی ہے کئی بار فرمایا، اب ڈر کے مارے بولے نہیں کہ کہیں مولانا خفا نہ جائیں، ہم لوگ مولانا سے ڈرتے بہت تھے پھر مولانا نے یہ تماشہ کیا کہ عین جلسہ میں فرمایا:

''ہم نے ان لوگوں کو قرآن وحدیث، فقہ، فلسفہ، منطق وغیرہ اتنے فنون میں فارغ کر دیا ہے اور ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ یہ ان فنون میں صاحب کمال ہو گئے ہیں، اگر کسی کو ان کے فضل وکمال میں شک ہو تو وہ جس فن میں چاہیں اسی جلسہ میں ان کا امتحان لے لیں''۔

لو صاحب! ہم تو دستار بندی ہی سے ڈر رہے تھے اور اس کو ملتوی کرنے کی درخواست کی تھی، یہاں مولانا نے علی الاعلان برسر جلسہ فرمادیا کہ جو چاہے اس وقت ان کا امتحان لے لے، مگر صاحب! ان حضرات کی ہیبت ایسی تھی کہ کسی کی مجال نہ تھی جو ہم سے سوال کرتا اور محض اہلیت ہی نہیں بلکہ سب کو یقین تھا کہ جیسا مولانا فرما رہے ہیں یہ ویسے ہی ہوں گے، کسی نے امتحان کی

درحقیقت کوئی ضرورت ہی نہ سمجھی اور اس موقع پر بھی ہمیں کوئی سند نہیں دی گئی، بس یہ دستار سند تھی اس کے بعد جب پڑھانے کا وقت آیا تو اول ہی میر زاہد امور عامہ کا سبق میرے ذمہ ہوا، دوپہر کو مطالعہ جو کیا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا دعاء کی، اے اللہ میاں! استاذ تو موجود نہیں، اگر یہ مقام حل نہ ہوا تو پڑھاتے وقت بڑی ذلت ہوگی، پھر ظہر کی نماز پڑھ کر جو مطالعہ کرنے بیٹھا ہوں تو کتاب بس پانی تھی۔ پھر خدا کے فضل سے ایسی طبیعت کھلی کہ اس زمانہ میں کانپور میں بڑے بڑے فضلاء موجود تھے اور کئی مدرسے تھے اور بعض طلبہ مشترک بھی تھے، کسی کو یہ پتہ نہ چلا کہ اس کو کچھ آتا نہیں، ہاں یہ رکاوٹ تو کچھ دن رہی کہ طلبہ کہتے تھے کہ یہ بہت کم عمر ہے اس سے پڑھنے میں عار معلوم ہوتی ہے بس سات آٹھ طالب علموں کو لے کر بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی کم عمر سمجھ کر پڑھتا ہی نہ تھا، پھر جو ڈاڑھی بڑی ہوئی، طالب علموں کی تعداد بھی بڑھنے لگی، بس پھر طالب علم خوب آنے لگے، پھر تو یہ حالت تھی کہ خدا کے فضل اور بزرگوں کی دعاء سے جس نے مجھ سے ایک بار بھی پڑھ لیا پھر کبھی اس نے کسی دوسرے سے پڑھنا پسند نہ کیا۔

حضرت مولانا محمود حسن صاحب فرماتے تھے کہ میں بارہا گنگوہ حاضر ہوا اور جی میں بھی آیا کہ حضرت مولانا سے عرض کروں کہ مجھے بھی حدیث کی سند دیجئے، لیکن کبھی اس درخواست کی ہمت ہی نہ پڑی، جب اس نیت سے گیا تو یہی خیال ہوا کہ تو یہ تمنا لے کر تو جاتا ہے، لیکن تجھے کچھ آتا جاتا بھی ہے، بارہا خیال ہوا کہ عرض کروں کہ سب کو حضرت سند دیتے ہیں مجھے بھی دے دیجئے، مگر پھر خیال ہوا کہ مولانا پوچھ بیٹھیں کہ تجھے کچھ آتا بھی ہے جو سند لیتا ہے تو کیا جواب دوں گا، اس لیے کبھی اس درخواست کی ہمت ہی نہ ہوئی، حالانکہ مولانا دیوبندی ہندوستان میں حدیث کے اندر بے نظیر تھے تو جناب ہم نے تو وہ وقت دیکھا ہے، اب یہ کہ درخواستیں کرتے ہیں کہ ہمیں سند دے دو، جس نے وہ زمانہ دیکھا ہو بھلا اس کو ایسی باتوں کا کیونکر تحمل ہو۔

شمرد ایک فرانسیسی تھا اس کی ایک بیگم تھی جس کا امراء میں بڑا درجہ تھا، یہاں تک کہ اس کے پاس مثل والیان ملک کے فوج بھی تھی، میرٹھ میں جو بیگم کا پل مشہور ہے وہ بھی اسی کا بنوایا ہوا ہے، اس کی ایک کوٹھی تھی جو فرانسیسی وضع پر بنی ہوئی تھی، وہ اپنے ملازموں کی بڑی قدر دان تھی، وہ کہا کرتی تھی کہ میں تمہیں ایسا کر کے چھوڑوں گی کہ تم کہیں کے نہیں رہو گے، تمہیں کوئی بھیک بھی نہیں دے گا، وہ کہتے کہ حضور اتنی عنایت کرتی ہیں اور حضور کے یہاں ہم تعلیم یافتہ ہے تو ہمیں ملازمت کی کیا کمی۔ وہ کہتی کہ دیکھ لینا۔ چنانچہ یہ دیکھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ملازم کسی اور کسی کی ملازمت نہ کر سکے۔ نہ دیسا کوئی قدر دان ملا نہ نوکری کر سکے۔ اس کے مرنے کے بعد وہ لوگ واقعی بھوکے مرے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی ہمیں اس طرح نکما کر دیا۔ اب کوئی پسند ہی نہیں آتا۔

اب لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے تم بھی بدل جاؤ۔ بھائی ہم سے تو اب بدلا نہیں جاتا تمہیں اختیار ہے کسی نے کہا ہے:

زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ بساز

زمانہ بدل گیا ہے تو بھی بدل جا، لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں:

زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ مساز

اور زمانہ کیا بدلتا اگر در حقیقت دیکھا جائے تو زمانہ ہمارا تابع ہے۔ ہم ہی تو زمانہ کو بدلتے ہیں زمانہ بیچارہ ہمیں کیا بدلے گا۔ جب ہم اپنے آپ کو بدل دیتے ہیں تب ہی زمانہ بدلتا ہے۔ زمانہ ہم سے علیحدہ کوئی چیز تھوڑا ہی ہے تو جب زمانہ کو ہم خود بدل سکتے ہیں تو ہم اس کو محفوظ بھی کر سکتے ہیں یہ اکبر حسین جج کا نکتہ ہے۔ بڑی اچھی بات ہے، کہتے تھے کہ لوگ زمانہ کی برائی کرتے ہیں کہ بھائی کیا کریں زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ جب تم سب بدل گئے تو یہی زمانہ کا بدلنا ہو گیا۔ زمانہ کوئی مستقل چیز تھوڑا ہی ہے، زمانہ تو تم خود ہو واقعی سچ کہا ہے، زمانہ کی حقیقت تو خود ہم ہی ہیں، ہم اگر نہ بدلیں تو زمانہ بھی نہ بدلے۔ کیا اچھی بات کہی، بڑا حکیمانہ دماغ تھا۔ فقط

میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا بھی اصول اپنی تبلیغ میں یہی تھا کہ تم ماحول کے تابع مت بنو، ماحول کو اپنے تابع بناؤ، تم دنیاداروں اور بے دینوں کی روش پر نہ چلو، اپنی روش پر مضبوط جمے رہو، ماحول اپنے آپ بدل جائے گا، اللہ پاک کا بھی ارشاد سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے "لا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ" [الآیۃ] ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھئے، جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ دنیوی زندگی کی رونق ہے اور آپ کے رب کا عطیہ بدرجہا بہتر ہے اور دیرپا ہے۔

(ترجمۃ حکیم الامۃ)

ہمارے اجداد میں مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی مشہور اکابر علماء میں ہیں، جن کی ولادت ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم تو اپنے اعمام واجداد سے حاصل کی اور ۱۲۴۷ھ میں تکمیل کے لیے دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی، مفتی صدر الدین صاحب وغیرہ اکابر سے تکمیل علم دین کی، طلب علم کا اتنا شوق تھا کہ مفتی صدر الدین صاحب نے ان کی درخواست پر وقت نہ ہونے کا عذر کر دیا، لیکن مولانا کے شدید اصرار پر مفتی صاحب نے یہ کہا کہ کچہری جاتے آتے وقت مل سکتا ہے، مولانا نور الحسن صاحب نے اس کو قبول کیا اور جب مفتی صاحب پالکی میں کچہری تشریف لے جاتے تو مولانا پالکی کے ساتھ دوڑتے ہوئے سبق پڑھتے جاتے اور کچہری جانے پر مولانا وہیں انتظار میں بیٹھے رہتے اور جب واپس

آتے تو واپسی میں بھی اسی طرح پالکی کے ساتھ دوڑتے ہوئے سبق پڑھتے۔

مفتی صاحب نے کئی مہینے جب اس شوق اور طلب کو دیکھا تو مستقل وقت تجویز کردیا، کچھ دنوں بعد انگریزی ملازمت، پھر ریاست الور کی ملازمت کے بعد اپنے وطن کاندھلہ تشریف لے آئے اور اپنے گھر کے قریب متصل مسجد میں درس جاری کردیا طلبہ کا ہجوم شروع ہوگیا، طلبہ کا کھانا بھی مولانا کے گھر سے آتا تھا اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ گھر کا کھانا طلبہ میں تقسیم ہوگیا اور گھر کے لوگ بھوکے رہ جاتے تھے۔

ایک مرتبہ سورت کے رئیس مولوی محمد سورتی شہرت سن کر تشریف لائے کئی نوکر اور بہت کچھ سامان ان کے ساتھ تھا نہایت شان وشوکت کا ایک عمدہ مکان کرایہ پر لے کر رہائش کا انتظام کیا اور روزانہ لباس بدل کر سبق کے لیے آتے ملازم کتاب لیے ساتھ ہوتا تھا اسی طرح چند روز گزرے۔

حضرت مولانا نور الحسن نے جب ان کو ذکی اور ہونہار پایا تو ایک دن فرمایا کہ صاحبزادے! باپ کی دولت اس طرح ضائع نہ کرو، اگر علم حاصل کرنا ہے تو یہ کپڑے اور پیالہ لو اور مسجد میں دیگر طلبہ کے ساتھ رہو، کھانا دونوں وقت گھر سے مل جایا کرے گا، اگر یہ نہیں ہوسکتا تو بے کار وقت اور دولت ضائع نہ کرو اس شان وشوکت کے ساتھ علم دین کی دولت ہاتھ نہیں آسکتی، انہوں نے پیالہ اور کپڑے ہاتھ میں لیے اور مسجد میں جا کر لباس کو تبدیل کیا اور ملازمین اور تمام سامان کو گھر واپس کردیا، پھر چند سال رہ کر تکمیل تعلیم کی

(منقول از رسالہ مشائخ کاندھلہ: ص ۱۵۰ مصنف مولوی احتشام الحسن مرحوم)

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حیدرآباد کے دو نواب زادے پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے، حضرت کبھی کبھی ان سے پاؤں دبوایا کرتے تھے، ایک بار فرمایا:

"مجھ کو تو اس کی ضرورت نہیں کہ ان سے پاؤں دبواؤں مگر علم اسی طرح آتا ہے۔"

(ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۷۶)

علم تو یقیناً اسی طرح حاصل ہوتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی مشہور سجادہ اپنے ابتدائی زمانہ میں میرے والد صاحب قدس سرہٗ سے پڑھنے کے لیے گنگوہ گئے تھے، میرے والد صاحب کے انتقال پر انہوں نے اپنے رسالہ منادی میں بہت طویل مضمون تعزیت کا لکھا تھا۔ جو میرے حجرہ کے جنگل میں کہیں محفوظ بھی ہوگا۔ انہوں نے بھی لکھا تھا کہ استاد نے میری سجادگی توڑنے کے لیے ایک پیالہ مجھے دیا ایک صاحب کے گھر کھانا مقرر کردیا اور حکم تھا کہ دونوں وقت خود جا کر لایا کرو۔ یہ بھی

لکھا تھا کہ استاد کے مسواک مارنے کے نشانات اب تک بھی شاید میرے بازوؤں پر ہوں کہ وضو کرتے ہوئے سبق پڑھایا کرتے تھے اور غلطی پر مسواک بازو پر مارا کرتے تھے اور بھی کئی واقعے تھے جو اس وقت یاد نہیں۔ کہیں رسالہ شاہد یا عزیزان مولوی عاقل و مولوی سلمان نے نکال دیا تو اور بھی واقعات مل جائیں گے۔

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا قصہ تو بہت مشہور ہے کہ بخارئی کے امیر (گورنر) نے امام بخاری سے درخواست کی کہ وہ اس کے گھر جا کر اس کو اور اس کی اولاد کو حدیث پڑھایا کریں۔ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سے انکار کر دیا کہ میں حدیث پاک کے علم کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا۔ جس کو پڑھنا ہے، میری مجلس میں آجایا کرے۔ اس پر امیر بخارئی نے دوسری درخواست کی کہ میری اولاد کے لیے کوئی مخصوص وقت مقرر کر دیں، جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔ امام بخاری نے اس سے بھی انکار کر دیا کہ میں کسی قوم کے لیے وقت خاص نہیں کر سکتا، جس میں کوئی دوسرا شریک نہ ہو۔ اس پر امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا بخارئی سے اخراج کیا گیا۔

(مقدمہ لامع)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی اس قسم کا واقعہ مشہور ہے کہ ہارون رشید نے ان کی خدمت میں ایک درخواست کی تھی کہ حریم خلافت میں قدم رنجہ فرما کہ شہزادوں کو علم حدیث پڑھا دیں۔ ''امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہلا بھیجا کہ علم کے پاس لوگ خود آتے ہیں، وہ دوسروں کے پاس نہیں جاتا''۔ انہوں نے اس بات سے ہارون کو اور بھی غیرت دلائی کہ ''یہ علم تمہارے گھر سے نکلا ہے اگر تم ہی اس کی عزت نہ کرو گے تو وہ کیوں کر عزت پا سکتا ہے''۔

اس معقول جواب کو ہارون نے نہایت خوشی سے تسلیم کیا اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امام موصوف کی درسگاہ عام میں حاضر ہوں۔ (تذکرہ دیوبند)

مقدمہ اوجز میں یہ قصہ اس طرح نقل کیا گیا کہ اول ہارون رشید نے مالک رحمہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ اس کے گھر جا کر پڑھایا کریں۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ہارون رشید مع اپنی اولاد کے امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی مجلس درس میں حاضر ہوا اور یہ درخواست کی کہ ہارون اور اس کی اولاد کے لیے مخصوص مجلس فرما دیں کہ اور کوئی شریک نہ ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ فرمایا: ''جب عوام کو خواص کی وجہ سے روکا جائے گا تو خواص کو بھی فائدہ نہیں ہوگا۔'' (مقدمہ اوجز ملخصاً)

مشائخ کاندھلہ میں حضرت مولانا نور الحسن صاحب کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے:

''حضرت مولانا نور الحسن صاحب کے حلقۂ درس میں جنات بھی شریک ہوتے تھے ایک مرتبہ

بعد مغرب ایک طالب علم کمرہ میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا کہ چراغ گل ہوگیا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ جاؤ اس کو مسجد کے چراغ سے جلالاؤ، اس نے چراغ ہاتھ میں لیا اور وہیں کمرہ سے ہاتھ بڑھا کر مسجد کے چراغ سے روشن کیا۔ حضرت مولانا نے اس کو خوب سرزنش کی اور کہا کہ اگر کوئی دوسرا اس حرکت کو دیکھ لیتا تو ڈر جاتا۔ آیندہ اس قسم کی حرکت سے منع فرمایا۔"

(از زکریا) جنات کے واقعات تو ہمارے خاندانوں میں بہت کثرت سے علی التواتر مشہور ہیں اور بڑے عجیب قصے ہیں۔ یہاں تو بے محل ہو جائیں گے کہیں موقع ملا تو بیسیوں قصے تو مجھے بھی یاد ہیں۔

حضرت مولانا نورالحسن صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی اور بہت معروف کہ وہ بیک وقت کئی کام کیا کرتے تھے۔ بائیں ہاتھ سے تسبیح پڑھتے رہتے تھے، داہنے ہاتھ سے کتاب نقل کرتے رہتے تھے، ان کی لکھی ہوئی کتابیں ہمارے جدی کتب خانہ میں بہت تھیں۔ سامنے شاگرد سبق پڑھتے رہتے تھے۔ اس درمیان میں لوگ ملنے جلنے والے آتے رہتے تھے کوئی مسئلہ پوچھتا، کوئی اور بات دریافت کرتا تھا اس کے جواب ساتھ ساتھ نمٹاتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا کی تصانیف بھی بہت مختلف فنون میں ہیں۔ جن کی تفصیل مشائخ کاندھلہ میں ہے۔ ۱۱محرم الحرام بروز سہ شنبہ بوقت شام ۱۲۸۵ھ کو وفات پائی۔ اللّٰھم اغفر له وارحمه و نور مرقدهٗ

طالبِ حدیث کے آداب اور اس سلسلے کے اکابر کے واقعات

اشرف السوانح جلد ۱ صفحہ ۷۴ میں لکھا ہے کہ حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ اپنے تجربہ کی بناء پر طلبہ کو یہ ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ تم تین باتوں کا التزام کرلو پھر میں ٹھیکہ لیتا ہوں اور ذمہ دار ہوتا ہوں کہ تمہیں استعداد علمی حاصل ہوجائے گی۔ اول یہ کہ جو سبق پڑھنا ہو اس کا مطالعہ ضرور کرلیا جائے اور مطالعہ کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ مطالعہ کا مقصود صرف یہ ہے کہ معلومات اور مجہولات متمیز ہوجائیں بس اس سے زیادہ کاوش نہ کرے پھر سبق کو استاد سے اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لے بلا سمجھے آگے نہ چلے۔ اگر اس وقت استاد کی طبیعت حاضر نہ ہو تو پھر کسی دوسرے وقت سمجھ لے اس کے بعد ایک بار خود بھی مطلب کی تقریر کرے بس ان تینوں التزامات کے بعد پھر بے فکر رہے چاہے یاد رہے یا نہ رہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ استعداد ضرور پیدا ہوجائے گی۔ یہ تینوں باتیں تو درجہ وجوب میں ہیں اور ایک بات درجہ استحباب میں ہے وہ یہ کہ کچھ آموختہ بھی روزانہ دہرالیا کرے۔

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے نظام تعلیم و تربیت صفحہ ۳۹۴ میں اکابر کے درس و تدریس کے واقعات کثرت سے لکھے ہیں۔ اس میں لکھتے ہیں کہ ایک سید میر اسماعیل بلگرامی

مختلف حلقۂ درس سے استفادہ کرتے ہوئے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی خدمت میں پہنچے اور استاد سے عرض کیا کہ مجھے کوئی وقت دیا جائے انہوں نے فرمایا کہ مستقل وقت تو ہے نہیں فلاں طالب علم کے سبق میں شریک ہوجایا کریں اور اس کو سنتے رہا کریں۔ چند ہفتے گزر گئے۔ میر اسماعیل نے کوئی سوال اعتراض وغیرہ استاد سے نہ کیا۔ جو زمانہ کے اعتبار سے بہت بعید چیز تھی۔ اس زمانہ کی طرح سے یہ طریقہ تو تھا نہیں کہ استاد تقریر کرتا رہے اور طالب علم سننے والوں کی صورت بنا کر بیٹھا رہے۔ استاد کے لیے نووارد طالب علم کا یہ رویہ ناقابل برداشت تھا اس لیے ملا عبدالحکیم نے شاگرد سے مطالبہ کیا کہ زمانہ گزر گیا، تمہاری طرف سے کوئی سوال واعتراض نہیں ہوا؟

شاگرد نے عرض کی کہ مجھے سبق سننے کی اجازت ہوئی تھی بولنے کی نہیں۔ اگر فقیر کے لیے جو بلگرام سے صرف آپ سے پڑھنے کے لیے سیالکوٹ آیا تھا۔ کچھ وقت تجویز فرمائیں احسان ہوگا، استاد نے کہا کہ آج کل عصر سے مغرب تک درمیان میں کچھ وقت مل سکتا ہے فقط۔ ان اکابر کے یہاں کچھ چار، چھ گھنٹے کی پابندی نہیں تھی، شاید آپ بیتی میں کسی جگہ لکھا جاچکا ہے کہ میرے چچا جان کے یہاں عزیز یوسف مرحوم اور ان کی جماعت کے لیے مستدرک کا وقت صبح کی اذان کے بعد تھا اور میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہ کے یہاں تو ہر وضو کے ساتھ ایک مستقل سبق ہوتا تھا۔

مولانا مناظر احسن صاحب شاہ عبدالحق صاحب کے متعلق نظام تعلیم وتربیت صفحہ ۲۰۴ میں لکھتے ہیں کہ جب مطالعہ کرتے ہوئے آدھی رات سے زیادہ گزر جاتی تو والد صاحب از راہ شفقت فرماتے تھے بابا کیا کررہے ہو، میں جلدی سے لیٹ کر کہتا کہ سویا ہوا ہوں کیا ارشاد ہے، اس کے تھوڑی دیر بعد اٹھ جاتا اور پھر مطالعہ میں لگ جاتا، شیخ نے یہ بھی لکھا کہ چراغ بعض مرتبہ میری دستار اور بال میں لگ جاتا اور مجھے پتہ نہیں چلتا۔

حضرت سلطان نظام الدین کے متعلق لکھا ہے کہ طلب علمی کے زمانہ میں اساتذہ سے سوال و جواب کی وجہ سے ان کا نام نظام الدین بحاث پڑ گیا تھا، دوسری جگہ صفحہ ۴۶۰ پر سلطان المشائخ کے طالب علمی کا حال لکھتے ہیں کہ میں خود نے اپنی دادی کی روایت سے نقل کیا کہ سلطان المشائخ جب بابا فرید الدین سے عوارف وغیرہ پڑھتے تھے، عمر بیس سال کی تھی تو میں نے دیکھا کہ سلطان المشائخ کے کپڑے بالکل گندے ہوگئے ہیں، میری دادی سے ان کا حال نہ دیکھا گیا انہوں نے اصرار کیا کہ تمہارے کپڑے بہت گندے اور بوسیدہ ہوگئے ہیں، اگر آپ دے دیں تو میں اس کو دھو دوں اور پیوند لگا دوں۔ اول تو انہوں نے مانا نہیں، بڑی منت سماجت کے بعد راضی ہوئے تو دادی نے اپنی چادر دے دی تاکہ وہ اوڑھ لیں اور دادی نے دھو کر پیوند لگا کر دیے، سلطان المشائخ کے پاس دوسرا جوڑا بھی نہیں تھا جس کو وہ پہن لیتے اتنی دیر میری دادی کی چادر اوڑھے رہے، ایک

کتاب لے کر کونہ پر چلے گئے اور جب تک کپڑے دھلے اور پیوند لگے کتاب دیکھتے رہے۔

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی شاہ عبد القادر صاحب سے حدیث پڑھتے تھے۔ شاہ صاحب بڑے صاحب کشف تھے، اس خاندان میں آپ کا کشف سب سے بڑا ہوا تھا، جس روز مولوی فضل حق صاحب کسی ملازم پر کتابیں رکھوا کر لے جاتے گو پہنچنے سے پہلے خود لے لیتے شاہ صاحب کو کشف سے معلوم ہو جاتا تھا اسی روز مولوی صاحب کو سبق نہیں پڑھاتے تھے اور جب خود لے جاتے حضرت کو کشف ہو جاتا اس روز سبق پڑھاتے۔

(ارواح ثلاثہ: ص ۵۷)

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سفرِ حج میں تھے، اس سفر میں آپ کا جہاز ایک بندرگاہ پر ٹھہر گیا مولانا کو معلوم ہوا کہ یہاں جہاز چند روز قیام کرے گا چونکہ آپ کو معلوم ہوا کہ یہاں سے قریب کسی بستی میں ایک بہت معمر عالم اور محدث رہتے ہیں۔ اس لیے جہاز سے اتر کر ان کی خدمت میں روانہ ہو گئے جب ان کی خدمت میں پہنچے اور گفتگو ہوئی تو مولانا کو ان کی شہرت علم کی تصدیق ہو گئی اور آپ نے ان سے حدیث کی سند کی درخواست کی ان عالم صاحب نے دریافت کیا کہ تم نے کس سے حدیث پڑھی ہے، مولانا نے فرمایا شاہ عبد الغنی صاحب سے وہ عالم شاہ عبد الغنی صاحب کو نہ جانتے تھے، اس لیے دریافت کیا کہ شاہ عبد الغنی صاحب نے کس سے پڑھی ہے مولانا نے فرمایا شاہ اسحاق صاحب سے وہ شاہ اسحاق صاحب سے بھی واقف نہ تھے اس لیے پوچھا کہ شاہ اسحاق صاحب نے کس سے پڑھی ہے، مولانا نے فرمایا شاہ عبد العزیز صاحب سے، وہ شاہ عبد العزیز صاحب سے واقف تھے، جب ان کا نام سنا تو فرمایا کہ اب میں تم کو سند دوں گا اور یہ بھی فرمایا:

''شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے۔''

پس جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کی شاخیں نہیں ہیں وہاں جنت نہیں، یوں ہی جہاں شاہ ولی اللہ کا سلسلہ ہے وہاں جنت ہے اور جہاں ان کا سلسلہ نہیں وہاں جنت نہیں، اس کے بعد انہوں نے مولانا کو حدیث کی سند دے دی۔ خان صاحب نے فرمایا کہ یہ قصہ خود میں نے حضرت مولانا نوتوی سے بھی سنا ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے حاشیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ باوجود کامل ہونے کے دوسرے اہل کمال سے استفادہ فرمانا کمال تواضع وحرصِ دین کی دلیل ہے۔'' وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون '' ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۲۰۷، حضرت شیخ کا طوبیٰ سے تشبیہ دینا بالکل صحیح ہے، میں نے اپنے ابتدائی مدرسے میں ۴۰ ھ میں جہاں تک یاد ہے چالیس سے زیادہ جوابی کارڈ مختلف مدارس

میں لکھے تھے، چاہے وہ اہل حدیث کا ہو یا اہل بدعت کا ہو، کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو، مجھے غیر منقسم ہندوستان میں اس وقت کوئی شیخ الحدیث ایسا نہیں ملا تھا جس کا سلسلہ سند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے بچ کر نکلا ہو۔ یہ تو کثرت سے ملا کہ ایک سند شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے سلسلہ کی اور دوسری سند دوسرے سلسلہ کی اس طرح خود میرے شیخ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہ کی متعدد اسانید ہیں جو مقدمہ اوجز میں تفصیل سے ذکر کی گئی ہیں، حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کی بھی متعدد سندیں ہیں جیسا کہ الیانع الجنی میں ہے، لیکن کوئی ایسا شیخ غیر منقسم ہندوستان میں مجھے نہیں ملا جس کی کسی سند میں حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نہ آتے ہوں حضرت دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے طلبہ کے متعلق تین اصول بہت ہی تفصیل سے لکھوائے ہیں کئی صفحوں پر ہیں ان کا بعینہ نقل کرانا تو بہت مشکل ہے کہ بہت طویل ہیں مگر اس قابل ہیں کہ ہر طالب علم کو دیکھنا چاہیے۔

وہ حضرت دہلوی کے مرض الوصال کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ آج بتاریخ ۲ جمادی الاولیٰ ۶۳ ۱۳ھ بروز چہار شنبہ رات میں دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی ایک جماعت آئی۔ رات بوقتِ عشاء حضرت کو اسہال کا ایک دورہ ہوگیا تھا، جس سے ضعف انتہا کو پہنچا ہوا تھا بات کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ بعد نمازِ فجر خاکسار مرتب کو بلایا اور ارشاد فرمایا کان بالکل میرے لبوں سے لگا دو اور سنو! یہ طلبہ اللہ کی امانت اور اس کا عطیہ ہیں، ان کی قدر اور اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ ان کا وقت ان کی حیثیت کے مناسب پورے اہتمام میں کام میں لگایا جائے اور ذرا سا وقت بھی ضائع نہ جائے۔ یہ بہت کم وقت لے کر آئے ہیں، پہلے میری دو تین باتیں انہیں پہنچا دو۔

(۱)......اپنے تمام اساتذہ کی توقیر اور ان سب کا ادب واحترام آپ کا خصوصی اور امتیازی فریضہ ہے۔ آپ کو ان کی ایسی تعظیم کرنی چاہیے جیسی کہ ائمہ دین کی کی جاتی ہے، وہ آپ لوگوں کے لیے علم نبوی کے حصول کا ذریعہ ہیں اور جس شخص نے کسی کو دین کی ایک بات بھی بتلائی، وہ اس کا مولیٰ ہو جاتا ہے، پھر علم دین کے مستقل اساتذہ کو جو حق ہے، وہ سمجھا جا سکتا ہے بلکہ اگر ان کے درمیان کچھ نزاعات بھی ہوں تب بھی ادب اور تعظیم کا تو تعلق سب کے ساتھ یکساں رہنا چاہیے خواہ محبت کسی کے ساتھ کم اور کسی کے ساتھ زیادہ ہو لیکن عظمت میں فرق نہیں آنا چاہیے اور دل میں ان کی طرف سے بدی نہ آنا چاہیے۔

قرآن مجید نے تو ہر مومن کا یہ حق بتایا ہے کہ ان کی طرف سے اپنے دلوں کے صاف رہنے کی اللہ تعالیٰ سے دعاء کی جایا کرے۔ فرمایا ''وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا '' (اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کا کینہ) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے'' لا

یبلغنی احد عن احد شیئاً فانی أحب ان اخرج الیکم وا نا سلیم الصدر "(تم میں سے کوئی مجھے ایک دوسرے کی باتیں نہ پہنچایا کرے میں چاہتا ہوں کہ میں جب تمہارے پاس آؤں تو میرا سینہ سب کی طرف سے صاف ہو۔)

(۲)......علمِ دین کے اساتذہ کے حقوق کا معاملہ اور بھی زیادہ نازک ہے توان طلبہ کو میرا ایک پیغام تو یہ پہنچاؤ کہ اپنی زندگی کے اس پہلو کی اصلاح کی یہ خاص طور سے فکر کریں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "علم لا ینفع" سے پناہ مانگی اور اس کے علاوہ بھی عالم بے عمل کے لیے جو سخت وعیدیں قرآن وحدیث میں آئی ہیں وہ آپ کے علم میں ہیں۔

(۳)......تیسری بات ان طلبہ سے یہ کہی جائے کہ ان کا وقت بڑا قیمتی ہے اور وہ بہت تھوڑا وقت لے کر آئے ہیں۔ لہٰذا اس کا ایک لمحہ بھی یہاں ضائع نہ کریں بلکہ یہاں کے اصولوں کے مطابق تعلیم و مذاکرہ کے کاموں میں لگے رہیں۔ اھ مختصراً (ملفوظات حضرت دہلوی: ص ۱۲۷)

بہت طویل مضمون ہے اور بہت اہم۔ اعتدال میں بھی اس مضمون پر بہت طویل کلام لکھا ہے اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ طے شدہ امر ہے اور عادت اللہ ہمیشہ سے یہی جاری ہے کہ اساتذہ کا احترام نہ کرنے والا کبھی بھی علم سے منتفع نہیں ہوسکتا۔ جہاں کہیں ائمہ فن طالب علم کے اصول لکھتے ہیں، اس چیز کو نہایت اہتمام سے ذکر فرماتے ہیں اور محدثین نے تو مستقل طور پر آداب طالب کا باب ذکر کیا ہے جو اوجز المسالک کے مقدمہ میں مفصل مذکور ہے اس میں اس چیز کو خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

امام غزالی علیہ الرحمۃ نے بھی "احیاء العلوم" میں اس پر مفصل بحث فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ استاد کے ہاتھ میں کلیۃ اپنی بات دے دے اور بالکل اسی طرح انقیاد کرے جیسا کہ بیمار مشفق طبیب کے سامنے ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: "جس نے مجھے ایک حرف پڑھا دیا میں اس کا غلام ہوں۔ چاہے وہ مجھے فروخت کردے یا غلام بنادے"۔

علامہ زرنوجی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "تعلیم المتعلم" میں لکھا ہے کہ میں طلبہ کو دیکھتا ہوں کہ وہ علم کے منافع سے بہرہ یاب نہیں ہوتے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کے شرائط اور آداب کا لحاظ نہیں رکھتے اسی وجہ سے محروم رہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے ایک مستقل فصل اساتذہ کی تعظیم کے ضروری ہونے میں لکھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں طالب علم علم سے منتفع ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ علم اور علماء اور اساتذہ کا احترام نہ کرے۔ جس شخص نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ احترام سے کیا ہے اور جو گرا ہے وہ بے حرمتی سے گرا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ آدمی گناہ سے کافرنہیں ہوتا دین کے کسی جزو کی بے حرمتی کرنے سے کافر ہوجاتا ہے۔''
''ونعم ما قیل'':

از خدا خواہیم توفیق ادب
بے ادب محروم گشت از فضل رب

ہم اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں کہ بے ادب اللہ کے فضل سے محروم ہوتا ہے۔ ادب تاجیست از فضل الٰہی، بنہ برسر برو ہر جا کہ خواہی۔ یعنی ادب فضل خداوندی کا ایک زبردست تاج ہے، اس کو سر پر رکھ کر جہاں چاہے چلتے جاؤ اور یہ مثل تو مشہور ہے، باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔

امام سعد الدین شیرازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
''میں نے مشائخ سے سنا ہے جو شخص یہ چاہے کہ اس کا لڑکا عالم ہوجائے اس کو چاہیے کہ علماء کا اعزاز و اکرام بہت کرتا رہے اور ان کی خدمت کثرت سے کرے اگر بیٹا عالم نہ ہوا تو پوتا ضرور عالم ہوجائے گا۔''

امام شمس الائمہ حلوانی کا قصہ مشہور ہے کہ وہ کسی ضرورت سے کسی گاؤں میں تشریف لے گئے۔ وہاں جتنے شاگرد تھے وہ استاد کی خبر سن کر زیارت کے لیے حاضر ہوئے مگر قاضی ابوبکر حاضر نہ ہوسکے۔ بعد میں جب ملاقات ہوئی تو استاد نے دریافت کیا۔ انہوں نے والدہ کی کسی ضروری خدمت بجالانے کا عذر کیا۔ شیخ نے فرمایا:
''رزق میں وسعت ہوگی مگر رونقِ درس حاصل نہ ہوگی۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ویسے بھی عام طور سے مشہور ہے کہ والدین کی خدمت رزق میں زیادتی کا سبب ہوتی ہے اور اساتذہ کی خدمت علم میں ترقی کا۔

میرا تو تجربہ یہاں تک ہے کہ انگریزی طلبہ میں بھی جو لوگ طالب علمی میں اساتذہ کی مار کھاتے ہیں، وہ کافی ترقیاں حاصل کرتے ہیں۔ اونچے اونچے عہدوں پر پہنچتے ہیں۔ جس غرض سے وہ علم حاصل کیا تھا، وہ نفع پورے طور پر حاصل ہوتا ہے اور جو اس زمانہ میں استادوں کے ساتھ نخوت و تکبر سے رہتے ہیں، وہ بعد میں اپنی ڈگریاں لیے ہوئے سفارشیں ہی کراتے ہیں۔ کہیں اگر ملازمت مل بھی جاتی ہے تو آئے دن اس پر آفات ہی رہتی ہیں۔ بہرحال جو علم بھی ہو اس کا کمال اس وقت تک ہوتا ہی نہیں اور اس کا نفع حاصل ہی نہیں ہوتا، جب تک کہ اس فن کے اساتذہ کا ادب نہ کرے چہ جائیکہ ان سے مخالفت کرے۔

کتاب ''ادب الدنیا والدین '' میں لکھا ہے کہ طالب علم کے لیے استاد کی خوشامد اور اس کے سامنے تذلّل (ذلیل بننا) ضروری ہے۔ اگر ان دونوں چیزوں کو اختیار کرے گا نفع کمائے گا اور دونوں کو چھوڑ دے گا تو محروم رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ طلبِ علم کے سوا کسی چیز میں خوشامد کرنا مومن کی شان نہیں ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''میں طالب علم ہونے کے وقت ذلیل بنا تھا اس لیے مطلوب ہونے کے وقت عزیز بنا''۔

بعض حکیموں کا قول نقل کیا ہے:

''جو طلبِ علم کے تھوڑی سی ذلت کو برداشت نہیں کرتا ہمیشہ جہل کی ذلت میں رہتا ہے۔''

(اعتدال: ص ۳۸)

اعتدال میں دوسری جگہ یہ ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ طالبِ علم کے لیے بہت سے آداب وشرائط ہیں ان میں سے اہم اور اصل اصول دس ہیں ان کے منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو کسی دوسری چیز میں مشغول نہ کرے۔ اہل وعیال اور وطن سے دور جا کر علم حاصل کرے۔ تاکہ خانگی ضروریات مشغول نہ بنائیں کہ تعلقات ہمیشہ علم سے پھیرنے والے ہوتے ہیں اور اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے ''ماجعل اللّٰہ لرجل من قلبین فی جوفہ''۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے کسی آدمی کے دو دل نہیں پیدا فرمائے ہیں، اسی وجہ سے مشہور ہے کہ علم اس وقت تک تجھ کو اپنا تھوڑا سا حصہ بھی نہیں دے گا جب تک کہ تو اپنے آپ کو ہمہ تن اس کے حوالے نہ کر دے۔ وہ فرماتے ہیں:

''جو دل مختلف چیزوں میں مشغول رہے وہ کھیت کی اس نالی کی طرح ہے جس کی ڈول بنی ہوئی نہ ہو کہ کچھ حصہ اس میں اِدھر اُدھر چلا جائے گا اور کچھ حصہ پانی کا ہوا بن کر اڑ جائے گا، صرف تھوڑا سا پانی رہے گا جو کھیت کے لیے کارآمد نہ ہو سکے گا۔'' (اعتدال: ص ۴۲)

میں نے بچپن میں والد صاحب سے ایک قصہ سنا تھا اور کئی دفعہ سنا کہ ایک متاہل شخص نے عربی پڑھنی شروع کی اور گھر کی ضروریات نے اس کو پریشان کرنا شروع کیا بیوی، بچے والا تھا وہ طلبِ علم کے شوق اور جذبہ میں بڑی دور نکل گیا، پڑھنا شروع کیا کچھ دنوں گھر والوں کو پتہ نہیں چلا۔ پھر پتہ چلا تو خطوط کی بھرمار شروع ہوگئی۔ دو چار خط تو انہوں نے پڑھے جس میں پریشانیاں بلانے کا سخت تقاضہ طبیعت پریشان ہوئی، انہوں نے غسل خانہ میں سے ایک ٹوٹا ہوا گھڑا لا کر اپنے حجرے میں رکھ لیا اور دس بارہ سال تک جو خط، جو تار، جو رجسٹری آئی بغیر پڑھے اس میں ڈالتے رہے آٹھ سال تک رخ بھی نہ کیا۔ فراغ ہونے کے بعد گھڑے کو الٹا پرانے خطوط اوپر آ گئے ترتیب وار پڑھنا شروع کیے۔ کسی میں بچہ کی بیماری تھی کسی میں بچی کی یاد کا ذکر تھا۔ کسی میں بیوی کی بیماری کا

ذکر تھا۔ کسی میں بیوی کا انتقال، ماں کا انتقال، باپ کا انتقال، جب دیکھا کہ سب ہی عزیز و اقارب چل دیئے تو یوں سوچ کر کہ اب جا کر کیا کروں گا وہیں مدرسی شروع کر دی۔ فقہی حیثیت سے تو علماء ہی بتا دیں گے مگر کام تو اسی طرح ہوتا ہے کام بغیر اس کے نہیں ہوتا۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۳

''اکابر کا طلبِ علم میں انہماک''

میں آپ بیتی نمبر۴ میں اپنے والد صاحب کے حالات میں لکھ چکا ہوں کہ میرے والد صاحب کے طالب علمی کے زمانہ میں ڈاکٹروں نے یہ کہہ دیا تھا کہ ان کی آنکھوں میں نزولِ آب شروع ہو گیا کتب بینی ہرگز نہ کیا کریں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ خبر سن کر کتب بینی میں اتنی محنت کی اس خیال سے کہ پھر تو یہ آنکھیں جاتی رہیں گی۔ جو کرنا ہے ابھی کرلیں۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ مدرسہ حسین بخش والوں کا اصرار ان کے والد یعنی میرے دادا پر یہ تھا کہ وہ دورۂ حدیث میں شریک ہوں، جس پر والد صاحب نے انکار کر دیا، لیکن امتحان میں شرکت قبول کر لی۔ نظام الدین کے ایک حجرہ میں جو بہت ہی تنگ و تاریک تھا اور اس میں جنگل کی طرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا وہاں پر اب کھڑکی ہے، اس میں شب و روز مطالعہ میں مشغول رہتے اور ایک دولٹر کے متعین تھے کہ وہ اذان کے بعد ایک دو لوٹے وضو، استنجاء کے لیے رکھ دیں اور دونوں وقت کھانا لاکر اسی کھڑکی میں سے میرے پاس رکھ دیں۔

اس زمانہ میں کاندھلہ سے ایک تار شادی کے سلسلہ میں ان کے بلانے کا آیا تو نظام الدین کے حضرات نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ وہ کئی ماہ سے یہاں نہیں ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے پانچ چھ ماہ میں بخاری شریف، سیرت ابنِ ہشام، طحاوی، ہدایہ، فتح القدیر اتنے انہماک سے دیکھی کہ جس کے بعد امتحان کی تعریف حضرت سہارنپوری ممتحن نے بڑے مجمع میں کی اور اسی بناء پر حضرت گنگوہی سے سفارش کی، جس پر حضرت گنگوہی نے آخری دورہ پڑھایا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ سبق کے بعد سب سے پہلے میں استاد کی تقریر عربی میں نقل کرتا تھا، اس کی مدد سے دوسرے رفقاء درس اردو میں اپنی تقریریں نقل کیا کرتے تھے۔ یہ قصہ بھی گزر چکا ہے کہ پورے دورہ میں ان کی ایک حدیث بھی ایسی نہ گزری جو استاد کے سامنے نہ پڑھی گئی ہو۔

آپ بیتی نمبر۴ پر مولوی شیر محمد صاحب ولایتی کا قصہ بھی بہت مفصل لکھوا چکا ہوں کہ میرے والد صاحب نے ان کو چار ماہ میں پورا دورہ گنگوہ میں پڑھایا۔ عشاء کے بعد سبق شروع ہوتا اور سحر تک جاری رہتا۔ ''فوائد جامعہ شرح عجالہ نافعہ'' صفحہ۱۲ میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ پڑھنے کے زمانہ میں جاڑے کی سخت ٹھنڈی ہوا اور گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں ہر روز دوبار دہلی کے مدرسہ میں جاتا تھا۔ جو غالباً ہمارے مکان سے دو میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ دوپہر

کو گھر میں بس اتنی قیام رہتا جتنی دیر میں ایسے چند لقمے کھالیتا جو عادۃً صحتِ جسم کو برقرار رکھے۔ بس اوقات ایسا ہوتا کہ سحر سے پہلے مدرسہ پہنچ جاتا اور چراغ کے سامنے صبح تک ایک ایک جزء لکھ لیتا عجب تر بات یہ کہ تمام اوقات پڑھی ہوئی کتب اور کتابوں کی بحث اور تکرار میں مشغول ہوئے پھر بھی میں ان شروح اور حواشی کو جو مطالعہ سے گزرتی قلم بند کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ میرے والدین فرمایا کرتے تھے کہ رات کو وقت پر سویا کرو اور دن میں کچھ وقت بچوں کے ساتھ کھیلا کرو۔ میں کہتا کہ آخر کھیل کود سے غرض تو دل ہی کو خوش کرنا ہے۔ میرا جی اسی سے خوش ہوتا ہے کہ میں کچھ پڑھوں، لکھوں۔

اعلیٰ حضرت گنگوہی کا علمی انہماک

ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ میں شاہ عبدالغنی صاحب کی خدمت میں جب پڑھا کرتا تھا جہاں پر میرا کھانا مقرر تھا وہاں میں خود لینے جایا کرتا تھا۔ راستہ میں ایک مجذوب پڑے رہا کرتے تھے۔ ہمیں پڑھنے کی طرف اس قدر مشغولیت تھی کہ درویش کیا کسی چیز کی طرف بھی طبیعت کو التفات نہ تھا۔

ایک روز وہ مجذوب مجھ سے بولے ''کہ مولوی تو کہاں جایا کرتا ہے۔''

''میں نے عرض کیا کھانا لینے جایا کرتا ہوں''۔

''انہوں نے کہا کہ میں تجھ کو دونوں وقت اسی طرف جاتا دیکھتا ہوں۔ کیا دوسرا راستہ نہیں ہے''؟۔

میں نے عرض کیا:

''دوسرا راستہ بازار میں ہو کر ہے، وہاں ہر قسم کی چیز پر نگاہ پڑتی ہے، شاید کسی چیز کو دیکھ کر طبیعت کو پریشانی ہو۔''

مجذوب نے کہا:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تجھے خرچ کی تکلیف رہتی ہے۔ میں تجھ کو سونا بنانا بتلا دوں گا، تو میرے پاس کسی وقت آئیو۔''

''میں اس وقت تو حاضری کا اقرار کر آیا، مگر خانقاہ پہنچ کر پڑھنے لکھنے میں یاد ہی نہ رہا۔''

دوسرے دن وہ مجذوب پھر ملے اور کہا: ''مولوی تو آیا نہیں۔''

''میں نے کہا کہ مجھے پڑھنے سے فرصت نہیں ہوتی جمعہ کو آؤں گا۔''

الغرض جمعہ آیا اور اس دن بھی کتاب وغیرہ دیکھنے میں مجھے یاد نہ رہا اور وہ پھر ملے پھر انہوں نے کہا: ''مولوی تو وعدہ کر گیا تھا اور نہیں آیا۔''

میں نے عرض کیا: ''مجھے تو یاد نہیں رہا۔''

آخر دوسرے جمعہ کا وعدہ کیا اور اسی طرح کئی جمعہ بھولا۔

آخر ایک جمعہ کو وہ مجذوب خود میرے پاس خانقاہ میں آئے اور مجھے شاہ نظام الدین صاحب کی درگاہ میں لے گئے۔ وہاں ایک گھاس مجھے دکھائی اور مقامات بتائے کہ فلاں فلاں جگہ یہ گھاس ملتی ہے اور مجھ سے کہا کہ خوب دیکھ لے۔

میں نے اچھی طرح پہچان لی آخر وہ تھوڑی سی توڑ کر لائے اور میرے حجرہ میں آکر مجھے سامنے بٹھا کر اس سے سونا بنایا۔ سونا بن گیا اور مجھے بنانا آگیا۔

وہ مجذوب مجھ سے یہ کہہ کر کہ اس کو بیچ کر اپنے کام میں لائیں اور اپنے مقام پر چلے گئے۔

مجھے کتاب کے مطالعہ کے آگے اتنی مہلت کہاں تھی کہ اس کو بازار میں بیچنے جاؤں۔

آخر دوسرے دن وہ مجذوب پھر ملے اور کہا:

''مولوی تو نے وہ سونا بیچا نہیں، خیر میں ہی بیچ لاؤں گا۔ دوسرے وقت آئے اور میرے پاس سے وہ لے گئے اور بیچ کر اس کی قیمت مجھ کو لادی۔

پھر ایک روز وہی مجذوب ملے اور کہنے لگے کہ مولوی میں یہاں سے جاتا ہوں تو میرے ساتھ چل اور اس بوٹی کو پھر دیکھ لے۔

غرض پھر مجھے ساتھ لے چلے اور سلطان جی صاحب میں وہ بوٹی پھر دکھائی اس کے بعد پھر کہیں چلے گئے۔ (تذکرۃ الرشید حصہ دوم: ص ۲۸۸)

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ جب میں استاذی مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پڑھتا تھا میرے تمام بدن کے اوپر خارش نکل آئی۔ میں ہاتھوں میں دستانے پہن کر سبق پڑھنے کے لیے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان ایام میں بھی ایک دن سبق ناغہ نہیں کیا۔ ایک روز مجھ کو زیادہ خارش میں مبتلا دیکھ کر حضرت استاذی نے فرمایا کہ میاں رشید تمہارا تو وہ حال ہو گیا بقول شخصے:

یکتن و خیل آرزو دل بچہ مدعا دہم
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(تذکرہ الرشید: ص ۲۷۴ ج ۲)

دیگر اکابر کے واقعات

مشائخ کاندھلہ صفحہ ۷۱ میں مفتی الٰہی بخش صاحب کے متعلق ایک عجیب قصہ لکھا ہے کہ ایک

مرتبہ دہلی میں بعض علماء کے درمیان بعض مسائل میں بحث ہوگئی اور آپس میں طے نہ کر سکے۔ شاہ دہلی نے اس کو قلم بند کرا کر ایک شتر سوار کے ہاتھ کاندھلہ مفتی صاحب کے پاس بھیجا، شتر سوار مغرب کے وقت پہنچا اور مفتی صاحب کی خدمت میں وہ سوالات پیش کیے۔ مفتی صاحب نے اسی مجلس میں برجستہ ان کے جواب مع حوالۂ کتب تحریر فرما کر طلبہ کے حوالے کیے کہ ان حوالوں کو اصل کتب سے ملالیں اور خود کھانا کھانے اندر تشریف لے گئے۔ اتنے میں حضرت مفتی صاحب کھانا کھا کر تشریف لائے طلبہ نے حوالوں کا کتابوں سے مقابلہ کرلیا تھا اور اسی وقت جواب لفافہ میں بند کر کے شتر سوار کے حوالہ کر دیا۔ شتر سوار نے عرض کیا کہ حضور شاہی حکم یہ ہے کہ جواب ملنے تک ٹھہرنا، اس کے بعد دیر نہ کرنا حضور میں صبح کا چلا ہوا ہوں، تھک رہا ہوں، حضور جواب صبح کو عطاء فرمادیں۔ چنانچہ مفتی صاحب نے صبح کو عطاء کیا اور وہ شام تک دہلی پہنچ گیا اور جب ان جوابات کو علماء کرام کے سامنے رکھا گیا تو سب نے ان کی صحت کو تسلیم کیا اور حیران رہ گئے کہ ایسے مغلق مسائل کا اتنا مدلل جواب، اس تھوڑے سے وقت میں کس طرح لکھا گیا۔ فقط

نظامِ تعلیم وتربیت صفحہ ۸۴ میں شیخ جنید حصاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق لکھا ہے کہ تین دن میں پورا قرآن شریف مع اعراب یعنی زیر، زبر، پیش کے نہایت خوشخط لکھا اور شیخ علی متقی نے اپنے استاذ کی تعمیل ارشاد میں بارہ ہزار اشعار کی کتاب بارہ راتوں میں پوری کردی اور دن میں دوسرے مشاغل بھی رہتے تھے۔ صرف رات میں نقل کی جاتی تھی۔ اسی کتاب صفحہ ۸۹ میں مولانا عصمت اللہ صاحب سہارنپوری کے متعلق لکھا ہے کہ مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے مشہور علماء میں سے ہیں گونابینا ہیں، لیکن شرح جامی اور تصریح کے جس نے حواشی دیکھے ہیں وہ اندازہ کرسکتا ہے کہ مولانا کو اللہ جل شانہٗ نے کتنی استعداد عطاء فرمائی ہے۔ بالخصوص تصریح کے حواشی ان سے بہتر میں نے نہیں دیکھے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ شاہ عبدالعزیز نوراللہ مرقدہٗ کی بینائی تو عرصہ سے جا چکی تھی لیکن اخیر عمر میں تھوڑی دیر کے لیے اختلاج قلب کا بھی دورہ ہونے لگا تھا اور اختلاجی دورہ کے وقت حضرت شاہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ مکان سے نکل کر جامع مسجد تک ٹہلتے تھے اور اس چلنے کی حالت کے باوجود اختلاج کے مقامات حریری کا سبق پڑھایا کرتے تھے۔ مقامات حریری کے سبق کا وقت یہی مقرر تھا جب وہ باہر تشریف لے جائیں تو شاگرد ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے یہ ناکارہ حکایاتِ صحابہ کے اخیر میں اکابر کا انہماک اور بہت سے ان کے کارنامے تفصیل سے لکھ چکا ہے۔ مثال کے طور پر دو ایک واقعے یہاں نقل کراتا ہوں۔ امام دارقطنی حدیث کے مشہور امام رہے ایک مرتبہ استاذ کی مجلس میں بیٹھے تھے استاد پڑھ رہے تھے اور یہ کوئی کتاب نقل کر رہے تھے ایک ساتھی نے اعتراض کیا کہ تم دوسری طرف متوجہ ہو۔ کہنے لگے کہ میری اور تمہاری توجہ

میں فرق ہے۔ بتاؤ استاذ نے اب تک کتنی حدیثیں سنائی، وہ سوچنے لگے۔ دارقطنی نے کہا کہ شیخ نے اٹھارہ حدیثیں سنائی ہیں پہلی یہ تھی، دوسری یہ تھی، اسی طرح ترتیب وار سب کے سب مع سند سنا دیں۔ حافظ اثرم مشہور محدث ہیں۔ حج کو تشریف لے گئے۔ وہاں خراسان کے دو بڑے استاذ حدیث حرم شریف میں علیٰحدہ علیٰحدہ درس دے رہے تھے۔ ہر ایک کے درس میں بڑا مجمع موجود تھا۔ یہ دونوں حلقوں کے بیچ میں بیٹھ گئے اور دونوں استادوں کی حدیثیں بیک وقت نقل کر دیں۔ عبداللہ ابن مبارک مشہور محدث ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ میں نے چار ہزار استادوں سے حدیث حاصل کی ہیں۔ علی بن حسن کہتے ہیں کہ ایک رات سخت سردی تھی میں اور ابنِ مبارک مسجد سے عشاء کے بعد نکلے، دروازہ پر ایک حدیث پر گفتگو شروع ہوگئی، میں بھی کچھ کہتا رہا، وہ بھی فرماتے رہے۔ وہیں کھڑے کھڑے صبح کی اذان ہوگئی۔ حمیدی مشہور محدث ہیں۔ رات بھر لکھتے تھے اور گرمی کے موسم میں ایک لگن میں پانی بھر لیتے اور اس میں بیٹھ کر لکھتے۔ شاعر بھی تھے، ان کے دو شعر یہ ہیں:

لقاء الناس ليس يفيد شيئا
سوى الهذيان من قيل وقال
فاقلل من لقاء الناس إلا
لأخذ العلم أو إصلاح حال

ترجمہ: "لوگوں کی ملاقات کچھ فائدہ نہیں دیتی بجز قیل قال کی بکواس کے، اس لیے لوگوں کی ملاقات کم کر بجز اس کے کہ علم حاصل کرنے کے واسطے استاد سے یا اصلاحِ نفس کے واسطے کسی شیخ سے ملاقات ہو۔"

امام طبرانی مشہور محدث ہیں بڑے کثیر التصانیف ہیں، ان کی کثرت تصانیف دیکھ کر کسی نے پوچھا کہ اتنی کتابیں کس طرح لکھ دیں۔ کہنے لگے کہ تیس (۳۰) سال بوریوں پر گزار دیئے یعنی رات دن بوریوں پر پڑے رہتے تھے۔ امام ترمذی مشہور محدث ہیں۔ احادیث کا کثرت سے یاد کرنا اور یاد رکھنا ان کی خصوصی شان تھی۔ بعض محدثین نے ان کا امتحان لیا اور چالیس (۴۰) ایسی حدیثیں سنائیں جو غیر معروف تھیں۔ امام ترمذی نے فوراً سنا دیں۔ خود امام ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے مکہ مکرمہ کے راستہ میں ایک شیخ کی احادیث کے دو جزء نقل کیے تھے۔ اتفاق سے خود ان شیخ سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے درخواست کی کہ وہ دونوں جزء احادیث کے استاذ سے سن بھی لوں۔ انہوں نے قبول کر لیا، میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جزء میرے پاس ہیں، مگر استاد کی خدمت میں گیا تو بجائے ان کے دو سادے جزء ہاتھ میں تھے۔ استاد نے سنانا شروع کیا اتفاقاً ان کی نظر پڑ گئی تو

میرے ہاتھ میں دو سادے جزء تھے ناراض ہوکر فرمایا تمہیں شرم نہیں آتی۔ میں نے قصہ بیان کیااور عرض کیا کہ آپ جو سناتے ہیں وہ مجھے یاد ہوجاتا ہے۔استاد کو یقین نہ آیا۔فرمایا اچھا سناؤ۔ میں نے سب حدیثیں سنادیں۔فرمایا کہ یہ تم کو پہلے سے یاد ہوں گی۔ میں نے عرض کیا کہ اور نئی حدیثیں سنادیجئے۔انہوں نے چالیس (۴۰) حدیثیں اور سنادیں۔ میں نے ان کو بھی فوراً سنادیا اور ایک بھی غلطی نہیں کی۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا تو مشہور قصہ ہے کہ مسجد نبوی میں عشاء کے بعد سے ایک مسئلہ میں گفتگو شروع کرتے اور صبح کی اذان شروع ہوجاتی، نہ ان میں کوئی طعن وتشنیع ہوتا نہ کوئی اور نامناسب بات اور اسی جگہ صبح کی نماز پڑھتے۔ابنِ جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ محدث ہیں، یتیمی کی حالت میں پرورش پائی۔ایک مرتبہ منبر پر کہا کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔دوسو پچاس سے زیادہ خود ان کی اپنی تصنیفات ہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی وقت ضائع نہیں جاتا تھا۔چار جزء روزانہ لکھنے کا معمول تھا۔حضرت نانوتوی قدس سرہٗ، اپنی طالب علمی کے زمانہ میں تنہا ایک جھلنگے پر پڑے رہتے تھے۔روٹی کبھی پکوالیتے تھے اور کئی کئی وقت تک کھالیتے تھے۔حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں کہ میرے پاس ایک کھانا پکانے والا تھا۔اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھائیں سالن دے دیا کرو۔مگر بدقت کبھی اس کے اصرار پر لے لیتے تھے ورنہ روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑے رہتے تھے۔فقط

(سوانح قاسمی: ص۲۹ر ج۱)

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ آپ اس قدر محنتی تھے کہ شب وروز کے چوبیس گھنٹوں میں شاید سات آٹھ گھنٹے بمشکل سونے کھانے اور دیگر ضروریات شرعیہ وطبعیہ میں خرچ ہوتے ہوں گے اور اس کے علاوہ سارا وقت ایسی حالت سے گزرتا تھا کہ کتاب نظر کے سامنے ہے اور خیال مضمون کی تہہ میں ڈوبا رہتا ہے۔مطالعہ میں آپ اس درجہ محو ہوتے تھے کہ پاس رکھا ہوا کھانا کوئی اٹھا کر لے جاتا تو آپ کو خبر نہ ہوتی۔بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کتاب دیکھتے دیکھتے آپ سو گئے اور صبح کو معلوم ہوا کہ رات کھانا نہیں کھایا تھا۔مدرسہ کو آتے جاتے آپ کبھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے۔ لپکے ہوئے جاتے اور جھپٹے ہوئے آتے تھے۔ (تذکرۃ الرشید: ص۲۵ر ج۱)

اس ناکارہ کی ابتدائی مدرسی کے زمانہ میں مہمانوں کا ہجوم تو تھا نہیں۔ بسا اوقات رات کو کچھ ضعف سا معلوم ہوتا، سوچنے پر معلوم ہوا کہ دوپہر کو کھانا نہیں کھایا۔

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت امام ربانی نے بارہا فرمایا کہ جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاد رحمہ اللہ تعالیٰ سے پڑھتے تھے اور ہمارا ارادہ ''مسلم'' شروع کرنے کا ہوا،

لیکن مولانا کو فرصت نہ تھی، اس لیے انکار فرماتے تھے۔ بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت! ہفتہ میں دو بار صرف پیر اور جمعرات کو پڑھا دیا کیجئے، خیر یہ منظور ہو گیا اور ہفتہ میں دو سبق ہونے لگے تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی۔ ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آ نکلے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب مع تمام مجمع کے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ لو بھائی حاجی صاحب آ گئے، حاجی صاحب آ گئے۔

اور حضرت مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ لو بھائی رشید اب سبق پھر ہوگا۔ مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا کہ بھئی یہ اچھا حاجی آیا، ہمارا سبق ہی گیا۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا، ہاہا ایسا مت کہو۔ یہ بزرگ ہیں اور ایسے ہیں، ایسے ہیں۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے۔ حضرت حاجی ہم دونوں کا حال دریافت فرمایا کرتے تھے اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب علموں میں وہ دو طالب علم (مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں۔

(تذکرہ الرشید: ص ۴۱/ ج ۱)

از زکریا۔

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود

چوں برآید درر دل عاشق ہو ید می شود

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ مولوی عبدالحئی صاحب لکھنوی کی بابت لوگ کہتے ہیں کہ تصنیف کا اوسط اتنے روزانہ کا پڑتا ہے۔ ہمارے حضرت نے فرمایا کہ بے چاروں کا دماغ اسی میں ضعیف ہو گیا، صرع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ہر چند منع کیا، مگر نہیں مانے۔ علمی خدمت کے مقابلہ میں بے چاروں نے جان تک کی پرواہ نہ کی۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص ۷۷)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۴

مشائخ کے یہاں معمولات کا اہتمام

میں نے اپنے جملہ اکابر کو اپنے معمولات کا بہت ہی پابند دیکھا۔

(اشرف السوانح: ص ۲۷رج ۱)

میں حضرت تھانوی کا ایک ارشاد لکھا ہے کہ انضباطِ اوقات جب ہی ہوسکتا ہے جب اخلاق و مروت سے مغلوب نہ ہو اور ہر کام کو اپنے وقت اور موقع پر کرے اور تو اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ جو حضرت والا کے استاد تھے۔ ایک بار مہمان ہوئے۔ حضرت والا نے راحت کے سب انتظام کر کے جب تصنیف کا وقت آیا تو باادب عرض کیا، حضرت میں اس وقت کچھ لکھا کرتا ہوں۔ اگر حضرت اجازت دیں تو کچھ دیر لکھ کر بعد کو حاضر ہو جاؤں۔ فرمایا، ضرور لکھو میری وجہ سے اپنا حرج نہ کرو۔ گو اس روز حضرت والا کا دل لکھنے میں لگا نہیں، لیکن ناغہ نہ ہونے دیا تا کہ بے برکتی نہ ہو۔ تھوڑا سا لکھ کر حاضرِ خدمت ہو گئے۔

اس سیہ کار کے ساتھ بھی اس سلسلہ میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ یاد نہیں کہ آپ بیتی میں کہیں گزر چکا یا نہیں۔ اس سیہ کار کی عادت بری عادتوں میں سے یہ بھی رہی کہ صبح کی تالیف کے وقت میں حضرت اقدس مدنی حضرت رائے پوری اور چچا جان کے علاوہ کسی بھی بڑے یا چھوٹے عزیز و اجنبی کا آنا بہت ہی گراں ہوتا تھا۔ ان تین کے علاوہ کسی کے لیے وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ البتہ یہ تین حضرات اس قاعدہ سے مستثنیٰ تھے اور ان کی تشریف آوری پر تالیف کا کام مجھ سے نہیں ہوتا تھا، مگر حضرت اقدس مدنی کا قیام تو زائد سے زائد ڈیڑھ گھنٹہ کا رہتا تھا اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ میرے اس وقت میں زنانہ میں یا دوسرے احباب سے ملنے تشریف لے جاتے۔ البتہ حضرت اقدس رائے پوری کا قیام رہتا۔ میں ایک مرتبہ حسبِ معمول چائے کے بعد حضرت رائے پوری کی خدمت میں بہت ہی ذوق و شوق سے بیٹھا ہوا تھا۔ تقریباً تین گھنٹہ بعد سر میں ایسا زور سے درد ہوا اور چکر آیا کہ بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں ایک دم حضرت نور اللہ مرقدہٗ سے یہ عرض کر کے کہ حضرت ابھی حاضر ہو رہا ہوں اٹھا۔ حضرت کو یقیناً کشف ہوا یا میرے اس طرح فوری اٹھنے سے فکر ہوا۔ دریافت فرمایا کہاں جا رہے ہو۔ میں عرض کر کے چلا گیا۔ حضرت ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ میں اس وقت تو فوری طور پر چلا گیا۔ اوپر دار التالیف میں گیا، قلم ہاتھ میں لیا اور کچھ لکھنا شروع کیا۔ چند ہی منٹ میں وہ درد وغیرہ سب جاتا رہا۔ ذرا بھی اثر نہ رہا۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔ واپسی پر پھر حضرت

نے باصرار پوچھا۔ اول تو میں نے ٹالنا چاہا، مگر حضرت کے بار بار اصرار پر میں نے پوری بات عرض کر دی۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ اسی واسطے تو بار بار پوچھ رہا ہوں۔ میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میری وجہ سے حرج نہ کیا کرو۔ معمولات کے چھوٹنے سے بسا اوقات جسمانی مرض ہوا کرتا ہے، یہ سب ہی کو پیش آتا ہے۔ اسی لیے اکابر معمولات کی پابندی کا اہتمام کرتے ہیں۔ میں نے اپنے اکابر کو بھی نظم اوقات اور معمولات کی پابندی کا بہت ہی پابند پایا۔ میرے والد صاحب کا تو خاص معمول تھا کہ اپنے مخصوص شاگردوں سے سب سے پہلے کام جو لیتے وہ نظام الاوقات ان سے ہی بنوا کر اس میں مطالعہ، کھانا، سبق سب آجائے، اس کو ملاحظہ فرما کر اگر اصلاح کی کوئی ضرورت سمجھتے تو اصلاح کر کے اس کے حوالے فرما دیتے اور پھر اس پر پابندی کی تاکید فرماتے اور نگرانی بھی فرماتے تھے۔

حضرت تھانوی کا ملفوظ

میں نے اپنے حضرت مرشدی کے معمولات کو تو ۳۵ھ کی ابتداء سے ۴۵ھ کی انتہا تک خوب دیکھا۔ گرمی سردی کسی موسم میں بھی ان میں تغیر نہ ہوتا تھا۔ اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا جہاں تک زمانہ یاد ہے اس میں بھی کوئی تخلف نہیں پایا۔ حضرت حکیم الامت کا ملفوظ حسن العزیز جلد اول صفحہ ۴۹۵ میں لکھا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس تو کوئی بیٹھا ہوا ہوتا تو اشراق اور چاشت بھی قضا کر دیتے تھے۔ حضرت گنگوہی کی اور شان تھی کوئی بیٹھا ہو جب وقت اشراق کا یا چاشت کا آیا وضو کر کے وہیں نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے، یہ بھی نہیں کہ کچھ کہہ کر اٹھیں کہ میں نماز پڑھ لوں یا اٹھنے کی اجازت لیں۔ جہاں کھانے کا وقت آیا لکڑی لی اور چل دیئے۔ چاہے کوئی نواب ہی کا بچہ بیٹھا ہو، وہاں یہ شان تھی جیسے بادشاہوں کی شان۔ ایک تو بات ہی کم کرتے تھے اور اگر کچھ مختصر سی بات کہی تو جلدی سے ختم کر کے تسبیح لے کر اس میں مشغول ہو گئے کسی نے کوئی بات پوچھی تو جواب دے دیا اور اگر نہ پوچھی تو کوئی گھنٹوں بیٹھا رہے انہیں کچھ مطلب نہیں۔ مولانا قاسم صاحب کے پاس جب تک کوئی بیٹھا رہتا برابر بولتے رہتے:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلہ کا واقعہ

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد حسن العزیز (جلد ۴ ص ۲۳۷) میں لکھا ہے کہ میں نے مولانا کو نہیں دیکھا۔ مولانا مظفر حسین صاحب اپنے معمولات کے ایسے پابند تھے کہ تہجد سفر میں بھی ناغہ نہ ہوتا، اس وقت ریل

نہ تھی۔ سفر بیل گاڑی میں ہوا کرتے تھے۔ بہلی میں جاتے ہوئے اور لوگ بھی ساتھ ہوتے تو راستہ میں تہجد پڑھتے مگر بہلی کو ٹھہراتے نہیں۔ اس خیال سے کہ رفقاء کا راستہ کھوٹا ہوگا، بلکہ تہجد اس طرح پورا کرتے کے کہ پہلے سے آگے بڑھ جاتے اور دو رکعت پڑھ لیتے پھر آگے بڑھ جاتے اور دو رکعت پڑھ لیتے۔ اسی طرح تہجد کو پورا کر لیتے۔ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کا وطن کا معمول یہ تھا کہ ہمیشہ ساری رات عبادت میں مشغول رہتے اور پوری رات کو تین حصوں پر منقسم فرمایا کرتے تھے۔ یہ بہت مشہور قصہ ہے۔ مختلف عبادتیں تھیں۔

تذکرۃ الخلیل میں لکھا ہے کہ کیرانہ میں ایک رافضی عورت تھی۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اس کو اہل سنت والجماعت ہونے کی ترغیب دی، اس نے اس شرط پر منظور کیا کہ اگر آپ مجھ سے نکاح کر لیں تو میں اہل سنت ہونے پر راضی ہوں۔ اوّل تو حضرت نے تامل فرمایا، اس کے بعد منظور فرما لیا۔ قصہ تو بہت طویل ہے۔ یہ مسماۃ بیوہ تھی، کیرانہ میں رہتی تھی۔ محرم کے موقع پر جب سب عورتیں قصبہ سے باہر تعزیہ دیکھنے گئیں تو اس نے پہلے کاندھلہ پرچہ بھیج دیا۔ مولانا نے اپنے داماد کو چند آدمیوں کے ساتھ ڈولی لے کر کیرانہ بھیج دیا۔ وہ رات کو گیارہ بجے مسماۃ کو لے کر کیرانہ سے روانہ ہو گئے۔ کیرانہ والوں کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے تعاقب بھی کیا، لیکن مولانا کے داماد مسماۃ کو لے کر کاندھلہ پہنچ گئے اور نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد ان محترمہ نے حضرت کو بہت تکالیف پہنچائیں اور حضرت سب کو صبر سے تحمل فرماتے تھے۔ حضرت نے ہر دو زوجات کی منظوری سے رات کو تین حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔

اول ثلث پہلی بیوی کا جس میں ان کو قرآن شریف کا ترجمہ پڑھایا کرتے تھے۔ دوسرے ثلث میں صاحبزادیوں کو قرآن پڑھایا کرتے اور تیسرا حصے کیرانہ والی بیوی کا تھا جس میں حضرت تہجد بھی پڑھا کرتے تھے۔ یہ بیوی بسا اوقات رات کو کواڑ بند کر کے سو جاتی تھیں اور کھلوانے پر بھی نہ کھولتی تھیں تو حضرت وہیں دروازہ پر لنگی بچھا کر تہجد پڑھتے رہا کرتے تھے۔ (تذکرۃ: ص ۱۰۲ بزیادۃ)

حضرت مولانا یعقوب صاحب کا واقعہ

ارواح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے صاحبزادے مولوی علاء الدین صاحب کا انتقال خاص بقرعید کے روز ہوا ہے۔ نماز سے پہلے ان کی بہت غیر حالت تھی۔ جب نماز کا وقت آیا تو مولانا یہ کہہ کر "اللہ کے سپرد اللہ خاتمہ بالخیر کرے" نماز میں پہنچ گئے نماز میں دیر نہ کی، حالانکہ مولانا کی وجاہت ایسی نہ تھی کہ اگر کتنی ہی دیر فرماتے تب بھی لوگوں کو گراں نہ ہوتا، مگر ایسا نہیں کیا وقت پر پہنچے۔ (ارواح ثلاثہ: ص ۲۲)

حضرت سہار نپوری کے واقعات

حضرت اقدس مرشدی وسیدی حضرت سہار نپوری کے متعلق تذکرۃ الخلیل میں لکھا ہے کہ پابندی اوقات کے دوچار، دس، بیس نہیں بلکہ صدہا واقعات ایسے ملیں گے جن میں ہر واقعہ اس کی مستقل شہادت ہے کہ پابندی وقت کا اہتمام آپ کی طبیعت کا حصہ بن گیا تھا اور کوئی صعوبت کیسی ہی دشوار کیوں نہ ہو آپ کی ہمت اور حوصلہ کو داب نہیں سکتی تھی۔ پھر کیا پوچھنا حاضری مدرسہ اور پابندی اسباق کا جو کہ آپ کا فریضہ منصب اور سارے کاموں میں اصل تھا کہ اس کی پابندی نے تو تمام مدرسہ کو پابند بنا دیا تھا اور بغیر اس کے کوئی نگرانی کرے، ہر چھوٹا بڑا اپنے وقت پر مدرسہ میں موجود اور خدمت مفوضہ میں مشغول نظر آتا تھا۔ آپ کا غایت مقصود یہ تھا کہ تمام نصاب سال بھر کا ہر مدرس کے پاس ایسے ماہواری اوسط سے پورا ہو کہ ختم سال پر نہ کوئی سبق بچے اور نہ آخر سال میں ختم کتاب کی خاطر زیادہ زیادہ سبق ہو کہ پڑھنے والوں کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔ ضروری سے ضروری کام آپ مدرسہ کا وقت ہو جانے پر ملتوی کر دیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ گھر میں اناج یا آٹا نہیں اور مدرسہ کا وقت آگیا تو آپ مدرسہ میں آجاتے اور منتظر رہتے کہ کوئی دوست آجائے تو اس سے آٹا منگوا کر گھر میں پہنچا دیا جائے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی نہ آتا یا آپ مشغولیت میں بھول جاتے اور جب فارغ ہو کر کھانے کا وقت آتا تب آپ کو خیال ہوتا کہ آٹا تو تھا ہی نہیں روٹی کہاں پکی ہوگی۔ (تذکرۃ الخلیل پاکی)

حضرت تھانوی کے واقعات

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ میرے اوقات ایسے گھرے ہوئے اور بندھے ہوئے ہیں کہ اگر پانچ منٹ کا بھی حرج ہو جاتا ہے تو دن بھر کے کاموں کا سلسلہ گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ مغرب کے بعد بعض یا عشاء کے بعد بعض لوگ سہ دری میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر جا پہنچتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ فوراً اٹھا دیتے ہیں کہ یہ وقت جلسہ کا نہیں ہے۔ میں نے خود ہی سب باتوں کی رعایت کر کے ہر بات کے لیے وقت مقرر کر دیا ہے تا کہ کسی کو تنگی نہ ہو۔ چنانچہ ذاکر اور شاغل لوگوں کے لیے یہ کس قدر آسانی ہے کہ بعد عصر پرچہ دیکھ کر جو کچھ چاہیں کہہ سن لیں اور اپنی تسلی کرلیں، ورنہ اور جگہ مدت گزر جاتی ہے، لیکن خلوت کا موقع نہیں ملتا۔ ایک صاحب نے قبل عشاء کچھ گفتگو شروع کی۔ برافروختہ ہو کر فرمایا یہ کیسی بے انصافی کی بات ہے کہ کسی وقت بھی آرام نہ لینے دیں۔ کوئی وقت تو ایسا دینا چاہیے کہ جس میں دماغ کو فارغ رکھ سکیں۔ کیا ہر وقت آپ لوگوں

کی خدمت ہی میں رہوں۔ عقل نہیں، انصاف نہیں، رحم نہیں۔ کوئی لوہے کا پیر ڈھونڈ لو، لیکن وہ بھی سر اگھس جائے گا۔ کسی کو میرا نصف کام بھی کرنا پڑے تو معلوم ہو۔

(حسن العزیز: ص ۳۸٦ رج ۱)

حضرت حکیم الامت نے بالکل صحیح فرمایا۔ انضباط اوقات سے جتنا کام عمدہ اور اچھا ہو سکتا ہے، بغیر انضباط کے نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ ناکارہ تو اپنے زمانہ حیات میں اپنے سے بیعت کا تعلق رکھنے والوں کو بھی اپنے سے خصوصی تعلق رکھنے والے طلبہ کو اس کی ہمیشہ تاکید کرتا تھا اور اس پر عمل بھی کراتا تھا کہ اپنے نظام الاوقات کا پرچہ لکھ کر مجھے دیں۔ بیعت سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اب تک بھی یہ ہے کہ یہاں کچھ دنوں رہیں اور اپنا نظام الاوقات بنا کر مجھے سنائیں اور اس کے بعد اپنے دوسرے دوستوں کے ذریعہ سے ان کی نگرانی بھی کرتا رہتا ہوں کہ یہ مقرر کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ دل اپنے متعلق بھی بہت چاہتا ہے کہ انضباط اوقات رہے مگر کرم فرماؤں کی کثرت نے مجبور کر دیا۔ فلاں صاحب آ گئے، فلاں جگہ سے آ گئے ہیں، ابھی واپس جانا ہے۔ آنے والوں کے تو پندرہ (۱۵) بیس (۲۰) منٹ خرچ ہوتے ہیں، مگر اس تسلسل سے میرے تو سارے ہی اوقات ختم ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے اکابر میں حضرت اقدس گنگوہی کے جہاں تک حالات سنے اور حضرت سہارنپوری اور رائے پوری نور اللہ مراقدہم ہر دو حضرات کو بغیر زمانہ بیماری کو چھوڑ کر اپنے اوقات کا بہت ہی زیادہ پابند پایا۔

حضرت رائپوری کے واقعات

علی میاں حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح میں حضرت رائے پوری کا نظام الاوقات تحریر فرماتے ہیں: ''یہ تھا کہ اخیر شب میں سب ہی جاگ جاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل میں مشغول ہو جاتے۔ اس کے بعد ذکر یا مراقبہ میں سب مشغول ہو جاتے اس وقت رات کے سناٹے میں اور جنگل کی خاموش فضا میں خانقاہ اللہ کے نام کی فضاؤں سے اور ذکر کی آوازوں سے گونج جاتی تھی اور سرور اور مستی کی ایک عام کیفیت ہوتی۔ صبح صادق کے ساتھ ہی مسجد میں اذان ہو جاتی، اذان و جماعت کے مابین چائے آ جاتی۔ خانقاہ کے ناظم مطبخ حاجی ظفر الدین جن کا چھپر خانقاہ کے اندر ہے، اپنی اہلیہ کے ساتھ پورے مجمع کے لیے تیار کر کے لاتے اور اسفار تک سب کو فارغ کر دیتے۔ حضرت بھی جب تک چائے نوش فرماتے تھے اسی وقت چائے سے فارغ ہو جاتے۔ بعد میں چائے کی بجائے دودھ اور دوائیں وغیرہ شروع کر دی تھیں۔ اخیر زمانہ کثرت امراض کے تین چار سال مستثنیٰ کر کے حضرت ہمیشہ نماز کے لیے مسجد تشریف لے جاتے۔ نماز سے

فارغ ہونے کے بعد جب تک آپ میں قوت تھی۔ چہل قدمی کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور نہر کی پٹڑی پر دوموئی تک جو تقریباً دو میل ہے، تشریف لے جاتے، آمدورفت کے چار میل ہوجاتے۔ صحت کے زمانہ میں خصوصی مہمانوں کی مشایعت کے لیے بھی حضرت تشریف لے جاتے اور کبھی کبھی خانقاہ کی جنوبی جانب روگی پٹڑی پر تشریف لے جاتے۔ ابتداءً حضرت اس سیر میں بالکل تنہا ہوتے، بعد میں ضعف کے زمانہ میں ایک دو خادم بھی ہوجاتے۔ حضرت کا معمول اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کا تھا۔ واپسی پر تھوڑی دیر اپنے مرشد کے مزار پر تشریف رکھتے، فارغ ہونے کے بعد اپنے حجرہ میں تشریف لے جاتے اور گرمی ہو یا سردی، گیارہ بجے کے درمیان حجرہ سے باہر تشریف لے آتے۔"

حضرت کا نظام الاوقات یہ تھا کہ رات کے پچھلے حصہ میں بالعموم سب ہی جاگ جاتے اور طہارت اور وضوء سے فارغ ہوکر نوافل میں مشغول ہوجاتے۔ بعض لوگ مسجد چلے جاتے، اکثر وہیں چٹائیوں اور چارپائیوں پر نوافل ادا کرتے، پھر ذکر جہر میں یا مراقبہ میں مشغول ہوجاتے۔ اس وقت رات کے اس سناٹے میں جنگل کی اس خاموش فضا میں خانقاہ اللہ کے نام کی صداؤں اور ذکر کی آوازوں سے گونج جاتی اور حسب استعداد توفیق لوگ اس فضا سے مکیف ہوتے اور سرور و مستی کی ایک عام کیفیت ہوتی، نماز صبح کے بعد پابندی سے سیر کو تشریف لے جاتے۔ بالعموم نہر کی پٹڑی پر تشریف لے جایا کرتے، واپسی پر مزار پر کچھ دیر بیٹھتے۔ بعد میں یہ معمول جاتا رہا۔ کچھ دیر موسم کے مطابق باہر تشریف رکھتے پھر اندر تشریف لے جاتے۔

کوئی موسم ہو، مہمان کم ہوں یا زیادہ حضرت باہر تشریف لاتے اور ساڑھے دس بجے یا گیارہ بجے تک کھانا آجاتا اور یہی وقت سہارنپور سے مہمانوں کے پہنچنے کا ہوتا تھا اور قرب وجوار کے دیہات سے آنے والوں کا عموماً وقت بھی یہی ہوتا تھا، جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ ہوتا تھا، مگر حاجی ظفر الدین صاحب ناظم مطبخ اور ان کی اہلیہ اللہ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے، مجھے تو ہمیشہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ پہلے سے چالیس (۴۰)، پچاس (۵۰)، مہمان ہوتے تھے، لیکن دسترخوان کے وقت سوڈیڑھ سو ہوجاتے تھے مگر ذرا سی تاخیر بھی کھانے میں نہیں ہوتی تھی۔ سالن تو زیادہ مقدار میں پہلے ہی سے ہوتا تھا، عین وقت پر حاجی ظفر کی اہلیہ اس سُرعت سے روٹیاں پکاتی کہ تار نہیں ٹوٹتا تھا۔ ایک جماعت کھانے سے اٹھتی اور فوراً دوسری جماعت بیٹھتی۔ اس کے بعد علی میاں لکھتے ہیں کہ کھانا عموماً سادہ بالعموم دال روٹی ہوتی تھی، جب تک حضرت کی صحت اجازت دیتی رہی مہمانوں کے ساتھ ہی کھانا تناول فرماتے تھے، کھانے کے بعد تھوڑی دیر مجلس ہوتی جس کا کوئی موضوع نہ ہوتا تھا۔ کبھی اکابر میں سے کسی کا قصہ چھڑ گیا اور کبھی کوئی اور مضمون۔

بارہ بجے کے قریب مجلس ختم ہو جاتی اور حضرت آرام فرماتے۔

ظہر کی اذان پر سب اٹھ جاتے اور مسجد میں جمع ہوتے رہتے۔ صحت کے زمانہ میں تو حضرت مسجد ہی میں تشریف لے جاتے تھے۔ نمازِ ظہر کے بعد حضرت تخلیہ میں تشریف لے جاتے اور کیواڑ بند ہو جاتا۔ سفر وحضر میں یہ قدیمی اور دائمی معمول تھا۔ البتہ اخیر زمانہ شدتِ مرض میں اس کی پابندی نہیں رہی۔ اس تخلیہ میں عموماً صلوٰۃ التسبیح اور ذکر بالجہر کا معمول تھا۔ (از زکریا)

جہر بہت ہلکی آواز سے ہوتا جو حجرہ کے باہر سہ دری سے آگے نہیں نکلتا تھا اور ہیبت سے اس سہ دری میں بھی لوگوں کو جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ زکریا کی چارپائی حجرہ شریف کے دروازے کے بالکل متصل چونکہ حکماً رہتی تھی اس لیے مجھے اس خفیف جہر کی آواز سننے کی بہت کثرت سے نوبت آتی، اس تخلیہ کا بہت اہتمام ہوتا تھا۔ تخلیہ سے باہر آنے کے وقت پر اتنا جلال اور انوار کا زور ہوتا تھا کہ چہرہ مبارک پر نگاہ ڈالنی مشکل ہوتی تھی اور تھوڑی دیر تک حضرت نور اللہ مرقدہٗ پر بھی کچھ استغراقی کیفیت کا ایسا غلبہ ہوتا تھا کہ خادم خاص بھائی الطاف کو بھی نہ پہچانتے فرماتے تو کون ہے۔ اس منظر کو اس ناکارہ نے بھی بہت دیکھا۔ میں تو حجرہ کے کیواڑ کھلنے کے وقت اپنی چارپائی سے اٹھ کر باہر آجاتا تھا، مگر چند منٹ بعد چائے اور اخبار آجاتے اور راؤ فضل الرحمن صاحب اخبار کی خاص خاص خبروں پر سُرخیاں لگا کر لاتے اور سناتے اور خصوصی ڈاک بھی سنائی جاتی، عصر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔

مولانا علی میاں رائے پور کے نظام الاوقات کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت اقدس رائے پوری کے مجاہدات بغیر رمضان کے بھی ابتداء زمانہ میں بہت سخت گزرے ہیں متفرق احوال وقتاً فوقتاً میری آپ بیتی میں جسے کشکول کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ چلتے پھرتے وقتاً فوقتاً اکابر کا جو واقعہ یاد آیا "لقد كان في قصصهم عبرة لأولي الألباب" (سورہ یوسف) لکھواتا رہا کہ اول تو اہل اللہ کے قصے نزولِ رحمت کا بھی سبب ہیں اور مجھے بچپن ہی سے اپنے اکابر کے قصوں میں بہت لطف آیا۔

علی میاں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات میں تحریر فرماتے ہیں، رائے پور کے قیام میں آپ نے اس عالی ہمتی جفاکشی اور مجاہدہ سے کام لیا جس کے واقعات اب صرف اولیاء متقدمین کے تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں اور جو انہیں لوگوں کا حصہ ہے جن کی استعداد اور جوہر نہایت عالی عزم وارادہ نہایت قوی اور طلب نہایت صادق ہوتی ہے جن کے ضمیر میں روزِ اول سے عشق کا مادہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو انہیں اس راہ کے اعلیٰ ترین مقامات اور کمالات تک پہنچا کر ان سے ہدایت اور تربیت خلق کا کام لینا ہوتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ میں رائے پور پہنچ کر سارا دن باغ میں پھرتا رہا کہ میں کسی درخت کے پتے کھا کر گزارا کرسکتا ہوں۔ آپ نے بعض اوقات کسی درخت کا نام بھی لیا کہ اس کو منتخب کیا تھا، کبھی آپ کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شہتوت کے پتے کھائے ہے۔ فرماتے تھے کہ الحمدللہ اس کی بہت کم نوبت آئی، کیونکہ حضرت نے اپنے خادم میاں جی معزز الدین سے فرمادیا تھا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا خیال رکھنا، رائے پور کا وہ دور بڑے مجاہدے اور جفاکشی کا تھا اور یہ سب ان لوگوں کی تکمیل حال کے لیے تھا جن کی ترقی اور پختگی اللہ تعالیٰ کو منظور تھی، لنگر کی روٹی اتنی موٹی اور کچی ہوتی تھی کہ بغیر پانی یا چاچھ کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ (چونکہ رائے پور خانقاہ میں پنجابی حضرات کی کثرت تھی ان کے معدے اچھے تھے اور قوی ہوتے تھے۔ ان کے لیے چھاچھ کے ایک پیالہ کے ساتھ ایک روٹی...... کھالینے میں کوئی اشکال نہیں تھا)۔

اخیر زمانہ میں اکثر فرماتے تھے کہ یہ ریاح کا مرض اور ضعف معدہ اسی وقت سے ہے فرماتے تھے کہ ایک روز روٹی جلی ہوئی تھی۔ حاجی جی مطبخ کے مہتمم تھے۔ میں نے کہا حاجی جی روٹی جلی ہوئی ہے کہا کہ اچھا کل جلی ہوئی نہ ہوگی۔ اگلے روز ایک طرف جلی ہوئی اور دوسری طرف کچی تھی، حاجی جی سے جب دوسری مرتبہ کہا کہ روٹی کچی ہے تو حاجی صاحب نے کہا کہ میاں اگر روٹی کھانے آیا ہے تو کہیں اور چلا جا۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ حضرت سے نہ کہہ دے، میں نے اپنے کو بڑی ملامت کی اور دل میں کہا کہ ارے آیا تو ہے اپنے نفع کی خاطر اور پھر نخرے کرتا ہے اور یہ عہد کیا کہ آئندہ کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔ پھر کبھی شکایت نہیں کی، چودہ سال تک کبھی باسی کبھی کچی کبھی سوکھی روٹی کھائی اور نام نہیں لیا۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے خود حضرت کے حوالے سے لکھا ہے۔ فرماتے تھے کہ مسلسل دس سال ایسے گزرے ہیں کہ ہم لوگوں کو جو طالبین کی حیثیت سے خانقاہ میں رہتے تھے ایک دن میں صرف ایک روٹی مکئی کی ملتی تھی اور وہ درمیان سے بالکل کچی ہوتی تھی جو صاحب پکانے والے تھے انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ روٹی سکی یا نہیں سکی سالن یا دال ترکاری کا کوئی سوال ہی نہ تھا، گاؤں سے کسی دن چھاچھ آجاتی تو کھانے پینے کے لحاظ سے ہم خانقاہ والوں کے لیے گویا وہ عید کا دن ہوتا۔

فرماتے تھے اس علاقہ (یوپی) کے ہمارے ساتھی تو وہی ایک روٹی آدھی آدھی کر کے دونوں وقت کھاتے تھے، لیکن میں پنجاب کا رہنے والا تھا، اس لیے ایک ہی وقت میں کھالیتا تھا اور دوسرے وقت بس اللہ کا نام، فرمایا کہ سوکھی روٹی کھانے کی وجہ سے میرے پیٹ میں درد رہنے لگا اور گڑگڑاہٹ ہوتی تھی۔ خیال آیا کہ حضرت سے عرض کروں گا خادم سے فرمادیا جائے کہ روٹی

اچھی طرح سینک لیا کرے پھر خیال آیا کہ اگر حضرت نے فرمایا کہ مولوی صاحب! جہاں پکی ہوئی روٹی ملتی ہو وہاں چلے جاؤ تو پھر کیا ہوگا۔ خود بخود دل میں خیال آیا تو سونٹھ پیس کر استعمال کی۔ استعمال کے بعد جب ایک مرتبہ استنجاء کیا تو ایک بڑا سا جونک جیسا کیڑا نکلا۔ میرا خیال ہوا کہ شاید آنت باہر آگئی مگر دیکھا تو کیڑا تھا اس وقت ڈر دیا بعد میں مفردات میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سونٹھ کی ایسی ہی خاصیت ہے۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کبھی شفقتاً اپنے دسترخوان پر جب کبھی حضرت شیخ الہند یا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہما تشریف لاتے تو بلاتے کہ تم بھی کھانا کھالو۔ میں اپنے وقت ہر جو کچھ مجھے باسی مل جاتا تھا کھالیتا تھا اور سختی سے معذرت کرتا تھا۔ حضرت شدت سے اصرار کرتے اور فرماتے کہ مولانا میں آپ کے نفع کے لیے کہہ رہا ہوں۔ حضرت کی تعمیل ارشاد میں ان حضرات کے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھالیتا۔ اسی طرح جب چائے کی پتی بچ جاتی میں اس کو کھالیتا جو گڑ رکھے رکھے پرانا اور خراب ہو جاتا اس کا شربت پکا کر اس کا شیرا چائے میں ڈال کر اس سے روٹی کھالیتا تاکہ جلدی لیٹ جاؤں اور حضرت کے اٹھنے سے پہلے ایک بجے حاضر ہو جاؤں۔

رہائش کے لیے حافظ یوسف علی صاحب کے چھپر میں جہاں ان کی گھوڑی بندھتی تھی، ان کی اجازت سے ایک طرف صاف کر کے اس پر اپنا بستر لگا دیا۔ (از زکریا حافظ یوسف علی صاحب اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے زمانہ میں قرآن پاک کے مکتب کے حافظ تھے، بہت ہی بزرگ تھے، بہت ہی صاحبِ کرامت تھے، میں نے بھی زیارت کی ہے بلکہ مرحوم بہت ہی شفقت فرمایا کرتے تھے مگر ٹانگوں سے بالکل معذور تھے۔ استنجاء وغیرہ نماز کے لیے تو کوئی شاگرد کمر پر بٹھا کر لے جاتا، لیکن قرب و جوار کے دیہات میں کبھی جانا ہوتا تو اس گھوڑی پر تشریف لے جایا کرتے تھے)۔

علی میاں لکھتے ہیں کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک کوڑے کرکٹ کی ڈھیر پر ایک پھٹا ہوا کمبل ملا تھا اس کو دھو کر وہاں بچھا دیا اس کو اتنی تہیں دیں کہ اس کے سوراخ بند ہو گئے چودہ سال تک یہی بستر رہا یہی جائے نماز، خانقاہ میں اس وقت ایک ہی لالٹین تھی وہ حضرت کے حجرہ میں رہتی، دوسری لالٹین تھی ہی نہیں رائے پور میں سانپوں اور بچھوؤں اور حشرات الارض کی کثرت ہے۔ فرماتے تھے کہ میں نے ایک ٹوٹا ہوا بانس اٹھالیا وقتاً فوقتاً اس کو بجاتا رہتا تھا کہ کوئی کیڑا یا سانپ نہ آئے الحمد للہ کہ سوائے ایک مرتبہ کے ایک کھنکھجورہ آیا کبھی کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کے بعد علی میاں نے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا لحاف والا قصہ لکھا کہ سردی میں کوئی کپڑا سردی سے بچاؤ کا نہیں تھا، اتنے مسجد کے کیواڑ کھلے رہتے ہم حمام کے سامنے بیٹھے ہوئے آگ تاپتے رہتے۔

اس کو میں تفصیل سے آپ بیتی نمبر۳ میں اپنے بچوں کی شادی کے سلسلہ میں مفصل لکھوا چکا ہوں اور حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے بہت سے مجاہدات کے قصے آپ بیتی نمبر۱ میں بھی گزر چکے ہیں، حضرت کا بار بار ارشاد تھا کہ طالب علموں کی اسٹرائیک کے ہنگاموں کے ذمہ اہل مدارس ہیں، دونوں وقت پکی پکائی مل جاتی ہے، خالی بیٹھے لغویات ہی سوجھتی ہیں۔ ہمیں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسباق فارغ ہونے کے بعد روٹی پکانے کا فکر ہوتا تھا، جلدی جلدی کچی پکی کھا کر دوسرے سبق کا وقت آجاتا تھا، لغویات کے سوچنے کا وقت ہی نہیں آتا تھا۔

اس کے بعد علی میاں لکھتے ہیں کہ ذکر میں شدت سے انہماک تھا رات میں بہت کم سونے کی نوبت آتی، فرماتے تھے کہ نزلہ کے زور کی وجہ سے ایک رومال رکھ لیتا اور ذکر شروع کرتا، رطوبت کی وجہ سے وہ تر ہوجاتا۔ (سوانح حضرت رائے پوری: ص۶۴)

ایک دفعہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ حضرت تھانوی کے یہاں حاضر ہوئے تو حضرت حکیم الامت نے فرمایا کہ میں تو رائے پور حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ مجھے یاد نہیں حضرت رائے پوری نے عرض کیا، حضرت! میں آپ کو کیا یاد رہتا، میری وہاں کوئی حیثیت اور امتیاز نہیں تھا، شاید آپ کو یاد ہو کہ حضرت کی خدمت میں ایک خادم بار بار آتا تھا، بدن پر ایک کمری ہوتی تھی اور تہبند باندھے ہوئے، فرمایا ہاں کچھ یاد تو آتا ہے عرض کیا کہ میں وہی ہوں۔ (سوانح حضرت رائے پوری: ص۶۹)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۵

قرآن وحدیث پر اعتماد

صحابہ کرام میں اور ہم لوگوں میں بڑا بنیادی فرق یہ ہے کہ ان کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد پر یقین اعتماد ایسا کلی اور قلبی تھا کہ اس میں ان کو کوئی تر دد نہیں رہتا تھا اور ہم لوگوں کا اعتقاد زبانی ہے قلبی نہیں، لیکن میں نے اپنے اکابر میں اس اعتماد کو علی وجہ الاتم پایا۔ ان حضرات کے نزدیک حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز سے ڈرایا یا منع کیا، اس سے خوف اور بچنا ایسا طبعی بن گیا تھا۔ جیسا ہم لوگوں کو سانپ بچھو سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن پاک اور احادیث کے ارشادات ایسے قطعی تھے کہ ان میں کوئی عقلی نہیں طبعی بھی تر دد نہ رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس دولت کا کوئی شمہ اس سیہ کار کو بھی نصیب فرمادے۔

چچا جان کے اعتماد کی پختگی کی ایک مثال

(الف)...... سہارنپور کے ایک دوست نے میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کو ایک جوابی لفافہ لکھا۔ جس میں اپنے کسی عزیز کے۔ لیے جو مایوسی کی حالت میں تھے، تعویذ منگایا اور چچا جان نے لفافہ پر سے ان کا نام کاٹ کر میرا نام لکھا اور لکھا کہ فلاں صاحب نے تعویذ منگایا ہے ان سے کہہ دو کہ میں صبح کی نماز کے بعد اور مغرب۔ کے بعد مسجد سے نکلوں تو مجھ سے دم کرالیا کریں اور مجھے ایک دعاء لکھی کہ تین دفعہ یہ دعاء اول وآخر درود شریف پڑھ کر اس پر دم کر دیا کرو اور یہ بھی لکھا کہ جو اس دعاء سے اچھا نہ ہو اس کا مرنا ہی اچھا ہے۔ میں نے ان صاحب کو بُلا کر خط تو ان کو نہیں دکھلایا کہ آخری جملہ مجھے بھی چبھ رہا تھا، میں نے چچا جان کی ارشاد فرمودہ دعاء پڑھنی شروع کی اور وہ تین چار دن میں اچھے ہو گئے، یہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے قوت اعتقاد کی بات تھی، یہ قصہ آپ بیتی نمبر۴ میں بھی گزر چکا ہے، چچا جان کے حالات میں اور بھی اس نوع کے متفرق واقعات گزر چکے ہیں۔

(ب)...... یہ واقعہ تو میں کثرت سے اپنی مجالس میں سنا تا رہتا ہوں، معلوم نہیں آپ بیتی میں کہیں سے گزرا یا نہیں، ہمارے مدرسہ کے ابتدائی محسنوں میں بلکہ اگر ابتدائی بانیوں میں کہا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔

حافظ فضل کے مکان پر چوروں کے آنے کا واقعہ:

ایک بزرگ تھے جن کا نام حافظ فضل حق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تھا، ان کے دو صاحبزادے الحاج حبیب احمد صاحب میرے حضرت قدس سرۂ اور میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے خاص تعلق رکھنے والے تھے۔ ان کا ذکر آپ بیتی میں بھی کئی جگہ گزر چکا ہوگا، میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کے موقع پر ان کو اپنے قبرستان میں دفن کرنے میں ان ہی کا زور تھا، میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بیماری میں ان کا یہ سوال بھی گزر چکا کہ آپ حضرت سہارنپوری کو لینے کے لیے بمبئی جائیں گے یا دہلی اور میرے والد صاحب کا یہ جواب کہ میں تو پڑے پڑے زیارت کرلوں گا وغیرہ وغیرہ، کئی قصے گزر چکے اور ان کے دوسرے صاحبزادے حافظ زندہ حسن صاحب کا ذکر بھی کئی جگہ گزرا ہوگا۔ بالخصوص میرے ابتدائی دور میں قرضہ کے سلسلہ میں شاید ان کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ حافظ فضل حق صاحب ان دونوں کے والد تھے اور میرے حضرت کے استاذ شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کے نام نامی پر مدرسہ کا نام مظاہر علوم رکھا گیا، ان کے بہت ہی جانثار اور معتقد تھے۔ ان ہی کی کوشش سے مدرسہ قاضی کے محلّہ سے جہاں ابتداءً قائم ہوا تھا، یہاں منتقل ہوا جہاں اب ہے۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب قدس سرۂ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے۔ گرمی میں کثرت سے پنکھا جھلتے، ان کا تکیہ کلام تھا ''اللہ کے فضل سے'' ہر بات میں یہی کہا کرتے تھے کہ ''اللہ کے فضل سے'' یہ ہوا۔ اللہ کے فضل سے وہ ہوا۔

ایک مرتبہ انہوں نے حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے صبح کو یہ عرض کیا کہ حضرت جی رات تو اللہ کے فضل سے اللہ کا غضب ہوگیا۔ حضرت قدس سرۂ بھی یہ فقرہ سن کر ہنس پڑے اور دریافت کیا کہ حافظ جی اللہ کے فضل سے اللہ کا غضب کیا ہوگیا تھا انہوں نے عرض کیا کہ حضرت جی رات میں سو رہا تھا اور مکان میں اکیلا ہی تھا۔ میری جو آنکھ کھلی، میں نے دیکھا کہ تین چار آدمی میرے کوٹھے کے کیواڑوں کو چمٹ رہے ہیں۔ میں نے ان سے بیٹھ کر پوچھا کے ابے تم چور ہو۔ کہنے لگے، ہاں ہم چور ہیں۔ میں نے کہا سنو، میں شہر کے رؤسا میں شمار ہوں اور مدرسہ کا خزانہ بھی میرے پاس ہے اور وہ سارا کا سارا اسی کوٹھی میں ہے اور یہ تالہ جو اس کو لگ رہا ہے چھ (٦) پیسے کا ہے تمہارے باپ دادا سے بھی نہیں ٹوٹے گا۔ تم تو تین چار ہو، دس بارہ کو اور بلالاؤ اور اس تالے کو ٹھو نکتے رہو یہ ٹوٹنے کا نہیں۔ میں نے حضرت جی! (مولانا محمد مظہر صاحب) سے سن رکھا ہے کہ جس مال کی زکوۃ دے دی جائے وہ اللہ کی حفاظت میں ہو جاتا ہے۔ میں نے اس مال کی

زکوۃ جتنی واجب ہے اس سے زیادہ دے رکھی ہے۔ اس لیے مجھے اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ اللہ میاں اپنے آپ حفاظت کریں گے۔ حضرت جی اللہ کے فضل سے میں تو یہ کہہ کر سو گیا۔ میں پچھلے کو اٹھا تو وہ لپٹ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ارے میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ دس بارہ اور بلا لاؤ یہ تالہ اللہ کے فضل سے ٹوٹنے کا نہیں۔ حضرت جی یہ کہہ کر میں تو اللہ کے فضل سے نماز میں لگ گیا اور جب اذان ہوگئی تو میں ان سے یہ کہہ کر کہ میں نماز کو جارہا ہوں تم اس کو لپٹے رہو۔ پھر حضرت جی اللہ کے فضل سے وہ سب بھاگ گئے۔ فقط

یہ وہی توکل اور اعتماد علی اللہ کی بات ہے ہم نااہلوں کے گھر میں اگر ایک چور کا بھی شبہ ہو جائے تو چارپائی پر لیٹنا مشکل ہو جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ ضروری ہے جیسا کہ میں شمائل ترمذی کے ترجمہ میں کئی احادیث کے ذیل میں اس قسم کے مضمون کو لکھ چکا ہوں کہ جب تک توکل اور اعتماد کا یہ درجہ حاصل نہ ہو، اس وقت یہ ان اعتماد والوں کی حرص نہیں کرنی چاہیے۔ امام بخاری نے بخاری شریف میں بھی اور اس ناکارہ نے اپنے رسالہ فضائل صدقات میں بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چندہ کی تحریک پر گھر کا سارا مال لا کر سامنے رکھ دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی سے قبول فرمالیا اور ایک موقع پر ایک اعرابی نے ایک سونے کا ڈلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا کہ مجھے ایک جگہ سے حاصل ہو گیا ہے، اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر سے منہ پھیر لیا، ان صاحب نے دوسری طرف حاضر ہو کر عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر سے بھی اعراض کرلیا اور سہ بارہ عرض کرنے پر حضور نے اس کو لے کر ایسا زور سے پھینکا کہ اگر اس کو لگ جاتا تو زخمی کر دیتا۔ توکل علی اللہ اور اللہ پر اعتماد پیدا کرنے کی تو بڑی ضرورت ہے اور اگر یہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے، مگر جب تک یہ پیدا نہ ہوا اس وقت تک عمل کرنا ایسا ہے جیسے کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔

پیلو میں انگریز کی کوٹھی کا واقعہ

(ج)...... میں نے اپنے بچپن میں اپنے والد صاحب سے اور دوسرے لوگوں سے بھی یہ قصہ سنا ہے کہ ضلع سہارنپور میں بہت سے آگے انگریزوں کی کچھ کوٹھیاں تھیں۔ من جملہ ان کے پیلو میں بھی جہاں اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا وصال ہوا اور اس کے قرب و جوار میں بہت سی کوٹھیاں کاروباری تھیں، جن میں ان انگریزوں کے کاروبار ہوتے تھے اور ان کے مسلمان ملازم کام کیا کرتے تھے اور وہ انگریز دہلی، کلکتہ وغیرہ بڑے شہروں میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی معائنہ کے

طور پر آ کر اپنے کاروبار کو دیکھ جاتے تھے۔

ایک مرتبہ اس جنگل میں آگ لگی جو کبھی کبھی مختلف وجوہ سے لگتی رہتی تھی اور وہاں کے باغات، جنگلات کو جلا دیتی تھی۔ ایک دفعہ اس جنگل میں آگ لگی اور قریب قریب ساری کوٹھیاں جل گئیں۔ ایک کوٹھی کا ملازم اپنے انگریز آقا کے پاس دہلی بھاگا ہوا گیا اور جا کر واقعہ سنایا کہ حضور سب کی کوٹھیاں جل گئیں اور آپ کی کوٹھی بھی جل گئی۔ وہ انگریز کچھ لکھ رہا تھا، نہایت اطمینان سے لکھتا رہا، اس نے التفات بھی نہیں کیا۔ ملازم نے دوبارہ زور سے کہا کہ حضور سب جل گیا۔ اس نے دوسری دفعہ بھی لاپرواہی سے جواب دے دیا کہ میری کوٹھی نہیں جلی اور بے فکر لکھتا رہا۔ ملازم نے جب تیسری دفعہ کہا تو انگریز نے کہا میں مسلمانوں کے طریقہ پر زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، اس لیے میرے مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ملازم جواب دہی کے خوف کے مارے بھاگا ہوا گیا تھا کہ صاحب کہیں گے کہ ہمیں خبر تک نہیں کی۔ وہ انگریز کے اس لاپرواہی سے جواب کو سن کر واپس آ گیا۔ آ کر دیکھا تو واقعی سب کوٹھیاں جل چکی تھیں مگر انگریز کی کوٹھی باقی تھی۔ رنجیت سنگھ کا بھی ایک واقعہ اسی نوع کا آگے آئے گا۔

(د)......اللہ کی شان! کہ اسلامی احکام پر عمل کر کے غیر مسلم تو فائدہ اٹھائیں اور ہم لوگ زکوٰۃ ادا نہ کر کے اپنے مالوں کو نقصان پہنچائیں۔ کہیں چوری ہو جائے، کہیں ڈاکہ پڑ جائے، کہیں کوئی اور آفت مسلط ہو جائے۔ فضائل صدقات کے مضامین بہت کثرت سے گزر چکے، جو دیکھنا چاہے تفاصیل وہاں دیکھ لے۔ زکوٰۃ کے ادا کرنے کے فضائل اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وعیدیں کثرت سے اس میں مذکور ہیں۔ مجھے بھی بہت کثرت سے ایسے لوگوں کے حالات سننے کی نوبت آئی کہ زکوٰۃ کی معمولی رقم ادا کرنے میں کوتاہی کی وجہ سے بڑے بڑے ٹیکس بڑی بڑی چوریاں بھگتنی پڑیں۔ یہ اللہ کے بندے اگر زکوٰۃ کا مال طیب خاطر سے حق واجب سے زیادہ ادا کر دیں تو کتنا ثواب ہو۔ اس کے بالمقابل جبری نقصان سے حفاظت بھی رہے اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا وبال مستقل رہے گا۔ فضائل صدقات میں اس قسم کی حدیثیں بہت کثرت سے ذکر کی گئی ہیں۔ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جو مال کسی جنگل میں یا دریا میں کہیں بھی ضائع ہوتا ہے وہ زکوٰۃ کے روکنے سے ضائع ہوتا ہے۔ یہ مضمون غیر متعلق ہے مگر بہت اہم ہے، زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے سے جو جانی اور مالی مصائب آتے ہیں وہ فضائل صدقات اول اور میرے رسالہ اعتدال میں تفصیل سے لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں دیکھنا چاہے تو کوئی دیکھ لے، مگر دیکھنا تو وہ چاہے جس کو عمل کرنا ہو اور اللہ اور اس کے پاک رسول کے ارشادات پر اعتماد ہو۔ اس وقت تو اعتماد علی اللہ وعلی رسولہ کے واقعات لکھوانا شروع کیے تھے۔

(ر)......۱۹۴۷ء کا ہنگامہ تو ابھی تک سب کو معلوم ہے اس میں کیا گزر رہی تھی۔ ہم سب لوگ نظام الدین میں محبوس تھے اور دہلی کا راستہ بالکل بند ہو چکا تھا اور راشن سبزی منڈی میں ملتا تھا جہاں کوئی ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ آپ بیتی نمبر ۵ میں بابوایاز صاحب کا ایک مفصل قصہ لکھوا چکا ہوں کہ وہ اس حالت میں بھی کبھی کبھی راشن لینے کے لیے سبزی منڈی جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سبزی منڈی میں چند سکھوں نے انہیں دیکھ کر بہت گھورا اور جب وہ نظام الدین آنے لگے تو ان کے ساتھ تین سکھ تھے اور آپس میں وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ مسلمان جارہا ہے۔ انہوں نے نہایت جرأت سے کہا کہ تم تین ہو، تیس بھی ہو تب بھی مار نہیں سکتے۔ ان کی جرأت پر سب حیران رہ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا بابو جی کیا بات تھی؟ انہوں نے کہا کہ تو نے یہی تو ایک دعاء بتائی تھی کہ ''اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ'' پڑھ کر چلے جایا کرو۔ مجھے یہ سن کر بہت ہی غیرت آئی۔ مفصل قصہ تو وہاں گزر چکا ہے، یہاں تو صرف حدیث پاک کی دعاء پر اعتماد ظاہر کرنا ہے۔ اب تک بھی جب یہ قصہ یاد آجاتا ہے تو بڑی غیرت آتی ہے کہ جس نے بتلایا اس کی تو ہمت ہے نہیں۔ اس نابکار کے ساتھ تو کئی واقعات دوستوں کے اسی قسم کے پیش آئے ہیں، جس پر بہت ہی شرم آتی ہے کہ میری بتلائی ہوئی چیزوں پر لوگوں نے اعتقاد اور حسنِ ظن سے عمل کیا اور اس کے ثمرات خوب پائے۔

شاہ عبدالقادر صاحب کا واقعہ

(س)......ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے زمانہ میں ایک شخص پر جن آتا تھا، اس کے قرابت دار اس کو شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ غلام علی صاحب اور دوسرے بزرگوں کے پاس لے گئے اور سب نے جھاڑ، پھونک، تعویذ، گنڈے کیے مگر افاقہ نہ ہوا۔ اتفاق سے شاہ عبدالقادر صاحب اس وقت دہلی میں تشریف نہ رکھتے تھے جب شاہ صاحب تشریف لائے تو ان کی طرف بھی رجوع کیا شاہ صاحب نے جھاڑ دیا وہ اسی روز اچھا ہو گیا جب شاہ عبدالعزیز صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے شاہ صاحب سے پوچھا، میاں عبدالقادر تم نے کون سا عمل کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ حضرت میں نے تو صرف ''الحمدللہ'' پڑھ دی۔ اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کسی خاص ترکیب سے؟ انہوں نے فرمایا کہ ترکیب کوئی نہیں فقط ''یاجبار'' کی شان میں پڑھ دی تھی۔ (میں نے خان صاحب سے اس جملہ کا مطلب پوچھا، انہوں نے فرمایا کہ مطلب میں بھی نہیں سمجھا، راویوں نے یہی الفاظ فرمائے تھے)۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اس کے حاشیہ پر تحریر فرمایا کہ احقر کے ذہن میں جو بے تکلف مطلب آیا اس کو

بسبیل احتمال عرض کرتا ہوں کہ کاملین میں ایک درجہ ہے ''ابوالوقت'' کہ وہ جس وقت جس تجلی کو چاہیں اپنے اوپر وارد کرلیں۔ کذا سمعت عن مرشدی رحمہ اللہ تعالیٰ پس عجب نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے اس وقت اپنے پر جبار کی تجلی کو وارد کیا ہو اور اس کی مظہریت کی حیثیت سے اس کو توجہ سے دفع فرما دیا ہو۔ (ارواح ثلاثہ: ص ۵۶)

میاں جی محمدی صاحب کا واقعہ

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ میاں جی محمدی صاحب کے صاحبزادے سخت بیمار تھے اور اطباء نے جواب دے دیا تھا۔ ان کے والدین کو اس وجہ سے تشویش تھی۔ اتفاق سے میاں جی صاحب نے خواب میں دیکھا کہ مولوی اسماعیل صاحب مسجد کے بیچ کے در میں وعظ فرما رہے ہیں اور میں مسجد کے اندر ہوں اور میرے پاس عبدالعزیز بیٹھا ہے۔ اتفاق سے اسے پیشاب کی ضرورت ہوئی اور میں اسے پیشاب کرانے لے چلا آدمیوں کی کثرت کی وجہ سے اور طرف راستہ نہ تھا اور مولوی اسماعیل صاحب سے بے تکلفی تھی۔ اس لیے میں اسے مولوی اسماعیل صاحب کی طرف لے گیا۔ جب عبدالعزیز مولوی اسماعیل صاحب کے سامنے سے گزرا تو انہوں نے تین مرتبہ ''یا شافی'' پڑھ کر دم کر دیا۔ اس خواب کے بعد جب آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنی بیوی کو جگایا اور کہا کہ عبدالعزیز اچھا ہو گیا۔ اطباء غلط کہتے ہیں کہ یہ نہ بچے گا میں نے اس وقت ایسا خواب دیکھا ہے۔ صبح ہوئی تو میاں عبدالعزیز بالکل تندرست تھے۔ (ارواح ثلاثہ: ص ۸۷)

(ش)......ارواحِ ثلاثہ میں ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ جس کی روایت حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی نقل کی ہے کہ بڑے میاں (شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) اور چھوٹے میاں (شاہ محمد یعقوب رحمہ اللہ تعالیٰ) دونوں بھائی جب مکہ حرم شریف میں داخل ہوتے تو دروازہ پر جوتے چھوڑ جاتے مگر باوجود اس کے وہاں جوتے کا محفوظ رہنا نہایت مشکل ہے اور سینہ کے سامنے سے اور سر کے سامنے سے خاص حرم کے اندر سے جوتا اٹھ جاتا ہے، ان کا جوتا کبھی چوری نہیں ہوا۔ یہ واقعہ دیکھ کر لوگ متعجب ہوتے اور ان حضرات سے پوچھتے کہ کیا وجہ ہے کہ آپ کا جوتا چوری نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے کہ جب ہم جوتا اتارتے ہیں تو چور کے لیے اس کو حلال کر جاتے ہیں اور چور کی قسمت میں حلال مال نہیں، اس لیے وہ انہیں نہیں لے سکتا۔ میر شاہ خان نے کہا کہ جب میں نے یہ قصہ مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) سے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ اصل میں تعلیم تھی۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی جب شاہ صاحب کے زمانہ میں اکبری (دہلی) مسجد میں جوتے چوری جانے لگے تو شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا

کہ تم اپنے جوتے چوروں کے لیے حلال کر دیا کرو۔ پھر وہ انہیں نہیں لیں گے۔

(اروحِ ثلاثہ: ص ۱۰۳)

(ص)...... اروحِ ثلاثہ میں ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ تحصیل سکندر آباد میں ایک گاؤں ہے حسن پور بہت بڑا گاؤں ہے۔ ایک وقت میں وہ شاہ اسحاق صاحب اور شاہ یعقوب صاحب کا تھا۔ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی فرماتے تھے کہ شاہ اسحاق صاحب اور شاہ یعقوب صاحب نہایت سخی تھے اور اکثر تنگی کی وجہ سے کچھ ملول سے رہتے تھے، لیکن ایک روز میں نے دیکھا کہ دونوں بھائی نہایت ہشاش بشاش ہیں اور خوشی میں اِدھر سے اُدھر آتے جاتے اور کتابیں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں رکھتے اور خوشی کے لہجہ میں آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر سمجھا کہ شاید آج کوئی بڑی رقم ہندوستان سے آئی ہے۔ (کہ ہر دو اکابر اس وقت مکہ مکرمہ میں تھے)۔ جس سے یہ اس قدر خوش ہیں۔ یہ سمجھ کر میں نے چاہا کہ واقعہ دریافت کروں مگر بڑے میاں صاحب (شاہ اسحاق صاحب) سے تو یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چھوٹے میاں (شاہ یعقوب صاحب) سے پوچھا کہ حضرت آپ بہت خوش نظر آتے ہیں، اس کی کیا وجہ؟ انہوں نے متعجبانہ لہجہ میں فرمایا کہ تم نے نہیں سنا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا کہ ہمارا گاؤں حسن پور ضبط ہو گیا، یہ خوشی اس کی ہے، کیونکہ جب تک وہ تھا ہم کو خدا پر پورا توکل نہ تھا اور اب صرف خدا پر بھروسہ رہ گیا ہے۔

(اروحِ ثلاثہ: ص ۱۰۲)

(ط)...... حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب میں گنگوہ حاضر ہوا تو حضرت کی سہ دری میں ایک کورا بدھنا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو اٹھا کر کنویں سے پانی کھینچا اور اس میں بھر کر پیا تو پانی کڑوا پایا۔ ظہر کی نماز کے وقت حضرت سے ملا اور یہ قصہ بھی بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کنویں کا پانی تو کڑوا نہیں ہے میٹھا ہے۔ میں نے وہ کورا بدھنا پیش کیا۔ حضرت نے بھی پانی چکھا تو بدستور تلخ تھا۔ آپ نے فرمایا اچھا اس کو رکھ دو۔ نماز ظہر کے بعد حضرت نے سب نمازیوں سے فرمایا کہ کلمہ طیب جس قدر جس سے ہو سکے پڑھو اور حضرت نے بھی پڑھنا شروع کیا۔ بعد میں حضرت نے دعاء کے لیے ہاتھ اٹھائے اور نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ دعاء مانگ کر ہاتھ منہ پر پھیر لیے۔ اس کے بعد بدھنا اٹھا کر پانی پیا تو شیریں تھا۔ اس وقت مسجد میں بھی جتنے نمازی تھے سب نے چکھا تو کسی قسم کی تلخی نہ تھی۔ بعد میں حضرت نے فرمایا کہ اس بدھنے کی مٹی اس قبر کی ہے، جس پر عذاب ہو رہا تھا۔ الحمدللہ کی برکت سے عذابِ قبر رفع ہو گیا۔

(ارواحِ ثلاثہ: ص ۳۰۵)

(ع)...... میرے دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے زمانہ میں نظام الدین کی مسجد کا گھنٹہ چلتے چلتے

بند ہوگیا۔ گھڑی ساز کو دکھایا گیا۔ اس نے گھنٹہ کو دیوار ہی پر کھول کر دیکھا اور کہا کہ اس میں تو لمبا کام ہے دو تین دن میں ہو سکے گا۔ دادا صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے مسجد کے سب بچوں کو جمع کر کے فرمایا کہ بسم اللہ سمیت الحمد شریف سات دفعہ اول و آخر درود شریف سات سات دفعہ پھونک مارو۔ سب نے دم کیا اور گھنٹہ خود بخود چلنے لگا۔ بہت مشہور قصہ ہے۔

(ف)...... مولانا محمد منظور صاحب نعمانی حضرت دہلوی کے ملفوظات میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ دہلی کے ایک تاجر ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ کام کر کے سندھ سے واپس آئے تھے۔ وہاں کے کام کی رپورٹ ان سے سن کر حضرت نے فرمایا، دوستو! ہمارا یہ کام (اصلاحی و تبلیغی جدوجہد) ایک طرح کا عمل تسخیر ہے۔ (یعنی جو کوئی اس کام میں لگے گا اور اس کو اپنی دُھن بنالے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے کام بناتا رہے گا)۔''من کان للّٰہ کان اللّٰہ لہ'' اگر تم اللہ کے کام میں لگو گے تو زمین و آسمان اور فضا کی ہوائیں تمہارے کام انجام دیں گی۔ تم اللہ کے کام میں گھر اور کاروبار چھوڑ کر نکلے تھے، اب آنکھوں سے دیکھ لینا تمہارے کاروبار میں کتنی برکت ہوتی ہے۔ اللہ کی نصرت کر کے جو اس کی نصرت ورحمت کی امید نہ رکھے، وہ فاسق اور بے نصیب ہے۔''

مرتب عرض کرتا ہے کہ آخری فقرہ آپ نے ایسے انداز اور اتنے جوش سے کہا کہ حاضرین مجلس کے دل ہل گئے۔ (ملفوظات حضرت دہلوی: ص ۱۳۶،۱۱۲)

(ک)...... حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''میں نے دیوبند کے ایک انگریزی داں سے سنا ہے کہ ایک شخص کا مقدمہ ڈپٹی ظہیر عالم کے یہاں تھا۔ یہ سہارنپور میں ڈپٹی تھے۔ وہ شخص حضرت حاجی محمد عابد حسین صاحب کے پاس آیا کہ حاجی جی مجھے ایک تعویذ دے دو میرا مقدمہ ظہیر عالم کے یہاں ہے، حاجی صاحب نے اس کو تعویذ دیا کہ اس کو پگڑی میں رکھ لینا جب یہ عدالت میں اجلاس پیشی پر پہنچا، ڈپٹی صاحب نے کچھ سوال کیا تو اس نے کہا ٹھہر جائیں دیوبند والے حاجی صاحب کا تعویذ لایا ہوں وہ لے آؤں پھر پوچھنا تو ڈپٹی صاحب اس پر ہنسے کیونکہ وہ عملیات کے معتقد ہی نہ تھے۔ جب وہ تعویذ لے آئے تو ڈپٹی صاحب سے کہا، اب پوچھے کیا پوچھتے ہیں اور دیکھ حاجی صاحب کا تعویذ یہ رکھا ہے (پگڑی دکھلائی)۔ ڈپٹی صاحب نے وہ مقدمہ قصداً بگاڑا۔ لیکن جب فیصلہ لکھا پڑھنے بیٹھے تو وہ موافق تھا۔ پھر ڈپٹی صاحب حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں معذرت کو حاضر ہوئے۔'' (جدید ملفوظات حضرت تھانوی: ص ۶۳)

رنجیت سنگھ کا واقعہ

(ل)...... حضرت تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ رنجیت سنگھ کی حکایت مشہور ہے کہ دریا اٹک پر پہنچا

تو آگے پار ہونے کا اس وقت سامان نہ تھا، (یعنی کشتی وغیرہ) اس نے اسی طرح گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ کسی نے کہا کہ جناب یہ اٹک ہے۔ رنجیت سنگ نے فوراً کہا کہ جس کے دل میں اٹک اس کے لیے اٹک۔ چونکہ اس کا بھروسہ کامل تھا پار ہوگیا۔ جب اہل باطل کے یقین میں یہ اثر ہے تو اہل حق کے یقین میں کیا کچھ ہوگا۔ (الکلام الحسن: ص ۲۱)

اسی نوع کا ایک واقعہ انگریز کی کوٹھی کا گزر چکا۔ حسن العزیز میں بھی رنجیت سنگھ کا واقعہ اس طرح ہے کہ مع فوج جا رہا تھا۔ درمیان میں دریائے اٹک پڑا، کشتی تھی نہیں لوگوں نے کہا کہ اٹک دریا ہے اس نے جواب دیا کہ جس کے دل میں اٹک اس کے لیے اٹک ہے اور گھوڑا ڈال دیا۔ گھوڑوں کے سم کے سوا اور کچھ بھیگا تک نہیں۔ ان کو خدا پر اعتماد تھا خدا نے پار اتار دیا۔

حضرت علاء بن الحضرمی کا واقعہ

سیر کی کتابوں میں علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ کا قصہ مذکور ہے۔ "حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے ان سے کہہ دیا تھا کہ راستہ میں توقف مت کرنا۔ ایک موقع پر پہنچے کہ وہاں سمندر حائل تھا۔ حالانکہ مطلب خلیفہ کا یہ تھا کہ آرام کے لیے توقف مت کرنا نہ یہ کہ سمندر ہو جب بھی توقف نہ کرنا۔ پس عبور عزم بالجزم کر لیا اور دعاء کی کہ موسیٰ علیہ السلام کو راستہ ملا تھا۔ ہم غلامان محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اے اللہ ہم کو راستہ ملے اور بسم اللہ کر کے گھوڑا ڈال دیا اور اُتر گئے۔" اب رہا یہ شبہ کہ کفار کے لیے ایسا کیوں ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ کفار کی دعاء بھی قبول ہو سکتی ہے یہ تو مسلم ہے اسی طرح ان کا توکل بھی مؤثر ہو سکتا ہے غرض جیسے دعاء قبول ہوتی ہے اسی طرح توکل بھی نافع ہو سکتا ہے۔ بلکہ کافر کی بعض دعاء تو ایسی قبول ہوئی ہیں کہ مسلم کی بھی کبھی نہیں ہوئی اور وہ دعاء ہے ابلیس کی "اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ"۔

غیر مسلموں کو بھی توکل نافع ہوتا ہے:

بات یہ ہے کہ "انا عند ظن عبدی بی" انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ جیسا ظن کر لیتا ہے اسی طرح پورا فرما دیتے ہیں۔ بت پرستوں تک کی بھی حاجت پوری ہوتی ہے چونکہ ان کو حق تعالیٰ سے یہی گمان ہوتا ہے۔ (حسن العزیز ۱؍۳: ص ۱۴۲)

حضرت تھانوی کے توکل پر ایک غیر مسلم کا تاثر

(ن)...... انفاس عیسیٰ میں لکھا ہے کہ خلافت کی شورش کے زمانہ کا قصہ ہے کہ یہاں پر ایک شخص تھا۔ ہندو راجپوت پرانا آدمی تھا۔ میں صبح کو جنگل سے آ رہا تھا وہ مل گیا۔ کہنے لگا کہ کچھ خبر ہے

تمہارے لیے کیا کیا تجویزیں ہورہی ہیں، اکیلے مت پھرا کرو۔ میں نے کہا جس چیز کی تم کو خبر ہے مجھ کو اس کی بھی خبر ہے اور ایک اور چیز کی بھی خبر ہے جس کی تم کو خبر نہیں۔ پوچھا وہ کیا؟ میں نے کہا کہ وہ یہ کہ بدون خدا کے حکم کے کسی سے کچھ نہیں ہوسکتا، کہنے لگا پھر تو جہاں چاہو پھرو تمہیں کچھ جوکھم یعنی اندیشہ نہیں۔ دیکھئے ایک ہندو کا خیال کہ خدا پر بھروسہ رکھنے والے کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

(انفاسِ عیسیٰ: ص۵۸۹)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۶

اکابر کا اپنی تنخواہوں کا زائد سمجھنا

میں نے اپنے اکابر کا یہ معمول بہت ہی اہتمام سے ہمیشہ دیکھا کہ انہوں نے اپنی تنخواہ کو اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھا۔ حضرت اقدس سیدی ومرشدی حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند کے متعلق میں آپ بیتی میں کہیں لکھوا چکا ہوں کہ میرے حضرت کی تنخواہ مظاہر علوم میں چالیس اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کی دارالعلوم دیوبند میں پچاس روپے تھی۔ ان دونوں کے متعلق جب بھی ممبران اور سرپرستان کی طرف سے ترقی تجویز ہوتی تو دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ یہ کہہ کر ترقی سے انکار کر دیا کرتے تھے کہ ہماری حیثیت سے یہ بھی زیادہ ہے۔ دونوں مدرسوں میں جب بھی مدرس دوم کی تنخواہ کے برابر پہنچ گئی تو ممبران نے یہ کہہ کر کہ اب ماتحت کے انکار سے ان کی ترقیاں رک جائے گی اس پر مجبوراً ہر دو اکابر نے اپنی اپنی ترقی قبول کی۔ میرے استاد حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نور اللہ مرقدۂ نے کئی بار مجمع میں فرمایا:

''میں نے اپنی ساری ملازمت میں کبھی اپنی ترقی کی درخواست نہ تحریراً پیش کی نہ زبانی کبھی کسی سے کہا''۔

اشرف السوانح صفحہ ۳۷ میں لکھا ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ جب جامع العلوم کانپور میں مدرس اول بن کر تشریف لے گئے تو حضرت کی تنخواہ پچیس روپے تھی، لیکن حضرت تھانوی اس کو زائد ہی سمجھتے رہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ہے:

''میں طالب علمی کے زمانہ میں جب کبھی اپنی تنخواہ سوچا کرتا تھا تو زیادہ سے زیادہ دس روپے سوچتا تھا۔ پانچ روپے اپنی ضروریات کے لیے اور پانچ روپے گھر کے خرچ کے لیے، بس اس سے زیادہ تنخواہ پر کبھی نظر ہی نہیں جاتی تھی۔ نہ اس سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھتا تھا''۔

حضرت مولانا یعقوب کا واقعہ

تذکرۃ الخلیل میں حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کے بھوپال جانے کی تقریب کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدۂ اعلی اللہ مراتبہ اجمیری کی ایک صد ماہوار کی تنخواہ اور بریلوی کے انسپکٹری مدارس کو چھوڑ کر دارالعلوم میں تیس (۳۰) روپے ماہوار پر اکابر کے مشورہ سے تشریف لے آئے تھے۔ اس کے بعد بھوپال کے مدارالمہام صاحب نے جو حضرت

مولانا کے والد مملوک علی صاحب کے شاگرد تھے۔ بحق صاحبزادگی مولانا کو بھوپال تین سو روپیہ ماہوار پر بلانا چاہا۔ مولانا نے یہ جواب تحریر فرمایا ''لا حاجۃ فی نفس یعقوب الاقضاھا''۔ یعقوب کی جو کچھ دلی حاجت تھی وہ پوری ہو چکی کہ بقدر ضرورت معاش کے ساتھ اہل اللہ کا قرب اور علمیہ دینیہ خدمت نصیب ہو گئی۔ لہٰذا اب کہیں آنے جانے کا خیال نہیں۔

اضافات یومیہ جلد نہم صفحہ ۳۵۰ میں حضرت حکیم الامت کا ایک ارشاد نقل کیا ہے فرماتے ہیں: ''نقل کرتے بھی صدمہ ہوتا ہے کہ ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے بے نظیر بزرگ اور پھر بھی ان کی تنخواہ کیا تھی صرف چالیس روپے ماہوار جو آج کا ایک نو آموز طالب علم بھی مشکل سے قبول کرتا ہے کہ اگر تنخواہ کی کمی بھی منظور کرتا ہے تو اس طرح سے کہ اثر میں کمی نہ ہو۔'' چنانچہ ایک مدرسہ میں بوجہ قلت آمدنی مدرسین سے کہا گیا کہ اپنی تنخواہوں میں تخفیف منظور کر لیں۔ صدر مدرس صاحب نے کہا کہ اس طرح تو تخفیف نہیں کروں گا۔ میں تنخواہ تو پوری لوں گا، لیکن جتنی تخفیف ضروری سمجھی جائے اتنی رقم اپنی طرف سے مدرسہ میں داخل کر دیا کروں گا۔ تاکہ نام تو رہے کہ تنخواہ اتنی ہے۔ تو یہاں تک باتیں نظر میں آنے لگیں کہ چاہے تنخواہ کم ہو جائے، لیکن شان ویسی ہی رہے۔ اب تو اتنی تنخواہ کو کوئی خاطر میں بھی نہیں لاتا اور وہاں اس کی بھی بڑی قدر تھی۔ وجہ کیا کہ وہ حضرات اپنے کو صاحب کمال ہی نہ سمجھتے تھے، اس واسطے صاحبِ مال ہونا نہیں چاہتے تھے۔

حضرت گنگوہی کا واقعہ

تذکرۃ الرشید جلد اصفحہ ۵۵ میں اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ طالبِ علمی کے بعد متاہل بھی ہو چکے تھے اور اپنا بار کسی دوسرے پر ڈالنا نہیں چاہتے تھے کہ اس دوران میں ایک جگہ سے قرآن شریف کے ترجمہ پڑھانے کی ملازمت سات روپیہ میں آئی آپ نے اپنے مرشد اعلیٰ حضرت سے اجازت چاہی۔ اعلیٰ حضرت نے منع فرما دیا۔ وہاں سے جواب آیا کہ اس کو منظور نہ کرو اور زیادہ کی آئے گی۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ سہانپور کے رئیس نواب شائستہ خان نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے دس روپے تنخواہ پر بلایا۔ حضرت امام ربانی تو دنیا کی نگاہ میں بہت اونچے تھے، مگر اپنی نگاہ میں ارزاں تھے۔ اس لیے دس کو اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ اعلیٰ حضرت کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ اگر صبر کرتے تو اور زیادہ کی آتی اور چھ ماہ یہ ملازمت اختیار فرمائی تاکہ کسب حلال کا فریضہ بھی ادا ہو جائے اور بعد والوں کے لیے تعلیم پر اجرت لینے کا راستہ بھی کھل جائے۔

حافظ منگتو صاحب کا واقعہ

یہ ناکارہ آپ بیتی جلد۲ صفحہ۳۲ میں اپنے قرآن پاک کے استاد اور کاندھلہ کے جملہ اکابر کے استاذ حافظ منگتو کا قصہ لکھوا چکا ہے کہ میرے دادا نے ان کو دو (۲) روپے ماہوار پر رکھا تھا۔ پندرہ (۱۵)، بیس (۲۰) سال کے بعد سات روپیہ تک پہنچے تھے۔ اس وقت میرے کاندھلہ کے بہت سے اکابر کا علی گڑھ سے تعلق وابستہ ہوگیا تھا۔ ان لوگوں نے بہت ہی کوشش کی کہ حافظ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو کاندھلہ سے علی گڑھ منتقل کریں اور ۴۰، ۵۰، ۶۰، ۱۰۰ روپے تک تنخواہ پیش کی۔ حافظ صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایسے کا بٹھایا ہوا ہوں کہ سات (۷۰۰) سو پر بھی نہیں جا سکتا۔

شیخ علی متقی کا واقعہ

نظام تعلیم و تربیت میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے علی متقی صاحب کنز العمال کا ایک عجیب قصہ لکھا ہے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ گجرات کا سلطان بہادر خان مدت العمر اس آرزو میں رہا کہ شیخ علی متقی اس کے شاہی محل کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سعادت اندوزی کا موقع دیں، لیکن آرزو پوری نہیں ہوتی تھی، وقت کے قاضی عبداللہ المسندی کو بادشاہ نے تیار کیا کہ وہ حضرت شیخ کے کسی طرح ایک مرتبہ سرائے کی تشریف آوری پر آمادہ کریں۔ المسندی بڑی جدوجہد کے بعد اس میں کامیاب ہوئے، لیکن شیخ نے اس شرط پر جانا قبول کیا کہ بادشاہ کے ظاہر و باطن میں اگر کوئی غیر اسلامی عنصر آئے گا تو میں چپ نہیں رہوں گا اور برسرِ دربار ٹوک دوں گا۔ بادشاہ نے شرط منظور کر لی اور شیخ سے کہلا بھیجا کہ آپ کا جو دل چاہے کہیں۔ شیخ تشریف لائے اور جو جی میں آیا بادشاہ کے منہ پر کہتے چلے گئے اور واپس چلے گئے۔ بادشاہ نے ایک کروڑ کی مقدار تنکہ گجراتی بعد میں ہدیہ بھیجا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ تنکہ کی کیا قیمت ہوگی، بہرحال ایک کروڑ کی مقدار بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ علی متقی نے وہ نذرانہ لانے والے قاصد کو قاضی صاحب ہی کے حوالے کر دیا کہ یہ تمہارے ہی ذریعہ سے آیا تم ہی اس کے زیادہ مستحق ہو۔

حضرت نانوتوی کا واقعہ

ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ مولوی امیر الدین صاحب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ بھوپال سے مولانا (حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) کی طلبی آئی اور پانچ سو (۵۰۰) روپے ماہوار تنخواہ مقرر

کی، میں نے کہا کہ اے قاسم تو چلا کیوں نہیں جاتا۔ تو فرمایا کہ وہ مجھے صاحب کمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور اس بناء پر وہ پانچ سو روپے دیتے ہیں۔ مگر میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا، پھر کس بناء پر جاؤں؟ میں نے بہت اصرار کیا مگر نہیں مانا۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۱۷)

سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ نواب صدر یار جنگ صدر الصدور حکومت آصفیہ مزے لے لے کر اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ خاکسار کے سامنے نواب صاحب مرحوم نے اس واقعہ کا اعادہ کتنی دفعہ فرمایا ہوگا۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ علی گڑھ کے جس ضلع میں نواب صاحب کی راجدھانی حبیب گنج واقع ہے، اسی علی گڑھ میں جب وہ کول کے نام سے مشہور تھا۔ ایک رئیس مولوی اسماعیل صاحب نامی تھے۔ جن کو حدیث پڑھنے کا شوق ہوا، لیکن ریاست کے کاروبار کی مشغولیت اس کا موقع نہیں دیتی تھی کہ گھر سے باہر نکل کر اپنے شوق کو پورا کریں۔ نواب صاحب فرماتے تھے کہ مولوی اسماعیل صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ کسی عالم کو جو حضرت کے نزدیک قابلِ اعتما ہو، علی گڑھ بھیج دیا جائے تاکہ میں ان سے حدیث پڑھوں۔ جواب میں مولانا نے ارقام فرمایا کہ اور کسی عالم کو اپنے کاموں سے فرصت کہاں ہے جو آپ کے پاس جانے پر راضی ہوسکتے ہوں، البتہ ایک بے کار آدمی خود یہ فقیر ہے حکم ہو تو بندہ ہی حاضر ہو کر آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرے۔

مولوی اسماعیل بے چارے کے لیے یہ نوید جاں افزا تھی کہ خود حضرت نانوتوی پڑھانے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ بہ دل و جان تشریف آوری کی تمنا انہوں نے ظاہر کی۔ کہتے تھے کہ ان کو پڑھانے کے لیے علی گڑھ میں مولانا نے قیام فرمایا اور مولوی اسماعیل جو کتابیں پڑھنا چاہتے تھے، ان کو پڑھا کر آپ علی گڑھ سے تشریف لے گئے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر اسی کے ساتھ دلچسپ کہیے یا دلدوز معاوضہ کی کمی بیشی کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے۔ وہ یہ ہے کہ شیروانی صاحب نور اللہ ضریحہ کے بیان کا مرکزی جزو یہ تھا کہ تنخواہ کا مسئلہ جب پیش ہوا تو مولوی اسماعیل نے دست بستہ عرض کیا، حضرت والا جو کچھ فرمائیں گے وہی رقم خدمت میں پیش کی جائے گی۔ جواب میں حکم ہوا کہ جب تک میں تمہارے یہاں ہوں ماہوار پندرہ روپے دے دیا کرنا تاکہ گھر بھیج دوں۔ اس قلیل رقم کو سن کر مولوی اسماعیل شرمندہ تھے، لیکن بات پہلے ہی طے ہوچکی تھی کہ یہ مسئلہ بجائے تمہارے فیصلہ کے میری رائے کے تابع رہے گا۔ اسی لیے خاموش ہوگئے۔ کئی مہینے حسب وعدہ پندرہ کی رقم پیش کرتے رہے۔

اسی عرصہ میں ایک دن مولوی اسماعیل جب پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو مولانا نے فرمایا کہ میاں اسماعیل! جو رقم اب تک تم دیتے تھے اس پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آگئی۔ وہ خاموش ہوئے

کہ شاید کچھ اضافہ کی منظوری عطاء فرمائی جائے گی، لیکن جب ان سے مولانا یہ فرمانے لگے کہ بھائی پندرہ روپے جوتم دیتے تھے ان میں دس تو میں اپنے گھر کے لوگوں کو دیا کرتا تھا اور پانچ روپے والدہ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ کل خط آیا کہ والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس لیے ان پانچ روپے کی ضرورت اب باقی نہیں رہی، آیندہ بجائے پندرہ کے دس ہی روپے دیا کرنا۔ مولوی اسماعیل ششدر وحیران تھے۔ کہتے جاتے تھے کہ حضرت مجھ پر کوئی بار نہیں، لیکن اِدھر سے اصرار تھا کہ غیر ضروری روپے کا بار اپنے سر کیوں لوں؟ آخر بات دس ہی روپے والی طے ہوگئی۔ مگر قاری طیب صاحب جنہوں نے اس قصہ کو براہِ راست نواب صدر یار جنگ سے سنا ہے وہی خاکسار سے فرماتے تھے کہ اس قصہ کے آخری جزء کے متعلق خیال گزرتا ہے کہ نواب صاحب کو کچھ اشتباہ ہوگیا تھا۔ مختلف وجوہ سے فرماتے تھے کہ اس جزء کے صحت میں مجھے کلام ہے۔ مثلاً یہی کہ تصحیح کے سوا مولانا نے درس وتدریس پر کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ اس پر تمام اکابر دیوبند کا اتفاق ہے۔

(سوانح قاسمی: ص ۴۲۸)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۷

ماحول کا اثر

ماحول کے اثرات تو ایسے اظهر من الشمس ہیں کہ ان کا تو احصاء اور شمار بھی بہت دشوار ہے۔ ہر سال مدارس میں دیکھتے ہیں کہ جو طلبہ دوسرے مدارس میں اساتذہ کے ہاتھوں سے خوب پٹتے ہوئے آتے ہیں، وہ دوسرے مدارس میں جا کر اس قدر صاحبِ عزت اور صاحبِ نخوۃ بن جاتے ہیں کہ ان کی شان میں اساتذہ کی سخت کلامی بھی موجب توہین بن جاتی ہے، جو طلبہ دوسرے مدارس میں اپنے ہاتھ سے پکی پکی روٹی اللہ کا شکر ادا کر کے مزے سے کھاتے ہیں، ان کو بڑے مدارس میں جا کر اس پر تاؤ آتا ہے کہ نان ذرا سا جل گیا۔ لیجیو، دیکھو، پکڑو، یوں طباخ کو نکالو، منشی کو معطل کرو، نظامت نا اہل ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں بھی کہاں سے کہاں بہک جاتا ہوں۔ ماحول کے اثرات لکھوا رہا تھا۔ مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روٹی پر کہیں سے کچی اور کہیں سے جل جانے پر ناراضی کے واقعات سن کر تو اتنی چوٹ لگتی ہے۔ ہر مدرسہ میں اور بڑے مدرسوں میں یہ مصیبتیں سنتا رہتا ہوں، جس پر ایک غیر متعلق واقعہ یاد آ گیا۔ جس کو میں فضائل صدقات حصہ دوم کے بھوکے رہنے کے دس فوائد کے ذیل میں لکھوا چکا ہوں کہ ایک بزرگ نے اپنے کسی ملنے والے کی دعوت کی اور ان میں سے الٹ پلٹ کر اچھی روٹی تلاش کرنے لگے۔ میزبان بزرگ نے فرمایا یہ کیا کر رہے ہو، جس روٹی کو تم بُری سمجھ کر چھوڑ رہے ہو اس میں اتنے اتنے فوائد ہیں اور اتنی اتنی مشقت اٹھانے والوں کی اس میں محنت ہوتی ہے کہ بہت سے کام کرنے والوں کے عمل کے بعد ابر میں پانی آیا پھر وہ برسا، پھر ہواؤں کی، زمین کی، چوپایوں کی اور آدمیوں کی محنت اس میں لگی جب تو یہ روٹی تمہارے سامنے آئی، اس کے بعد تم اس میں اچھی بری چھانٹنے لگے؟ کہتے ہیں کہ ایک روٹی پک کر تمہارے سامنے اس وقت تک نہیں آتی جب تک اس میں تین سو ساٹھ کام کرنے والوں کا عمل نہیں ہوتا۔

سب سے اول حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانے سے ناپ کر چیز نکالتے ہیں، پھر وہ جو ابر پر مامور ہیں اور بادلوں کو چلاتے ہیں، پھر چاند، سورج اور آسمان، پھر وہ فرشتے جو ہواؤں پر مامور ہیں، پھر چوپائے، سب سے آخر میں روٹی پکانے والے، سچ ہے پاک ارشاد میرے رب سبحانہ وتقدس کا ''وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها'' اگر تم اللہ تعالیٰ کی ایک

نعمت اور اس کی تفصیلات کو شمار کرنے لگو تو کبھی بھی پوری نہیں گن سکتے۔

(فضائل صدقات حصہ دوم عکسی: ص ۷۱۴)

یہ غیر متعلق بات ویسے ہی یاد آ گئی، اس وقت تو مجھے ماحول کے اثرات بیان کرنے تھے۔ اس قسم کے واقعات تو بہت ہی لا تعدو لا تحصیٰ ہیں۔ اس وقت چند واقعات لکھواتا ہوں۔

مولوی لئیق مرحوم کا واقعہ

(۱)...... مجھے اس وقت اپنے ایک دوست مولوی لیئق احمد سہارنپوری مرحوم کا قصہ یاد آیا، جو آپ بیتی نمبر ۴ میں بھی لکھوا چکا ہوں۔ جو بہت ہی ذی استعداد تھا اور میرے خاص دوستوں میں تھا۔ مظاہر علوم میں جب فارغ التحصیل ہوا تو میں نے بلا اس کی تحریک کے از خود اس کی مدرسی کی تحریک کی، حضرت ناظم صاحب مولانا عبد الطیف صاحب بھی اس کی استعداد سے واقف تھے، انہوں نے پسند کیا۔ میں نے اس کے لیے ۲۰ روپے تنخواہ تجویز کی اور اس نے بہت خوشی سے اس کو قبول کیا، لیکن دو تین دن بعد آ کر اس نے قلت تنخواہ کا عذر کیا کہ کم از کم پچیس (۲۵) روپے میں کام کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ بیس روپے بھی تمہاری خصوصی رعایت تھی۔ ضابطہ کے موافق پندرہ سے زیادہ نہ ہونی چاہیے تھی۔ اس نے منظور نہ کیا اور نظام الدین بسلسلہ تبلیغ و تدریس چلا گیا اور دونوں کاموں کا معاوضہ آٹھ (۸) روپیہ تنخواہ تجویز ہوئی۔ چونکہ نظام الدین کی سرپرستی بھی اس وقت اس سیہ کار کے متعلق تھی، در میں کثرت سے نظام الدین حاضر ہوتا رہتا تھا۔ ایک سال بعد میری نظام الدین حاضری پر وہاں کے مہتمم نے وہاں کے مدرسین کی تنخواہ میں اضافہ کی درخواست پیش کی اور کہا کہ مدرسہ کے یہ مدرسین اگرچہ ان کی طرف سے تنخواہ میں اضافہ کی کوئی درخواست نہیں ہے، مگر ان کی ہر ایک کی آٹھ روپے تنخواہ ہے، لیکن دو روپیہ اگر اضافہ کر دیا جائے تو اچھا ہے۔ میں نے کہا کہ دو نہیں چار، مگر چچا جان نے فرمایا کہ ابھی تو دو ہی رہنے دو۔ ہمارے مدرسین کی عادت نہ بگاڑو۔

ان مدرسین میں ایک نام عزیز لیئق مرحوم کا بھی تھا۔ میں نے مغرب کے بعد عزیز مرحوم کو بلایا۔ وہ سمجھ تو گیا اور نہایت شرمندگی سے سر جھکائے ہوئے آیا۔ وہ منظر اس وقت بھی یاد ہے۔ میں نے پوچھا کہ لیئق تو وہی ہے، وہ چپ رہا۔ میں نے کہا خاموش رہنے کی ضرورت نہیں، میں تو صرف بات پوچھتا ہوں کہ تو نے وہاں کے بیس روپے کو قبول نہ کیا اور یہاں آٹھ روپیہ پر کام کر رہا ہے۔ اس مرحوم نے بہت ہی شرمندگی سے یہ کہا کہ صرف ماحول کا اثر ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے تو بیس روپے بڑی خوشی سے قبول کیے تھے، مگر وہاں کے مدرسین نے مجھے مجبور کیا

کہ اگر تیری پچیس روپے تنخواہ ہوگئی تو ہمارا بھی راستہ کھلے گا اور بھی اسی قسم کے واقعات وہاں لکھوا چکا ہوں۔ ماحول کے تغیرات کے تو بہت سے قصے میں سناتا بھی ہوں۔ شاید آپ بیتی میں بھی کہیں دو چار گزر گئے ہوں۔

مولوی احمد احسن گنگوہی کا واقعہ

(۲)...... یہ قصہ میں نے اپنے والد صاحب سے متعدد مرتبہ سنا ہے کہ گنگوہ میں لال مسجد کے نام سے جو مشہور مسجد ہے۔ میرے والد صاحب کا ابتدائی طالب علمی کے زمانہ میں وہیں قیام تھا۔ اس کے سامنے مولوی احمد حسن صاحب مرحوم کی ایک ٹال تھی۔ اپنے بچپن میں میں نے بھی مرحوم کو دیکھا۔ بہت بوڑھے آدمی تھے، اپنی ٹال کے دروازے میں چار پائی پر پڑے رہا کرتے تھے۔ وہ اپنا قصہ سنایا کرتے تھے اور اپنے پوتوں سے یوں کہا کرتے تھے کہ بچو! تمہیں کیا کہوں۔ ماحول اور زمانہ کا تغیر تو خود مجھ پر بھی گزر چکا ہے۔ میں اپنی جوانی میں اسی ٹال میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک فوجی نوجوان گزرا اور اس نے لال مسجد کو جھک کر سلام کیا، میں نے اس کو بلایا کہ بھائی اور تو بہتری چیزیں دیکھی ہیں، مگر مسجد کو جھک کر سلام کرنا ابھی تک نہیں دیکھا۔ اس نے کہا اللہ کا گھر ہے۔ میرے بار بار اصرار سے پوچھنے پر اس نے یہ قصہ سنایا کہ میں اپنی ابتدائی جوانی میں گھر سے لڑ کر بھاگ گیا۔ صحت اچھی تھی، بدن میں طاقت تھی۔ سہارنپور جا کر پولیس میں نوکری کر لی۔

میری جوانی اور قوت کو دیکھ کر دو تین سال میں مجھے فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد خوب لوٹ مار کی۔ جہاں سے جو کچھ ملا خوب جمع کیا۔ دو تین سال میں سو (۱۰۰) اشرفیاں جمع کر لی اور سو بوٹ تیار کر کے گھر والوں کو دکھلانے کے واسطے گیا اور جب گنگوہ پہنچا، گھر لکھنؤ کے قریب تھا تو میں نے سوچا کہ خوب نہا دھو کر بن سنور کر گھر جاؤں گا۔ اس مسجد کے غسل خانہ میں خوب صابن بوٹنہ وغیرہ مل کر نہایا، نہانے کے بعد خوب پاؤڈر ملا اور اس کی کھونٹی پر اپنی سو اشرفیاں والی ہمیانی لٹکا دی جو لکھنوتی کے قریب جا کر یاد آئی، جب ہی وہاں سے لوٹا، یہاں آ کر دیکھا تو کون چھوڑتا، واپس چلا گیا۔ اس کے بعد سے جب اس مسجد پر آتے جاتے گزر ہوتا ہے تو اس مسجد کو سلام کرتا ہوں۔

حاجی احمد حسن نے کہا کہ میں نے اس فوجی سے کہا کہ دیکھ وہ چھپر کے نیچے کھونچی میں ایک چیز لٹک رہی ہے وہ تیری تو نہیں۔ یا اس نے اندر جا کر دیکھا اور خوشی سے اچھل پڑا۔ کہنے لگا وہی ہے، وہی ہے، اس نے اشرفیاں کو نکال کر گنا تو پوری سو تھیں۔ مجھے اس وقت اس میں سے دس اشرفیاں نکال کر دونوں ہاتھوں سے میرے سامنے پیش کیں۔ مجھے اس وقت اس قدر غصہ آیا کہ جیسا کسی

نے جوتا مارا ہو۔ میں نے اُسے بہت ہی خفا ہو کر برا بھلا کہا اور کہا کہ اس واسطے تین سال سے اس کی حفاظت کر رکھی ہے کہ تو اس کی مزدوری دے گا۔

مگر بچو! تمہیں ماحول کا کیا اثر بتاؤں کہ اب بڑھاپے میں یوں سوچا کرتا ہوں کہ جب وہ اتنی خوشامد کر رہا تھا، منت کر رہا تھا، اگر لے لیتا تو کیا حرج تھا۔ اس قصے میں جہاں ماحول کا اثر اور زمانہ کا تغیر اصل قصہ میں مذکور ہوا، دوسری چیز ماحول کہو یا زمانہ کا تغیر کہو۔ یہ بھی عجیب ہے کہ تین سال تک وہ ہمیانی چھپّر میں کھونٹی کے اوپر لٹکی رہی، نہ کسی نے اس کو اٹھائی نہ چرائی۔ وہ ٹال اس ناکارہ نے بھی دیکھی، زنجیر تالہ تو درکنار اس کو کواڑ اور چوکھٹ بھی نہیں تھی۔ اب تو اس جگہ بڑی تعمیرات ہو گئی ہیں۔

ایک سقہ کا واقعہ

(ب)......اسی کے ساتھ ایک دوسرا قصہ بھی میں نے اپنے والد صاحب سے کئی مرتبہ سنا ہے کہ جب یہ نہر جمن کھودی جا رہی تھی جو رائے پور سے لے کر سہارنپور کاندھلہ ہوتی ہوئی دہلی تک پہنچی ہے تو نانوتہ کے قریب زمین کھودتے ہوئے زمین کے اندر سے سونے کی ایک سری بہت لمبی بہت موٹی نکلی جو مزدوروں نے سقہ کو دے دی، جو وہاں پانی ڈالا کرتا تھا اور وہی کل مزدوروں کا گویا چودھری یا امیر تھا۔ اس سقے نے دو مزدوروں کو لے کر اسے اٹھایا اور قریب ہی ایک انگریز کا ڈیرا تھا جو گویا اس سارے کاروبار کا افسر اعلیٰ تھا اور ٹھیکے دار تھا، اس کو لے جا کر دے دی۔ اس نے اس کو رکھ لی اور اس کا اندراج کر لیا، مگر ان مزدوروں پر اور سقے پر بہت تعجب کرتا رہا کہ اتنی بڑی دولت ان کو ملی آپس میں بانٹ لیتے تو خبر بھی نہ ہوتی۔

بیس (۲۰) پچیس (۲۵) سال بعد جب کہ یہ انگریز مظفر نگر کا کلکٹر بنا۔ اس کا عدالت میں یہ مقدمہ پیش ہوا کہ ایک سقے نے ایک کمسن بچی کے کان میں گلٹ کی بالیاں دیکھی تھیں، اس سقہ نے سونے کی سمجھ کر اس لڑکی کو قتل کر کے کنویں میں ڈال دیا اور بالیاں نکال لیں۔ یہ سقہ پیش ہوا اور اس نے اقرار بھی کر لیا۔ اس کلکٹر نے اس کو پہچان لیا اور اس سے دریافت کیا کہ تو وہی سقہ ہے جو نہر جمن کی کھدائی میں تھا اور سونے کی سری واپس کر دی تھی۔ اس نے اس کا بھی اقرار کیا۔ کلکٹر نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا بات؟ اس نے کہا کہ اس وقت ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ دوسروں کی چیز نہیں لی جا سکتی۔ اس کو ہم سُور کھانے سے زیادہ بُرا سمجھتے تھے اور آج کل یوں ہے کہ جو مل جائے وہ اپنا ہی ہے۔ کلکٹر نے مقدمہ یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ یہ ہماری حکومت کا اثر ہے اس کا قصور نہیں۔

میں نے یہ قصہ ان ہی الفاظ میں سنا۔ ممکن ہے کلکٹر کے یہاں کسی خاص وجہ سے مقدمہ گیا ہو۔

اس زمانہ کے قصوں میں یہ چیزیں خاص طور سے سمجھ میں آئیں کہ منصف انگریز بے تکلف اپنی حکومت پر تنقید کرلیا کرتے تھے۔

(ج)...... ماحول کا ایک عجیب اثر تو میں نے خود بھی اپنے گھر میں دیکھا۔ میری بچیاں مختلف العمر ۴ سال سے ۷ سال تک کی درمیان کی جب سڑک پر سے باجے یا ڈھول کی آواز آتی تو زور سے اپنے کانوں میں انگلیاں دے دیا کرتی تھیں اور ایک دم شور مچالیا کرتی تھی کہ شیطان بول رہا ہے اور اپنی ماں، بڑی بہنوں سے پوچھتی رہتی تھیں کہ شیطان چلا گیا یا نہیں۔ اب ان کی اولاد اس عمر والی جب ڈھول یا باجے کی آواز آتی ہے تو ایک دوسرے کو بلاتی ہیں کہ چل تماشہ دیکھیں۔ میں اپنی بچیوں کو بڑی غیرت دلاتا ہوں کہ تمہارا فعل تمہاری ماں کا اثر تھا اور تمہارے بچوں پر اثر تمہارا ہے۔

ہولی دنوں میں لال رنگ سے احتراز

(د)...... اس کے ساتھ ایک واقعہ اور بھی یاد آ گیا۔ اپنے بچپن میں اپنے سارے گھرانے میں بلکہ خاندان میں یہ معمول دیکھا کہ ہولی کے دنوں میں رنگا ہوا کپڑا نہیں پہنا جاتا تھا۔ عروس بھی سفید کرتیاں اور کالے پائجامے عموماً پہنا کرتی تھیں۔ سُرخ رنگ سے بچپن کا بڑا ہی اہتمام دیکھا تھا۔ اب تو وہ اہتمام نہیں دیکھ رہا ہوں۔

یہ قصہ بھی اپنے بچپن میں گھر کی عورتوں سے کثرت سے سنا۔ کسی مرد سے سنتا تو یاد نہ رہتا۔ ایک بزرگ بہت ہی نیک پابند صوم وصلوٰۃ واوراد وظائف تھے۔ ان کے انتقال کے بعد کسی نے خواب میں ان کو دیکھا۔ نہایت ہی پرتکلف مکان ہے، نہایت ہی عمدہ بستر ہے، قالین ہیں، نہایت ہی پرتکلف تخت پر آرام کررہے ہیں، مگر ہونٹوں پر ایک چھوٹا سا سانپ کا بچہ لپٹ رہا ہے۔ خواب میں دیکھنے والے نے ان سے بڑی حیرت کے ساتھ پوچھا کہ اس اعزاز واکرام کے ساتھ یہ سانپ کیسا؟

انہوں نے کہا کہ ہولی کے زمانہ میں میں نے پان کھا رکھا تھا اور ایک مریل سا گدھا سامنے کو جارہا تھا، میں نے ایک پان کی پیک اس پر تھوک کر مذاقاً یہ کہہ دیا تھا کہ آج ساری دنیا رنگی ہوگئی ہے تجھے کسی نے نہ رنگا، تجھے میں رنگ دیتا ہوں۔ یہ قصہ اور خواب میرے بچپن کے زمانے میں بہت ہی شائع ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے یاد ہے کہ پان کھانے والے بھی کچھ جھجکتے تھے اور یہ قصہ بوڑھیاں بہت ہی اہتمام کے ساتھ دلہنوں اور نوعمر لڑکیوں کو سنایا کرتی تھیں۔

(س)...... اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد تو میں بیسیوں جگہ لکھوا چکا ہوں اور ہزاروں

جگہ سنا بھی چکا ہوں۔ یوں فرمایا کرتے تھے کہ طالب علم چاہے کتنا ہی غبی ہو اور کند ذہن ہو اگر اس کو دوستیوں اور یار باشی کا شوق نہیں ہوا تو کسی وقت کام کا ہوکر رہے گا اور چاہے کتنا ہی ذہین ذی استعداد ہو اگر اس کو دوستیوں کا شوق ہوا تو آخر میں بے کار ہوکر رہے گا اور ماحول کے اثرات پر تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بھی کثرت سے مختلف عنوانات سے متنبہ فرمایا ہے۔

اعتدال میں لکھا ہے کہ اہل اللہ سے جتنی بھی محبت پیدا کرسکو دریغ نہ کرنا اور بے دین لوگوں سے جتنا بھی ممکن ہو احتراز کرنا اور یکسو رہنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''صالح اور بہتر ہم نشین کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مشک والا ہو کہ اگر اس سے مشک نہ بھی ملے تب بھی اس کو خوشبو تو پہنچے ہی گی اور برے ہم نشین کی مثال اس شخص کی سی ہے جو بھٹی کا دھونکنے والا ہو کہ اگر کوئی چنگاری وغیرہ گرگئی تو بدن جلادے گی یا کپڑے جلادے گی اور اگر چنگاری بھی نہ اڑے تو اس کا دھواں اور بو تو پہنچے ہی گی۔'' بخاری، مسلم وغیرہ میں یہ حدیث مختلف الفاظ میں نقل کی گئی ہے۔

حضرت لقمان حکیم کی نصیحت ہے کہ بیٹا! صلحاء کی مجلس میں بیٹھا کر اس سے تو بھلائی کو پہنچے گا اور ان پر رحمت نازل ہوگی تو تو اس میں شریک ہوگا اور بروں کی صحبت میں کبھی نہ بیٹھنا کہ اس سے بھلائی کی توقع نہیں اور کسی وقت ان پر کوئی آفت نازل ہوئی تو تو بھی شریک ہوجائے گا۔ اس لیے بری صحبت کے اثرات سے بہت احتراز کرنا چاہیے۔ اللہ والوں کی صحبت اور ان کے پاس بیٹھنے کو اکسیر سمجھنا چاہیے۔ ان کی صحبت نیک اعمال کی ترقی کا سبب ہوتی ہے۔ (اعتدال: ص۱۹)

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

تقریباً بیس پچیس سال سے ماہِ مبارک میں یہاں ذاکرین کا مجمع ہوتا ہے جو ہر سال بڑھتا ہی رہتا ہے ان میں غیر ذاکر مہمان بھی آتے رہتے ہیں۔ ماہِ مبارک کے بعد کئی ماہ تک بہت ہی رنج و قلق کے خطوط آتے رہتے ہیں کہ عبادت میں اور لو میں اور ذکر میں تلاوت میں جو لذت وہاں آتی تھی اب نہیں رہی میں اس کا جواب یہی لکھوایا کرتا ہوں کہ یہ ماحول کا اثر ہوتا ہے، اس وقت میں یہاں اللہ کا نام لینے والے بہت جمع ہوجاتے ہیں ان کے ماحول کا اثر ہوتا ہے تم بھی اپنے یہاں چند دینی احباب کو جمع کرکے دین کا ماحول بنالو تو یہ اثرات ان شاء اللہ پھر پیدا ہوجائیں گے۔ حضرت دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں بہت کثرت سے اس پر زور دیا گیا ہے کہ ماحول کو بدلو۔

اسی لیے وہ حضرات گھروں سے نکالنے پر زور دیتے ہیں کہ گھریلو ماحول میں دینی اثرات پیدا نہیں ہوتے اور جب دینی جماعت کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہنا سہنا کھانا پینا ہوگا تو ماحول کے

اثرات ضرور پڑیں گے۔ مجھ سے سینکڑوں دیہاتی لوگوں نے جو بیعت کا تعلق رکھتے ہیں یہ کہا کہ تہجد کی بہت ہی کوشش کی مگر کبھی توفیق نہیں ہوئی، تبلیغی جماعت کے ساتھ ایک چلہ گزارا تھا، اللہ کے فضل سے ایسی عادت پڑ گئی کہ اب خود بخود آنکھ کھل جاتی ہے۔

حسن العزیز میں لکھا ہے کہ حضرت کی مجلس میں یہ ذکر تھا کہ انٹر کلاس اور جو درجے اس کے اوپر کے ہیں ریل میں ان میں متکبرین بیٹھتے ہیں اور اس کا اثر قلب پر پڑتا ہے ارشاد فرمایا جب کبھی تیسرے درجے میں بڑا آدمی بیٹھ جاتا ہے تو اس کا مزاج بھی نرم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ چارپائی پر بیٹھنے سے بہ نسبت کرسی کے مسکنت آجاتی ہے۔ (حسن العزیز ۲/۳:ص ۱۲۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد تو یہ ہے کہ جانوروں تک کا اثر ہوتا ہے، مشکوٰۃ شریف میں بخاری و مسلم کی روایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد نقل کیا ہے کہ اونٹ والوں میں فخر اور تکبر ہوتا ہے اور بکری پالنے والوں میں مسکنت ہوتی ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ فخر و تکبر اونٹ اور گھوڑے والوں میں ہوتا ہے۔ بہت سی روایات میں ہے کہ فخر و تکبر اونٹ اور گھوڑے والوں میں ہوتا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ مزاج کی سختی اور ظلم کسانوں میں ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بہت سی روایات اس مضمون کی ہیں کہ ان جانوروں تک میں اثرات ہوتے ہیں۔

اسی واسطے علماء میں مشہور ہے کہ ہر نبی سے پہلے بکریاں چروائی جاتی ہیں تاکہ ان میں مسکنت اور ہٹ دھرمی پر صبر کی عادت پڑ جائے۔ بکری ضعیف جانور ہے لیکن جب چلتے چلتے وہ اگلے دونوں پاؤں جما کر کھڑی ہوجائے تو وہ کھینچنے سے کھنچے گی نہیں اور ڈنڈا مارنے سے اس کا پیر ٹوٹ جائے گا اس لیے بکریاں چرانے والے کو بہت زیادہ متحمل مزاج اور ضد اور ہٹ دھرمی کی بجائے نرمی کا مشتاق ہونا پڑتا ہے اس لیے ہر نبی کو پہلے بکریاں چرانی پڑتی ہیں۔

حضرت موسیٰ کا واقعہ

حضرت پیران پیر نور اللہ مرقدہٗ کے مواعظ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو باتیں کی تھیں ان میں یہ بھی تھا کہ میں نے تم کو اپنے پیغامات اور بات چیت اور اپنا مقرب بنانے کے ذریعہ سے لوگوں پر بزرگی عنایت فرمائی ہے ایک دن وہ تھا کہ تم بکریاں چرا رہے تھے۔ پس ان میں سے ایک بکری بھاگ نکلی اور تم اس کے پیچھے دوڑ پڑے، یہاں کہ تم نے اس کو پکڑ لیا۔ حالانکہ تم بھی تھک گئے تھے اور بکری بھی تھک گئی تھی۔ پس تم نے اس کو اپنی گود میں لیا اور کہا کہ پیاری تو نے اپنے آپ کو بھی تھکایا اور مجھے بھی تھکایا۔ اسی شفقت کا یہ صلہ ملا کہ سرکش

بندوں کوخدا وندی آستانہ پر لانے کے لیے شاہی سفیر قرار پائے۔

(مواعظ پیران پیر: ص۵۶۴)

لیکن عام طور پر چونکہ بکری میں مسکنت ہوتی ہے اسی واسطے کان پکڑی بکری مشہور ہے کہ کان پکڑ کر جدھر کو چاہے لے جاؤ۔ اس کے لیے جانے کے واسطے رسوں کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ سبعہ معلقہ کا دوسرا معلقہ جو طرفہ بن العبد کا ہے اس کے دو شعر ہیں۔

عن المرء لا تسئل و ابصر قرینہ

فإن القرین بالمقارن یقتدی

کہتے ہے کہ جب آدمی کا حال معلوم کرنا ہو تو اس کے ہم نشینوں کو دیکھ کیسے ہیں۔ یعنی اگر اس کے ہم نشین یار دوست اچھے ہیں تو وہ بھی اچھا ہے اگر برے ہیں تو وہ بھی برا ہے اس لیے کہ آدمی اپنے ہم نشینوں کا مقتدیٰ ہوا کرتا ہے۔ دوسرا شعر ہے:

اذا کنت فی قوم فصاحب خیارھم

ولاتصحب الأردی فتردی مع الردی

حضرت گنگوہی کی صاحبزادی کا واقعہ

جب تو کسی قوم میں پہنچے تو ان کے اچھوں کے ساتھ ہم نشینی اختیار کر۔ بروں کے ساتھ نہ رہنا کہ تو بھی ان کے ساتھ برباد ہو جائے گا۔ تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا: ''حضرت مرشدنا حاجی صاحب گنگوہ تشریف لائے۔ میری لڑکی کی عمر تین سال کی تھی، حضرت نے اس کے ہاتھ میں پانچ روپے شیرنی کے لیے دیے۔''

میری لڑکی نے وہ روپیہ لے کر حضرت کے قدموں میں رکھ دیئے، پھر دیئے، اس نے ایسا ہی کیا ہر چند حضرت نے پھسلایا تو تو میری بیٹی ہے لے لے، مگر اس نے مانا ہی نہیں حضرت نے فرمایا۔ آخر تو فقیر کی بیٹی فقیرن ہی ہے اس کے بعد یہ دعاء فرمائی:

''ایں دختر صاحب نصیب است و ہیچ عسرت در دنیا نہ بیند والا زاہد و صالح خاہد شد۔

حضرت نے فرمایا: ''الحمدللہ میری لڑکی کو دنیا کی محبت بالکل نہیں ہے۔''

(تذکرۃ الرشید: ص۲۷۵/ج۲)

یہ بھی ماحول کا ہی اثر تھا اس ناکارہ کو یاد نہیں کہ اپنے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی زندگی میں گھر کی بڑی بوڑھیوں کے علاوہ کسی شخص کا بھی کوئی عطیہ یا ہدیہ میں نے اپنے ہاتھ سے قبول کیا ہو۔ لوگوں کو زیادہ اصرار پر کہہ دیتا تھا کہ آپ والد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیجئے وہ چاہیں گے تو

مجھے دے دیں گے ورنہ نہیں، لیکن اب اپنی اولاد کو دیکھتا ہوں کہ وہ جو ملے چپکے سے جیب میں رکھ لیتے ہیں اور اولاد کی اولاد کو دیکھتا ہوں کہ وہ جو ملے چپکے سے لینے کے دندنا کر لیتی ہے۔ میں تو بسا اوقات کہہ دیتا ہوں کہ میرے باپ کا دور نہ ہوا، ورنہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔

مولوی محمد صاحب وکیل الہ آبادی کا واقعہ

جدید ملفوظات حضرت تھانوی میں لکھا ہے کہ فرمایا کہ مولوی محمد صاحب وکیل الہ آباد کا قصہ میرے ایک دوست نے سنایا کہ میں ایک دفعہ ان کے یہاں مہمان تھا۔ میں نے ایک روز دیکھا کہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ہنستے کھیلتے یہ کہتے پھرتے ہیں۔ آیا جی ہمارے یہاں آج شیخ جی آئے ہیں، اس روز کھانے میں بہت دیر ہوگئی۔ انہوں نے سمجھا کہ شیخ جی کوئی بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اچھے اچھے کھانے پک رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کھانا آنے میں دیر ہوئی۔ جب بہت دیر ہوگئی اور کھانے کا وقت گزر گیا تو میں نے کسی سے پوچھا کہ بھائی یہ شیخ جی کون ہیں اور وہ اب تک دکھائی بھی نہیں دیئے لوگوں نے کہا کہ آج ان کے ہاں فاقہ ہے بچے اس کو شیخ جی کے لقب سے یاد کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ ہمارے حضرت نے فرمایا کہ بزرگوں کی اولاد میں بھی اثر ہوتا ہے خواہ خود بزرگ نہ ہوں۔ یہ وکیل صاحب بزرگ زادہ تھے۔

(جدید ملفوظات: ص ۲۱)

یہ قصہ میں نے اس واسطے لکھوایا ہے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا اثر صاحبزادی میں اور اس سیہ کار میں اپنے باپ کا اثر تھا، ورنہ میں خود نا اہل ہوں، اس لیے اولاد پر میرا اثر ہوا۔ تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ ملحدوں سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیے، پاس جانا بھی اچھا نہیں۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۲۴۵ رج ۲)

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کی احادیث میں کثرت سے فرمایا کہ جو اس کی خبر سنے دور رہے پاس کو نہ جائے۔

علی میاں نے جو ملفوظات حضرت شاہ یعقوب صاحب مددی بھوپالی کے نقل کیے ہیں، اس میں حضرت شاہ صاحب کا ارشاد نقل کیا ہے: ''آدمی جس ماحول میں رہتا ہے عموماً اس میں رنگ جاتا ہے اس کا ذہن اور دل و دماغ اسی میں چلتا ہے اور سارے اعضاء اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ جب دوسرے ماحول میں جاتا ہے تو بڑی اجنبیت محسوس کرتا ہے۔''

حضرت مجدد صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ ایک چمڑے پکانے والے کالڑکا چمڑے دار ماحول سے اتنا متاثر تھا کہ ایک بار وہ عطر کی دُکان سے گزرا تو عطر کی خوشبو کا متحمل نہ ہو سکا اور بے

ہوش ہر کر گر پڑا۔ جب باپ نے پرانے چمڑے کو سونگھایا تو ہوش آیا۔ یہی حال آج کل کے گندے ماحول کا ہے۔ اس ماحول میں پرورش پانے والا اچھے اور صالح ماحول میں گھٹن محسوس کرتا ہے اور وہ ماحول اس کے ذہن و دماغ پر بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ (صحبتے با اہل دل: ص ۳۷۰)

شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی مجلس کا ماحول

تذکرہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی میں علامہ شیروانی کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ قصہ تو بہت طویل ہے مختصر لکھواتا ہوں۔ اس میں ''آستانہ فقیر'' کے عنوان سے علامہ شیروانی نے لکھا ہے کہ مجھے ایک عرصہ مراد آباد حاضری کی تمنا تھی۔ جس کا منشا شبلی عہد جنید دہر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی زیارت تھا۔ ۲۰ رجب ۱۳۰۵ھ کو آستانہ کی زیارت کے ارادہ سے کانپور پہنچا۔ آگے اپنے سفر کی طویل روداد لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ دس بجے مراد آباد پہنچا۔ معلوم ہوا کہ اس وقت حضرت درس حدیث میں مشغول ہیں۔ میں مسجد کے قریب ایک مقبرہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں یک سیتل پاٹی پڑی ہوئی تھی۔ جس پر چند آدمی امیدوار زیارت بیٹھے تھے۔ ان کے پاس میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔

مولانا اگرچہ یہاں سے دور مسجد میں تشریف فرما تھے، مگر یہاں تک بھی رعب اتنا تھا کہ کوئی شخص پکار کر بات نہیں کر سکتا تھا اور بے تکلف یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے حاکم کی آمد کا انتظار ہے۔ ایک گھنٹہ بعد حضوری حاصل ہوئی۔ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ چار پائی پر تشریف رکھتے تھے میں زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ تھوڑی سے دریافت حال کے بعد اشعار نعتیہ پڑھنا شروع کر دیا چند منٹ بعد حجرہ میں تشریف لے گئے۔ مجھے بھی اندر آنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ کچھ بزرگوں کے حالات ارشاد فرمائے۔ مثنوی کے اشعار نہایت درد سے پڑھے۔ منجملہ اوروں کے یہ شعر بھی تھا:

صحبت مرداں اگر یک ساعت است

بہتر از صد خلوت و صد طاعت است

کچھ عرصہ بعد استراحت کے لیے رخصت فرمایا۔ بعد ظہر مسجد میں تشریف لا کر حدیث کا درس شروع فرما دیا، جس میں مجھے حاضری کی عزت حاصل ہوئی، کچھ دیر بعد حجرہ میں تشریف لے جا کر رخصت کے واسطے طلب فرمایا دعائے خیر کے بعد اجازت فرما دی، اس کے بعد مسجد کے حالات لکھ کر لکھتے ہیں کہ کوئی چیز اس میں اہلِ دنیا کی دلچسپی کی نہیں ہے مگر صدہا امیر و غریب تونگر و مفلس آتے ہیں اور جاتے ہیں۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر دو زبردست خیال میرے دل میں آئے جن

کے سبب یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت کا مرتبہ میں نے پہچان لیا ہے، لیکن یہ جانا کہ ہم میں اور ان میں سوائے ظاہری مشابہت کے اور کوئی مشابہت نہیں، ہمارے خیالات سے ان کے خیالات الگ، ہمارے ارادوں سے ان کے ارادے جدا، ہمارے مشاغل سے ان کے مشاغل علیٰحدہ، ان کی امیدیں اور خوشیاں اور خوف اور مقصود اور اول خیال یہ تھا کہ مراد آباد دنیا میں ہے گاؤں نہیں قصبہ ہے، لیکن حضرت کی مسجد میں ایک دوسرا عالم نظر آتا تھا، دنیوی معاملات کا کوسوں پتہ نہ تھا، خود حضرت کی گفتار و کردار اور وہاں کے اہل قیام کے احوال سے (عام اس سے کہ وہ چند گھنٹے کے آئے ہوئے ہیں یا دو چار برس کے رہتے ہیں) یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جو تعلقات دنیا سے کنارہ کر آئے ہیں۔

حیدر آباد کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر جو باون لاکھ کے معافی دار ہیں، میرے پہنچنے سے صرف ایک روز پہلے وہاں آئے تھے، مگر ان کا ذکر بھی نہ تھا اور نہ کوئی وقعت ان کی کسی کے ذہن میں معلوم ہوتی تھی، حالانکہ کانپور اور بلہور وغیرہ ان کے تذکروں کی صدا سے گونج رہے تھے اور ہر ایک سوسائٹی (خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ) ان کے تذکروں کو اپنے جلسوں کا دلچسپ مبحث بنائے ہوئے تھی۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ خود میرا ذہن مجھ کو ذلیل سمجھتا تھا اور ہر چند حیرت سے غور کرتا تھا، لیکن کوئی وقعت اپنی میرے ذہن میں نہیں آتی تھی، دنیوی جلسوں میں لیفٹیننٹ کے دربار دیکھے، رؤسا کے مجمعے دیکھے، اہل علم کی مجلسیں دیکھیں مگر کہیں اپنے نفس کو اتنا بے حقیقت نہیں پایا۔ اپنے اعمال ذمیمہ ماضیہ پر خود نفس ملامت کرتا تھا اور اپنی بے مائے گی پر خود نفرین کن تھا۔ ہر شخص سے خواہ وہ کوئی ہو اپنے تئیں کم وقعت تصور کرتا تھا۔ غرض ایک عجیب خیال تھا کہ پورا بیان میں آنا مشکل ہے۔ وہاں سے آنے پر یہ خیال ایسے رہے جیسے کہ کسی دلچسپ خواب کا صبح کو خیال اور لطف ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہوگئی اور چند لمحہ کے بعد پھر نفس "امارہ انا و لاغیرلی" اور "ہمچو ما دیگرے نیست" کے پھندے میں جا پھنسا۔ یہ خیال میرے نزدیک محض نئے اور نرالے تھے جو مدت العمر میں کسی جگہ اور کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس سے قیاس چاہتا ہے کہ وہ جگہ بھی کچھ اور جگہوں سے نرالی تھی۔ اللہ بس باقی ہو۔

(تذکرہ فضل الرحمٰن: ص ۱۱۲)

☆☆☆☆☆

فصل نمبر ۸
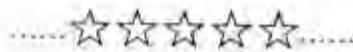
اکابر کے مجاہدات

فی العِلم وَ السّلوك

یہ تو ایسی معروف ومشہور چیز اور اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کو نمونہ کے طور پر لکھنا بھی مشکل ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے۔ **من طلب العلی سھر اللیالی** جو بلند درجات حاصل کرنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگا کرتا ہے۔ سچ فرمایا، اکابر میں سے کوئی بھی میرے علم میں ایسا نہیں گزرا جس نے ابتداء میں مجاہدات کسی نہ کسی نوع کے نہ کیے ہوں۔ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے کئی مرتبہ ارشاد فرمایا کہ بزرگوں کا ارشاد ہے کہ جو ہماری ابتداء دیکھے وہ کامیاب اور جو ہماری انتہا دیکھے نا کامیاب۔ سچ ہے کہ ابتداء میں جتنی محنتیں کرنی پڑتی ہیں ان کو دیکھنے والا تو سمجھ لیتا ہے کہ بزرگی اس طرح حاصل ہوتی ہے اور ان کی انتہا دیکھنے والا جب وہ حضرات اپنی ساری قوتیں فنا کر کے معذوری کے درجہ میں پہنچ جاتے ہیں اور ان محنتوں کے ثمرات شروع ہو جاتے ہیں تو اس وقت دیکھنے والا یوں سمجھ لیتا ہے کہ بزرگی اس طرح بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

حضرت پیران پیر کا مجاہدہ

مواعظ حضرت پیرانِ پیر صفحہ ۵۳۴ میں لکھا ہے کہ میں ایسے مشائخ کی صحبتوں میں رہا ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کے دانت کی بھی سفیدی نہیں دیکھی، کیونکہ کسی نے مسکرا کر مجھ سے بات ہی نہیں کی۔ وہ خود نفیس غذائیں کھایا کرتے اور مجھ کو یک نوالہ بھی نہ دیتے تھے۔ بایں ہمہ میری طبیعت میں ان کی طرف سے بدگمانی یا ملال کا مطلق اثر نہیں آتا تھا دوسری جگہ لکھتے ہیں۔ اے نادان میرے اس قیمتی کُرتے اور فرش کی طرف نظر مت کر۔ یہ لباس تو مر جانے کے بعد کا ہے، یہ تو کفن ہے اور مردے کا کفن نفیس ہی ہوا کرتا ہے۔ یہ لباس مدتوں میرے صفوف پہننے اور موٹا چھوٹا کھانے اور بھوکا رہنے کے بعد کا عطاء ہوا ہے۔ (مواعظ پیران پیر: ص ۵۸۸)

تیسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ابتدائی زمانہ میں میرے پاس ایک کُرتا تھا۔ نہایت عمدہ میں بار ہا (اس کو فروخت کرنے کے لیے) بازار کی طرف گیا (یعنی عمدہ ہونے کی وجہ سے میں نے اس کو نہیں پہنا) مقولہ مشہور ہے:

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

مپندار جان پدر گر کسی
کہ بے سعی ہر گز بجائے رسی

''باپ کی جان! اگر تو کسی قابل ہے تو ہرگز گمان نہ کر کہ بے کوشش کوئی کہیں پہنچ سکتا ہے''۔ میں اپنے چچا جان کے حالات میں آپ بیتی کے متفرق نمبروں میں بہت کثرت سے لکھوا چکا ہوں۔ گولر پر افطار وقناعت، چھ ماہ تک پانی نہ پینا، مغرب سے عشاء تک نفلیں پڑھنا، اپنے ابتدائی سلوک میں ہر وقت چپکا رہنا وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے واقعات آپ بیتی کے مختلف نمبروں میں مختلف مواقع پر ذکر کر چکا ہوں۔

حضرت مولانا گنگوہی کے مجاہدات

حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ کے مجاہدات تذکرۃ الرشید میں بہت کثرت سے مواقع میں لکھے ہیں۔ مقدمہ ارشاد الملوک میں تذکرۃ الرشید حصہ دوم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تھانہ بھون کے ابتدائی چالیس روز کے قیام میں آپ کا امتحان بھی لیا گیا جس کے متعلق حضرت قدس سرہٗ نے خود فرمایا کہ تھانہ بھون میں رہتے ہوئے مجھ کو چند روز گزرے تو میری غیرت نے اعلیٰ حضرت پر کھانے کا بار ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ آخر میں نے یہ سوچ کر کہ دوسری جگہ انتظام کرنا دشوار بھی ہے اور ناگوار بھی۔ رخصت چاہی حضرت نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ ابھی چند روز ٹھہرو، میں خاموش ہو گیا۔ قیام کا قصد تو کر لیا مگر اس کے ساتھ ہی یہ فکر ہوئی کہ کھانے کا انتظام کسی دوسری جگہ کرنا چاہیے۔

تھوڑی دیر کے بعد جب اعلیٰ حضرت مکان پر تشریف لے جانے لگے تو میرے وسوسہ پر مطلع ہو کر فرمانے لگے کہ میاں رشید احمد کھانے کی فکر مت کرنا، ہمارے ساتھ کھانا۔ دوپہر کو کھانا مکان سے آیا تو ایک پیالہ میں کوفتے تھے، نہایت لذیذ اور دوسرے پیالہ میں معمولی سالن تھا۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے دستر خوان پر بٹھا لیا مگر کوفتوں کا پیالہ مجھ سے علیحدہ اپنی طرف رکھا اور معمولی سالن کا پیالہ میرے قریب سرکا دیا۔ میں اپنے حضرت کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔

اتنے میں حضرت حافظ ضامن صاحب تشریف لائے کوفتوں کا پیالہ مجھ سے دور رکھا ہوا دیکھ کر اعلیٰ حضرت سے فرمایا، بھائی صاحب رشید احمد کو اتنی دُور ہاتھ بڑھانے میں تکلیف ہوتی ہے، اس پیالہ کو ادھر کیوں نہیں رکھ لیتے، اعلیٰ حضرت نے بے ساختہ جواب دیا اتنا بھی غنیمت ہے کہ اپنے ساتھ کھلا رہا ہوں، جی تو یوں چاہتا تھا کہ چوڑھوں، چماروں کی طرح الگ ہاتھ پر روٹی رکھ دیتا۔

اس فقرہ پر اعلیٰ حضرت نے میرے چہرہ پر نظر ڈالی کہ کچھ تغیر تو نہیں آیا، مگر الحمد للہ میرے قلب پر بھی اس کا کچھ اثر نہ تھا، میں سمجھتا تھا کہ حقیقت میں جو کچھ حضرت فرما رہے ہیں بالکل سچ ہے، اس دربار سے روٹی کا ملنا کیا تھوڑی نعمت ہے، جس طرح بھی ملے بندہ نوازی ہے۔

(مقدمہ ارشاد: ص ۱۲)

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب اعلیٰ حضرت کے دستِ مبارک پر بیعت ہونے کا وقت آیا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھ سے ذکر شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہو سکتا اور نہ رات کو اُٹھا جاتا ہے، اعلیٰ حضرت نے تبسم کے ساتھ فرمایا، اچھا کیا مضائقہ ہے، اس تذکرہ پر کسی خادم نے دریافت کیا کہ حضرت پھر کیا ہوا تو آپ نے جواب دیا اور عجیب ہی جواب دیا کہ پھر تو مرمٹا، پہلی ہی شب میں اعلیٰ حضرت نے میری چارپائی اپنی چارپائی کے قریب بچھوائی اور جب آخر شب میں اعلیٰ حضرت نے میری چارپائی کے قریب بچھوائی اور جب آخر شب میں اعلیٰ حضرت بیدار ہوئے تو میری بھی آنکھ کھل گئی، تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کروٹیں لیں آخر نہ رہا گیا، اُٹھ کر وضو کیا، مسجد کے ایک کونہ میں اعلیٰ حضرت مشغول تھے، دوسرے کونہ میں میں جا کر کھڑا گیا اور تہجد کے بعد ذکر نفی و اثبات بالجہر شروع کر دیا، گلا اچھا تھا، بدن میں قوت تھی، صبح کو جب حاضر خدمت ہوا تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشتاق کرنے والا ہو، اس دن سے ذکر جہر کے ساتھ مجھے محبت ہوگئی، پھر کبھی چھوڑنے کو جی نہ چاہا اور نہ کوئی وجہ شرعی اس کی ممانعت کی معلوم ہوئی اور وصال تک دیگر مشاغل مراقبہ وغیرہ کے ساتھ ذکر بارہ تسبیح فرماتے رہے، ایسی ہلکی آواز کے ساتھ کہ جس کو حجرہ کے پاس بیٹھنے والا سن سکتا تھا۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۴۸ رج ۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ تھانہ بھون سے واپسی کے متعلق مولانا ابوالنصر صاحب فرماتے ہیں کہ تھانہ بھون سے واپسی پر حضرت کا قیام میرے مکان پر تھا۔ نصف شب کو جب آپ اُٹھتے اور سیدھے مسجد کی جانب رُخ فرماتے تو پیچھے پیچھے میں بھی لگا ہوا چلا آتا تھا، جس وقت حضرت بالجہر ذکر شروع فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری مسجد کانپ رہی ہے، خود پر جو حالت گزرتی ہوگی اس کی تو کسی کو کیا خبر، آستانہ امدادیہ سے جو بات حاصل ہوئی اس نے نہ کھانے کا رکھا نہ پینے کا، ہر وقت تفکر و استغراق سے کام تھا اور رونا سب راحت و آرام، اکثر تمام تمام شب روتے گزر جاتی اور سارا سارا دن کسی گہری فکر میں غرق ہوئے تمام ہو جاتا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے ایک رضائی نیلے رنگ کی آپ کے لیے تیار کی تھی کہ شب کو مسجد میں آتے جاتے

خشکی سے محفوظ رکھے، آپ کے رونے اور آنسوؤں کے اسی رضائی سے پونچھنے کی وجہ سے اس کا رنگ بھی کچھ کا کچھ ہوگیا اور ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ (تذکرۃ الرشید: ص۵۲ رج۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ریاضت ومجاہدہ کی یہ حالت تھی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا اور ترس کھایا کرتے تھے، چنانچہ اس پیرانہ سالی میں جب کہ آپ ستر (۷۰) سال کی عمر سے متجاوز ہوگئے تھے، کثرت عبادت کا یہ عالم تھا کہ دن بھر کا روزہ اور بعد مغرب چھ کی جگہ بیس رکعت صلوٰۃ الاوابین پڑھا کرتے تھے، جس میں تخمیناً دو پارے قرآن مجید سے کم کی تلاوت نہ ہوتی تھی، پھر اسی کے ساتھ رکوع سجدہ اتنا طویل کہ دیکھنے والے کو سہو کا گمان ہو، نماز سے فارغ ہوکر مکان تک جاتے اور کھانا کھانے کے لیے مکان پر ٹھہرنے کی مدت میں کئی پارے کلام مجید ختم کرتے تھے، پھر تھوڑی دیر بعد نمازِ عشاء اور صلوٰۃ تراویح میں جس میں گھنٹے سوا گھنٹہ سے کم خرچ نہ ہوتا تھا، تراویح سے فارغ ہوکر ساڑھے دس گیارہ بجے آرام فرماتے اور دو ڈھائی بجے ضرور ہی اٹھ جاتے تھے۔ بلکہ بعض دفعہ خدام نے ایک ہی بجے آپ کو وضو کرتے پایا۔ اس وقت اٹھ کر ڈھائی تین گھنٹے تک تہجد میں مشغولیت رہتی تھی۔

بعض مرتبہ سحر کھانے کے لیے کسی خادم کو پانچ بجے جانے کا اتفاق ہوا تو آپ کو نماز ہی میں مشغول پایا۔ صلوٰۃ فجر کے بعد آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک وظائف واوراد اور مراقبہ وملاحظہ میں مصروفیت رہتی۔ پھر اشراق پڑھتے اور چند ساعت استراحت فرماتے۔ اتنے ڈاک آجاتی تو خطوط کے جوابات اور فتاویٰ لکھواتے اور چاشت کی نماز سے فارغ ہوکر قیلولہ فرماتے تھے۔ ظہر کے بعد حجرہ شریفہ بند ہوجاتا اور تا عصر کلام اللہ کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ باوجودیکہ اس رمضان میں جس کا مجاہدہ لکھا گیا ہے پیرانہ سالی ونقاہت کے ساتھ وجع الورک کی تکلیف شدید کا یہ عالم تھا کہ استنجاء گاہ سے حجرہ تک تشریف لانے میں حالانکہ پندرہ سولہ قدم کا فاصلہ ہے مگر راہ میں بیٹھنے کی نوبت آتی تھی۔ اس حالت پر فرائض تو فرائض نوافل بھی کبھی بیٹھ کر نہیں پڑھے اور ان میں گھنٹوں کھڑا رہنا۔ بارہا خدام نے عرض کیا کہ آج تراویح بیٹھ کر ادا فرمائیں تو مناسب ہے، مگر آپ کا جواب یہی تھا ''نہیں جی یہ کم ہمتی کی بات ہے'' اللہ رے ہمت آخر ''أفلا اکون عبدا شکورا'' کے قائل کی نیابت کوئی سہل نہ تھی جو اس ہمت کے بغیر حاصل ہوجاتی۔

یوں تو ماہِ رمضان المبارک میں آپ کی ہر عبادت میں بڑھوتری ہوتی تھی مگر تلاوت کلام اللہ کا شغل، خصوصیت کے ساتھ اس درجہ بڑھتا تھا کہ مکان تک آنے جانے میں کوئی بات نہ فرماتے تھے، نمازوں میں اور نمازوں کے بعد تخمیناً نصف قرآن مجید ختم آپ کا یومیہ معمول قرار پاتا تھا۔ جس شب کی صبح کو پہلا روزہ ہوتا، آپ حضار جلسہ سے فرمادیا کرتے تھے کہ آج سے کچہری

برخواست۔ رمضان کو بھی آدمی ضائع کرے تو افسوس کی بات ہے۔ اس مجاہدہ پر غذا کی یہ حالت تھی کہ کامل رمضان بھر کی خوراک پانچ سیر اناج تک پہنچنی دشوار تھی۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۶۵ ر ج ۱)

دوسری جگہ حکیم اسحاق صاحب نہٹوری کے طویل مضمون میں جو بعد میں آنے والا ہے اس میں رمضان کے متعلق لکھا ہے کہ رمضان شریف میں صبح کو خلوت خانہ سے دیر میں برآمد ہوتے۔ موسم سرما میں اکثر دس بجے تشریف لاتے۔ نوافل اور قراءت قرآن وسکوت ومراقبہ میں بہ نسبت دیگر ایام بہت زیادتی ہوتی۔ سونا اور استراحت نہایت قلیل کلام بہت کم کرتے، بعد نماز مغرب ذرا دیر خلوت نشینی کا ذائقہ لے کر کھانا تناول فرماتے۔ تراویح کی بیس رکعات اوائل میں خود پڑھاتے تھے اور آخر میں صاحبزادہ مولوی حافظ حکیم محمد مسعود احمد صاحب کے پیچھے پڑھتے، بعد وتر دو رکعت طویل کبھی کھڑے ہو کر کبھی بیٹھ کر پڑھتے، دیر تک متوجہ بقبلہ بیٹھ کر پڑھتے رہتے۔ پھر ایک سجدہ تلاوت کر کے کھڑے ہو جاتے۔ بندہ نے بعض الفاظ سن کر اندازہ کیا ہے کہ اس درمیان سورۂ تبارک الذی اور سورۂ سجدہ اور سورۂ دخان پڑھتے تھے۔ اکثر تمام عشرہ ذوالحجہ اور عاشورہ اور نصف شعبان کا روزہ رکھتے تھے۔ (تذکرہ الرشید: ص ۶۷ ر ج ۲)

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے یہ واقعہ بہت دفعہ سنایا کہ حضرت قدس سرہٗ کی حیات کے آخری رمضان میں قرآن پاک میں نے سنایا کہ حکیم مسعود احمد صاحب نے کسی مجبوری کی وجہ سے قرآن پاک سنانے سے عذر فرمایا تھا۔ والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے ماہِ مبارک سے کئی دن پہلے یہ فرمانا شروع کیا کہ اب کے تو مسعود احمد معذور ہیں، ہمیں تراویح کون پڑھائے گا۔ والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں بار بار اس لفظ کو سنتا۔ مگر ادباً یہ کہنے کی ہمت نہ پڑتی کہ میں پڑھادوں گا۔ ماہِ مبارک سے دو دن قبل حضرت نے ارشاد فرمایا مولوی یحییٰ تم بھی تو حافظ ہو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت حافظ تو ضرور ہوں مگر میں تو فارسی میں قرآن پڑھتا ہوں اور حضرت والا حکیم صاحب کے قرآن سننے کے عادی ہیں جو جید قاری ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ نہیں تمہارا قرآن تو میں نے سنا ہے بس اب کے تم ہی تراویح پڑھاؤ گے۔ والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ پہلے دن تو مجھ پر بوجھ پڑا اور سوا پارہ قرآن پاک کا دن میں دیکھ کر پڑھا کہ سات سال کی عمر میں قرآن ختم کرنے کے بعد چھ مہینے تک ایک قرآن روز دیکھ کر پڑھا کرتا تھا، لیکن اس کے بعد سے کبھی دیکھ کر پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ یوں فرمایا کرتے تھے کہ پہلے دن سوا پارہ تو دن میں دیکھ کر پڑھا تھا۔ پھر دوسرے دن سے خوف نکل گیا۔ پھر سارے رمضان دیکھ کر پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ فقط

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے پہلا حج فرض ۱۲۸۰ھ میں کیا۔ اس کے واقعات میں حضرت

کے مجاہدے کا قصہ نکل گیا ہے کہ حضرت امام ربانی نے سفر کے دوران اپنے رفقاء میں ادنیٰ شخص کی تھوڑی راحت کو اپنی بڑی سے بڑی اور ضروری راحت پر مقدم سمجھا، ہر ایک کا تکلیف میں ساتھ دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے معمولات نوافل تک میں فرق نہ آنے دیا۔ مدنی راہ میں ایک جگہ ڈپٹی عبدالحق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو کسی قسم کی کوفت لاحق ہوئی تو رنج وغصہ کے باعث اونٹ سے اتر پڑے اور قسم کھالی کہ اس اونٹ پر نہ بیٹھوں گا جنہوں نے یہ راستہ طے کیا ہے۔ (یہ قصے جب کہ ہیں جب حج اونٹوں پر ہوا کرتا تھا۔)

وہ شتربان بدّوں کی طبائع سے واقف ہیں کہ انہیں اپنی قطار کے سامنے کسی کے مرنے اور جینے کی بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ ڈپٹی صاحب کے قسم کھانے اور اونٹ کی سواری سے کرایہ دے کر پیدل ہوجانے کی تو کیا پرواہ کرتے، چنانچہ بدّونے نے ڈپٹی صاحب کے اونٹ کی رسی قطار سے کھول دی۔ اونٹ جماعت سے علیٰحدہ ہوگیا۔ ڈپٹی صاحب مع اپنے دو ہمراہیوں کے کھڑے رہ گئے اور قافلہ چل دیا۔ حضرت مولانا کی نظر جو ڈپٹی صاحب پر پڑی تو فوراً اپنے اونٹ سے کود پڑے اور قافلہ کو چھوڑ کر ڈپٹی صاحب کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ حضرت امام ربانی کو قافلہ سے علیٰحدہ دیکھنا آپ کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنصر کو کب گوارا تھا۔ انہوں نے بھی اپنا اونٹ قطار سے علیٰحدہ کردیا اور حضرت کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ قافلہ دور نکل گیا اور آناً فاناً دور ہوتا جارہا تھا اور یہ چند نفر لق ودق میدان میں ایسی خطرناک جگہ کھڑے ہوئے تھے جہاں پتھروں سے مسافر کا مار ڈالنا رہزنوں کے نزدیک کوئی بات نہیں تھی، مگر چلیں تو کس طرح چلیں۔ قسم کے باعث ڈپٹی صاحب اونٹ سوار نہیں ہوتے اور پیدل چلنے کی سکت نہیں۔ حضرت مولانا اور دیگر ہمراہی ڈپٹی کے بغیر چل ہی نہیں سکتے تھے۔ آخر کار مولوی ابوالنصر صاحب نے اپنی اہلیہ کو اونٹ سے اتارلیا اور ڈپٹی صاحب سے کہا کہ آپ میرے اونٹ پر سوار ہوجائیں تاکہ قسم بھی نہ ٹوٹے اور کسی طرح قافلہ میں جاملیں۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب مع اپنے ایک ہمراہی کے اس اونٹ پر سوار ہوئے اور مولوی ابوالنصر صاحب کی اہلیہ ڈپٹی صاحب کے اونٹ پر سوار کی گئیں۔ اسی اونٹ پر امام ربانی کو جگہ ملی اور مولوی ابوالنصر مع دوسرے ہمراہی کے پاپیادہ روانہ ہوئے۔ کم وبیش تین کوس پر قافلہ ملا اور آخر دونوں اونٹ قطار میں باندھنے کے بعد مولوی ابوالنصر صاحب اپنے اونٹ پر اور حضرت مولانا قدس سرہٗ اپنے اونٹ پر سوار ہوئے (غالباً ڈپٹی صاحب کا اونٹ دوسرے رفقاء سے بدلا ہوگا)۔

(تذکرۃ الرشید جلد: ص ۲۰۷)

اسی سفر کی واپسی پر حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو خارش کا شدید مرض پیدا ہوا۔ خارش تو مکہ مکرمہ میں شروع ہوگئی تھی، مگر خشک تھی۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے تر ہوگئی۔ ابتداءً معمولی تھی۔ اس

وقت ہولناک بن گئی تھی۔ اسی حالت میں آپ جہاز پر سوار ہو گئے۔ جہاز پر سوار ہونا تھا اور گویا پھونس میں آگ کا لگنا تھا۔ دفعۃً بخار چڑھا اور اتنا شدید ہوا کہ سرسام ہو گیا۔ کامل تین دن تک آپ اس درجہ بے ہوش اور دنیا و مافیہا سے غافل رہے کہ اپنے تن بدن کی بھی مطلق خبر نہ رہی۔ دست جاری ہوئے اور اتنی تعداد میں کہ گنتی اور شمار دشوار ہو گئی۔ ایسی حالت میں جب کہ آپ اور آپ کے تمام رفقاء آپ کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ آپ کی تیمارداری آپ کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنصر صاحب نے کی۔

مولانا ابوالنصر کی وہ خدمت گزاری جو اس ہولناک مرض میں واقع ہوئی، وہ مشہور خدمت تیمارداری ہے جو صفحہ سوانح کی پیشانی پر مدتوں روشن اور چمکتے حروف میں قائم رہے گی۔ بمقتضاء ''من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ''۔ حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی زبانی اکثر سنا گیا کہ آپ فرماتے تھے، ایسا حقیقی بھائی بھی نہیں کرسکتا۔

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ میرا بھائی اور بھاوج میری خدمت نہ کریں تو میری ہڈیوں کا بھی پتہ نہ چلتا اور ایک مرتبہ یہ الفاظ فرمائے کہ ابوالنصر کے بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں میرا پاخانہ نہ لگا ہو۔ ایک موقع پر حضرت امام ربانی سے کسی نے پوچھا کہ آپ مولوی ابوالنصر سے ناراض ہیں؟ حضرت نے فرمایا ابوالنصر میری ماں ہے، اس سے ناراض ہوں گا؟ ایک مرتبہ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ایسا حقیقی بھائی بھی نہیں کرتا جیسا ابوالنصر نے میرے ساتھ کیا کہ مثل مادر مشفقہ اپنی گود میں لے کر پاخانہ پیشاب کراتے تھے۔ مولوی ابوالنصر صاحب کے کپڑے ہمیشہ خارش کی پیپ اور لہو میں بھر جاتے اور اکثر پاخانہ پیشاب میں بھی ملوث ہوتے تھے، لیکن مولوی صاحب مردانہ وار اپنے کپڑے اور بدن اور نیز حضرت قدس سرہٗ کا بدن اور کپڑے روزانہ دھوتے تھے اور کچھ کراہت نہ کرتے تھے اور گویا پاخانہ کو صندل اور پیشاب کو گلاب بنالیا تھا۔ حضرت امام ربانی کو تین دن بعد جس وقت ہوش آیا تو کروٹ لینے کی طاقت تھی، چوتھے دن پیشاب ہوا تو ایسا سُرخ جیسا خالص خون ہے، آنکھیں کھولیں تو اس درجہ لال کہ گویا بانات سُرخ کے ٹکڑے ہیں، اس وقت ہوش کہیئے یا بے ہوشی، حضرت قدس سرہٗ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے کہ افسوس ایک بھائی تھا وہ بھی جدا ہو گیا، مولوی ابوالنصر صاحب جو حضرت مولانا کا سر اپنی گود میں رکھے ہوئے بیٹھے تھے بولے کہ بھائی میں تو آپ کو گود میں لیے بیٹھا ہوں اور یہ سامنے آپ کی بھاوج ہے، حضرت بولے تم تو ایسے ہو کہ میں تم کو ماں کہوں یا باپ کہوں۔

دقیق دستوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ تین لحاف بچھونوں کا روڑ کیے بعد دیگرے استنجاء میں ختم ہو گیا، آخر آپ کے نیچے بچھانے کو کوئی اور بستر نہ مل سکا تو احرام کے کپڑے جن کو تبرک بنا کر گھر لانا

چاہا تھا، اس ضرورت میں نکال لیے گئے اور یکے بعد دیگران کا استعمال ہوا، جب ایک کپڑا ملوث ہوجاتا تو اس کو جہاز سے سمندر کے شور پانی میں لٹکا دیا جاتا اور دوسرا دُھلا ہوا کپڑا نکال کر کام میں لایا جاتا تھا، پیشاب میں اس درجہ تعفن اور شوریت تھی کہ جس کپڑے پر پڑا اس کو بدبودار بنا کر تیزاب کا کام کر دیا اور جلا کر گویا راکھ بنا دیا۔

ہوائی جہاز تھا یا بادبانی کشتی تھی جہاں نہ دوا نہ دارو، علاج ہو تو کس کا اور دوا ہو تو کیونکر، خدا خدا کر کے ساتویں دن بمبئی کا کنارہ نظر آیا اور حجاج خوشی خوشی اپنے وطن یعنی سرزمین ہند پر جہاز سے اُترے، مولوی ابوالنصر نے حضرت قدس سرہٗ کو بھی بہ ہزار دقت و دشواری جہاز سے اُتارا اور بمبئی میں رامپوری قافلہ کے ہمراہ ایک کرایہ کے مکان میں مقیم ہوئے، حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو جو مرض لاحق ہوا تھا وہ اس درجہ شدید ہو لیا تھا کہ صحت و تندرستی کا خیال محض وہم اور گمان ہی گمان رہ گیا تھا۔

بمبئی پہنچ کر علاج بھی ہوا اور پوری سعی و کوشش کے ساتھ ہوا، مگر مرض میں رائی کے دانہ کے برابر بھی کمی نہ ہوئی جو لحظہ تھا وہ ترقی مرض کا تھا اور جو ساعت تھی وہ زیادتی بیماری کی تھی، اول اول مخلص دوست جناب حکیم ضیاء الدین صاحب نے اپنی رائے سے آپ کو یونانی ادویہ کا استعمال کرایا جب وہ مایوس ہو گئے تو ایک شخص عبداللہ شاہ نظاموی حکیم جو وہاں موجود تھے آپ کے معالج بنے، ایک دن انہوں نے بھی دوا دی آخر دوسرے دن دستبردار ہو گئے اور جواب دے دیا کہ کسی دوسرے طبیب کا علاج کرو، مولوی ابوالنصر جن کے دل کو لگی ہوئی تھی کبھی طبیب کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے پھرتے اور کبھی حضرت کی چارپائی سے لگ کر آ بیٹھتے اور خدمت اور تیمارداری میں مشغول ہوتے، وقت پر روٹی کھانا اور معمول کے موافق شب کو سو جانا عرصہ ہوا چھوٹ چکا تھا، اب تو نہ لیٹے چین تھا نہ بیٹھے کل پڑتی تھی، آخر ایک وید کے پاس پہنچے اور کہا کہ میرا بھائی بیمار ہے اس کو چل کر آپ دیکھ لیں، وید جی نہایت ہی خلیق اور بامروت شخص تھا،

جس وقت مولوی ابوالنصر صاحب نے اپنے مریض کو دکھانے کی درخواست کی اس وقت وید کے پاس مریضوں کا ایک مجمع موجود تھا اور اپنا اپنا عرض حال کر رہا تھا، وید نے نووارد مسافر کا توحش اور جان سے زیادہ عزیز مریض کے شدتِ مرض کی وجہ سے سراسیمگی و اضطراب کو دیکھ لیا، اس لیے یہ کہہ کر دو منٹ ٹھہریے ابھی چلتا ہوں جلدی جلدی موجودہ بیماروں سے فراغت پائی، آخر چھڑی ہاتھ میں لے کر ساتھ ہو لیا اور حضرت امام ربانی کی نبض بھی دیکھی قارورہ بھی دیکھا اور اول سے آخر تک سارا حال اطمینان کے ساتھ سنا، تیمارداروں کو تسلی دی اطمینان دلایا ڈھارس بندھایا اور چند گولیاں اپنے پاس سے دیں کہا ایک ابھی کھلا دو، چنانچہ ایک گولی آپ کو کھلا دی گئی خدا کا فضل تھا

کہ مرض میں دوگنا خفت محسوس ہوئی مگر نہ ایسی جس پر اطمینان یا امید زیست قائم ہو، اس مرض میں حضرت کو تشنج کے دورے شروع ہو گئے جو پے در پے پڑتے اور نحیف جسم کو ضعیف کرتے رہتے تھے بمبئی میں ایک مہینہ قیام رہا آخر منشی علاء الدین صاحب کی اہلیہ کا وہیں انتقال ہو گیا، مضمون بہت طویل ہو گیا، آگے بھی کئی صفحے باقی ہیں۔

مجھے تو صرف حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات میں سے ایک مجاہدہ کا اور اس کے ساتھ ہی مولانا ابو النصر صاحب کے مجاہدات کے ساتھ اور مایوسانہ حالات کے ساتھ ان دونوں حضرات کا یہ طویل سفر گزرا، سفر کے آخر تک کی روداد تذکرۃ الرشید جلد ا صفحہ ۲۱۱ میں موجود ہے کہ آخر تک حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو کیسی کیسی سخت تکالیف برداشت کرنی پڑی، تذکرۃ الرشید میں دوسری جگہ حضرت امام ربانی کے معمولات حسب ذیل لکھے ہیں، مولانا مرحوم لکھتے ہیں کہ امام ربانی قدس سرہٗ کی عادت جاریہ اور معمول دائمی کے اظہار میں ایک تحریر اور ہدیہ ناظرین کرتا ہوں، جو حضرت کے شاگرد رشید اور مجاز طریقت جناب الحاج حکیم محمد اسحاق صاحب نہٹوری نے تحریر فرمائی ہے یہ ہے۔

عادت شریفہ یوم بلیلہ میں اس طرح تھی کہ بعد نماز صبح سے خلوت خانہ میں مشغول بذکر و فکر و مراقبہ جاڑوں میں نو بجے تک اور گرمیوں میں آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک رہتے پھر حاجت ضروری سے فارغ ہو کر وضو فرما کر چاشت کے نوافل ادا کرتے، کبھی چار رکعت کبھی آٹھ رکعت، نماز سے فراغ کے بعد تدریس میں مشغول ہو جاتے، دو گھنٹہ یا کچھ کم یہ شغل حدیث رہتا، پھر کھانا تناول فرما کر بارہ بجے وقت استواء کے دھوپ گھڑی سے گھڑی کو ملاتے پھر قیلولہ فرماتے۔ جاڑوں میں ایک بجے اور گرمیوں میں ڈیڑھ بجے سے پہلے بیدار ہو کر نماز ظہر سے سردی میں ڈیڑھ بجے تک فارغ ہوتے اور گرمی میں دو بجے تک فارغ ہوتے، بعد نماز ظہر تلاوت قرآن شریف کا معمول تھا اور خطوط کا ملاحظہ اور ان کا جواب مع فتاویٰ نویسی، صبح کو بعد صلوٰۃ ضحیٰ قبل تدریس معمول تھا، اگر جواب خطوط باقی رہتے تو بعد تلاوت یا بعد نماز عصر پورا فرماتے اور موسم گرما میں قبل نماز ظہر غسل فرمانے کا معمول تھا اور کبھی دوسری بار قریب عصر کے بھی غسل فرماتے پھر بعد تلاوت تدریس طلبہ میں عصر تک مشغول رہتے، بعد عصر تسبیح لے کر طالبین کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جاتے اس میں کوئی مسئلہ پوچھتا، کوئی کچھ حال عرض کرتا، کوئی مراقبہ میں مشغول ہو کر مستفید ہوتا بعد نماز مغرب صلوٰۃ اوابین چھ رکعت ادا فرماتے، ان میں سے کسی قدر قرآن شریف آدھ پارے سے لے کر ایک پارہ تک تخمیناً پڑھتے بعد فراغ نوافل صحن حجرہ میں ذرا دیر مہمانوں سے بات چیت کر کے گھر میں تشریف لے جاتے، وہاں سے کھانا تناول فرما کر قریب اذان عشاء تشریف لا کر زائرین و

حاضرین سے مخاطب ہوتے، کبھی لیٹ جاتے اور کبھی بیٹھے رہتے، نمازِ عشاء جاڑوں میں نو بجے گرمیوں میں دس بجے شروع کرتے اگر نمازی جلدی جمع ہوتے تو دیر نہ فرماتے، خصوصاً اس نماز میں تحدید مخصوص نہ تھی، بعد فراغ نماز عشاء ذرا بیٹھ کر لیٹ جاتے اور گیارہ بجے کے قریب خدام پاؤں دباتے، اس میں بعض خواص کو عجیب وغریب کیفیات اور انوار مشاہد ہوتے، بعد گیارہ بجے یا ساڑھے گیارہ بجے سب کو رخصت کر دیتے، پھر قدرے مقرر استراحت فرما کر بیدار ہوتے، اس وقت بنفسِ نفیس سب کام خود کرتے اس وقت استعانت وخدمت غیر کو پسند نہ فرماتے، تہجد کو بقرات طویلہ بجہر غیر مفرط بلحن داؤدی ادا فرماتے۔ اس وقت اُٹھنے میں عادت شریفہ مختلف تھی، کبھی بالکل نہ سوتے جب خدام کو رخصت کیا اور جانا کہ سب لوگ لیٹ گئے ہوں گئے، اُٹھ بیٹھتے اور عشاء کے وضو سے نفلیں ادا فرماتے، جب تھک جاتے قدرے استراحت فرماتے بعد استراحت پھر نفلیں شروع فرماتے، صبح تک یہی طور رہتا، باوجود ضبطِ کامل کبھی گریہ اس طرح مستولی ہوتا کہ تمام شب گریہ میں گزر جاتی، عدد رکعات اور قدر قراءت کا حال معلوم نہیں، الغرض پچھلی رات نوافل مسنونہ اور ذکر وفکر کی مشغولی میں گزرتی تھی پھر نمازِ صبح بوقت ابتداء یا توسط اسفار ادا فرماتے، فرض نماز آں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ بہت مختصر اور کامل پڑھاتے تھے، پارہ عم کی سورتوں کے سوا دوسری سورتیں شاذ ونادر ہی پڑھتے تھے، فرائض کے رکوع وسجود وغیرہ میں ادعیہ ماثورہ نہ پڑھتے تھے بلکہ تسبیحات پر قناعت فرماتے، لیکن نوافل میں اکثر پڑھتے تھے، اس رات دن کے عمل میں مریضوں کی دوا اس طرح ہوتی تھی کہ اس کے واسطے وقت ممتاز نہ تھا، معمولی مشغولی میں جب کوئی مریض آتا آپ اسی وقت اکثر دوا مفرد بتلا کر رخصت کر دیتے تھے، نسخہ لکھنے یا اور مرکب دوا بتلانے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا، آپ کی برکت سے مریضوں کو بکثرت شفا ہوتی اور امراض عسیرہ وممتدہ کا علاج بھی بطور مختصر فرماتے اور ہر قسم کے مریضوں کو شفاء ہوتی، یہ معمول دوازدہ ماہ کا تھا۔''

حضرت نانوتوی کے مجاہدات:

حضرت اقدس نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات میں حضرت اقدس مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے سوانح قاسمی میں تحریر فرمایا ہے کہ میں اپنے مکان کو چہ چیلاں میں رہتا تھا، مولانا بھی اسی مکان میں آ گئے، کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس پر پڑے رہتے تھے، روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اس کو کھا لیتے تھے، میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا، اس کو یہ کہہ کر رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھائیں تو سالن دے دیا کرو، مگر بدقت کبھی اس کے اصرار پر کھا لیتے تھے ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑے رہتے تھے ایک سال کے قریب (بعد انتقال

والد مرحوم) احقر دہلی رہا پھر اجمیر کی نوکری کے سبب دہلی چھٹی اور مولوی صاحب سے جدائی پیش آئی، مولوی صاحب چند روز اسی مکان میں تنہا رہے پھر چھاپہ خانہ جارہے، یہ واقعات میرے مشاہدے کے تو نہیں سنے ہوئے ہیں کہ اس مکان میں چند آدمی اور تھے مگر سب متفرق ہو گئے مولانا تنہا اس مکان میں رہ گئے باہر کا قفل لگا رہتا، رات کو مولوی صاحب کیواڑ اُتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کیواڑ کو درست کر لیتے تھے اور صبح کو کیواڑ اتار کر باہر ہو جاتے اور پھر کیواڑ درست کر دیتے تھے، چند ماہ اسی ''ہو'' کے مکان میں گزر گئے۔

جس زمانہ میں مولانا میرے پاس رہتے تھے مولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی، بال سر کے بڑھ گئے تھے نہ دھونا، کنگھی نہ تیل نہ کترے نہ درست کیے عجب صورت تھی، مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہیبت عنایت کی تھی ان کے سامنے بولنے کا ہر کسی کو حوصلہ نہ تھا باوجودیکہ نہایت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے، اس لیے تو میں کچھ نہ کہہ سکا اور دوست سے کہلایا تب بمشکل بال کتروا کر درست کیے اور دھلوائے، جوئیں بہت ہو گئی تھیں ان سے نجات ہوئی، مزاج تنہائی پسند تھا اس لیے کچھ عرض نہ ہو سکتا تھا۔

مولوی صاحب کو اول عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی کہ اکثر ساکت رہتے اس لیے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا اور باوجود خوش مزاجی اور ظرافت کے ترش رو اور مغموم جیسی صورت رکھتے اور ان کے حال سے بھلا ہو یا برا نہ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے یہاں تک کہ بیمار بھی اگر ہوتے تب بھی شدت کے ساتھ کبھی کسی نے جان لیا ورنہ خبر بھی نہ ہوتی اور دوا تو کہاں۔

(سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب: ص ۳۰)

مولانا مناظر احسن گیلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ شاید ''ھو'' اسی مکان کا وہ مشہور قصہ ہے جس کا ذکر خاکسار سے براہ راست حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم بھی فرمایا کرتے تھے اور قاری محمد طیب صاحب نے بھی بیان ذکر کیا کہ حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی میں نے یہ قصہ سنا ہے کہ حضرت نانوتوی اپنے بند حجرے میں ذکر میں مشغول تھے تو ہر ضرب کے ساتھ دھماکہ کی آواز بھی آتی تھی۔ لوگ متوحش ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے، حجرہ کے کیواڑ اُتارے گئے، چونکہ اندر سے زنجیر بند تھی اندر جا کر دیکھا تو حضرت کے برابر ایک سانپ ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی سر اُٹھا کر کھڑا ہوتا ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی زور سے زمین پر سر پٹکتا ہے یہ دھماکہ اسی کا تھا لوگوں نے اسے مار مار کر باہر لائے لیکن حضرت کو کچھ خبر نہیں ہوئی، قاری طیب صاحب نے بیان کیا کہ یہ واقعہ میں نے

امیر شاہ خاں اور متعدد لوگوں سے سنا ہے۔

(سوانح قاسمی: ص ۳۰۶ رج ۲)

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق مشہور یہ ہے کہ حضرت نے پورا قرآن شریف جہاز میں یاد کیا دن کو ایک پارہ حفظ کر لیتے تھے اور رات کو سنا دیتے تھے، اروحِ ثلاثہ صفحہ ۲۶۷ میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی روایت سے یہی نقل کیا ہے لیکن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے سوانح عمری میں خود حضرت نانوتوی کی روایت سے نقل کیا ہے کہ میں نے فقط دو سال رمضانوں میں قرآن پاک یاد کیا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا جمادی الثانیہ ۱۲۷۷ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے اور آخر ذیقعدہ میں مکہ مکرمہ پہنچے، بعد حج مدینہ شریف روانہ ہوئے اور ماہِ صفر میں مدینہ پاک سے مراجعت فرمائی، ربیع الاول کے اخیر میں بمبئی پہنچے اور جمادی الثانیہ تک وطن پہنچے، جاتی دفعہ کراچی سے جہاز بادبان میں سوار ہوئے تھے، رمضان کا چاند دیکھ کر مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا اور اول وہاں سنایا بعد عید مکلا پہنچ کر حلواء مسقط خرید فرما کر شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمائی، مولوی صاحب کا اس سے پہلے قرآن یاد کرنا کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا، بعد ختم مولوی صاحب فرماتے تھے کہ فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا اور جب یاد کیا پاؤ سپارہ کی قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا، پھر تو بہت کثرت سے پڑھتے، ایک بار یاد ہے کہ ستائیس پارے ایک رکعت میں پڑھے اگر کوئی اقتداء کرتا رکعت کرا کر اس کو منع فرما دیتے اور تمام شب تنہا پڑھتے تھے۔ (سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب: ص ۳۸)

مشہور روایت یکسالہ میں اور اس میں جمع تو آسان ہے کہ کچھ حصہ پہلے رمضان میں یاد کر لیا ہو اور بیشتر حصہ سفر حج کے رمضان میں یاد کیا ہو اور اسی سال پہلی مرتبہ تراویح میں قرآن پاک سنایا جس کے ختم پر مسقط کے حلوے کی تقسیم فرمائی ہو۔

حضرت مولانا یحییٰ کے مجاہدات

مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تذکرۃ الخلیل میں میرے والد صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری درخواست پر رمضان میں قرآن شریف سنانے کے لیے میرٹھ تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ دن بھر میں چلتے پھرتے پورا قرآن شریف ختم فرما لیتے اور افطار کا وقت ہوتا تو ان کی زبان پر ''قل اعوذ برب الناس'' ہوتی تھی، ریل سے اترے تو عشاء کا وقت ہو گیا تھا ہمیشہ باوضو رہنے کی عادت تھی اس لیے مسجد میں قدم رکھتے ہی مصلے پر آ گئے اور تین گھنٹے میں دس پارے ایسے رواں اور صاف پڑھے کہ کہیں نہ لکنت تھی نہ متشابہ گویا

قرآن شریف سامنے کھلا رکھا ہے اور با اطمینان پڑھ رہے ہیں، تیسرے دن ختم فرما کر روانہ ہو گئے کہ نہ دور کی ضرورت تھی نہ سامع کی۔ (تذکرۃ الخلیل :ص۲۰۴)

میرٹھ کے اس سفر کے متعلق والد صاحب نے یہ بھی فرمادیا کہ میرٹھ کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ جب لوگوں میں یہ تذکرہ ہوا کہ ایک شخص سہارنپور سے تین دن میں قرآن شریف سنانے کے لیے آرہا ہے تو تیس (۳۰) چالیس (۴۰) حافظ محض امتحان کے لیے میرے پیچھے تراویح پڑھنے آتے تھے، والد صاحب کو رمضان المبارک میں میری طرح سے بخار نہیں آتا تھا، دوستوں کے اصرار پر ایک دو دن کے لیے ان کے یہاں جا کر دو شب یا زیادہ سے زیادہ تین شب میں تراویح میں ایک قرآن پڑھ کر واپس آجاتے تھے، مساجد میں عموماً تین شب میں ہوتا تھا، غیر مساجد میں ایک یا دو شب میں بھی ہو جاتا تھا، ایک مرتبہ شاہ زاہد حسین مرحوم کے اصرار پر دو شب کے اندر قصبہ بہٹ میں ان کے مردانہ مکان میں قرآن پاک سنا کر آئے تھے، مسجد نواب والی قصاب پورہ دہلی میں بھی ایک دفعہ کا قرآن سنانا مجھے یاد ہے۔

عزیز مولوی نصر الدین سلمہ حکیم اسحاق صاحب مرحوم کی مسجد میں ایک مرتبہ قرآن پاک سنا رہے تھے، میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کسی سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے، حکیم اسحاق صاحب کی بیٹھک میں استراحت فرماتے تھے، نصیر الدین کا چودھواں پارہ تھا سامع بار بار لقمہ دے رہا تھا وہ باوضو تھے، مسجد میں تشریف لے گئے، نصیر الدین کو سلام پھیرنے کے بعد مصلے پر سے ہٹا کر سولہ رکعت میں سولہ پارے ختم کر دیئے، مصلیوں کو گراں تو ضرور ہوا مگر لوگوں کو جلد قرآن پاک ختم ہونے کی خوشی مشقت پر غالب ہوا کرتی ہے۔ بارہویں رات میں قرآن ختم کر کے سب تکان بھول گئے۔

بعض اعزہ کے اصراروں پر کاندھلہ میں بھی امی بی رحمہا اللہ تعالیٰ کے مکان پر اخیر زمانہ میں ایک دفعہ قرآن سنانے کا حال تو مجھے بھی معلوم ہے اور اپنی جوانی کا وہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ ساری رات نوافل میں قرآن سنانے میں گزرتی تھی اور چونکہ ہمارے یہاں نوافل میں چار سے زیادہ مقتدیوں کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اس لیے مستورات تو بدلتی رہتی تھیں اور میرے والد مسلسل پڑھتے رہتے تھے، میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے بھی کئی رمضان المبارک امی بی رحمہا اللہ تعالیٰ کی وجہ سے کاندھلہ میں گزارے، تراویح تقریباً ساری رات میں پوری ہوتی تھی، مسجد کے فرض پڑھنے کے بعد مکان تشریف لے جاتے تھے اور سحر تک تراویح میں چودہ پندرہ پارے پڑھتے تھے، مولانا رؤف الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ میرے والد صاحب کے حقیقی ماموں اور میری سابقہ اہلیہ مرحومہ کے والد ان کا مفصل قصہ تو عنقریب تقویٰ کے مضمون میں آرہا ہے اس کا یہ جزء یہاں کے

مناسب ہے کہ ۳۰ رمضان المبارک کو ''الم'' سے ''قل اعوذ برب الفلق'' تک ایک رکعت میں اور دوسری میں ''قل اعوذ برب الناس'' پڑھ کر سحر کے وقت اپنی والدہ یعنی امی بی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دو رکعت میں نے پڑھا دی، اٹھارہ آپ پڑھ لیں اور ان کی والدہ امی بی رحمہا اللہ تعالیٰ نے سارا قرآن کھڑے ہو کر سنا بات پر بات نکلتی جاتی ہے، مگر یہ واقعات بھی اکابر کے مجاہدات میں داخل ہیں اس لیے زیادہ بے محل نہیں۔

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم کے مجاہدات

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ رائے پوری کے رمضان المبارک کے معمولات تذکرۃ الرشید میں یہ لکھے ہیں کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کو تعلیم قرآن پاک سے شغف تھا، (دون کے دیہات میں بیسیوں مکاتیب قرآن پاک کے جاری کرائے) اسی طرح خود تلاوت کلام اللہ سے عشق تھا، آپ حافظ قرآن تھے اور شب کا قریب قریب سارا وقت تلاوت میں صرف ہوتا تھا، رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں شاید آپ گھنٹہ بھر سے زیادہ نہ سوتے ہوں اور اسی لیے آپ کو لوگوں سے وحشت ہوتی تھی کہ معمول تلاوت میں حرج ہوتا تھا، عصر و مغرب کے درمیان کا وقت عام دربار اور سب کی ملاقات کے لیے مخصوص تھا (از زکریا) صبح کے وقت میں بھی نو دس بجے کے قریب ایک گھنٹہ مہمانوں کی عمومی ملاقات کا تھا اور اس کے علاوہ بغیر کسی خاص ضرورت کے آپ کسی سے نہ ملتے اور حجرہ شریف کا دروازہ بند فرما کر خلوت کے مزے لوٹتے اور اپنے مولائے کریم سے راز و نیاز میں مشغول رہا کرتے تھے، خوراک آپ کی کم تھی اور ماہ رمضان میں تو مجاہدہ اس قدر بڑھ جاتا کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا، ماہِ رمضان میں صبح و عصر کے بعد کی مجلس بھی موقوف رہتی تھی، زکریا) افطار و سحر دونوں کا کھانا بمشکل دو پیالی چائے اور آدھی یا ایک چپاتی ہوتی تھی۔

شروع میں آپ قرآن مجید تراویح میں خود سناتے اور دو ڈھائی بجے فارغ ہوتے تھے، (ھکذا فی الاصل) مگر آخر میں دماغ کا ضعف زیادہ بڑھ گیا تو سامع بنتے اور اپنی تلاوت کے علاوہ تین چار ختم سن لیا کرتے تھے، ماہِ مبارک میں چونکہ تمام رات اور تمام دن آپ کا مشغلہ تلاوت کلام اللہ رہتا تھا، اس لیے تمام مہمانوں کی آمد آپ روک دیا کرتے تھے، (از زکریا۔ مہمانوں کا ہجوم تو رمضان میں اعلیٰ حضرت رائے پوری کے یہاں بہت بڑھ جاتا تھا، البتہ ملاقات بالکل بند تھی جب حضرت قدس سرہٗ نمازوں کے لیے مسجد میں آتے جاتے اس وقت دور سے زیارت کر لیا کرتے تھے) اور مراسلت بھی پورے مہینے بند رہتی تھی کہ کوئی خط کسی کا بھی (الا ماشاء اللہ) عید سے قبل

دیکھا یا سنا نہ جاتا تھا، اللہ جل جلالہ کا ذکر جس پیرایہ پر بھی ہو آپ کی اصل غذا تھی اور اسی سے آپ کو وہ قوت پہنچتی تھی جس کے سامنے دواء المسک اور جواہر مہرہ ہیچ تھا۔ (تذکرۃ الخلیل: ص ۲۴۸)

یہ اُوپر لکھا جا چکا ہے کہ اعلیٰ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں رمضان میں ہجوم تو بہت رہتا تھا، مگر حقیقی طالبین کا رہتا تھا، جس کے لیے ماہ مبارک میں کوئی ملاقات کا وقت نہیں تھا، صرف نماز کو جاتے ہوئے دور سے زیارت ان مشتاقین کے لیے کافی تھی، لیکن جن لوگوں کے آنے پر حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے قلبِ اطہر کو متوجہ ہونا پڑے، ان کا آنا بڑا گراں تھا، آپ بیتی نمبر۴ تحدیث بالنعمۃ میں لکھوا چکا ہوں کہ اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کے زمانہ حیات کے آخری رمضام میں میں نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں رمضان ۳۴ھ گزارنے کی خواہش کی تھی تو اعلیٰ حضرت نے ازراہِ شفقت تحریر فرمایا کہ رمضان کہیں آنے جانے کا نہیں ہوتا اور نہ ملنے کا، اپنی جگہ پر یکسوئی سے کام کرتے رہو، اس ناکارہ نے صرف اخیر عشرے میں حاضری کی اجازت چاہی، جس کا جواب میرے کاغذات میں سے مل گیا تھا اور وہ آپ بیتی نمبر۴ میں بھی لکھوا چکا ہوں کہ جو سبب شروع ماہ مبارک میں عدم قیام کا ہے وہ اخیر ماہ میں بھی موجود ہے باقی تم اور تمہارے ابا جان زبردست ہو، ہم غریبوں کی کیا چل سکے، یہ تمہاری زبردستی ہے کہ جو اس وقت ماہ مبارک میں تم کو جواب لکھوا رہا ہوں، باقی جو ذکر و شغل حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ نے تلقین فرمایا ہے وہی کرنا چاہیے، یہ خط تو وہاں گزر چکا مگر میرے والد صاحب نے فرمایا کہ تیری وجہ سے حضرت کی یکسوئی میں فرق پڑے گا اور حضرت کو تیرے کھانے پینے کا فکر رہے گا اس لیے حضرت کا حرج نہ کر۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی کے مجاہدات

حضرت شیخ الاسلام مولانا الحاج سید حسین احمد صاحب المدنی نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات کے لیے تو بڑے دفتر چاہئیں، یہ تو میرا متعدد اکابر سے سنا ہوا ہے کہ جب مدینہ پاک میں ذکر و شغل کی ابتداء کی تو مدینہ پاک سے باہر ایک مسجد اجابت تھی جو اب تو شہر کے اندر آگئی اور چاروں طرف آبادی بہت بڑھ گئی، اس وقت ویرانہ میں تھی، حضرت وہاں بیٹھ کر اس زور و شور سے ضربیں لگایا کرتے تھے کہ دور تک آواز جایا کرتی تھی اور بعض مرتبہ جوشِ عشق میں ضربیں لگاتے لگاتے اُٹھ کر مسجد کی دیواروں میں سر دے کر مارا کرتے تھے، یہ گستاخ بعض مواقع پر حضرت سے عرض بھی کر دیتا تھا کہ آپ کی دماغی قوت کا کون مقابلہ کر سکتا ہے جس کا سر دیواروں پر مارنے سے بھی نہ پھوٹا، حضرت نے کبھی اس کی تردید تو فرمائی نہیں، مگر ایسا گہرا سکوت فرماتے تھے کہ یہ گستاخ کہہ کر خود ہی پشیمان ہوتا تھا، حجاز سے واپسی اور صبح کو چھ بجے دیوبند پہنچنا اور اس وقت سات بجے بخاری شریف

کا سبق پڑھا دینا تو مجھے بھی معلوم ہے۔

الیکشن کے ہنگامہ میں ایک مرتبہ جمعرات کی شام کو چار بجے کی گاڑی سے دہلی تشریف لے گئے، دس بجے حاجی علی جان مرحوم کی کوٹھی میں کوئی میٹنگ تھی، اس میں مشغول رہے، وہاں سے فارغ ہوکر رات ہی کو نانوتہ پہنچے، صبح کی نماز کے بعد نانوتہ میں جلسہ میں تقریباً دو گھنٹے تقریر فرمائی، وہاں سے فارغ ہوکر سہارنپور ہوتے ہوئے سیدھے سنسار پور تشریف لے گئے، وہاں ایک اجتماع میں تقریر فرمائی، جمعہ بہٹ آکر پڑھا اور جمعہ کے بعد دو گھنٹہ وہاں تقریر فرمائی، عصر کے بعد سہارنپور تشریف لائے، عشاء کے بعد سہارنپور کے ایک اجتماع میں تقریر فرمائی، شنبہ کی صبح کو دیوبند جا کر بخاری شریف کا سبق پڑھا دیا، حضرت کے مجاہدات کی تفصیل تو بہت لمبی ہے اور مجاہد اعظم کا لقب حضرت کے لیے حضرت کے مجاہدات کے مقابلہ میں کم ہے، البتہ سلہٹ کے ایک رمضان کا واقعہ لکھواتا ہوں جس کو مولوی عبدالمجید صاحب اعظمی نے ''مولانا مدنی کا قیام سلہٹ'' نامی رسالہ میں مفصلہ تحریر فرمایا ہے۔

یہ بہت ہی طویل مضمون اس رسالہ کے دس صفحے پر آیا تھا، اسی دوران میں اکابر کے رمضان کے نام سے مستقل ایک رسالہ لکھنے کی نوبت آگئی، اس میں بھی یہ مضمون بعینہٖ مکرر آگیا، اگرچہ میرا تو جی چاہتا تھا کہ دونوں رسالوں میں مستقل آجائے مگر میرے بعض دوستوں کی رائے ہوئی کہ ایک ہی مضمون دو جگہ اتنا طویل تکرار ہے، مختصر ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا، اس کے لیے یہاں سے لکھوانے کے بعد حذف کر دیا، مگر ہے قابل دید اور اکابر کے رمضان تو سارے ہی دیکھنے کے قابل ہیں، دوستوں کا مشورہ ہے کہ اس مضمون کو خاص طور سے اس میں ضرور دیکھیں، بعد میں مفتی محمود صاحب کی رائے یہ ہوئی کہ دونوں جگہ ہونا ضروری ہے، اس لیے باقی رکھا گیا۔

مولوی عبدالحمید صاحب اعظمی حضرت کے معمولات رمضان کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا کا قیام تو داروغہ عبدالستار صاحب مرحوم کے مکان پر ہوتا تھا اور نئی سڑک کی بڑی مسجد جو قیام گاہ سے تقریباً دو فرلانگ ہے، اس میں حضرت پانچوں وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی میں زائرین معتقدین دور دراز سے آکر ماہِ مبارک میں فروکش ہوتے تھے چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا پورے ماہ کا قیام ہوتا تھا۔ اس لیے نیت اقامت کی ہوتی تھی اور جملہ نمازوں میں حضرت خود ہی امامت فرمایا کرتے تھے اور ظہر کی نماز کے بعد مصلی کے چاروں طرف جو بیسیوں بوتلیں پانی دم کرنے کی رکھی رہتیں، ان پر دم کرتے اس کے بعد نیچے سے وہ درخواستیں نکالتے جو ظہر کی نماز تک وہاں جمع ہوتی رہتی تھیں اور ان کو ہر ایک کو پڑھ کر صاحب درخواست کو بلا کر اس کی درخواست پوری فرماتے تعویذ وغیرہ لکھتے، جس میں بیعت کی درخواست ہوتی، ان سب کو جمع

کرتے۔ ان درخواستوں سے فارغ ہونے کے بعد بیعت ہونے والے حضرات کو بیعت کرتے پھر کچھ ارشاد ونصیحت کے بعد دولت خانہ تشریف لے جاتے۔ جانے کے ساتھ کبھی ذرا سالیٹ گئے ورنہ تلاوت میں مشغول ہوگئے۔ ڈاک کا کام اگر باقی رہ گیا تو اس کو پورا کیا، اسی درمیان میں خصوصی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا اتنے میں عصر کی اذان ہوجاتی۔ حضرت ضروریات سے فارغ ہوکر نمازِ عصر کے لیے تشریف لے جاتے۔ نمازِ عصر سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمد جلیل صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند کے ساتھ سوا پارے کا دور فرماتے اس طرح کہ پاؤ پارہ حضرت پڑھتے اور پھر وہی پارہ حضرت مولانا جلیل صاحب پڑھتے۔ مغرب تک اسی طرح رہتا۔ اگر غروب سے پہلے دور ختم ہوجاتا تو حضرت مراقب رہتے اور رفقاء اپنے ذکر وشغل میں مشغول رہتے اور معمولی افطار کے بعد جو عموماً کھجور اور زمزم سے اور ناشپاتی، انناس، عمدہ کیلے، آم، بصری کھجوریں، ناریل کا پانی، پپیتے، میٹھے اور نمکین چاول بھی ہوجاتے، تلے ہوئے انڈے بھی ہوتے اور عام ہندوستانی افطاری پھلیاں چنے وغیرہ سے دسترخوان خالی ہوتے۔ میں تو سمجھا کہ ان چیزوں کا یہاں رواج نہیں۔ مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ رواج تو خوب ہے مگر ان چیزوں کو گھٹیا سمجھا جاتا ہے۔ مگر حضرت نور اللہ مرقدہٗ نہایت استغراق میں ساکت رہتے، افطار گاہ مسجد کے قریب ہی تھی، لیکن دور ختم ہونے سے جو استغراقی کیفیت ہوتی تو بعض مرتبہ اذان کی بھی اطلاع کرنی پڑتی۔''

(از زکریا) یہ منظر اس ناکارہ نے بھی دیوبند کی حاضری پر بار ہا دیکھا کہ لوگ کسی سیاسی مسئلہ پر زور وشور سے بحث ومباحثہ کرتے رہتے اور کسی موقع پر حضرت زور سے فرماتے ''آ گئیں''، ''آ گئیں''۔

اس وقت میں یہ سمجھتا کہ حضرت جی تو یہاں ہیں ہی نہیں۔'' افطار کی ان تنوعات کے باوجود جو اوپر ذکر کیا گیا، حضرت کا افطار کھجور، زمزم کے بعد ایک آدھ قاش پھل کی نوش فرماکر ناریل کا پانی نوش فرماتے اور ایک یا آدھی پیالی چائے کی نوش فرماتے، لیکن دسترخوان کے ختم ہونے تک وہیں تشریف فرما ہوتے اور کبھی کبھی کوئی مزاحی تفریحی فقرہ بھی فرمادیا کرتے۔ آٹھ دس منٹ اس افطار میں لگ جاتے، اس کے بعد حضرت مغرب کی نماز نہایت مختصر پڑھتے اور اس کے بعد دو رکعت نفل نہایت طویل تقریباً نصف گھنٹے تک پڑھتے۔ اس کے بعد حضرت طویل دعاء مانگتے، جس میں سارے اہل مسجد چاہے مشغول ہوں یا فارغ، شرکت کرتے۔ اس کے بعد اگر کہیں دعوت ہوتی تو مسجد سے داعی کے مکان پر تشریف لے جاتے۔ ورنہ اپنی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے۔

کھانے میں دو دسترخوان ہوا کرتے تھے۔ ایک حضرت اور ان کے رفقاء کا جو روٹی کھانے کے

عادی تھے اور دوسرا مہمانوں کا، جو چاول کھانے والے ہوتے تھے۔ حضرت کے رفقاء میں صاحبزادے مولانا اسعد اور عزیزان ارشد و ریحان بھی ہوتے۔ یہ تینوں بھی چاول کھانے والوں میں ہوتے۔ حضت مزاحاً ارشاد فرمایا کرتے ''دو بنگالی میرے پاس بھی ہیں، ان کے لیے بھی چاول پکا دیجئے''۔

دستر خوان پر مختلف قسم کے چاول کثرت سے ہوتے تھے۔ اس لیے کہ مجمع بنگالیوں کا ہوتا تھا اور وہ چاول کے عادی ہیں۔ پراٹھے کا دستور ہے، مگر سادی چپاتیاں نہ معلوم ہیں نہ کوئی پکانا جانتا ہے دستر خوان پر گوشت وغیرہ کے علاوہ کسی میٹھی چیز کا ہونا بھی ضروری ہے۔ حلوے اور شاہی ٹکڑوں کے علاوہ پپیتے اور پیٹھے کی سویاں اس تکلف سے پکائی جاتیں کہ ادھر کے لوگوں کو اس کی پہچان اور تمیز مشکل ہوتی۔ نیپال کی سبز مرچیں بھی تراش کر دستر خوان پر رکھنا بھی ضروری ہوتا۔ باوجود اس کے کہ یہ مچھلیوں کا ملک ہے، معلوم نہیں مچھلی دستر خوان پر کیوں نہیں ہوتی تھی۔ ایک نئی ترکاری بانس کی لائی گئی تھی، تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہاں بانسوں میں ایک گوپھا ہوتا ہے اس کی ترکاری پکائی جاتی ہے۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا عمومی دستر خوان دیوبند میں بھی اور یہاں بھی عرب کے قاعدہ کے موافق بڑے طباق میں ترکاری اور اس کے چاروں طرف حلقہ بنا کر کھانے والے بیٹھتے تھے۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے پاس ایک کپڑے میں گرم چپاتیاں لپٹی رہتی تھیں اور حسبِ ضرورت مہمانوں کو مرحمت فرماتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص اپنی رکابی کو بھری ہوئی چھوڑ دیتا تو حضرت اس کو اٹھا کر اپنے دستِ مبارک سے صاف کر دیتے اور دسترخوان پر گرے ہوئے روٹی کے ٹکڑے کو اٹھا کر بے تکلف کھا لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو بھی اس کا اہتمام ہو گیا۔ حضرت کا معمول دو زانو بیٹھ کر کھانے کا تھا ایک چپاتی بائیں ہاتھ میں دبا لیتے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے توڑ کر کھاتے۔ سب سے اول میں افتتاح کرتے اور سب سے آخر میں فارغ ہوتے۔ کھانے کے بعد سب مہمان چائے پیتے۔

یہ سب تفصیل دعوت کی تھی۔ اگر کہیں دعوت نہ ہوتی تو حضرت مغرب کی نماز سے فراغ کے بعد سیدھے قیام گاہ پر تشریف لاتے کھانا پہلے سے تیار ہوتا۔ تشریف لاتے ہی دو دستر خوان ایک چاول والوں کا اور دوسرا حضرت اور ان کے رفقاء روٹی کھانے والوں کا۔ چونکہ مکان پر کھانے سے جلدی فراغ ہو جاتا، اس لیے حضرت کھانے کے بعد چند منٹ بیٹھ جاتے۔ احباب مختلف گفتگو علمی یا اخباری کرتے رہتے، حضرت بھی اس میں شریک ہوتے۔ اس کے بعد چند منٹ کے لیے حضرت آرام فرماتے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا مخصوص لہجہ اور ان کی

نماز کا خشوع اور خضوع نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب اور حجاز میں بھی ممتاز و مسلم ہے۔

سلہٹ میں حضرت نماز اور تراویح کی امامت خود فرماتے۔ اس تراویح کی شرکت کے لیے دور دراز سے سینکڑوں آدمی آتے اور تراویح و تہجد کی شرکت فرما کر صبح سب اپنے گھر روانہ ہو جاتے۔

(از زکریا) حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی قراءت اور نمازوں کے متعلق جو لکھا لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ فرائض کی اقتداء تو اس ناکارہ کو سینکڑوں مرتبہ ہوئی ہوگی۔ لیکن ماہِ مبارک میں حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری کی کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ البتہ تراویح میں دو مرتبہ اقتداء کی نوبت آئی۔

پہلی مرتبہ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ میں جب کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ الہ آباد جیل سے رہا ہو کر چودہ رمضان یکشنبہ کی صبح سہارنپور پہنچے اور اسی وقت دوسری گاڑی سے دیوبند روانہ ہو گئے اور ایک شب دیوبند قیام کے بعد دوشنبہ کی دوپہر کو بارہ بجے دہلی تشریف لے گئے۔ چونکہ اس سال ۲۱ رجب کے صبح کو چچا جان کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے حضرت قدس سرہٗ دہلی پہنچنے کے بعد مغرب کے بعد نظام الدین بسلسلہ تعزیت تشریف لے گئے۔ تراویح کے وقت حضرت نے فرمایا جو امام تراویح ہے وہ تراویح پڑھائے۔ میں نے عرض کیا کہ کس کی ہمت ہے کہ آپ کے سامنے تراویح پڑھا سکے، آج تو آپ ہی کو پڑھانی ہے۔ تھوڑی سی رد و قدح کے بعد حضرت نے منظور فرما لیا اور اسی شب کی تراویح کی امامت حضرت نے نظام الدین میں فرمائی اور اپنی تراویح کا قرآن جو پہلے سے شروع ہوا ہوا تھا اس میں پارہ ۱۴ کے نصف سے سورہ بنی اسرائیل کے ختم تک ایک پارہ بیس رکعت میں اسے اطمینان سے پڑھا کہ لطف آ گیا۔

دوسری مرتبہ دوسرے سال رمضان ۶۴ھ کی پہلی تراویح حضرت نے سہارنپور کے اسٹیشن پر پڑھائی کہ ۲۹ شعبان کی شب صبح کو چار بجے بخاری ختم ہوئی اور اس دن شام کو مع اہل و عیال لاری سے دیوبند سے روانہ ہو کر سہارنپور پہنچے اور بارہ بجے کے قریب سہارنپور کے اسٹیشن پر بہت بڑی جماعت کے ساتھ تراویح پڑھی۔ اہل مدرسہ و اہل شہر کی بڑی جماعت جو اپنے اپنے یہاں سے تراویح پڑھ کر اسٹیشن پہنچتے رہے اور بہ نیت نفل شریک ہوتے رہے۔ زکریا کو حضرت نے حکم فرمایا کہ میرے قریب کھڑے ہو سامع تمہیں بننا ہے۔ میں نے عرض کیا، آپ کو لقمہ دینا آسان تھوڑا ہی ہے، مجمع میں حافظ بہت ہیں اچھے سے حافظ کو لاؤں، حضرت نے قبول نہیں فرمایا اور اس شب کے استماع کا فخر اس سیہ کار کو حاصل ہوا۔ فقط

مولوی عبدالحمید صاحب لکھتے ہیں کہ چونکہ مجمع دور دور سے آتا تھا۔ اذان کے بعد ہی مسجد پُر ہو جاتی تھی۔ بعد میں آنے والوں کو جگہ بھی نہیں ملتی تھی۔ حضرت کے تشریف لے جانے کے لیے درمیان میں تھوڑی سی جگہ خالی رکھی جاتی۔ مسجد میں تشریف لاتے وقت متولی مسجد پانی کا گلاس

پہلے سے بھر کر انتظار میں کھڑے ہوتے کہ حضرت مکان سے چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد ایک پان کھا کر موٹر میں تشریف فرما ہوتے اور گلی کر کے سیدھے مصلی پر پہنچتے تھے۔ کثرت ہجوم کی وجہ سے ایک دو مکبر تو ضروری تھے اور اخیر عشرہ میں کئی کئی مکبر ہو جاتے تھے۔ تراویح میں ڈھائی پارے قرآن پاک کے اس طرح پڑھتے کہ اول چار رکعتوں میں مولوی جلیل سوا پارہ پڑھتے اور اسی سوا پارہ کو سولہ رکعتوں میں حضرت قدس سرہٗ پڑھتے۔ ترویحہ بہت لمبا ہوتا۔ حضرت پر تراویح میں قرآن پاک پڑھتے ہوئے بعض وقت ایک جوش پیدا ہوتا کہ اس وقت کی لذت تو سننے والے ہی کو معلوم ہے۔ تراویح کے بعد بہت طویل دعاء ہوتی۔ جس میں حاضرین پر گریہ وبکا کا ایسا زور ہوتا کہ بسا اوقات ساری مسجد گونج جاتی۔ تراویح کے بعد حضرت اپنے رفقاء اور خدام کے ساتھ وہیں چائے نوش فرماتے اور تقریباً دس منٹ بعد حضرت کے وعظ میں شرکت کے لیے مسجد آجاتے اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تل رکھنے کی جگہ نہیں رہتی۔ بلکہ لوگ مسجد سے باہر سڑکوں پر کھڑے ہوتے وہاں آواز نہیں پہنچتی تھی اس لیے آلہ مکبر الصوت کا انتظام کیا گیا اور اس وقت میں وعظ میں شرکت کرنے والوں کو جن کی ہزاروں کی تعداد ہوتی تھی۔ چائے بھی خاموشی سے ملتی رہتی مگر اس میں آواز بالکل نہ ہوتی تھی اور نہ کوئی ایسا شخص ہوتا تھا جس کو چائے نہ ملی ہو۔ اتنے حضرت نور اللہ مرقدہٗ اپنی چائے سے فراغت پاتے اتنے مجمع بھی چائے سے فارغ ہو جاتا۔

یہ وعظ بالکل اصلاحی ہوتا تھا۔ سیاسیات پر کوئی کلام طویل نہ ہوتا۔ ایک آدھ لفظ بیچ میں چاشنی کے طور پر آجاتا تھا۔ (لارڈ میکالے اور ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر تو حضرت قدس سرہٗ کے ورد زبان تھے)۔ حضرت کے وعظ میں پرچہ بھی پہنچتا رہتا اور حضرت ان کو سن کر جواب بھی تفصیل سے دیتے۔ جب وسط رمضان کے بعد سے حضرت قدس سرہٗ کی طبیعت ناساز ہوگئی تو دوسرے لوگ وعظ کرتے رہے، لیکن حضرت قدس سرہٗ باوجود ناسازی طبع کے جب تک وعظ ختم نہ ہوتا وعظ میں شرکت فرما ہوتے۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ بعد وعظ ختم ہو کر مصافحہ کا نمبر شروع ہوتا۔ باوجود انتظامات کے کار تک پہنچنے میں دیر لگ جاتی۔

مکان پر تشریف لانے کے بعد ہلکا سا ناشتہ پیش ہوتا۔ جس میں جملہ حاضرین شرکت کرتے۔ ڈیڑھ بجے رات کو یہ مجلس ختم ہو جاتی، اس کے بعد حضرت اپنے حجرہ میں تشریف لاتے۔ اس میں بھی بعض مخصوص حضرات سے تخلیہ میں بات کرتے۔ اس کے بعد تقریباً آدھ گھنٹے حضرت آرام فرماتے اور پھر تہجد کے لیے بیدار ہو جاتے

(از زکریا) اس کا اس ناکارہ کو بھی بہت ہی کثرت سے تجربہ ہوا ہے کہ میرے حضرت مرشدی سہارنپوری اور حضرت مدنی نور اللہ مرقدہما کی نیند اس قدر قابو کی تھی کہ جب سونے کا ارادہ

فرماتے، لیٹتے ہی آنکھ لگ جاتی اور جب اٹھنے کا ارادہ ہوتا تو بغیر کسی الارم یا جگانے والے کے خود بخود آنکھ کھل جاتی۔ میں دونوں اکابر کے متعلق آپ بیتی میں کہیں لکھوا بھی چکا ہوں کہ حضرت مرشدی جب اسٹیشن تشریف لے جاتے اور معلوم ہوجاتا کہ گاڑی دس منٹ لیٹ ہے تو حضرت فرماتے کہ دس منٹ میں ایک نیند لی جاسکتی ہے اور وہیں بستر منگوا کر آرام فرماتے اور دس منٹ بعد خود بخود اٹھ جاتے اور حضرت شیخ الاسلام کے متعلق سینکڑوں دفعہ یہ بات دیکھنے کی نوبت آئی کہ میرے مکان پر تشریف لاتے آرام فرماتے اور گاڑی چھوٹنے سے آدھے گھنٹے پہلے اپنے آپ اٹھ جاتے۔ میں نے بہت دفعہ کوشش کی کہ آنکھ نہ کھلے، کوئی آہٹ نہ ہو، مگر آدھے گھنٹے پہلے اٹھ کر فوراً اسٹیشن کے لیے روانہ ہوجاتے۔ فقط) اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد مسجد میں تہجد کے لیے تشریف لے جاتے۔ جو لوگ تہجد کی شرکت کے لیے دور دور سے آتے وہ سب حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے پہنچنے سے پہلے ورنہ پہلی رکعت میں ضرور شریک ہوجاتے۔

تہجد میں دو قرآن کا معمول تھا۔ ایک حضرت نور اللہ مرقدہٗ پڑھتے۔ دوسرا مولانا محمد جلیل صاحب۔ حضرت تہجد کے لیے تشریف لے جاتے وقت بہت اہتمام کرتے کہ آہٹ نہ ہو اور کسی کی آنکھ نہ کھلے، مگر فرطِ شوق میں لوگ جاگ ہی جاتے تھے۔ نفلوں کے بعد چونکہ سحری کا وقت بہت کم رہ جاتا ہے۔ اسی لیے فوراً اسی مکان پر سحری کا دستر خوان بچھ جاتا اور وقت کی تنگی کی وجہ سے جلدی جلدی انگلیاں اور منہ کھانے میں مشغول اور آنکھیں گھڑی پر اور کان مؤذن کی آواز پر ہمہ تن متوجہ رہتے اور حضرت سحری سے فراغت کے بعد تھوڑی دیر لیٹ جاتے اور پھر نماز کی تیاری کرتے اور مسجد تشریف لے جاتے اور اسفار میں نماز ہوتی، لیکن اخیر عشرہ میں اعتکاف کے زمانے ''غلس'' میں شروع ہوتی اور ''اسفار تام'' میں ختم ہوتی۔ واپس جانے والے حضرات الوداعی مصافحہ کرتے اور حضرت اپنی قیام گاہ پر تشریف لاتے اور فوراً لیٹ جاتے۔ ایک دو خادم بدن دباتے اور سر مبارک پر تیل مل جاتا اور حضرت بعض مرتبہ باتیں کرتے کرتے ہی سو جاتے۔ رفقاء بھی سب سو جاتے۔ حضرت تھوڑی دیر آرام کے بعد وضو استنجاء سے فارغ ہونے کے بعد تلاوت قرآن شریف میں مشغول ہوجاتے اور دس بجے تک ان لوگوں کی آمد شروع ہوجاتی جن کو تخلیہ کا وقت دے رکھا تھا۔ لیکن درمیان میں بھی اگر کچھ وقت ملتا تو حضرت قدس سرہٗ تلاوت میں مصروف ہوجاتے اور اسی وقت ڈاک بھی تحریر فرماتے۔ اس سال چونکہ ڈاک ہڑتال تھی، اس لیے دس رمضان تک تو ڈاک کا سلسلہ بند رہا اور گزشتہ ڈاک جو ساتھ تھی اس کی تکمیل فرماتے رہتے، لیکن دس رمضان کے بعد ڈاک جب شروع ہوگئی تو اس کا انبار لگ گیا تو اس میں بہت وقت خرچ ہونے لگا۔ اسی درمیان میں جن لوگوں کو کچھ خصوصی بات کرنی ہوتی وہ بھی آتے جاتے، یہ سلسلہ کبھی کبھی تو

ظہر تک چلتا اور اگر کبھی وقت مل جاتا تو ظہر سے پہلے آدھ گھنٹہ آرام فرما لیتے۔

اس سال حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی طبیعت بہت ناساز رہی اور وسط رمضان سے بخار وغیرہ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اس لیے بعض خدام نے اعتکاف کے متعلق استمزاج کیا کہ اعتکاف میں دقت زیادہ ہو گی۔ حضرت نے فرمایا کہ نہیں اعتکاف کی نیت کر لی ہے۔ چنانچہ مسجد کے ایک کونہ میں حضرت کا معتکف بنا دیا گیا۔ لیکن بخار کی شدت کی وجہ سے بسا اوقات دورانِ نماز میں سردی لگ جاتی۔ حضرت چادر اوڑھ لیتے۔ برقی پنکھے بند کر دیئے جاتے۔ اسی طرح بخار ہی کی حالت میں تہجد میں طویل قیام اور لمبی قراءت کرنا پڑتی۔ کیونکہ قیام گاہ پر حضرت کی ناسازی طبع کی وجہ سے چار راتوں میں تہجد کی نماز با جماعت نہیں ہو سکی تھی، اس لیے قرآن ختم ہونے کو کافی باقی رہ گیا تھا۔ اس کمی کو اس عشرہ میں پورا کرنا ضروری تھا، اس پر مزید یہ کہ مسجد میں قیام اور لوگوں کے ہجوم و اژدہام کے باعث رات کے نصف گھنٹے کا وہ سکون اور خاموشی بھی یہاں میسر نہیں تھی جو قیام پر حاصل تھی۔ اس لیے مشاغل کی زیادتی کے ساتھ آرام کا بھی خاص موقع نہیں۔ اخیر عشرہ میں ہجوم بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مسجد سے باہر سڑکوں پر بھی آدمی رہتے تھے۔ جس کی وجہ سے ظہر کے بعد کی درخواستوں میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی طرح سے بیعت ہونے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور مخصوص طالبین سالکین جن کو اپنے مخصوص حالات سنا کر ہدایت لینی تھی، ان کی تعداد تو بہت ہی بڑھ گئی تھی، حتی کہ ان کے لیے نمبر وار باری مقرر کرنی پڑ گئی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر جانے والوں کے مصافحوں کی بہت کثرت ہوتی۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت اپنے معتکف میں تشریف لے جاتے اور تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد جب کہ رات کا جاگا ہوا سارا مجمع گہری نیند سویا ہوا ہوتا، حضرت اٹھ کر نہایت آہستہ آہستہ قدم بچا کر استنجاء تشریف لے جاتے اور وضو فرما کر اپنے معمولات میں مشغول ہو جاتے۔

شب قدر کے متوالے ۲٦ کی صبح ہی سے مسجد میں آنے شروع ہو جاتے اور ہجوم بڑھتا رہتا۔ اس لیے کہ عوام میں شب قدر کے متعلق یہی ہے کہ وہ ۲۷ کو ہوتی ہے۔ اس لیے مسجد کے آس پاس کی جگہ بھی کھچا کھچ بھر گئی۔ ظہر کے بعد کی درخواستوں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ حد نہیں اور رات کو دم کرنے والی بوتلوں کا ہجوم حضرت کے مصلے کے چاروں طرف پھیل گیا اور جب تہجد کے بعد حضرت نے دعاء کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ تو ساری مسجد رونے سے گونج گئی اور خود حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے اوپر جس کیف و سرور کی حالت دیکھی وہ بیان سے باہر ہے۔ شب قدر کی تعیین میں حضرت کی مجلس میں مختلف گفتگوئیں شروع ہوئیں۔ راقم الحروف (مولانا عبد الحمید صاحب اعظمی) نے کہا کہ اہل اللہ کو تو شب قدر کے کوائف سارے معلوم ہو جاتے ہیں۔ معلوم نہیں اس سال اخیر

راتوں میں سے کونسی رات میں شب قدر تھی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ اس سال شب قدر ۲۳ شب میں تھی۔ تیسویں رمضان چہار شنبہ کو عید کا چاند دیکھنے کے بعد حضرت شیخ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔ اس شب میں بھی تہجد کی نماز جماعت سے ہوئی اور حضرت نے اس قدر طویل قیام فرمایا کہ سارے رمضان میں کسی رات اتنا طویل قیام تہجد میں نہیں فرمایا ہوگا۔ صبح کو ٹھیک ساڑھے نو بجے حضرت نے اس مسجد میں عید کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد عربی زبان میں جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اصل کتاب میں موجود ہے۔

مصنف نے حضرت کی واپسی کا ذکر نہیں فرمایا۔ چونکہ اس سال راستے بند تھے۔ ہنگاموں کی وجہ سے ریلوں میں مشکلات ہو رہی تھیں۔ اس واسطے بروایۃ مولوی محمود صاحب پیٹھڑوی جو اس رمضان میں حضرت کے ہمرکاب تھے۔ حضرت قدس سرہٗ، تو ہوائی جہاز سے واپس تشریف لے آئے اور خدام آہستہ آہستہ متفرق طور پر واپس ہوئے کہ فسادات کی وجہ سے ہر جگہ ریلوں پر ہنگامے ہو رہے تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری کے مجاہدات

حضرت اقدس مولانا الحاج عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے رمضان کے متعلق علی میاں نے لکھا ہے کہ رمضان مبارک میں خاص بہار ہوتی، لوگ بہت پہلے سے اس کے منتظر ہوتے اور تیاریاں کرتے۔ ملازمین چھٹیاں لے کر آتے، مدارس دینیہ کے اساتذہ اس موقع کو غنیمت جان کر اہتمام سے آتے، علماء وحفاظ کی خاصی تعداد جمع ہوتی، تقسیم سے پہلے مشرقی پنجاب کے اہلِ تعلق و خدام اور وہاں کے مدارس کے علماء کی تعداد غالب ہوتی، اہل رائے پور اور اطراف کے اہل تعلق اولوالعزمی اور عالی ہمتی سے مہمانوں اور مقیمین خانقاہ کے افطار طعام وسحر کا انتظام کرتے۔ رمضان مبارک میں اپنے شیخ کی اتباع میں مجلسیں سب ختم ہو جاتیں۔ باتوں کے لیے کوئی خاص وقت نہ تھا۔ ڈاک بھی بند رہتی۔ تخلیہ نماز کے وقت کے علاوہ تقریباً چوبیس گھنٹے کسی ایسے شخص کے آنے سے گرانی ہوتی جس کے لیے وقت صرف کرنا پڑتا۔

افطار علالت سے پیشتر مجمع کے ساتھ ہوتا، جس میں کھجور اور زمزم کا خاص اہتمام ہوتا۔ مغرب کے متصل کھانا علالت سے پہلے مجمع کے ساتھ ہوتا۔ اس کے بعد چائے عشاء کی اذان تک۔ یہی وقت چوبیس گھنٹے میں مجلس کا تھا۔ اذان کے بعد نماز کی تیاری اس درمیان میں حضرات علماء جن کا مجمع اگلی صف میں رہتا۔ بعض اہم اہم سوالات کرتے اور حضرت ان کا جواب دیتے۔ عشاء کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ کبھی نشست اور کبھی لیٹ جاتے۔ خدام بدن دبانا شروع کرتے۔ مسجد وخانقاہ

میں تراویح ہوتی، مسجد میں بھی قرآن ہوتا اور خانقاہ میں بھی۔ یوں حفاظ کی کثرت ہوتی، مگر حضرت اچھے پڑھنے والے بہتر حافظ کو پسند فرماتے۔ حضرت نے ایک سال ۱۹۵۳ء میں منصوری پر رمضان کیا۔ پچاس، ساٹھ خدام ساتھ تھے۔ مولوی عبدالمنان صاحب نے قرآن شریف سنایا۔ تراویح کے بعد حضرت کے تشریف رکھنے اور مجلس کا معمول تھا۔ طبیعت میں بڑی شگفتگی اور انبساط تھا۔ متعدد حضرات رات بھر بیدار اور مشغول رہتے، غرض دن رات ایک کیف محسوس ہوتی، ضعفاء وکم ہمت بھی سمجھتے تے:

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

ایک حاضر خدمت خادم نے جس کو آخری عشرہ گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور جو اپنی صحت کی کمزوری اور ہمت کی پستی کی وجہ سے مجاہدے سے قاصر رہا۔ اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا تھا۔

دکان مے فروش پہ سالک پڑا رہا
اچھا گزر گیا رمضان بادہ خوار کا

(سوانح حضرت اقدس رائے پوری: ص۱۲۴)

حضرت حاجی صاحب کے مجاہدات

حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق حضرت حکیم الامت نے تحریر فرمایا ہے کہ یہاں (تھانہ بھون) جب حضرت حاجی صاحب تشریف رکھتے تھے، تو حافظ عبدالقادر جو حضرت کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی، رات کو یہیں سہ دری میں حضرت کی چارپائی کے نیچے لیٹتے تھے۔ حضرت کی چارپائی بہت مکلّف تھی، نواڑ سے بنی ہوئی۔ رنگین پائے، پیچ بند کسے ہوئے لوگ یوں سمجھتے تھے کہ نوابوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن حال یہ تھا کہ مجھ سے خود حافظ عبدالقادر کہتے تھے کہ عشاء کے بعد حضرت اول میں چارپائی پر آکر لیٹ جاتے بس اس وقت تو سب نے دیکھ لیا کہ حضرت عشاء کے بعد سو رہے ہیں لیکن جب سب نمازی چلے جاتے تو مؤذن سے دروازہ بند کرا لیتے اور مسجد میں مصلی بچھا کر ذکر میں مشول ہو جاتے۔ حافظ صاحب کہتے تھے کہ رات بھر میں شاید تھوڑی ہی دیر آرام فرماتے ہوں۔ کیونکہ جب آنکھ کھلی حضرت کو مسجد میں بیٹھے ہوئے ذکر میں مشغول ہی دیکھا اور کوئی دن ناغہ نہ جاتا تھا کہ روتے نہ ہوں اور بڑے درد سے بار بار یہ شعر نہ پڑھتے ہوں:

اے خدا ایں بندہ رار سوا مکن
گر بدم من سرمن پیدا مکن

(اضافات ۲/۹: ص ۴۳۰)

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بہت ہی نحیف نازک تھے مگر اب تک مجاہدہ کرتے تھے جس کی وجہ سے روح کا نشاط اور قلب کی تازگی تھی۔

ہر چند پیرو خستہ و بس ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

از زکریا:

ان کے دیکھنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

پھر اس قوتِ روحانیہ کی مناسبت سے فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے درِ خیبر قوت بشریہ سے نہیں اٹھایا بلکہ قوت الٰہیہ سے اٹھایا۔ چنانچہ اکھاڑنے کے بعد فرمایا تھا ''ما حملنا ھا بقوة بشرية لكن حملنا ھا بقوة إلهية''۔ (حسن العزیز: ص ۳۸۸ ر ج ۲)

مجاہدہ کے سلسلہ کے متفرق واقعات

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے حضرت شاہ عبدالقدوس صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مجاہدات کا ذکر فرماتے ہوئے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ عبدالقدوس رحمہ اللہ تعالیٰ عشاء کی نماز کے بعد ذکر بالجہر کرنے بیٹھتے اور صبح تک کرتے تھے، سو جس کا ذکر اتنا لمبا ہو اس کا حال کتنا لمبا ہوگا۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۲۵۴ ر ج ۲)

اس کے حاشیہ پر حضرت گنگوہی سے نقل کیا گیا ہے حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے قلب کو اول میں ذکر جہر سے جو زیادہ دھنا ہے تو اب مجھ کو مہلت نہیں دیتا۔ حضرت شاہ ابوسعید صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مجاہدہ تو رلانے کے لیے کافی ہے، آپ بیتی نمبر ۵ میں مختصر گزر چکا ہے۔ حضرت سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ اولاً حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ سے بیعت ہوئے تھے اور بیعت ہونے کے بعد جب دوسری مرتبہ حاضر ہوئے تو تربیت و تعلیم کے لیے حضرت شاہ صاحب نے ان کو اس مسجد میں ٹھہرادیا جو ان کے مدرسہ کے قریب تقریباً پچاس قدم کے فاصلہ پر واقع تھی۔ جس میں شاہ صاحب اور طلبہ نماز پڑھا کرتے تھے اور تعلیم میں اشغال فرما کر حکم دیا کہ آٹھویں روز ہم سے ملا کرو۔ سید صاحب نے چھ ماہ تک تعلیم حاصل کی، چھ ماہ کے بعد شاہ صاحب

کے خاندان میں کسی کے ہاں تقریب شادی ہوئی۔ اس تقریب میں شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب تینوں بھائی موجود تھے اور شامیانہ تانہ جا رہا تھا۔ اس مقام پر ایک نیم کا درخت تھا جس کی وجہ سے شامیانہ اچھی طرح نہ تنتا تھا، بلکہ اس میں جھول رہتا تھا۔ اتنے میں سید صاحب بھی مسجد میں تشریف لے آئے۔ جب آپ نے یہ رنگ دیکھا تو کُرتا کمر سے باندھ کر نیم پر چڑھ گئے اور نیم پر چڑھ کر جو شامیانہ کھنچا تو شامیانہ بالکل تن گیا اور جھول بالکل نکل گیا۔ سید صاحب کی یہ دھج شاہ عبدالقادر صاحب کو پسند آ گئی اور انہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے عرض کیا کہ سید احمد کو مجھے دے دیجئے؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ لے جاؤ اور سید صاحب سے کہہ دیا کہ میاں عبدالقادر کے ساتھ چلے جاؤ۔

شاہ عبدالقادر صاحب ان کو اپنے ساتھ اکبری مسجد میں لے آئے اور ایک حجرہ میں رکھ دیا اور اشغال کے لیے فرمایا کہ میری سہ دری کے پاس بیٹھ کر کیا کرو، سید صاحب نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہ عبدالقادر صاحب کے حکم کے مطابق ذکر و شغل کرتے رہے اور جو جگہ شاہ صاحب نے ان کو بتا دی، سید صاحب خواہ بارش ہو یا آندھی یا دھوپ، برابر اپنی جگہ بیٹھے رہتے تھے اور جب تک شاہ صاحب نہ کہتے تھے کہ اب یہاں سے اٹھ جاؤ اس وقت تک نہ اُٹھتے تھے۔

شاہ صاحب نے سید صاحب کو ڈھائی برس اپنی خدمت میں رکھا اور ڈھائی برس کے بعد ان کو لے کر شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں آئے اور شاہ صاحب سے عرض کیا کہ سید احمد حاضر ہیں، ان کو پرکھ لیجئے پرکھا لیجئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں عبدالقادر تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک کہتے ہو، اب ان کو بیعت کی اجازت دو شاہ عبدالقادر صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اجازت تو آپ ہی دیں گے اور ان سے آپ ہی کا سلسلہ چلے گا۔ شاہ صاحب نے ان کو بیعت کی اجازت دے دی۔ حضرت حکیم الامت اس کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں قولہ سید صاحب سے کہہ دیا۔ اقول اگر شیخ مرید کو کسی کے سپرد کرے اس کے ماننے میں ذرا تردد نہ کرے۔ جیسا خود راویوں کی عادت ہے قولہ جب تک شاہ صاحب الخ اقول یہ ہے انقیاد شیخ کہاں ہیں وہ حضرات جو ان حضرات کو درویشی کا منکر اور بزرگوں کی شان میں بے ادب کہتے ہیں آئیں اور آنکھیں کھول کر دیکھیں۔

(اروحِ ثلاثہ: ص ۱۲۵)

دوسری جگہ سید صاحب کے بارش میں بیٹھنے کا قصہ اس طرح نقل کیا ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے ایک جگہ بتا دی تھی کہ اس جگہ بیٹھ کر ذکر کیا کرو۔ رفتہ رفتہ برسات کا زمانہ آ گیا۔ ایک روز شاہ صاحب نے اس حال میں دیکھا کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور اسی میں بیٹھے ہیں۔ سید صاحب سے پوچھا کہ تم بارش میں کیوں بیٹھے ہو تو فرمایا کہ آپ ہی نے یہ موقع بتایا تھا۔

ہمارے حضرت نے فرمایا ''یہ ہے اطاعت''۔ شاہ صاحب کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ میرے بتانے کو ایسا عام سمجھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تمام برسات اور جاڑا بھی گزر جاتا جب بھی سید صاحب اس جگہ سے نہ اٹھتے۔ (جدید ملفوظات: ص۳۴)

جس نے جو پایا ہے مجاہدہ ہی سے پایا ہے۔ میں اس مضمون کو شروع میں لکھوا چکا ہوں:

میندار جان پدر گر کسی
کہ بے سعی ہرگز بجائے رسی

محض مشائخ اور اکابر کی توجہ سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک خود کچھ نہ کرے۔ غالباً آپ بیتی میں کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ ہمارے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدۂ ایک مرتبہ چلہ کشی کا ارادہ سے پیران کلیر شریف تشریف لے گئے تھے۔ جب بھی مراقب ہوئے یہی صدا آئی کہ اپنا کرنا بھرنا۔ تین دن کے بعد یہ سوچ کر واپس آگئے کہ یہی ہے تو حجرہ کے کیواڑ بند کر کے زیادہ ہوسکتا ہے اور تھانوی نور اللہ مرقدۂ نے فرمایا کہ نری توجہ سے کیا ہوتا ہے، جب تک دوسری طرف سے بھی طلب نہ ہو۔ حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام سے تو زیادہ کسی کی توجہ نہیں ہوسکتی مگر جہاں دوسری طرف سے طلب نہ ہوئی کچھ بھی نہ ہوا۔ عطاء کا مدار طلب پر ہے۔ بدون طلب کے کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ عادۃ اللہ یہی ہے۔ عدم طلب کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''**أنلزمكوها و انتم لها كارهون**'' ادھر سے طلب اور ارادہ ہو اس طرف سے عطاء ہوتی ہے۔ (افاضات یومیہ ۲/۷: ص۲۹۲)

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بدون ریاضت اور مجاہدہ کے صرف کسی متصرف کی توجہ سے بھی کام ہوسکتا ہے، لیکن نادراً اور ''**النادر كالمعدوم**'' باقی توجہ سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی عمر کچھ نہیں ہوتی، وہ وقتی چیز ہوتی ہے اور نہ توجہ سے رسوخ ہوسکتا ہے جو اصل اور روح ہے طریق کی۔ یہ دولت مجاہدات اور ریاضات اعمال ہی کی پابندی سے میسر ہوتی ہے۔ اس کو کبھی زوال نہیں ہوتا ان شاء اللہ تعالیٰ، بشرطیکہ یہ اس کی نگرانی کرتا رہے۔ (افاضات یومیہ ۱/۸: ص۱۰۸)

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ مبتدی کو چاہیے کہ وہ منتہی کی حرص کر کے اپنے لیے کسی حالت کا طالب نہ ہو کہ جس کا فی الحال وہ تحمل نہ کر سکے اور راز اس میں یہ ہے کہ ہر وہ بات جو وقت سے پہلے واقع ہو جائے خطرناک ہوتی ہے اور یہ قاعدہ صرف تربیت روحانی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تربیت جسمانی میں بھی اس کو تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اطباء نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر مریض کو ضعف کے بعد دفعۃً قوت آجائے تو وہ بہت خطرناک ہے۔

یہی راستہ پہلے مشائخ کے اس طرز کا کہ وہ طالبین کی تربیت کے اندر تربیت وتدریج کی رعایت

کرتے تھے، یعنی یہ نہ تھا کہ جو آیا اس کو ذکر و شغل تعلیم کر دیا بلکہ جس کے لیے وہ اول مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت سمجھتے تھے، اس کو برسوں تک ریاضت اور مجاہدہ ہی میں مشغول رکھتے تھے۔ ذکر کی ہرگز تعلیم نہ کرتے تھے۔ جب دیکھ لیتے تھے کہ اب کامل طور پر اس میں استعداد پیدا ہوگئی ہے، اس کے بعد اس کو ذکر کی تعلیم کرتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اس کو شروع سے ہی ذکر و شغل کی تعلیم کی گئی تو چونکہ یہ ریاضت و مجاہدہ کیے ہوئے نہیں ہے۔ اس لیے ذکر سے اس کے اندر کبر عجب پیدا ہو جائے گا اور بجائے نفع کے نقصان پہنچے گا۔ یہاں تک کہ بعض بزرگوں نے تو طالبین کو (۱۲) بارہ سال تک صرف مجاہدہ ہی میں مشغول رکھا ہے اور جب ان کو اطمینان ہو گیا ہے کہ اب طالب کے نفس کے اندر کامل تواضع اور شکستگی ہوگئی ہے، اس کے بعد اس کو ذکر کی تعلیم کی ہے۔

اب چونکہ یہ شخص پہلے سے ریاضت اور مجاہدہ کیے ہوئے ہوتا تھا اور ان مجاہدات کی وجہ سے اس کے اندر استعداد اور قابلیت پیدا ہو چکی تھی تو اس وقت جب ذکر کی تعلیم کی جاتی تھی تو پھر ایسے شخص کے اندر ذکر کا اثر بھی بہت جلد ہوتا تھا اور جن لوگوں کو ان مجاہدات کی خبر نہیں ہوتی صرف ذکر و شغل ہی کی مدت کو دیکھ لیتے ہیں، ان لوگوں کو اس شخص کی حالت پر تعجب ہوتا ہے کہ کیا وجہ کہ اس کو تو اتنی جلدی نفع ہو گیا اور ہم لوگ باوجود مدت دراز کی مشغولیت کے ابھی تک محروم ہی ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ ان کی خدمت میں بہت سے ذاکرین شاغلین رہتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص کہیں باہر سے ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ حضور سے میں اپنے نفس کی اصلاح کروانا چاہتا ہوں۔ لہٰذا مجھ کو اپنے خدام کے زمرہ میں داخل فرما لیا جائے اور اپنی خدمت میں قیام کی اجازت دی جائے، شیخ نے اس کی درخواست کو منظور فرما لیا اور دوسرے طالبین کی طرح اس کو بھی اپنی خدمت میں قیام کی اجازت دے دی۔

چنانچہ وہ شخص وہاں رہ کر اپنے نفس کی اصلاح میں مشغول ہو گیا اور جو حالت نئی پیش آتی اس کی شیخ کو اطلاع کرتا اور جو کچھ وہ تعلیم فرماتے اس پر عمل کرتا، تھوڑے دن گزرے تھے کہ ایک دن بزرگ نے اس شخص کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا کہ یہاں قیام سے جو تمہارا مقصود ہے وہ بفضلہٖ تعالیٰ تم کو حاصل ہو گیا، لہٰذا یہاں قیام کی اب تم کو چنداں ضرورت نہیں اور اس کے بعد اس کو خلعت و خلافت سے بھی سرفراز فرما دیا، چنانچہ وہ شخص حضرت سے رخصت ہو کر وطن واپس ہو گیا، اب جو دوسرے طالبین برسوں پہلے سے شیخ کی خدمت میں حاضر تھے اور حضرت سے اپنی اصلاح کرا رہے تھے ان کو بڑا خیال ہوا کہ کیا بات ہے، ہم کو تو اتنے دن کام کرتے ہوئے ہو گئے مگر اس درجہ کا نفع نہ ہوا اور اس شخص کو چند ہی روز میں سب کچھ عطاء ہو گیا اور اس مثل کو یاد کیا:

پیا جس کو چاہے وہی سہاگن ہو

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ کو ہماری طرف توجہ نہیں اب اتنی ہمت تو کسی کی نہ تھی کہ حضرت شیخ سے اپنے وسوسہ کی اطلاع کرتا، بس دل ہی دل میں افسوس کر کے رہ گئے مگر:

بندگان خاص علام الغیوب

درمیان شاں جواسیس القلوب

کشف سے شیخ کو ان طالبین کے اس وسوسہ پر اطلاع ہو گئی اور انہوں نے طالبین کے اس شبہ کا جواب حکیمانہ طریقہ سے دینا چاہا، چنانچہ انہوں نے اپنے مریدین کو حکم دیا کہ جنگل جا کر کافی تعداد میں گیلی لکڑیاں اکٹھی کر کے ہمارے پاس لاؤ، چنانچہ خدام حکم بجالائے اور کافی تعداد میں گیلی لکڑیاں جمع کر کے حاضر کر دیں۔

حضرت شیخ نے حکم دیا کہ ان لکڑیوں کو جلاؤ، خدام نے ان لکڑیوں میں آگ سلگانا شروع کی، چونکہ لکڑیاں کافی گیلی تھیں، اس لیے اول اول تو ان میں آگ کا اثر ہی نہ ہوا، جب ایک عرصہ گزر گیا اور انتہائی کوشش اور محنت کی گئی تب جا کر ان لکڑیوں میں کچھ آگ لگی، اس کے بعد شیخ نے حکم دیا کہ اچھا اب سوکھی لکڑیاں لاؤ، چنانچہ خدام سوکھی لکڑیاں لائے، شیخ نے حکم دیا کہ اچھا ان کو جلاؤ، چنانچہ ان لکڑیوں میں آگ سلگائی گئی، سو وہاں کہاں دیر تھی بس ایک دیا سلائی دکھانا تھی کہ ساری لکڑیوں میں آگ پڑ گئی اور ذرا سی دیر میں وہ سب لکڑیاں جل بھن کر راکھ ہو گئیں۔

اب حضرت شیخ نے ان طالبین سے ان کی تعلیم و تفہیم کی غرض سے دریافت کیا کہ بھائی کیا بات ہے پہلی لکڑیوں میں تم نے اتنی کوشش کی مگر آگ نہ لگی اور بعد کی لکڑیاں ذرا سی دیر میں جل بھن کر ختم ہو گئیں، خدام نے عرض کیا کہ حضرت پہلی لکڑیاں چونکہ گیلی تھی اس لیے نہ جلیں اور بعد کی لکڑیاں چونکہ سوکھی تھیں اس لیے ان میں فوراً آگ لگ گئی۔

حضرت شیخ نے فرمایا، درست ہے، اب ہم تم کو اصل حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ یہ جو ہم نے گیلی اور سوکھی لکڑیاں جمع کرا کر ان کو جلانے کا حکم دیا تو اس سے ہمارا مقصود تمہارے ایک شبہ کا جواب دینا ہے وہ یہ کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ فلاں شخص نے جو یہاں آ کر ہماری خدمت میں قیام کیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد اس پر حق تعالیٰ نے فضل فرمایا اور وہ کامیاب ہو گیا تو تم کو اس شخص کی اس حالت پر تعجب ہے اور اس واقعہ سے ہمارے متعلق تم کو یہ شبہ ہوا کہ ہم کو تمہاری طرف پوری توجہ نہیں۔

سو یاد رکھو! یہ خیال تمہارا بالکل غلط ہے بلکہ ہم کو جیسی توجہ اس شخص کی طرف تھی ویسی ہی تمہاری

طرف ہے مگر باوجود اس کے پھر وہ جلد کامیاب ہوگیا اور تم کو دیر لگی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم لوگوں کا حال تو گیلی لکڑیوں کا سا ہے اور وہ جو شخص آیا تھا وہ سوکھی لکڑی تھا یعنی اس شخص کے اندر بھی گو مثل تمہارے اول رذائل نفس کی رطوبت تھی مگر وہ شخص اپنی ان رطوبات کو مجاہدات اور ریاضات اختیار یہ یا اضطراریہ کی حرارت سے یہاں پہنچنے سے مدتوں پہلے فنا کر چکا تھا، جس کی وجہ سے وصول حق کی اس کے اندر کافی استعداد پیدا ہو چکی تھی، اس لیے ہماری تعلیمات کا اثر اس کے اندر زیادہ ہوا اور وہ شخص جلد کامیاب ہوگیا۔

بخلاف تمہارے کہ تم نے یہاں آنے سے قبل کبھی ریاضت و مجاہدہ کی حرارت کا مزہ ہی نہ چکھا، اس لیے جب تم ہمارے پاس پہنچے تو تمہارا وہ حال تھا جو ایک گیلی لکڑی کا ہوتا ہے، اس لیے ہم کو اتنے دن کوشش کرتے ہوئے گزرے مگر ابھی تک تو تمہارے اندر سے رذائل نفس کی وہ رطوبت ہی خشک نہیں ہو چکیں جس سے استعداد تام وصول کی پیدا ہوتی، پھر وصول کہاں تو اس نو وارد کی جلد کامیابی اور تمہاری دیر میں کامیابی کی وجہ یہ تھی، پس اگر غور کرو تو نہ ہماری توجہ میں کچھ کمی ہوئی اور نہ تم کو وصول میں دیر لہٰذا مایوسی اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ جاؤ اور با اطمینان اپنے معمولات میں مشغول رہو، ایک دن وہ آئے گا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ تم پر بھی حق تعالیٰ کا ایسا ہی فضل ہوگا جیسا اس شخص پر ہوا۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ فلاں شخص کو فلاں بزرگ نے ایک نظر میں کامل کر دیا، سب غلط ہے بلکہ سب کو اول مجاہدہ وریاضت کرنا پڑتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بعض لوگ شیخ کی تربیت میں پہنچ کر مجاہدات کرتے ہیں اور بعض لوگ ایسے شیخ کی خدمت میں پہنچنے سے قبل ریاضت اور مجاہدہ سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں تو ان آخر الذکر لوگوں کو دیکھ کر یہ مشہور ہو جاتا ہے کہ ان کو بلا مجاہدہ حصول کمال ہوگیا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، بلا مجاہدہ دفعۃً کسی کو حصول کمال نہیں ہوتا الا ما شاء اللہ اور اگر یہ شبہ ہو کہ بعض کتابوں میں ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہوا ہے کہ ان کے یہاں ایک بار مہمان آئے، ان مہمانوں کے لیے ان بزرگ کو کھانا پکوانے کی ضرورت ہوئی اور سامان تھا نہیں، تو ایک طباخ (اس کے بعد حضرت حکیم الامت نے اس قصہ کو مختصراً لکھا، یہ بزرگ خواجہ باقی باللہ ہیں، اس قصہ کو یہ ناکارہ آپ بیتی نمبر۵ ص ۵۷۷ میں نسبت اتحادیہ کے ذیل میں بہت مفصل لکھ چکا ہے)۔

اس کے بعد حضرت تھانوی نے لکھا ہے کہ جب حجرہ سے باہر آئے تو دونوں کی صورتیں ایک تھیں کہ لوگ یہ نہ پہچان سکے کہ ان میں سے کون طباخ ہے اور کون وہ بزرگ ہیں، صورت تک میں اس توجہ کا اتنا اثر ہوا تھا، باطنی احوال میں جو کچھ تغیر ہوا ہو اس کا تو کہنا ہی کیا۔ تو اس سے معلوم ہوتا

ہے کہ بلا مجاہدہ محض تصرف کے ذریعہ سے بھی دفعۃً حصول کمال ہو جاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے تصرف سے کچھ کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں جو مقصود نہیں قرب الٰہی حاصل نہیں ہوتا ہے جو کہ مقصود ہے، پھر یہ کیفیات بھی جو کہ توجہ سے پیدا ہوتی ہیں، دیرپا نہیں ہوتا، تیسرے ایسی توجہ سے طالب کو بوجہ ضعیف قویٰ طبعیہ بعض مرتبہ کوئی ضرر جسمانی پہنچ جاتا ہے۔

چنانچہ لکھا ہے کہ وہ طباخ اس توجہ کے بعد زندہ نہیں رہا، بلکہ کوٹھری سے نکلنے کے تھوڑے عرصہ بعد مر گیا، بلکہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت ابراہیم بن ادہم کے صاحبزادے محمود کے انتقال کی توجیہہ بھی یہی فرمائی ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہم کے صاحبزادے کا قصہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جب وہ مکہ معظمہ اپنے والد بزرگوار حضرت ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت ابراہیم کی نظر ان صاحبزادے پر پڑی تو فوراً ہی ان صاحبزادے کا انتقال ہو گیا تو ان صاحبزادے کے انتقال کی وجہ بعض مصنفین غیر محققین نے تو اور کچھ بیان کی ہے اور وہ یہ کہ جب حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی نظر ان صاحبزادے پر پڑی تو چونکہ مدت تک باپ بیٹے میں جدائی رہی، اس لیے حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے صاحبزادے کو دیکھا تو شفقت و محبت پدری کا جوش ہوا تو اس وقت حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کو الہام ہوا کہ:

جب حق ہو دل میں یا حب پسر
جمع ان دونوں کو تو ہرگز نہ کر

اس وجہ سے حضرت ابراہیم نے دُعاء کی کہ بارِ الٰہی تو مجھ کو موت دے دیجئے یا اس کو چنانچہ صاحبزادہ کا انتقال ہو گیا، مگر اصول شرعیہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وجہ غلط ہے کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ محبت جو صاحبزادے کو دیکھ کر حضرت ابراہیم کے قلب میں پیدا ہوئی تھی حضرت حق کی محبت پر غالب تھی یا نہ تھی، اگر کہا جائے کہ غالب تھی ایسی محبت کا قلب میں جگہ دینا حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی شان سے بالکل بعید تھا اور اگر کہا جائے کہ وہ محبت حضرت حق کی محبت پر غالب نہ تھی بلکہ مغلوب تھی تو ایسی محبت کسی کے لیے مضر نہیں، حتیٰ کہ انبیاء الصلوٰۃ علیہم والسلام کو ایسی محبت سے نہیں روکا گیا تو اولیاء کا درجہ تو بعد ہی میں ہے۔

چنانچہ حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو جتنی محبت حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھی سب کو معلوم ہے، مگر کہیں ثابت نہیں کہ حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس سے منع فرمایا گیا ہو، بلکہ اولاد کی ایسی محبت جو حضرت حق پر غالب نہ ہو ہر

مسلمان کے محمود ہے، کیونکہ اولاد کے حقوق کا ادا کرنا مامور بہ ہے اور یہ محبت اس کی معین ہے، لہٰذا حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ایسی محبت سے ممانعت کی کوئی وجہ نہ تھی، البتہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان صاحبزادے کے متعلق جو واقعہ بیان فرمایا ہے وہ نہایت لطیف ہے، وہ یہ کہ جب یہ صاحبزادے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان پر حضرت ابراہیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی نظر پڑی تو شفقت پدری کو جوش ہوا اور چاہا کہ جب میرا بیٹا دولتِ ظاہری سے مالامال ہے، اسی طرح دولت باطنی سے بھی محروم نہ رہے، لہٰذا انہوں نے صاحبزادے کو توجہ دی اور جوشِ محبت میں یہ خیال نہ رہا کہ اس کا تحمل بھی ہو سکے گا یا نہیں تو چونکہ وہ توجہ نہایت قوی تھی اس لیے وہ صاحبزادے اس توجہ کی تاب نہ لا سکے اور فوراً جاں بحق ہو گئے تو توجہ کے ذریعہ سے جو دفعۃً بلا مجاہدہ کوئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس میں خطرہ ہوتا ہے مضرت کا، غرضکہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بلا مجاہدہ کوئی کامل نہیں ہوتا ہے۔

ہمارے حیدرآبادی ماموں صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ بعض لوگوں کو شبہ ہوا کرتا ہے کہ علماء جو مشائخ سے تربیتِ باطنی کراتے ہیں انہوں نے جہاں کام کرنا شروع کیا ان کو نفع ہونا شروع ہوا اور ہم لوگوں کو مدتیں گزر جاتے ہیں اور نفع نہیں ہوتا، حالانکہ یہ علماء زیادہ ریاضت و مجاہدہ بھی نہیں کرتے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہ خیال صحیح ہے کہ علماء کو اول ہی دن نفع شروع ہو جاتا ہے اور غیر عالم کو نہیں ہوتا اور نہ یہ خیال صحیح ہے کہ علماء مجاہدہ نہیں کرتے، کیونکہ علماء جو یہ درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں اور پڑھتے پڑھاتے ہیں یہ سب مجاہدہ ہی تو ہے تو ان کا مجاہدہ اور ان کا سلوک تو اسی وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب سے یہ اول کتاب پڑھنا شروع کرتے ہیں اور جب تک درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں برابر مجاہدہ ہی رہتا ہے، تو علماء کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ بھی مجاہدہ ہی سے حاصل ہوتا ہے، ایسا کوئی نہیں جس کو بلا مجاہدہ حصول کمال ہوا ہو۔ (الا ماشاء اللہ)

لہٰذا سالک کو چاہیے کہ وہ صبر و استقلال و یکسوئی کے ساتھ اپنے شیخ کی تعلیمات پر عمل کرتا رہے، جب وقت آئے گا تو مقامات و احوال میں سے جو کچھ اس کے لیے مناسب ہوگا خود بخود اس کو عطاء ہو جائے گا۔ (افاضات یومیہ۸۲: ص۴۴۰)

حضرت نور اللہ مرقدہ نے علماء کے متعلق جو کچھ لکھا بالکل صحیح لکھا، میرا بعض دوستوں پر تجربہ ہے کہ شعبان میں وہ دورہ سے فارغ ہوئے اور صرف ماہ مبارک کے ایک ماہ میں نمٹ نمٹا کر شوال میں خلافت لے کر چل دیئے، مگر یہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق میں نے دیکھا جو طالب علمی کے زمانہ علم میں زیادہ منہمک رہے ہوں اور تعلقات سے متوحش۔

انفاس عیسیٰ میں حضرت تھانوی سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نے مجاہدہ کی توفیق دے

رکھی ہوتو سمجھ لے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور رسائی ہوگی، کیونکہ مجاہدہ پر رسائی کا وعدہ ہے اور وعدہ خلافی کا احتمال نہیں۔ (انفاس عیسیٰ: ص۲۹۶)

جس وعدہ کی طرف اشارہ ہے وہ قرآن پاک کی آیت ہے ''وَالَّذِینَ جاَ ھدُوا فِیناَ لنھد ینھم سبلنا'' اللہ پاک نے اپنے اس وعدے کولام تاکید کے ساتھ مؤکد کیا ہے۔

سوانح مولانا عبدالقادر صاحب مرتبہ علی میاں میں لکھا ہے کہ تصوف کے بعض حلقوں اور عوام میں بزرگانِ دین کے بعض خصوصی واقعات وکیفیات کی بناء پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اہلِ قلوب جس کو جس وقت دولتِ باطنی فرمانا چاہیں بلا استعداد وذاتی سعی ومحنت عطاء فرما سکتے ہیں، ایسے واقعات کی صحت اور امکان میں شبہ نہیں، جب کسی صاحب باطن نے اپنی یا طالب کی کسی خاص کیفیت پر جو بعض اوقات سعی ومحنت کی قائم مقام بن جاتی ہے باذنِ خداوندی اس نسبت باطنی یا کسی خاص حال کا اضافہ فرمایا، لیکن یہ کوئی عمومی ضابطہ اور اختیاری چیز نہیں ہے عمومی طور پر اپنی ذاتی سعی ومحنت ہی کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی میں دوام واستقلال ہے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ اسی پر بہت زور دیا کرتے تھے۔

علی میاں مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوٹی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ رمضان کا آخری ہفتہ غالباً رائے پور میں ہوا (یعنی مولانا عبداللہ صاحب) کا اسی موقع پر ایک صاحب پنجاب کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، پہلے وہ کسی اور بزرگ کی خدمت میں گئے تھے، ان بزرگ نے فرمادیا تھا کہ تمہارے حصہ رائے پور ہے وہاں جاؤ، رائے پور کا نقشہ تو تمہارے سامنے ہی ہے، خاص طور پر رمضان شریف میں سب حضرات مہمان اکثر اوقات ذکر، نماز تلاوت، مراقبہ بالخصوص ذکر بالجہر میں مشغول رہتے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر وہ صاحب کہنے لگے کہ ہم سے تو یہ چکی نہ پیسی جاسکے گی، غالباً کسی نے حضرت سے ذکر کردیا ہوگا، شام کو کھانے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ دوست آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حصہ کی پڑیا بنی رکھی ہے مل جائے گی، جیب میں ڈال کرلے آئیں گے مگر یہاں بغیر محنت کے کچھ نہیں ہوتا، اس راستہ میں محنت لازمی ہے، غالباً اس کے بعد آیت ''والذین جا ھدوا فینا لنھدینھم سبلنا'' پڑھ کر مزید روشنی ڈالی، مگر چند دنوں بعد حضرت کے کانوں میں پھر یہی الفاظ ڈالے گئے کہ فلاں بزرگ دوستوں کے یہاں شب وروز محنت دیکھ کر گھبراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اتنی محنت یہاں کون کرے، دوبارہ بڑے جوش سے فرمایا۔

اگر کوئی گھر آپ لوگوں کو معلوم ہو جہاں دوروٹیاں پکی پکائی مل جاتی ہوں تو میں بھی ٹوکری پکڑ کر تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں تاکہ کچھ حاصل کرسکوں، مگر دوست صرف چکی ہی پیسنے کی شکایت

کرتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ چکی پیسنے کا ہنر تو بہت روز میں آتا ہے، پہلے تو زمین کو جوتنا ہے اچھا بھلا بیج گھر سے نکال کر کھیت میں بکھیر کر پھر سینچنا ہے تا کہ کھیتی بڑھ کر پکنے کی حد تک پہنچے اور پک جائے تو پھر کاٹنا اور گاہنا اور غلہ کو بھوسے سے علیحدہ کرنا پھر چکی پیسنا، آٹا بن جانے کے بعد پھر اسے مشقت سے گوندھنا بھی ہے اور آگ جلانے پکانے کا سامان مہیا کرنا ہے، پھر جیٹھ کی گرمی بھی برداشت کرنا ہے، پک کر تیار ہو جانے کے بعد مشقت سے توڑ کر منہ کے زور سے نگلنا ہے، اس ساری کوششوں کے بعد اگر ہضم ہو جائے تو محض میرے مولا کا فضل سمجھنا چاہیے وگرنہ قے ہو کر باہر بھی نکل سکتا ہے، کسی دوست نے عرض کیا کہ حضرت ماں اپنے بچہ پر کتنی شفیق ہوتی ہے کہ سوئے ہوئے بچہ کو اُٹھا کر دودھ پلاتی ہے، اگر بچہ بھوکا ہو تو اُس کی چھاتیوں میں ایک قسم کی تحریک سی پیدا ہو کر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ بچہ بھوکا ہے، مگر بزرگ لوگ ماؤں سے زیادہ شفیق ہوتے ہیں اس لیے ان سے ایسی امیدیں باندھی جا سکتی ہیں اس پر حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بھئی ماں کا کام تو اتنا ہی ہوتا ہے کہ چھاتی بچہ کے منہ میں دے دے، مگر اگر بچہ ہی مردہ ہو اور ہونٹ ہلا کر دودھ کو چوس نہ سکے اور اپنے پیٹ میں نہ پہنچا سکے تو اس میں ماں کا کیا قصور ہے اور اس کی شفقت میں کیا فرق آ سکتا ہے۔

(سوانح حضرت رائے پوری: ص ۲۴۰)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۹

اکابر کا فقر و فاقہ

یہ نمبر در حقیقت پہلے نمبر کا جزء ہے اور پہلے نمبر میں اس کے متعدد واقعات گزر بھی گئے ہیں، لیکن فقر و فاقہ کو چونکہ سلوک میں خاص دخل ہے اور میں نے اپنے اکابر کے یہاں بہت کثرت سے اس کے مشاہدات بھی کیے ہیں، اس لیے اہمیت کی بناء پر اس کے چند واقعات بھی خاص طور سے لکھوانے کو جی چاہتا ہے کہ علماء بالخصوص جن کو سلوکی ذوق بھی حاصل ہو ان کو اس سے ہرگز متاثر یا پریشان نہیں ہونا چاہیے، حدیث پاک میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے آ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خدا کی قسم مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھ سوچ کر کہہ، کیا کہہ رہا ہے ان صاحب نے تین دفعہ قسم کھا کر یہ کہا کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تیسری دفعہ کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تجھے مجھ سے محبت ہے تو فقر کے لیے تیار رہ، اس لیے کہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے فقر اس کی طرف ایسا دوڑتا ہے جیسا پانی ڈھلان یعنی نیچی کی طرف دوڑتا ہے۔ (ترمذی: ص ۵۸/ ج ۲)

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ اہل علم پہلے زمانہ میں جو ہوئے ہیں ان میں استغناء کی شان ہوتی تھی، اب تو جس کو دیکھو امراء کے دروازوں پر نظر آتے ہیں، پہلے فقر و فاقہ کو اپنا زیور سمجھتے تھے، دنیا سے نفرت اور دین سے رغبت اور اس میں مشغولیت رہتی تھی اور اسی کی برکت تھی اور اسی سے عزت تھی، اب جب سے اپنے بزرگوں کا یہ مسلک اور مشرب چھوڑ دیا ویسے ہی ذلیل و خوار ہیں، باقی جو بڑے بڑے متکبرین ہیں وہ اب بھی فقیروں کے دروازے پر آتے ہیں اور کوئی سچا فقیر ان کے دروازوں پر نہیں جاتا اور یہ شان اس کے لیے اس قدر شایاں ہے کہ دوسری قوم کے لوگ ان کے لیے اس کو زیبا بتلاتے ہیں۔

ایک غلام مصطفےٰ نامی کانپور میں مولوی ہیں، بڑے دلیر ہیں، ایک بڑے انگریز یعنی لیفٹیننٹ گورنر کے پاس پہنچے ملاقات ہوئی کہا کہ کیا مولویوں کا آپ کے یہاں کوئی حق نہیں۔ کیا یہ آپ کی رعیت نہیں، لیفٹیننٹ گورنر نے کہا کہ حق ہے، حق کیوں نہ ہوتا، آپ فرمایئے بات کیا ہے؟ کہا کہ کوئی نوکری دلوایئے، گورنر نے کہا نوکری بہت ہے مگر آپ کو ایک نیک مفید مشورہ دیتا ہوں کہ آپ عالم ہیں، آپ کو اللہ نے دین عطاء فرمایا ہے، آپ ان کے بھروسہ پر کسی مسجد میں بیٹھ کر درس دیجیے

گا، آپ کی شان کے لیے یہی شایاں ہے، ہمارے یہاں کی نوکری آپ کے شانِ علم کے خلاف ہے، اللہ آپ کے کفیل ہوں گے، اس کے بعد اپنے خدمت گار کو اشارہ کیا، وہ ایک کشتی میں پچاس روپے لے کر حاضر ہوا، لیفٹیننٹ گورنر نے وہ کشتی اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت احترام اور ادب سے ان مولوی صاحب کے سامنے پیش کی کہ یہ قبول فرما لیجئے، انہوں نے کہا کہ میں آپ کے مشورہ پر عمل کرنے کی نیت کر چکا ہوں کہ اب اللہ ہی دے گا تو لوں گا، اس مشورے پر یہیں سے عمل شروع کرتا ہوں اس لیے یہ نہ لوں گا، کس قدر حوصلہ کی بات ہے۔

اس کے بعد حضرت تھانوی ارشاد فرماتے ہیں میں نے سن کر کہا کہ اتنی ہی کمی نکلی، میں اگر ہوتا تو لیتا، اس لیے کہ دین پر نیت کر لینے ہی کے خلوص کی برکت تھی کہ اللہ نے وہیں سے کفالت شروع کر دی، وہ بھی اللہ ہی دلوا رہے تھے، وہ بے چارہ کیا دیتا، غرضکہ اہل علم کو استغناء کی سخت ضرورت ہے، خصوصاً امراء کے دروازوں سے تو ان کو بالکل اجتناب چاہیے، اس میں دین، علم (دین) اہل دین کی سب کی ذلت ہے سبکی ہے۔ مجھ کو تو اس سے بڑی نفرت ہے اور میں جب کوئی واقعہ اہل علم کا امراء کے ساتھ تملق کا سنتا ہوں سخت افسوس ہوتا ہے، میں تعلق کو منع نہیں کرتا، یہ اہل علم کی شان سے بہت ہی بعید ہے، مگر کس طرح دل میں ڈالوں۔ (افاضات ۲/۶: ص ۲۹۴)

اہل اللہ کا فقر و فاقہ ایسی لازمی چیز ہے کہ اکابر میں سے کوئی بھی اس سے الا ماشاء اللہ مستثنیٰ نہیں ہوگا اور جہاں بظاہر افراد نظر آتا ہے وہ مالک کی طرف سے دوسروں کی پرورش اور ان کی روزی رسانی کے لیے ان حضرات کو ذریعہ بنا دیا جاتا ہے، ورنہ جہاں تک ان اکابر کی اپنی ذات کا تعلق ہے عملاً بھی اور اس سے زیادہ قلباً بھی مسکنت اور فقر و فاقہ کے عاشق رہے ہیں، اس کی پہلی فصل مجاہدات میں بہت سے واقعات اس نوع کے گزر چکے ہیں، اس کی اہمیت کی وجہ سے خصوصی تنبیہ کے لیے اور اپنے اکابر کے بعض احوال کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس مضمون کو مستقل لکھوایا، صوفیاء کا یہ مشہور مقولہ لکھوا چکا ہوں کہ جو ہماری ابتداء دیکھے وہ کامیاب جو انتہا دیکھے وہ ناکام اور یہ صحیح ہے کہ ابتداء میں یہ حضرت جب پتھر سے رگڑے جاتے ہیں، ان مناظر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بزرگی اور تقرب کس طرح حاصل ہوا کرتا ہے:

رنگ لاتی ہے حنا پتھر سے پس جانے کے بعد

اس مضمون کو یہ ناکارہ اپنے رسالہ فضائل صدقات حصہ دوم میں بہت تفصیل سے لکھوا چکا ہے، اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا گیا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر میں اپنی وفات تک کبھی جو کی روٹی بھی دو دن لگاتار پیٹ بھر کر تناول نہیں فرمائی، یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تھی اور یہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت رکھنے والوں کی زندگی ہے،

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے دوسری حدیث میں یہ مضمون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے گھرانے کا نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کبھی بھی دو دن لگا تار جو کی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے نقل کیا گیا ہے کہ جب میں پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہوں تو میرا رونے کو (بے اختیار) دل چاہتا ہے، پس رونے لگتی ہوں، کسی نے عرض کیا یہ کیا بات ہے؟ فرمانے لگیں کہ مجھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آجاتا ہے کہ گوشت سے یا روٹی سے کبھی بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو وصال تک دن میں دو مرتبہ پیٹ بھر کر تناول فرمانے کی نوبت نہیں آئی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اکثر بھوکے رہتے تھے بغیر ناداری کے یعنی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کھانا موجود ہو پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کم تناول فرماتے تھے، اس لیے کہ بھوکے رہنے سے انوار کی کثرت ہوتی ہے، یہ مضمون اور اس قسم کی روایات فضائل صدقات حصہ دوم میں بہت کثرت سے نقل کی گئی ہیں۔

جن اکابر کے یہاں آخر میں غذا میں تنعم دیکھا جاتا تھا وہ حقیقت میں دو وجہوں پر مبنی تھا اور میں نے اس کو خوب مشاہدہ کیا۔ بڑی وجہ تو ہدایا پیش کرنے والوں اور لانے والوں کی دل داری۔ مجھے بسا اوقات اکابر کا یہ رنگ دیکھنا پڑا کہ کسی چیز کو طبیعت بالکل نہیں چاہ رہی ہے مگر لانے والے کی دلداری کی وجہ سے بہت ہی بے رغبتی کے ساتھ طبعی گرانی کے ساتھ نوش فرماتے دیکھا۔ دوسری وجہ قویٰ کا ضعف تھا جو سابقہ مجاہدات کی وجہ سے پیش آتا تھا اور عبادات پر تقویت حاصل کرنے کے لیے دواء ہوتا تھا۔ میرے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا یہ ارشاد میں نے بار بار سنا کہ جب دانت تھے تو چنے نہ ملے اور جب دانت نہ رہے جب چنوں کا زور ہوا اور یہ سچ ہے کہ ان اکابر کی فتوحات بہت کثرت سے دیکھی گئیں۔ جب یہ شروع ہوتی ہیں، جب دل کو اس کی طرف لگاؤ نہ رہے۔ یہ مضامین تو بہت ہی تفصیل طلب ہیں اور بہت اہم ہیں اور فضائل صدقات حصہ دوم میں بہت تفصیل سے گزر بھی چکے ہیں۔ مجھے تو آپ بیتی میں اپنے اکابر کے وہ معمولات لکھوانے کو دل چاہتا ہے جو میں نے دیکھے ہیں۔

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب کے بعض حالات

سید الطائفہ حضرت الحاج امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے فقر و فاقہ کے حالات بہت ہی کثرت سے سننے میں آئے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ، حضرت حاجی صاحب کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت قدس سرہٗ کے مرشد حضرت میانجیو صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ۱۲۵۹ھ

میں رحلت فرمانے کے بعد آپ کے قلب مبارک میں جذبہ الٰہیہ پیدا ہوا اور آپ آبادی سے ویرانے میں چلے گئے۔ مخلوق سے نفرت فرماتے تھے اور جنگل پنجاب وغیرہ میں اوقات بسر فرماتے تھے اور اکثر وقت فاقہ سے کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مشرف ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ آٹھ آٹھ روز اور بھی زیادہ گزر جاتے اور ذرا سی چیز حلق مبارک میں نہ جاتی اور حالتِ شدت بھوک میں اسرار و عجائب فاقہ مکشوف ہوتے تھے۔

بیان فرماتے تھے کہ ایک دن بہت بھوک کی تکلیف میں ایک دوست سے کہ نہایت خلوص دل رکھتا تھا۔ چند پیسے میں نے بطور قرض مانگے تھے۔ باوجود ہونے کے انکار صاف کر دیا۔ اس کی اس نا اتفاقی سے تکدر و ملال دل میں پیدا ہوا۔ چند منٹ کے بعد تجلی توحید نے استعلاء فرمایا اور معلوم ہوا کہ یہ فعل فاعل حقیقی سے متکون ہوا ہے، اس وقت سے خلوص اس دولت کا زائد ہوا اور وہ تکدر مبدل بلطف ہو گیا۔ اس واقعہ کو چند ماہ گزرے تھے کہ میں مراقبہ میں تھا۔ سیدنا جبرائیل، سیدنا میکائیل علیہم السلام کو بغایت جلال ملکانی و نہایت جمال نورانی سنبل کاکل سیاہ کندھوں پر ڈالے ہوئے اور سبزہ نہ اگا ہوا دیکھا۔ محو خود رفتہ ہو گیا۔ جو لذت کہ حاصل ہوئی احاطہ بیان میں نہیں آ سکتی اور وہ دونوں تبسم کناں دز دیدہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسی طرح چلے گئے اور کچھ نہ کہا۔ (راقم مؤلف) ہیچکارہ نے بخدمت حضرت ایشاں قلبی وروحی فداہ عرض کیا کہ تعبیر دیکھنے ان فرشتگان اولعزم کیا تھی۔ ارشاد فرمایا کہ مرتبہ نزدیکی کا مجھ پر ظاہر ہوا۔ کیونکہ دیکھنا جبرائیل علیہ الصلوۃ والسلام کا بشارت اس امر کی ہے کہ بفضلہ سبحانہ حصہ وافر علم و تعلیم ارشاد و ہدایت سے مجھ کو مرحمت ہو گا کہ یہ خدمت ان کو تفویض ہے اور دیکھنا میکائیل علیہ الصلوۃ والسلام کا اشارہ ہے، اس طرح کہ مایحتاج به فی الدنیا بے تکلف میسر آئے کہ قسمت و تقسیم رزق کی حضرت میکائیل سے متعلق ہے، راقم (مؤلف حضرت حکیم الامۃ) عرض کرتا ہوں کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا، سائل چند منٹ میں ایک ادنیٰ اشارہ حضرت ایشاں سے صاحب حال ہوتا ہے۔

(حیات حاجی صاحب: ص ۱۴)

قرض لینے کا واقعہ حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کی تحریر سے ہندوستان کا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ واقعہ میں نے اپنے اکابر سے مختلف مشائخ سے سنا کہ مکہ مکرمہ کا ہے کہ کئی دن کے فاقہ کے بعد ایک بے تکلف خصوصی تعلق رکھنے والے تاجر سے دو ہلل (تقریباً دو پیسے) قرض مانگے تھے، باوجود بڑے تاجر ہونے کے اس نے معذرت کر دی تھی، جس پر حاجی صاحب کا ارشاد سنا گیا کہ مجھے بعد میں بڑی غیرت آئی کہ کیوں سوال کیا تھا، رات کو خواب میں دیکھا کہ امتحان کا دور ختم ہو نے والا ہے غالب یہ ہے کہ یہ دوسرا واقعہ ہے اور حضرت جبرائیل اور حضرت میکائیل والا واقعہ اس

دوسرے قصہ کے بعد کا ہے، اس لیے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ جب میں (حضرت حاجی صاحب) پہلے مکہ آیا تو نوبت فاقوں کی پہنچ گئی، کئی کئی دن تک اتفاق کھانے کا نہیں ہوتا تھا، میں نے عرض کیا کہ بارِ الہا مجھ میں طاقت امتحان نہیں ہے، بعدہ حضرت خواجہ شیخ معین الدین چشتی رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ لاکھوں روپے کا خرچ تمہارے ہاتھوں مقرر ہوگا، میں نے عرض کیا کہ اس مہم کی طاقت نہیں رکھتا، ہنس کر فرمایا کہ تمہاری حاجت بند نہیں رہنے کی، اس وقت سے خرچ ماہانہ کہ اقل مرتبہ سو (۱۰۰) روپے ہے، خدا اپنے خزانہ غیب سے پہنچاتا ہے۔

(حیات حاجی صاحب: ص۱۱۵)

حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ خودنوشت سوانح میں تحریر فرماتے ہیں کہ قطب عالم حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز کو فرماتے ہوئے میں نے خود سنا کہ ایک ہفتہ تک موصوف کو صرف زمزم کے پانی پر گزارا کرنا پڑا، اسی اثناء میں ایک مخلص دوست سے جو کہ بہت زیادہ اخلاص کا مدعی تھا، چند پیسے قرض مانگے تو اس نے ناداری کا بہانہ کر کے انکار کر دیا، حالانکہ واقع میں نادار نہ تھا۔

حضرت قدس سرہٗ العزیز نے فرمایا کہ میں اس انکار سے سمجھا کہ منشاء الوہیت یہی ہے، اس لیے میں بھی صبر کر کے چپکا ہو گیا، ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد جب کہ ضعف و نقاہت بہت زیادہ ہو گیا تھا، رات میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ العزیز کو خواب میں دیکھا، ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اپنے باورچی خانہ کا ناظم اور مہتمم بنا دیا صبح کو اندھیرے میں ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا، میں نے دروازہ کھولا تو اس نے ایک تھیلی دی جس میں سو (۱۰۰) ریال تھے اور پھر چلا گیا، اس کے بعد سے عسرت نہیں ہوئی۔

(نقش حیات: ص۶۰/ج۱)

ایک اور جگہ حاجی صاحب کا مقولہ نقل فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار چلّہ کا ارادہ کیا اور اس کے لیے آٹھ آنے جو خریدے تھے، میری بھاوج نے کہا کہ جو کی روٹی کھانی مشکل ہو گی، میں نے کہا، جس طرح بنے گا کھاؤں گا، انہوں نے جو کوٹ کر چھان دیا، ہر روز مجھے ایک روٹی ملتی تھی وہی کافی ہوتی تھی۔ (حیات حاجی صاحب: ص۱۷۰)

ایک اور جگہ حضرت حکیم الامت حضرت سید الطائفہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں فرمایا کہ فقر و فاقہ بڑی نعمت ہے، مجھ پر یہ حالت اس طرح گزری ہے کہ میرے احباب مجھ کو قرض نہ دیتے تھے اور ظاہری حالت میری بھی امیرانہ تھی یعنی لباس بھی عمدہ ہوتا تھا اور مسند تکیہ بھی درست اور میری بھوک کے مارے یہ حالت ہوتی تھی کہ زینہ پر چڑھنا دشوار ہوتا تھا، بلکہ بارہا گر بھی پڑتا تھا، اس

حالت میں عجائب وغرائب واقعے پیش آتے تھے کہ جن کا مزہ نہیں بھولتا۔

(امدادالمشتاق: ص ۱۶۷)

حضرت حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ فقر دو طرح پر ہے، اختیاری و اضطراری، فقر اختیاری وہ ہے جو رضاء حق کے واسطے ہو، یہ دولت مندی سے بدرجہا افضل ہے اور فقر اضطراری عوام کو ہلاکت کفر تک پہنچاتا ہے کہ حدیث ''کاد الفقر أن یکون کفرا'' سے یہی مراد ہے اور معنی فقر کے محتاجی ہیں اور فقر حقیقی وہ ہے کہ اپنے نفس سے بھی محتاج ہو یعنی مالک اپنے نفس کا بھی نہ رہے، کیونکہ جس قدر فقیر کا ہاتھ ہر چیز سے خالی ہوگا اسی قدر اس کا دل ماسوائے اللہ سے خالی ہوگا اور فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہو جائے گا۔ (حیات حاجی: ص ۴۹)

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ فلاں عزیز الور چلا گیا، افسوس ہے کہ اس کے حال نیک میں خلل واقع ہوا، نہایت آزمائش پیش آئی، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، فقر و فاقہ مؤمنین کے حق میں معراج ہے، طاقت نہ رکھ کر قناعت کے گوشہ اور صبر سے باہر ہو گیا اگر چند روز تکلیف برداشت کرتا اور اس پر استقامت رکھتا تو چند عرصہ میں تمام تکلیف دور ہو جاتی۔

شاہ عبدالقدوس صاحب کا واقعہ

شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہٗ کے متعلق حضرت امام ربانی گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت شاہ عبدالقدوس رحمہ اللہ تعالیٰ نے تمام عمر فاقہ پر فاقہ اُٹھائے ہیں، صاحبزادے بھوک کے مارے بلکتے چیختے اور روتے تھے، ان کی والدہ بہلانے کے واسطے چولہے پر خالی ہانڈی میں پانی بھر کر چڑھا دیتیں اور جب بچے بھوک سے بے تاب ہو کر کھانے کا تقاضا کرتے تو ان کو چمکارتیں اور تسلی دے کر فرماتیں تھیں کہ دیکھو چولہے پر کیا چڑھا ہوا ہے، گھبراتے کیوں ہو، جب تمہارے والد آئیں گے۔ ان کے ساتھ کھانا کھانا، بچے روتے ہوئے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مچلتے کہ جلدی چلو، ہمیں گھر چل کر کھانا کھلاؤ، حضرت ان کے ہمراہ گھر میں تشریف لاتے اور بیٹھ کر خود بھی ان کے ساتھ آبدیدہ ہوتے اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ میرے گناہوں کے باعث ان معصوم بچوں پر بھی مصیبت آئی ہوئی ہے۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۲۶۵ / ج ۲)

شاہ عبدالغنی صاحب کا واقعہ

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ میرے استاذ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ بہت بڑھا ہوا تھا، سینکڑوں مرید تھے اور ان میں اکثر امراء اور

بڑے آدمی تھے، مگر آپ کے ہاں اکثر فاقہ ہوتا تھا، ایک روز آپ کے ہاں کئی روز کا فاقہ تھا، خادمہ کسی بچہ کو گود میں لیے ہوئے باہر نکلی، بچہ کے چہرے پر بھی فاقہ کے سبب پژمردگی تھی، اتفاق سے مفتی صدر الدین صاحب کہیں سے تشریف لائے تھے، بچہ کا چہرہ مرجھایا ہوا دیکھا تو خادمہ سے پوچھا بچہ کیسا ہے، اس کا رنگ کیوں متغیر ہے اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا حضرت یہاں کئی وقت سے فاقہ ہے، مفتی صاحب کو سخت صدمہ ہوا، اسی وقت گھر پہنچ کر خادم کے ہاتھوں ڈیڑھ سو (۱۵۰) روپے روانہ کیے اور لکھا کہ یہ آمدنی فیس کی نہیں بلکہ تنخواہ ہے قبول فرمالیجئے۔ حضرت شاہ صاحب نے واپس فرمادیئے اور کہلا بھیجا، آپ کی تنخواہ ہی کہاں جائز ہے، یہ تو ہولیا، اس کے بعد شاہ صاحب کو فکر ہوا کہ فاقہ کا راز کس طرح ظاہر ہوا، تحقیق سے معلوم ہوا کہ خادمہ نے کہہ دیا تھا، آپ نے اس کو بُلایا اور فرمایا، نیک بخت اگر فاقہ کی برداشت نہیں تو اور گھر دیکھ لو، مگر خدا کے لیے ہمارا راز افشاء نہ کرو۔ (تذکرۃ الرشید: ص۲۷۶ رج ۲)

قطب عالم حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے قصے تو آج تک بہت مشہور ہیں، ایک دفعہ حضرت امام ربانی نے خود ارشاد فرمایا کہ میں نے اور میرے گھر کے لوگوں نے فاقے اُٹھائے مگر الحمدللہ میں نے کبھی قرض نہیں لیا۔ (تذکرۃ الرشید: ص۲۷۷ رج ۲)

تذکرۃ الرشید میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ ایام طالب علمی میں آپ نے اپنے خورد ونوش کا دہلی میں کسی پر بار نہ ڈالا، تین روپے ماہوار آپ کے ماموں بھیجا کرتے تھے، اسی میں روکھی سوکھی روٹی اور دال ترکاری وقت پر جو بھی آسانی سے مل گیا آپ نے کھائی اور اسی تین روپے میں کپڑے، دُھلائی، اصلاح خط یا جو کچھ بھی ضرورت پیش آتی رفع کی، دہلی میں آپ کو کوئی کیمیا گر اور مہوش بھی ملے اور انہوں نے آپ کی روش اور انداز کو دیکھ کر بہ نیت محبت بتانا اور آپ کو کیمیا کا بنانا سکھانا بھی چاہا، مگر آپ کی زہد اور قناعت پسند طبیعت نے خود طمع یا حرص تو درکنار اس کا سیکھنا بھی گوارا نہ فرمایا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں کئی شخص کیمیا بنانے والے ملے، دہلی میں ایک شخص نے بنا کر دکھلا بھی دی، ایک شخص نے ہمیں اس کا نسخہ دیا، وہ میری ترمذی میں پڑا ہے مگر میں نے کبھی دھیان بھی نہیں کیا، طالب علمی میں تو کیا بعد میں وسوسہ بھی نہ آیا کہ لاؤ دیکھیں تو سہی بنتی بھی ہے یا نہیں، گنگوہ میں جب آیا اتفاق سے کتاب سے وہ نسخہ نکل آیا، ایک شخص کا نام لے کر فرمایا، وہ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے نسخہ کی نقل مانگی، ہمیں بخل کی ضرورت کیا تھی، ان کو نقل کرادیا اور اصل کو اسی وقت پھاڑ دیا، اس کے بعد غالباً حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ اس سے بن بھی گیا تھا۔

(تذکرۃ الرشید: ص۳۶ رج ۱)

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے حالات میں کیمیا کا ایک اور قصہ علمی انہاک میں گزر چکا ہے، حسن العزیز میں ایک واقعہ لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مولانا مظفر حسین صاحب جہاں جاتے فوراً کہہ دیتے، میں تمہارا مہمان ہوں ایک دن ٹھہروں گا یا دو دن، ایک دفعہ یہ بزرگ مولانا گنگوہی کے مہمان ہوئے، روانگی کے وقت حضرت گنگوہی نے عرض کیا کہ آپ رام پور جانے والے ہیں جلدی کھانا تیار کرا دوں، فرمایا کھانا تیار کرانے میں میری منزل کھوٹی ہوگی، ہاں اگر رات کا رکھا ہوا کچھ ہو تو لادو۔ مولانا نے باسی روٹی اور ماش کی دال لادی، آپ نے دال روٹی پر الٹ کر پلے میں باندھ لی اور رخصت ہو گئے، جب رامپور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین صاحب سے کہا کہ مولوی رشید بڑے اچھے آدمی ہیں، حکیم صاحب نے کہا ہاں بڑے بزرگ ہیں، فرمایا میں ان کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا ہوں، میں تو کہہ رہا ہوں کہ وہ بہت اچھے آدمی ہیں اگر خود نہیں سمجھتے ہو تو پوچھ ہی لو، انہوں نے کہا اچھا فرمائیے، آپ نے فرمایا دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں، انہوں نے مجھے کھانے کے لیے کہا مگر میرے کہنے پر جو کھانا رکھا ہوا تھا بلا تکلف لا دیا، میں اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ (حسن العزیز: ص ۱۴۴ / ج ۴)

حکیم معین الدین صاحب کا واقعہ

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ ایک مرتبہ نانوتہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے صاحبزادہ حکیم معین الدین صاحب کے یہاں مہمان ہوئے، یہ صاحب بہت ہی بے تکلف ہیں، اتفاق سے ان کے یہاں اس روز کھانے کو کچھ بھی نہ تھا، مولانا سے عرض کیا ہمارے یہاں تو آج فاقہ ہے لیکن اکثر احباب آپ کی دعوت کیا کرتے ہیں، اگر آپ فرمادیں تو میں آپ کی دعوت منظور کرلوں، فرمایا میں تمہارا مہمان ہوں جو حال تمہارا ہے وہی میرا، بس فاقہ ہی سے بیٹھ رہے، خدا کی قدرت شام کے قریب ایک جگہ سے گیارہ روپے (مطب میں) آ گئے۔ وہ خوش خوش مولانا کے پاس آئے کہ لیجئے آپ کی برکت سے گیارہ روپے آ گئے، اب معمولی ہم کیوں پکوائیں گے، اب تو جس طرح جی چاہے گا دعوت کریں گے۔ اس واقعہ کو نقل کر کے حضرت حکیم الامت فرماتے ہیں کہ جب ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا پھر ہماری نظروں میں آج کل کی خاطر داری کیا آسکتی ہے۔

حضرت نانوتوی کا واقعہ

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق بھی علمی انہاک میں ایک واقعہ لکھوا چکا ہوں کہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک جھلنگا پر پڑے رہتے تھے۔ روٹی ایک وقت پکوا کر کئی کئی وقت تک

اسے ہی روکھی کھاتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اپنے ملازم کو کہہ رکھا تھا کہ کھانے کے وقت ان کو سالن دے دیا کرو۔ بڑی دقت اور اصرار سے کبھی لے لیتے تھے اور اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب نے حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدۂ کے طفلی حالات میں اپنی ایک قلمی یادداشت میں لکھا ہے کہ مولانا مرحوم یعنی حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی تازہ باسی روٹی یا دانہ دنکا، مٹھائی کھٹائی اپنی زبان سے نہیں مانگی۔ اگر کسی نے دے دیا تو لے لیا اور کھالیا ورنہ خیر۔ بعض دفعہ بھوک بہت لگتی، مانگنے کی تکلیف کو بھوک کی تکلیف پر گوارا کر کے صبر کرتا اور جب مہینے دو مہینے میں دو چار روز کے واسطے گھر نانوتہ جاتے اور پھر دیوبند کی واپسی کا وقت قریب آتا تو آپ بھوک کی تکلیف یاد کر کے رو پڑتے۔ آپ کی والدہ ہر چند پیار کر کے چمکار کر پوچھتیں کہ تجھ کو دیوبند میں کچھ تکلیف ہے۔ مولانا فرماتے تھے کہ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ اگر میں نے والدہ سے اس تکلیف کا ذکر کیا تو دیوبند والوں کی ناشکری ہوگی اور ان کو رنج گزرے گا۔ اپنے نفس پر تکلیف کا ہونا مضائقہ نہیں۔ والدہ کو اصل حال سے مطلع نہیں کیا اور برابر اسی طرح گزار دی۔ (سوانح قاسمی گیلانی: ص۱۸۲ / ج۱)

حضرت نانوتوی کے واقعات

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدۂ کی سوانح میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی تحریر فرماتے ہیں کہ نکاح کرنے سے انکار کر دیا۔ بڑی مشکل کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے حکم دلایا۔ جس پر حضرت راضی تو ہو گئے مگر اس شرط پر کہ تمام زوجہ کی نفقہ اور اولاد کی پرورش کے لیے کچھ کما لانے کے مجھ پر تقاضے نہ ہوں۔ بے چاروں نے ناچار یہ شرط قبول کی نکاح ہو گیا، اب نوکری کی تو چار پانچ روپے کی، کسی کتاب کی تصحیح کی اور اس کے ساتھ ہی مہمان نوازی فطرت میں داخل تھی اس سے کچھ کیا بچتا کہ اہل و عیال کو دیتے، جب مکان تشریف لاتے اور یہاں بھی مہمان آتے تو والدین پر بار ڈالنے کی بجائے اہلیہ کا زیور نہ صرف اس کی اجازت سے بلکہ اس کی رغبت سے فروخت کر کے مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے، اہلیہ بھی اللہ نے ایسی عطاء فرمائی تھی جو حضرت کی طبیعت مبارکہ کے ساتھ ہی ساتھ تھی کہ اپنے گھر کے زیور بھی بہت خوشی سے والدین سے مخفی بیچنے کے لیے دیتی رہتی خود حضرت قدس سرہٗ کا ارشاد ہے:

''ہماری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے۔''

(سوانح قاسمی یعقوبی: ص۳۲)

شیخ الاسلام حضرت مدنی کے واقعات

حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ خود نوشت سوانح میں اپنے مدینہ پاک کے ابتدائی حالات میں جو تفصیل سے تحریر فرمائے گئے ہیں، لکھتے ہیں کہ وطن سے یعنی ہندوستان سے مدینہ پاک آ کر ہم لوگوں کو بھی بہت سے مشکلات پیش آئیں، بالخصوص عورتوں کو، وطن اور اہل وعیال کی جدائی تو تھی ہی، بہت سے کام ایسے کرنے پڑے جن کی بچپن میں کبھی نوبت نہیں آئی تھی، مثلاً آٹا بھی خود ہی پیسنا پڑا، گھر میں جھاڑو دینا، برتنوں کو دھونا، والدہ صاحبہ باوجود ضعف و پیری بہت زیادہ جفاکش اور عالی ہمت تھیں، اپنی ہر بہو کی آٹا پیسنے کی باری مقرر تھی مگر خود بھی ہر بہو کے ساتھ چکی پیسنے میں اور گھر کے کاروبار میں شریک رہتیں، گھر والوں کے اور بچوں کے اور مردوں کے کپڑے بھی سب کو خود ہی دھونے پڑتے تھے، جس کی وطن میں کبھی نوبت نہیں آئی تھی، ہم مردوں کو بالخصوص مجھے اور بھائی سید احمد صاحب مرحوم کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر میٹھا پانی لانا پڑتا تھا کہ دن میں مشغولی کی وجہ سے وقت نہیں ملتا تھا۔

۱۳۱۸ھ میں مجھے اور بھائی صدیق احمد صاحب مرحوم کو ہندوستان کا سفر پیش آیا بھائی سید احمد مرحوم کی تنخواہ صرف بیس روپے ماہوار تھی والد صاحب مرحوم نے بہ مجبوری ایک مخلص سے پچاس روپے قرض لیے جس سے چاول خریدے، ایک وقت میں کھچڑی اور دوسرے وقت میں پیچ پر سارے گھر والوں کا گزر تھا، (چاولوں کو بہت سے پانی میں اُبال کر اس کا پانی جو گاڑھا ہوتا ہے اس کو پیچ کہتے ہیں) یہ سلسلہ کئی ماہ تک مسلسل رہا اور یہ چند ماہ گھر والوں پر بہت عسرت کے گزرے، لیکن الحمدللہ فاقوں کی نوبت کسی کو نہیں آئی۔

حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی اور حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی دہلوی قدس اللہ اسرارہما اور ان کے خاندان والوں پر عرصہ تک فاقوں کی نوبت آتی رہی۔

(نقش حیات: ص ۱۶/ ج ۱)

حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا ابتدائی دور کلکتہ کے قیام کا اور دیوبند کے قیام کا بھی بہت تنگی کا گزرا، باوجود وسیع تنخواہ کے مہمانوں کی کثرت اور فیاضیوں کا زور اکثر مقروض ہی بنائے رکھتا تھا، ایک چیز تو میرے ساتھ بہت ہی کثرت سے دیوبند کے ابتدائی قیام میں پیش آئی، کہ بیسیوں مرتبہ بلکہ اگر سینکڑوں کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا، دیوبند سے کلکتہ، لکھنؤ، شاہدرہ وغیرہ تشریف لے جاتے ہوئے سہارنپور دیوبند سے آ کر صرف اس لیے اُترتے تھے کہ حضرت جی کے پاس آگے جانے کا کرایہ نہیں ہے، اس سیہ کار پر حضرت کی شفقت اس وقت سے شروع ہوئی تھی جب میری عمر گیارہ بارہ

سال کی تھی اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد دو ماہ کا چلہ گنگوہ میں کیا تھا اور دو ماہ مسلسل روزے بھی رکھے تھے۔

حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری کے واقعہ

حضرت مولانا الحاج شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں کثرت سے گزر چکا کہ رائے پور کے ابتدائی قیام میں ایک روٹی روز ملتی تھی، جس کی تفصیل مجاہدات میں گزر چکی، وہ بھی کہیں سے کچی کہیں سے پکی بغیر سالن کے، گاؤں سے کسی دن چاچھ آجاتی تو اس سے حلق میں اُتاری جاتی ورنہ پانی سے، وہ ارشاد فرماتے تھے کہ ہمارے یوپی کے ساتھی تو اسی روٹی کو آدھی آدھی دو وقت میں کھاتے تھے اور پنجاب کا رہنا والا ایک ہی وقت میں کھا لیتا تھا اور دوسرے وقت میں اللہ کا نام، باغ میں پتے تلاش کیا کرتے تھے جن پر گزر ہو جائے مختلف پتے بھی کبھی کبھی کھائے اکثر مہمانوں کی چائے سے جو پتی بچتی تھی اس کو پکا کر اور باورچی خانہ میں جو پرانا گڑ مل جاتا تھا اس کو پکا کر شیرا بنا کر اس میں وہ پتی ڈال کر روٹی اسی سے کھا لیتا تھا، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر ایک پھٹا ہوا کپڑا کسی کا پڑا ہوا تھا، ردی کر کے ڈال دیا گیا تھا، حضرت نے اس کو اُٹھا کر دھو کر پاک کر کے کئی تہہ کر کے اس کو حافظ یوسف علی صاحب کی گھوڑی جہاں بنتی تھی وہاں بچھا لیا تھا، وہی بستر تھا وہی مصلےٰ تھا، چودہ (۱۴) سال تک اسی پر گزر کیا، خانقاہ میں ایک ہی لالٹین تھی اور خانقاہ میں سانپ، بچھو، کنکھجورے، جنگل میں کثرت سے ہوتے تھے۔ حضرت فرماتے تھے کہ ایک ٹوٹا ہوا بانس بستر کے قریب رکھا رہتا تھا، اس کو کبھی زمین پر مار دیتا تھا کہ کوئی سانپ بچھو ہو تو بھاگ جائے۔

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے چند واقعات

حضرت کے اور دوسرے اکابر کے بہت سے واقعات، مجاہدات میں گزر چکے ہیں، مکرر لکھوانے کو جی نہیں چاہتا، میرے چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق کئی جگہ متفرق قصے گزر چکے ہیں، جن میں ماہ رمضان میں افطار و سحر میں گولر پر گزر کرنا اور ایک ضروری کارڈ اس ناکارہ کو کئی دن اس وجہ سے نہ لکھنا کہ پیسہ کوئی تھا نہیں، قرض لینے کو جی نہ چاہا اور بھی کئی واقعات ہیں، سوانح یوسفی میں لکھا ہے کہ جو زمانہ مولانا یوسف صاحب کی خوردسالی کا گزرا ہے وہ بستی نظام الدین میں بڑی تنگ دستی اور عسرت کا تھا، گھر میں کئی کئی فاقے ہو جاتے، لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی، اس حال سے وہی لوگ واقف تھے جو گھر کے افراد تھے یا معتمد علیہ تھے یا خدام و رفقاء، بچے اور بوڑھے سب ہی اس حال میں مست اور صبر و قناعت کے پیکر تھے۔

مولانا یوسف نے خود ایک موقع پر ایک صاحب کے استفسار پر بیان فرمایا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے دور میں شروع شروع کئی کئی فاقے ہو جاتے تھے اور مدرسہ کاشف العلوم میں کام کرنے والے حضرات بھی اس سے لطف اندوز ہوتے ایک بار مسلسل کئی دن سے فاقہ تھا اور اندر باہر کچھ نہ تھا، حضرت اپنے حجرے سے نکلے اور حوض کے کنارے اہل مدرسہ کو جمع کر کے فرمایا کہ دیکھو تم لوگ میری وجہ سے پریشان مت ہو، تم یہاں سے کہیں اور جا سکتے ہو، کسی اور مدرسہ میں کام کر سکتے ہو، میں اکیلا ہوں حوض کا پانی پی کر گزارا کر لوں گا، گھر اور مدرسہ کے خزانہ میں کچھ نہیں ہے، حضرت کے اس فرمانے پر سب اہلِ مدرسہ نے ایک زبان ہو کر عرض کیا، حضرت! ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں چاہے ہمیں بھی حوض کا پانی پینا پڑے، حضرت اس جواب پر آبدیدہ ہو گئے، اپنے حجرے میں تشریف لے گئے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد نکل کر باہر آئے اور فرمایا اللہ برکت دے گا اور آسانی مہیا کرے گا۔

اس کے بعد مولانا یوسف صاحب ہی سے سنا ہوا واقعہ ہے کہ جب بھی کہیں سے آٹا آتا تھا تو ایک صندوق میں جو اسی مقصد سے رکھا رہتا تھا بھر دیا جاتا تھا اور اندر باہر صرف میں لایا جاتا تھا، ایک بار کا واقعہ ہے کہ صندوق میں آٹا بالکل نہ تھا اور کئی روز سے فاقہ کی حالت چل رہی تھی مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے صندوق کے درازوں سے آٹا نکال کر جمع کیا وہ اتنا کم تھا کہ بڑی محنت سے جمع ہوا اور اس کی چند ٹکیاں بن سکیں۔ مولانا محمد یوسف صاحب کی اس محنت اور عمل کو حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے حجرہ سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا، حال دریافت کیا اور انکشافِ حال سے چہرہ پر ایک خاص قسم کا اثر پڑا اور حجرہ واپس تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد نکلے اور فرمایا یوسف! اب اس چہار دیواری کے اندر ان شاء اللہ فاقہ نہ آئے گا۔

(سوانح یوسفی)

حضرت مولانا اسماعیل شہید کا واقعہ

اور ح ثلاثہ میں امیر شاہ خان صاحب فرماتے ہیں کہ ایک شخص بڑے لوگوں میں سے جن کا نام تو یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ ان کو منشی جی کہا کرتے تھے، انہوں نے مولانا اسماعیل صاحب شہید سے اپنے یہاں مردانہ مکان میں وعظ کہلوایا، وعظ میں مولانا کی یہ حالت تھی کہ جو تڑاک پڑاک ان کے وعظ میں ہوتی تھی اس وعظ میں نہ تھی، بلکہ لہجہ نہایت کمزور تھا، مولوی رستم خان بریلوی جو مولانا کے خازن اور نہایت جان نثار تھے، ان سے ان منشی صاحب نے دریافت کیا کہ آج مولانا کی آواز اُبھرتی کیوں نہیں، اس کا کیا سبب ہے، چونکہ منشی صاحب مخلص تھے اور پوچھا بھی اصرار سے اس

لیے انہوں نے جواب میں فرمایا کہ اس ضعف لہجہ کا سبب یہ ہے کہ مولانا پر تین وقت سے فاقہ ہے اور انہوں نے تین وقت سے کچھ کھایا نہیں ہے، منشی صاحب یہ سن کر اُٹھے اور مولانا سے کہا کہ مولانا اب وعظ کو موقوف فرما دیجئے مجھے اور بھی ضروری کام ہیں، وعظ موقوف ہو گیا اور وہ مولانا کو الگ ایک مکان میں لے گئے، وہاں ان کے سامنے کھانا رکھا، مولانا دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا، منشی جی! تم سے کسی نے کہہ دیا ہے مگر میں کھانا نہ کھاؤں گا اور میں ان سے الگ نہیں کھا سکتا، انہوں نے ساتھیوں کو بھی بلایا اور سب کو کھانا کھلایا اور کئی وقت تک دعوت کی۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۶)

حضرت سہارنپوری کا واقعہ

مفتی محمود صاحب نے بروایت مولوی لطیف الرحمٰن مرحوم کاندھلوی بیان کیا ہے کہ میں (مولوی لطیف الرحمٰن) ایک مرتبہ پیالہ لے کر حضرت اقدس سہارنپوری کے دولت کدہ پر گیا، حضرت کے منتظم کار حاجی مقبول احمد صاحب آئے، میں نے ان سے کہا کہ مطبخ کی دال کھائی نہیں جاتی، تھوڑا سا سالن دیجئے، انہوں نے جواب دیا آج تو سالن ہے نہیں، میں نے کہا کہ حضرت کے سالن میں سے دے دو، انہوں نے جواب دیا کہ حضرت کا سالن بھی نہیں، آج گھر میں فاقہ ہے، اس پر میں نے کہا کہ اچھا میں بازار سے حضرت کے لیے کچھ لے آؤں، اس پر انہوں نے فوراً میرے پاؤں پکڑ لیے کہ اللہ کے واسطے ایسا نہ کرنا ورنہ میری آفت آجائے گی کہ گھر کا راز کیوں ظاہر کیا، لیکن گھر سے باہر جب حضرت تشریف لاتے تو بڑے اعلیٰ لباس میں کہ کسی کو ادنیٰ شبہ بھی نہ ہو کہ گھر میں فاقہ ہے، ایک شاہانہ انداز میں تشریف لاتے تھے، یہ عمدہ اور اعلیٰ لباس تو غیرت الٰہی کی وجہ سے تھا کہ صورتِ حال سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ ان کے پاس ہے نہیں، صورت سوال نہ بن جائے اور حق تعالیٰ کا شکوہ وشکایت نہ ہو اور گھر کا فاقہ یہ غایت تحمل اور اتباعِ سنت ہو۔

حکایاتِ صحابہ کے تیسرے باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور صحابہ کرام کے فقر و فاقہ کے متعدد قصے لکھے جا چکے، سب کا اعادہ کرنا تو یہاں بہت طویل ہے مگر اس باب کو اس کا جزء سمجھنا چاہیے اور احادیث کی سب کتابوں میں کتاب الزہد تو اس باب کا ماخذ اور اصل اصول ہے، مگر میں اپنی ہر تالیف میں خاص طور سے شمائلِ ترمذی، فضائل قرآن، فضائل صدقات میں بار بار اس پر تنبیہ لکھواتا رہا ہوں کہ اور اب بھی لکھواتا ہوں کہ ان سب واقعات کے نہایت اہم نہایت مرغوب، نہایت مقصود اور قابل تقلید ہونے کے باوجود، ہم لوگوں کو اپنے ضعف کا لحاظ بہت ضروری ہے، ایسی کوئی چیز ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے آدمی دوسری عبادت سے بھی جاتا رہے نہ بھاگ کر چلنا، نہ اُکھڑ کر گرنا۔

تقلیل طعام میں تحمل کا لحاظ ضروری ہے

آپ بیتی میں شاید کسی جگہ مفصل لکھوا چکا ہوں کہ ۳۵ھ کی ابتداء سے اس ناکارہ کے طلب علم کے ذوق کا دور شروع ہوا اور اسی ذیل میں رات کا کھانا چھوڑا تھا، جس میں حرج ہوتا تھا، کچھ دنوں تک تو میری ہمشیرہ مرحومہ میرے پاس بیٹھی رہتی، میں مطالعہ میں مشغول رہتا اور وہ لقمہ بنا کر کھلاتی رہتی، کئی سال تک تو محض حرج کی وجہ سے کھانا چھوٹا رہا پھر عادت ہوگئی، لیکن چند سال تک یہ رہا کہ اگر کوئی معزز مہمان آتا تو اس کی دل داری میں ضرور شریک ہوتا اور رغبت سے کھاتا، چند سال بعد طبیعت میں بار شروع ہوگیا اور صرف تین ہستیاں، حضرت شیخ الاسلام، حضرت رائے پوری ثانی اور میرے چچا جان نور اللہ مراقدہم اللہ ان حضرات کو بہت ہی اُونچے درجے عطاء فرمائے ان کے ساتھ شرکت کا معمول رہا اور ان کی برکت سے گرانی بھی نہیں ہوتی تھی، ان کے بعد سے تو یہ حالت ہوگئی کہ اگر کسی وجہ سے دوسرے وقت کھانے کی نوبت آجاتی ہے تو طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی اور جب کبھی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آج رات کو کھانا ہے تو اس دن صبح کو حذف کردیتا ہوں، لیکن میرے متعدد دوستوں کو یہ واقعہ پیش آچکا ہے، اسی وجہ سے اس چیز کو اہمیت سے لکھوا رہا ہوں کہ دو چار نہیں بیسیوں خطوط اس مضمون کے آگے آچکے ہیں کہ سہارنپور سے آنے کے بعد رات کا کھانا چھوڑ دیا اور میں نہایت شدت سے نہایت سختی سے ان کو منع کرتا رہتا ہوں۔

تقریباً بیس سال کا واقعہ ہے یا اس سے بھی زائد کا، ایک صاحب کا خط آیا کہ سہارنپور سے آنے کے بعد سے شام کا کھانا چھوڑ دیا، میں نے بہت ہی شدت سے انہیں منع کیا انہوں نے اتنی ہی شدت سے بلکہ اس سے بھی زیادہ سے رات کے نہ کھانے کے فوائد لکھے، طبیعت بہت ہلکی رہتی تھی معمولات میں دل لگتا ہے، ذکر میں بڑی لذت آتی ہے، تہجد میں بڑا انشاط رہتا ہے، نیند بالکل نہیں آتی وغیرہ وغیرہ۔

میں نے شدت سے اس پر بھی انکار لکھا مگر میرے کہنے کو تو انہوں نے قبول نہیں کیا مگر ایک ہفتہ بعد ان کا خط آیا کہ ضعف کی وجہ سے رات کا کھانا شروع کردیا، طبیعت بالکل متحمل نہ رہی، رات کے معمولات بھی قضا ہونے لگے باوجود آنکھ کھلنے کے نماز تہجد نہیں پڑھی جاتی وغیرہ وغیرہ، اس قسم کے کئی واقعات میرے ساتھ پیش آچکے ہیں۔

اس ناکارہ کی صحت وقوت کے زمانہ میں تقریباً پچاس (۵۰) سال یہ معمول رہا کہ ماہِ مبارک میں ستائیس (۲۷) رمضان تک یعنی ختم قرآن تک ایک قرآن پاک روزانہ کا اہتمام کرتا تھا، اس

کی تفصیل تو آپ بیتی نمبر۲ میں گزر گئی، اس کا اعادہ تو بے محل ہے مگر یہاں تو یہ لکھنا ہے کہ میرے محترم مولانا واجد علی صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ایک دن مغرب کے قریب حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے روزہ کی حالت غشی کی سی صورت، حضرت بھی ان کو دیکھ کر گھبرا گئے ان کو لٹایا پنکھا ونکھا کیا، افطار کے بعد خمیرہ وغیرہ کھلایا گیا، جب اوسان درست ہوئے، حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے ان سے حالت خود دریافت کی، کیا ہوا تھا؟ کیا بات پیش آئی تھی، انہوں نے کہا کہ شیخ کو ایک قرآن روز پڑھتے دیکھا تھا، کئی دن سے میں نے بھی شروع کر دیا دو تین دن تک تو پتہ نہیں چلا، مگر کل سے کچھ ضعف معلوم ہوا، آج زیادہ ہو گیا، حضرت قدس سرہٗ نے خوب ڈانٹا اور پھر حضرت نور اللہ مرقدہٗ ہی نے ابتداءً یہ قصہ تفصیل سے مجھے سنایا، بعد میں میں دوسرے لوگوں سے بھی سنتا رہا، میں نے بھی مولانا مرحوم سے عرض کیا کہ آپ نے اپنے ضعف و پیری کو تو خیال فرمایا ہوتا اور پھر میرے گھاس کاٹنے میں اور آپ کے تدبر اور تدبیر سے پڑھنے میں آسمان و زمین کا فرق ہے، میں بہت کثرت سے اس مضمون پر ضرور تنبیہ کرتا ہوں۔

فضائلِ صدقات حصہ دوم کا ایک مضمون یہاں نقل کراتا ہوں اس میں فقر و فاقہ کے دس فوائد بنہایت تفصیل سے احیاء العلوم سے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ بات قابلِ لحاظ ہے جو متعدد بار لکھی جا چکی ہے کہ ان فضائل کے حق ہونے میں تردد نہیں، یقیناً یہ وہ کمالات ہیں جس سے خوش نصیب کو حق تعالیٰ شانہ اپنے لطف سے عطاء فرما دیں، اس کے لیے دین اور دنیا دونوں کی راحت ہے اور آخرت کے لیے بے شمار درجات اور ترقیات کا زینہ یہی چیزیں ہیں، لیکن اپنے تحمل کی رعایت ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا، زیادہ شوق میں آدمی تھوڑے سے بھی جاتا رہے، اس لیے ان سب چیزوں کی طرف دل کو رغبت دینے کے ساتھ ان چیزوں کے اور اس طرزِ زندگی کے اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کے ساتھ اور ان امور کو نہایت وقعت سے دیکھنے کے ساتھ عمل اتنا ہی کرنا چاہیے جتنا اپنے اندر تحمل ہو، بیمار آدمی طاقت سے زیادہ بوجھ اُٹھائے گا تو جلدی مرے گا، ہم لوگ نفس کی بیماریوں کے بیمار ہیں، اعضاء اور قویٰ کے مارے ہوئے ہیں، اس لیے صحت کی تمنا اور کوشش، سعی اور رغبت کے ساتھ ایسی کوئی چیز عملی طور سے اختیار نہ کرنا چاہیے جو اس حالت سے بھی گرا دے جس پر اب موجود ہیں، امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"کم کھانے کی عادت آہستہ آہستہ پیدا کرنی چاہیے جو شخص زیادہ کھانے کا عادی ہو، وہ دفعۃً کم

کرے گا تو اس کا تحمل بھی نہ ہوگا، ضعف بھی ہو جائے گا، مشقت بھی بڑھ جائے گی، اس لیے بہت آہستگی اور سہولت کے ساتھ اس کو اختیار کرنا چاہیے، مثلاً اگر کوئی شخص دو نان کھاتا ہو تو اس کو ایک نان کا اٹھائیسواں حصہ روزانہ کم کرنا چاہیے، اس سے ایک مہینے کے اندر آدھی خوراک رہ جائے گی اور اگر اس کا بھی تحمل دشوار ہو تو چالیسواں حصہ کرنا چاہیے۔''

(فضائلِ صدقات: ص۱۶۳/ج ۲)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۱۰

اکابر نور اللہ مراقدہم کا تقویٰ

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے واقعات

یہ ایسا مشہور اور معروف معمول رہا ہے کہ اس کا احصار مشکل اور اس کے واقعات **لا تعد و لا تحصٰی** ہیں، میں اپنے اکابر کے متعلق اسی رسالہ میں کسی جگہ چند اشعار لکھوا چکا ہوں، جن کا ایک مصرع ''انہیں کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی'' حرف بحرف صحیح ہے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اس کے واقعات اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کا لکھنا تو بڑی ضخیم کتاب کو چاہتا ہے، خود اس رسالہ میں بھی اکابر کے مختلف حالات کے ذیل میں بھی شان اتقاء کا ظہور بہت کثرت سے گزر چکا ہے، حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی نور اللہ مرقدہٗ کے تقویٰ کے واقعات تو نہ معلوم اسی رسالہ میں کتنی جگہ گزرے ہوں گے کہ حضرت مرحوم کا معدہ مشتبہ چیز کو قبول نہیں کرتا تھا، فوراً قے ہو جاتی تھی، اس کی وجہ سے حضرت کے اعزہ واحباب اور جہاں کہیں تشریف لے جاتے میزبانوں کو فکر ہو جاتا کہ کہیں حضرت کے کھانے کے بعد اپنی رسوائی نہ ہو، مشتبہ مال کے قے ہو جانے کے متعدد واقعات اپنے بچپن میں گھر کی مستورات سے سننے کی نوبت آتی رہی، تذکرۃ الخلیل میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب کاندھلوی کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے کچھ دام اپنے صاحبزادے مولوی محمد ابراہیم صاحب کو دیئے کہ خود جا کر ان کا سامان کھانے کے لیے لاویں تا کہ کچھ گڑ بڑ نہ ہو، کھانا تیار ہوا اس میں فیرینی بھی تھی جس کے کھاتے ہی قے ہو گئی، مولوی نور الحسن صاحب بہت پریشان ہوئے، تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ جو دودھ مولوی محمد ابراہیم صاحب لائے تھے وہ گر گیا تھا، دودھ باورچی حلوائی کے یہاں سے ادھار میں لے آیا تھا۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۱۰)

از زکریا: مولانا نور الحسن صاحب حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے قریب ترین ہمجد ہیں، مولانا نور الحسن بن مولانا ابو الحسن بن مفتی الٰہی بخش بن مولانا شیخ الاسلام اور حضرت مولانا مظفر حسین صاحب بن مولانا محمود بخش ابن شیخ الاسلام۔

(تاریخ کبیر: ص ۴۱)

مولانا نور الحسن صاحب فراغ تکمیل علوم کے بعد کچھ دنوں سرکاری ملازم رہے، کچھ عرصہ دیو بند، ضلع سہارنپور میں نائب تحصیل دار پھر نکوڑ ضلع سہارنپور میں تحصیل دار رہے، غالباً اسی زمانہ

ٹکوڑ کا یہ قصہ ہے جیسا کہ بچپن میں کان میں پڑا، خاندان میں اس قسم کا قصہ دودھ جلیبی کا بھی مشہور ہے کہ مولانا نورالحسن صاحب نے ایک سپاہی کو بہت سمجھا بجھا کر اور یہ واضح کر کے کہ کوئی گڑ بڑ نہ کیجئے، ورنہ تیری اور میری دونوں کی ذلت ہوگی، ایک سپاہی کے ہاتھ دودھ جلیبی بازار سے منگوائی اور اس کو بہت ہی بار بار سمجھا دیا تھا کہ ان ہی پیسوں کی لائے، ورنہ میری تیری دونوں کی ذلت فوراً ہو جائے گی، سپاہی کی عقل میں نہیں آئی کہ ذلت کیوں ہوگی، وہ حلوائی سے دودھ جلیبی تو تحصیل دار صاحب کے مہمان کے نام سے مانگ لایا اور پیسے جیب میں رکھ لیے اور دودھ جلیبی کا چمچہ نوش فرماتے ہی شور مچ گیا، سپاہی بیچارے کی عقل میں ہی نہیں آتا تھا کہ ایسی فوری گرفت ہوگی۔
حضرت نوراللہ مرقدہٗ کی طالب علمی کے زمانہ کا قصہ بھی آپ بیتی میں کئی جگہ گزر چکا کہ دہلی کے قیام طالب علمی میں بازار سے کھانے کا نظم تھا، مگر حضرت بغیر سالن کے روٹی کھایا کرتے تھے، اس لیے کہ دہلی کے سالنوں میں بازاری ہوں یا گھریلو امچور کا دستور بہت کثرت سے تھا اور آموں کی بیع قبل از وقت ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوتی ہے، اس لیے حضرت دہلی کے بازار کا سالن نہیں نوش فرمایا کرتے تھے۔

اورح ثلاثہ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی روایت سے نقل کیا گیا ہے وہ فرماتے تھے کہ شاہ اسحاق صاحب کے شاگردوں میں تین شخص نہایت متقی تھے، اول درجہ کے مولوی مظفر حسین صاحب، دوسرے درجہ کے شاہ عبدالغنی صاحب اور تیسرے درجہ کے نواب قطب الدین صاحب، اس کے بعد فرمایا کہ ایک مرتبہ نواب قطب الدین خان صاحب نے احباب کی دعوت کی، شاہ اسحاق صاحب نے منظور فرمالی اور مولوی یعقوب صاحب نے بھی مگر مولوی مظفر حسین صاحب نے منظور نہ فرمائی، اس سے نواب قطب الدین خان کو ملال ہوا اور انہوں نے شاہ اسحاق صاحب سے شکایت کی کہ میں نے مولوی مظفر حسین صاحب کی بھی دعوت کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا شاہ صاحب نے مولوی مظفر حسین پر عتاب فرمایا اور فرمایا، ارے مظفر حسین! تجھے تقویٰ کی بدہضمی ہوگئی، کیا نواب قطب الدین کا کھانا حرام ہے، انہوں نے کہا کہ حاشا وکلا مجھے نواب صاحب پر اس قسم کی بدگمانی نہیں ہے۔

شاہ صاحب نے فرمایا پھر کیوں انکار کرتا ہے، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت نواب صاحب نے آپ کی بھی دعوت کی ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب کی بھی اور ان کے علاوہ اتنے اور آدمیوں کی اور آپ کو پالکی میں لے جائیں گے، اس میں بھی ضرور صرف ہوگا اور نواب صاحب گو بگڑ گئے ہیں مگر پھر بھی نواب زادہ ہیں، وہ دعوت میں ضرور نوابانہ تکلف بھی کریں گے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب مقروض بھی ہیں اور جتنا روپیہ وہ دعوت میں صرف کریں گے وہ ان

کی حاجت سے زائد بھی ہے تو یہ روپیہ وہ اپنے قرض میں کیوں نہیں دیتے، ایسی حالت میں ان کا کھانا کراہت سے خالی نہیں، یہ بات شاہ صاحب کے ذہن میں بھی آگئی اور شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں قطب الدین اب ہم بھی تمہارے یہاں کھانا نہ کھائیں گے۔

اس پر حضرت حکیم الامت تھانوی حاشیہ میں فرماتے ہیں:

''قولہ کراہت سے خالی نہیں، اول کہ وہ اعانت بعیدہ ہے مطل فی اداء القرض کی، کیا دقیق تقویٰ ہے اور اُستاد کیسے مقدس کہ یا تو شاگرد کو لتاڑ رہے تھے یا ان ہی کا اتباع کرلیا۔''

(ارواح ثلاثہ: ص ۱۹۱)

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کے متعلق مشہور یہ ہے ''جب وہ کسی سواری کا کرایہ کرتے تو مالک کو چیزیں دکھلا دیا کرتے تھے اگر بعد میں کوئی خط بھی لاتا تو فرماتے کہ بھائی میں نے سارا اسباب مالک کو دکھا دیا ہے اور یہ اس میں سے نہیں، لہٰذا تم مالک سے اجازت لے لو۔''

(جدید ملفوظات: ص ۳۸)

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کا واقعہ

حضرت مولانا الحاج احمد علی صاحب محدث سہارنپوری محشی بخاری شریف کا واقعہ آپ بیتی میں کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ حضرت کا قیام ہمیشہ کلکتہ رہا، کلکتہ اور اس کے نواح کے لوگ حضرت سے واقف تھے، اس لیے مدرسہ مظاہر علوم کے چندہ کے لیے کلکتہ کا سفر فرمایا اور سفر سے واپسی پر سفر خرچ کا ایک ایک پیسہ کا حساب درج تھا، اس حساب کو میں نے خود بھی نہایت بے غیرتی سے پڑھا کہ جن کے اکابر کی یہ احتیاط ہو ان کے اصاغر کی بے التفاتیاں انتہائی موجب قلق ہیں، اس حساب کہ اخیر میں ایک نوٹ یہ بھی تھا کہ کلکتہ سے فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے کی غرض سے گیا تھا، اگر چہ وہاں چندہ اندازہ سے زیادہ ہوا لیکن میرے سفر کی غرض چندہ کی نیت سے جانے کی نہیں تھی اس لیے اتنی مقدار سفر کلکتہ سے وضع کرلیا جائے، یہ واقع آپ بیتی میں گزر چکا، اس میں یہ بھی گزر چکا کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کے نام نامی پر مدرسہ کا نام مظاہر علوم ہے، ان کے متعلق لکھوا چکا ہوں مدرسے کے اوقات میں جب کوئی مولانا قدس سرہٗ کا عزیز ذاتی ملاقات کے لیے آتا تو اس سے باتیں شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر حضرت کی کتاب میں ایک پرچہ رکھا رہتا تھا، اس پر تاریخوں اور منٹوں کا اندراج فرما لیتے اور ماہ کے ختم پر ان کو جمع فرما کر اگر نصف یوم سے کم ہوتا تو آدھ روز کی رخصت اور اگر نصف یوم سے زائد ہوتو ایک روز کی رخصت مدرسہ میں لکھوا دیتے، البتہ اگر کوئی فتویٰ وغیرہ پوچھنے

آتا تو اس کا اندراج نہیں فرماتے تھے، آپ بیتی حصہ اول میں اس قسم کے بہت سے واقعات گزر چکے ہے، یہاں تو ان واقعات کی طرف اجمالی اشارہ یاد دلانے کے لیے کرنا ہے۔

حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق بھی لکھا جا چکا کہ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ ۳۴ھ میں یک سالہ قیام حجاز کے بعد جب سہارنپور تشریف لائے تو یہ کہہ کر مدرسہ کی تنخواہ بند کر دی تھی کہ میں اپنے ضعف و پیری کی وجہ سے مدرسہ کا پورا کام انجام نہیں دے سکتا، مگر اب تک چونکہ مولانا یحییٰ صاحب میری جگہ اسباق پڑھاتے تھے اور تنخواہ نہیں لیتے تھے، وہ میرا ہی کام سمجھ کر کرتے تھے اور میں اور وہ دونوں مل کر ایک مدرس سے زیادہ کام کرتے تھے اب چونکہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور میں مدرسہ کی تعلیم کا پورا کام نہیں کر سکتا اس لیے قبول تنخواہ سے معذور ہوں، یہ بھی آپ بیتی میں گزر چکا ہے کہ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ اتنے سبق پڑھاتے رہتے اتنے تو مدرسہ کی قالین پر تشریف فرما رہتے تھے، لیکن جب سبق کے بعد اپنے اعزہ میں ذی وجاہت شخص سے بات شروع کی تو قالین سے نیچے اُتر گئے اور فرمایا کہ مدرسہ نے یہ قالین ہمیں سبق پڑھانے کے لیے دیا ہے، ذاتی استعمال کے لیے نہیں۔

اس میں یہ بھی لکھا جا چکا کہ مدرسہ میں حضرت کی چارپائیاں مستقل دور رہتی تھیں، مدرسہ کی چارپائی یا بستر پر میں نے آرام فرماتے یا بیٹھتے نہیں دیکھا یہ بھی گزر چکا کہ مدرسہ کے سالانہ جلسوں میں مدرسہ کے جملہ اکابر حتیٰ کہ جو صاحب مطبخ میں مہمانوں کی دیگیں پکواتے تھے وہ بھی دیگ کا نمک خود نہیں چکھتے تھے، بلکہ کسی مہمان یا طالب علم سے چکھواتے تھے، جملہ اکابر مدرسین منتظمین جو شب و روز مدرسہ کے کام میں ہمہ وقت مشغول رہتے، لیکن مدرسہ کا کھانا تو در کنار مدرسہ کی چائے یا پان بھی یہ حضرات استعمال نہیں کرتے تھے، وہاں یہ بھی لکھا جا چکا کہ ہمارے مدرسہ کے مہتمم مولانا عنایت الٰہی صاحب کے پاس دفتر میں دو قلم دان تھے، ایک مدرسہ کا، دوسرا اپنا ذاتی اور ذاتی قلم دان میں چھوٹے چھوٹے پرچے پڑے رہتے تھے، اپنے گھر یا ذاتی پرچہ کہیں لکھنا ہوتا تو مدرسہ کے قلم دان یا مدرسہ کے کاغذ پر نہیں لکھتے تھے، یہ بھی گزر چکا کہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا کھانا اس زمانہ میں بازار سے آیا کرتا تھا کہ میری والدہ یہاں مستقل مقیم نہیں تھیں اور مدرسہ کا مطبخ اس وقت تک جاری نہیں ہوا تھا، قرب وجوار میں کوئی طباخ کی دُکان بھی نہیں تھی جامع مسجد کے بازار میں مسجد کے سامنے محمد اسماعیل نامی طباخ کے یہاں سے کھانا آتا تھا جو شام کو مدرسہ آتے آتے بالکل جم جاتا تھا، میرے والد صاحب سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے قریب حمام سے باہر رکھ دیتے تھے اور جب نیم گرم ہو جاتا تو نوش فرما لیا کرتے تھے، اس پر دو تین روپے ہر ماہ چندہ کے نام سے اس دور کی آگ کے انتفاع کی وجہ سے دیا کرتے تھے۔

حضرت گنگوہی کے واقعات

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ اپنے معاملہ میں آپ کا تقویٰ اور احتیاط اس قدر تھا کہ مسئلہ مختلف فیہا میں قول راجح پر اقرب الی الاحتیاط کو اختیار فرمایا کرتے تھے، باوجود ضرورت کے احتیاط کو ہرگز نہیں چھوڑتے تھے، آپ کی احتیاط کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ آپ اپنے امراض میں کیسا ہی شدید مرض کیوں نہ ہوا کبھی بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی، مرض الموت میں جب تک اس قدر حالت رہی کہ دو آدمیوں کے سہارے سے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکے اس وقت تک اسی طرح پڑھی کہ دو آدمیوں نے بمشکل اُٹھایا اور دونوں جانبوں سے کمر میں ہاتھ ڈال کر لے کر کھڑے ہو گئے اور قیام ورکوع وسجود انہیں کے سہارے سے نماز ادا کی، ہر چند خدام نے عرض کیا کہ حضرت بیٹھ کر نماز ادا کر لیجئے مگر نہ کچھ جواب دیا نہ قبول فرمایا، ایک روز مولوی محمد یحییٰ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اگر اس وقت بھی جائز نہیں تو پھر وہ کون سا وقت اور کون سی حالت ہوگی جس میں بیٹھ کر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے، آپ نے فرمایا ''قادر بقدرۃ الغیر تو قادر ہوتا ہے اور جب میرے دوست ایسے ہیں مجھ کو اُٹھا کر نماز پڑھاتے ہیں تو میں کیونکر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں۔'' آخر جب نوبت ضعف اس قدر پہنچ گئی کہ دوسروں کے سہارے بھی کھڑے ہونے کی قدرت نہ رہی تو اس وقت چند وقت کی نمازیں آپ نے بیٹھ کر پڑھیں، گویا بتلا دیا کہ اتباعِ شرع اس کو کہتے ہیں تقویٰ اس کا نام ہے اختیار احوط اسی طرح ہوتا ہے۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۶۴ / ج ۲)

مفتی محمود صاحب نے بروایت اپنے والد صاحب حضرت قطب عالم مولانا گنگوہی کا ایک اور واقعہ بیان فرمایا ''نزول آب کے وقت حضرت سے آنکھ بنوانے کے لیے عرض کیا گیا تو آپ نے انکار فرما دیا۔''

ایک ڈاکٹر صاحب نے وعدہ کیا ''حضرت کی کوئی نماز قضا نہ ہونے دوں گا، فجر اول وقت اور ظہر آخر وقت میں پڑھ لیں، البتہ چند روز تک سجدہ زمین پر نہ فرمائیں، اونچا تکیہ رکھ کر اس پر کر لیں۔''

اس پر ارشاد فرمایا:

''چند دن کی نماز تو بہت ہوتی ہیں، ایک سجدہ بھی اس طرح گوارا نہیں، کسی خادم نے عرض کیا کہ حضرت درس حدیث دیتے تھے اب یہ فیض بند ہو گیا، آنکھ بنوانے سے پھر یہ فیض جاری ہو جائے گا۔''

اس پر ارشاد فرمایا:

''اس میں میرے کسی عمل کو کیا دخل ہے جب تک قدرت نے چاہا جاری رہا جب چاہا بند ہو گیا''

پھر کسی نے عرض کیا کہ حضرت اس میں حرج کیا ہے، فرمایا ''حدیث شریف میں بصارۃ سلب ہونے پر جنت کی بشارت ہے، مجھ کو یہ نعمت ملی ہے میں اس کو کیوں ضائع کروں چنانچہ اخیر تک آنکھ نہ بنوائی۔''

مفتی محمود صاحب نے ایک اور واقعہ بروایت مولوی منفعت علی صاحب وکیل بیان کیا کہ سخت ترین گرمی اور لُو کا زمانہ تھا، رمضان المبارک کا مہینہ تھا حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کی طبیعت ناساز چل رہی تھی پیچش کی شدید تکلیف تھی، حضرت نے کئی روز تک دوا سے افطار پر قناعت کی کوئی غذا نہیں کھائی، جمعہ کا دن آیا، مولوی عبداللہ جان وکیل بھی مدرسہ جمعہ پڑھنے کے لیے آئے انہوں نے دیکھا کہ چہرہ نہایت پژمردہ ہے اور ضعف ونقاہت کے آثار نمایاں ہیں تو یہ حالت دیکھ کر ستون کے پیچھے ہو کر رونے لگے، مولانا حافظ عبداللطیف صاحب (ناظم مدرسہ مظاہر علوم) نے عرض کیا کہ حضرت کا کئی روز سے فاقہ ہے، تکلیف زیادہ ہے، روزہ قضا فرمادیتے آخر فقہاء نے رخصت لکھی ہی ہے اور مولوی عبداللہ تو رو رہے ہیں، حضرت قدس سرہٗ کا چہرہ فوراً متغیر ہو گیا اور فرمایا کہ حافظ صاحب کیسی بات کہتے ہیں، ارے روزہ! اور پھر رمضان کا روزہ، پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ مقلب القلوب ہیں کہ مولوی عبداللہ جان جیسا کوہ وقار انسان بھی متاثر ہو جائے۔

ایسے ہی واقعات کے متعلق میرے اس رسالہ میں اپنے اکابر کے متعلق کئی دفعہ گزر چکا ہے۔

انہیں کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے جو حدیث کا درس اپنے یہاں گنگوہ میں جاری کر رکھا تھا وہ سب توکل پر تھا، چنانچہ وہ درس جب بند ہوا کیونکہ مولانا کی بینائی جاتی رہی تھی تو اس کے بعد جب کبھی باہر سے بڑی بڑی رقمیں آئیں تو مولانا نے سب واپس کر دیں کہ اب درس نہیں رہا، بعض بعض لوگوں نے مولانا کو رائے بھی دی کہ حضرت واپس کیوں کی جائے، صاحب رقم سے کسی دوسرے مصرف خیر کی اجازت لے کر اس میں صرف فرمادیجئے گا، حضرت مولانا نے فرمایا ''میں لوگوں سے کیوں اجازت لیتا پھروں۔''

پھر حضرت حکیم الامت نے فرمایا: ''مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانہ میں گنگوہ کی جامع مسجد تعمیر ہو رہی تھی، لوگوں نے ایک بار نواب محمود علی خان کو بھی لکھوایا انہوں نے مولانا کی خدمت میں تحریر فرمایا کہ آپ اپنے کسی آدمی سے تخمینہ کرا کر مجھ کو مطلع کر دیجئے، حضرت مولانا نے اپنی آزاد مزاجی سے صاف تحریر فرمادیا میرے پاس کوئی آدمی نہیں اگر آپ کو تخمینہ کرانا ہے تو کسی انجینئر کو بھیج کر تخمینہ کرا لیجئے اور انتظام کے لیے اپنا کوئی کارندہ بھیج دیجئے۔''

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''مولانا کا یہی مذاق تھا اور سب مقتداؤں کا یہی ہونا چاہیے۔'' (افاضات: ص ۱۳۶ / ج ۱۰)

مولانا محمد منیر صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کا واقعہ

حضرت مولانا محمد منیر صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، ایک مرتبہ وہ مدرسہ کے ڈھائی سو روپے لے کر مدرسہ کی سالانہ روداد طبع کرانے کے لیے دہلی تشریف لے گئے، اتفاق سے روپے چوری ہو گئے، مولوی صاحب نے اس چوری کی کسی کو اطلاع نہیں کی اور مکان آ کر اپنی کوئی زمین وغیرہ بیع کی اور ڈھائی سو روپے لے کر دہلی پہنچے اور کیفیت چھپوا کر لے آئے، کچھ دنوں بعد اس کی اطلاع اہلِ مدرسہ کو ہوئی، انہوں نے مولانا گنگوہی کو واقعہ لکھا اور حکم شرعی دریافت کیا، وہاں سے جواب آیا کہ مولوی صاحب امین تھے اور روپیہ بلا تعدی کے ضائع ہوا ہے اس لیے ان پر ضمان نہیں، اہلِ مدرسہ نے مولانا محمد منیر صاحب سے درخواست کی کہ آپ روپیہ لے لیجئے اور مولانا کا فتویٰ دکھلا دیا، مولوی صاحب نے فتویٰ دیکھ کر میاں رشید صاحب نے فقہ میرے ہی لیے پڑھا تھا اور کیا یہ مسائل میرے ہی لیے ہیں ذرا اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر تو دیکھیں اگر ان کو ایسا واقعہ پیش آتا تو کیا وہ بھی روپیہ لے لیتے، جاؤ لے جاؤ اس فتویٰ کو، میں ہرگز دو پیسے بھی نہ لوں گا۔

(اورِح ثلاثہ: ص ۴۳۰)

مال وقف میں احتیاط اور اس کے چند واقعات

آپ بیتی نمبر ۱ میں اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد نقل کرا چکا ہوں اور حضرت کا بہت مشہور مقولہ ہے کہ مجھے مدرسہ کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی سے نہیں لگتا، اگر کوئی شخص کسی کے یہاں ملازم ہو وہ مالک سے کام میں کچھ کوتاہی کرے، خیانت کرے، کسی قسم کا نقصان پہنچائے ملازمت سے علیٰحدہ ہوتے ہوئے یا مرتے وقت مالک سے معاف کرا لے تو معاف ہو سکتا ہے، لیکن مدرسوں کا روپیہ جو عام غرباء اور مزدوروں کے دو، دو پیسے، ایک ایک آنے کا چندہ ہوتا ہے، ہم سرپرستان مدرسہ اس کے مالک تو ہیں نہیں امین ہیں اگر اس مال کے اندر افراط وتفریط ہو تو ہم لوگوں کے معاف کرنے سے معاف ہو تو نہیں سکتا، اس لیے کہ دوسرے کے مال میں ہم کو معافی کا کیا حق ہے، اتنا ضرور ہے کہ ہم اگر بمصالح مدرسہ چشم پوشی کریں تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ہم سے درگزر فرمالے لیکن اگر اپنے ذاتی تعلقات سے ہم لوگ تسامح کریں تو ہم بھی جرم کے اندر شریک ہیں، لیکن جرم کرنے والے سے کسی حال میں بھی معاف نہیں ہو سکتا کہ حقوق العباد ہے اور جن کا مال ہے وہ اتنے کثیر کہ ان سے معاف نہیں کرایا جا سکتا۔

آپ بیتی نمبر ۱ میں یہ بھی گزر چکا کہ اپنی جوانی میں اس ناکارہ نے حضرت مولانا الحاج عنایت الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ساری عمر مدرسہ کے ساتھ انتہائی جانفشانی بیک وقت تدریس افتاء تحصیل چندہ شہر اور عدالتی کارروائیوں کے ساتھ کہ جن کے لیے آج کل مستقل چار آدمی کام کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مدرسہ کی دوسری ضروریات بھی انجام فرماتے رہتے تھے اور اپنے ضعف و پیری میں اس قدر معذور ہوگئے کہ گھر سے صبح کو ڈولی میں بیٹھ کر آیا کرتے تھے اور سارے دن مدرسہ کے کاموں میں مشغول رہتے تھے، دوپہر کو کوئی گھر سے کھانا لا دیتا تو دفتر کے کونے میں بیٹھ کر ٹھنڈا ہی کھالیا کرتے، ان تمام امور کے پیش نظر میں نے یہ تحریک کی تھی کہ حضرت مہتمم صاحب کے لیے ان کی حسنِ کارگذاری کے ذیل میں کوئی معمولی سی پنشن مدرسہ سے ہوجائے۔

سب سے پہلے تو ہمارے مدرسہ کے ناظم حضرت مولانا عبدالطیف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے میری تجویز کی مخالفت کی، میں نے گستاخانہ عرض کیا کہ جناب کو یہ وقت پیش آنے والا ہے استاذی حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ایسی نوبت آئی تو میں تو پانوں کی دُکان لے کر دار الطلبہ کے قریب بیٹھ جاؤں گا'' اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سرپرست مدرسہ نے میری تجویز پر تحریر فرمادیا تھا کہ مدرسہ کے موجودہ چندہ سے پنشن دی جاسکتی ہے، مہتمم صاحب کے متعلق تم نے جو لکھا، بالکل صحیح ہے میں ذاتی طور سے خوب واقف ہوں ان کے لیے جو تم مناسب سمجھو تنخواہ تجویز کر کے مخصوص احباب سے چندہ مقرر کرالو، پانچ روپے ماہانہ میں اپنی ذات سے دوں گا مال وقف کے سلسلہ میں اس نوع کے بہت سے واقعات آپ بیتی نمبر ۱ میں گزرے ہیں، خود حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے حالات زندگی میں بھی اس قسم کے بہت سے واقعات بہت ہی کثرت سے ملتے ہیں، اشرف السوانح میں لکھا ہے کہ حضرت والا کی خصوصیات خاصہ میں سے یہ ہے کہ اگر کبھی تھوڑا سا بھی مسجد کا گرم پانی وضو سے بچ جاتا تو اس کو بھی وہ سقاوہ ہی میں جا کر ڈال آتے ہیں تاکہ مسجد کا اتنا سا مال بھی ضائع نہ جائے۔ (اشرف السوانح: ص ۲۳۸، ج ۲)

دوسری جگہ لکھا ہے کہ اگر منی آرڈر کے کوپن پر کوئی مضمون نہیں ہوتا یا مبہم مضمون ہوتا ہے جس سے بھیجی ہوئی رقم کا مصرف یا اور کوئی ضروری جزء صاف طور پر واضح نہیں ہوتا تو حضرت والا اس کو واپس فرمادیتے ہیں اور اس پر سبب واپسی بھی تحریر فرمادیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوپن میں یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اس رقم کے متعلق جداگانہ عریضہ بھیجا جارہا ہے تب بھی واپس فرمادیتے ہیں۔ کیونکہ اگر خط کے انتظار میں رقم وصول کرلی گئی اور پھر خط کے مضمون کو پڑھ کر وہ رقم قابلِ واپسی سمجھی گئی تو پھر علاوہ امانت رکھنے کی ذمہ داری کے واپسی میں بڑی دقت اور مزید صرفہ ہے پہلے حضرت والا رقم وصول فرما کر خط کا انتظار فرمایا کرتے تھے لیکن جب اس میں گوناگوں خلجانات پیش آئے

تب واپسی کا معمول مقرر فرمالیا۔ (اشرف السوانح: ص ۲۳۸ رج ۲)

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے اس قانون پر عمل کرانے کو تو میرا بھی بہت جی چاہتا ہے، بعض دفعہ لوگ منی آرڈر بھیج دیتے ہیں اللہ کے بندے کوپن میں کچھ نہیں لکھتے اور بعض کو پنوں پر یہی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ خط آرہا ہے اور وہ نہیں پہنچتا تو اس امانت کی حفاظت میں بہت دقتیں اُٹھانی پڑتیں ہیں کئی کئی مرتبہ جوابی خط لکھنے پڑتے ہیں اور ان کا بھی مرسل کی مصالح سے جواب نہیں ملتا، بعض مرتبہ ایک سال بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ رقم مدرسہ کی تھی اور چونکہ تبلیغی احباب بھی یہاں کثرت سے آتے رہتے تھے اس لیے اتنے ان کے منی آرڈروں کی تحقیق کی جائے، مرسل الیہ اپنے تبلیغی سفروں میں آگے چلے جاتے ہیں جن کو پہنچانے میں بڑی دقت اٹھانی پڑتی ہے، لوگ منی آرڈر واپس کردینے پر ناراضی کا اظہار تو کرتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے ذرا سے تساہل پر کہ وہ کوپن پر تفصیل نہیں لکھتے، ہم لوگوں کو کتنی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں، حضرات تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں تو جو حضرت کی سوانح اور دوسرے رسائل میں کثرت سے ذکر کیے گئے ہیں، ایک واقعہ میں چونکہ اس ناکارہ کی بھی شرکت ہے اس کو ضرور لکھواتا ہوں۔

افاضاتِ یومیہ میں لکھا ہے کہ والد مرحوم نے چار نکاح کیے اس وقت عام دستور تھا، معافی مہر کا، اس لیے اس طرف کبھی التفات نہیں ہوا، مگر ایک بار دفعۃً تنبہ ہوا اور اس عام عادت پر قناعت نہ ہوئی، اس بناء پر میرے حصہ پر شرعی مسئلہ کی رو سے جو رقم بیٹھی تھی اس کو تقسیم کرنے کا انتظام کیا، اس لیے کہ وہ جائیداد تو والد صاحب کی ہم ہی لوگوں کو پہنچی، اسی ترکہ میں یہ دین مہر بھی ہونا چاہیے اس لیے فرائض صرف مناسخہ کی اجرت میں مجھ کو چودہ روپے دینے پڑے اور تقریباً سال بھر کے عرصہ میں ورثاء کی تحقیق کی، کوئی مکہ معظمہ ہے کوئی مدینہ منورہ میں، کوئی کلکتہ میں، کوئی لاہور میں، غرض الحمد اللہ بعد تحقیق سب کو رقمیں پہنچادی گئیں، غالباً آٹھ سو روپیہ سے کچھ کم یا زائد میرے حصہ پر رقم بیٹھی جس میں سے صرف دو جگہ باقی ہیں، جہاں ابھی رقمیں پہنچیں، بمبئی اور مکہ معظمہ (جو بعد میں وہاں بھی پہنچ گئی، جامع) ورثاء کے حصص میں بعض بیچاروں کے حصہ پر ایک ہی پیسہ آیا، بعض کے حصہ پر دو ہی پیسے آئے کاندھلہ میں بڑے بڑے معزز متمول لوگ ہیں، بعض کے حصہ پر قلیل پیسے آئے، مگر میری درخواست پر کسی نے قبول کرنے سے انکار نہیں کیا مجھ کو بڑی ہی مسرت ہوئی کہ انہوں نے قبول فرمایا، اس خیال سے نہ تو معاف کیا کہ میری دل آزاری اور دل شکنی ہوگی، ما شاء اللہ کیا ٹھکانہ ہے ان کی سمجھ کا اور شرافت کا۔

افاضات ۲/۷ ص ۳۴۶ میں نے اس ملفوظ کے شروع میں ایک لفظ لکھوایا کہ اس واقعہ میں میری بھی شرکت ہے، اس کی شرح یہ ہے کہ حضرت قدس سرہٗ نے کاندھلہ کے ورثاء کی رقم کی تقسیم اس

ناکارہ کے حوالہ کی خود ہی کاندھلہ محض اسی کام سے گیا تھا، دو تین دن قیام کیا اور سب حضرات سے وصول کے دستخط لے کر اصل کاغذ تو حضرت کی خدمت میں بھیج دیا، لیکن اس تقسیم کے کارڈ کے ساتھ جو والا نامہ میرے نام آیا تھا، اس میں فرمایا تھا کہ بہت اہم تکلیف دیتا ہوں، حرج تو ہوگا، وہ والا نامہ میرے کاغذات میں کہیں ہوگا، اس ناکارہ کے حصہ میں جہاں تک یاد ہے دو پیسے آئے تھے، یہ ناکارہ اپنے اکابر کی شان میں بہت ہی گستاخ رہا، اللہ تعالیٰ ہی معاف فرمائے، ایک دفعہ اس سیہ کار نے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ سے عرض کیا کہ آپ کی جلالتِ شان کی وجہ سے کوئی کہہ سکے یا نہ کہہ سکے لیکن مدرسہ کی تنخواہ کے ساتھ یہ اسفار کی کثرت بہت سوں کے لیے موجب اشکال ہے۔ حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے وہ شرائط نامہ جو مولانا انور شاہ صاحب کی تشریف بری اور حضرت شیخ الاسلام کی دار العلوم میں ابتدائی تقرر کے وقت طے ہوا تھا، مجھے مرحمت فرمایا کہ آپ اسے پڑھ لیجئے، اس میں تو واقعی اتنی وسعت تھی کہ حضرت قدس سرہٗ کے اسفار اس کے مقابلہ میں بہت کم ہوتے تھے جتنی ممبران کی طرف سے حضرت کو اجازت دی گئی، وہ وقت ہی ایسا تھا کہ دار العلوم کی موت وحیات حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی آمد پر موقوف تھی، کانگریسی اخبارات اور رسائل جو دار العلوم کی مخالفت میں بہت زوروں پر تھے، حضرت شیخ الاسلام کی تشریف آوری پر ایسے ساکت ہوئے کہ پھر کوئی مخالفت کی زوردار آواز نہیں نکلی، البتہ بعض حضرت کے مخالفین کی طرف سے چندہ کی کمی وغیرہ کے الزامات قائم کیے گئے مگر حضرت قدس سرہٗ نے دار العلوم کے چندہ میں جو مساعی جمیلہ اس وقت فرمائی ہیں، وہ اس ناکارہ کو خوب معلوم ہیں، ہر سفر میں بڑی بڑی رقمیں حضرت لے کر آتے تھے اور دار العلوم میں غلہ اسکیم کے سالانہ جلسہ کی بنیاد بھی حضرت نور اللہ مرقدہٗ ہی نے ڈالی تھی۔

اس سیہ کار نے ایک مرتبہ اپنے چچا جان قدس سرہٗ سے بھی اپنی گستاخانہ حرکات میں یہ عرض کیا کہ تبلیغ کے سلسلہ میں جو رقوم آتی ہیں وہ تنہا آپ کی رائے پر تقسیم ہوتی ہیں، اس کا کوئی ضابطہ ہونا چاہیے، کوئی معیار ضرور تجویز ہونا چاہیے، میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں تبلیغ کے نام سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا، دینے والوں پر اصرار کرتا ہوں کہ تم اپنی رائے اور اپنے ہاتھ سے خرچ کرو اور مشورہ مجھ سے کرو، لیکن جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ رقم تمہاری ذاتی رائے پر ہے، چاہے اپنے اوپر خرچ کرو اہل وعیال پر چاہے کسی مبلغ پر ایسی رقم میں قبول کرتا ہوں، اس کے لیے کسی ضابطہ کی ضرورت نہیں، میں نے عرض کیا کہ میرا اشکال تو ختم ہو گیا، چونکہ یہ ناکارہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ہر مشورہ میں شریک رہتا تھا اور بعض قدیم لوگوں کو کم ملتا تھا اور مؤلفۃ القلوب کو زیادہ، اس لیے اس سیہ کار کو اشکال پیش آیا تھا۔

فصل نمبر ١١

اُمراء کے ساتھ تعلق

امراء کے ساتھ تعلق بھی میرے اکابر کا بہت ہی عجیب اور قابل اقتداء رہا، تملق اور تعلق میں ایسا بین فرق محسوس ہوتا تھا، جس کو ہر شخص ذرا سے تامل سے سمجھ لیتا تھا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں امراء سے تعلق کو منع نہیں کرتا تملق کو منع کرتا ہوں علماء کو خصوصیت کے ساتھ اسی سے اجتناب کی ضرورت ہے اور یہ اس وجہ سے کہ دین اور اہل دین کی تحقیر نہ ہو۔

(افاضات: ٦/٢ص ٤١٦)

میرے رسائل میں سے کسی رسالہ میں مالداروں کی طرف ان کے مال کی وجہ سے اور لالچ کی وجہ سے جھکنے کی وعیدیں بھی گزر چکی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے جو بروایتِ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نقل کیا گیا ہے ''جو شخص کسی غنی کے سامنے جھکے یا اس کے سامنے اپنے نفس کو ذلیل کرے، اس کی بڑائی کی وجہ سے یا اس کے مال میں طمع کی وجہ سے تو دو ثلث مروت (دینی وقار) جاتی رہتی ہے اور نصف دین بھی جاتا رہتا ہے''۔ایک دوسری روایت میں آیا ہے ''جو کسی غنی کے پاس جائے اور اس کے سامنے ذلت کا اظہار کرے تو اس کے دین کا دو حصہ جاتا رہتا ہے''۔ایک اور حدیث میں آیا ہے ''جو کسی غنی کے سامنے اس کے لیے جھکے کہ اس کے مال سے کچھ پہنچے تو اس نے اللہ کو ناراض کیا''۔ایک اور حدیث میں آیا ہے:

''جو کسی غنی کے سامنے اس لیے جھکے کہ اس کے زائد مال کو حاصل کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعمالِ حسنہ کو ضائع فرما دیتے ہیں''۔ان اخیر کی دونوں حدیثوں کو لوگوں نے ضعیف بتایا ہے، بلکہ علامہ ابنِ جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو موضوع بتایا ہے مگر پہلی روایت سے ان کو تقویت حاصل ہے اس لیے معنی میں کوئی اشکال نہیں، الفاظ حدیث میں کلام ہوسکتا ہے، علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں ان روایات کو مع حوالہ کتب نقل کیا ہے۔

حضرت حکیم الامت کا ارشاد امراء کے پاس اپنی حاجت لے جانا خلافِ شان عالم ہے یہ بہت ظاہر ہے لیکن اپنے آپ کو اتنا ان سے کھینچنا کہ باوجود اصرار اور قدر دانی اور علم کی حق شناسی کے کبھی ان کی فرمائش پوری نہ کرنا یہ بھی محمود نہیں یہ دعویٰ تقدس اور تکبر ہے جس میں بہت سے علماء مبتلا ہیں۔

محققین کا قول ہے ''نعم الامیر علیٰ باب الفقیر و بئس الفقیر علیٰ باب الامیر''

اسی کے متعلق حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے ''جب امیر تمہارے دروازے پر آئے تو اس کی عزت کرو، وہ اس وقت صرف امیر نہیں نعم الامیر ہے اس کے نعم کی تعظیم ہے، ہاں یہ درست ہے کہ ان سے اپنی کوئی حاجت نہ مانگے''۔ (مجالس الحکمۃ :ص ۵۵)

حضرت حکیم الامت نے جو اپنی ضرورت پیش کرنے کے متعلق لکھا ہے وہ اہم ہے، اپنی ذاتی اغراض مراد ہیں دینی ضرورت یا دینی مصلحت سے ملاقات تو اس میں وہ داخل نہیں، خود حکیم الامت اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ امراء سے ملنا قبیح لغیرہ ہے یعنی خوشامد اور سکوت عن الحق اور مداہنت فی الدین اور اشتغال لا یعنی اور حب مال وجاہ اور احتیاج الی غیر اللہ وغیرہ کو مستلزم ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے اور اگر یہ مفاسد نہ ہوں خواہ امیر کی طرف سے کہ وہ دیندار اور ان مفاسد سے پرہیزگار ہو یا جانے والے کی طرف سے کہ وہ اس قدر قوی النفس ہو کہ ان مفاسد سے بچ سکے یا اور کسی وجہ سے ان بلیات سے حفاظت ہو سکے تو کچھ حرج نہیں اور اگر کوئی ضرورت دینی ہو کہ خود امیر کی اصلاح کی امید ہو یا اور کوئی ایسی ہی ضرورت دینی داعی ہو تو امیر کے پاس جانا مستحسن ہے، یہاں سے بہت سے اہل اللہ کے متعلق شبہات رفع ہو جاتے ہیں جن سے امراء سے ملنا ثابت ہے۔ (مجالس الحکمۃ :ص ۵۵)

حضرت شاہ اسحاق کا واقعہ

استاذ الاساتذہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق اورح ثلاثہ میں لکھا ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے ایک رزیڈینٹ ملنے آیا کرتا تھا، شاہ صاحب اس کے لیے مونڈھا بچھوا دیتے تھے جو نذرانہ پیش کرتا تھا، شاہ صاحب موسم کا کوئی پھل اس کے پاس بھجوا دیتے تھے جب شاہ صاحب کی وفات ہوگئی تو سب نے مل کر صدر حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو مقرر کیا اور ان کو نذرانہ دیتے تھے حتیٰ کہ سید صاحب بھی جلالت قدر نذر پیش فرماتے، شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مدرسہ میں پڑھا رہے تھے کہ رزیڈینٹ آیا لیکن شاہ صاحب نے اس کو نہ دیکھا نہ ان کی مجلس میں کوئی تغیر آیا، شاہ صاحب ہمیشہ نگاہ نیچی رکھتے تھے، بعض کو تمنا تھی کہ شاہ صاحب کی آنکھیں جو بہت خوبصورت تھی دیکھیں مگر تمام عمر نہ دیکھ سکے، غرض رزیڈینٹ مدرسہ میں آیا اور ٹہلتا رہا، جب درس ختم ہوا تو شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس بوجہ پتلون کے ٹانگ پھیلا کر وہیں چٹائی پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر میں رخصت ہونے لگا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے، شاہ صاحب مرحوم آپ کے لیے کچھ ہدیہ بھجوایا کرتے تھے، مگر میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں کہ بھجواتا، جب رزیڈینٹ چلا گیا تو بعض مسلمانوں ہی نے یہ کہہ کر شاہ صاحب کی

طرف سے بدظن اور مشتعل کرنا چاہا کہ دیکھئے وہ حضرت سے کیسی بے التفاتی سے پیش آئے وہ متکبر ہو گئے ہیں، اس پر ریذیڈینٹ نے اسے ڈانٹا کہا خاموش، میں اس شاہ صاحب کا امتحان لینے گیا تھا کہ وہ اتنی دنیا پر بیٹھ کر دنیا سے کتنا مستغنی ہے حضرت تھانوی حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ دونوں حضرات کے معمول کا تفاوت نیت اور مصالح کے اختلاف سے ہے اور چونکہ مبنیٰ اس دوسرے معمول کا بھی اخلاص پر تھا اس لیے رزیڈینٹ پر اس کا کیسا پسندیدہ اثر پڑا۔

(اورحِ ثلاثہ:ص۱۱۹)

مدرسہ مظاہر علوم میں بھی بسا اوقات کلکٹر وغیرا اپنی انتظامی مصالح سے آتے رہتے تھے، میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ کو کبھی مدرسہ کے دروازے تک یا اس کے اندر آنے پر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے نہیں دیکھا، حضرت مہتمم صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور ان کے ساتھ ایک آدھ مدرس اور منتظم دفتر باہر ہی نمٹ لیتا تھا۔ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کا قصہ مشہور ہے کہ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے سفرِ حجاز سے چھ ماہ قبل سر جیمس مسٹن لفٹیننٹ گورنر ممالک متحدہ دارالعلوم میں رونق افروز ہوئے تو حضرت شیخ الہند شریک جلسہ نہ ہوئے اور اپنے مکان پر رہے۔ (حیات شیخ الہند:ص ۱۵۲)

حضرت حاجی صاحب کا ارشاد

امداد المشتاق میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں ''حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بہت خاطر داری کرتے تھے اور وجہ اس کی یہ فرماتے تھے ''نعم الامیر علی باب الفقیر ''یعنی جو امیر فقیر کے دروازے پر جائے وہ بہت اچھا ہے، پس جو کوئی امیر آپ کے در وازے پر آیا تو اس میں امارت کے ساتھ ایک دوسری صفت بھی پیدا ہوگئی، یعنی نعم کی پس اس صفت کی عظمت کرنی چاہیے۔ لہٰذا بداخلاقی کی اجازت نہیں۔'' (امداد المشتاق:ص ۲۱۷)

حضرت گنگوہی کی شان استغناء اور اس کے چند واقعات

معمولات کی پابندی میں حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا ایک مقولہ نقل کیا گیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت گنگوہی کی اور شان تھی، کوئی بیٹھا ہو جب وقت اشراق کا یا چاشت کا آیا وضو کر کے وہیں نماز پڑھنے کھڑے ہوئے، یہ بھی نہیں کہ کچھ کہہ کر اٹھے کہ میں نماز پڑھ لوں یا اٹھنے کی اجازت لیں، جہاں کھانے کا وقت آیا لکڑی لی اور چل دیے، چاہے کوئی نواب ہی کا بچہ بیٹھا ہو وہاں یہ شان تھی جیسا بادشاہوں کی شان تھی، ایک تو بات ہی کم کرتے تھے اور اگر کچھ مختصر سی بات کہی تو جلدی سے ختم کر کے تسبیح لے کر اس میں

مشغول ہو گئے، کسی نے کوئی بات پوچھی تو جواب دے دیا اور اگر نہ پوچھی تو کوئی گھنٹوں بیٹھا رہے، انہیں کچھ مطلب نہیں۔ (حسن العزیز: ص ٤٩٥ ر ج ١)

یہ بات استغناء سے پیدا ہو سکتی ہے، بہت ہی تجربہ ہوا کہ جہاں بھی استغناء جتنے زور سے ہوا اتنے ہی لوگوں پر ہیبت پائی، حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ اپنے پہلے نکاح کا قصہ یاد یاراں میں تحریر فرماتے ہیں: ''جب اس احقر کا گنگوہ میں نکاح ہوا غالباً ١٢٩٨ھ تھا، والد صاحب مرحوم کی درخواست پر شیخ غلام محی الدین مرحوم رئیس اعظم چھاؤنی میرٹھ کے والد مرحوم ان کی ریاست میں مختار تھے، شادی میں شامل ہونے کے لیے میرٹھ سے تشریف لائے تھے اور گنگوہ بھی تشریف لے گئے تو شیخ غلام محی الدین صاحب مرحوم بھی ساتھ ہو لیے، ایک موقع پر خود احقر سے بیان فرمایا ''میں نے بہت سے بزرگ دیکھے، بڑے بڑے حکام سے ملا اور بات چیت کی، لیکن جو رعب و ہیبت حضرت کی دیکھی کسی میں نہیں دیکھی، یہ حالت تھی کہ بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑتی تھی بڑی مشکل سے اتنی جرأت ہوئی کہ نذر پیش کر سکا'' یہ شیخ صاحب مردم شناسی و عالی حوصلگی میں مسلم ومعروف تھے ان کی یہ شہادت ایک باوقعت شہادت ہے۔'' (یاد یاراں: ص ٥)

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے واقعات

مکاتیب رشید یہ میں ایک گرامی نامہ ہے، ایک رئیس نے حضرت کی خدمت میں آنے کی درخواست پیش کی اور حضرت کے ایک مخلص کو ساتھ لانے کی، ان مخلص نے حضرت سے ان کے ساتھ آنے کی اجازت چاہی، ان کے جواب میں حضرت تحریر فرماتے ہیں حکیم عبدالعزیز خان صاحب السلام علیکم دعاء سے تو دریغ نہیں مگر امراء سے بخدا میرا دل گھبراتا ہے بس وہیں ان کی طمانیت کر دیں، دعاء کرتا ہے، یہاں نہ لائیں، دور دور سے ہی ان کی تسلی رکھیں۔

(مکاتیب: ص ٥٩، ٥٢)

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے مذہب اسلام کا پاس ولحاظ اور کافر و مسلم کا فرق مراتب آپ کی طبعی عادت تھی، ایک مرتبہ عصر کا وقت تھا، حضرت امام ربانی صحن میں چارپائی پر تشریف فرما تھے، سامنے پورب رُخ دوسری چارپائی پڑی تھی، اس پر پائینتی کی طرف آپ کے خادم منشی تفضل حسین صاحب بیٹھے تھے، حضرت تسبیح پڑھ رہے تھے، یکا یک آپ نے منشی صاحب سے خطاب فرمایا'' سرہانے کو بیٹھ جاؤ، یہ تکلف سمجھے اور بالحاظ ادب عرض کیا کہ حضرت آرام سے بیٹھا ہوں، اس پر آپ نے جھڑک کر بتاکید فرمایا کہ سرہانے بیٹھو، اس وقت ان کو تعمیل کرنی پڑی، چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک ہندو ساہوکار آیا، خادم کے سر پر مٹھائی کی تھالی تھی اور شاید کچھ نقد بھی تھا، رئیس جب سامنے آیا

تو اس نے جھک کر سلام کیا اور منتظر رہا کہ بیٹھنے کی اجازت ملے، مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی، وہ کھڑا ہی تھا کہ حضرت نے پوچھا، لالہ تمہاری لڑکی کو آرام ہے؟ اس نے عرض کیا کہ حضور کے صدقہ سے بالکل آرام ہے، اس خوشی میں تھوڑی سی مٹھائی خدام کے لیے لایا ہوں، آپ نے فرمایا اس کی کچھ حاجت نہیں، غرض معلوم نہیں کہ آپ نے واپس فرمادی یا وہیں طلبہ کو بانٹ دی، منشی تفضل حسین صاحب فرماتے ہیں، اس وقت سمجھا کہ پائینتی اس بیٹا کے لیے چھڑوائی گئی تھی۔

(تذکرۃ الرشید:ص۱۷۰رج۲)

تذکرۃ الرشید میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''جب کسی قوم کا سردار تمہارے پاس آئے تو تم اس کا اکرام کیا کرو'' اس لیے حضرت امام ربانی کی خدمت میں اگر مخالفین کی جماعت میں سے کوئی بڑا شخص آتا تو اکرام میں مطلق پہلوتہی نہ فرماتے تھے، مگر باوجود اس کے امر متنازع فیہ میں مداہنت ممکن نہ تھی کہ ذرہ برابر بھی ظاہر ہو۔

ایک مرتبہ مولوی عبدالسمیع صاحب کسی تقریب میں گنگوہ گئے اور حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تو آپ نہایت خلق کے ساتھ ملے اور فرمایا کہ آج کسی وقت کا کھانا میرے یہاں کھائیے حالانکہ یہ زمانہ وہ تھا کہ مولوی صاحب انوار ساطعہ لکھ چکے تھے اور ادھر سے بہ تصدیق امام ربانی اس کا جواب شائع ہو گیا تھا۔ (براہین قاطعہ شائع ہو گیا تھا) پس اب درجہ تھا اکرام ضیف اور اکرام امیر قوم کا سو اس کو آپ نے اس طرح پورا فرمایا۔ چنانچہ مولوی عبدالسمیع صاحب نے دعوت قبول کی اور حضرت کے مہمان بن کر کھانا کھایا۔ حضرت امام ربانی نے ایک مکتوب میں (بنام حضرت نانوتوی) اس دعوت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ میرا خیال تھا کہ بدعات کا زبانی تذکرہ ہوگا اور خوب خوب جواب دوں گا، مگر مہمان نے اشارۃً بھی کوئی لفظ نہیں کہا، سو میزبان کو کیا لازم تھا کہ یہ ذکر نکال کر مناظرہ کی کوفت میں ڈالیں، اب دیکھئے وہاں جا کر براہین کے جواب کی فکر کرتے ہیں یا نہیں، اگر کچھ لکھا تو پھر وہی جواب۔

(تذکرۃ الرشید:ص۱۸۲رج۲)

مفتی محمود صاحب نے بیان فرمایا: ''ایک مرتبہ ایک کلکٹر گنگوہ آیا اور کسی سے یہ خواہش ظاہر کی کہ شاملی کے میدان میں مولانا گنگوہی نے جہاد کیا، میں ان کی زیارت کرنا چاہتا ہوں'' وہ اپنے بنگلہ سے چلا ادھر حضرت اپنی سہ دری سے اُٹھ کر کمرہ میں تشریف لے گئے اور کواڑ بند کر لیے، کلکٹر آیا اور کچھ دیر سہ دری میں بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر چلا گیا، تب حضرت حجرہ سے باہر تشریف لائے، کچھ مدت کے بعد پھر وہی کلکٹر گنگوہ آیا، بعض خدام نے عرض کیا کہ حکومت دارالعلوم کی طرف سے بہت بد ظن ہے، حضرت! کلکٹر سے ملاقات فرمالیں تو دارالعلوم کے لیے مفید ہے اور خطرات سے حفاظت

کی توقع ہے، فرمایا بہت اچھا، پالکی میں سوار ہوئے، کلکٹر کے بنگلہ پر تشریف لے گئے، علماء عصر بھی اس پالکی کو اُٹھا کر لے جانے والے تھے، جب پالکی بنگلہ پر پہنچی تو کلکٹر خود ہی بنگلہ سے باہر آیا، سامنے آکر مصافحہ کے لیے خود ہی ہاتھ بڑھایا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بھی مصافحہ فرمایا، مگر نگاہ نیچی رکھی اُوپر نہیں اُٹھائی اور اس کی صورت نہیں دیکھی، کلکٹر نے کہا ہم کو کچھ نصیحت کرو، حضرت نے فرمایا کہ انصاف کرو، مخلوق پر رحم کرو، یہ کہہ کر پالکی میں سوار ہوئے اور واپس تشریف لے آئے، کلکٹر نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون آدمی تھا؟ ہمارا دل اس کو دیکھ کر کانپ رہا تھا اس کو بتلایا گیا کہ یہ وہی مولانا رشید احمد صاحب ہیں، جن کی زیارت کا آپ کو شوق تھا۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ ایک رئیس کی دینداری کے بہت مداح تھے لیکن کبھی ملے نہیں، حضرت علی گڑھ تشریف رکھتے تھے وہ رئیس صاحب ملنے کے لیے آئے جب سنا کہ وہ آرہے ہیں تو علی گڑھ چھوڑ کر چلے گئے ملے نہیں، حضرت مولانا گنگوہی عمر بھر کسی امیر کے دروازے پر نہیں گئے عرض کیا گیا (کسی نے حضرت تھانوی سے عرض کیا) کہ وہ رئیس صاحب تو طالب دین ہو کر آرہے تھے، پھر بھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اعراض فرمایا۔ فرمایا کہ ہر بزرگ کی جدا شان ہوتی ہے، طبائع مختلف ہوتی ہیں حضرت مولانا کی طبیعت ہی ایسی واقع ہوئی تھی کہ ان کو امراء سے انقباض ہوتا تھا تکبر تو بڑا، امیر کو بھی حقیر کیوں سمجھے، لیکن اختلاط بھی کیوں کرے کہیں پھنس ہی جاوے، تو پھر بدخلقی نہ کرے۔ (حسن العزیز: ص ۵۴۰ ج ۱)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے حضرت میں یہ خاص بات تھی کہ وہ جامع مراتب اعتدال تھے نہ متکبر تھے نہ تصنع کے متواضع، سادگی کے ساتھ ان میں استغناء کی شان تھی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کسی دینی ضرورت سے ایک مرتبہ ریاست رامپور تشریف لے گئے، نواب صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا تشریف لائے ہیں، نواب صاحب نے مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لانے کی درخواست کی مگر مولانا تشریف نہیں لے گئے اور یہ عذر فرمایا کہ ہم دیہات کے رہنے والے ہیں، آداب شاہی سے ناواقف نہ معلوم ہم سے کیا گڑبڑ ہو جائے جو آداب شاہی کے خلاف ہو اس لیے مناسب نہیں، نواب صاحب نے جواب میں کہلا کر بھیجا کہ آپ تشریف لائیں آپ سے آداب کون چاہتا ہے، ہم خود آپ کا ادب کریں گے، ملنے کا بہت اشتیاق ہے، مولانا نے پہلے تو انکسار کا جواب دیا تھا جب اس پر اصرار ہوا پھر ضابطہ کا جواب کہلا کر بھیجا کہ عجیب بات ہے کہ اشتیاق تو آپ کو اور آؤں میں، غرض یہ کہ مولانا تشریف نہیں لے گئے۔

(افاضات: ۱/۶ ص ۵۰)

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ چھتہ کی مسجد میں حجرہ کے سامنے چھپر میں حجامت بنوار ہے تھے کہ شیخ عبدالکریم رئیس لال کرتی میرٹھ، حضرت مولانا سے ملنے کے لیے دیوبند آئے، مولانا نے ان کو دور سے آتے ہوئے دیکھا جب وہ قریب آئے تو ایک تغافل کے ساتھ رخ دوسری طرف پھیرلیا، گویا کہ دیکھا ہی نہیں ہے وہ آکر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے، ان کے ہاتھ میں رومال میں بندھے ہوئے بہت سے روپے تھے، جب انہیں کھڑے ہوئے بہت عرصہ ہوگیا تو حضرت مولانا نے ان کی طرف رخ کر کے فرمایا، آہا! شیخ صاحب ہیں مزاج اچھا ہے؟ انہوں نے سلام عرض کیا اور قدم چوم لیے اور وہ روپیہ بندھا ہوا قدموں میں ڈال دیا، حضرت نے اسے قدموں سے الگ کر دیا، تب انہوں نے ہاتھ باندھ کر بمنت قبول فرمالینے کی درخواست کی، بالآخر بہت سے انکار کے بعد انہوں نے تمام روپیہ حضرت کی جوتیوں میں ڈال دیا، حضرت جب اُٹھے تو نہایت استغناء کے ساتھ جوتے جھاڑے اور روپیہ سب زمین پر گر گیا، حضرت نے جوتے پہن لیے اور حافظ انوارالحق صاحب سے ہنس کر فرمایا کہ حافظ جی! ہم بھی دنیا کماتے ہیں اور اہل دنیا بھی کماتے ہیں، فرق یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھکراتے ہیں اور وہ قدموں میں پڑتی ہے اور دنیا دار اس کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ انہیں ٹھکراتی ہے یہ فرمایا اور روپیہ وہیں تقسیم فرمادیا۔

(اورِح ثلاثہ: ص ۲۶۴)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ جب مرادآباد تشریف لے جاتے تو نواب محمود علی خان صاحب کی بہت آرزو اور تمنا تھی کہ ایک مرتبہ مولوی محمد یعقوب صاحب چھتاری تشریف لاویں، مولانا نے فرمایا کہ ہم نے سنا ہے کہ جو مولوی نواب صاحب کے یہاں جاتا ہے نواب صاحب اس کو سو روپے دیتے ہیں وہ خود بلاتے ہیں اس لیے شاید دو سو روپے دے دیں، سو، دو سو روپے ہمارے کتنے دن کے، ہم وہاں جاکر مولویت کے نام کو دھبہ نہ لگاویں گے۔

(ارواح ثلاثہ: ص ۳۱۷)

حضرت سہارنپوری کے واقعات

تذکرۃ الخلیل میں حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق لکھا ہے کہ بمبئی میں حج کو جاتے وقت ایک سیٹھ صاحب نے آپ کی خدمت میں سو روپے ملازم کے ہاتھ بھیجے کہ مجھے حاضری کی فرصت نہیں۔ اس لیے روپیہ آدمی کے ساتھ بھیجتا ہوں قبول فرمادیں آپ نے واپس فرمادیا کہ بحمد اللہ مجھے ضرورت نہیں آخر وہ خود آیا اور معذرت کی۔ تب آپ نے قبول کیا۔ اگر کسی غریب کا ہدیہ ہوتا تو آپ اس کی بڑی عظمت فرماتے اور ایسے قبول فرماتے تھے گویا اس کے محتاج ہوں۔

ایک شخص نے ٹوپی پیش کی جو شاید آٹھ آنے سے زائد کی نہ ہوگی۔ آپ نے مسکرا کر اس کو لے لیا اور اسی وقت اوڑھ کر اپنی ٹوپی کو بکس میں رکھوا دیا۔ (تذکرۃ الخلیل: ص۳۶۳)

آپ کسی تقریب نکاح میں میرٹھ تشریف لائے۔ لڑکے والوں نے درخواست کی کہ تبرکاً دولہا کو کپڑے حضرت پہناویں۔ آپ وہاں تشریف لے گئے جہاں دولہا غسل کے بعد کپڑے پہننے کا منتظر کھڑا تھا۔ بندہ بھی (مولانا عاشق الٰہی) حضرت کے ساتھ تھا۔ کرتا پاجامہ تو آپ نے اٹھا کر دے دیا۔ اچکن کا نمبر آیا تو آپ نے کہا کیا ریشم کی ہے؟ میں نے غور سے دیکھ کر عرض کی۔ جی حضرت ریشم ہی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اس کو رکھ دیا اور فرمایا اس کا پہننا اور پہنانا بھی حرام ہے۔ پھر ٹوپی دیکھی تو وہ بھی مغرق۔ اس پر حضرت نے تیز لہجہ میں فرمایا یہ بھی حرام ہے۔ لڑکے والے کچھ محتاط نہ تھے۔ انہوں نے حضرت کے انکار کی پرواہ نہ کی خود اٹھا کر دولہا کو پہنا دی۔ حضرت کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا تحمل فرمایا اور مجھ سے یہ کہہ کر ''چلو'' وہاں سے واپس آ گئے۔ آپ قیام گاہ پر تشریف نہیں لائے بلکہ رنج وقلق کے ساتھ حاجی وجیہ الدین صاحب مرحوم کے مکان پر تشریف لے گئے۔ فرمایا یہ کیا تعلق ہے۔ معصیت میں شریک کرنے کو بلاتے ہیں اس نکاح میں شریک ہونے والے سب گنہگار رہوں گے جہاں دولہا حرام لباس پہنے بیٹھا ہو کہ کوئی عامل ہو کوئی اس پر راضی، یہ سن کر سب میں ہلچل مچ گئی کہ برادری کا تھا اور حضرت کے ساتھ کئی لوگوں کا تعلق تھا۔ نہ حضرت کو چھوڑ سکے نہ برادری کو۔ دوڑے ہوئے گئے کہ کسی طرح دولہا کے کپڑے بدلوادیں، مگر بہیترے تھے جن کو نہ حضرت سے تعلق تھا نہ اتباع شریعت کا اہتمام۔ اس لیے وہ تبدیل لباس کو نحوست اور بدشگونی سمجھتے اور کہتے تھے کہ جو دولہن کے یہاں سے جوڑا آیا ہے وہی پہننا ضروری ہے مگر یہ دوڑ دھوپ کرنے والے سربرآوردہ اور مدبر تھے آخر کامیاب ہوئے اور حاجی وجیہ الدین صاحب مصری کپڑے کی بیش قیمت اپنی اچکن نکال کر جلدی سے پہنچے کہا کہ اس سے بہتر تو اچکن دولہا، کو ہندوستان میں بھی کہیں نصیب نہ ہوگا۔ وہ پہنا کر اور ٹوپی کی بجائے عمامہ بندھوا کر حضرت کے سامنے لے آئے کہ حضرت اب تو تشریف لے چلیں۔ اس وقت آپ اٹھے اور شریک عقد ہوئے۔

ایسا ہی ایک قصہ دہلی میں پیش آیا تو اس میں بھی حضرت نے دولہا کا لباس حرام ہونے کی وجہ سے نکاح میں شرکت نہیں فرمائی۔ حکیم جمیل الدین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مطب میں تشریف لا کر بیٹھ گئے اور حضرت نے کمال تاثر سے فرمایا کہ ہم لوگ اسی لیے امراء کی تقریبات میں شرکت کے قابل نہیں ہیں۔

ہم جیسے ضعفاء کے لیے بھی امراء کی تقریبات میں شرکت کے لیے یہ چیز بہت مانع ہوتی ہے کہ

نہ حضرت قدس سرہٗ جیسی صاف گوئی اور جرأت اپنے میں پاتے ہیں اور نہ اپنی ایسی حیثیت ہے کہ ناراضی سے دوسروں پر کوئی اثر پڑے، اسی لیے عدم شرکت ہی کو اہون سمجھتے ہیں اور دعاء گوئی پر قناعت کرتے ہیں۔

مولانا میرٹھی دوسری جگہ لکھتے ہیں اور بالکل صحیح لکھا، اس ناکارہ نے بھی اس پر اکثر غور کیا کہ بیعت کرنے پر حضرت کی خدمت میں اگر نذر پیش کی گئی تو حضرت نے کبھی قبول نہیں فرمائی کہ صورتاً یہ توبہ کرانے کا معاوضہ بن جاتا ہے اور اس رسم کے مشابہ ہے جو آج کل دنیادار پیروں میں چل پڑی ہے۔ ہاں اس کے بعد انس ومحبت کا تعلق پیدا ہوکر اگر کوئی قلیل سے قلیل ہدیہ بھی پیش کرتا تو مسنون طریقہ پر آپ اسے بخوشی قبول فرماتے۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۱۶۸)

یہ ناکارہ آپ بیتی میں کسی جگہ لکھوا چکا ہے کہ میرے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا معمول حجاز میں چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑے ہدیہ قبول فرمانے کا نہیں تھا۔ اول تو یہ ہدیہ دینے والے پر اصرار کرتے کہ یہاں کے لوگ ہدیہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے میری ضرورت سے زائد دے رکھا ہے۔ اگر اس پر کوئی شدید اصرار کرتا تو قبول فرما کر دس روپے سے زائد کی رقم تو کسی کو اہلِ حرمین میں سے دے دیتے، معلم اس کے بچوں کو بھی، حضرت قدس سرہٗ نے علاوہ ان کے حقوق لازمہ کے بڑی بڑی رقمیں جو کہیں سے آئی ہوتی تھی اسی طرح دوسرے اکابر اور مشائخ کو بہت جلد مرحمت فرما دیتے تھے اپنے پاس نہیں رکھتے تھے اور دس روپے سے کم کا ہدیہ ہوتا تو وہ اسی وقت اس ناکارہ کے حوالے ہوجاتا کہ یہاں کے دکاندار سے کوئی چیز خرید لاؤں، یہ ناکارہ اکثر انگور یا اس قسم کی چیزیں خرید کر لے آتا جو مجمع کے ساتھ حضرت بھی نوش فرماتے اور خدام کے تو مزے ہوتے ہی ہیں۔

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے واقعات

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دیوبندی میں علاوہ اور کمالات کے ایک عجیب بات تھی کہ امراء سے ذرہ برابر دلچسپی نہ تھی جب تک کوئی امیر پاس بیٹھا رہتا اس وقت تک حضرت کے قلب پر انقباض رہتا ورنہ اکثر علماء میں کچھ نہ کچھ مدارت امراء کی ضرور ہوتی ہے۔ امیر شاہ خان صاحب راوی ہیں کہ نواب یوسف علی خان صاحب کو میں بعضے بزرگوں کی طرف زیادہ متوجہ کرتا تھا مگر ان کو حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ میلان تھا۔ میں

نے ایک روز نواب صاحب سے دریافت کیا کہ میں آپ کو اور بزرگوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں اور تم حضرت مولانا دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہو اس کی خاص وجہ کیا ہے۔

نواب صاحب نے ایک عجیب بات فرمائی کہ اور جگہ جو میں جاتا ہوں تو میرے جانے سے خوش ہوتے ہیں بہت زیادہ خاطر تواضع کرتے ہیں مدارت کرتے ہیں اور مولانا دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس جاتا ہوں تو مولانا مجھ سے طبعاً ایسی نفرت کرتے ہیں جیسے کسی کو ماس سے گند آتی ہو تو اس سے یہ سمجھتا ہوں کہ وہاں دین ہے اور خالص دین ہے دنیا بالکل نہیں۔ اسی وجہ سے میں مولانا کا زیادہ معتقد ہوں۔ عجیب بات فرمائی۔ نواب کیا تھے درویش تھے بلکہ یہ بات تو ان میں بھی نہیں جو مدعی صوفیت کے ہیں۔ (اضافات: ۱/۷ص ۵۰)

اروحِ ثلاثہ میں امیر الروایات سے نقل کیا ہے کہ جب نواب محمود علی خان صاحب کا انتقال ہوا تو حضرات دیوبند کا ارادہ ہوا کہ وہ نواب کی تعزیت کے لیے چھتاری آئیں اور انہوں نے مولوی محمود حسن صاحب پر بھی زور دیا کہ تم بھی چلو۔ مولوی محمود حسن صاحب نے مجھے (امیر شاہ خان) خفیہ جوابی خط لکھا اور لکھا کہ تم اپنی اصلی رائے لکھو کہ میں آؤں یا نہ آؤں اور لکھا کہ اس کا جواب دھلی کے فلاں شخص کے نام بھیجنا اور جواب مجمل لکھنا۔ میں نے لکھ دیا کہ نہ آئیے اس پر مولوی صاحب نے دستوں کی گولیاں کھالیں اور اصرار کرنے والوں سے بیماری کا عذر کر دیا۔

(ارواح ثلاثہ: ص ۳۷۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک مدرسہ کے مہتمم نے عرض کیا کہ حضرت ضرورت ہوتی ہے مدارس میں چندہ کی اور چندہ مانگنے میں ذلت ہے تو کیا صورت کی جائے۔ فرمایا غریبوں سے مانگو کچھ ذلت نہیں (از جامع وہ جو کچھ دیں گے نہایت خلوص اور تواضع سے دیں گے اور اس میں برکت بھی ہوگی۔) اور مال داروں تو بیچارے تنگ ہوتے ہیں۔ پانچ سو کی آمدنی ہے اور چھ سو کا خرچ ہے یہ تو رحم کے قابل ہیں (از جامع اور اگر کچھ دے بھی دیا تو محصل کو ذلیل اور خود کو بڑا سمجھ کر دیں گے)۔ (اروحِ ثلاثہ: ص ۳۸۱)

حضرت تھانوی کے واقعات

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد ہے کہ خلوص بڑی چیز ہے اور یہ اکثر غرباء میں ہوتا ہے اور امراء میں فلوس تو ہوتا ہے مگر خلوص نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ، ایک غریب شخص نے مجھ کو (حضرت حکیم الامۃ) ایک اکنی دے کر کہا کہ ایک پیسہ دینا چاہتا ہوں، تین پیسے واپس کر دو۔ میں نے ایسا ہی کیا، بھلا اس میں کیا ریاء ہو سکتی ہے، سو غرباء سے ہمیشہ میرا یہ معاملہ رہا ہے۔ محض ان کے خلوص کی وجہ

سے اور امراء کے ساتھ دوسرا معاملہ ہوتا ہے۔

چنانچہ نواب ڈھاکہ سلیم خان صاحب نے مجھ کو مدعو کیا میں نے چند شرائط پیش کیں۔ منجملہ اور شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مجھ کو کچھ دیا نہ جائے۔ سب شرائط طے ہوگئیں، میں ڈھاکہ پہنچا نواب صاحب نے ایک روز درخواست کی کہ میری دو لڑکیاں ہے ان کو بسم اللہ کرا دیجئے اور یہ بھی کہا کہ ہمارا خاندانی دستور یہ ہے کہ بسم اللہ شروع کرانے کے وقت کچھ دیا جاتا ہے، اگر نہ دیا جائے یا قبول نہ کیا جائے تو ہماری سبکی ہوگی۔ یہ ترکیب تھی کہ اس بہانے سے مجھ کو نقد دیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی سبکی گوارا نہیں کرسکتا، لیکن اپنی وضع کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا، تو اس کی صورت یہ ہے کہ میں جلوت میں تو آپ کا عطیہ لے لوں گا اور خلوت میں واپس کردوں گا اور عمر بھر واپسی کا کسی سے ذکر نہ کروں گا، مگر اپنے دل میں تو خوش ہوں گا کہ میں نے اپنے مسلک اور مشرب کے خلاف نہیں کیا۔ بس چپ رہ گئے اور رقعہ لکھا کہ میری غلطی تھی۔ اب میں آپ کی وضع پر اپنی تجویز کو نثار کرتا ہوں اور اس سے یہاں تک ان کا اعتقاد بڑھا کہ لوگوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ جس نے صحابہ کو نہیں دیکھا وہ تھانہ بھون جا کر دیکھ لے اور یہ سب ذرا سے نسخہ کی بدولت ہے۔

(افاضات: ص ۲۷۴)

ایک اور واقعہ یاد آیا نواب جمشید علی خان صاحب نے باغپت بلایا تھا، اس وقت ان سے ملاقات نہ ہوتی تھی۔ میں نے شرط کرلی تھی کچھ لوں گا نہیں۔ مگر گھر میں ان کی والدہ صاحبہ نے بلا لیا۔ یہ بی بی حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت ہیں۔ سو (۱۰۰) روپے دینے چاہیے۔ میں نے عذر کردیا کہ خلافِ شرط ہے۔ امراء کے ساتھ ضابطہ کا برتاؤ مناسب ہے جب تک بے تکلفی اور خلوص کا اطمینان نہ ہوجائے۔ چنانچہ اس کے بعد موصوف کے تمام خاندن سے ایسا ہی تعلق ہوگیا اور برتاؤ بھی بدل گیا۔ (افاضات: ۸/۲ ص ۲۷۵)

ایک مرتبہ فرمایا کہ امراء سے از خود تعلق نہیں پیدا ہوتا، اگر وہ خود تعلق پیدا کریں تو اعراض بھی نہیں کرتا۔ اگر ان سے تعلق کی ابتداء کی جائے یوں خیال ہوتا ہے کہ کسی غرض سے ہم سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ غریبوں سے اگر شیریں کلامی سے بول لیے تو نثار ہونے لگتے ہیں۔

(حسن العزیز: ص ۲۱۸ / ج ۱)

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے واقعات افاضات وغیرہ میں بہت کثرت سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان سب کا احاطہ تو اس رسالہ میں مشکل ہے۔ مجھے تو اپنے اکابر کے نمونہ کے طور پر چند واقعات لکھوانے تھے۔ البتہ ایک واقعہ اپنے اکابر ثلاثہ کا جو میں خواب خلیل کے حاشیہ میں لکھوا چکا ہوں۔ خوانِ خلیل میں حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جام نمبر ۱۲ کہ مولانا

رحمہ اللہ تعالیٰ (حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ) میں حضرات سلف کی سی تواضع تھی کہ مسائل و اشکالات علمیہ میں اپنے چھوٹوں سے بھی مشورہ فرما لیتے تھے اور چھوٹوں کی معروضات کو شرح صدر کے بعد قبول فرما لیتے تھے۔ چنانچہ بعض واقعات نمونہ کے طور پر معروض ہیں۔

پہلا واقعہ: ایک بار سفر بھاولپور میں اس احقر سے ارشاد فرمایا ''حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول ہدایا کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ پہلے سے اشرافِ نفس نہ ہو''۔

مگر سفر میں اکثر داعی کی عادت ہوتی ہے کہ مدعو کو کچھ ہدیہ دیتے ہیں اسی عادت کے سبب اکثر خطور بھی ایسے ہدایا کا ذہن میں ہو جاتا ہے سو کیا خطور بھی اشرافِ نفس وانتظار میں داخل ہے جس کے بعد ہدیہ لینا خلافِ سنت ہے، اس حقیر میں کیا قابلیت تھی کہ ایسے عظیم الشان عالم و عارف کے استفسار کا جواب دے سکوں، لیکن چونکہ لہجہ استفسار امر بالجواب پر دال تھا اس لیے الامر فوق الادب کی بناء پر جواب عرض کرنا ضروری تھا، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ میرے خیال میں اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ اس احتمال کے بعد دیکھا جائے کہ اگر وہ احتمال واقعہ نہ ہو تو آیا نفس میں کچھ ناگواری پیدا ہوتی ہے یا نہیں، اگر ناگواری ہو تو اس احتمال کا خطور اشراف نفس ہے اور اگر ناگواری نہ ہو تو اشراف نفس نہیں ہے خالی خطرہ ہے جو احکام میں مؤثر نہیں، اس جواب کو بہت پسند فرمایا اور دعاء دی۔

اس کے ضمیمہ میں بھی اس ناکارہ نے ایک واقعہ بھاولپور کا لکھوایا ہے کہ حضرت مولانا الحاج سر رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جن کا ذکر آپ بیتی میں بار بار آچکا ہے، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے مرید اور میرے جملہ اکابر کے بہت خصوصی تعلق رکھنے والے تھے، بھاولپور کے وزیر اعظم تھے اور نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے موجودہ نواب کی صغر سنی کی بناء پر ان کے اتالیق اور جملہ امور میں نواب صاحب مرحوم کے قائم مقام رہے اور میرے اکابر کے ساتھ خصوصی تعلق کی وجہ سے ان حضرات کی بھی بھاولپور سے تشریف بری ہوتی تھی، ان کا مختصر حال خوان خلیل کے ضمیمہ پر لکھوا چکا ہوں۔

ایک مرتبہ ان کی دعوت پر حضرت اقدس سہارنپوری، حضرت شیخ الہند اور حضرت حکیم الامت نور اللہ مراقدہم تینوں ساتھ ہی بھاولپور تشریف لے گئے اور ساتھ ہی واپس تشریف لائے۔ واپسی پر انہوں نے ہر سہ حضرات کی خدمت میں علی التساوی ایک گرانقدر ہدیہ پیش کیا، شیخین نے تو قبول کر لیا اور حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے چونکہ اشراف نفس ہو گیا تھا، اس لیے قبول سے معذوری ہے اور ان دونوں حضرت کو نہ ہوا ہوگا مولانا رحیم بخش صاحب نے وہ رقم فوراً لے کر اپنی جیب میں رکھ لی اور اشارۃً بھی کوئی لفظ اس کے قبول کرنے کے متعلق نہیں

کہا۔ یہ سب حضرات ان سے رخصت ہوکر ریل میں سوار ہو گئے۔

مولانا رحیم بخش صاحب نے اپنے ایک ملازم کے ذریعہ حضرت حکیم الامت کی رقم ایک لفافہ میں بند کر کے بھیجی اور اس میں پرچہ لکھا کہ حضرت والا نے اشراف نفس کے احتمال سے یہ ناچیز ہدیہ واپس فرمادیا تھا اور اس خاکسار کو حضرت اقدس کی منشاء کے خلاف مکرر درخواست کی جرأت نہیں کی۔ لیکن اب تو حضرت واپس جاچکے اور اشراف کا کوئی احتمال نہیں رہا۔ اس لیے امید ہے کہ اس ناچیز ہدیہ کو قبول فرمالیں گے اور اگر اب بھی کوئی گرانی ہو تو حضرت کے طبع مبارک کے خلاف ذرا اصرار نہیں۔ اس مضمون کا پرچہ لفافہ میں بند کر کے اس نوکر سے کہا کہ جب سات، آٹھ اسٹیشن گزر جائیں تو فلاں جنکشن پر یہ بند لفافہ حضرت کی خدمت میں پیش کر دینا اور پوچھ لینا حضرت اگر کچھ جواب دیں تو لیتے آنا ورنہ چلے آنا، چنانچہ حسبِ ہدایت ملازم نے چند اسٹیشن جا کر وہ لفافہ پیش کیا اور حضرت نے پڑھا اور بہت ہی اظہار مسرت کیا اور فرمایا کہ محبت خود طریقے سکھلا دیتی ہے مجھے تو اس قصہ پر ہمیشہ ایک مصرعہ یاد آتا ہے کہ:

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی

بہر حال حضرت نے قبول فرما کر تحریر فرمایا کہ خدا تعالیٰ آپ کی فہم و ذکاء میں ترقی عطاء فرمائے، واقعی اب مجھے کوئی عذر نہیں۔ (خوان خلیل: ص ۵۶)

حضرت حکیم الامت کے واقعات تو بہت زیادہ مدون ہو چکے ہیں اور کثرت سے شائع ہیں اس لیے ان ہی چند واقعات پر اکتفا کرتا ہوں حضرت کی تصانیف میں بہت کثرت سے اس قسم کے واقعات ملیں گے۔

حضرت حکیم الامت ارشاد فرماتے ہیں کہ ہدیہ لینے میں بعض اوقات ایک تو طبعی انقباض ہوتا ہے اس کا تو ذکر نہیں اور ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ تجربہ کی بناء پر ہدیہ قبول کر کے پچھتانا پڑتا ہے، اس میں انتظام کی ضرورت ہے یہاں ہماری برادری میں ایک صاحب تھے جن کا حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے خادمیت کا تعلق تھا، اس بناء پر مجھ سے بھی محبت کرتے تھے ان کے یہاں کوئی پھل آیا۔ یا کوئی اچھا کھانا پکا۔ میرے لیے بھیج دیتے تھے اور یہاں سے بھی جاتا رہتا تھا مگر کم و بیش کا تفاوت تھا۔

اتفاق سے فرائض کا مسئلہ انہوں نے مجھ سے پوچھا میں نے بتلا دیا وہ ان کے خلاف تھا اور اس میں ان کے فریق مخالف کا نفع تھا اس پر کہا کہ ہم اتنے زمانہ سے خدمت کرتے ہیں مگر جب ہمارے کام کا وقت آیا تو ہماری کچھ رعایت نہ کی۔ دیکھئے کتنی رنج دہ بات ہے۔ اس وجہ سے بعض ہدیہ میں شبہ ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کا بھی یہی انجام نہ ہو اور ہدیہ دے کر کسی رعایت کی توقع تو

نہایت ہی منکر و قبیح ہے مجھ کو تو یہ بھی پسند نہیں کہ ہدیہ دے کر دعاء کے لیے کہا جائے۔ اس لیے کہ ہدیہ تو محض طیب قلب سے تطییب قلب کے لیے ہوتا ہے اس میں اور اغراض کی یا دوسرے مصالح کی آمیزش کیسی۔ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہ شبہ ہو جائے کہ یہ شخص ہم کو غریب سمجھ کر ہدیہ دے رہا ہے لینے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم غریب ہی سہی مگر اس کو کیا حق ہے کہ وہ غریب سمجھ کر دے تو مولانا نے دفع حاجت کی مصلحت کی آمیزش کو پسند نہیں فرمایا اور ایک یہ بھی معمول تھا کہ سفر میں ہدیہ لینا پسند نہ فرماتے تھے۔ بعض اوقات پہلے سے آمادگی نہیں ہوتی منہ دیکھ کر خیال ہو جاتا ہے تو طیب قلب سے نہ ہوا۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمہ اللہ تعالیٰ پر غالب حالت مجذوبیت کی تھی اگر کوئی شخص رخصت کے وقت ہدیہ پیش کرتا تو قبول نہ فرماتے تھے اور جو شخص آتے ہی دیتا لے لیتے تھے۔ جانے کے وقت دینے کے متعلق فرماتے کہ بھٹیارہ سمجھا ہے کہ حساب لگا کر دیتا ہے کہ آٹھ آنے کا کھایا ہوگا لاؤ روپیہ دے دو۔ دیکھئے یہاں بھی ہدیہ میں دوسری مصلحت یعنی اداء عوض مل گئی۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ زیادہ مقدار میں ہدیہ نہ لیتے تھے کم مقدار میں لیتے تھے اور لینے کے وقت بے حد شرماتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میری اتنی حیثیت نہیں۔ اپنے کو ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ بھائی زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ دے دو۔ اس میں بھی یہ راز ہے کہ بعض اوقات زیادہ مقدار میں طیب قلب نہیں ہوتا، قلیل مقدار سے شرما کر زیادہ دیتا ہے پھر اسطراداً فرمایا کہ مجھ کو حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ کشش ہے، دوسرے بزرگوں کے ساتھ تو ان کے کمالات کی بناء پر عقیدت ہے اور حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے اضطراری طور پر محبت ہے۔ ان کی ہر بات میں ایک محبوبانہ شان معلوم ہوتی ہے۔

(افاضات: ۲ رص ۱۹۰)

میرے حضرت مرشدی حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کو تو مدرسہ کی وجہ سے مالداروں کے ساتھ مدارات کا برتاؤ مجبوراً کرنا پڑتا تھا، جس کو میں کثرت سے دیکھتا تھا، لیکن حضرت قدس سرہٗ کے دور میں میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اہل چندہ کی مدارات کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس لیے امراء کی ملاقات سے بہت ہی گریز فرمایا کرتے تھے۔ غرباء کا تو اکثر مجمع دن بھر بیٹھا رہتا، ذرا دست نہ ہوتی، لیکن جب مدرسہ میں امراء میں سے کسی کی آمد کی اطلاع ہوتی تو مجھ سے ارشاد فرماتے کہ دروازے پر باہر کا قفل لگا دو۔ جب وہ لوگ چلے جائیں تو کھول دینا۔ میں خبر رکھتا لوگ دیکھنے آتے لیکن قفل لگا ہوا دیکھ سمجھتے کہ کہیں باہر تشریف لے گئے۔

جناب الحاج شیخ رشید احمد صاحب میرٹھی پھر چاٹگامی جو بعد میں مدرسہ کے سرپرست بھی ہوگئے تھے سے بہت گہرے تعلقات تھے نہایت ہی طرفین میں محبت اور تعلق تھا۔ ایک عجیب لطیفہ و شدت تعلق کا جملہ معترضہ کے طور پر یہ ہے کہ جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا اور میں پریشان زیادہ تھا کہ بارِ قرض بھی بہت تھا کتب خانہ کی بکری بھی کالعدم تھی اس کی تفاصیل تو آپ بیتی میں کہیں آ چکی کہ شیخ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے خواب دیکھا تھا کہ میرے والد صاحب نے خواب میں فرمایا کہ زکریا پریشان ہے اس کا خیال رکھنا، شیخ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطاء فرمائے کہ اس خواب پر بہت ہی زیادہ عمل کیا، بچپن ہی سے میری خاطر مدارات میں کسر نہ چھوڑی اور اخیر تک بڑھتی ہی رہی

چنانچہ تقسیم کے بعد جب وہ چاٹگام منتقل ہوگئے اور بعض وجوہ سے ہند میں آنا ناممکن ہوگیا تو بہت ہی زیادہ خطوط میں ملاقات کا اشتیاق میرے بلانے پر تقاضے لکھتے رہے۔ ایک خط میں یہ لکھا کہ یہاں آنے کے بعد دارالعلوم بھی مل گیا۔ مظاہر علوم بھی مل گیا ان کی سرپرستیاں بھی مل گئیں کہ ان ناموں سے مدارس شرقی پاکستان میں قائم ہوگئے مگر تم ہی نہ مل سکے۔ میرا تو وہاں آنا ناممکن اور تمہارا یہاں آنا اس سے زیادہ مشکل، ملنے کو طبیعت بے قرار ہے۔ میں تمہارے ہوائی جہاز کا بمبئی تا جدہ ٹکٹ بھیج دوں اور تمہاری معینہ تاریخ سے پہلے بھی وہاں آ جاؤں۔ ایک دو ماہ ساتھ رہ لیں۔ یہ تو ضمناً شیخ صاحب کے تعلق کی طرف اجمالی اشارہ تھا۔ شیخ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے صاحبزادے کی تقریب نکاح میں جہاں میرے حضرت قدس سرہٗ بھی تشریف لے گئے تھے والد صاحب پر بلانے کا اصرار کیا۔ والد صاحب نے جواب میں ایک شعر لکھا تھا:

در مجلس خود راہ مدہ ہمچو منے را

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اس خط میں تو صرف شعر ہی تھا بعد میں مزید اصرار پر انہوں نے لکھا کہ تم سے جو انس و محبت ہے وہ محتاج بیان نہیں مگر مجلس امراء میں مجھے شرکت بہت مشکل ہے۔

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا ملفوظ

میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ مدارس کی طرح سے امراء سے تبلیغ کی وجہ سے ملنے کی نوبت تو بہت آتی تھی مگر بہت ہی استغناء کے ساتھ جو قابل دید تھا۔ جب کوئی تبلیغ کے لیے بھی ہدیہ پیش کرتا تو ان کا مشہور مقولہ تھا کہ مجھے آپ کے پیسے نہیں چاہیے، مجھے تو آپ کی ذات چاہیے۔ آپ اس مبارک کام میں شرکت فرمادیں اور ان پیسوں کو اپنے اور اپنے رفقاء پر خرچ فرمادیں تو وہ میرے

لیے زیادہ موجبِ مسرت ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ بعض اہلِ دین اور اصحاب ثروت سے مطلقاً ملا ہی نہ جائے اور ان کے اختلاط سے کلی پرہیز کیا جائے حالانکہ استغناء کا منشاء صرف یہ ہے کہ ہم ان کی دولت کے حاجت مند بن کر ان کے پاس نہ جائیں اور طلب جاہ و مال کے لیے ان سے نہ ملیں، لیکن ان کی اصلاح کے لیے اور دینی مقاصد کے لیے ان سے ملنا اور اختلاط رکھنا ہرگز استغناء کے منافی نہیں بلکہ یہ تو اپنے درجہ میں ضروری ہے۔ ہاں اس چیز سے بہت ہوشیار رہنا چاہیے کہ ان کے پاس اختلاط سے ہمارے اندر حب جاہ و مال اور دولت کی حرص پیدا نہ ہو جائے۔

(ملفوظات حضرت دہلوی: ص۱۵)

حضرت مولانا محمد یوسف کے واقعات:

عزیز مولوی یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ جو اپنی ابتداء میں تو میرے اصاغر میں تھا لیکن اللہ کی دین کہ انتہا آخر میں میرے اکابر میں بن گئے۔ ان کے سامنے استغناء کے واقعات تو اتنی کثرت سے ہیں کہ **لا تعد و لا تحصٰی** میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں کہ نقل کراتے ہوئے بھی اپنی بدحالی کی وجہ سے شرم آتی ہے، ان میں سے صرف دو واقعات جن میں خود میری شرکت بھی ہے اس جگہ لکھوانے مقصود ہیں، لیکن اس سے پہلے سوانح یوسفی سے ایک واقعہ نقل کراتا ہوں کہ مولانا محمد یوسف صاحب نے اس دور میں بھی علم تقویٰ اور کامل احتیاط کی صفت اپنے آباء و اجداد سے ورثہ میں پائی تھی اور وہ اس دولت بے بہاء سے خوب نواز لیے گئے تھے۔ تبلیغی کام کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بعض حضرات کی چیزیں بعض دینی مصلحتوں سے استعمال فرمائیں تو مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مناسب نہیں جانا۔

وہ خود اپنا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ حضرت جی (مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہٗ) بعض دفع دہلی کے تاجروں کی کاریں استعمال فرمالیا کرتے تھے مجھ کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی کہ امراء کا احسان لیا جائے۔ ایک دن میں نے حضرت سے خلوت میں وقت مانگا۔ حضرت جی نے دے دیا۔ میں نے ادب سے عرض کیا۔ امراء کی کاریں آپ استعمال فرماتے ہیں یہ بات بظاہر استغناء کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ حضرت جی نے فرمایا ”یوسف! جو کچھ کرتا ہوں سوچ سمجھ کر کرتا ہوں اور صرف دین کے لیے کرتا ہوں“۔ (سوانح یوسفی)

جو دو واقعے میرے ساتھ گزرے ہیں ان میں سے ایک واقعہ تو کرنل اقبال بھوپالی مرحوم کا ہے۔ کرنل صاحب بھوپال میں ایک فوجی افسر تھے۔ نہایت ہی لحیم شحیم، قد آور پہلوان، نہایت ہی

حسین صورت۔ میرے ان کے ساتھ تعلق کی ابتداء یہ ہے کہ بھوپال میں کسی صاحب نے ان سے حضرت اقدس رائے پوری ثانی کا ذکر کیا، جس پر وہ حضرت کی زیارت کے مشتاق ہوئے۔ ان صاحب نے کرنل صاحب کو رائے پور کا راستہ بتاتے ہوئے یہ بتایا کہ جب ریل سے آپ سہارنپور اتریں تو مظاہر علوم میں آپ سیدھے چلے جائیں اور زکریا سے حضرت کے متعلق معلوم بھی کرلیں کہ رائے پور میں ہیں یا کسی دوسری جگہ اور وہ رائے پور کے موٹر میں کسی کے ساتھ بٹھادیں گے۔ وہ دس بجے کے قریب سہارنپور پہنچے۔ میرے روز نامچے میں ان کی ابتدائی آمد کی تاریخ بھی لکھی ہوئی ہوگی مگر کون تلاش کرے۔ جب وہ مدرسہ پہنچے تو میرا ایک مخلص دوست حافظ شیخ فرقان احمد جو اس وقت بچہ تھا اور مولوی نصیر الدین کے مکتب میں قرآن پڑھتا تھا، وہ ننگے پاؤں بھاگا ہوا میرے دار التصنیف میں اوپر پہنچ گیا۔ اس کے متعلق آپ بیتی میں کئی جگہ تذکرہ آچکا ہے کہ وہ زمانہ میری علمی انہاک کا تھا اور صبح کی چائے کے بعد سے دوپہر کے گیارہ بجے تک بجز اکابر ثلاثہ حضرت مدنی، رائے پوری اور میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے کسی شخص کی آمد گوارا نہ تھی اور ان کے علاوہ کوئی پہنچتا تو واقف ہوتا تو ڈانٹ پڑتی اور اجنبی ہوتا تو روکا جواب کہ اس وقت فرصت نہیں ہے، گیارہ بجے بات کرسکتا ہوں۔

حافظ فرقان نے اوپر جاکر گھبرائی ہوئی زبان میں کہا کہ ایک بزرگ چناں چنیں تانگہ سے اترے ہیں، تجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور ابھی رائے پور جائیں گے۔ میں نے اس غریب کو ایک ڈانٹ پلائی کہ کیوں آیا ان سے کہہ دیتا کہ وہ اس وقت فارغ نہیں ہیں۔ اس نے کہا میری تو ہمت نہیں پڑی وہ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ میں نے اس کو ڈانٹ کر کہا جا کہہ دے مہمان خانہ میں تشریف رکھیں، گیارہ بجے حاضر ہوں گا اور سامان لے کر مہمان خانہ میں پہنچا آ۔ اس نے مجبوراً جاکر کرنل صاحب سے کہا کہ اس نے کہا ہے کہ میں اس وقت بہت مشغول ہوں، مہمان خانہ میں تشریف رکھیں۔ وہ میرے کہنے پر ان کو مہمانِ خانہ میں پہنچا آیا اور سامان بھی رکھ آیا۔ مگر دوبارہ آکر مجھ سے کہا کہ وہ ابھی رائے پور جارہے ہیں۔ میں نے کہا جانے دو، مگر وہ بہت مرعوب ہورہا تھا، اس نے مجھ سے بہت اصرار کیا میں اس کے اصرار پر ننگے سر جوتے پہن کر مہمان خانہ میں پہنچا۔ مہمان خانہ میں پہنچ کر یاد آیا سر پر ٹوپی بھی نہیں ہے۔ وہ مرحوم چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کیا اور عرض کیا کہ زکریا میرا ہی نام ہے کیا ارشاد ہے؟ انہوں نے کھڑے ہوکر مصافحہ کیا اس لیے کہ وہ اپنے لمبے قد کی وجہ سے سیدھے مصافحہ نہیں کرسکتے تھے۔

انہوں نے فرمایا کہ میں بھوپال سے آیا ہوں اور اسی وقت رائے پور جانا چاہتا ہوں۔ کل کو مجھے علی الصبح واپس دس بجے کی گاڑی سے دہلی جانا ہے اور اسی وقت بھوپال کے لیے روانگی ہے۔ میں

نے کہا بہت اچھا۔ میں لڑکا ساتھ کراتا ہوں وہ موٹر اڈہ تک پہنچا دے گا، مگر میرا مشورہ اور درخواست یہ ہے کہ آپ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یہاں آرام فرمالیں۔ میں فراغت پر آپ کو بلالوں گا۔ کھانے کے بعد آپ تشریف لے جائیں۔ اس لیے کہ حضرت کے تو آرام فرمانے کا وقت قریب ہے۔ اتنے آپ پہنچیں گے، حضرت لیٹ چکے ہوں گے۔ حضرت سے ملاقات تو ظہر کی نماز کے بعد ہوگی اور آپ بے وقت وہاں پہنچیں گے تو وہاں کے لوگوں کو انتظام کرنا پڑے گا۔ سب فارغ ہو کر سو رہے ہوں گے۔ اگر آپ کھانے کے بعد تشریف لے جائیں گے تب بھی ملاقات اسی وقت ہوگی۔ جو اس وقت کے جانے پر ہوگی۔ میرے اس کہنے پر وہ چارپائی پر اوپر کو بیٹھے۔ میں نے کہا جلدی لیٹ جاؤ۔ میں تو یہ کہہ کر دو منٹ میں نمٹا آیا اور واپس آ کر اوپر زنانہ میں آواز دی کہ ایک مہمان ہیں، اس وقت کھانے میں ان کے لیے اہتمام کرنا ہے اور مولوی نصیر سے بھی کہہ دیا کہ ربڑی دودھ جلیبی وغیرہ ایک آدمی کے بقدر منگوالے۔ اللہ میرے گھر والوں اور مولوی نصیر کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ وہ میرے مہمانوں کا اہتمام میری خواہش سے بھی زیادہ کر دیتے ہیں۔

میں نے اپنے اس حرج کی تلافی میں پندرہ منٹ زائد خرچ کیے اور اوپر سے اترتے وقت ایک لڑکے کو مہمان خانہ میں بھیجا کہا کہ ایک مہمان لیٹے ہوئے ہیں انہیں بلا لائے۔ ان کے آنے سے پہلے دستر خوان بچھ چکا تھا، کھانا بھی رکھا جا چکا تھا اور ''جائزتہ یوم ولیلة'' کی وجہ سے تنوعات بھی کئی قسم کے ہوگئے تھے اور میں نے بھی تلافی مافات میں ان کی دل داری خوب کی اور کھانے کے بعد ان سے کہا کہ ابھی آدھ گھنٹہ کی گنجائش ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ کھانا کھاتے ہی جانے میں دقت ہوگی اور ایک لڑکا ان کے سامنے کر دیا کہ یہ آدھ گھنٹہ بعد آپ کو اڈہ پر پہنچا دے گا۔ انہوں نے اس رائے کو بھی پسند کیا اور لیٹ گئے۔

دوسرے دن علی الصباح ساڑھے نو بجے کے قریب وہ موٹر اڈہ سے اسٹیشن کے لیے تانگہ لے کر میرے مکان سے گزرے۔ میرا ابھی یہی مشغولیت کا وقت تھا۔ مولوی نصیر الدین نے اوپر جا کر کہا کہ کرنل صاحب تانگہ میں بیٹھے ہیں ریل پر جا رہے ہیں، میں نے صرف مصافحہ کیا اور پوچھا کہ آپ کی گاڑی میں دس منٹ کی گنجائش ہے، میں معلوم کرلوں اگر گھر میں کچھ موجود ہوگا تو کچھ نوش فرماتے جائیں، اس لیے کہ آپ کی گاڑی چار بجے پہنچے گی اور اگر گھر میں کچھ موجود نہیں ہوگا تو بے تکلف عرض کر دوں گا۔ چونکہ کل گزشتہ خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا بہت اچھا اور تانگہ سے اترنے لگے۔ میں نے کہا کہ ابھی نہ اترو، میں معلوم تو کرلوں کہ کچھ ہے بھی یا نہیں۔ میں گھر میں آیا اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے۔ گھر والوں نے کہا کہ فلانے گھر میں پڑھنے

والی کا نکاح ہے اور گرم گرم پُلاؤ زردہ ایک ایک رکابی میں ابھی آیا ہے، لانے والی بھی کھڑی تھی میں نے کہا جلدی سے ذرا سا گوشت بھی بھون دو اور باسی روٹی بھی اور جلدی یہ کہہ کر کرنل صاحب کو بُلانے کے واسطے نکلا ہی تھا کہ وہ دروازے تک پہنچ گئے تھے، میں نے کہا تمہارا مقدر ابھی آیا ہے جلدی آجاؤ، ان کو باسی روٹی بھنا ہوا گوشت اور پلاؤ زردہ کر ان کے پاس رکھا اور میں نے کہا اب تمہارا کام ہے جتنی جلدی کھاؤ گے سہولت رہے گی، وہ ماشاء اللہ بدیں جلالت شان فوجی بھی تھے، سالن کی رکابی پلاؤ کی رکابی پر اُتھل کر اور دو تین منٹ میں نمٹا دی، باسی روٹی البتہ نہیں کھائی اور بہت ہی خوش ہوئے اور میں نے کہا کہ جلدی جاؤ دیر ہو رہی ہے اور ایک آدمی سے کہا جلدی ہاتھ دھلاؤ، میں تو یہ کہہ کر اوپر جانے لگا، انہوں نے کہا حضرت ذرا سی بات کہنی ہے آپ سے، تکلف تو رہا نہیں میرا بٹوہ کہیں جیب سے نکل گیا، دہلی کا کرایہ نہیں ہے، میں نے کہا اسی پر جانے کا زور دکھلا رہے تھے۔

اس زمانہ میں میری جیب میں پیسے کا بالکل دستور نہیں تھا، لیکن قرضے مانگنے میں اتنا مشاق ہو گیا تھا اور اب تک بھی ہوں کہ جیب میں ہاتھ ڈالنے سے مانگ لینا زیادہ آسان ہے اور محض اللہ کے فضل سے لوگوں کا اعتماد بھی اتنا ہو گیا تھا کہ وہ مجھے قرض دینا موجب مسرت سمجھتے تھے، باہر ہی ایک آدمی پر نظر پڑی، میں نے اس سے کہا کہ ارے جیب میں کچھ ہے، اس نے کہا جی بہت، میں نے کہا جلدی سے تیس روپے دے دے اور میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر جلدی سے کرنل صاحب کے حوالہ کیے اور وہ جلدی سے تانگے میں بیٹھ کر چل دیے اور میں اُوپر چلا گیا، جہاں تک یاد ہے سارے قصے میں پندرہ سولہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔

کچھ دنوں بعد کرنل صاحب کا ایک بیمہ بھوپال سے موصول ہوا، جس میں ایک بڑی رقم تو مدرسہ کے لیے تھی اور اس سے آدھی اجراڑہ کے مدرسہ کے لیے، اس لیے کہ اس سے پہلے دن کھانے میں حافظ محمد حسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مہتمم مدرسہ اجراڑہ بھی شریک تھے جن کا ذکر آپ بیتی میں گزر چکا کہ میرے حضرت کے رمضان المبارک کے سامع قرآن نہایت معذور، اپاہج منحنی، مگر کھانے میں ان کا اہتمام کرنل صاحب ہی کے برابر کر رہا تھا، انہوں نے مجھ سے ان کا حال دریافت کیا تھا تو میں نے ان کے اوصاف جمیلہ بتا دیئے تھے اور تیس سو روپے اس ناکارہ کو ہدیہ بھیجے تھے۔

میں نے کرنل صاحب کو لکھا کہ وہ ''در دنیا ستر در آخرت'' سنتے تو آئے تھے مگر عمل آپ نے کر کے دکھلایا، سود کی یہ شرح کسی ملک میں نہیں، اس لیے میں نے اپنے تین سو روپے وصول کر لیے بقیہ آپ کی امانت جمع ہے، آپ جہاں فرما دیں وہاں داخل کر دوں، میرا مشورہ یہ ہے کہ مدرسہ میں داخل کر دیں۔

ان کا بہت ہی لمبا چوڑا خط لجاجت اور اصرار کا آیا کہ خدانخواستہ یہ سود نہیں ہے، میں تو آپ کی بے تکلفی اور ایک اجنبی سے اس برتاؤ پر پہلے ہی ارادہ کر چکا تھا، ایک دو دفعہ تو میں نے مکاتبت کی پھر دھر علق میں، اس کے بعد کرنل صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند درجے عطاء فرمائے، ان کی شفقتیں زیادہ سے زیادہ بڑھتی ہی چلی گئیں اور ہر سفر میں کوئی نہ کوئی ہدیہ ضرور لے کر آتے، میں ہر مرتبہ اصرار بھی کرتا کہ مجھے مادی ہدایہ کی بجائے روحانی ہدایہ کی ضرورت ہے، مگر مرحوم بہت ہی اصرار فرمایا کرتے تھے اور اتنے تعلقات بڑھ گئے تھے کہ جب بھی کسی ضرورت سے دہلی آنا ہوتا، سہارنپور آئے بغیر واپس نہ جاتے۔

اصل واقعہ جو لکھوانا تھا وہ یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی ایک جائیداد تقریباً سوا لاکھ کی چار جگہوں پر وقف کی، دار العلوم دیو بند، مظاہر علوم سہارنپور، جمعیۃ علماء دہلی اور تبلیغ نظام الدین، بقیہ تینوں حضرات نے تو شکریہ سے قبول کر لیا، مگر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے انکار کر دیا، مرحوم نے کئی مرتبہ نظام الدین آ کر مولانا مرحوم کی خوشامد بھی کی مگر مولانا مرحوم کا ایک ہی جواب تھا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے تمہارے مال کی نہیں، چونکہ کرنل صاحب مرحوم کا مجھ سے تعلق بہت بڑھ گیا تھا، اس لیے انہوں نے مجھے بھی اس سلسلہ میں متعدد خطوط لکھے کہ میں مولانا یوسف صاحب مرحوم کو حکماً اس کو منظور کرنے کو لکھوں، میں نے بھی کرنل صاحب کی دل داری میں مولانا مرحوم کو کئی خط لکھے، مگر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ بہت ہی جزائے خیر دے ان کا جواب جو لفظی نہیں تھا بلکہ حقیقی تھا، یہ آیا کہا گر حکم ہے تو مجھے انکار نہیں مگر مجھے اس میں دقت بہت ہے، وقت کا حساب رکھنا، پھر اس کا حساب داخل کرانا، آڈٹ کرانا میرے بس کا نہیں، میں نے ان کو لکھا کہ بجائے تبلیغ کے مدرسہ کے لیے قبول کر لو، مدرسہ کے مہتمم تو آپ کے مستقل ہیں، یہ سب دھندے وہ کرتے رہیں گے، مدرسہ کے مہتمم اس وقت میں حاجی عبد المجید صاحب دہلوی موتی والے تھے، وہ کاروباری آدمی تھے، ان کے لیے ان چیزوں میں کوئی اشکال نہ تھا، مگر مولانا مرحوم نے اس کو بھی گوارا نہ کیا، میں نے مولانا مرحوم کو لکھ دیا کہ تمہاری رائے کے خلاف مجھے بالکل اصرار نہیں۔

اتفاق سے اس دوران میں میرا نظام الدین جانا ہوا اور کرنل صاحب اس وقت نظام الدین میں موجود تھے، میں موٹر سے اُتر کر مسجد میں گھسا ہی تھا کہ حضرت مولانا محمد یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے پیچھے کرنل صاحب مرحوم بھی ننگے پاؤں مجھ سے مصافحہ کے لیے دوڑے، مولانا مرحوم سے تو معانقہ اور مصافحہ کے بعد میں نے کرنل صاحب کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور میں نے کہا کرنل صاحب! آپ کے یہاں موجود ہونے سے بہت ہی مسرت ہوئی، مرحوم نے کہا مجھے آپ سے زیادہ مسرت ہوئی، ان حضرت جی کی خوشامد کرتے کرتے تھک گیا، آپ کی تشریف

آوری پر میری اُمید بڑھ گئی کہ آپ میری تمنا پوری کرا دیں گے اور بہت ہی خوشی کا اظہار کیا، میں نے کہا اجی کرنل صاحب پہلے میری سن تو لیجئے، مجھے آپ سے زیادہ خوشی ہو رہی ہے مجھے تو بہت ہی مسرت ہوئی کہ آپ یہاں تشریف فرما ہیں، اس لیے کہ آپ نے جو ہمارے مدرسہ کے لیے وقف کیا ہے اس کے متعلق ہمارے مدرسہ والوں کا اصرار یہ ہے کہ ایک وفد آپ کی خدمت میں بھوپال جائے، جو آپ کے اس احسانِ عظیم کا شکریہ ادا کرے، مگر ان کا اصرار یہ ہے کہ تیرا اس وفد میں ہونا ضروری ہے اور میرے لیے سفر ''قطعة من النار ''ہے، کئی دن سے ہمارے مدرسہ میں یہ مشورہ چل رہا ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ مدرسہ ایک وفد ضرور بھیجے اور اہل مدرسہ کا اصرار ہے کہ تیرا اس وفد میں ہونا بہت ضروری ہے کہ اس سے کرنل صاحب کو مسرت ہوگی، اس وقت آپ کے یہاں ہونے کی خوشی اس پر ہے کہ میں مدرسہ کی طرف سے بطور وفد آپ کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے اور کئی منٹ تک کھڑے ہی کھڑے صرف زبانی نہیں، میں نے ان کے لیے دل سے دُعائیں دیں اور آخر میں میں نے کہا کہ کرنل صاحب بڑھاپے میں کچھ آدمی کی عقل میں فتور آجاتا ہے ارے بڈھے! تو نے یہ کیا کیا! ان حضرت جی کا نام کیوں لکھ دیا، مرحوم نے کہا اجی حضرت! ایک ہی سانس میں دونوں، میں نے کہا کرنل صاحب بالکل اور پھر وہی کہوں گا جو میں نے شروع میں کہا کہ میں مدرسہ کا آدمی بھی ہوں اور ہم اہل مدرسہ چندہ کے لیے سفیروں کو بھی بھیجتے ہیں تم حضرات کی خدمت میں خوشامد کے خطوط بھی لکھتے ہیں، ایسی صورت میں اگر بلا طلب کوئی ہمارے مدرسہ میں دے تو اس کا ہم جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے، لیکن یہ شخص جو مال کے اُوپر فٹ بال کے گیند سے بھی زیادہ ٹھوکر مارتا ہوا اس کو آپ مجبور کریں اور مجھے بھی آپ مجبور کریں کہ میں ان پر ان کی طبیعت کے خلاف جبر کروں یہ آپ کا کیسا ظلم ہے، یہ ساری گفتگو کھڑے کھڑے ننگے پاؤں ہو رہی تھی۔

کرنل صاحب نے فرمایا کہ آپ حجرہ میں تو تشریف لائیں، آپ کی خبر سن کر میرا دل تو باغ باغ ہو گیا تھا، مگر آپ نے تو مجھے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا، حجرہ میں جا کر تقریباً دو گھنٹے یہی منظر رہا کہ میں ایک ہی سانس میں مدرسہ کا شکریہ ادا کرتا اور عزیز مرحوم کی طرف سے معذرت کرتا، میں نے کرنل صاحب سے یہ بھی کہا کہ آپ ان کا حصہ مدرسہ کو دے دیں، آپ ایسے ناقدرے کو کیوں دیں، قدر دانوں کو دینا چاہیے، کرنل صاحب نے کہا کہ میری تمنا تو یہی ہے کہ آپ میری اس جائیداد میں تبلیغ کا بھی کوئی حصہ کرا دیں، میں نے کہا کہ میں ان عزیز کی منشاء کے خلاف کوئی حکم ان کو نہیں دے سکتا، مرحوم نے اخیر تک اس کو منظور ہی نہیں کر کے دیا، اس کے بعد تو ہمارے مدرسہ کے ناظم مالیات بھائی اکرام مرحوم بھی بار بار یوں کہا کرتے تھے کہ مولانا

یوسف صاحب نے بڑا ہی اچھا کیا کہ قبول نہیں کیا اس لیے کہ اس جائیداد کے مقدمات کا سلسلہ ایسا لا متناہی ہوا اور جن پر وقف کیا تھا ان پر اتنے اخراجات پڑ گئے کہ مولانا مرحوم اگر میرے اصرار پر قبول کر لیتے تو میرے بھی آنکھ نیچی رہتی۔

دوسرا واقعہ: جناب الحاج وجیہ الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے، یہ میرے حضرت قدس سرہٗ کے اخص الخواص خدام میں تھے اور میرے حضرت قدس سرہٗ ان کا اور ان کے بڑے بھائی جناب الحاج فصیح الدین صاحب کا اور جناب شیخ الحاج رشید احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا بہت ہی احترام کرتے تھے اور بہت ہی شفقت فرماتے تھے، انہی حضرات کے بچوں کے ختمِ قرآن میں حضرت رمضان المبارک میں شرکت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جیسے پہلے بھی اس کی تفاصیل گزر چکیں۔ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد اس ناکارہ نے کئی رمضان جزءاً وکلاً نظام الدین میں گزرے۔ اعتکاف تو اس زمانہ میں وہیں ہوتا تھا مولانا یوسف صاحب کے حجرہ کے قریب جو ایک لمبا چوڑا معتکف بنا ہوا ہے وہ میرا اور مولانا مرحوم کا مشترک معتکف ہوتا تھا کہ بڑا پردہ تو نہایت طویل وعریض لو ہے کہ سرے پر پڑا رہتا تھا اور اندر کے حصوں کو معمولی چادروں سے دو حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔ غربی حصہ میں یہ سیہ کار رہتا تھا اور شرقی میں مولانا مرحوم۔ ایک مرتبہ ہم دونوں ظہر کے بعد اپنے اپنے معتکف میں تھے، بیچ میں مختصر سا پردہ پڑا ہوا تھا میں مشغول تھا کہ دفعۃً میں نے مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے گرجنے کی آواز سنی اور جب خیال کیا تو دوسری آواز جناب الحاج وجیہ الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی تھی وہ کچھ تبلیغ میں دے رہے تھے اور مولانا مرحوم کہہ رہے تھے کہ مجھے پیسے نہیں چاہئیں، مجھے تو تمہاری ضرورت ہے۔ جب میں نے کئی منٹ تک یہ ردوقدح سنی تو میں اپنے معتکف سے مولانا مرحوم کے معتکف میں گیا اور حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو درخواست کر کے اپنے معتکف میں لے آیا اور میں نے نہایت ہی خوشامد، لجاجت، منت سماجت سے ان سے یہ معذرت کی کہ عزیز موصوف جناب سے واقف نہیں۔ آپ یہ رقم مجھے مرحمت فرما دیجئے۔

انہوں نے نہایت غصہ میں مجھے دینے سے انکار فرما دیا کہ میں تجھے نہیں دیتا۔ میں نے ہر چند اصرار سے مانگا کہ میں تبلیغ میں خرچ کروں گا اور کسی وقت مولانا یوسف صاحب کے ذریعہ خرچ کراؤں گا، انہیں بہت غصہ آ رہا تھا، انہوں نے صفائی سے انکار کر دیا کہ میں تجھے نہیں دوں گا جب وہ نہیں لیتے تو مجھے بھی اصرار نہیں جتنی دیر مولانا مرحوم سے جنگ وجدل میں گزری تھی اس سے دوگنی دیر میں نے خوشامد کی۔ مگر حاجی صاحب پر بہت ہی اثر تھا وہ راضی نہیں ہوئے اور اٹھ کر چل دیئے۔ ان کے جانے کے بعد میں عزیز مرحوم نور اللہ مرقدہٗ کے معتکف میں گیا۔

میں نے کہا کہ تم اپنے لوگوں کے ساتھ تو جو چاہے برتاؤ رکھو مگر اکابر کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے ساتھ ایسا برتاؤ ہرگز نہیں چاہیے۔ یہ شخص وہ ہے جس کے لیے تمہارا باپ حضرت قدس سرہٗ کے مکان سے کھانا اور چائے لے کر آیا کرتا تھا۔ عزیز موصوف نے ناواقفیت کا عذر کیا اور یہ بالکل صحیح تھا کہ میں نے جو منظر بیان کیا تھا وہ عزیز موصوف کی پیدائش سے بھی پہلے کا یا بالکل ابتدائی زمانہ کا تھا۔ عزیز مرحوم نے مجھ سے کہا کہ آپ اسی وقت تشریف لا کر مجھے منع فرما دیتے۔ میں نے کہا تم اس قدر جوش پر تھے کہ اس وقت میں نے دخل دینا مناسب نہیں سمجھا مگر اس کا اہتمام بہت ضروری ہے اس عزیز مرحوم نے بھی دو ایک لڑکوں کو ان کے تعاقب میں بھیجا، معلوم ہوا کہ وہ یہاں سے درگاہ میں گئے ہیں مگر وہ نہ ملے۔

کئی ماہ بعد میرا دوبارہ دہلی جانا ہوا تو معمول کے موافق عزیزانم مولانا یوسف مرحوم اور مولانا انعام الحسن سلمہٗ اسٹیشن پر موجود تھے۔ میں نے اسٹیشن پر اترتے ہی کہا کہ پہلے حاجی وجیہ الدین صاحب کے یہاں جانا ہے اور تمہیں ان سے معافی مانگنا ہے۔ عزیز مرحوم نے بہت خوشدلی سے کہا کہ ضرور چلنا ہے۔ چنانچہ ہم تینوں ایک دو آدمی اور بھی ساتھ تھے۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی دُکان پر جو نظام الدین کے راستے ہی میں تھی، پہنچے، رات کا وقت ہو گیا تھا، کیواڑ کھلوائے، خود حاجی صاحب مرحوم نے کیواڑ کھولے اور میں نے کیواڑ کھلتے ہی عرض کیا کہ مولانا یوسف صاحب آپ سے معافی مانگنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں نہیں اس کی بالکل ضرورت نہیں۔ بلکہ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں کہ آپ نے اس دن میری کتنی خوشامد کی مگر مجھے اس وقت قلق بہت ہو رہا تھا، اس لیے میں نے آپ کی خوشامد کی پرواہ نہ کی اور صاف انکار کر دیا، اس کی تو میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ان کی ڈانٹ کا جتنا مجھے اثر ہوا آپ کی خوشامد کا نہیں اور حاجی صاحب نے فرمایا کہ اس دن سے لے کر آج تک میوات کا کوئی تبلیغی جلسہ ایسا نہیں ہوا، جس میں میں نے شرکت نہ کی ہو، اتنا تو ضرور ہے کہ رات کو میں نہیں ٹھہرا، صبح کو ناشتہ سے فارغ ہو کر اپنی کار میں ہمیشہ جلسہ میں گیا اور دعاء کے فوراً بعد واپس آ گیا، مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی کہ جی ہاں میں بھی جلسہ میں ہمیشہ دیکھتا تو رہا ہوں، لیکن جلسہ کے بعد تلاش کرنے پر نہیں ملے، مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو اللہ جل شانہٗ نے اسی استغناء کی وجہ سے ہیبت اور رعب اتنا عطاء فرما دیا تھا کہ بڑے سے بڑے آدمی کو ڈانٹنے میں بالارادہ نہیں بلا ارادہ جوش آ جاتا تھا کہ پھر ان کو اس کا احساس نہیں رہتا تھا کہ سامنے والا کون ہے، ان کی نگاہ میں سب ایک عام آدمی سمجھے جاتے تھے، لاہور کی ان کی ایک تقریر اور جلسہ بہت مشہور ہے۔

قریشی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ لاہور میں بہت ہی خواص اعلیٰ عہدہ داروں اور اعلیٰ حکام کا ایک جلسہ کیا، جس میں بہت ہی اہتمام سے بڑے اعلیٰ عہدہ داروں کو جمع کیا، تا کہ وہ مولانا کی تقریر بہت اہتمام سے تفصیل سے سن سکیں اور جلسہ کے افتتاح کے موقع میں مرحوم نے ان کا تعارف بھی کرایا کہ یہ صاحب فلاں محکمہ کے انچارج ہیں، یہ صاحب وزیر ہیں، یہ انجینئر ہیں، یہ ڈاکٹر ہے، دیر تک اشخاص کا عہدوں اور ڈگریوں کے ساتھ تعارف ہوتا رہا اور نئے نئے الفاظ کے ساتھ جو ہم جیسوں کے لیے غیر مانوس بھی تھے، مولانا اس پوری مدت میں پیچ وتاب بھی کھاتے رہے، بعد میں کھڑے ہوئے اور فرمایا ابھی بھی جن لوگوں کا جن الفاظ اور جس طرز سے تعارف ہوا وہ میرے لیے غیر مانوس تھا اور اگر بجائے اس کے یوں کہا جاتا کہ یہ کتا ہے، یہ گدھا ہے، یہ سُور ہے تو میں بخوبی سمجھ لیتا کہ کون کون صاحب کیا ہیں، پھر اس طرزِ تعارف پر تحت تنقید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اسلام کے مبارک دور میں جب کسی کا تعارف ہوتا تو اسی طرح ہوتا کہ فلاں نے اسلام کی یہ خدمت کی، فلاں نے اسلام کی راہ میں اس طرح جان دی، فلاں نے خدا کے لیے یہ کہا، فلاں نے اسلام کو اس طرح پھیلایا، فلاں جنگ میں شریک ہوئے، فلاں نے غزوہ میں شرکت کی، یہ بدری ہیں، یہ اصحاب العقبہ ہیں، غرض کہ تقریر کا اکثر حصہ اس پر مشتمل تھا، صاحبِ خانہ سر جھکائے سب سنتے رہے اور ڈرتے رہے کہ مولانا کی صاف گوئی سے اہلِ دنیا پر کیا اثر پڑے گا، اس کا بھی بہت فکر رہا کہ میں نے تو کیا سوچ کر اجتماع کیا تھا یہ تو اُلٹا ہی ہو گیا۔

مرحوم فرماتے ہیں کہ ہر وقت یہ فکر لگا رہا کہ مجمع میں سے کوئی اُٹھ کر مولانا کی شان میں بے ادبی نہ کر دے، مگر ہوا یہ کہ جن لوگوں کو ڈانٹا گیا تھا ان لوگوں پر بہت ہی اچھا اثر ہوا اور وہ دوسرے جلسوں میں اپنے ہم جنسوں کو اہتمام سے شرکت کے لیے لائے، یہ اجتماع تو بہت ہی پُر لطف اور بہت ہی طویل مضامین کا ہے، بندہ کے پاس بھی اس وقت بہت ہی کثرت سے اس جلسہ کی روداد کے خطوط بھی آئے، لوگوں کے تاثرات بھی معلوم ہوئے، سوانح یوسفی میں بھی اس واقعہ کو بہت مختصر طور پر ذکر کیا ہے اور مولانا مرحوم کے پورے الفاظ میں بھی یہاں باوجود یاد ہونے کے نقل نہیں کر رہا ہوں، اس لیے کہ ایک نہایت اور ضروری بات یہ ہے کہ اس کا مبلغین کو بہت اہتمام کرنا چاہیے کہ اکابر کی ان جیسی چیزوں کی نقل ہرگز نہیں اُتارنا چاہیے، اس لیے کہ جو بلا ارادہ جذبہ سے نکلتے ہوں وہ تو مؤثر ہوتے ہیں اور جو بناوٹ اور آورد سے ہوتے ہیں وہ مضر ہوتے ہیں:

ناز را روئے بباید ہمچو ورد
چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

''ناز کے لیے بھی گلاب کے پھول جیسا منہ چاہیے اور جب پھر یہ نہ ہو اس وقت تک ڈانٹ

ڈپٹ کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیے''۔

زشت باشد روئے ناز یباو ناز عیب باد چشم نابینا و باز

''برے چہروں کے ساتھ ناز بہت بدنما ہے جیسے آندھی آنکھ کھلی ہوئی بری لگتی ہے، اگر بینائی جاتی رہے تو بند آنکھ ہی اچھی لگتی ہے''۔

میں نے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد ان کے بعض خلفاء کو جو مجھ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، بڑے اہتمام سے تاکید کی تھی کہ اتنے حکیم الامت نہ بنو، اتنے اصلاح میں تشدد نہ کیجئے، ان دوستوں نے میری بات کو بہت پسند کیا تھا، حدیث پاک میں آیا ہے کہ ''اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اگر اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا فرما دیتے ہیں'' لیکن اس کی حرص میں اگر ہر شخص بزرگی جتانے کے واسطے اللہ پر قسم کھا کھا کر غیب کی باتیں کرنے لگے تو دوسری حدیث میں آیا ہے کہ تو دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ ''ومن یتال علی اللہ یکذبہ'' پہلے بھی اس مضمون کو میں آپ بیتی میں کئی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ اکابر کی ان چیزوں پر جن کو وہ جوش میں فرما دیں وہ ڈانٹ ڈپٹ کے قبیلہ سے ہو یا اپنے متعلق تعریفی الفاظ ہوں نکیر نہیں ہونا چاہیے لیکن ان کی حرص بھی نہیں چاہیے۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۱۲

اکابر کی تواضع

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے: ''من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰہ'' یہ پاک ارشاد تو میرا بہت ہی مجرب ہے، جن حضرات میں جتنی بھی میں نے تواضع پائی اتنی ہی زیادہ ان میں رفع آنکھوں سے دیکھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ و مولانا فخر الدین

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور مولانا فخر الدین صاحب چشتی اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمہم اللہ تعالیٰ تینوں کا ایک زمانہ تھا اور تینوں حضرات دہلی میں تشریف رکھتے تھے، ایک شخص نے چاہا کہ تینوں حضرات ایک شہر میں موجود ہیں، ان کا امتحان لینا چاہیے کہ کس کا مرتبہ بڑا ہے، یہ شخص اول شاہ ولی اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ حضرت کل کو آپ کی میرے یہاں دعوت ہے قبول فرمائیں اور نو بجے دن کے غریب خانہ پر خود تشریف لائیں، میرے بلانے کے منتظر نہ رہیں، شاہ صاحب نے فرمایا بہت اچھا، اس کے بعد وہ شخص مولانا فخر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا ساڑھے نو بجے میرے بلائے بغیر مکان پر تشریف لائیں اور ماحضر تناول فرمائیں۔

مرزا مظہر جان جاناں کا واقعہ

یہاں سے اُٹھ کر یہ شخص مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ کاروبار کے سبب حضرت خدمت نہ ہوسکوں گا پورے دس بجے دن کو غریب خانہ پر تشریف لائیں، تینوں حضرات نے دعوت قبول فرمائی اور اگلے روز ٹھیک وقتِ مقررہ پر اس شخص کے مکان پر پہنچ گئے۔

اول نو بجے شاہ صاحب تشریف لائے، اس شخص نے ان کو ایک مکان میں بٹھایا اور چلا گیا، ساڑھے نو بجے مولانا تشریف لائے، ان کو دوسرے مکان میں بٹھایا، پھر دس بجے مرزا صاحب تشریف لائے، ان کو تیسرے مکان میں بٹھایا، غرض تینوں حضرات بیٹھ گئے تو یہ شخص پانی لے کر آیا، ہاتھ دُھلائے اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ ابھی کھانا لے کر حاضر ہوتا ہوں، کئی گھنٹے گزر گئے اس شخص نے خبر نہ لی، آ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ کون گیا اور کون بیٹھا ہے، جب ظہر کا وقت قریب آ گیا اور اس

نے سوچا کہ مہمانوں کو نماز بھی پڑھنی ہے تو اول شاہ ولی اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور شرمندہ صورت بنا کر عرض کیا، حضرت کیا کہوں گھر میں تکلیف ہوگئی تھی، اس لیے کھانے کا انتظام نہ ہوسکا۔ دو پیسے نذر کیے اور کہا ان کو قبول فرمائیے، شاہ صاحب نے خوشی سے لے لیے اور فرمایا کیا مضائقہ ہے، بھائی گھروں میں اکثر ایسا ہوہی جاتا ہے، شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں، یہ فرما کر چل دیئے، پھر یہ شخص مولانا فخر الدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہی کہا جو وہاں کہا تھا اور دو پیسے نذر کیے، مولانا نے فرمایا، بھائی فکر کیا بات ہے، اکثر گھروں میں ایسے قصے پیش آجایا کرتے ہیں اور کھڑے ہوکر نہایت خندہ پیشانی سے تعظیم کے ساتھ رومال پھیلا دیا، دو پیسے کی نذر قبول فرمائی اور رومال میں باندھ کر روانہ ہوئے، دونوں کو رخصت کرکے یہ شخص حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی خدمت میں پہنچا اور وہی عذر بیان کرکے دو پیسے نذر کیے، مرزا صاحب نے پیسے تو اُٹھا کر جیب میں ڈال لیے اور پیشانی پر بل ڈال کر فرمایا کچھ مضائقہ نہیں، مگر پھر ہمیں ایسی تکلیف مت دیجئے، یہ فرما کر تشریف لے گئے۔

اس شخص نے یہ قصہ اور بزرگوں سے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ مولانا شاہ فخر الدین صاحب فن درویشی میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں کہ انہوں نے وہ نذر خندہ پیشانی کے ساتھ تعظیم سے کھڑے ہوکر قبول فرمائی اور ان سے کم درجہ شاہ ولی اللہ کا ہے کھڑے تو نہیں ہوئے مگر بخوشی نذر کو قبول فرمایا اور تیسرے درجہ پر مرزا صاحب کی نذر کی قبولیت کے ساتھ ملال بھی ظاہر فرمایا، یہ قصہ نقل فرما کر حضرت امام ربانی نے ارشاد فرمایا ''اس زمانہ کے بزرگوں کا یہی خیال تھا مگر میرے نزدیک تو حضرت مرزا صاحب کا درجہ بڑھا ہوا ہے کہ باوجود اس قدر نازک مزاج ہونے کے اتنا صبر وتحمل فرمایا اور کچھ مضائقہ نہیں، جواب عطاء فرمایا''۔ (تذکرۃ الرشید: ص۲۵۸؍ ج۲)

اس قصہ کو مختصر طور پر اورِح ثلاثہ میں بھی ذکر کیا گیا ہے، اس میں امیر شاہ خان صاحب نے بیان کیا ہے کہ یہ قصہ مجھ کو حضرت حاجی صاحب نے بھی سنایا اور حضرت نانوتوی نے بھی، حضرت گنگوہی نے بھی، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس قصہ کو بیان فرما کر یہ فرمایا کہ مولانا فخر الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی بات بہت انکساری کی ہے اس سے حیثیت ٹپکتی ہے اور مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی بات بڑھی ہوئی ہے کہ ان کے نفس نے اصلاً حرکت نہ کی اور حضرت گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ مرزا صاحب کی بات بہت بڑھی ہوئی، عدل کا اقتضا یہی ہے کہ جو کچھ مرزا صاحب نے فرمایا، حاشیہ پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ قولہ حضرت گنگوہی الخ اقول احقر کا میلان حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی رائے کی طرف ہے۔ (اورِح ثلاثہ: ص۱۶)

حضرت شاہ اسحاق کا واقعہ

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد اجمیر میں رہا کرتے تھے اور وہاں مواعظ کے ذریعہ سے اشاعتِ دین کرتے تھے انہوں نے حدیث **لا تشد الرحال** کا وعظ کہنا شروع کیا اور لوگوں پر اثر بھی ہوا، اتفاق سے شاہ اسحاق صاحب کا اس زمانہ میں قصد ہجرت ہوگیا، جب شاہ صاحب کے قصد کی ان کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے شاہ صاحب کو لکھا کہ جناب جب عازمِ سفر ہجرت ہوں تو اجمیر تشریف نہ لاویں، کیونکہ میں **لا تشد الرجال** کا وعظ کہہ رہا ہوں۔ لوگ راہ پر آ چلے ہیں آپ کی تشریف آوری سے جو کچھ اثر ہوا ہے اس کے غتر بود ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں اجمیر کے قصد سے نہ آؤں گا لیکن چونکہ اجمیر راستہ میں پڑے گا اور خواجہ صاحب ہمارے مشائخ میں ہیں، اس لیے مجھ سے نہ ہو سکے گا کہ میں بلا حاضر ہوئے بالا بالا چلا جاؤں، ہاں جب میں آؤں تم وعظ کہنا اور وعظ میں بیان کرنا کہ اسحاق نے غلطی کی جو وہ اجمیر آیا اس کا فعل حجت نہیں اور میرے سامنے کہنا اور یہ خیال نہ کرنا کہ شاید مجھے ناگوار ہوئے گا، مجھے ہرگز ناگوار نہ ہوگا اور میں اقرار کرلونگا کہ واقعی میری غلطی سے ہے اس سے وہ ضرور دفع ہو جائیگا جس کا تم کو اندیشہ ہے اور شاہ صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ یہ مجاور اور قبر پرست ہمارے رقیب ہیں، رقیبوں کے ڈر سے محبوب کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔

یہ قصہ اورِ ح ثلاثہ صفحہ ۱۱۸ میں بھی ذکر کیا ہے، اس میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کا حاشیہ ہے، قولہ وعظ میں بیان کرنا الخ۔ اقول کیا انتہا ہے، اس محبت دین ونصح مسلمین کا کہ اپنی شان کو ان پر بالکل نثار کر دیا، حالانکہ اس مقام میں علاوہ اس جواب کے کہ حدیث کے کیا معنی ہیں کہ یہ جواب تو خلاف مصلحت وتقیہ تھا، دوسرا اسہل جواب یہ ہو سکتا تھا کہ ہم خاص اس قصد سے نہیں آئے آگے جاتے ہوئے ٹھہر گئے، مگر اس کو بھی پسند نہیں کیا کہ ہر شخص ایسا بہانہ کر سکتا ہے، وہ جواب تجویز کیا جس میں شغب بالکل ہی قطع ہوگیا، گو اپنا جاہ بھی قطع ہوگیا ہو۔

مولانا اسماعیل شہید کے واقعات

ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ وعظ فرما رہے تھے، اثناء وعظ میں ایک شخص اُٹھا اور کہا کہ مولوی صاحب! ہم نے سنا ہے کہ تم حرامی ہو، آپ نے نہایت متانت سے جواب دیا، میاں تم نے غلط سنا ہے، میرے ماں باپ کے نکاح کے گواہ بڈھانہ پھلت اور خود دہلی میں ہنوز موجود ہیں اور یہ فرما کر وعظ شروع کر دیا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس حاشیہ میں

تحریر فرماتے ہیں کہ اس سے طالب علم کو معلوم ہوسکتا ہے کہ حضرت مولانا شہید کی تیزی سب دین کے لیے تھی ورنہ ہیجان نفس کا اس سے بڑھ کر اور کونسا موقع ہوسکتا تھا۔ (اورح ثلاثہ: ص ۵۷)

میرے حضرت شیخ مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ بھی اس نوع کا ایک واقعہ پیش آچکا ہے مسلم لیگ اور کانگریس کے ہنگامے میں بہت سے نالائقوں نے اخباروں میں حضرت قدس سرہٗ کی سیادت سے انکار کیا، اخباروں میں تو جھوٹ سچ، گالی گلوچ ہوتی رہتی ہے، مگر کسی احمق نے حضرت نور اللہ مرقدہ کو درس بخاری میں اس مضمون کا پرچہ دے دیا کہ اخبارات میں یہ شائع ہو رہا ہے، حضرت نے سبق کے دوران ہی میں نہایت متانت سے فرمایا کہ میرے والدین کے نکاح کے گواہ ابھی تک ٹانڈا اور فیض آباد وغیرہ کے نواح میں موجود ہیں، جس کا دل چاہے وہاں جاکر تحقیق کرلے اور سبق شروع کروادیا، چونکہ بخاری شریف کی جماعت بہت بڑی ہوتی تھی، اس لیے اثناء سبق میں سوالات کا دستور یہ تھا کہ سائل کوئی پرچہ لکھ کر واسطہ در واسطہ حضرت تک پہنچاتا اور حضرت اس پرچہ کو پڑھ کر سبق ہی میں اس کا جواب مرحمت فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کے سامنے تو آلہ مکبر الصوت ہوتا تھا، ہر جگہ آواز پہنچ جاتی تھی، مگر سائل کی آواز نہیں پہنچتی تھی، حضرت شاہ اسماعیل صاحب کے تو واقعات اس قسم کے بہت معروف و مشہور ہیں۔

رنڈی کے یہاں کا قصہ تو بہت مشہور ہے ایک مرتبہ حضرت مولانا عشاء کی نماز پڑھ کر جامع مسجد کے اس دروازہ سے باہر تشریف لے گئے جو قلعہ کی طرف ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اُٹھ کر لپک کر ان کو پکڑا کہ کہاں جاتے ہو، میں اس وقت تم کو تنہا نہ جانے دوں گا، اگر تم کہیں جاؤ گے میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ مولانا نے فرمایا کہ میں ایک خاص ضرورت سے جا رہا ہوں، تم مجھے جانے دو اور میرے ساتھ نہ آؤ۔ میں نے اصرار کیا گر وہ نہ مانے اور تنہا چل دیے، میں بھی ذرا فاصلے سے ان کے پیچھے ہولیا، خانم کے بازار میں ایک بڑی اور مشہور رنڈی کا مکان تھا، اس کا نام موتی تھا، مولانا اس مکان پر پہنچے اور آواز دی، تھوڑی دیر میں مکان سے ایک لڑکی نکلی اور پوچھا کہ تم کون اور کیا کام ہے۔ انہوں نے کہا، میں فقیر ہوں، وہ لونڈی یہ سن کر چلی گئی اور جاکر کہہ دیا کہ ایک فقیر کھڑا ہے، رنڈی نے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ جاکر دے دے، وہ لڑکی پیسے لے کر آئی، مولانا نے کہا میں ایک صدا کہا کرتا ہوں اور بغیر صدا کہے لینا میری عادت نہیں، تم اپنی بی بی سے کہو کہ میری صدا سن لے، اس نے جاکر کہہ دیا، رنڈی نے کہا کہ اچھا بلا لے، وہ بلا کرلے گئی، مولانا جاکر صحن میں رومال بچھا کر بیٹھ گئے اور سورۂ والتین ''ثم رددنہ اسفل سافلین'' تک تلاوت فرمائی، میں بھی وہاں پہنچ گیا اور جاکر مولانا کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔

مولانا نے اس قدر مؤثر تقریر فرمائی کہ گویا جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرادیا اس رنڈی کے

یہاں بہت سی اور رنڈیاں بھی تھیں ان کے علاوہ اور لوگ بھی بہت تھے، ان پر اس کا یہ اثر ہوا کہ سب لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے اور کہرام مچ گیا، انہوں نے ڈھولک ستار وغیرہ توڑنے شروع کر دیئے اور موتی اور اس کے علاوہ کئی رنڈیاں تائب ہوگئیں۔ اس کے بعد مولانا اُٹھ کر چل دیئے، میں بھی پیچھے پیچھے چل دیا، جب مولانا جامع مسجد کی سیڑھی پر پہنچے تو میں نے مولانا سے کہا کہ میاں اسماعیل! تمہارے دادا ایسے تھے، تمہارے چچا ایسے تھے اور تم ایسے خاندان کے ہو جس کی سلامی بادشاہ رہے ہیں، مگر تم نے اپنے آپ کو بہت ذلیل کر لیا، اتنی ذلت ٹھیک نہیں۔

اس پر مولانا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور حیرت سے میرے طرف دیکھا اور کھڑے ہو گئے، مجھ سے فرمایا مولانا! آپ نے یہ کیا فرمایا، آپ اس کو میری ذلت سمجھتے ہیں یہ تو کچھ بھی نہیں میں تو اس روز سمجھوں گا کہ آج میرے عزت ہوئی ہے جس روز دلی کے شہدے میرا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے مجھے چاندنی چوک میں نکالیں گے اور میں کہتا ہوں'' **قال اللّٰہ کذا و قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم کذا** '' یہ سن کر میرے یہ حالت ہوئی کہ میں کہنے کو تو کہہ گیا مگر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا اور زبان بند ہو گئی، اس کے بعد مجھے ان سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں، قولہ میں تو اس روز سمجھوں گا الخ اقول اللہ اکبر! مدعیان فنا آئیں اور دیکھیں فناء اس کو کہتے ہیں۔ (اورِ ح ثلاثہ: ص ۰۷)

یہاں ایک امر پر تنبیہ ضروری ہے کہ ہر شخص کو یہ درجہ یا حوصلہ نہیں کہ وہ وعظ کے بہانے رنڈی کے مکان پر پہنچ جائے اور کہہ دے کہ میں تو تبلیغ کرنے گیا تھا، یہ حق اسی کو حاصل ہے جو شاہ اسماعیل بن گیا ہو، اس کی فنائیت محقق ہو چکی ہو، دین کے اعلان و اشاعت میں کالا منہ کر کے گدھے پر گھمائے کو بھی عزت سمجھتا ہو اور مختصر الفاظ میں مامور من اللہ بن گیا ہو۔

حضرت شاہ اسماعیل رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ ادب بھی مشہور تھا کہ جس جلسہ میں حضرت سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہوتے اس جلسہ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وعظ نہیں فرماتے تھے، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے تواضع کے قصے جیسا کہ اُوپر لکھوا چکا ہوں **لا تعدو لا تحصیٰ** ہیں، ایک مرتبہ وعظ فرما رہے تھے، اس میں ایک حدیث نقل کی، اسی وقت ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں نے شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، آپ نے فرمایا ''مجھ کو خبر نہیں'' اسی وقت وعظ چھوڑ کر شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے اور تصدیق کی اور پھر وعظ کے جلسہ میں آ کر فرمایا، واقعی تم سچ کہتے ہو، یہ حدیث ضعیف ہے۔

(حسن العزیز: ص ۱۸۲ / ج ۳)

میں نے اپنے اساتذہ کے اساتذہ کا معمول سنا ہے کہ سبق پڑھانے کے دوران میں اگر کوئی طالب علم اشکال کرتا جس کا جواب سمجھ میں نہیں آیا تو دوران سبق میں اپنے اُستاذ سے جا کر پوچھ آتے اور آ کر تقریر فرماتے، حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے ترجیح الراجح کا سلسلہ اسی لیے قائم کیا ہے کہ جس کو میری تصانیف میں غلطی معلوم ہو مجھے تنبیہ کر دے تا کہ مجھے اگر اپنی غلطی کا سامنا ہو جائے تو اس سے بالا علان رجوع کر لوں، چنانچہ مجھ سے جہاں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے اس کا دل کھول کر بہت فراغ دلی سے اقرار کیا ہے اور جہاں مجھے شرح صدر اپنی غلطی کا نہیں ہوا وہاں دوسرے کا قول بھی نقل کر دیا تا کہ جو قول جس کے جی کو لگے وہ اسی کو اختیار کر لے، میں نے ہمیشہ یہی کیا خواہ مخواہ اپنی بات کو نبھایا نہیں۔

یہ برکت حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہے، ویسے تو یہ خصلت اپنے سب ہی اکابر میں تھی، لیکن جیسا رنگ مولانا (محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) میں اس صفت کا نمایاں تھا اور حضرات میں ایسا نہ تھا، دوران درس جہاں کسی مقام پر شرح صدر نہ ہوا، جھٹ اپنے کسی ماتحت مدرس کے پاس کتاب لیے جا پہنچے اور بے تکلف کہا کہ مولانا! یہ مقام میری سمجھ میں نہیں آیا، ذرا اس کی تقریر تو کر دیجئے، چنانچہ بعد تقریر کے واپس آ کر طلبہ کے سامنے اس کو دُہرا دیتے اور فرماتے کہ مولانا نے اس مقام کی یہ تقریر کی ہے، اسی طرح اگر کوئی طالب علم کسی مقام کی مولانا کی تقریر کے معارض تقریر کرتا اور وہ صحیح ہوتی تو اپنی تقریر سے فوراً درس ہی میں رجوع فرما لیتے اور صاف لفظوں میں فرماتے ہاں واقعی مجھ سے غلطی ہوئی، مولانا کو ایسی باتوں سے ذرا عار نہ آتی، بات یہ ہے کہ جن کی بڑی شان ہوتی ہے وہ کہیں ایسی باتوں سے گھٹتی ہے اگر کسی کی ایک من شان ہو اور اس میں سے ایک تولہ گھٹ جائے کی اس کی کمی کی کیا پرواہ ہوگی، ہاں جن کی ایک چھٹانک ہی شان ہوگی اس میں سے اگر آدھی چھٹانک جاتی رہے تو اس کے پاس آدھی چھٹانک ہی رہ جائے گی۔

(افاضات: ۹/۲ ص ۴۰۸)

کتاب ''تقویت الایمان'' کا ذکر

حضرت شاہ اسماعیل صاحب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''تقویۃ الایمان'' عربی میں تحریر فرمائی جس کا ایک نسخہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے کتب خانہ میں بھی تھا، ایک نسخہ امیر شاہ خان صاحب کے پاس اور ایک نسخہ مولوی نصر اللہ خان صاحب خورجوی کے کتب خانہ میں بھی تھا، اس کے بعد مولانا نے اس کو اُردو میں لکھا اور لکھنے کے بعد اپنے خاص خاص لوگوں کو جمع کیا، جن میں سید صاحب، مولوی عبد الحئی صاحب، شاہ اسحاق صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولوی فرید

الدین صاحب مرادآبادی، مومن خان صاحب، عبداللہ خان علوی صاحب بھی تھے۔

ان کے سامنے ''تقویۃ الایمان'' پیش کی اور فرمایا کہ میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آگئے اور بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا مثلاً ان امور کو جو شرک خفی تھے شرک جلی لکھ دیا گیا ہے، ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی اشاعت میں شورش ضرور ہوگی، اگر میں یہاں رہتا تو ان مضامین کو آٹھ دس برس میں بتدریج بیان کرتا، لیکن اس وقت میرا ارادۂ حج کا ہے اور وہاں سے واپسی کے بعد جہاد ہے، اس لیے میں اس کام سے معذور ہو گیا اور میں دیکھتا ہوں کہ دوسرا اس بار کو اُٹھائے گا نہیں، اس لیے میں نے یہ کتاب لکھ دی ہے گو اس سے شورش ہوگی، مگر توقع ہے کہ لڑ بھڑ کر خود ٹھیک ہو جائیں گے، میرا یہ خیال ہے اگر آپ حضرات کی رائے اشاعت کی ہو تو اشاعت کی جائے ورنہ اسے چاک کر دیا جائے۔

اس پر ایک شخص نے کہا کہ اشاعت تو ضرور ہونی چاہیے، مگر فلاں فلاں مقام پر ترمیم ہونی چاہیے، اس پر مولوی عبدالحئی صاحب، شاہ اسحاق صاحب، عبداللہ خان علوی صاحب اور مومن خان صاحب نے مخالفت کی اور کہا کہ ترمیم کی ضرورت نہیں ہے اور اسی طرح شائع کرنی چاہیے، چنانچہ اسی طرح اس کی اشاعت ہو گئی، اشاعت کے بعد مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ حج کو تشریف لے گئے اور حج سے واپسی کے بعد چھ مہینہ دہلی میں قیام رہا، اس زمانہ میں مولانا اسماعیل صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ گلی کوچوں میں وعظ فرماتے تھے اور مولوی عبدالحئی صاحب مساجد میں (یہ مواعظ جہاد کی ترغیب کے ہوا کرتے تھے) چھ مہینہ کے بعد جہاد کے لیے تشریف لے گئے، اس پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں، قولہ تشدد ہو گیا، اقول الخ۔ اس تشدد فی العلاج کا سبب مرض کا شدید ہونا ہے قولہ ورنہ اسے چاک کر دیا جائے، اقول ایسے بزرگ پر تشدد یا اصرار کا استبداد کا شبہ ظلم نہیں تو کیا ہے؟ (اورواحِ ثلاثہ: ص ۸۱)

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ اس کتاب سے بہت نفع ہوا، چنانچہ مولانا اسماعیل صاحب کی حیات ہی میں دو ڈھائی لاکھ آدمی دُرست ہو گئے تھے اور ان کے بعد جو کچھ نفع ہوا اس کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا، حضرت شاہ اسماعیل صاحب نور اللہ مرقدہ ایک زمانہ میں نہایت خوش پوشاک بہترین لباس پہنا کرتے تھے، اس زمانہ کا قصہ ہے کہ اکبری مسجد کے صحن میں پہلی صف میں کسی وجہ سے ایک پتھر نیچا ہو گیا تھا اور برسات کے موسم میں اس میں گارا کیچڑ ہو جاتا تھا، سب نمازی اپنے کپڑوں کو بچانے کے لیے اس کو چھوڑ کر کھڑے ہوا کرتے تھے، اس وجہ سے اس میں فرجہ رہتا تھا، ایک روز عمدہ پوشاک پہنے ہوئے مولانا اسماعیل صاحب اکبری مسجد میں

تشریف لائے، آپ نے صفِ اول میں فرجہ دیکھا، آپ اسی جگہ گارے کیچڑ میں بیٹھ گئے اور کپڑوں کا ذرا خیال نہ فرمایا۔ (اورحِ ثلاثہ:ص ۸۷)

حضرت شاہ غلام علی کا واقعہ

حضرت گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ شاہ غلام علی صاحب میں عجز وانکساری اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک سید نے شاہ صاحب کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ حضرت! آپ مجھے اپنا خادم بنا لیں، شاہ صاحب گھبرا اُٹھے اور فرمایا...... ہا...... ہا...... یہ لفظ ہرگز زبان سے نہ نکالنا تم فرزند علی ہو اور میں غلام علی ہوں۔ (تذکرۃ الرشید:ص۲۶۲رج۲)

حضرت مولانا مظفرحسین صاحب کے واقعات

حضرت مولانا مظفر صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا ایک واقعہ قریب ہی میں گزر چکا ہے کہ مولانا رشید احمد صاحب بہت اچھے آدمی ہیں، وہ بہت اچھے آدمی ہیں، بہت اچھے آدمی ہیں کہ حضرت مولانا مظفرحسین صاحب جب گنگوہ سے رامپور جارہے تھے تو حضرت گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ نے کھانے کی تواضع کی، حضرت مولانا نے فرمایا کہ دیر ہو جائے گی، جو گھر میں رکھا ہو دے دو، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے چند باسی روٹیوں پر اُڑد کی دال رکھ کر لادی اور حضرت مولانا مظفرحسین صاحب نے ان کو لپیٹ کر اپنی چادر میں باندھ لیا اور رامپور جا کر فرمایا کہ مولانا رشید احمد صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔

حسن العزیز میں لکھا ہے کہ مولانا مظفرحسین صاحب کاندھلہ میں ایک بزرگ تھے، درویش بھی تھے، زمیندار بھی تھے، طرز ایسا تھا کہ کوئی ان کو عالم نہ سمجھا تھا، ان کے عجیب وغریب معمولات تھے کھانے کے متعلق۔ ان کے قرابت دار مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی دہلی کے مدرسہ میں مدرس تھے، دہلی سے نانوتہ کا یہی راستہ تھا، کاندھلہ راستہ میں واقع ہوتا ہے، مولانا مظفرحسین صاحب نے ان سے شکایت کی کہ جب کبھی آپ آتے ہیں تو بلا ملے چلے جاتے ہیں مولانا مملوک صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اصرار نہ کیا جائے ٹھہرنے کا تو میں آجایا کروں گا، اس وقت بہلی میں سفر ہوتا تھا، اس روز سے معمول ہو گیا کہ کاندھلہ پہنچ کر جنگل میں بہلی چھوڑ کر مولانا مظفرحسین صاحب سے ملنے آتے، پھر وہ ان کو پہنچانے آتے، ایک دفعہ جب وہاں پہنچے تو اول سوال یہ تھا کہ کھانا کھاؤ گے یا کھا کر آئے ہو اور اگر کھاؤ گے تو رکھا ہوا کھاؤ گے یا تازہ پکوا دیا جائے، مولوی صاحب نے کہا کہ رکھا ہوا کھاؤں گا، بس ایک برتن میں کھچڑی کی کُھرچن لاکر رکھ دی کہ رکھا ہوا تو یہ ہے، انہوں نے وہی کھالی۔ (حسن العزیز:ص ۲۷۰)

حضرت مولانا ہی کا ایک واقعہ اور ہے کہ قصبہ بڈولی میں ایک دفعہ مولانا وہاں کی سرائے میں ٹھہرے، برابر میں ایک بنیا مع اپنے لڑکے کے ٹھہرا ہوا تھا اور لڑکے کے ہاتھ میں سونے کے کڑے تھے، مولانا کی اس سے بات چیت ہوتی رہی، جیسا کہ سفر میں عادت ہے کہ مسافر آپس میں بات چیت کیا کرتے ہیں، اس نے پوچھا میاں جی کہاں جاؤ گے، مولانا نے سب بتا دیا کہ فلاں جگہ اور فلاں راستہ سے جاؤں گا، اس کے بعد مولانا تہجد پڑھ کر روانہ ہو گئے، اس لڑکے کے ہاتھ میں سے کسی نے کڑے اُتار لیے، بنیا اُٹھا تو دیکھا کڑے ندارد، بس اس کی تو رُوح فنا ہو گئی، دیکھا کہ وہ میاں جی بھی نہیں، جن سے رات بات چیت ہو رہی تھی، اس نے کہا ہو نہ ہو وہی لے گئے، یہ کوئی ٹھگ تھا، وہ اسی راستہ پر روانہ ہوئے جس پر مولانا نے جانے کا ارادہ بیان کیا تھا، یہاں تک کہ مولانا اس کو مل گئے، بس پہنچتے ہی اس نے ایک دھول رسید کیا، مولانا نے کہا کیا ہے؟ کہنے لگا کڑے کہاں ہیں؟ مولانا نے کہا کہ بھائی میں نے تیرے کڑے نہیں لیے، اس نے کہا ان باتوں سے کیا تو چھوٹ جائے گا، میں تجھے تھانے لے چلوں گا، مولانا نے کہا کچھ عذر نہیں میں تھانہ بھی چلا چلوں گا، غرض وہ مولانا کو پکڑ کر جھنجھانہ کے تھانہ میں پہنچا، اتفاقاً تھانہ دار مولانا کا بڑا معتقد تھا، اس نے دیکھا کہ مولانا آرہے ہیں، کھڑا ہو گیا اور دُور سے ہی آلیا، یہ دیکھ کر بنیے کے ہوش خطا ہو گئے، مگر مولانا اس سے کہتے ہیں بھاگ جا، بھاگ جا، تجھے کوئی کچھ نہ کہے گا، تھانہ دار نے مولانا سے پوچھا یہ کون تھا، مولانا نے کہا تم اسے کچھ نہ کہو جانے دو، اس کی چیز کھو گئی ہے اس کی تلاش میں آیا تھا، دیکھئے کیا بے نفسی ہے، لطف یہ کہ نرا عفو ہی نہیں بلکہ مولانا اس کے احسان مند بھی ہوئے چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ اس سے مجھے بڑا نفع ہوا، جب لوگ مصافحہ کرتے ہیں، میرے ہاتھ چومتے جاتے ہیں تو میں نفس سے کہتا ہوں کہ تو وہی ہے جس کے ایک بنیے نے دھول لگایا تھا، بس اس سے عجب نہیں ہوتا۔ (حسن العزیز: ص ۲۳۹ رج ۲)

حضرت حاجی صاحب کے بعض واقعات

اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ ایسا وظیفہ بتا دیجئے کہ خواب میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہو جائے، حضرت نے فرمایا کہ آپ کا بڑا حوصلہ ہے، ہم تو اس قابل بھی نہیں کہ روضۂ مبارک کے گنبد شریف کی زیارت نصیب ہو جائے، اللہ اکبر کس قدر شکستگی و تواضع کا غلبہ تھا، اس پر حضرت والا (حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ) نے فرمایا، یہ سن کر ہماری آنکھیں کھل گئیں، حضرت کی عجیب شان تھی، اس فن کے امام تھے، ہر بات میں شان محققیت و حکمت ٹپکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرت کے خادموں میں سے

کوئی محروم نہیں رہا، حضرت حاجی صاحب کی خود یہ حالت تھی کہ اپنے ہر ہر خادم کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کے آنے والوں کے قدموں کی زیارت کو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھتا ہوں، حضرت پر شان عبدیت کا غلبہ رہتا تھا، وہ عبدیت ہی اس ارشاد کا منشاء تھا، مطلب یہ تھا کہ اپنی اہلیت کا اعتقاد نہ رکھتے، باقی تمنا کی ممانعت نہیں۔ (افاضات: ص۹۷رج۱)

امیر شاہ خاں صاحب نے فرمایا کہ ایک شخص پنجابی ڈاکٹر مکہ معظمہ گیا ہوا تھا، حافظ صاحب کی بیوی سے ان کا نکاح ہو گیا تھا، اس نکاح میں کچھ باتیں حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت کے خلاف بھی ہوئی تھیں اور یہ ڈاکٹر اچھا آدمی بھی نہیں تھا، چنانچہ میں اس کو مکہ جانے سے پہلے سے جانتا تھا، اس ڈاکٹر نے ایک مرتبہ گستاخانہ طور پر حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ مجھے آپ کے اندر کوئی کمال نظر نہیں آیا، رہی آپ کی شہرت، سو یہ مولوی رشید احمد صاحب اور مولوی محمد قاسم صاحب کی وجہ سے ہوئی ہے، پھر مجھے حیرت ہے کہ مولوی رشید احمد صاحب اور مولوی محمد قاسم صاحب آپ سے کس طرح بیعت ہوئے، اللہ رے نفوس قدسیہ کہ اس کو سن کر ذرا تغیر نہیں ہوا اور مسکرا کر فرمایا کہ ہاں بھائی بات تو ٹھیک کہتے ہو، مجھے خود بھی حیرت ہے کہ یہ حضرات میرے کیوں معتقد ہو گئے اور لوگ مجھے کیوں مانتے ہیں۔ (اورحِ ثلاثہ: ص۱۷۰)

حضرت گنگوہی کے واقعات

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں کہ سچی تواضع اور انکسارِ نفس جتنا امام ربانی میں دیکھا گیا دوسری جگہ کم نظر سے گزرے گا، حقیقت میں آپ اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھتے تھے، بحیثیت تبلیغ جو خدمتِ عالیہ آپ کے سپرد کی گئی تھی یعنی ہدایت و رہبری اس کو آپ انجام دیتے، بیعت فرماتے، ذکر و شغل بتاتے، نفس کے مفاسد وقبائح بیان فرماتے اور معالجہ فرماتے تھے، مگر بایں ہمہ اس کا کبھی وسوسہ بھی آپ کے قلب پر نہیں گزرتا تھا کہ میں عالم ہوں اور یہ جاہل ہیں، میں پیر ہوں اور یہ مرید ہیں، میں مطلوب ہوں اور یہ طالب، مجھے ان پر فوقیت ہے، میرا درجہ ان کے اُوپر ہے، کبھی کسی نے نہ سنا ہوگا کہ آپ نے اپنے خدام کو خادم یا متوسل یا منتسب کے نام سے یاد فرمایا ہو، ہمیشہ ''اپنے لوگوں'' سے تعبیر فرماتے اور دعاء میں یاد رکھنے کی ضرورت اپنے لیے طالبین سے بھی زیادہ ظاہر فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ تین شخص بیعت کے لیے حاضر آستانہ ہوئے، آپ نے ان کو بیعت فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ تم میرے لیے دُعاء کرو میں تمہارے لیے دعاء کروں، بعض مرید بھی پیر کو تیرا لیتا ہے۔

(تذکرۃ الرشید: ص۱۷۴رج۲)

دوسری جگہ لکھتے ہیں اپنے متعلق انکسار وتواضع کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی تقریر سے اپنی خوبی کا کچھ بھی اثر ظاہر ہوا تو معًا اس کی تردید فرماتے اور اپنے سے اس انتساب کی نفی فرما دیا کرتے تھے، ایک بار حضرت شیخ عبدالقدوس رحمہ اللہ تعالیٰ کے خرقہ کا تذکرہ فرما رہے تھے کہ پچاس برس حضرت کے بدن پر رہا ہے، اس ضمن میں فرمایا، اسی حجرہ میں حضرت شیخ اور شیخ جلال تھانیسری رہا کرتے تھے، بیچ میں دیوار حائل تھی، سوکہاں تو فقر کا یہ حال تھا اور اب اسی حجرہ میں دنیا بھری پڑی ہے۔

(تذکرۃ الرشید: ص۱۲۹رج ۲)

حضرت حکیم الامت تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے مولانا گنگوہی کی خدمت میں اپنے کچھ حالات لکھے، مولانا نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ''بھائی ہمیں تو اب تک بھی یہ حالات نصیب نہیں ہوئے''۔ کیا ٹھکانہ ہے تواضع کا، پھر فرمایا کہ مولانا گنگوہی نے ایک جگہ قسم کھائی ہے کہ مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے، بعض مخلص لوگوں کو اس سے شک ہو گیا کہ مولانا میں کمال کا ہونا تو ظاہر ہے تو اس قول سے مولانا کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، پھر ہمارے حضرت (حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ) نے مولانا کے قول کی تفسیر میں فرمایا کہ بزرگوں کو آئندہ کمالات کی طلب میں موجودہ کمالات پر نظر نہیں ہوتی، پس مولانا اپنے کمالاتِ موجودہ کی کمالاتِ آئندہ کے سامنے نفی خیال فرماتے تھے۔

(حسن العزیز: ص۱۱۱رج ۲)

ایک مولوی صاحب نے مولانا کی ایک تقریر سن کر جوش میں آکر کہا کہ آپ کے پاس آکر تو حدیث بھی حنفی ہو جاتی ہے، مطلب یہ تھا کہ آپ تو ہر حدیث سے حنفیہ کی تائید فرماتے ہیں اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے، اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہ کیا کہا اگر حضرت امام شافعی زندہ ہوتے تو کیا میں ان کے سامنے بولتا بھی؟ اور بولتا تو کیا میں تو ان کی تقلید کرتا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تقلید کو چھوڑ دیتا، کیونکہ مجتہد حی کے ہوتے مناسب نہیں ہے، مجتہد غیر حی کی تقلید کی جائے۔

(افاضات یومیہ: ۲/۹ص۴۳۹)

امیر شاہ خان صاحب نے نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خود مجھ سے بیان فرمایا کہ جب میں ابتداء میں گنگوہ کی خانقاہ میں آکر مقیم ہوا ہوں تو خانقاہ میں بول وبراز نہ کرتا تھا بلکہ باہر جنگل جاتا تھا کہ شیخ کی جگہ ہے، حتیٰ کہ لیٹنے اور جوتے پہن کر چلنے پھرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

(اورحِ ثلاثہ: ص۲۸۸)

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ اپنے مکاتیب میں جو مکاتیب رشیدیہ کے نام سے طبع ہوئے ہیں، حضرت سہارنپوری کے نام سفرِ حجاز سے تحریر فرماتے ہیں، آپ کا نامہ آیا، یاد الفت کو دلایا، تم کو ذخیرہ

خیرات جانتا ہوں، تم قابلِ فراموشی نہیں ہو، دعاء کا طالب ہوں، (مکاتیب صفحہ ۳۸) ایک اور خط میں حضرت سہارنپوری کو لکھتے ہیں کہ آپ کا خط آیا حال معلوم ہوا، واردات رجوع الی اللہ تعالیٰ موجب فرحت ہیں، حق تعالیٰ کا نہایت شکر کرنا لازم ہے کہ بڑی نعمت کبریٰ ہے کہ بمقابلہ اس کے لاکھوں جہاں مثل پر پشہ بھی نہیں اور اس احقر کو تو نہایت ہی باعثِ شکر وافتخار ہے کہ اگر خود ایسی عطیات سے محروم ہے بارے احباب کو عطاء متواتر ہے۔

در گور برم از سر گیسوئے تو تارے
تا سایہ کند بر سر من روز قیامت آمین

(مکاتیب: ص۴۰)

ایک خط میں حضرت سہارنپوری کو لکھتے ہیں، آپ کا خط آیا تھا بندہ کو بعد سخت بیماری بخار موسم کے اب افاقہ ہوا ہے، آپ کا جواب پسند آیا تھا، اس کی تحسین میں خط لکھنا ضرور نہ جانا تھا، اب حادثہ جدیدہ یہ ہوا کہ مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم (صدر مدرس مظاہر علوم) ۲۴ شب ذی الحجہ یکشنبہ کو فوت ہوئے، عالم اندھیرا ہوا، اب سب رفیق رخصت ہوئے، دیکھئے کب تک میری قسمت میں اس دنیا کے دھکے لکھے ہیں۔ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن''۔ (مکاتیب: ص۴۴)

ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ نسبت یادداشت واحسان تھی کہ شمہ اس کا میرے سعید ازلی قرۃ العینین خلیل احمد کو نصیب ہوئی، جس پر ہزار فخر وناز یہ بندہ ناساز کر کے اپنا وسیلہ قرار دیئے مطمئن بیٹھا ہے، اگر چہ خود اس دولت سے محروم رہا، مگر ناؤدان اپنے دوستوں کا بنا اگر چہ سواقی کو ماءِ نہر سے حظ نہ ہو کہ مبدأ حوض ہے اور منتہاء مزرع، مگر تاہم کوئی حصہ سواقی کو بھی ہے گو معتد بہا نہ ہو، پھر آپ کی پوری تسلی کرتا ہوں کہ مولوی صدیق صاحب انبہٹوی کو جو کچھ یہ انکشافات ہیں ان کے ہی قلبی ہیں نہ اس مدبر کی طرف سے سوائے راہ بتانے کے اس کا کام کچھ نہیں، ان انوار و واردات سے خود بھی عاطل رہا ہے، مدت العمر میں اس قسم کو مشاہدہ نہیں کیا، ہاں نسبت حضور کا قدر نصیب مقدر حصہ ملا ہے جس کا ہم پلہ ان ہزارہا انوار کو کچھ نہیں جانتا، تو جب خود ان سے غافل ہوں تو تم کو کہاں سے آگاہ کروں، ہاں اس قدر ہے کہ آپ کی نسبت کو جس قدر اس عاجز سے مناسبت ہے، اس قدر مناسبت نہیں، وہ حالات اپنے اختیار سے خارج ہیں، نہ افسوس سے ہاتھ آئے نہ مجاہدہ سے حاصل ہوئے، ہاں زیادہ تر مشغولی کرنا ضرور ہے تا کہ وہی حضور ترقی پر آجائے اور میرے واسطے بھی دعاء توجہ فرمادیں کہ بسبب مناسبت ساتھ ہی رہوں اور دوستوں کی ترقی کا طالب ہی رہوں اور دوستوں کی ترقی کا طالب ہوں ''المرء مع من احب'' جب اسفل سے اعلیٰ

کی جانب مرعی ہے، اعلیٰ سے اسفل میں بھی ملحوظ ہے۔ زیادہ بجز دعاء ترقی کے کیا لکھوں، می سوز، می دوز، می پیچ و می خروش۔

والله يهدينا و اياكم

فقط والسلام

۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ یکشنبہ

(مکاتیب: ص ۴۶)

ایک اور خط میں مولانا روشن علی خاں کو لکھتے ہیں کہ اپنا جو حال ہے لکھ نہیں سکتا، محض بیگانہ ہوں، چند باتیں اور بس فقط۔ (مکاتیب: ص ۷۰)

ایک اور خط میں مولانا موصوف کو لکھتے ہیں کہ حالات آپ لوگوں کے دریافت ہو کر خود شرمندہ و محجوب ہوا کہ آپ کو بندہ کے ساتھ یہ حسنِ عقیدت ہے اور خود ہیچ در ہیچ ہوں، کاش آپ کے حسنِ عقیدت کی وجہ سے مغفور ہو جاؤں، حق تعالیٰ رحم فرمائے۔ (مکاتیب: ص ۷۲)

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے واقعات

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے متعلق امیر شاہ خان صاحب لکھتے ہیں کہ حکیم عبدالسلام صاحب ملیح آبادی کو مولانا نانوتوی کی خدمت میں جانے کا بہت شوق تھا، مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ جب تو حضرت کی خدمت میں جائے مجھے اپنے ساتھ ضرور لے چلنا، لیکن مجھ بدنصیب کے دل میں ایک خیال جم گیا تھا وہ یہ کہ حکیم صاحب بہت خوش بیان و گویا آدمی ہیں، بہت طویل قصہ ہے، حکیم صاحب دوسری مرتبہ میرے ساتھ خود بخود ہو گئے اور جب دیوبند پہنچے مغرب کا بعد ہو چکا تھا اور مولانا کا قیام مولانا محمودالحسن صاحب کے مکان پر تھا، جب مکان تقریباً پچاس قدم رہ گیا تو میں چند قدم آگے بڑھ کر مولانا کے پاس پہلے پہنچ گیا، مولانا کا لباس اس وقت یہ تھا کہ سر پر میلا اور پھٹا ہوا عمامہ تھا جس میں لیرے پڑے ہوئے تھے اور چونکہ سردی کا زمانہ تھا اس لیے ایک دھوتر کی نیلی رنگی ہوئی مرزئی پہنے ہوئے تھے جس میں بند لگے ہوئے تھے اور نیچے نہ کرتا تھا (کرتا پہنتے ہی نہ تھے) اور نہ انگرکھا تھا اور ایک رزائی اوڑھے تھے جو نیلی رنگی تھی اور جس میں موی کی گوٹ لگی ہوئی تھی جو پھٹی ہوئی تھی اور کہیں تھی اور کہیں بالکل اڑائی ہوئی تھی، میں نے سلام کر کے مصافحہ کیا اور حکیم صاحب کی آمد کی اطلاع کی، میں تعارف کرا ہی رہا تھا کہ اتنے میں حکیم صاحب بھی آ گئے۔

اس وقت مجلس کا یہ رنگ تھا کہ دروازہ کے سامنے مولوی ذوالفقار علی صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے برابر میں مظفر نگر کے ایک عالم بیٹھے ہوئے تھے اور مولانا ایک طرف کو چارپائی سے کمر

لگائے بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے برابر میں دیو بند کے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جو لباس بھی عمدہ پہنے ہوئے تھے اور ڈاڑھی بھی شاندار تھی، جب حکیم عبدالسلام صاحب پہنچے تو سب لوگ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے، حکیم صاحب مولانا کے دھوکہ میں سب شاندار لوگوں سے مصافحہ کرتے رہے مگر مولانا کی طرف متوجہ نہ ہوئے میں نے بتایا کہ مولانا یہ ہیں تو وہ مولانا سے مصافحہ کر کے وہیں بیٹھ گئے، طویل قصہ اورِ ح ثلاثہ میں لکھا ہے، مجھے تو صرف حضرت مولانا کی تواضع کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ (اورِ ح ثلاثہ: ص۲۰۹)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں کہ مولانا کی سادگی کا ڈھنگ یہ تھا کہ جب وہ میرے پاس رہتے تھے تو مولوی صاحب کی صورت پر جذب کی حالت برستی تھی، بال سر کے بڑھ گئے تھے نہ دھونا، نہ کنگھی، نہ تیل، نہ کترے، نہ درست کیے عجیب صورت حال تھی، بعض احباب کی زبانی سنا ہے کہ چھاپا خانے میں جناب مولوی احمد علی صاحب کے ہاں جب مولوی صاحب کام کیا کرتے تھے مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی کہہ کر پکارتے ہیں اور آپ بولتے نہیں کوئی نام لے کر پکارتا خوش ہوتے، تعظیم سے گھبراتے، بے تکلف ہر کسی سے رہتے، اب تک جو شاگرد یا مرید تھے ان سے یارانہ کے طور پر رہتے اور کچھ اپنے لیے صورت تعظیم کی نہ رکھتے، علماء کی وضع عمامہ یا کرتا کچھ نہ رکھتے، ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع عمامہ یا کرتا کچھ نہ رکھتے، ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا میں (مولانا محمد یعقوب صاحب) کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کس نے کیا جانا، جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے، کیا اس میں ظاہر ہوئے اور آخر سب کو خاک میں ہی ملا دیا اپنا کہا کر دکھایا، مسئلہ بھی نہ بتلاتے حوالہ کسی پر فرماتے، فتویٰ نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار، اول امامت سے بھی گھبراتے آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے، وعظ بھی نہ کہتے تھے، جناب مولوی مظفر حسین صاحب مرحوم کاندھلوی نے اول وعظ کہلوایا اور خود بھی بیٹھ کر سنا اور بہت خوش ہوئے۔ (سوانح قاسمی: ص۳۱)

مولانا امراء سے بھی بہت گھبراتے تھے اور کسی امیر سے ملاقات کا موقع نہیں آنے دیتے تھے، خورجہ کے ایک رئیس برسوں سے تمنا میں تھے کہ میرے گھر پر ایک دفعہ حضرت والا آجائیں مگر وہ کامیاب نہ ہوتے تھے، اتفاق سے جنگ روم وروس چھڑ گئی اور حضرت نے ترکوں کی اعانت کے لیے چندہ کی تحریک شروع کی، جو اس زمانہ میں سلطانی چندہ کے نام سے معروف ہوئی، ان رئیس صاحب کے لیے یہ زریں موقع ہاتھ لگ گیا، انہوں نے کہلوایا کہ اگر حضرت والا ان کے گھر تشریف لا کر وعظ فرمائیں تو وہ سلطانی چندہ میں دس ہزار روپے دیں گے، حضرت نے منظور فرمالیا

اوران کے یہاں وعظ فرمایا، انہوں نے حسب وعدہ دس ہزار روپے پیش کیے، ختم مجلس پر حضرت اُٹھے تو مجمع بھی اُٹھا اور لوگوں میں حضرت کی مہمانی کے بارہ میں کہا سنی ہوئی اور ردوقدح ہونے لگی، ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ حضرت کو میں اپنے گھر لے جا کر مہمان بناؤں، لوگ تو اس جھگڑے اور بحث میں سر گرداں تھے اور حضرت اسی ہجوم میں آہستہ سے نکل کر روانہ ہو گئے، مغرب کا وقت آچکا تھا اذان ہونے والی تھی، حضرت والا شہر کے کنارے ایک غیر معروف مسجد میں پہنچے، وہاں اتفاق سے امام مسجد موجود نہ تھا لوگوں میں تشویش ہوئی کہ نماز کون پڑھائے، ہر ایک دوسرے پر ٹالتا تھا، چند ایک نے حضرت جی سے کہا کہ بھائی تم ہی نماز پڑھا دو، (یہ لوگ حضرت کو پہچانتے نہ تھے) مگر حضرت عذر فرماتے رہے، جب کوئی بھی امامت کے لیے تیار نہ ہوا تو لوگوں نے حضرت سے یہ کہہ کر زبردستی امامت کے لیے مصلے پر دھکیل دیا کہ بندۂ خدا تو مسلمان تو ہے، کہ تجھے دو چار سورتیں بھی قرآن شریف کی یاد نہیں جو امامت سے اتنا گھبرا رہا ہے، حضرت نے اب مجبور ہو کر امامت کرائی۔

مگر عجیب اتفاق یہ پیش آیا کہ پہلی رکعت میں تو ''قل اعوذ برب الناس'' پڑھ گئے اور دوسری میں ''قل اعوذ برب الفلق'' ختم نماز پر اس مسجد کے ان پڑھ نمازیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ یہ عجیب آدمی ہے جس نے قرآن ہی اُلٹا پڑھ دیا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ میں امامت کے لائق نہیں ہوں لوگوں نے کہا کسی کو کیا پتہ تھا کہ تو قرآن بھی سیدھا پڑھنا نہیں جانتا، حضرت نے اس پر یہ فرمایا کہ مولویوں سے یہ سنا ہے کہ نماز تو اس طرح بھی ہو جاتی ہے اس پر لوگوں نے تند لہجہ میں کہا چوری اور سینہ زوری، ایک تو نماز اُلٹی پڑھا دی اور اُوپر سے مولویوں کو بدنام بھی کرتا ہے، یہاں یہ جھگڑا چل رہا تھا کہ حضرت کو ڈھونڈتی ہوئی ایک جماعت ادھر آنکلی اور دیکھا کہ حضرت جاہلوں میں گھرے ہوئے ہیں، تب انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ تم کس کے ساتھ یہ معاملہ کر رہے ہو یہ تو مولانا محمد قاسم ہیں، اس پر لوگ نادم ہوئے اور عجز و نیاز سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ (سوانح قاسمی: ص ۳۹۵ رج ۱)

شیخ المشائخ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا معمول یہ تھا کہ لوگ بیعت و ذکر و شغل کے بعد اپنے حالات بیان کرتے مگر حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کچھ نہ عرض کرتے۔ ایک مرتبہ حضرت حاجی نور اللہ مرقدہٗ نے خود ہی دریافت کیا کہ آپ کچھ نہیں بیان کرتے، حضرت کے اس استفسار پر حضرت نانوتوی رونے لگے، پھر بڑے یاس انگیز الفاظ میں فرمانے لگے کہ اپنا حال کیا بیان کروں جہاں تسبیح لے کر بیٹھا بس ایک مصیبت ہوتی ہے اس قدر گرانی کہ جیسے سو سو من کے پتھر کسی نے رکھ دیئے ہوں، زبان و قلب سب بخ بستہ ہو جاتے ہیں، حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ

تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مبارک ہو مولانا! حق تعالیٰ شانہ کے اسم علیم کے ساتھ آپ کو خصوصی نسبت ہے اور اسی نسبتِ خصوصی کے یہ آثار ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ آپ کو کرایا جارہا ہے، یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور پاک کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا جس کی تشریح خاں صاحب نے حاجی صاحب کی نقل سے یہ کی کہ تم سے حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے جا کر دین کی خدمت کرو، ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دو۔

(مختصر من سوانح قاسمی: ص۲۵۹رج۱)

حکیم منصور علی صاحب اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ کے سفر میں میں حضرت کے ہم رکاب تھا، قبہ خضراء جونہی نظروں کے سامنے ہوا مولانا نے اپنے نعلین اُتار کر بغل میں دبالی اور پا برہنہ چلنا شروع کیا، میں نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی جوتیاں اُتار کر ننگے پیر ہمراہ مولانا مرحوم کے چلنا شروع کیا، اس قدر پتھریاں پاؤں میں چبھنے لگیں کہ متحمل نہ ہوسکا، آخر جوتا پہن کر چلنے لگا، جو کنکریاں ایک پٹھان نوجوان کے پاؤں کے لیے ناقابلِ برداشت بن چکی تھی، مگر مولانا مرحوم جو از فرق تا قدم نہایت نازک و نرم اندام تھے، اسی خاردار جنگل میں مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب کی تاریکی میں چلتے رہے کہ قوتِ عشق کے نزدیک سنگ و گل برابر ہے۔

(سوانح قاسمی: ص۱۵۶رج۱)

مولانا احمد حسن صاحب امروہوی فرماتے تھے کہ جب شاہجہاں پور کا مناظرہ ہوا تو مولانا بنفسِ نفیس چپکے سے تشریف لے گئے، جب مولانا محمود حسن صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی مولانا کے بعد پیچھے پیچھے تشریف لے گئے اور میں (مولانا احمد حسن بھی) بعد میں گیا تو شاہجہاں پور میں مولانا محمود الحسن صاحب سے میری ملاقات ہوئی، میں نے دریافت کیا کہ کیا مولانا مل گئے؟ مولانا محمود الحسن صاحب نے فرمایا کہ نہیں، مجھ کو تو ابھی نہیں ملے، تو میں نے کہا کہ اچھا چلو سرائے میں چل کر تلاش کریں، چنانچہ سرائے میں جا کر اس شخص سے معلوم کیا جو شخص نام لکھا کرتا تھا کہ یہاں کوئی شخص خورشید حسن بھی آئے، اس نے کہا کہ ہاں آئے ہیں، چنانچہ ہم نے تلاش کیا تو ایک کوٹھری کے اندر مولانا تشریف رکھتے تھے، جب صبح ہوئی تو مولانا میدانِ مناظرہ میں تشریف لے چلے، راستہ میں ایک دریا پڑتا تھا، مولانا پیدل تھے، تو مولانا پاجامہ پہنے ہوئے دریا میں اُتر پڑے جس سے پاجامہ بھیگ گیا، خیر مولانا نے پار اُتر کر لنگی باندھی اور پاجامہ اُتار کر نچوڑ کر پیچھے لاٹھی پر گاؤں والوں کی طرح سے ڈال لیا اور تشریف لے چلے اور میدان مناظرہ میں پہنچ گئے۔

(اورحِ ثلاثہ: ص۲۷۶)

مولانا احمد حسن صاحب فرماتے ہیں کہ ایک جولاہے نے مولانا محمد قاسم صاحب کی دعوت کی،

اتفاق سے اس روز بارش ہوگئی اور وہ جولاہا وقت پر بلانے نہ آیا تو مولانا خود اس جولاہے کے یہاں تشریف لے گئے، اس نے عرض کیا کہ حضرت چونکہ آج بارش ہوگئی تھی، اس لیے میں دعوت کا انتظام نہ کرسکا، مولانا نے فرمایا، انتظام کیا ہوتا ہے، تمہارے یہاں کچھ پکا بھی ہے، اس نے کہا، جی ہاں وہ تو موجود ہے، فرمایا کہ بس وہی کھالیں گے، چنانچہ جو کچھ معمولی کھانا ساگ وغیرہ اس کے یہاں تیار تھا وہ بخوشی مولانا تناول فرما کر تشریف لے آئے اور فرمایا بس جی تمہاری دعوت ہوگئی۔ (اورِح ثلاثہ: ص ۲۷۴)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مولانا نانوتوی کی شان عالمانہ تھی اور نہ دُرویشانہ، بلکہ عاشقانہ تھی اور آپ کی مجلس دوستانہ ہوتی تھی، گاڑھے کے کپڑے پہنتے تھے، ایک مرتبہ دیوبند سے نانوتہ کو تشریف لیے جاتے تھے، ایک جولاہے نے بوجہ سادگی کے اپنا ہم قوم سمجھ کر پوچھا کہ آج کل سوت کا کیا بھاؤ ہے، مولانا نے جواب دیا کہ بھائی آج بازار جانا نہیں ہوا، وہ جولاہا بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ (حسن العزیز: ص ۲۷۴/ج ۲)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے واقعات

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر دار العلوم دیوبند کے متعلق ابھی لکھوا چکا ہوں کہ وہ سبق کے درمیان میں اُٹھ کر ماتحت مدرسوں سے پوچھ آتے تھے کہ مولانا اس عبارت کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ حسن العزیز میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے تمام مجمع میں خوش پوشاک، نازک مزاج، نازک بدن تھے اور حسین بھی ایسے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ شہزادہ ہیں، ان کی حکایت ہے کہ موضع املیا کے ایک شخص نے مولانا کی مع طالب علموں کے آموں کی دعوت کی، وہ گاؤں دیوبند سے تین کوس ہے، سواری بھی نہیں لایا، مولانا مع رفقاء کے پیدل گئے اور آم کھائے، جب چلنے لگے تو اس نے بہت سے آم گھر لے جانے کے لیے دیئے اور بدتمیزی یہ کی کہ ان کے پہنچانے کے لیے مزدور تک نہ دیا گیا، بس سامنے لاکر رکھ دیئے کہ ان کو لیتے جایئے، مولانا کا حصہ بھی اوروں سے زیادہ ہی دیا گیا، سب اپنے اپنے آم کپڑے میں باندھ کر چلے، مولانا بھی بغل میں لے کر چلے، ایک طرف کی بغل دکھ گئی تو دوسری طرف لے لیا، جگہ تھی دور، بار بار کروٹیں بدلتے تھے، یہاں تک کہ جب دیوبند پہنچے تو ہاتھ بہت زیادہ تھک گئے، مولانا نے اس گھٹڑی کو سر پر رکھ لیا اور فرماتے ہیں کہ یہ ترکیب پہلے سے سمجھ میں نہ آئی، اس وقت حالت یہ تھی کہ مولانا کو دونوں طرف سے بازار میں سلام ہو رہے تھے اور مولانا جواب دیتے جاتے تھے، اس حالت میں مولانا کو ذرا بھی تغیر نہ تھا،

سبحان اللہ کیا تواضع ہے نفس ان حضرات میں تھا ہی نہیں۔

(حسن العزیز: ص ۲۴۰؍ ج ۴)

حضرت سہارنپوری کے واقعات

حضرت اقدس سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے تواضع کے قصے تو حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں سترہ سال قیام میں نہ معلوم کتنے دیکھے، اس لیے رجب ۲۸ ھ میں سہارنپور حاضری ہوئی تھی اور ذیقعدہ ۴۵ ھ میں مدینہ پاک میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ سے مفارقت ہوئی، ہر ہر موقع پر تواضع و انکسار نشست و برخاست میں خوب ہی دیکھنے کے مواقع ملے، اسفار میں بھی بہت دفعہ ہمرکابی رہی، خدام کے ساتھ سامان اُٹھانے میں ذرا بھی حضرت کو تامل نہ ہوتا تھا، ریل پر اُترنے میں چڑھنے میں کچھ سامان حضرت نور اللہ مرقدہٗ بے تکلف اُٹھالیا کرتے تھے، خدام عرض کرتے ہیں کہ ہمیں دے دیجئے، فرماتے کہ وہ بڑا سامان رکھا ہے اُٹھالو، دعوتوں میں بھی حضرت کے ساتھ اکثر شرکت ہوئی، کبھی امتیازی جگہ پر داعی کی درخواست بغیر نہ بیٹھتے میں نے دیکھا کیف ما اتفق تشریف رکھنے کا ارادہ کرتے، مگر داعی کی درخواست پر ممتاز جگہ میں بھی انکار نہ کرتے تھے۔

ایک مسئلہ میں حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ اور بعض علماء کا اختلاف ہوا تو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کو حکم بنانے پر فریق ثانی کو راضی کرلیا، جس کی تفصیل خوانِ خلیل کے جا[مع] صفحہ ۷ میں موجود ہے، اس پر حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ اس محاکمہ کی تمہید می[ں] مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت قابل دید ہے، وہی ہذہ، (بندہ ناچیز باعتبار اپنے علم وفہم کے اس قا[بل] نہیں کہ علماء اعلام کے اختلاف کا فیصلہ کرسکے، مگر ہاں امتثا لالامر الشریف اس مسئلہ میں جو کچھ [خ]یال میں آیا عرض کرتا ہے الخ حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ تواضع اور اظہارِ حق میں اس طرح جمع کرنا جس درجہ کا کمال ہے ظاہر ہے، خوان خلیل صفحہ ۸) پر حضرت حکیم الامۃ خوان خلیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ میں حضرات سلف کی سی تواضع تھی کہ مسائل واشکالات علمیہ میں اپنے چھوٹے سے بھی مشورہ فرماتے تھے اور چھوٹوں کے معروضات کو شرح صدر کے بعد قبول فرمالیتے تھے، اس کے بعد حضرت سہارنپوری کا اشکال اشراف نفس کے متعلق ذکر کرنے کے بعد حضرت حکیم الامت تحریر فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کے چند کمالات ثابت ہوتے ہیں، ایک تواضع جس کے سلسلہ میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے دوسرے دقیق تقویٰ کہ اشراف کے احتمال بعید تک نظر پہنچی اور اس پر عمل کا اہتمام ہوا، تیسرے اتباع سنت جیسا کہ ظاہر ہے، چوتھے اپنے معاملہ میں

اپنے نفس کو متہم سمجھا کہ اپنی رائے پر وثوق نہیں فرمایا، ورنہ جس کی نظر اتنی دقیق ہو گیا اس فیصلہ تک وہ نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ (خوان خلیل: ص ۱۲)

خوان خلیل میں اور بھی متعدد قصے حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے ذکر کیے گئے ہیں۔

شیخو پورہ کی دعوت کا ایک قصہ جس میں یہ ناکارہ خود بھی شریک تھا اور حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ بھی شریک تھے، اس کو حضرت نے تحریر فرمایا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک بار سہارنپور میں بڑے جلسہ (سالانہ جلسہ مدرسہ مظاہر علوم) میں جانا ہوا، جلسہ سے اگلے روز شیخو پورہ والوں نے حضرت مولانا سہارنپوری اور دیگر بعض مہمانوں کو مدعو کر دیا، چلتے وقت سہارنپور کے ایک تاجر چانول نے اگلے روز صبح کی دعوت کر دی، مولانا نے دعوت منظور فرمالی اور شیخو پورہ چلے گئے، شب کو وہاں رہے، صبح کے وقت چھاجوں پانی پڑ رہا تھا، مگر چونکہ مولانا نے وعدہ کر لیا تھا، اس وجہ سے اسی حالت میں واپسی ہوئی، جب سہارنپور اُترے میں بھی (حضرت حکیم الامۃ) ہمراہ تھا، راستہ میں وہ صاحب جو دعوت کر گئے تھے، سڑک جاتے ہوئے ملے، مولانا نے پکار کر بلایا اور اپنے آنے کی اطلاع کی تو آپ کہتے ہیں، حضرت دعوت کا کچھ انتظام نہیں ہوا، مجھ کو واپسی کی امید نہ تھی، مولانا نے فرمایا اچھا بھائی پھر سہی، اس نے کل صبح کا وقت معین کیا اور تبسم سے فرمایا کہ ظالم نے شام کا وقت بھی تو نہ کہا۔

ہمارے حضرت (حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ) نے فرمایا اس گفتگو سے میرے غصے کی کچھ انتہا نہ تھی، مولانا چونکہ بزرگ تھے ان کے سامنے کچھ کہہ نہ سکا، مجھے بھی صبح دعوت میں شریک ہونے کا حکم ملا، میں نے عرض کیا حضرت! مجھے تو صبح صبح بھوک نہیں لگتی ہے، فرمایا اگر بھوک ہو کھالینا ورنہ مجلس میں بیٹھ جانا، میں نے عرض کیا بہت اچھا۔ صبح وقت پر پھر ہم سب گئے، مگر میں غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ کوٹھے کے اوپر کھانا کھلایا۔ میں عذر کر کے مولانا سے رخصت ہو گیا اور اس دعوت کنندہ سے مولانا کے سامنے تو کہنے کا موقع نہ ملا اس لیے نیچے بلایا اچھی سے اس کے کان کھولے اور کہا کہ بزرگوں کو بلا کر ایسی ہی تکلیف اور اذیت دیا کرتے ہیں۔ تجھے تو یہ چاہیے تھا کہ اگر مولانا شیخو پورہ سے تشریف نہ بھی لاتے تب بھی انتظام کرتا۔ اس نے آئندہ کے لیے توبہ کی۔

(ارواح ثلاثہ: ص ۳۸۶)

(از زکریا) بندہ کے خیال میں تو اس قصہ میں حضرت سہارنپوری سے زیادہ حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تواضع ہے کہ اس غصہ اور تکبر کے باوجود حضرت سہارنپوری کے کہنے پر دعوت بھی قبول کر لی اور حضرت کے سامنے کچھ ڈانٹ بھی نہیں پلائی، الگ لے جا کر ڈانٹا۔

تذکرۃ الخلیل میں حضرت سہارنپوریؒ کا معمول لکھا ہے کہ اعلیٰ حضرت گنگوہی کی حیات میں اول

تو کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے اور اگر کسی کو شدید اصرار پر بیعت کرتے بھی تو یہ الفاظ کہلواتے تھے۔ کہو بیعت کرتا ہوں میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب سے خلیل احمد کے ہاتھ پر۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۷۵)

بذل المجہود کی تالیف میں جب بھی کوئی اہلِ علم میں سے آتا اور ایک دو دن قیام کرتا۔ حضرت بڑے اہتمام سے بذل کا مسودہ اس حوالہ فرماتے کہ غور سے دیکھیں اور کوئی چیز قابلِ اصلاح ہو تو ضرور متنبہ فرمادیں اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جو بعد میں مدرس مظاہر علوم بھی ہو گئے تھے، ان کے ذمہ تو مستقل نظر ثانی تھی اور مولانا مرحوم بہت ہی اہتمام سے نظر ثانی کیا کرتے تھے اور جہاں جہاں مولانا نشانات لگاتے حضرت ان کو بہت غور سے ملاحظہ فرماتے اور اصلاح کی ضرورت سمجھتے تو اصلاح یا توضیح فرماتے۔

تذکرۃ الخلیل میں ایک قصہ لکھا ہے جو خود میرے بھی علم میں ہے کہ آپ کو اپنے کسی کمال پر ناز نہ تھا اور نہ ضد تھی۔ ایک بار آپ تھانہ بھون گئے اور فساد صلوٰۃ بمحاذاۃ النساء کے مسئلہ میں مولوی احمد حسن سنبھلی کا حضرت سے مکالمہ ہوا۔ حضرت تو حنفیہ کے قول کو قوی فرمارہے تھے اور مولوی احمد حسن ضعیف۔ حضرت نے فرمایا، پہلے میری تقریر سن لو پھر جو کہنا ہے وہ کہنا۔ مگر مولوی صاحب نے درمیان میں آپ کا کلام قطع کرنا شروع کر دیا۔ حضرت کو تکدر ہوا اور لہجہ میں تیزی آگئی۔ مولوی احمد حسن بھی تیزی پر آگئے۔ تب آپ نے تحمل کیا اور خاموش ہو گئے۔ جب آپ ریل پر آنے لگے تو آپ نے خود ابتداء بالسلام کی اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر فرمایا، اگر مجھ سے کچھ گستاخی آپ کی شان میں ہو گئی ہو تو معاف فرمادینا۔ اس بندۂ خدا نے اس پر بھی کوئی معذرت نہ کی۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۲۹۷)

بعد میں مولوی صاحب موصوف کی تھانہ بھون سے بھی علیحدگی ہوئی اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو بھی تکدر رہا کہ ان کو اپنے علوم پر بہت ہی گھمنڈ پیدا ہو گیا تھا۔

حضرت شیخ الہند کے واقعات

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق سنا ہے کہ ابتداء میں بہت ہی خوش پوشاک تھے، رئیسانہ زندگی، مگر اخیر میں کھدر کی وجہ سے ایسا لباس ہو گیا تھا کہ دیکھنے والا مولوی بھی نہ سمجھتا تھا۔ حضرت تھانوی ایک جگہ ذکر محمود فرماتے ہیں کہ جیسے شباب میں لطافت مزاج کے سبب نفیس پوشش مرغوب تھی اب غلبہ تواضع کے سبب سادہ لباس اور جوتا اور ساری ہی وضع اختیار فرمائی تھی۔ جیسے مساکین کی وضع ہوتی ہے۔ وضع سے کوئی شخص یہ بھی گمان نہ کرسکتا تھا کہ آپ کو کسی قسم کا بھی امتیاز

مالی، جاہی، علمی حاصل ہے۔ حالانکہ:

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(النور: ص ۳۹ ر ج ۲)

جب حضرت نے قرآن پاک ترجمہ پورا کیا تو حضرت نے دیوبند میں سب علماء کو جمع کر کے جو کہ حضرت کے خدام اور تلامذہ تھے، یہ فرمایا کہ بھائی میں نے قرآن شریف کا ترجمہ پورا تو کردیا ہے، لیکن سب مل کر اس کو دیکھ لو، اگر پسند ہو تو شائع کرو، ورنہ رہنے دیا جائے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ اکبر اس تواضع کی بھی حد ہے۔

(النور ماہ شعبان ۳۹ ھ: ص ۳۰)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ بھی بعض ثقات سے سنا ہے کہ حضرت مولانا (شیخ الہند) نے ارشاد فرمایا کہ بارہا حاضری گنگوہ کے وقت خیال ہوا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے حدیث کی اجازت کی درخواست کروں، مگر معاً یہ خیال مانع آ گیا کہ اگر پوچھ بیٹھیں کہ تجھ کو آتا ہی کیا ہے جو حدیث کی سند مانگتا ہے تو کیا جواب دوں گا۔ بس یہ سوچ کر چپ رہ گئے۔ اللہ اکبر کچھ حد ہے تواضع کی۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ میں نے کبھی نہ دیکھا نہ سنا کہ آپ نے کبھی امامت فرمائی ہو۔ بعض درست و نادرست مزاج طلبہ درس میں بہت ہی بے ادبی کے الفاظ کہہ ڈالتے تھے مگر حضرت مولانا کو کبھی اس پر تغیر نہیں ہوا۔

حضرت شیخ الہند و حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہما کے ایک مسلم لیگ و کانگریس کا اختلاف دیکھنے والے تو اب تک ہزاروں موجود ہیں اور بیسیوں رسائل اس سلسلہ کے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اس ناکارہ کا رسالہ ''اعتدال'' بھی اس سلسلہ کا ہے۔ اس سے بھی اختلاف کی نوعیت معلوم ہو جائے گی۔ اس زمانہ میں جب حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ شوال ۳۳ ھ حجاز مقدس تشریف لے گئے، جس کے بعد مالٹا جانا پڑا۔ اس زمانہ کے دو مکتوب بھی حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ نے ذکر محمود میں نقل فرمائے ہیں جو النور میں شائع ہوئے ہیں۔

پہلا مکتوب:

سراپا فضل و کمال شرفکم اللّٰہ تعالیٰ و جعلکم فوق کثیر من الناس السلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ۔

بارہا آپ کی خیریت معلوم ہونے کا داعیہ پیدا ہوا اور ایک دو دفعہ بعض آیندگان کی زبانی آپ

کی خیرت معلوم بھی ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو مع جملہ متعلقین خیریت سے رکھے، اس وقت ایک صاحب بنگالی مسمّی عبدالمجید سے ملاقات ہوئی جو ہندوستان واپس ہورہے ہیں اور جناب کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد رکھتے ہیں۔ یہ موقع غنیمت معلوم ہوا، اس لیے یہ عریضہ روانہ کرتا ہوں۔ بندہ مع رفقاء بحمد اللہ بالکل خیریت اور اطمینان سے ہے۔ شروع رجب میں مکہ مکرمہ حاضر ہوگیا تھا، اس وقت تک یہیں حاضر ہوں، مجھ کو امید ہے کہ فلاح وحسن خاتمہ کی دعاء سے اس دور افتادہ کو فراموش نہ فرمائیں گے۔ آیندہ قیام کی نسبت ابھی کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ مولوی شبیر علی صاحب، مولوی محمد ظفر صاحب، مولوی عبداللہ صاحب وغیرہ حضرات سے سلام مسنون فرمادیجئے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب، مولانا قمرالدین صاحب کی وفات سے افسوس بر افسوس ہے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، رحمہما اللہ تعالیٰ والسلام علیکم وعلی من لدیکم۔ فقط

بندہ محمود غفرلہٗ

مکہ معظمہ ۲ امحرم چہار شنبہ

دوسرا مکتوب:

معدن حسنات وخیرات، دام ظلکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ نامی سامی موجب مسرت و امتنان ہوا۔ جو ہوا کرمین ومخلصین کی داعیہ مقبولہ کا ثمرہ ہے۔ ادام اللہ فیوضہم وبرکاتہم احقر اور رفقاء ومتعلقین بحمد اللہ خیریت سے ہیں۔ سب کا سلام قبول ہو۔

والسلام علیکم وعلی من لدیکم۔ فقط

بندہ محمود

از دیوبند، دہم شوال، روز یکشنبہ

تلامذہ کے ساتھ اس طرح اختلاط وارتباط وانبساط رکھنا کہ دیکھنے والا کبھی نہ سمجھ سکے کہ یہ اس مجمع کے مخدوم ہیں۔ بعض خدام کے ساتھ جن میں کوئی خاص خصوصیت ہوتی، مثلاً مولانا کے کسی استاذ یا بزرگ کی اولاد میں سے ہونا یا عوام مسلمین کے نزدیک معظم ہونا، ونحوذلک ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اجنبی شخص کو شبہ ہوسکے خادم پر مخدوم ہونے کا۔ جب خدام کے ساتھ یہ معاملہ ہوتو مساوی یا بڑوں کے ساتھ معاملہ کا اسی موازنہ کرلیا جائے۔ کسی سے کسی خدمت کی فرمائش کرنے کی عادت نہ تھی۔ بلکہ اکثر مہمانوں کے لیے کھانا گھر سے اپنے ہاتھ میں لاتے اور خود کھلاتے۔

ایک بار احقر (حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ) کی درخواست پر مدرسہ جامع العلوم کانپور کے جلسہ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے اور احقر کے بے حد اصرار پر وعظ فرمانے کا وعدہ فرمایا۔

جامع مسجد میں وعظ شروع ہوا۔ جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی کانپور میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرے عرض کرنے پر جلسہ میں تشریف لائے اور عین اثنا وعظ میں تشریف لائے اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہورہا تھا۔ جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہ آج جاتا رہے گا اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں۔ مولانا (شیخ الہند) کی جونہی مولانا علی گڑھی پر نظر پڑی، فوراً وعظ بیچ ہی سے قطع کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی بوجہ ہمدرس ہونے کے بے تکلف تھے۔ انہوں نے دوسرے وقت عرض کیا کہ یہ کیا کیا۔ یہی تو وقت تھا بیان فرمایا کہ ہاں یہی خیال مجھ کو آیا تھا، اس لیے قطع کر دیا کہ یہ تو اظہار علم کے لیے بیان ہوا نہ کہ اللہ کے واسطے۔

ثقات سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مراد آباد سے وعظ کی درخواست کی گئی۔ بہت کچھ عذر کے بعد، منظور فرمایا اور بیان شروع ہوا۔ حدیث یہ تھی ”فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد اشد“ کے ترجمہ کا حاصل بھاری کے لفظ سے فرمایا۔ مجلس میں ایک پرانے عالم تھے جو محدث کے لقب سے معروف تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر فرمایا اشد کا ترجمہ غلط کیا گیا ہے، ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ تو مولانا بے ساختہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت مجھ کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ مجھ جیسے شخص کا وعظ کہنا جائز نہیں اور میں نے ان صاحبوں سے اسی واسطے عذر بھی کیا تھا، مگر انہوں نے مانا نہیں۔ اب بہت اچھا ہوا، حضرت کے ارشاد سے بھی میرے عذر کی تائید ہوگئی اور بیان سے بچ گیا۔ حاضرین کو تو جس قدر ناگواری ہوئی اس کا تو کچھ پوچھنا نہیں۔ دانت پیستے تھے کہ کیا لغو حرکت تھی۔ گو مولانا کے ادب سے کچھ بول نہ سکتے تھے۔ مگر مولانا نے بجائے ناگوار سمجھنے کے یہ کمال کیا کہ نہایت سکون کے ساتھ ان کے پاس جا کر ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر نہایت نیاز مندی کے لہجے میں ارشاد فرمایا کہ حضرت غلطی کی وجہ معلوم ہو جائے تو آئندہ احتیاط رکھوں گا۔ انہوں نے کڑک کر فرمایا کہ اشد کا ترجمہ آپ نے اثقل سے کیا یہ کہیں منقول نہیں اضر سے کرنا چاہیے۔ مولانا نے فرمایا اگر کہیں منقول ہو تو۔ انہوں نے کہا کہاں ہے؟ مولانا نے فرمایا حدیث وحی میں ہے۔ کسی نے پوچھا ”کیف یاتیک الوحی“ جواب میں ارشاد فرمایا: ”یاتینی احیانا مثل سلسلة الجرس هو اشده علی“ اور ظاہر ہے کہ یہاں اضر کے معنی میں ممکن نہیں۔ اثقل ہی سے معنی صحیح ہو سکتے ہیں۔ بس یہ سن کر ان کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر مولانا نے نہ کچھ اس پر فخر کیا نہ دوبارہ بیان شروع فرمایا۔ لیکن ان کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ اپنی غلطی کا اعلان فرمادیں۔ وذلک فضل اللہ یوتیه من یشاء و نعم ما قیل:

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ دار و سکندری داند
ہزار نکتہ باریک ترز موا ینجاست
نہ ہر کہ سربہ تراشد قلندری داند

(ذکر محمود النور جلد ۲ ۳۹۲ھ)

مفتی محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بروایت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم ایک واقعہ سنایا کہ جب حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ سفر حجاز کے لیے تشریف لے جارہے تھے اور وہاں سے گرفتار ہو کر مالٹا گئے، اس وقت کی بات ہے کہ ہمارے مکان پر تشریف لائے، دادی صاحبہ (اہلیہ محترمہ مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ) کی خدمت میں عرض کیا کہ اماں جی! میں نے آپ کی کوئی خدمت نہیں کی، بہت شرمندہ ہوں، اب سفر میں جارہا ہوں ذرا اپنا جوتا دے دیجئے۔ انہوں نے پس پردہ سے جوتا آگے بڑھایا۔ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کو لے کر اپنے سر پر رکھا اور روتے رہے کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرمادیجئے۔

یہ دوسرا واقعہ بھی بروایت مولانا محمد طیب صاحب مفتی صاحب نے سنایا کہ ایک مرتبہ مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ نماز کے لیے حضرت شیخ الہند کی مجلس سے سب لوگ اٹھ کر چلے۔ میرے برادر خورد مولوی طاہر مرحوم ٹھہر گئے۔ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ اندر زنانہ مکان سے گرم پانی لائے اور مولوی طاہر مرحوم سے فرمایا کہ وضو کرلیں، وہ ذرا ہچکچائے کہ حضرت میرے واسطے لوٹا لائے، اس پر فرمایا کہ تم جانتے بھی ہو کہ میں کون ہوں؟ میں پیرو کا غلام ہوں (پیرو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی خادمہ تھیں)۔

حضرت شاہ عبدالرحیم رائپوری کے واقعات

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی تو پوری ہی زندگی تواضع و انکساری کی تھی۔ ہمارے جملہ اکابر میں اعلیٰ حضرت کی تواضع ضرب المثل تھی۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ ایک مرتبہ حضرت قدس سرہٗ کی حیات میں رائے پور تشریف لے گئے تو تو ارشاد فرمایا کہ اللہ اکبر اس باغ کے درختوں کے پتے پتے سے تواضع ٹپک رہی ہے۔

علی میاں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ فرمایا میں اپنے حضرت کی تعریف اس لیے نہیں کرتا کہ اس میں بھی اپنی ہی تعریف ہے ورنہ ہمارے حضرت تو تصوف کے امام تھے اور تو کچھ عرض نہیں کرتا، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ چودہ سال حضرت کی

خدمت میں رہا، اس طویل مدت میں کبھی ایک کلمہ بھی حضرت کی زبان مبارک سے نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو، حب جاہ ایک ایسی چیز ہے جو سب سے آخر میں سالکین کے قلوب سے نکلتی ہے جب سالک صدیقین کے مقام تک پہنچتا ہے تب اس سے پیچھا چھوٹتا ہے، یہ بات میں نے اپنے حضرت میں خوب اچھی طرح سے دیکھی کہ حب جاہ کا وہاں سر کٹا ہوا تھا۔
(سوانح قادری: ص ۲۴۲)

پختہ تعمیر سے اعلیٰ حضرت کو بہت ہی وحشت ونفرت تھی، باغ کی مسجد بھی اخیر زمانہ تک کچی ہی رہی، کچی دیواریں اور اس پر چھپر پڑا ہوا تھا، اس ناکارہ نے بھی اپنی اوائل عمر میں بار ہا دیکھا، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی تذکرۃ الخلیل میں اعلیٰ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک نادان طبیب نے غلطی سے آپ کو زہر دے دیا، فوراً آپ کو قے ہوگئی اور مرض ترقی کر گیا ڈاکٹری تشخیص سے پتہ چلا کہ چند منٹ قے نہ ہوتی تو جانبری محال تھی۔

حضرت سے جس کو ذرا بھی تعلق تھا وہ حکیم صاحب پر آنکھیں نکالتا اور ان کی صورت سے بیزار ہو گیا مگر آپ کو حکیم صاحب کی ندامت اور اپنے خدام کی ان سے یہ وحشت ایک مستقل تکلیف بن گئی کہ وہ بھی کتمان اور ضبط میں رہی، جس کا اثر یہ تھا کہ حکیم صاحب تشریف لاتے تو آپ ان کو سب سے الگ اپنے پاس چارپائی پر بٹھاتے اور کسی کی بھی دوا کا استعمال ہو مگر حکیم صاحب سے مشورہ لیا کرتے اور وہ اس کو مناسب مرض بتاتے تو آپ استعمال کرتے ورنہ ان سے ایسی ہی باتیں کرتے جن سے ان کو یقین ہو جاتا کہ حضرت میرے معالجہ کے معتقد اور میری حزاقت ومزاج شناسی کے معترف ہیں اور مخلص خدام سے ایک مرتبہ نرم لہجہ میں اس طرح فرمایا کہ حکیم صاحب تو میرے محسن ہیں، غلطی تو ہر بشر کے ساتھ لگی ہوئی ہے، مگر جو کچھ کیا وہ محبت وشفقت ہی کی نیت سے کیا، ان کو کوئی ترچھی نظر سے دیکھتا ہے تو میرے دل پر ایک برچھی لگتی ہے، فاعل مختار بجز مولائے کریم کے کوئی نہیں، جو ہوا وہ اس کی مشیت سے ہوا، پھر کسی کو کیا حق ہے کہ آلہ وا وزار کو سرزنش کرے۔

آخر سفر حج میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ سو سے زائد کا مجمع ہو گیا تھا، بمبئی پہنچے تو رفقاء کا ٹکٹ موجودہ جہاز سے ملنا مشکل تھا، حضرت اور حضرت کے اہل وعیال اور مخصوص رفقاء کو مل سکتا تھا، مگر حضرت نے جملہ رفقاء کے بغیر جانا قبول نہیں فرمایا اور جن کو عجلت تھی ان کو اس جہاز سے بھیج دیا اور خود پندرہ دن تک دوسرے جہاز کے انتظار میں بمبئی تشریف فرما رہے، اس موقع پر بہت سے لوگوں نے حضرت قدس سرہٗ سے اصرار بھی کیا کہ حضرت! باقی رفقاء دوسرے جہاز سے آتے

رہیں گے، مگر حضرت نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان ساتھیوں کو رنج ہوگا۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر مکی احباب نے ایک بہت نفیس مکان حضرت اور حضرت کے رفقاء کے لیے پہلے سے کرایہ پر لے رکھا تھا اور خدام نے حضرت کے کمرہ کو بہت ہی راحت کا بنا رکھا تھا، بعض مکی خدام نے بہت عمدہ مسہری اور نفیس تکیے گدے حضرت کے کمرہ کے لیے مہیا فرما رکھے تھے کہ بعد میں حضرت صاحبزادہ صاحب حکیم مسعود احمد صاحب خلف الرشید حضرت قطب ارشاد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ حج کے لیے پہنچ گئے، حکیم صاحب کے پہنچنے پر حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے اپنا کمرہ سجا سجایا مع سامان راحت کے حضرت حکیم صاحب کی نذر کر دیا اور فرمایا کہ مجھ فقیر کے لیے تو جہاں بھی بیٹھ جاؤں گا راحت ہی راحت ہے، خدام کے ہوتے ہوئے حضرت حکیم کو تکلیف ہو یہ تو بہت نا موزوں ہے، حتیٰ کہ میرے حضرت مرشدی سہارنپوری نے بھی جو بعد میں مکہ میں پہنچے تھے، اس پر نکیر فرمائی، سارا سامان لوگوں نے آپ کی راحت کے لیے دیا تھا، مگر حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ نے یہی ارشاد فرمایا کہ حضرت! مجھ سے دیکھا نہ گیا کہ خادم تو اسی راحت میں رہے اور مخدوم زادہ معمولی جگہ قیام کرے، حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے لیے تو خدام نے اس کا بدل کر ہی دیا مگر رائے پوری قدس سرہٗ کا عمل ہم نالائقوں کے لیے قابل رشک ہی ہوسکتا ہے

ایک مرتبہ مولوی وہاج الدین صاحب جو کہ حضرت گنگوہی سے بیعت تھے، رائے پور آئے، رات زیادہ جا چکی تھی اور سفر کی تھکان بہت تھی، ایک طرف لیٹ کر سو گئے، ذرا دیر بعد آنکھ کھلی تو دیکھا ایک شخص پائینتی بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ ان کے پاؤں دبا رہا ہے، مگر اس احتیاط سے کہ آنکھ نہ کھل جائے، اول تو سمجھے کہ شاید حضرت نے کسی خادم کو بھیج دیا، مگر پھر غور کی نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ یہ تو خود حضرت مولانا ہیں، یہ گھبرا کر اُٹھے اور کود کر چارپائی سے نیچے آئے کہ حضرت یہ کیا غضب ہے فرمایا بھائی اس میں کیا حرج ہے آپ کو تھکان بہت ہوگئی ہوگی، ذرا لیٹ جایئے کہ آرام مل جائے، انہوں نے کہا بس حضرت معاف فرمایئے میں باز آیا ایسے آرام سے کہ آپ سے پاؤں دبواؤں:

تواضع اور مروت گر کوئی شخص مجسم ہو
تو وہ سر تا قدم عبدالرحیم با صفا ہوگا

ایک بار ایک صاحب حاضرِ خدمت ہوئے، جن کی اُنگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی حضرت کے اخلاق اور مہمان نوازی دیکھ کر وہ حیران ہو گئے اور جب رخصتی مصافحہ کرنے لگے تو عرض کیا کہ حضرت میرے لیے دعاء فرما دیں، حضرت نے ہاتھ تھامے ہوئے ان سے ارشاد فرمایا، بہت اچھا ان شاء اللہ حکم کی تعمیل کروں گا، مگر ایک عرض میری بھی ہے اس کو آپ قبول فرمالیں، وہ یہ کہ طلائی

انگشتری کو شریعت نے مرد کے لیے حرام کہا ہے، اگر اس گناہ بے لذت کو ترک فرمادیں تو پھر خوش ہوکر دل سے دُعا نکلے گی، یہ سن کر وہ صاحب شرما گئے، پیشانی پر پسینہ آ گیا اور فوراً انگوٹھی اُتار کر ہاتھ میں لے لی۔

ایک مرتبہ بیماری میں بندہ (مولانا عاشق الٰہی صاحب) اور مولوی محمد یحیٰی صاحب مرحوم حاضر ہوئے، دونوں سے حضرت کو کمال بے تکلفی تھی، اس لیے جب سب اُٹھ گئے تو فرمایا مجھے ایک پریشانی لاحق ہے جس میں گھلا جاتا ہوں، وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے، بندہ مومن کو لقاء رب کی تمنا ہوتی ہے اور میں اپنے اندر اس مضمون کو نہیں پاتا ہوں، مولوی یحیٰی صاحب نے کہا حضرت یہ تمنا و شوق تو عندالموت ہوتا ہے اور آپ ابھی مرنے والے نہیں، آپ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا کہ مرنے کو تو پڑا ہی ہوں اور اسی لیے فکر ہے کہ شوق لقاء کیوں نہیں، مولوی صاحب نے کہا کہ پھر حضرت ہمارے لیے تو مبارک ہے کہ ابھی حق تعالیٰ نے اس وقت کو مؤخر فرمادیا کہ وہ وقت ہوتا تو شوق لقاء بھی غالب آتا، چنانچہ آپ تندرست ہوگئے اور زندہ رہے، حتیٰ کہ مولوی محمد یحیٰی صاحب نے بھی دفعۃً انتقال فرمایا۔

اس کے بعد پھر مرض نے زور پکڑا اور اس شدتِ مرض میں حضرت قدس سرہٗ کو آستانہ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حاضری کا غلبہ ہوا اور آپ نے سفرِ حج کا پختہ قصد کرلیا اور میں (مولانا عاشق الٰہی صاحب) حاضر ہوا تو آپ نے بڑے اہتمام سے مجمع کو اُٹھا کر تنہائی حاصل کیا اور مجسم شوق بن کر فرمایا، میں تو تیرا ہی انتظار دیکھ رہا تھا کہ دل کی بات کہوں، وہ یہ کہ امسال حج کا ارادہ کر چکا ہوں اور تمنا ہے کہ زندہ رہوں تو پہلے جہاز پر سوار ہو جاؤں، میں نے عرض کیا کہ آفریں ہے حضرت کی ہمت پر کہ کروٹ تو لی نہیں جاتی اور قصد ہے اس کٹھن سفر کا جس میں مستعد جوان چُور چُور ہو جاتے ہیں، بھلا کیسے ہوسکتا ہے، فرمایا، حضرت بوڑھے جوان سب ہی اس راستہ میں چلتے ہیں، بس مجھے تو کوئی پکڑ کر ریل میں ڈال دے تو پڑا پڑا ان شاء اللہ چلا ہی جاؤں گا۔

میں نے دیکھا کہ یہ غلبہ شوق دبنے والا نہیں تو موافقت کا پہلو لے لیا اور عرض کیا ہاں حضرت ہمت کا حامی خدا ہے، جب حضرت نے قصد فرمالیا تو ان شاء اللہ پہنچنا دشوار نہیں، فرمایا، الحمدللہ تو نے تو موافقت کرلی، اب ایک خاص درخواست ہے وہ یہ کہ اب حضرت سہارنپوری کا میرے بزرگوں میں ایک دم باقی ہے، جن کے سامنے چوں وچرا کی ہمت نہیں، اس کا سہم چڑھا ہوا ہے کہ حضرت نے اجازت نہ دی اور منع فرمادیا تو پھر کیا کروں گا، بس یہ خدمت تیرے سپرد ہے کہ حضرت سے بخوشی اجازت دلوادے، میں چونکہ سمجھ رہا تھا کہ یہ تو سرکار کے بُلاوے کی علامت ہے کہ حاضری آستانہ کا شوق بیتاب بنا رہا ہے، ورنہ موسم حج میں ابھی اتنا وقت ہے کہ اس وقت تک

حضرت حیات ہی رہیں تو زہے نصیب، پھر آپ کے دل کو پژمردہ کیوں کروں، اس لیے میں نے عرض کیا کہ ہاں حضرت انشاء اللہ ضرور کوشش کرونگا اور امید قوی ہے ان شاء اللہ حضرت انکار نہ فرمائیں گے، بلکہ کیا عجب ہے حضرت بھی قصد فرمالیں اور پھر بندہ بھی ہمرکاب ہو، اتنا سن کر فرحت وسرور سے حضرت کا چہرہ چمکنے لگا اور الحمد للہ، الحمد للہ اب اطمینان ہو گیا فرماتے ہوئے از خود اُٹھ بیٹھے کہ تکیہ سے سہارا لگائے دیر تک اسی کی باتیں کرتے اور مزا لیتے رہے۔

حضرت نے اپنی شدت بیماری میں اپنا سارا سامان حتیٰ کہ بدن کے کپڑے بھی مولانا عبدالقادر صاحب کو ہبہ کر دیئے تھے کہ اب تم سے مستعار لے کے پہنا کروں گا، مگر تیرا سو روپے نقد زادِ راہ بنا کر مولانا عبدالقادر صاحب کے حوالہ کر دیا تھا کہ اس کو محفوظ رکھو، یہ میرے اور تمہارے سفر حج کا خرچ ہے، آخر جوں جوں حج کا موسم قریب آتا گیا، آپ کا مرض اور ضعف بڑھتا اور وصال کا وقت قریب آتا گیا، حتیٰ کہ آپ نے سمجھ لیا کہ اب گنجائش نہیں رہی اور تیرہ سو روپے ترکہ بنانا چاہتا ہے تب آپ نے مولانا کو بُلا کر وہ روپیہ بھی تقسیم کرادیا، کیونکہ آپ مولائے کریم سے ایسی حالت میں ملنے کے متمنی تھے کہ دنیا کا کوئی حبہ اور پارچہ بھی آپ کی ملک میں نہ ہو، بیت کے دھیان سے ہٹ کر اب آپ رب البیت کے خالص تصور میں غرق ہو گئے اور آخر چند ہی روز بعد وہ مبارک وقت آیا جس کے شوق میں آپ کا رُواں رُواں پکارتا تھا، حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ نے خواب دیکھا کہ آفتاب غروب ہو گیا اور دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔

حسب معمول تہجد کے وقت حضرت اُٹھے اور نفلوں سے فارغ ہو کر متفکر بیٹھ گئے، اہلیہ نے پوچھا، آج عادت کے موافق آپ نفلوں کے بعد لیٹے کیوں نہیں اور طبیعت کچھ فکرمند معلوم ہوتی ہے، کیا بات ہے، آپ نے خواب کا اظہار کیا اور محزون لہجے میں فرمایا، اس کی تعبیر ایک تو یہ ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب مالٹا میں محبوس ہیں، دوسرے مجھ کو یہ بھی اندیشہ ہے کہیں شاہ عبدالرحیم صاحب کی حالت نازک نہ ہو، غرض صبح کو حضرت بہلوں روانہ ہو گئے، جہاں تبدیل آب وہوا کے لیے حضرت کا قیام تھا، چنانچہ یہ سمجھ کر کہ آرام کی خواہش ہوگی نماز اول وقت پڑھ لی گئی اور آپ چارپائی پر لیٹ رہے اور حضرت (سہارنپوری) دوسرے کمرے میں جا لیٹے کہ دفعۃً آپ کو آخری کرب شروع ہوا اور حضرت اپنے کمرے سے لپک کر پاس آئے، مولانا نے حضرت کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور آپ کا ہاتھ تھام کر اپنے سینہ پر رکھ لیا، حضرت نے پڑھنا شروع کیا اور رائے پور کا آفتاب اپنے محبوب کا ہاتھ چھاتی پر رکھے ہوئے چند منٹ کے اندر شب کے گیارہ بج کر اُنیس منٹ پر غروب ہو گیا، انا للّٰه وانا الیه راجعون۔ (منقول از تذکرۃ الخلیل)

حضرت شاہ عبدالقادر رائپوری کے واقعات

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نوراللہ مرقدۂ کے دیکھنے والے تو ابھی تک ہزاروں ہیں تواضع میں اپنے شیخ قدس سرۂ کا نمونہ تھے، اس غایت تواضع ہی کا ثمرہ تھا کہ ابتداء بیعت میں باوجود اعلیٰ حضرت رائے پوری کے مشورہ کے کہ گنگوہ میں حضرت قطب عالم سے بیعت ہوں، حضرت رائے پوری نے فیصلہ کیا کہ میں اتنے اُونچے دربار کے قابل نہیں، اس کی تفصیل سوانح حضرت رائے پوری مؤلفہ علی میاں میں ذکر کی گئی ہے، جس میں اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے مشورہ پر جو جواب حضرت رائے پوری نے دیا وہ یہ تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو جو کچھ ملا حضرت گنگوہی سے ملا، مگر میرا رجحان آپ کی طرف ہے، میری طرف سے اگر مہمانداری کی فکر ہے تو میرے حقوق حضرت کے ذمہ نہیں، میں اپنے قیام وطعام کا خود ذمہ دار ہوں، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب یہ خط دیکھ کر بہت خوش ہوئے، لوگوں کو یہ خط دکھایا اور فرمایا دیکھو! یہ ہیں طالب۔ (سوانح رائے پوری: ص۵۹)

مجاہدات کے بیان میں حضرت رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ کے بہت سے حالات گزر چکے، پکی پکی جلی ہوئی روٹی جو ملتی اس کو نہایت ہی صبر وشکر کے ساتھ تناول فرماتے، وہاں کے قیام میں چنے بھی چابے اور کبھی مہتمم باورچی خانہ کو بھی ایک دفعہ کے سوا اس وجہ سے نہیں ٹوکا کہ اگر اس نے حضرت سے شکایت کردی اور حضرت نے جواب میں فرمایا کہ میاں! اچھا کھانا ہے تو کہیں اور جاؤ، تو کیا ہوگا، حضرت کے واقعات میں بہت کثرت سے آپ بیتی میں مختلف جگہ لکھوا چکا ہوں، یہاں سب کا اعادہ کرنا تو بہت مشکل ہے، یہ واقعہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ حضرت رائے پوری ایک دفعہ تھانہ بھون حاضر ہوئے تو حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تو رائے پور حضرت شاہ عبدالرحیم کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ مجھے یاد نہیں، فرمایا حضرت! میں آپ کو کیا یاد رہ سکتا تھا، میری وہاں کوئی حیثیت اور امتیاز نہیں تھا، شاید آپ کو یاد ہو کہ حضرت کی خدمت میں ایک خادم بار بار آتا تو تھا، بدن پر ایک کمری ہوتی تھی اور تہبند باندھے ہوئے، فرمایا ہاں کچھ یاد تو آتا ہے، فرمایا میں وہی ہوں۔ (سوانح قادری: ص۲۹)

حضرت اپنی انتہائی تواضع کی ہی وجہ سے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی نگاہ میں بڑھتے چلے گئے اور ساری خصوصی خدمات اعلیٰ حضرت کی حضرت رائے پوری کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی، یہ واقعہ تو پہلے گزر چکا کہ اعلیٰ حضرت رائے پوری نوراللہ مرقدہ نے اپنے کپڑے بھی حضرت رائے پوری ثانی کو ہبہ کردیئے کہ اپنی ملک میں کچھ نہ رہے، لیکن غایت تواضع سے حضرت اپنے شیخ کے کپڑوں کو

استعمال نہیں کرتے تھے اور چونکہ امامت بھی حضرت ہی کے سپرد تھی، اس کا ایک قصہ خود بیان فرمایا کہ میں ایک دفعہ نہر پر کپڑا دھونے گیا ایک ہی جوڑا کپڑوں کا تھا، اسی کو دھوسکھا کر پہن لیتا، اس دن سُوکھنے میں ذرا دیر ہوگئی، جمعہ کا وقت ہو گیا، جمعہ میں ہی پڑھایا کرتا تھا، حضرت میرے انتظار میں تھے، جب حاضر ہوا، فرمایا کہاں رہ گئے تھے؟ میں نے سکوت کیا، دوبارہ پھر دریافت فرمایا، میں نے سکوت کیا، بار بار اصرار سے پھر دریافت فرمایا تو عرض کیا حضرت کپڑے نہیں سوکھے تھے، اس لیے حاضری میں دیر ہوگئی، حضرت نے غصہ سے فرمایا، آپ کے پاس میرے کپڑے موجود نہیں ہیں ان کو کیوں استعمال نہیں کرتے، کیا ان کو آگ لگانا ہے، مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس کے باوجود کبھی حضرت کے کپڑے پہننے کی جرأت نہ ہوئی۔ (سوانح قادری: ص ۷۱)

اعلیٰ حضرت رائے پوری نے قولاً فعلاً اشارۃً حضرت رائے پوری ثانی کو جانشین بنا رکھا تھا، لیکن اعلیٰ حضرت کے وصال کے بعد کئی سال تک حضرت رائے پوری ثانی نے رائے پور کا قیام اختیار نہیں فرمایا، زیادہ پنجاب کے اسفار اور مکان پر رہتے اور جب رائے پور کی زیارت کا اشتیاق غالب ہوتا تو بہت جناب الحاج شاہ زاہد حسن صاحب مرحوم کے مکان پر چند روز قیام کرتے اور شاہ صاحب کی گاڑی میں اور کبھی پیدل روزانہ جاتے اور واپس آجاتے کہ کسی کو یہ واہمہ نہ ہو کہ مولانا اپنے کو گدی نشین سمجھتے ہیں، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے اپنے وصال کے قریب صدیق صاحب کو ان کی زمین میں جو خانقاہ کے متصل تھی، ایک مکان بنانے کو فرمایا تھا، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے وصال کے بعد جب چودھری صاحب نے حسب وصیت مکان بنانے کا ارادہ کیا تو مولانا نے فرمایا کہ میرے لیے مکان کی ضرورت نہیں، میرے لیے تو صرف ایک چھپر ڈال دیجئے، مگر چودھری صاحب کو اعلیٰ حضرت کی وصیت تھی، اس لیے مولانا کے ایک سفر کو غنیمت سمجھ کر ایک پختہ دالان بنا دیا، ایک سہ دری اس کے اندر ایک کوٹھا اور دونوں جانب ایک ایک حجرہ تعمیر کرا دیا، جو اب تک حضرت رائے پوری ثانی کی خانقاہ کے نام سے مشہور ہے۔

۴۵ھ کے سفر حج میں جب کہ اعلیٰ حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کا قیام بھی مدینہ پاک میں تھا حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا باوجود شیخ المشائخ ہونے کے حضرت سہارنپوری کی خدمت میں دوزانوں مؤدبانہ خادمانہ بیٹھنا تو مجھے بھی خوب یاد ہے، ہم خدام سے اتنا ادب نہیں ہوتا جتنا حضرت رائے پوری کیا کرتے تھے، جس کو دیکھ کر رشک آتا تھا اور حضرت رائے پوری کو یہ قلق رہتا تھا کہ ان کے متعلقین حضرت سہارنپوری کی خدمت میں اس وقت اہتمام سے کیوں نہیں حاضر ہوتے، اس کو آپ بیتی میں بھی کسی جگہ لکھوا چکا ہوں، تلاش میں دِقت ہے اور تفصیل میں واقعات مکرر ہوتے جاتے ہیں، ایک دفعہ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے حضرت کی تعریف

اس لیے نہیں کرتا کہ اس میں بھی اپنی ہی تعریف ہے ورنہ ہمارے حضرت تصوف کے امام تھے اور تو کچھ نہیں عرض کرتا، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میں چودہ سال حضرت کی خدمت میں رہا، اس طویل مدت میں کبھی ایک کلمہ بھی حضرت کی زبان مبارک سے ایسا نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو، حب جاہ ایک ایسی چیز ہے جو سب سے آخر میں سالکین کے قلوب سے نکلتی ہے جب سالک صدیقین کے مقام تک پہنچتا ہے تب اس سے پیچھا چھوٹتا ہے، یہ بات میں نے اپنے حضرت میں خوب اچھی طرح سے دیکھی کہ حب جاہ کا وہاں سر کٹا ہوا تھا۔

(سوانح قادری: ص۲۴۳)

علی میاں سوانح قادری میں لکھتے ہیں کہ حضرت رائے پوری نے اپنے مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی فنائیت و بے نفسی کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ وتاثر جو کچھ بیان فرمایا حضرت کے یہاں رہنے والوں کا بعینہ یہی تاثر حضرت کی ذات کے متعلق ہے کہ کبھی ایک کلمہ ایسا نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو، حب جاہ کا یہاں سر کٹا ہوا تھا۔

اس خادم (علی میاں) کو ۱۳۲۹ھ آخری سفر حج میں ہمر کابی کا شرف حاصل ہوا اور تقریباً تین مہینے شب و روز آپ کے ساتھ رہنا ہوا، بعض خدام نے ادراک و الطاف الٰہی کے واقعات بھی سنائے، پورے سفر میں حضرت نے کوئی بات ایسی نہیں فرمائی جس سے حضرت کے علوِمرتبت یا کسی کشف وادراک کا احساس ہو، حج کے علاوہ بھی کبھی کوئی ایسی بات قصداً نہیں فرمائی جس سے لوگوں کی عقیدت میں اضافہ یا آپ کی بزرگی کا احساس ہو، خدام نے جب سنا اپنی نفی، اپنا انکار، اپنی بے حسی اور غباوت کا اظہار سنا، مشیخت کی باتیں یا متصوفانہ نکات یا سلوک ومعرفت کی تحقیقات بیان کرنے کا حضرت کے یہاں دستور ہی نہ تھا، مسئلہ علماء سے پوچھتے، تصوف کی کوئی بات پوچھتا تو اگر حضرت شیخ الحدیث صاحب یا کوئی دوسرا صاحب علم اور صاحب نظر قریب ہوتا تو اس کی طرف محول فرما دیتے۔ اگر اصرار کیا جاتا اور بات ضروری ہوتی تو نہایت نپے تلے لفظ میں مغز کی بات فرما دیتے اور ایسی بات سے گریز کرتے جس سے آپ کی ژرف نگاہی باریک بینی کا اندازہ ہو، لیکن اہلِ حقیقت سمجھ جاتے کہ غواص کو مطلب ہے گوہر سے نہ کہ صدف سے، کسی بھری مجلس میں خواہ اس میں کیسے ہی نئے نئے اور سربرآوردہ اشخاص کیوں نہ ہوں، اپنی لاعلمی اور اپنے عامی ہونے کا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا خواہ اس کا اثر حاضرین مجلس اور خاص طور پر صاحب علم طبقہ پر کچھ پڑتا ہو۔ (سوانح قادری: ص۲۴۷)

حضرت رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ کی خصوصیت جو بہت ہی نمایاں تھی کہ معاصر اکابرین میں بھی جس کسی کا تذکرہ حضرت کے یہاں ہوتا تو ناواقف یا نو واردیوں سمجھتا کہ ایک مرید اپنے شیخ کا

تذکرہ کررہے ہیں اور اگر ان بزرگوں میں سے کسی کے یہاں آپ کا ذکر خیر ہوتا تو معلوم ہوتا کہ کسی شیخ وقت کا تذکرہ ہورہا ہے۔ (سوانح رائے پوری: ص۳۰۴)

ایک مرتبہ کوئی شخص تھانہ بھون سے ناراض ہوکر آئے تھے اور حضرت کے سامنے بے ادبی کے ساتھ وہاں کا تذکرہ کرتے تھے، آپ نے فرمایا کہ حضرت تھانوی میرے بھی شیخ ہیں اس پر وہ خاموش ہوگئے۔ (سوانح رائے پوری: ص۳۰۵)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہم کے ساتھ محبت وعقیدت احترام واعتماد کا جو غیر معمولی معاملہ تھا وہ دنیا پر روشن ہے، جس مجلس میں مولانا کا کوئی ناقد یا مخالف ہوتا وہاں اور زیادہ جوش کے ساتھ ان کے فضائل ومناقب بیان کرتے اور ان کے خلوص ومقبولیت کا اعلان فرماتے، ایک مرتبہ بعض آنے والوں نے مولانا کے سیاسی مسلک اور ان کے سیاسی انہماک پر کچھ اعتراض کیا تو فرمایا کہ اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ان کے سفروں میں خادم کی طرح ان کے ساتھ رہتا اور ان کی ادنیٰ ادنیٰ خدمتیں انجام دیتا۔ (سوانح رائے پوری: ص۳۰۶)

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی بانی جماعت تبلیغ کے حضرت بہت معتقد تھے کبھی حضرت دہلوی کے سوا اور طرح کا نام نہیں لیا اپنے خدام کو بہت تاکید واہتمام کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے اور خود بھی بڑے اہتمام کے ساتھ نظام الدین تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز قیام فرماتے۔ (سوانح رائے پوری: ص۳۰۸)

حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا اپنے معاصرین بلکہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ بھی تواضع وانکساری کا جو برتاؤ رہا ہے اس کا بیان حضرت رائے پوری کی سوانح مصنفہ علی میاں میں ملتا ہے ان سب کا یہاں نقل کرنا طول ہے۔

حضرت حکیم الامۃ تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے دور میں سیاست پر اتنا زور تھا اور حکیم الامۃ ہونے کا تقاضا تھا کہ مریدین مسترشدین کے اوپر تنبیہ اور امراض کی جراحت فرمادیں، جس کی وجہ سے عوام نہیں بلکہ خواص بھی حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی شان تواضع سے ناواقف رہے، لیکن میرے ان سب اکابر کے درمیان اوصاف حسنہ وجمیلہ جس قدر کوٹ کوٹ کر بھرے گئے تھے بسا اوقات ان میں سے کسی کا ظہور نہیں ہوتا تھا، یہ منظر اس ناکارہ کی نگاہ میں بیسیوں مرتبہ دیکھا کہ معاصرین کے ساتھ نشست وبرخواست اور گفتگو میں اس تواضع اور انکار کا منظر ہوتا تھا کہ قابل دید اور قابل رشک تھا، چنانچہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے طرز تربیت کے متعلق بارہا فرمایا کہ یہ طرز میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے اور مجھے بعد کو بڑی کلفت اور ندامت بھی ہوتی ہے اور رہ رہ کر سوچا کرتا ہوں کہ بجائے اس طرح کہنے کے اس طرح بھی کہہ سکتا تھا، بجائے یوں سمجھانے کے یوں

بھی سمجھا سکتا تھا، بجائے اس تجویز کے یہ تجویز بھی کر سکتا تھا، لیکن عین وقت پر مصلحت اصلاح کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ کوئی مصلحت پیش نظر رہتی ہی نہیں اور یہ جبھی تک ہے جب تک کہ میں نے اپنے ذمہ اصلاح کی خدمت سمجھ رکھی ہے اور اگر کبھی اس سے قطع نظر کر لی تو پھر میں ان شاء اللہ خود اخلاق بھی بن کر دکھلا دوں گا، میرا اصل مذاق تو یہی ہے کہ کسی سے کچھ تعرض ہی نہ کرو اور اپنے آپ کو سب سے یکسو رکھو، بقول احمد جام رحمہ اللہ تعالیٰ:

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار
دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(اشرف السوانح: ص۶۳ ر ج۳)

حضرت تھانوی کا ملفوظ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مجھ میں حدت ہے شدت نہیں، بلکہ دوسروں کے جذبات کی تو میں اتنی رعایت رکھتا ہوں کہ دوسروں کی نظر بھی ان دقائق رعایت تک نہ پہنچتی ہوگی، بفضلہ تعالیٰ دور دور تک کے احتمالات اذیت پر بھی فوراً میری نظر پہنچ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے احتراز کی توفیق بھی عطاء فرما دیتے ہیں اور اسی لیے اور بھی غصہ آتا ہے کہ میں تو ان کی اتنی رعایت کروں اور یہ میرے ساتھ ایسی بے فکری برتیں اھ۔ (اشرف السوانح: ص۴۶ ر ج۴)

حضرت تھانوی کا مشہور مقولہ ہے کہ میں اپنے بُرا بھلا کہنے والوں کو ہمیشہ معاف ہی کرتا رہتا ہوں۔ (ایضاً: ص۱۴۸ ر ج۲)

مولانا یحییٰ صاحب کی تواضع

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی سادی زندگی کو دیکھنے والے تو اب تک بکثرت موجود ہیں، ان کے لباس یا طرز معاشرت سے کوئی ان کو مولوی بھی نہیں سمجھتا تھا کپڑے زیادہ تر میل خورہ پہنتے تھے، جناب الحاج شاہ زاہد حسین صاحب رئیس بہٹ کے یہاں میرے حضرت قدس سرہٗ کے کپڑے بھی دُھلا کرتے تھے اور ہر ہفتے شنبہ کو ان کا آدمی آ کر دھوبی کے گھر کے کپڑے دے جاتا تھا اور جمعہ کے اُتارے ہوئے کپڑے لے جاتا تھا۔ میں اکثر خیال کیا کرتا تھا کہ دُھلے ہوئے کپڑوں میں اور اُتارے ہوئے کپڑوں میں سلوٹوں کے سوا کوئی فرق نہ ہوتا تھا کہ پاجامہ پر خدام کے دبانے کی وجہ سے کچھ سلوٹیں پیدا ہو جاتی تھیں، شاہ صاحب نے کئی دفعہ والد صاحب پر اصرار کیا کہ اعلیٰ حضرت کے ساتھ ساتھ آپ بھی اپنے کپڑے بھیج دیا کریں، انہوں نے فرما دیا کہ میرے کپڑے ایسے ہوتے ہی نہیں کہ دھوبی کے ہاں دُھلیں، بہت کم دھوبی کے یہاں دُھلوانے

کی نوبت آتی تھی، ورنہ کوئی خادم یا میری والدہ نور اللہ مرقدہا پانی میں نکال کر سکھا دیتی تھیں، جو اگلے جمعہ کو میرے والد صاحب پہن لیتے تھے۔

میرے پھوپھا مولانا رضی الحسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی زندگی رئیسانہ تھی وہ گرمی سردی کئی کئی اچکن بنوایا کرتے تھے اور میرے والد صاحب کے کاندھلہ جانے پر ایک دو اچکن گرمی کے ساتھ کر دیتے تھے، وہی میرے والد صاحب کے استعمال میں رہتی تھیں، اپنے لیے اچکن سلوانا میرے علم میں نہیں، چونکہ دونوں کا بدن ایک سا تھا، اس لیے وہ کرتے پاجامے بھی ایک دو ساتھ کر دیتے تھے، چونکہ بے تکلفی تھی اور بچپن کا تعلق تھا، کاندھلہ میں ساتھ پڑھتے تھے، گنگوہ میں بھی ساتھ رہے، اس لیے والد صاحب کو بھی ان کے کپڑے پہن لینے میں تکلف نہیں ہوتا تھا۔

گنگوہ کے قیام میں بھی اور سہارنپور کے صدر مدرسی کے دور میں بھی کھانے کے وقت مخصوص خدام اور مخصوص احباب اپنے اپنے گھر سے کھانا لا کر شریک ہو جاتے تھے اور کھانے کے وقت سب جگہ کے سالنوں کو ایک بڑے طباق میں یکجائی ملا لیتے تھے، اس میں شوربا بھی ہوتا، دال بھی ہوتی، ساگ بھی ہوتا، بھوجی بھی، سردی میں ان سب کو ملا کر انگیٹھی پر رکھ کر چند منٹ گرم لیتے اور سب مل کر اسی طباق میں مشترک کھاتے تھے۔

میرے اُستاذ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب سابق ناظم مظاہر علوم بھی اکثر کھانے کے وقت اپنے گھر سے کھانا لے کر آ جاتے تھے، ناظم صاحب کے مزاج میں نفاست نزاکت بہت تھی، مگر میرے والد صاحب سے تعلق بھی بہت تھا وہ بھی اس کچونڈے کو بہت رغبت سے کھاتے تھے اور کبھی کبھی گوشت منگا کر اور طلبہ کے کھانے سے پہلے اس کو پکوا کر یہ سب سالن اس میں ملا کر جوش دیئے جاتے تھے، تو ایسا لذیذ ہو جاتا تھا کہ ویسا لذیذ پھر نہیں ملا، اس واقعہ کو تو مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الخلیل میں بھی لکھا ہے، البتہ گوشت کا شوق ضرور تھا، جس زمانہ میں میری والدہ رحمہا اللہ تعالیٰ سہارنپور ہوتیں اس زمانہ میں تو والد صاحب کا گھر سے کھانا آ جاتا ورنہ بازار سے دو چار نفر کا جس میں ہم لوگ بھی ہوتے منگا لیا جاتا، (شاید آپ بیتی میں اس کا ذکر کہیں آ بھی چکا ہے) وہ بھی اسی طشت میں ڈال دیا جاتا تھا، اکمال الشیم کے مقدمہ میں مولانا شیخ علی متقی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حالات میں بھی اس واقعہ کا ذکر کر چکا ہوں کہ حضرت شیخ کا بھی یہی معمول تھا، مجھے یاد نہیں کہ والد صاحب نے گھر میں اپنے لیے کبھی چیز کے پکانے کی فرمائش کی ہو، والدہ مرحومہ جو بھی اپنی تجویز سے پکا دیتیں وہی دستر خوان پر چلا جاتا۔

تذکرۃ الرشید میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے یہاں سے خمیری روٹی اور قورمہ آیا، نوش فرما کر خانقاہ تشریف لائے اور تشریف لا کر میرے والد صاحب

نور اللہ مرقدہٗ سے دریافت فرمایا ''میاں یحییٰ تمہیں بھی کچھ بھاوے''؟ انہوں نے عرض کیا حضرت ایک ارہر کی دال تو بھاتی نہیں باقی جو ملے سب پسند ہے، آپ نے بیساختہ یہ شعر پڑھا:

کیا کہوں جرأت کہ کچھ بھاتا نہیں
کچھ تو بھایا ہے جو کچھ بھایا نہیں

(تذکرۃ الرشید: ص ۶۷ ؍ ج ۲)

میرے اکابر کے واقعات تواضع کے تو اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے لیے تو ایک دفتر چاہیے، یہ مضمون بھی اتنا بڑھ گیا کہ میرے کاتبوں کی تو رائے یہ ہے کہ اس مضمون کو بھی آپ بیتی سے نکال کر اکابر کے رمضان کی طرح سے اکابر کی تواضع کا ایک مستقل رسالہ علیحدہ کردوں، کیا بعید ہے کہ اگلی طباعت کے وقت ایسا بھی ہو جائے، یہ طبع کرنے والوں کی رائے پر ہے میں تو بہت ہی مختصر کرنا چاہتا ہوں، مگر جو سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے، اس کے واقعات ذہن میں اتنے آجاتے ہیں کہ ان کو ترک کرنا ہی پڑتا ہے۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر۱۳

اکابر کی ذکاوت

میں نے اپنے سب اکابر کو بڑا ہی ذکی الحس دیکھا مگر ساتھ یہ ان کا ضبط وتحمل بھی قابلِ دید رہا، بہت سی باتوں کو میں نے دیکھا کہ وہ واقعات کے متعلق اخیر تک پہنچ گئے، مگر مبارک چہروں پر یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ان کو اس واقعہ کا کوئی علم ہے، ضبط وتحمل کے متعلق تو کبھی موقع ہوا تو شاید ایک مستقل سرخی بھی لکھوادوں، اس وقت تو اکابر کی ذکاوت کے واقعات جو یاد آ گئے ہیں ان ہی کو لکھوار ہا ہوں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ کی ذکاوت

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ذکاوت کے قصے تو بہت ہی مشہور ومعروف اور بڑے دلچسپ ہیں، اورِح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ جب شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تالیف ''تحفہ اثناء عشریہ'' لکھنؤ میں پہنچی تو لکھنؤ کے نواب نے جو اس وقت بر سرِ حکومت تھا، مجتہدین شیعہ سے درخواست کی کہ اس کا جواب لکھا جائے، مجتہدین میں سے دلدار علی خان نے جواب کا بیڑا اُٹھایا، لیکن تحفہ کی زبان چونکہ بے نظیر تھی اس لیے مرزا قتیل سے درخواست کی گئی کہ مضامین قبلہ و کعبہ لکھیں گے اور آپ ان کو اپنی عبارت میں ادا کردیں، تا کہ مضامین کا جواب مضامین سے اور عبارت کا جواب عبارت میں ادا کریں، مگر قتیل نے عذر کیا اور کہا کہ میں شاہ صاحب کی سی فارسی عبارت لکھنے پر قادر نہیں ہوں اور اس کی تائید میں اس نے بیان کیا کہ دلی میں ایک رنڈی سے میری آشنائی ہے اور میں نے نہایت دل سوزی سے اپنی پوری قابلیت صرف کر کے اسے ایک خط لکھا تھا، وہ رنڈی خط کو دلی کے تمام لائق فائق لوگوں کے پاس لے کر گئی اور درخواست کی کہ اس کا جواب لکھ دیا جائے مگر اس کے جواب کا کسی نے اقرار نہیں کیا، مجبور ہو کر وہ اس خط کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے گئی اور ظاہر کیا کہ میں تمام جگہ پھر چکی ہوں، مگر کسی نے جواب کی حامی نہیں بھری، اب میں مجبور ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں، حضور اس کا جواب لکھ دیں، شاہ صاحب نے خط سنتے ہی فی البدیہہ اس کا جواب لکھوادیا، وہ خط چھ مہینے سے میرے پاس رکھا ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کا جواب لکھوں مگر اب تک اس کا جواب نہیں ہوسکا، اب آپ غور فرمالیں کہ میں تحفہ کا جواب کس طرح لکھ سکتا ہوں۔

جب قتیل نے عذر کیا تو ناچار قبلہ وکعبہ نے خود ہی جواب لکھا، اس جواب کو نواب صاحب نے مرزا قتیل کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ بتایئے کیسا جواب ہے؟ مرزا قتیل نے اس کو دیکھ کر کہا کہ ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں؟ نواب صاحب نے فرمایا، فرمایئے! مرزا قتیل نے کہا کہ سچ تو یہ ہے کہ قبلہ وکعبہ سے اپنی کتاب کا نام بھی رکھنا نہیں آیا، شاہ صاحب تو ''تحفہ'' پیش کرتے ہیں اور قبلہ وکعبہ تحفہ کا جواب تلوار سے دیتے ہیں، مرزا قتیل کے اس اعتراض کا منشاء یہ تھا کہ قبلہ وکعبہ نے اپنی کتاب کا نام ''ذوالفقار'' رکھا تھا، اس کے بعد قبلہ وکعبہ نے فرمایا کہ اچھا عبارت کی نسبت کچھ فرمایئے، قتیل نے کہا کہ حضور! کہاں جائس کا جلاہا اور کہاں دلی کی سیڑھیوں کا بیٹھا ہوا شہدہ (یہ قتیل نے اس لیے کہا کہ قبلہ وکعبہ جائس کے تھے اور جائس کے جلاہے مشہور ہیں)

(اورِ ح ثلاثہ: ص۴۳)

دوسری جگہ لکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے پاس ایک جہاز راں انگریز آیا اور کہا کہ میں نے سنا ہے آپ کو ہر فن میں دخل ہے، جہاز رانی میں بھی آپ کو کچھ آتا ہے شاہ صاحب نے جو بعض پرزوں کے حالات بیان کیے ہیں تو وہ اس کو بھی یاد نہ تھے، اس کو حیرت ہوگئی، پوچھا تو فرمایا کہ بچپن میں اس فن کی ایک کتاب دیکھی تھی اس میں سے کچھ یاد رہ گیا۔

شاہ صاحب کے پاس دو قوال آئے ان میں کسی راگنی میں اختلاف تھا اور شاہ صاحب کو حکم بنایا دونوں نے شاہ صاحب کے سامنے گایا، شاہ صاحب نے ایک کی تصویب کی اور دوسرے کا تخطئہ اور بتا دیا کہ یہ خرابی ہے، ان کو بڑا تعجب ہوا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ جب ہم مکتب میں جاتے تھے تو ہمارے راستہ میں ایک ڈوم نے بالا خانہ کرایہ پر لے رکھا تھا، ہم آتے جاتے سنا کرتے تھے، اسی سے ہم نے کچھ معلوم کیا تھا جو ہمیں یاد ہے۔ (اورِ ح ثلاثہ: ص۴۷)

حضرت شاہ عبدالقادر کی ذکاوت

شاہ عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق اورِ ح ثلاثہ میں متعدد قصے لکھے ہیں، اس میں بروایت مولانا نانوتوی یہ واقعہ لکھا ہے کہ اس خاندان کے دو غبی تھے۔ ایک شاہ عبدالقادر صاحب اور ایک شاہ اسحاق صاحب، مولوی فضل حق صاحب اور مفتی صدرالدین صاحب یہ فرمایا کرتے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علوم دینیہ جیسے حدیث، تفسیر وغیرہ خوب جانتے ہیں، مگر معقولات نہیں جانتے، چنانچہ ایک روز جس وقت یہ دونوں پڑھنے جا رہے تھے، ابھی وہ شاہ صاحب تک پہنچے بھی نہیں تھے کہ شاہ صاحب نے اپنے خدام کو حکم دیا کہ ایک بوریہ مسجد سے باہر ڈال دو ایک مسجد کے اندر اور جب فضل حق اور صدرالدین آئیں تو ان کو وہیں بٹھا دو، بوریئے حسب الحکم بچھا دیئے گئے

اور جب وہ دونوں واپس آگئے تو ان کو وہیں بٹھا دیا گیا، جب ان کے آنے کی شاہ صاحب کو اطلاع ہوئی تو شاہ صاحب تشریف لائے اور آکر اپنے بوریئے پر بیٹھ گئے اور فرمایا، میاں فضل حق اور میاں صدر الدین! آج سبق پڑھانے کو تو جی نہیں چاہتا، یوں جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولیوں کے خرافات میں گفتگو ہو، انہوں نے فرمایا کہ جیسے حضرت کی خوشی ہو، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا، اچھا یہ بتاؤ کہ متکلمین کا کون سا مسئلہ ایسا ہے جو فلاسفہ کے مقابلہ میں بہت ہی کمزور ہے، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! متکلمین کے تو اکثر مسائل کمزور ہی ہیں، مگر فلاں مسئلہ تو بہت کمزور ہے، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تم فلاسفہ کا مسئلہ لو اور ہم متکلمین کا اور گفتگو کریں، انہوں نے عرض کیا بہت اچھا، اس پر گفتگو ہوئی اور شاہ صاحب نے دونوں کو عاجز کر دیا، اس کے بعد فرمایا اچھا اب بتاؤ فلاسفہ کا کونسا مسئلہ کمزور ہے، اس پر انہوں نے عرض کیا کہ فلاں مسئلہ کمزور ہے، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا اب تم متکلمین کا پہلو لو اور ہم فلاسفہ کا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور شاہ صاحب نے اب بھی ان کو چلنے نہیں دیا، جب ہر طرح ان کو مغلوب کر دیا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں فضل حق اور میاں صدر الدین! تم یہ نہ سمجھو کہ ہم کو معقول نہیں آتی، بلکہ ہم نے ان کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، مگر انہوں نے ہمیں اب تک نہیں چھوڑا، وہ اب تک ہماری قدم بوسی کیے جاتے ہیں، خان صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ میں نے اپنے بزرگوں سے یہ سنا تھا کہ یہ گفتگو دونوں سے ہوئی تھی مگر مولوی احمد علی خیر آبادی اور مولوی ماجد علی کہتے ہیں کہ یہ گفتگو صرف مفتی صاحب سے ہوئی تھی۔

(اورِح ثلاثہ: ص ۵۱)

حضرت شاہ اسماعیل شہید کی ذکاوت

حضرت شاہ اسماعیل شہید صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں لکھا ہے کہ میں یعنی ملا نواب صاحب کی عمر پندرہ سال کی تھی، اپنے اُستاذ حافظ دراز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (محشی صدرا) کی اُنگلی تھامے ہوئے کہ وہ نابینا ہو گئے تھے، مولانا اسماعیل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، مولانا اسماعیل صاحب اس وقت پشاور میں تھے اور اپنے گھوڑے پر کھرا کر رہے تھے، حافظ صاحب نے اسی حالت میں چند معقولی سوالات کیے، جس کا جواب حضرت شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے نہایت متانت اور سادگی سے اسی وقت دے دیا، حافظ دراز صاحب شافی جوابات لے کر واپس ہونے لگے تو مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حافظ صاحب ایک سوال میرا بھی ہے، حافظ صاحب ٹھہر گئے اور مولانا کا سوال سنا اور جواب دیا، اس پر مولانا نے شبہ فرمایا، اس کا جواب پھر حافظ

صاحب نے دیا، مولانا نے پھر شبہ فرمایا اور حافظ صاحب نے اس کا بھی جواب دیا، مولانا نے پھر تیسری دفعہ خدشہ پیش فرمایا تو حافظ صاحب کو غصہ آ گیا اور طیش میں آ کر بجائے جواب کے غیر مہذب عربدہ شروع کر دیا، جس سے مولانا کی پگڑی زمین پر گر گئی، مولانا نے اسی سادگی سے خاک آلود پگڑی اُٹھا کر سر پر رکھ لی اور فرمایا کہ حافظ صاحب میں نے تو آپ کے کتنے سوالات کے جواب عرض کیے، مگر آپ تو ایک ہی سوال پر خفا ہو گئے۔ (اورحِ ثلاثہ: ص ۹۶)

دوسری جگہ لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی کا ارشاد ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل شہید کا ذہن اس درجہ سریع الانتقال تھا کہ پانچ آدمیوں کو سامنے بٹھا کر پانچ مختلف مضامین لکھاتے تھے اور اس طرح بتلاتے اور املاء کراتے کہ کسی کا قلم نہ رُکتا۔ (اورحِ ثلاثہ: ص ۹۸)

حضرت گنگوہی نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مولانا رشید خاں صاحب جو شاہ عبد العزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد تھے اور بوجہ اپنی ذکاوت اور استعداد کامل کے رشید المتکلمین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، ایک دفعہ درس دیتے ہوئے فرمانے لگے کہ مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب کو دینیات کے ساتھ شغف تھا، باقی معقولات کی طرف توجہ نہیں، اتفاقاً مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کو ایک دن بخار آ گیا اور رشید الدین خان صاحب عیادت کے لیے تشریف لے گئے، مولانا شہید فرمانے لگے کہ مولانا آج بخار میں جو دماغ پریشان تھا اسی پریشانی اور انتشار کی حالت میں فلاسفہ کے فلاں فلاں مسئلہ کی طرف ذہن منتقل ہو گیا اور ان مسائل پر میرے دل میں یہ یہ اعتراضات پیدا ہوئے، مولانا رشید الدین خاں صاحب بالکل ساکت رہے، واپس ہونے پر ان کے تلامذہ نے کہا کہ آپ تو فرماتے تھے کہ مولانا اسماعیل کو معقولات کی طرف توجہ نہیں، فرمایا کہ بے شک میں نے یہ کہا تھا، مگر اب میری رائے یہ ہے کہ اگر ارسطو اور افلاطون بھی قبر سے نکل کر آ جائیں تو مولانا کے بیان کردہ اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔

(اورحِ ثلاثہ: ص ۹۸)

دوسری جگہ لکھا ہے کہ ایک شخص کا نام محمد کالے تھا، وہ اپنا سجع کہلانا چاہتا تھا، اکثر نے انکار کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو گورے تھے، کالے کہاں تھے، اس میں جوڑ کیسے ملائیں، وہ مولانا اسماعیل شہید صاحب کے پاس پہنچے تو آپ نے فوراً سجع کہہ دیا:

ہر دم نام محمد کالے

(اورحِ ثلاثہ: ص ۱۰۰)

حضرت شاہ اسحاق صاحب کی ذکاوت

حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک صاحب شمس بازغہ کی ایک عبارت پر بہت غور وخوض کررہے تھے جو ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی، اتفاق سے شاہ اسحاق صاحب بھی اس وقت مسجد میں ٹہل رہے تھے، شاہ صاحب نے ان کے پاس آکر دریافت کیا کہ میاں صاحبزادے بڑے مصروف ہو، کونسی کتاب دیکھ رہے ہو، ان صاحب نے اس پر کچھ التفات نہیں کیا اور ہوں ہاں کرکے ٹال دیا، شاہ صاحب نے دوسری مرتبہ پھر پوچھا کہ میاں صاحبزادے ہمیں تو بتاؤ کونسی کتاب دیکھ رہے ہو؟ ان صاحب نے پھر ٹال دیا، شاہ صاحب پھر چلے گئے، تیسری مرتبہ پھر ٹہلتے ہوئے آئے اور ان صاحب کے پاس بیٹھ گئے اور ذرا اصرار سے پوچھا میاں بتاؤ تو سہی کہ یہ کیا کتاب ہے اور تم اس میں اتنے مصروف کیوں ہو؟ تب ان صاحب نے مجبور ہوکر کہا کہ یہ کتاب شمس بازغہ ہے میں ایک مقام میں اُلجھا ہوا ہوں، اسے سوچ رہا ہوں، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ کونسا مقام ہے، انہوں نے اس کا جواب بھی لاپرواہی سے دیا، جب کئی مرتبہ شاہ صاحب نے دریافت کیا تب انہوں نے ان کو وہ مقام دکھلایا، وجہ ان کی بے التفاتیوں کی یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے لوگ معقول نہیں جانتے، شاہ صاحب نے اس مقام کو ملاحظہ فرمایا کہ تمہارے اُستاد نے یہ بتلایا ہوگا اور تم یہ کہتے ہوگے؟ انہوں نے اقرار کیا، اس پر شاہ صاحب نے اس کا صحیح مطلب بتلادیا اور عبارت پر اس کو منطبق فرمادیا۔

(اورِح ثلاثہ: ص ۱۱۰)

حضرت گنگوہی کے واقعات

قطب الارشاد حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق اورِح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ اس قدر ذکی الحس تھے کہ ایک مرتبہ جب آپ مسجد میں عشاء کی نماز کے لیے تشریف لائے تو فرمایا، آج کسی نے مسجد میں دیا سلائی جلائی ہے، تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ ایک صاحب نے مغرب کے بعد جلائی تھی، جس کا اثر مولانا کو عشاء کے وقت محسوس ہوا اور آپ کے یہاں عشاء کی نماز قریب ثلث شب کے وقت ہوتی تھی۔ (اورِح ثلاثہ: ص ۲۰۳)

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کا اتباع سنت ضرب المثل ہے، ایک مرتبہ لوگوں نے کہا کہ مسجد سے بایاں پاؤں نکالنا اور جوتا سیدھے پاؤں میں پہننا سنت ہے، (دیکھیں حضرت ان دونوں کو کیسے جمع فرماتے ہیں) لوگوں نے اس کا اندازہ کیا جب مولانا مسجد سے نکلنے لگے تو آپ نے پہلے بایاں پاؤں نکال کر کھڑاؤں پر رکھا، جب سیدھا پاؤں نکالا تو کھڑاؤں کی کھونٹی انگوٹھے میں

ڈالدی، اس کے بعد بائیں پاؤں میں کھڑاؤں پہنا۔ (اورحِ ثلاثہ: ص ۳۰۶)

تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ استنجاء کے لیے تشریف لے جارہے تھے، گولر کے قریب پہنچے، ٹھٹکے اور فرمایا کہ تمبا کو کی بو آتی ہے، آپ تو یہ فرما کر چلے گئے، خادم نے غور کے ساتھ دیکھا تو پان کی پیک پڑی ہوئی تھی، جو خشک ہو چکی تھی، غرض اس کو کھرچا اور زمین کو صاف کر دیا گیا، واپس تشریف لائے تو فرمایا اب نہیں ہے، اس کے باوجود ضبط اس کمال کا تھا کہ جہاں اظہار سے کسی کی تاذی کا احتمال ہوتا تو تحمل وسکوت فرماتے یا ملیح اشارہ سے کسی مخلص خادم پر ڈھال کر فرما دیتے تھے کہ نصیحت بھی ہو جائے اور نا گوار بھی نہ گزرے۔

ایک مرتبہ چند آدمی آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، جن کے کپڑوں سے میلے اور عرق آلود ہونے کی وجہ سے بُو آتی تھی، آپ دل شکنی کے اندیشہ سے ان کو تو صاف طور پر نہ فرما سکے، مولوی محمد یحییٰ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرمایا، میاں مولوی محمد یحییٰ کبھی نہا بھی لیا کرو دیکھو بدن میں پسینہ کی بو آنے لگی۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۵۳/ج ۲)

حالانکہ والد صاحب کے یہاں کثرتِ غسل کا اہتمام آخر تک رہا اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے یہاں حاضری کے دوران میں تو اس کا بہت اہتمام رکھتے تھے، تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ آپ تمام حواس کے اعتبار سے نہایت ذکی تھے، بیسیوں تعجب انگیز قصے آپ کی ذکاوت حس اور کمال ادراک کے مشہور ہیں، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے لکھا ہے کہ بھائی عبد الرحمٰن صاحب فرماتے تھے کہ مجھے چائے کا بہت شوق تھا اور اپنے ہاتھ سے پکایا کرتا تھا، حضرت جب چائے پیتے تو فرماتے چائے میں کچے پانی کا ذائقہ آتا ہے، میں نے ایک روز دل میں کہا کہ اچھا آج میں اس قدر پکاؤں گا کہ پانی بھاپ بن جائے، چنانچہ کئی گھنٹے تک پکائی، جب تیار ہوئی اور حضرت کو پلائی فرمایا کہ کچا پانی کا ذائقہ اس میں بھی ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ وہم کا درجہ ہے، پھر مجھے خیال ہوا کہ میں نے اس میں سے کچھ دودھ گھر سے لاکر ڈالا تھا جو کڑھا ہوا تھا، پوچھوں کہیں اس میں تو پانی نہیں تھا، آخر گھر جا کر معلوم ہوا کہ لوگوں نے اس میں کچھ پانی ڈال دیا تھا۔

مولانا سید احمد صاحب مدنی (برادر بزرگ حضرت شیخ الاسلام مدنی) ایک دن چائے کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے ایک پیالی سے دوسری پیالی میں لوٹ پوٹ رہے تھے، کچھ دیر میں حضرت نے فرمایا اس کی جھلک سے معلوم ہوتا ہے کہ پینے کے قابل ہو گئی ہے، جن ایام میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب دیو بندی حضرت کے لیے چائے پکایا کرتے تھے، کئی دن ایسا قصہ پیش آیا کہ جب حضرت کو چائے پلائی حضرت نے فرمایا، کچے پانی کی بو آتی ہے، ہر چند مولوی صاحب چائے

جوش دینے میں کوشش کی مگر جب فرمایا، حضرت نے یہی فرمایا کہ کچے پانی کی بو موجود ہے آخر بہت پریشان ہوئے کہ یا اللہ کیا بات ہے، پانی کو بہتیرا پکا تا ہوں دودھ اونٹتا ہوا ڈالتا ہوں پھر کچا پانی کیسا، آخر بہت غور کے بعد پتہ چلا کہ جس پیالی میں چائے نکالی جاتی ہے وہ دھو کر خشک نہیں کی جاتی، چنانچہ اس دن پیالی کو دھو کر کپڑے سے صاف کے اور چائے لے کر حاضر ہوئے، حضرت نے چائے پی لی اور فرمایا آج کچے پانی کی بو نہیں ہے۔

حضرت کے مہمان سہ دری میں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، حالانکہ دستر خوان اُٹھا کر بوریہ جھاڑ دیا جاتا تھا، مگر حضرت تشریف لاتے تو جو کھانا کھایا جاتا اس کا نام لے کر فرما دیتے کہ فلاں شے کی خوشبو آتی ہے، ایک مرتبہ کھانا کھاتے میں آپ نے فرمایا اس میں کوتھمیر کی خوشبو آتی ہے، ہر چند غور کیا مجمع میں سے کسی کو احساس نہ ہوا، تحقیق کیا تو پتہ چلا کہ پکتی ہانڈی میں چار پانچ پتے ڈال دیئے گئے تھے، آپ کے ادراک کے متعلق ایسے ایسے عجیب اور حیرت انگیز قصے لوگوں نے دیکھے کہ بغیر دیکھے غالباً کہنے والوں کا یقین بھی نہ آتا۔

ایک مرتبہ جمعہ کے بعد مجمع کثیر آپ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مولوی محمد یحییٰ صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد الیاس جن کی عمر اس وقت دس گیارہ برس کی تھی، دبے پاؤں آئے اور چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ گئے، معاً حضرت نے گردن اوپر اُٹھائی اور فرمایا بچہ کا سانس ہے، اس وقت کسی نے کہا کہ حضرت! محمد الیاس آئے ہیں۔

ایک بار نمبر دار فضل حق کا لڑکا اکرام الحق بعد نماز مغرب حاضر خدمت تھا، حضرت کو خبر نہ تھی، کہ کون کون موجود ہیں، جب کھانا کھانے کو مکان جانے لگے اور اکرام الحق کے قریب پہنچے تو حضرت ٹھہرے اور فرمایا نمبر دار کی سی بو آتی ہے، تب کسی نے کہا کہ نمبر دار کا لڑکا اکرام ہے۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۵۸ رج ۲)

اسی رسالہ میں آداب طلبہ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا واقعہ نقل کرا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ حضرت نے حنفیت کی تائید میں نہایت زوردار تقریر فرمائی، جس پر ایک شخص نے جھوم کر کہا کہ اگر حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اس تقریر کو سنتے تو رجوع فرما لیتے، حضرت امام ربانی نے فرمایا، توبہ توبہ حضرت امام اگر موجود ہوتے تو میری یہ تقریر ایک شبہ ہوتی اور حضرت مجتہد اس کا جواب فرما دیتے، پورا قصہ وہاں گزر چکا۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے واقعات

حضرت امام کبیر نانوتوی قدس سرہٗ کی ذکاوت کے قصے بھی بہت مشہور ہیں، نواب اعظم

علی خان کے یہاں ایک قصہ خواں نوکر تھا اور یہ قصہ خواں بہادر شاہ کا قصہ خواں تھا اور اس سے بڑھ کر دہلی میں کوئی قصہ خواں نہ تھا، نواب صاحب کے یہاں اسے تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، اس کے اندر یہ کمال تھا کہ کیسا ہی ہکلا یا کسی قسم کا آدمی ہو اس کی اسی طرح نقل کر دیتا تھا کہ اصل اور نقل میں امتیاز نہ ہوسکتا تھا۔

ایک مرتبہ مولانا نانوتوی خورجہ تشریف لائے اور اعظم خان نے مولانا کی دعوت کی، یہ قصہ خواں رافضی تھا، اس نے مولانا سے سوال کیا کہ حضرت! میں ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں، مولانا نے اجازت دے دی، اس نے عرض کیا کہ خلافت کی قابلیت کس میں تھی اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کیسے خلیفہ ہو گئے، جب کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خلیفہ نہ بنایا تھا، اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ میں جواب عرض کرتا ہوں، مگر تم اس کے جواب میں نہ بولنا، جب میں تقریر کر چکوں اس وقت جو کچھ شبہ ہو اس کو پیش کر دینا، اس نے کہا بہت اچھا۔

مولانا نے فرمایا، اگر کوئی پہلوان پھکیت یا بکیت بیمار ہو جائے اور اس کی وجہ سے کشتی خود نہ سکھا سکے اور جب سکھانے کا وقت آئے، اپنے کسی شاگرد سے کہہ دے کہ تو سکھلا دے، یا کوئی رئیس اور اہلکار کہیں جائے اور اپنے کام کے متعلق اپنے بیٹے یا کسی عہدیدار سے کہہ جائے کہ میرا کام تم کر دینا اور اشخاص مامورین اور خدمت مفوضہ کو انجام دیں تو استخلاف عملی ہوگا اور اس قسم کا استخلاف اس استخلاف سے کہیں بڑھ کر ہے جو فقط اس کہنے سے ہو کہ فلاں میرا خلیفہ ہے، جب یہ مقدمہ ذہن نشین ہو گیا تو اب دوسرا مقدمہ سنو اور اس کو غور سے سنو۔

ارکانِ اسلام چار ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، مگر دو (۲) ان میں اصل ہیں اور دو (۲) ان میں تابع۔ نماز اصل ہے اور زکوٰۃ اس کے تابع، کیونکہ نماز کا تعلق براہِ راست حق تعالیٰ سے ہے اور وہ اس کے دربار کی حاضری اور اس کی تعظیم اور اس سے عرض معروض کا نام ہے اور زکوٰۃ کا تعلق بلا واسطہ محتاجوں اور فقراء سے ہے، پس نماز کے مقابلہ میں زکوٰۃ ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اہلِ دربار کو اپنے دربار میں پانچ وقت حاضری کا حکم دے اور یہ بھی حکم دے کہ ہماری طرف سے جو انعامات و صلات تم کو وقتاً فوقتاً ملے ہیں، ان میں سے کچھ ہماری رعایا کو بھی جو دربار کے راستہ میں خیرات کے موقع پر بیٹھ جاتے ہیں، دے دیا کرو، سو ظاہر ہے کہ حاضری دربار مقصود ہے اور صدقہ و خیرات اس کے تابع اور یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تقریباً ہر جگہ قرآن میں زکوٰۃ کو نماز کے بعد بیان فرمایا، اسی طرح حج کا تعلق براہِ راست حق تعالیٰ سے ہے، کیونکہ اس میں محبوب کے درِ دولت پر حاضر ہو کر اپنے عشق و محبت کا اظہار ہے اور روزہ میں کسر شہوت نفس ہے جو مانع ہے اس محبت و عشق سے اور ان خامیوں کو دفع کرنا ہے جو اس ناصح نامہربان نفس امارہ کی بدولت اس کی خدمت میں پیدا ہو

گئی، اس لیے روزے تیس مقرر کیے گئے اور حج کا وقت رمضان کے بعد سے شروع کیا گیا، کیونکہ آخری وقت حج سے رمضان تک دس مہینے ہوتے ہیں، پس ہر مہینے کے لیے مسہل یعنی روزے تجویز کیے گئے اور ان سب کو ایک مہینہ رمضان میں جمع کر دیا گیا تاکہ دس مہینوں میں جس قدر نفس امارہ کی وجہ سے عشق ومحبت کے جذبات میں خامی وخلل آ گیا ہے ان مسہلوں سے اس کی تلافی کی ہو جائے، وہ اس قابل ہو سکے کہ محبوب کے درِ دولت پر حاضر ہو کر صحیح طور پر اپنی محبت کا اظہار کر سکے اور جب رمضان میں وہ ان مسہلوں سے اس قابل ہو گیا تو اب یکم شوال سے اس کو اجازت ہوئی کہ اب آؤ اور آ کر اپنی محبت کا اظہار کرو، یعنی اس وقت سے حج کا وقت شروع ہو گیا، اس کی ایسی مثال سمجھ لیجئے جیسے بادشاہ اپنے اہلِ دولت کو جشن شاہی کی شرکت کے لیے دعوت دے، اس کے ساتھ یہ بھی حکم دے کہ سب لوگ خوب نہا دھو کر اعلیٰ اعلیٰ خوشبوئیں لگا کر پوری طرح شرکتِ جشن کے قابل ہو کر شریک جشن ہوں، سو ظاہر ہے کہ شرکتِ جشن مقصود ہے اور باقی امور اس کے تابع، جب یہ ذہن نشین ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ نماز اور حج ارکان مقصودہ ہیں اور زکوٰۃ اور روزہ ان کے تابع تو اب اصل مقصود سنو۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں صدیق اکبر کو امیر حج بنایا اور باوجود تمام صحابہ کی موجودگی کے اس خدمت پر آپ کے سوا کسی اور کو مامور نہیں فرمایا، پس اسلام کے ایک رکن اصلی کے متعلق آپ کا استخلافِ عملی ثابت ہو گیا اور اس کے ضمن میں اس کے تابع روزہ کے متعلق بھی استخلاف ثابت ہو گیا، پھر آپ نے اپنے مرض وفات میں خدمت امامت صلوٰۃ آپ کے سپرد کی اور سترہ (۱۷) وقت کی نمازیں اپنے سامنے آپ سے پڑھوائیں اور باوجود تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی موجودگی کے یہ خدمت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی اور کے سپرد نہیں فرمائی، پس نماز کے متعلق آپ کا استخلاف عملی ثابت ہو گیا، اب کیا وجہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ برحق نہ مانا جائے اور کس طرح کہا جائے کہ خلافت کی ان میں اہلیت نہ تھی اور اہلیت خلافت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ میں تھی اور وہی خلیفہ تھے۔

مولانا نے اس تقریر کو نہایت وضاحت اور بسط کے ساتھ فرمایا تھا اور قدر دلکش پیرایہ میں بیان فرمایا تھا کہ میں نے مولانا کی کوئی تقریر ایسی دل کش نہیں سنی، مگر وہ تقریر مجھے (امیر شاہ خان) محفوظ نہیں رہی، اس لیے اس کا قریب قریب خلاصہ بیان کر دیا گیا، اس تقریر کا قصہ خواں پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت رفض سے تائب ہو کر سنی ہو گیا۔ (اورِح ثلاثہ: ص ۲۲۱)

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ باوجود جفاکش اور مجاہد ہونے کے لطیف الطبع اور نازک دماغ تھے، اتفاقاً ایک نہایت ہی بدہیئت شخص

سامنے آ کر بیٹھ گیا تو حضرت مولانا کی طبیعت رک گئی، بالآخر کسی انداز سے اُٹھے اور مجمع ایک دم تہ و بالا ہوا، اس گڑ بڑ میں وہ شخص سامنے سے ٹل گیا، پھر آ کر تقریر شروع فرمائی اور اب طبیعت بے تکان تھی۔ (اورحِ ثلاثہ: ص ۲۵۷)

مولانا حبیب الرحمن صاحب نے فرمایا کہ مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ اکثر تقریر فرماتے ہوئے بیچ میں چند ایک منٹ سکوت فرماتے تھے اور ایک دم رُک جاتے تھے، اس پر عرض کیا گیا کہ حضرت مسلسل تقریر فرماتے ہوئے آپ کیوں رُک جاتے ہیں، فرمایا ایک ہی مضمون کے بیسیوں پیرائے اور عنوان ذہن میں ایک دم آ جاتے ہیں اور طبیعت رک جاتی ہے تو اس پر غور کرنے لگتا ہوں کہ کس کو لوں اور کس کو چھوڑوں۔ (اورحِ ثلاثہ: ص ۲۵۸)

طرزِ تعلیم میں ایک واقعہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بہت مفصل لکھوا چکا ہوں کہ ایک انگریز مہندس نے اشتہار دیا تھا کہ کوئی شخص مثلث کے زاویہ کو تین حصوں میں دلیل سے ثابت اور منقسم کر دے تو ڈیڑھ لاکھ روپے انعام ہے، اس پر مظفر نگر کے منصف صاحب نے بڑی کاوش اور محنت سے اس کو ثابت کیا اور کئی ماہرین ہندسہ نے مصنف کو مشورہ دیا کہ اس کو شائع کر دیں اور ڈیڑھ لاکھ روپے کا انعام وصول کر لیں، مگر مصنف صاحب کا اصرار یہ تھا کہ حضرت نانوتوی صاحب اگر بغور ملاحظہ فرما کر تصویب کر دیں تو شائع کر دوں، مولانا اتفاق سے مظفر نگر تشریف لے گئے اور واپسی میں ریل پر سوار ہونے کے لیے جب اسٹیشن پر تشریف لائے تو گاڑی میں دس بارہ منٹ باقی تھے، ڈاکٹر عبد الرحمن صاحب جو حضرت گنگوہی کے بعد خاص خدام میں ہو گئے تھے منصف صاحب کی تمنا ظاہر کی، خیال تھا کہ حضرت اس تحریر کو اپنے ساتھ لے جائیں گے، حضرت نے گاڑی کے انتظار میں کھڑے کھڑے سرسری اس کو سنا اور فرما دیا کہ اس کا فلاں مقدمہ نظری ہے، حالانکہ اقلیدس کے تمام مقدمات کی انتہا بدیہیات پر ہوتی تھی، چونکہ وہ صاحبِ فن تھے فوراً سمجھ گئے اور اشتہار دینا ملتوی کر دیا، لوگوں نے کہا بھی کہ تم نے ڈیڑھ لاکھ کھویا، اس وقتِ نظر کو کون پہچانتا۔

اس جگہ مولانا کی ذکاوت کے اور بھی قصے گزر چکے ہیں، طرزِ تعلیم میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ بھی قصہ گزر چکا کہ دیوبند چھتہ کی مسجد میں اقلیدس پڑھاتے ہوئے جب کسی شکل کھینچنے کی ضرورت ہوتی تھی تو بوریہ کا کونہ اُٹھا کر کچی زمین پر اُنگلی سے شکل کھینچ کر سمجھا دیتے تھے، نہ پرکار کی ضرورت تھی نہ کسی اوزار کی۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق احسن العزیز میں لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب وضو کرتے ہوئے اقلیدس و مساحت کے سوالات حل کرتے جاتے تھے، ایک وہاں اسکول تھا، وہاں کے مدرس پوچھنے آجاتے تھے، مولانا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اول مرتبہ ہی میں جہاں تک میرا ذہن پہنچنا ہوتا ہے پہنچ جاتا ہے، اگر نہیں پہنچتا تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ (حسن العزیز: ص۲۰۲/ج۲)

حضرت تھانوی کا واقعہ اکابر کے وصیت نامے

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کا ارشاد ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ جس وقت نابینا ہو گئے تو میں کبھی ویسے ہی چپکے سے جا کے نہیں بیٹھا، بلکہ جب گیا یہ کہہ دیا کہ اشرف علی آیا ہے اور جب چلنے لگا تو کہہ دیا کہ اشرف علی رخصت چاہتا ہے، ویسے چپکے سے جا کر بیٹھنے میں تجس کا شائبہ ہے، تشبہ بالمتجس بھی تجس ہے، آنے جانے کی اطلاع سے یہ فائدہ تھا کہ شاید کوئی بات میرے سامنے فرمانا نہ چاہیں اور حضرت فرمانے لگیں۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص۳۸۵)

حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کی ذکاوت کے قصے اتنے محفوظ اور ضرب المثل ہیں کہ ان کا احاطہ بہت مشکل ہے، حضرت کے سارے معمولات سراسر ذکاوت اور کثرتِ احساس پر مبنی ہیں، نمونے کے طور پر صرف اشراف السوانح سے وصیت کی ایک یادداشت عبرت اور عمل کے لیے لکھواتا ہوں۔

حضرت تحریر فرماتے ہیں یادداشت ہائے ضروری متعلقہ امانت حجرہ نمبر۱ تمام نسخ رافع الضنک غیر مجلد کے تقسیم کے لیے ہیں اور شیخ (فلاں) صاحب کی مملوک ہیں، نمبر۲ تمام نسخ غیر مجلد ہدیہ سنیہ و تقلیل الاختلاط مع الانام واسرار العبادۃ کے تقسیم کے لیے ہیں اور مملوکہ حاجی (فلاں) صاحب کے ہیں ان سب کے ساتھ مثل دیگر امانت کے معاملہ کیا جائے اور اگر انہیں کتابوں کے نسخے حجرہ نمبر۲ میں پائے جائیں وہ میری ملک ہیں، اسی طرح اسی حجرہ کی رسی پر جو کپڑے رکھے ہیں وہ مساکین کے لیے ہیں، میں ان کی تقسیم میں وسیع ہوں، یہ تقسیم کر دیئے جائیں، نمبر۳ لانبی تپائی مولوی فلاں کی ہے، وہ ان کو دے دی جائے، نمبر۴ سہ دری میں جو گھڑی، گھنٹہ دار رکھی ہے، یہ مدرسہ کی ہے وہ ان کو دے دی جائے، نمبر۵ سہ دری میں جو کھونٹی پر چوبی تختی رمضان کے نقشہ کی ہے وہ بھی میری ملک نہیں ہے، نمبر۶ لفافہ دان جو میری چوکی کے برابر رکھا رہتا ہے، اس کے سب سے اخیر اور نشیبی درجہ میں اور اسی طرح سہ دری کی جنوبی دیوار کے بڑے طاق میں باستثناء رسائل

کہ وہ میری ملک ہیں، اکثر کچھ کاغذ ارت رہتے ہیں وہ دوسروں کی ملک ہیں، مطبوعات پر تو مالکوں کے نام ہیں، ان کو دے دیئے جائیں اور خالی لفافہ بلا نمبر جوابی کارڈ بلا نمبر کاتبوں کے پاس مع اطلاع واقعہ بھیج دیئے جائیں اور نمبر وار لفافے یا کارڈ استفتوں کے متعلق ہیں، انہی نمبروں کے فتوے کاتب یا ناقل فتاویٰ سے لے کر بھیج دیئے جائیں اور اگر ان نمبروں کے فتوے نہ ملیں تو گم ہو جانے کی اطلاع کر دی جائے اور جن پر لفظ لقطہ لکھا ہے وہ مصارف لقطہ میں صرف کیے جائیں، اسی طرح جن میں ٹکٹ ہوں اور پتہ نہ ہو وہ بھی لقطہ ہیں مضمون کیسہ جات و لفافہ جات مذکورہ نمبر ۵ و نمبر ۷۔

(۱)...... یہ رقم حاجی فلاں بابت صفائی مواعظ ہے، ان کو اطلاع دے کر حسبِ اجازت ان کے عمل کیا جائے، مگر مواعظ کا کام فوراً بند کر کے اس کو بھی ان کو مع اس حالت کے جس حالت پر کام بند ہوا ہے اطلاع کر دی جائے اور بند ہونے تک وقت کا حساب کر کے اس میں سے اجرت دے دی جائے۔

تنبیہ ضروری

مذکورہ رقم کی تھیلی میں ایک لفافہ بھی ہے، اس کی یہ یادداشت ہے، یہ بھی رقم بالا کا جزو ہے جس کی مقدار (انتاروپیہ) ہے، یہ جدا اس لیے رکھی ہے کہ میں نے یہ رقم ان کی اذن دلالۃً کی بناء پر قرض لے لی تھی، پھر جلد ہی اس میں رکھ دی، مگر اس کے ضمان سے براءت نہیں ہوئی، اس لیے اگر یہ قبل ان کے پاس پہنچنے کے یا قبل ان کے اذن آنے کے ضائع ہو جائیں میرے ترکہ سے ادا کی جائیں اور اگر ترکہ ورثہ میں تقسیم ہو چکا ہو تو نسبت سے حصہ رسد سب سے واپس ادا کی جائے کہ دین مقدم ہے میراث پر۔

(۲)...... یہ رقم فلاں خاں صاحب کی ہے، روشنی صحن مدرسہ و غسل خانہ وغیرہ کے لیے ان سے یا ان کے ورثہ سے اطلاع کر کے حسب اجازت عمل کیا جائے۔

(۳)...... یہ رقم مسجد فلاں کی ہے جو مجھ کو فلاں صاحب نے سپرد کی ہے، ان کو واپس کر دی جائے۔

(۴)......صاحبِ رقم کا یہ پتہ ہے انہوں نے اس رقم کا نہ خود مصرف لکھا نہ میرے خط کا جواب دیا، ان سے پھر پوچھا جائے، اگر دو ماہ تک جواب نہ آئے تو اعلاء السنن کے کسی حصہ کی اشاعت یا تصنیف جس میں حاجت ہو صرف کیا جائے۔

(۵)...... یہ رقم فلاں خان صاحب کی زکوۃ کی ہے، ان کو اطلاع دی جائے کہ اشرف کی رائے

تھی کہ یہ رقم نصب اس کے دونوں اہلیہ کے ہاتھ سے مساکین کو تقسیم کرائی جائے، آگے خان صاحب جو فرمائیں۔

(۶)......اس کا مضمون بھی مثل نمبر ۵ کے ہے، مگر اس میں ایک حصہ صدقہ نافلہ کا بھی ہے، صرف حصہ نافلہ کے متعلق میری رائے طلبہ وذاکرین کو نقد تقسیم کرنے کی لکھ دی جائے۔

(۷)......اس تھیلی میں حاجی فلاں صاحب کی دی ہوئی رقم بابت فدیہ نماز فلاں خاں صاحب کی ہے، مساکین قصبہ کے لیے ان سے مکرر پوچھا جائے۔

(۸)...... یہ رقم فلاں صاحب کی ہے بنابریں اذن دلالۃ کے مولوی فلاں صاحب کو قرض دے دی ہے، ان سے وصول کر کے جس طرح فلاں صاحب کہیں صرف کیا جائے اور اگر وصول نہ ہو تو میرے ترکہ سے صاحبِ رقم کو دے دی جائے، پھر جب وصول ہو میرے ترکہ میں شامل کر دی جائے اور فلاں صاحب مجھ کو معاف کریں، معافی کو قبول کر لیا جائے پھر وصول کے وقت وہ میرا ترکہ ہوگا۔

تنبیہ

نیز اہلِ امانات کو یہ بھی اطلاع دی جائے کہ امانت بھیجنے کی مدت تحقیقاً یا تخمیناً یاد کر کے استفتاء کر لیں کہ بقایا رقم کی وجہ سے اس میں زکوٰۃ تو واجب نہیں ہوئی۔

نوٹ

اور مدت ختم کی رقم کو امانت واجبۃ الرد میں اس لیے نہیں لکھا کہ ظاہراً مالکوں کو اس رقم کا ختم ہی میں خرچ کرنا مقصود ہے پس دلالۃً اجارہ باقی ہے، لیکن اگر علماء اس کے خلاف فتویٰ دیں تو کام بند کر کے میرے ربع وصیت (مذکورہ نمبر۴) سے کارڈ خرید کر سب کو اطلاع دے دیں، اگر فیس منی آرڈر کی ضرورت ہو انہی کی رقم سے ادا کریں، سب کے پورے پتے حافظ فلاں کے پاس لکھے ہیں اور جو رقم میری معرفت میں نہ ہو اس سے خارج ہے اسی طرح اگر اہلِ رقم کی جانب سے کوئی تغیر پیش آئے وہ بھی اس سے خارج ہے۔ فقط

تنبیہ

ان سب وصایا اور ضمیمہ میں اول سے آخر تک اگر مجھ سے کچھ ابہام یا نقص یا خلط ہو گیا ہو یا کسی جزء میں شبہ یا تردد ہو جائے، بہر حال میں احکام شرعیہ کی تحقیق کر کے ان پر عمل کیا جائے، بلکہ اس سے تمام مضمون کو ہر ناظر وصیت جو کہ عالم نہ ہو کسی عالم سے سمجھ کر پڑھ لے تو اپنی وصیت لکھنے میں

اور دوسروں کی وصیت کی با قاعدہ جاری کرنے میں بہت اعانت ہو۔
(اشرف السوانح:ص ۱۲۷رج ۳)

میرے اکابر نور اللہ مراقدہم کے وصیت نامے تو اکثر مطبوع اور سوانحوں میں درج ہیں، اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی وصیت مستقل میں نے ہی کئی ہزار شائع کر کے تقسیم کیے ہیں اور اعلیٰ حضرت قطب ربانی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا وصیت نامہ میرے والد صاحب قدس سرہٗ نے کئی ہزار پمفلٹ کی صورت میں تقسیم فرمایا تھا، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا وصیت نامہ مکمل تو وصل الحبیب میں شائع ہوا ہے، اس کا ابتدائی حصہ مختصر تذکرۃ الرشید میں بھی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

''حامداً ومصلیاً یہ وصیت عام ہے، سب دیکھیں اور سنادیں اور عمل کریں، اپنی اولاد اور زوجہ اور سب دوستوں کو بتاکید وصیت کرتا ہوں کہ اتباع سنت کو بہت ہی ضروری جان کر شرع کے موافق عمل کریں، تھوڑی مخالفت کو بہت سخت دشمن اپنا جانیں اور رسوم دنیا کو سرسری جان کر نہایت خرابی کی بات ہے اور لذت کھانے اور کپڑے کی قید نہایت خرابی ڈالنے والی دین اور دنیا کی ہے، اس سے بہت اجتناب کریں، اپنے مقدور سے بڑھ کر کام کرنا مآل کار ذلیل ہونا ہے، اس کی رسوائی دین و دنیا میں اُٹھانی ہوتی ہے، بدمزاج و کج خلقی سخت نامرضی حق تعالیٰ کی ہے، دنیا میں ایسا آدمی خوار رہتا ہے اور آخرت میں نہایت ذلت اُٹھاتا ہے، نرمی سب کے ساتھ لازم ہے اور بُرا کام قلیل بھی بُرا ہے اور اطاعت و اچھا کام اگرچہ تھوڑا ہو بہت بڑا رفیق ہے۔ تکلفات شادی و غمی کے بدعت سے خالی نہیں ہے، اس کو سرسری نہ جانے، طعن و تشنیع خلق و برادری کے سبب سے اپنے مقدور سے زیادہ کام کرنا یا خلاف شرع یا بدعت کو کرنا عقل کی بات نہیں، دنیا و دین میں اس کا خمیازہ بُرا ہے، اسراف کی مذمت اور بُرائی شریعت میں سخت آئی ہے کہ شیطان کا بھائی اس کو قرآن میں فرمایا ہے، اگر میرا انتقال ہو جائے تو حسبِ مقدور ثواب پہنچادیں، اندازے سے ہرگز نہ کرے، نہ کوئی تکلف غیر مشرع کریں جو کچھ ہو موافق سنت کے ہو، باہم اتفاق سلوک سے رہیں، میرے ذمہ کسی کا ایک پیسہ تک قرض نہیں، اس کا کچھ فکر نہ کریں۔'' الخ

مولانا یحییٰ صاحب کے واقعات

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ علمی ذکاوت تو ان کی ان تقریروں سے ظاہر ہے جو حدیث پاک کی لکھی ہیں اور اب دنیا میں شائع بھی ہو گئیں اور علماء بھی ان کی تحریر کو اور طویل مضمون کو مختصر عبارت میں لکھنے کی داد دیا کرتے ہیں، وہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ گنگوہ میں دورۂ حدیث سے

فراغت کے بعد میں حضرت اعلیٰ کی خدمت میں قیام کی نیت سے پڑ گیا تھا، حضرت قدس سرہٗ نے رنگون سے آیا ہوا ایک استفتاء جو سود کے متعلق تھا اور کمپنیوں کے حصص کے متعلق متعدد سوالات تھے، میں نے اس کا بہت ہی مفصل جواب لکھا تھا، حضرت اقدس سرہٗ نے میرا جواب سن کر بہت ہی اظہار مسرت فرمایا تھا اور اسی دن اپنی مہر شریف میرے حوالے کر دی تھی کہ فتاویٰ کے جواب لکھا کرو اور کوئی بات مجھ سے دریافت کرنی ہو تو دریافت کر لیا کرو، فرماتے تھے کہ ابتداء میں تو عام اور روزمرہ کے مسائل کے علاوہ کوئی خاص مسئلہ ہوتا تو میں جواب اہتمام سے سنایا کرتا تھا، اس کے بعد اجمالی جواب حضرت سے عرض کر کے تفصیلی لکھ دیا کرتا تھا، تذکرۃ الخلیل میں بھی متعدد واقعات لکھے ہیں، اس میں بھی لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ مولانا کی علمی استعداد اور علوم نقلیہ کے ساتھ فنون عقلیہ کی مہارت تامہ مسلم اور مشہور ہونے کے ساتھ علماء عصر میں حیرت کی نظر سے دیکھی گئی، مگر اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی اکثر کتابیں آپ نے خود دیکھی ہیں اور استاذ سے بہت ہی کم پڑھی ہیں، یوں فرمایا کرتے تھے کہ سارے ادب میں میں نے استاذ سے مقامات کے صرف نو (۹) مقامے پڑھے ہیں، وہ اس طرح سے کہ جب استاذ فرما دیا کرتے تھے کہ اس لفظ کا ترجمہ مجھے معلوم نہیں، لغت میں دیکھ لو، یہ واقعات آپ بیتی میں بھی تفصیل سے گزر چکے ہیں اور طبعی ذکاوت کے قصے تو خاندان میں بہت مشہور ہیں، میں نے خود والد صاحب سے بھی سنا ہے کہ وہ اپنی والدہ کی روایات سے نقل کیا کرتے تھے کہ دادی صاحبہ کا دودھ کم تھا اس لیے دایہ کا دودھ پلایا جاتا تھا، مگر وہ جب تک نہا کر کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر دودھ نہیں پلاتی تو دودھ نہیں پیا کرتا تھا اور دودھ پینے کے زمانہ میں پاؤ پارہ قرآن کا حفظ کر لینا اور سات برس کی عمر میں پورا قرآن حفظ اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی تھی، یہ قصے تو پہلے آپ بیتی میں گزر چکے ہیں، وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میرے لیے دہلی کے اطباء نے بھینس کے پائے خاص طور سے کھانے کہ تاکید کر رکھی تھی کہ تیرا حس بہت بڑھا ہوا ہے، چنانچہ بہت دنوں تک دہلی کے بھٹیارے کے یہاں سے بھینس کے پائے کھلائے گئے۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۱۴

اکابر کے تصرفات

اکابر کے تصرفات کے قصے بہت ہی مشہور ہیں اور حیرت انگیز ہیں، مگر اس نوع کو نہ تو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا اور نہ عام طور سے ان کے تذکرہ کا رواج تھا، واقعات تو میرے علم میں بھی بہت ہیں، مگر چونکہ اکابر کی طرف سے بھی اس نوع کے واقعات کا اظہار پسند نہیں تھا اور خود اپنی طبیعت کو بھی اس سے مناسبت نہیں ہوئی، اس لیے اس طرف طبیعت چلتی نہیں، تاہم نمونۂ چند واقعات اکابر کے بھی جو نظر سے گزرے یا خود بھی دیکھے لکھوا رہا ہوں۔

شاہ عبدالقادر صاحب کا ایک واقعہ

اورِ ح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ کے زمانہ میں ایک آدمی پر جن آیا، اس کے قرابت دار اس کو شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ غلام علی صاحب اور دوسرے بزرگوں کے پاس لے گئے اور سب نے جھاڑ پھونک، تعویز گنڈے کیے، مگر کچھ افاقہ نہ ہوا، اتفاق سے شاہ عبدالقادر صاحب اس وقت دہلی میں تشریف نہ رکھتے تھے، جب شاہ صاحب تشریف لائے تو ان کی طرف بھی رجوع کیا، شاہ صاحب نے جھاڑ دیا اور وہ اسی روز اچھا ہو گیا، جب شاہ عبدالعزیز صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے شاہ صاحب سے پوچھا، میاں عبد القادر! تم نے کون سا عمل کیا تھا، انہوں نے فرمایا حضرت! میں نے تو صرف الحمد پڑھ دی تھی، اس پر شاہ صاحب نے دریافت فرمایا کہ کسی خاص ترکیب سے، انہوں نے فرمایا کہ ترکیب کوئی نہیں، فقط یا جبار کی شان میں پڑھ دی تھی، ناقل قصہ نے امیر شاہ خاں صاحب راوی سے اس کا مطلب پوچھا، انہوں نے کہا کہ مطلب تو میں بھی نہیں سمجھتا، جو الفاظ سنے تھے نقل کر دیئے، اس پر حکیم الامۃ حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں، احقر کے ذہن میں جو بے تکلف مطلب آیا اس کو بہ سبیل احتمال ذکر کرتا ہوں کہ کاملین میں ایک درجہ ہے ابوالوقت، کہ وہ جس وقت تجلی کو چاہیں اپنے اُوپر وارد کر لیں، کذا سمعت مرشدی۔ (سید الطائفہ الحاج امداد اللہ قدس سرہٗ) پس عجب نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے اس وقت اپنے پر جبار کی تجلی کو وارد کیا ہو اور اس کی مظہریت کی حیثیت سے اس کی توجہ سے دفع فرما دیا ہو۔ (اورِ ح ثلاثہ: ص ۵۵)

ایک مجذوب دہلی کی جامع مسجد کے پیچھے دُکان میں رہا کرتے تھے اور اس زمانہ کے لوگ اس

کے نہایت معتقد تھے، وہ مجذوب کبھی کبھی جامع مسجد کی ان سیڑھیوں پر آبیٹھتا تھا جو دریبہ کی جانب ہیں اور اس کی شکل اس قدر ہیبت ناک تھی کہ اکثر لوگ اس کے خوف سے اس طرف کا راستہ چھوڑ دیتے تھے اور وہ اپنی کوٹھری میں بھی اور سیڑھیوں پر بھی شیر کی طرح غرایا کرتا تھا، رات کے وقت اس کی کوٹھری میں کوئی کبھی گیا ہی نہیں، اگر کسی کو کچھ عرض معروض ہوتی تو بہت ڈرتے ڈرتے سیڑھیوں ہی پر کچھ کہہ لیتا تھا، وہ مجذوب لوگوں کو مارتا بھی تھا اور اینٹیں بھی پھینکتا تھا۔

شاہ اسماعیل شہید کا واقعہ

مولانا اسماعیل شہید نے ایک روز اس کی دُکان میں جانے کا ارادہ کیا تو احباب نے بہت منع کیا، مگر انہوں نے کسی کی نہ سنی اور دُکان میں پہنچ گئے، مجذوب مولانا کو دیکھ کر اس قدر غرایا کہ کبھی اس قدر نہ غرایا تھا، مخالفین تو بہت خوش ہوئے کہ ان پر مجذوب کی مار پڑے گی اور یا تو مر جائیں گے یا دیوانہ ہو جائیں گے یا اور کوئی بلا نازل ہوگی، مگر کچھ نہ ہوا بلکہ وہ مجذوب تھوڑی دیر تو غرایا اس کے بعد اس کا غرانا موقوف ہو گیا اور دونوں کی باتوں کی آواز آنے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ دو گھنٹے کے بعد مولانا اس کو نکال لائے اور باہر لا کر نماز پڑھوا دی، اس کے بعد سے یہ حالت ہوئی کہ برابر نماز پڑھنے لگا اور غرانا وغیرہ سب موقوف ہو گیا، مگر کسی قدر دیوانگی باقی رہی۔ (اورِح ثلاثہ: ص ۶۲)

حضرت شاہ اسماعیل صاحب قدس سرہٗ کے مواعظ کے واقعات تو بہت کثرت سے ہیں اور ان مواعظ کی تاثیر کی وجہ سے غنڈے ان کے بہت ہی مخالف ہو گئے تھے، حتیٰ کہ ہر وقت لوگ ان کے قتل کے درپے رہتے تھے، اس لیے خاندان کے لوگ حضرت شاہ صاحب کی بڑی حفاظت کرتے تھے، ایک مرتبہ عشاء کی نماز کے بعد جامع مسجد دہلی سے اس دروازے کو چل دیئے جو قلعہ کی طرف کھلتا ہے، مولانا محمد یعقوب صاحب نے لپک کر ان کو پکڑا اور پوچھا کہ کہاں جاتے ہو، میں اس وقت میں تنہا نہ جانے دوں گا، اگر تم کہیں جاؤں گے تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا، مولانا نے فرمایا کہ میں خاص ضرورت سے جا رہا ہوں، تم مجھے جانے دو اور میرے ساتھ نہ آؤ، میں نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانے اور تنہا چل دیئے، میں بھی ذرا فاصلے سے ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

خانم کے بازار میں ایک بڑی مالدار اور مشہور رنڈی کا مکان تھا اور اس کا نام موتی تھا، مولانا اس مکان پر پہنچے اور آواز دی، تھوڑی دیر بعد مکان سے ایک لڑکی نکلی اور پوچھا کہ تم کون ہو اور کیا کام ہے انہوں نے کہا کہ میں فقیر ہوں، وہ لونڈی یہ سن کر چلی گئی اور جا کر کہہ دیا کہ ایک فقیر کھڑا ہے، رنڈی نے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ جا کر دے دے، وہ لڑکی پیسے لے کر آئی اور مولانا کو دینا چاہا، مولانا نے کہا کہ میں ایک صدا کہا کرتا ہوں اور بغیر صدا کہے لینا میری عادت نہیں، تم اپنی بی بی سے

کہو کہ میری صدا سن لے، اس نے جا کر کہہ دیا، رنڈی نے کہا کہ اچھا بُلا لے، وہ بُلا کر لے گئی مولانا جا کر صحن میں رومال بچھا کر بیٹھ گئے اور آپ نے سورۂ والتین ''ثم رددنہ اسفل سافلین'' تک تلاوت کی، میں بھی وہاں پہنچ گیا اور جا کر مولانا کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور مولانا نے اس قدر بلیغ اور مؤثر تقریر فرمائی کہ گویا جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرا دیا، اس رنڈی کے ہاں بہت سی اور رنڈیاں بھی تھیں اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی بہت تھے، ان پر اس کا یہ اثر ہوا کہ سب لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے اور کہرام مچ گیا اور انہوں نے ڈھولک، ستار وغیرہ توڑنے شروع کر دیئے اور مولوی اور اس کے علاوہ کئی رنڈیاں تائب ہو گئیں، یہ قصہ مفصلاً اکابر کی تواضع میں گزر چکا ہے، یہاں تو مولانا کے اس تصرف کی وجہ سے دوبارہ مختصر لکھوا دیا۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۹)

حضرت حاجی صاحب کا واقعہ

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے تصرفات بھی بہت مشہور و معروف ہیں، ایک شخص نے حضرت سے بیعت کی درخواست کی اور یہ شرائط پیش کیں کہ ایک تو یہ نماز نہیں پڑھوں گا، دوسرے یہ کہ ناچ دیکھنا نہیں چھوڑوں گا، حضرت نے دونوں شرط کے ساتھ بیعت میں قبول کر لیا، مگر حضرت کو خدا تعالیٰ کی ذات پر ایسا بھروسہ تھا کہ کیسا ہی کوئی آیا اس کو لے لیا، اب برکت سنیے۔

بیعت ہونے کے بعد جب نماز کا وقت آیا، اس شخص کے بدن میں خارش شروع ہوئی اور ایسی ہوئی کہ پریشان ہو گیا اور اتفاق سے جو اعضاء وضو میں دُھلتے ہیں ان میں زیادہ خارش تھی، اس شخص نے پانی سے وہ اعضاء دھوئے صرف مسح رہ گیا، پھر خیال آیا کہ اور اعضاء تو دھل گئے صرف مسح رہ گیا لاؤ مسح بھی کر لیں وضو ہی ہو جائے گا، چنانچہ مسح بھی کر لیا، جس سے نصف خارش جاتی رہی، پھر خیال آیا کہ وضو تو ہو ہی گیا لاؤ نماز بھی پڑھ لیں، بس نماز کی نیت باندھنا تھا کہ دفعۃً تمام خارش بند ہو گئی، اس نماز کے بعد دوسری نماز کا وقت آیا پھر وہی خارش پھر وضو کر کے نماز شروع کی تو خارش بند، اب یہی سلسلہ جاری ہو گیا، وہ شخص اب سمجھا اور کہنے لگا واہ حضرت یہ تو مجھ پر اچھا ہی سپاہی مسلط کر دیا، غرض پکا نمازی بن گیا، اب ہندوستان میں آیا خیال اور نیت یہ تھی کہ ناچ دیکھنا نہ چھوڑوں گا، رہا نماز کا معاملہ، نماز کے وقت ناچ میں سے اُٹھ آیا کروں گا، اول موقع پر ناچ میں جانے کا ارادہ کیا، دل میں خیال آیا کہ بڑی شرم کی بات ہے، ناچ دیکھ کر پھر یہی منہ لے کر مسجد میں جاؤں بڑی بے غیرتی کی بات ہے، بس ناچ دیکھنا بھی چھوٹ گیا۔

(افاضات: ۷/۲ ص ۳۱۵)

حضرت گنگوہی کے واقعات

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا ایک واقعہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا کہ جب گنگوہ میں حاضر ہوا تو حضرت کی سہ دری میں ایک کورا بدھنا رکھا ہوا تھا، میں نے اس کو اُٹھا کر کنویں سے پانی کھینچا اور اس میں بھر کر پانی پیا تو پانی کڑوا پایا، ظہر کی نماز کے وقت حضرت سے ملا اور یہ قصہ بھی بیان کیا، آپ نے فرمایا کہ کنویں کا پانی کڑوا نہیں میٹھا ہے، میں نے دو کڑوا بدھنا پیش کیا، حضرت نے بھی چکھا تو بدستور تلخ تھا، آپ نے فرمایا کہ اچھا اس کو رکھ دو نماز ظہر کے وقت حضرت نے سب نمازیوں سے فرمایا کہ کلمہ طیبہ جس سے جس قدر ممکن ہو سکے پڑھو اور حضرت نے بھی پڑھنا شروع فرما دیا، بعد میں حضرت نے دعاء کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور نہایت خشوع خضوع کے ساتھ دعاء مانگ کر ہاتھ منہ پر پھیر لیے اور اس کے بعد بدھنا اُٹھا کر پانی پیا تو شیریں تھا، اس وقت میں جتنے نمازی تھے سب نے چکھا تو کسی قسم کی تلخی نہ تھی، بعد میں حضرت نے فرمایا کہ اس بدھنے کی مٹی اس قبر کی ہے جس پر عذاب ہو رہا تھا، الحمدللہ کلمہ کی برکت سے وہ عذاب رفع ہو گیا۔

(ارواح: ص ۲۷۱)

حضرت امام ربانی قطب عالم گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کے ۱۲۹۹ھ والے حج میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ جس جہاز کے ارادہ سے چلے تھے وہ بمبئی پہنچنے سے ایک دن پہلے روانہ ہو گیا تھا، دوسرا جہاز ریڈی کھڑا تھا، مگر اس کے روانہ ہونے میں دیر تھی، اس لیے ہم کو بمبئی میں گیارہ روز اور ٹھہرنا پڑا، وہ تو ۲۰ ذیقعدہ کو چلا نہ ۲۱ کو نہ ۲۲ کو اب لوگ گھبرا گئے اور سمجھے کہ اب حج نہیں مل سکتا کیونکہ دن تھوڑے باقی ہیں اور گیارہ دن کا قرنطینہ بھی کرنا ہے، لوگوں نے تو اُترنا شروع کیا تو آپ نے ہم لوگوں سے کہہ دیا کہ عزم حج فسخ نہ کریں، ہمیں حج ضرور ملے گا، ہم نے لوگوں سے کہہ دیا کہ اس پر تو کچھ لوگ رہ گئے اور کچھ پھر بھی اُتر گئے۔

حافظ...... بھی اس جہاز میں سوار تھے، انہوں نے بھی جہاز سے اُترنے کا ارادہ کیا تھا، مولانا کو چونکہ ان سے حسنِ ظن تھا اس لیے مولانا نے مجھ سے اور ایک صاحب سے فرمایا کہ حافظ کو سمجھاؤ کہ ہرگز نہ اُتاریں، ہمیں حج ضرور ملے گا، ہم نے انہیں سمجھایا اس پر وہ خود مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا نے اپنی عادت کے خلاف خود ان کو سمجھایا اور انہوں نے اقرار کر لیا اب میں نہ اُتروں گا، مگر باوجود اس کے بھی وہ اُتر گئے، مولانا کو جب ان کا اُترنا معلوم ہوا تو آپ کو بہت ملال ہوا اور آپ نے فرمایا کہ ناحق اُتر گئے، بس جی ان کی قسمت ہی میں حج نہیں اس کے بعد حافظ ہر سال حج کا ارادہ کرتے تھے مگر کوئی نہ کوئی مانع پیش آ جاتا تھا، مگر تا انتقال ان کو حج میسر نہ ہوا۔

اللہ اللہ کر کے ہمارا جہاز ۲۳ ذیقعدہ کو عصر کے وقت چلا۔ جب عدن سے آگے پہنچا تو اس میں جس قدر ولایتی تھے سب تبرلے کر جہاز والوں پر چڑھ گئے اور کہا کہ اگر تم نے جہاز کا رخ کامران (قرنطینہ کی جگہ) کی طرف پھیرا تو ہم تمہیں مار ڈالیں گے۔ سیدھا جدہ لے چلو۔ جہاز والے ڈر گئے اور مجبوراً ان کو جہاز جدہ لے جانا پڑا۔ جب جہاز جدہ پہنچا تو ان کو معلوم ہوا کہ مسافروں کو اترنے کی اجازت نہ ہوگی اور جہاز کو قرنطینہ کے لیے کامران واپس کیا جائے۔ اس خبر سے حاجیوں کو سخت پریشانی ہوئی کہ اللہ اللہ کر کے تو ہم نے قرنطینہ کی قید سے نجات پائی تھی اب پھر وہیں جانا ہوگا۔

تھوڑی دیر میں ایک عرب صاحب تشریف لائے اور انہوں نے کہا کہ گودی کے افسر رشوت خور ہیں اور وہ لینے کے لیے یہ حجت کر رہے ہیں۔ تم جلدی کچھ چندہ کر دو میں انہیں دلا کر راضی کرلوں گا۔ جب یہ خبر مولانا تک پہنچی تو آپ نے فرمایا یہ شخص بالکل جھوٹا ہے کوئی اسے کچھ نہ دے۔ ہم کو کامران واپس ہونا نہیں پڑے گا اور ہم یہاں اتریں گے لیکن آج نہیں اتریں گے۔ کل اتریں گے، چنانچہ دوسرے روز یہ حکم ہوا کہ حاجیوں کو اتر جانا چاہیے۔ ان کا کوئی قصور نہیں، قصور جہاز والوں کا ہے اس لیے اس کی سزا میں جہاز کو دونا قرنطینہ کرنا ہوگا، اسی پر حاجی اتر گئے اور ہم آٹھ تاریخ کو مکہ پہنچ گئے۔ حاجی صاحب (سید الطائفہ) ہم کو شہر کے باہر کھڑے ہوئے ملے۔ سنا ہے کہ حاجی صاحب فرماتے تھے کہ اگر مولوی رشید احمد صاحب اس جہاز میں نہ ہوتے تو کسی کو حج نہ ملتا۔

(ارواح: ص ۲۸۳)

صوفی کریم حسین صاحب جو امام ربانی کے خاص مریدین میں بڑے عامل تھے یہ ایک بار اپنے وطن میں مقیم تھے نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد دنیاوی ایک کام میں ایسے مشغول ہوئے کہ ظہر کی اذان ہوگئی۔ مجبوراً کام چھوڑ کر انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور پھر اسی کام میں لگ گئے، یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت ہوا اور پھر مغرب کا وقت ہوا۔ یہ فرض نماز تو پڑھتے رہے مگر اوراد وظائف بھی چھوٹ گئے۔ دفعتہً قلب کسی بیرونی اثر سے متاثر ہوا۔ جو یہ چاہتا تھا کہ یہ کام چھوڑ و اوراد کی قضا کرو۔ صوفی کریم حسین جوں جوں اس خیال کو دفع کرتے اور اپنے دھندے میں لگنا چاہتے ووں ووں وہ بڑھتا اور زور کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ وہ اثر موسلا دھار بارش کی طرح قلب پر اس زور سے برسا کہ ان کے ہاتھ پاؤں بے قابو ہوگئے اور کام چھوٹ گیا، آخر عشاء کی نماز پڑھی اور کئی گھنٹے کامل ندامت وانابت الی اللہ کی لذت قلب کو حاصل ہوتی رہی۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۱۴۰ ج ۲)

مولوی محمد سہول صاحب (جو بعد میں دار العلوم کے مدرس بھی رہ چکے) جس زمانہ میں مدرسہ

شاہجہان پور کے مدرس تھے ایک دن عشاء سے قبل لیٹ گئے اور آنکھ لگ گئی، خواب دیکھا کہ گویا گنگوہ حاضر ہیں جماعت ہو رہی ہے اور حضرت نماز پڑھا رہے ہیں، یہ بھی شرکت جماعت کے لے وضو کرنے لگے مگر وضو پورا نہ ہو پایا تھا کہ سلام پھیر گیا اور یہ مع چند اور آدمیوں کے جماعت سے محروم رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر حضرت امام ربانی قدس سرہٗ مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر ان لوگوں کی طرف مخاطب ہوئے جو جماعت سے نماز پڑھ سکے اور غصہ کے ساتھ یوں ارشاد فرمایا، لوگ میری طرف منسوب ہو کر نماز سے اس قدر غافل رہتے ہیں۔ اس ارشاد پر مولوی محمد سہول صاحب اپنی غفلت پر نادم ہوئے اور فوراً آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو شب کے بارہ بج چکے تھے۔ اسی وقت اٹھ کر نماز پڑھی اور آیندہ کے لیے احتیاط کی۔

تذکرۃ الرشید میں حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ آپ کی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی پریشانی یا وساوس کی کثرت کیوں نہ ہو جونہی آپ کی صحبت میں بیٹھے اور قلب میں ایک خاص قسم کا سکینہ اور جمعیت حاصل ہوئی، جس سے سب کدورت رفع ہو گئیں اور قریب قریب آپ کے کل مریدوں میں عقائد کی درستی، دین کی پختگی خصوصاً ''حب فی اللّٰہ اور بغض فی اللّٰہ'' بدرجہ کمال مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب برکت آپ کی صحبت کی ہے اور ان کمالات کی شہادت میں بے شمار واقعات موجود و مشہور ہیں۔ احقر پر یوں تو ہر صحبت اور ہر مخاطبت میں کچھ نہ کچھ فیض و احسان فائض رہتا تھا لیکن حسب ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ''من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ'' وہ احسان زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ ایک علم ظاہری کے متعلق، دوسرا باطن کے متعلق۔

اوّل احسان: کا مختصر بیان یہ ہے کہ مسائل اختلافیہ میں اہلِ حق اور اہلِ بدعت کے متعلق باوجود صحت عقیدہ کے والحمد للہ کے ایک غلطی میں مبتلا رہا اور اس غلطی پر بہت سے خیالات اور بہت سے اعمال متفرع رہے۔ یعنی بعض اعمال رسمیہ مثل مجلس متعارف میلاد شریف و امثالہ جن کو محققین بعض مفاسد کی وجہ سے عوام کے لیے مطلقاً ممنوع بتاتے اور ان سے عوام الناس کے ساتھ خواص کو بھی روکتے ہیں۔ ان مفاسد کو تو میں ہمیشہ مذموم اور ان کے مباشر کو ہمیشہ ملوم سمجھتا تھا اور یہ صحت عقیدہ کی تھی اور عوام الناس کو ہمیشہ ان مفاسد پر متنبہ اور مطلع کرتا تھا۔ لیکن یہ بات میرے خیال میں جم رہی تھی کہ علت نہی کے وہ مفاسد ہیں اور جہاں علت نہ ہوگی وہاں معلول بھی نہ ہوگا۔ پس خواص جو کہ ان مفاسد سے مبرا ہیں ان کو روکنے کی ضرورت نہیں اور اسی طرح عوام کو بھی علی الاطلاق روکنے کی حاجت نہیں، بلکہ ان کو نفسِ اعمال کی اجازت دے کر ان کے ان مفاسد کی اصلاح کر دینا چاہیے بلکہ اس اجازت دینے میں یہ ترجیح اور مصلحت سمجھتا تھا کہ اس طریق سے تو عقیدہ کی بھی اصلاح ہو جائے گی، جس کا فساد مدار نہیں ہے اور بالکل منع کر دینے میں عوام مخالف

سمجھیں گے اور عقیدہ کی اصلاح بھی نہ ہوگی۔ ایک مدت اس حالت میں گزر گئی اور باوجود دائمی درس تدریس فقہ وحدیث وغیرہما کے کبھی ذہن کو اس کے خلاف انتقال والتفات نہیں ہوا۔

حضرت قدس سرہٗ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں کہ خود ہی غایت رأفت وشفقت سے مولوی منور علی صاحب دربھنگوی مرحوم سے اس امر میں میری نسبت تأسف ظاہر فرمایا اور اسی غلطی کے شعبوں میں سے ایک شعبہ یہ بھی واقع تھا۔ بعض درویشوں سے جن کی حالت کا انطباق شریعت پر تکلف سے خالی نہ تھا۔ میں یہ خیال خذ ماصفادع ما کدر بعض اذکار واشغال کی تلقین بھی حاصل کر لی تھی اور آمد رفت وصحبت کا بھی اتفاق ہوتا تھا اور لزوم مفاسد کی نسبت وہی خیال تھا کہ خواص کے عقائد خود درست ہوتے ہیں، وہاں مفسدہ لازم نہیں اور عوام کے حق و باطل پر تقریراً متنبہ کرتے رہنا، دفع مفسدہ کے لیے کافی ہے، سو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اس پر تأسف ظاہر فرمایا اور غایت کرم یہ قابل ملاحظہ ہے کہ جیسا حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غایت کرم وحیاء سے بالمشافہ کسی پر عتاب نہیں فرماتے تھے، اسی طرح حضرت قدس سرہٗ نے باوجود حاضری کرۃ بعد مرۃ کے بالمشافہ کبھی اس سے تعرض نہیں فرمایا اور اس سے زیادہ لطف وکرم یہ کہ اگر کبھی کسی نے اعتراض کیا تو میرے فعل کی تاویل اور اس کو محمل حسن پر محمول فرمایا۔ اسی غلطی کی ایک فرع یہ تھی کہ حضرت پیر ومرشد قبلہ وکعبہ حاجی صاحب نے ایک تقریر درباب ممانعت تنازع و اختلاف مسائل معہودہ میں اجمالاً ارشاد فرمائی اور مجھ کو اس کی تفصیل کا حکم دیا۔ چونکہ میرے ذہن میں وہی خیال جما ہوا تھا، اس لیے اس کی تفصیل بھی اسی کے موافق عنوان سے حیز تحریر میں لایا اور حضرت حاجی صاحب کے حضور میں اس کو سنایا۔ چونکہ حضرت کو بوجہ لزوم خلوت وقلت اختلاط مع العوام وبنا بر غلبہ حسن ظن عوام کی حالت وجہالت وضلالت پورا پورا التفات نہ تھا لامحالہ اس مفصل تقریر کو پسند فرمایا اور کہیں کہاں اس میں اصلاح اور کمی بیشی بھی فرمائی اور ہر چند کہ وہ عنوان میرا تھا۔ مگر چونکہ اصل معنون حضرت نے از خود ارشاد فرما کر قلمبند کرنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا حضرت نے اس تقریب کو اپنی ہی طرف سے لکھوایا اور خود اپنے دستخط ومہر سے مزین فرمایا اور اپنی ہی طرف سے اشاعت کی اجازت دی جو بعنوان فیصلہ ہفت مسئلہ شائع کردی گئی۔ جس کو بعض کم سمجھوں نے اپنی بدعات کا مؤید سمجھا۔ وانی لھم ذالک، کیونکہ ان مفاسد کا اس میں بھی صراحتًا رد ہے۔ صرف خوش عقیدہ اور خوش فہم لوگوں کو البتہ رخصت و وسعت اس میں مذکور ہے۔ اس کا مبنی وہی خیال مذکور ہے کہ عوام کے مفاسد کا خواص پر کیوں اثر پڑے۔ غرض حضرت قدس اللہ سرہٗ نے اس سب کے متعلق مولوی منور علی صاحب سے اجمالاً تو مجھ سے فوراً اپنی غلطی پر تنبیہ ہو گیا، لیکن زیادت بصیرت کے لیے میں نے اس بارے میں مکاتبت کی بھی ضرورت سمجھی۔ چنانچہ چند بار جانبین سے

تحریرات ہوئی، جوتذکرۃ الرشید حصہ اول میں شائع ہوچکی ہیں۔ بالجملہ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ کو بصیرت و تحقیق کے ساتھ اپنی غلطی پر بفضلہ تعالیٰ اطلاع ہوگئی اور اس پر اطلاع ہونے سے ایک باغ عظیم علم کا جو کہ مدت کا مغلق تھا، مفتوح ہوگیا اور جب میرے اس خیال کی اصلاح ہوگئی تو خلافِ شریعت درویشوں کی صحبت وتلقی سے بھی نجات ہوئی اور فیصلہ ہفت مسئلہ کے متعلق ایک ضمیمہ لکھ کر شائع کردیا گیا، جس سے اس کے متعلق افراط وتفریط کے سب اوہام کو رفع کردیا گیا۔

دوسرا احسان: متعلق باطن کے اس تفصیل میں چونکہ مخفیات کا اظہار بھی ہے اور وہ قضیہ بھی نہایت دردناک اور ناگوار بھی ہے۔ اس لیے محض اس اجمال پر اکتفاء کرتا ہوں کہ میری شامتِ اعمال سے مجھ پر ایک ایسی حالت شدید طاری ہوئی تھی کہ باوجود صحت بدنی کے زندگی سے مایوسی تھی، بلکہ موت کو ہزار ہا درجہ حیات پر ترجیح دیتا تھا اور اس کو اس سے زیادہ عنوان کے ساتھ تعبیر نہیں کرسکتا:

دو گونہ رنج و عذاب است جان مجنوں را
بلائے فرقت لیلےٰ و وصلت لیلےٰ

اس وقت حضرت قدس سرہٗ نے دعاء وتعلیم وہمت سے خاص توجہ فرمائی جس سے ہوش وحواس درست ہوئے اور جان میں جان آئی اور اس حالت کے طریان کے فوائد اور پھر اس کے زوال کے منافع بحمد اللہ محسوس ہوئے۔ ان دونوں احسانوں کو امید ہے کہ عمر بھر کبھی نہیں بھولوں گا اور حکم بھی یہی ہے۔ ''من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ'' (تذکرۃ الرشید: ص۱۴۴رج۲)

خود حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے بھی اپنے رسالہ ''یاد یاراں'' میں ان دونوں واقعوں کو تحریر فرمایا ہے۔

ایک مرتبہ آپ درس حدیث میں مشغول تھے کہ ایک شخص نہایت پریشان حال حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت للہ میری طرف توجہ فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا، بھائی میں تو مُلّا ہوں کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتو مجھ سے پوچھو۔ درویشوں کی باتیں درویش جانے۔ اس شخص نے کہا کہ حضرت میں زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ کیا آپ کو گوارا ہے کہ میں خودکشی کرلوں اور مر رہوں۔ آپ مسکرائے اور فرمایا، اچھا مجھے پڑھانے دو۔ سامنے دیوار سے لگ کر جا بیٹھو۔ اتنا فرما کر آپ نے درس شروع فرمادیا اور وہ شخص سامنے دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ پڑھاتے پڑھاتے دو تین مرتبہ آپ نے اس مبتلا کی جانب نظر فرمائی اور پھر تقریر میں طلبہ کی طرف مخاطب ہوگئے۔ سبق ختم نہ ہونے پایا تھا کہ وہ شخص ہنستا ہوا اٹھا اور اس درجہ مسرور ہوکر چلا کہ سلام کرنا بھی بھول گیا۔ جب وہ چلا گیا تو بعض طلبہ نے حضرت سے دریافت کیا حضرت یہ کون تھا اور کس مرض میں مبتلا تھا۔ آپ نے فرمایا

درویش ہے، قبض طاری تھا، الحمدللہ رفع ہوگیا۔ اتنے مسرور ہوئے کہ چلتے وقت سلام بھی نہ کیا۔
(تذکرۃ الرشید: ص ۱۴۸ رج ۲)

ایک بزرگ ذاکر۔ شاغل تھے۔ ان کو عادت پڑ گئی مغرب وعشاء کے مابین سو جانے کی۔ ہر چند اس کے ترک کی کوشش کرتے تھے مگر عشاء سے قبل نیند کا اتنا غلبہ ہوتا کہ بے اختیار سو جاتے اور آنکھ لگ جاتی۔ ان کو خیال ہوتا تھا کہ حدیث میں اس عادت کی مذمت بھی آئی ہے اور نیز عشاء کی نماز میں وقت مستحب کے ہاتھ سے جاتے رہنے یا کم سے کم کسل واضمحلال پیدا ہونے کا سبب ہے اس لیے ہمت ضرور کرتے تھے کہ نہ سوؤں مگر کچھ مجبوری کی سی حالت ہوگئی تھی کہ آنکھ لگ ہی جاتی تھی۔ آخر گنگوہ حاضر ہوئے، جس وقت خانقاہ میں پہنچے ہیں، مغرب کے نماز ہو چکی تھی اور حضرت دولت کدہ تشریف لے گئے تھے۔ چھپر کے نیچے چار پائی پر بیٹھ گئے اور عادت کے موافق جب نیند کا غلبہ ہوا تو راستہ کی جانب پشت کر کے وہیں پڑ کر سو گئے۔

خواب میں دیکھا کہ حضرت دولت خانہ سے تشریف لائے اور ان کی کمر میں لات مار کر غصہ کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ یہ کیا واہیات حرکت ہے۔ حدیث کے خلاف یہ کوئی وقت ہے سونے کا۔ دفعتہً آنکھ کھل گئی تو کروٹ بدل کر دیکھا کہ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ خیال ہوا کہ شاید حضرت تشریف لے آئے ہوں گے۔ خانقاہ میں گئے تو معلوم ہوا کہ حضرت ابھی دولت خانہ سے واپس تشریف نہیں لائے۔ خواب کو خیال سمجھ کر دوبارہ چار پائی پر آ لیٹے۔ ہر چند کوشش کی کہ سو رہوں مگر آنکھ ہی نہ لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت تشریف لائے تو یہ بھی حاضر خدمت ہوئے۔ اس دن کے بعد پھر کبھی مابین المغرب والعشاء ان کو نیند نہیں آئی، اگر لیٹ بھی گئے تو عشاء کا فکر ایسا دل پر سوار ہوا کہ بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہے اور جب تک نماز سے فراغت نہ ہو لی آنکھ ہی نہ لگتی۔
(تذکرۃ الرشید: ص ۱۱۸ رج ۲)

ایک شخص ذاکر شاغل حضرت کی خدمت میں رہتے تھے۔ ان کا کھانا قصبہ میں ایک شخص کے یہاں مقرر تھا، وہیں مسجد میں نماز پڑھانے جایا کرتے تھے۔ شیطان تو ہر مسلمان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اتفاق سے ان کو کسی عورت سے تعلق ہوگیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ ملاقات کا وقت مقرر ہوگیا۔ شیطانی حرکت کسی پر ظاہر کرنے کے قابل نہ تھی، اس لیے کسی کو خبر نہ ہوئی کہ چلتے چلاتے کام میں شیطان نے کس رخنہ اندازی کا انداز اختیار کیا۔ وعدہ کی شب میں عشاء کے بعد حضرت کے پاؤں دبا کر جب سمجھے کہ حضرت سو گئے، وہاں سے کھسکے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے خانقاہ سے باہر ہوئے۔ جس وقت باہر قدم نکالا تو مطلع بالکل صاف تھا۔ دو چار قدم چلے تھے کہ آسمان پر سیاہ بدلی نظر آئی۔ جوں جوں یہ آگے بڑھتے رہے ووں ووں بادل بڑھتا اور اوپر چڑھتا رہا یہاں

تک کہ جس وقت اس مکان کی دیوار کے نیچے پہنچے جہاں عورت حسب وعدہ کھڑی ہوئی تھی تو اس سے قبل کہ بات کریں، دفعتہً بادل اس زور سے گرجا کہ دونوں گھبرا گئے۔ ادھر وہ بھاگی کہ گھر والے جاگیں گے اور مجھے نہ پائیں گے تو کیا گل کھلے گا۔ ادھر یہ سراسیمہ دوڑے کہ حضرت کی چارپائی باہر بچھی ہوئی ہے، میں قریب ہی سوتا ہوں، حضرت آواز دیں گے اور میں نہ ہوں گا تو کیا نتیجہ ہوگا۔ غرض بے نیل و مرام دوڑتے ہانپتے خانقاہ میں پہنچے۔ جس وقت اندر قدم رکھا، مطلع بالکل صاف ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ حضرت کی طرف چلے، جھانک کر دیکھا تو حضرت امام ربانی چارپائی کی دونوں پٹیوں پر ہتھیلیاں ٹیکے گردن جھکائے اس طرح بیٹھے ہیں جیسے توجہ دینے کی حالت میں شیخ مستغرق ہو کر بیٹھتا ہے یہ چپکے چپکے ہی دبے پاؤں چل کر اپنی چارپائی تک پہنچے جو حضرت کی چارپائی سے کچھ ہی فاصلہ پر گولر کے نیچے بچھی ہوئی تھی۔ جس وقت پہنچ لیے، حضرت نے گردن اوپر اٹھائی اور لیٹ رہے۔ صبح ہوئی تو اشارۃً حضرت نے نصیحت فرمائی اور امتحان کے موقع پر نفس کو قابو میں رکھنے کے فضائل بیان کیے۔ یہ چند کلمات سن کر ندامت کا قلب پر اتنا غلبہ ہوا کہ جس حد تک معصیت ہوئی تھی اس کو یاد کر کے رویا کرتے اور گڑگڑا کر توبہ کیا کرتے تھے۔ چند ماہ میں حق تعالیٰ نے نسبت معتبر سے نوازا اور مجاز طریقت ہو کر اپنے وطن واپس ہوئے۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۱۴۸/۲)

حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے واقعات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے بھی تصرفات کے قصے تو بہت مشہور ہیں۔ خورجہ میں ایک شخص تھے محمد اسحاق۔ نہایت پابند صوم و صلوٰۃ اور ذاکر و شاغل تھے۔ یہ صاحب مولانا نانوتوی سے بیعت تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ دو تین روز مسجد میں نہیں آئے۔ میں سمجھا کہ شاید کچھ بیمار ہو گئے، اس لیے میں ان کی عیادت کے لیے گیا، جا کر دیکھا تو ایک کوٹھری میں چھپے بیٹھے تھے اور کانوں میں روئی ٹھونس رکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا حالت ہے، تم کئی روز سے نماز کے لیے نہیں آئے۔ انہوں نے کہا اچھا ہوں، مگر کوئی چار روز سے ایک سخت عذاب میں مبتلا ہوں، وہ یہ کہ کوئی گاڑی نکلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر چل رہی ہے اور جب بیلوں کو سانٹا مارا جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے لگتا ہے اور جب کتوں میں آپس میں لڑائی ہوتی ہے تو سمجھتا ہوں کہ وہ میرے کاٹتے ہیں۔ جب چکی چلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ گیہوں کے بدلے میں پس رہا ہوں۔ لڑکے بھاگتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر دوڑتے ہیں اس لیے سخت تکلیف میں ہوں اور باہر نہیں نکل سکتا۔ نہ چکی کی آواز سن سکتا ہوں۔ اس لیے میں چھپا ہوا بیٹھا ہوں اور میں نے کانوں

میں رو رو ڈھونس رکھا ہے۔ میں نے کہا کہ اپنی اس حالت کی مولانا نانوتوی صاحب کو اطلاع دو۔ انہوں نے کہا کہ تم لکھ دو۔ میں نے کہا تم ہی لکھ کر دو، میں اپنے خط میں بھیج دوں گا۔ انہوں نے اپنی حالت لکھ کر مجھے دے دی اور میں نے اپنے عریضے کے ساتھ مولانا کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ مولانا اس زمانہ میں دہلی میں تھے۔ مولانا نے جواب دیا کہ اس اس کا جواب تحریر سے نہیں ہوسکتا۔ تم ان سے کہہ دو کہ وہ میرے پاس چلے آئیں۔ چنانچہ یہ گئے۔ مولانا نے کچھ نہیں کیا صرف اوراد و اشغال کے اوقات بدل دیئے۔ یہ شخص دوسرے دن اچھے ہوگئے۔

(اروحِ ثلاثہ: ص ۲۲۰)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ اس واقعہ پر لکھتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ مولانا نے تصرف فرمایا اور اخفاء تصرف کے لیے اوراد و اشغال کے اوقات بدل دیئے۔ واللہ عالم باسرار عبادہ۔

مولانا منصور علی صاحب مرحوم مراد آبادی حضرت نانوتوی کے تلامذہ میں تھے۔ طبیعت کے بہت پختہ تھے۔ اس لیے جدھر طبیعت مائل ہوتی تھی پختگی اور انہماک کے ساتھ ادھر تھے۔ انہوں نے اپنا واقعہ خود ہی مجھ سے نقل فرمایا کہ مجھے ایک لڑکے سے عشق ہوگیا ہے اور اس قدر اس کی محبت نے طبیعت پر غلبہ پایا کہ رات دن اس کے تصور میں گزرنے لگے۔ میری عجیب حالت ہوگئی، تمام کاموں میں اختلال ہونے لگا حضرت کے فراست نے بھانپ لیا، لیکن سبحان اللہ تربیت و نگرانی اسے کہتے ہیں کہ بے تکلفی کے ساتھ حضرت نے میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ شروع کیا اور اسے اس قدر بڑھایا کہ جیسے دو یار آپس میں بے تکلف دل لگی کیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود ہی میں نے اس کی محبت کا ذکر چھیڑا۔ فرمایا ہاں بھئی وہ (لڑکا) تمہارے پاس کسی وقت آتا بھی ہے یا نہیں؟ میں شرم و حجاب سے چپ رہ گیا تو فرمایا کہ نہیں بھائی یہ حالات تو انسان پر ہی آتے ہیں۔ اس میں چھپانے کی کیا بات ہے، غرض اس طریق سے مجھ سے گفتگو کی کہ میری ہی زبان سے اس کی محبت کا اقرار کرالیا اور کوئی خفگی اور ناراضگی نہیں ظاہر کی۔ بلکہ دل جوئی فرمائی۔ اس مخصوص بے تکلفی کے آثار اب مجھ پر ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ میں ایک دن تنگ آ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ یہ میری محبت رگ و پے میں سرایت کر گئی، مجھے تمام امور سے بیکار کر دیا، کیا کروں اور کہاں جاؤں، آخر عاجز آ کر دوڑا ہوا حضرت کی خدمت میں پہنچا اور مؤدب عرض کیا کہ حضرت للہ میری اعانت فرمایئے۔ میں تنگ آ گیا ہوں اور عاجز ہو چکا ہوں۔ ایسی دعاء فرما دیجئے کہ اس لڑکے کا خیال تک میرے قلب سے محو ہو جائے، تو ہنس کر فرمایا کہ بس مولوی صاحب کیا تھک گئے، بس جوش ختم ہوگیا، میں نے عرض کیا کہ حضرت میں سارے کاموں سے بیکار ہوگیا۔ اب مجھ سے یہ برداشت

نہیں ہوسکتا۔ خدا کے لیے میری امداد فرمائیے۔ فرمایا اچھا بعد مغرب جب نماز سے فارغ ہوں تو آپ موجود ہوں۔ میں نماز پڑھ کر چھتہ مسجد میں بیٹھا رہا۔ جب حضرت صلوۃ الاوابین سے فارغ ہوئے تو آواز دی۔

مولوی صاحب! میں نے عرض کیا، حضرت حاضر ہوں، میں سامنے حاضر ہوا اور بیٹھ گیا۔ فرمایا ہاتھ لاؤ۔ میں نے ہاتھ بڑھایا، میرا ہاتھ اپنی ہتھیلی پر رکھ کر میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے اس طرح رگڑا جیسے بان بٹے جاتے ہیں۔

خدا کی قسم! میں نے بالکل عیاناً دیکھا کہ میں عرش کے نیچے ہوں اور ہر چہار طرف سے نور اور روشنی نے میرا احاطہ کرلیا، گویا میں دربارِ الٰہی میں حاضر ہوں۔ میں اس وقت لرزاں اور ترساں تھا کہ ساری عمر مجھ پر کپکپی اور یہ خوف طاری نہ ہوا تھا۔ میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور بالکل خودی سے گزر گیا اور حضرت برابر میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی پھیر رہے ہیں۔ جب ہتھیلی پھیرنا بند فرمایا تو یہ حالت بھی فرو ہوگئی۔ فرمایا جاؤ۔ میں اٹھ کر چلا آیا اور دو ایک دن بعد حضرت نے پوچھا۔ مولوی صاحب کیا حال ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس لڑکے کا تصور یا عشق تو کجا دل میں اس لڑکے کی گنجائش تک باقی نہیں۔ فرمایا اللہ کا شکر کرو۔ والحمد للہ علی ذلک۔

حضرت حکیم الامۃ تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اس پر طویل حاشیہ تحریر فرمایا ہے اور فرمایا کہ یہ اثر تھا تصرف کا مشابہ اس اثر کے جو حدیث مسلم شریف میں وارد ہے کہ حضرت ابی بن کعب (اختلاف قرآن کی طویل حدیث میں) فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میری حالت کو دیکھا تو میرے سینہ پر دستِ مبارک مارا تو پسینہ پسینہ ہو گیا اور گویا اللہ جل شانہٗ کو اپنی آنکھ سے دیکھنے لگا۔ امام نووی اس کی شرح میں قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک اس لیے مارا کہ ان کے دل میں جو مذموم وسوسہ پیدا ہو گیا ہے وہ جاتا رہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ مشائخ نے اس قسم کے تصرفات کو کمالات مقصودہ سے شمار نہیں کیا اور راز اس میں یہ ہے کہ تصرفات کا صدور قوت نفسانیہ سے ہوتا ہے اور جس طرح قوت جسمانیہ کمالات مقصودہ سے نہیں جیسے کشتی میں پچھاڑنا، اسی طرح قوتِ نفسانیہ بھی۔ اسی وجہ سے یہ قوت اہل باطل میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے مشائخ نے لکھا ہے کہ عارف کے لیے تصرف مناسب نہیں کہ وہ اس کے عدم کو اس کے وجود پر ترجیح دیتے ہیں اور وجہ اس کی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں شانِ عبدیت سے بُعد ہے اور یہ وجہ افعال جسمانیہ میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ اس میں اسباب مادیہ کی طرف احتیاج ظاہر ہے جو عین عبدیت ہے اور عبدیت اور تصرفاتِ نفسانیہ میں اسباب خفی ہیں۔ اس لیے احتیاج کی

شان اس میں خفی ہے۔ نیز افعال جسمانیہ کے صدور میں عوام معتقد نہیں ہوتے اور تصرفات میں معتقد ہوجاتے ہیں تو اس میں افتتان اور عجب کا خطرہ بھی ہے۔ واللہ اعلم

(ارواح ثلاثہ: ص ۲۴۵)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے واقعات

حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہٗ نے ایک دفعہ چھتہ کی مسجد میں فرمایا کہ بھائی آج تو ہم صبح کی نماز میں مرجاتے، بس کچھ ہی کسر رہ گئی۔ عرض کیا گیا، کیا حادثہ پیش آیا؟ فرمایا، آج صبح کی نماز میں سورہ مزمل پڑھ رہا تھا کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر سے گزرا کہ میں تحمل نہ کرسکا اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کرجائے مگر وہ دریا جیسا کہ ایک دم آیا ویسا ہی نکلا چلا گیا، اس لیے میں بچ گیا۔ نماز کے بعد جب میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا تو منکشف ہوا کہ حضرت مولانا نانوتوی اس ساعتوں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے، یہ ان ساعتوں کا اثر تھا۔ پھر فرمایا اللہ اکبر جس شخص کی توجہ کا یہ اثر ہے کہ علوم کا دریا دوسروں کے قلب پر موجیں مارنے لگے اور تحمل دشوار ہوجائے تو اس شخص کے قلب کی وسعت وقوت کا کیا حال ہوگا جس میں خود وہ علوم ہی سمائے ہوئے ہیں اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کیے ہوئے ہوگا۔

(ارواح ثلاثہ: ص ۲۶۵)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تصرفات بھی بہت مشہور ہیں۔ جس زمانہ میں ہیضہ کی وبا پھیلی ہے، اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد یقوب صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے ایک پیشین گوئی فرمائی تھی اور لوگوں سے فرمایا تھا کہ ایک وباء آنے والی ہے اگر ہر چیز میں سے صدقات کیے جائیں، اللہ سے امید ہے کہ یہ بلا ٹل جائے۔ بعض اہل دیوبند نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ میں کچھ ضرورت ہوگئی ہے اس کی خبر کسی نے مولانا کو کردی تو مولانا کو اس پر بہت غیظ آیا اور فرمایا کہ یعقوب اور یعقوب کی اولاد اور سارا دیوبند، یعقوب اور یعقوب کی اولاد اور سارا دیوبند، اس جملہ کو چند بار تکرار فرمایا۔ اس وقت حاجی محمد عابد صاحب حجرہ کے اندر بیٹھے ہوئے اس کلمہ کو سن رہے تھے اور وہ گھبرا کر باہر نکلے اور کہنے لگے یہ حضرت کیا کہہ رہے ہو۔ مولانا نے دریافت فرمایا کہ کیا کہا ہے۔ حاجی محمد عابد صاحب نے وہی جملہ دھرا دیا کہ یوں فرمارہے تھے۔ مولانا نے فرمایا، اب تو یوں ہی ہوگا۔ اس کے بعد اس کثرت سے وباء پھیلی کہ ۲۰، ۲۵، ۲۰، ۲۵ جنازوں کی نماز ایک دفعہ ہوتی تھی۔ بس دیوبند خالی ہی ہوگیا۔ جب یہ وباء ختم ہوئی تو آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ میں تو سمجھا تھا کہ میرا بھی وقت آگیا، کیا ابھی کچھ دیر ہے اس کے بعد اپنے

وطن نانوتہ پہنچے اور وہیں جا کر مبتلا مرض ہو کر واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
(اروحِ ثلاثہ: ص ۳۲۱)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے صاحبزادے جناب حکیم معین الدین صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہمارے نانوتہ میں جاڑ ابخار کی بہت کثرت ہوئی۔ سو جو شخص مولانا کی قبر سے مٹی لے جا کر باندھ لیتا اسے ہی آرام ہو جاتا۔ بس اس کثرت سے مٹی لے کر گئے کہ جب بھی قبر پر مٹی ڈلواؤں تب ہی ختم ہو جائے۔ کئی مرتبہ ڈال چکا، پریشان ہو کر ایک دفعہ میں نے مولانا کی قبر پر جا کر کہا (یہ صاحبزادہ بہت تیز مزاج تھے) آپ کی کرامت ہوئی اور ہماری مصیبت ہو گئی۔ یاد رکھو کہ اب کے کوئی اچھا ہوا تو ہم مٹی نہ ڈالیں گے۔ ایسے ہی پڑے رہئے گا۔ لوگ جوتا پہنے تمہارے اوپر ایسے ہی چلیں گے۔ بس اسی دن سے پھر کسی کو آرام نہ ہوا۔ جیسے شہرت آرام کی ہوئی تھی ویسے ہی یہ شہرت ہو گئی کہ اب آرام نہیں ہوتا۔ پھر لوگوں نے مٹی لے جانا بند کر دیا۔ (ارواح ثلاثہ: ص ۳۲۲)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مزار مبارک دہلی تا سہارنپور جو موٹروں کی آمد کی سڑک ہے اس پر نانوتہ کے موٹر اڈہ سے ایک فرلانگ سہارنپور کی طرف چل کر ایک باغ میں سڑک کی بائیں طرف لب سڑک ہی موجود ہے۔ وہاں حضرت کے خاندان کے دوسرے مزارات بھی ہیں۔ کچی قبریں کثرت سے ہیں۔ حضرت کی قبر مبارک کے سرہانے ایک بڑا سا پتھر بھی گڑا ہوا ہے۔

میرے دادا مولانا اسماعیل کا واقعہ

اپنے دادا صاحب محمد اسماعیل صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا بھی ایک واقعہ اعتماد کے بیان میں لکھوا چکا ہوں کہ نظام الدین کا گھنٹہ ایک دفعہ چلتے چلتے بند ہو گیا، گھڑی ساز کو دکھلایا گیا اس نے دیوار پر لگے لگے کھول کر دیکھا اور کہا کہ اس میں تو بڑا لمبا کام ہے، تین چار دن لگیں گے۔ دادا صاحب نے مسجد کے سب بچوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ ہر شخص بسم اللہ سمیت الحمد شریف سات دفعہ اول و آخر درود شریف سات سات دفعہ پڑھ کر دم کرے۔ سب نے دم کیا، گھنٹہ خود بخود چلنے لگا۔

حضرت سہارنپوری کے واقعات

حضرت اقدس سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے تصرفات کے قصے بھی بہت سے مشہور ہیں، لیکن آریہ سے مناظرہ کا واقعہ مشہور اور طبع شدہ ہے کہ ہر شخص کے علم میں ہے۔ مولانا میرٹھی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت اپنی قوت قلبیہ کے تصرف کو بہت کم کام میں لاتے اور خاص ضرورت کے وقت ہی

صرف فرماتے۔ سہارنپور میں اہل اسلام اور آریہ کا مناظرہ ہوا جو موضع ٹوپری سے منتقل ہوکر سہارنپور آیا تھا۔ حضرت شریک جلسہ تھے اور مسلمانوں کی طرف سے فریقین کی تقریروں کو قلمبند کرنے کے لیے مولوی کفایت اللہ صاحب اور مولوی احمد اللہ صاحب تجویز ہوئے تھے۔ مگر مولوی احمد اللہ تھک گئے تو صرف مولوی کفایت اللہ صاحب نے اس خدمت کو انجام دیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ مجلس مناظرہ میں آریوں کی طرف ایک جوان، خوبصورت گیروں کپڑے پہنے ہوئے سادھو تھا جو آرام دہ کرسی پر لیٹا رہتا اور جب مسلمانوں کے مقرر تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوتے تو وہ گردن جھکا کر بیٹھ جاتا تھا۔ مقررین اسلام کی تقریریں نہایت پراگندہ اور خراب ہورہی تھیں۔ حتیٰ کہ مولانا عبدالحق حقانی سے دورو تسلسل کی تقریر بھی نہ ہوسکی، تو میں نے صدر جلسہ مرزا عزیز بیگ کو ایک پرچہ لکھ کر دیا کہ مسلمانوں کی طرف سے جب مناظر تقریر کرنے کو کھڑا ہوتا ہے تو یہ جوگی اثر ڈالتا ہے اور متوجہ ہوکر بیٹھ جاتا ہے۔ لہٰذا مولانا خلیل احمد صاحب کو اس کی اطلاع دے دو۔ صدر جلسہ نے یہ پرچہ پڑھ کر حضرت کی طرف سرکا دیا اور حضرت نے پرچہ پڑھتے ہی گردن جھکالی کہ دونوں حق و باطل میں تصرف قل کی جنگ ہونے لگی۔ دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ سادھو بے قرار ہوکر آرام کرسی سے اٹھا اور میدان جلسہ سے باہر چلا گیا۔

پھر کیا تھا مسلمانوں کی وہ تقریریں ہوئیں گویا دریا کا بند کھل گیا حالانکہ اس مناظرہ میں بہت کچھ بے عنوانیاں ہوئی۔ مگر نتیجہ یہ نکلا کہ گیارہ آدمی مشرف با اسلام ہوئے اور اسی دن دوپہر کے کھانا کھانے میں حضرت نے فرمایا، اس کا تو مجھے یقین تھا اور ہے کہ اسلام غالب رہے گا ''الحق یعلو ولا یعلی ۔'' مگر حق تعالیٰ کی شان بے نیاز ہے اس کا خوف ہر وقت اور ہر بشر کو ہے۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے سالانہ جلسہ سے فارغ ہوکر باہر کے مہمان رخصت ہوئے۔ پنجاب جانے والی گاڑی پہلے آئی اور اس طرف کے مہمان گاڑی میں پہلے سوار ہوئے، گاڑی میں ایک سادھو بیٹھا تھا جو ہردوار سے آرہا تھا۔ اسٹیشن پر اژدہام دیکھ کر اس نے دریافت کیا کہ یہ بھیڑ کیسی ہے۔ حضرت کے خادم نے جو اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے جواب دیا کہ یہاں سہارنپور میں ایک بزرگ شیخ ہیں سب لوگ مختلف اطراف سے ان کی زیارت کو آئے تھے اور اب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہورہے ہیں وہ حضرت کے حالات پوچھنے لگا اور پھر خاموش ہوکر بیٹھ گیا وہ خادم کہتے تھے کہ کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ قلب پر ایک غیر مانوس اثر اور دباؤ پڑرہا ہے۔ جس کا ظاہری سبب کچھ معلوم نہیں ہوتا اور دل اندر سے گھبراتا اور اڑان ہوا جاتا ہے، حیران تھا کہ دن ہے رات نہیں، مجمع ہے تنہائی نہیں، ریل کا ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جنگل یا بیابان نہیں ہے، پھر یہ وحشت و پریشانی کیوں ہے طبیعت آپے سے نکلی جاتی ہے اور زبان گنگ اور سن ہوئی جاتی ہے، اسی پریشانی میں تھا کہ دفعتہً

حضرت کی شبیہ نظر آئی اور اس کا عکس دل پر پڑنا شروع ہوا اور اشارہ ہوا کہ پڑھو"**حسبی اللّٰہ و نعم الوکیل**" چنانچہ زبان گنگ تھی مگر دل نے اس کا ورد شروع کیا اور گھبراہٹ اور اضطراب کے بادل پھٹنا شروع ہو گئے۔ چند منٹ میں وہ کیفیت جاتی رہی اور قلب کو سکون نصیب ہوا۔ کان میں آواز آئی سادھو کہتا ہے تمہارے گرو واقعی بڑے کامل اور بہت زور والے ہیں۔ اس وقت میں سمجھا کہ یہ اثر ڈال رہا تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ بس تم میں اتنی ہی ہمت تھی ذرا کچھ کر کے دکھایا ہوتا وہ کھسیانہ ہو گیا اور منہ موڑ کر بیٹھ گیا، کہ پھر بات تک نہ کی۔ (تذکرۃ الخلیل: ص ۴۱۰)

اس ناکارہ کے سامنے بھی ایک واقعہ پیش آیا، حضرت قدس سرہٗ ایک ضرورت سے مظفر نگر کسی صاحب سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ یہ ناکارہ بھی ساتھ تھا۔ جب ان کے مکان پر پہنچے تو صاحب مکان وہاں موجود نہیں تھے، گھر میں گئے ہوئے تھے اور ایک پیر صاحب ایک آرام کرسی پر نہایت جبہ تلہ پہنے ہوئے آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ حضرت تشریف لے گئے اور بہت وورایک معمولی سی کرسی پر بیٹھ گئے۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ پیر صاحب نہایت گھبرا کر یوں کہتے ہوئے بڑا گرم ہے بڑا گرم ہے۔ یہ لفظ تو میں نے بھی کئی دفعہ زور سے سنے، تھوڑی دیر بعد وہ صاحب مکان سے آئے حضرت کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر بہت ہی ندامت اور قلق کا اظہار کیا کہ حضرت اطلاع نہیں ہوئی ورنہ اسٹیشن پر حاضر ہوتا، حضرت نے ارشاد فرمایا، اس کی کیا ضرورت تھی مجھے مکان تو معلوم تھا، حضرت اپنی ضرورت سے فارغ ہو کر واپس تشریف لانے لگے، انہوں نے قیام وطعام پر اصرار بھی کیا حضرت نے فرمایا کہ مشغولی تھی فلاں ضروری بات کی وجہ سے آنا ہوا تھا اور حضرت معذرت فرما کر اسٹیشن تشریف لے آئے اور واقعہ میرے سامنے کا تو ہے نہیں لیکن مشہور ہے جب مظاہر علوم کے جلسہ کے موقع پر بسا اوقات مہمان اندازہ سے زیادہ ہو جاتے تو حضرت قدس سرہٗ اپنی لنگی دے دیا کرتے کہ اسے کھانے پر ڈال دو۔

حضرت میرٹھی نور اللہ مرقدہٗ تذکرۃ الخلیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ سالانہ جلسہ میں ایک مرتبہ دیہاتی مہمان امید سے زیادہ آ گئے کہ کھانا تیار شدہ نصف کو بھی بمشکل کافی ہوتا، کارکنان مدرسہ گھبرا گئے کہ نہ تیار کرانے کا وقت کیونکہ جلسہ سے ایک بجے فراغ ہوا تھا، حافظ عبداللطیف صاحب نے یہ حالت حضرت سے عرض کی اور یہ بھی کہا کہ باورچی بھی تھک گئے، ان میں پکانے کو ہمت بالکل نہیں، حضرت نے فرمایا کہ کھانے کو چادروں سے ڈھانک دو میں آتا ہوں، چنانچہ حضرت نے تشریف لا کر کچھ پڑھا اور کھانے پر دم کر کے دعاء برکت فرمائی اور حکم دیا کہ کپڑا دیگ کے منہ سے نہ ہٹایا جائے اور نیچے سے کھانا نکال کر کھلانا شروع کر دیا جائے الحمدللہ کہ سب مہمان فارغ ہو گئے اور کھانا بہتر انچ رہا۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۲۷۴)

مولوی کفایت اللہ صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ میرٹھ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی سے بیعت تھے اور گنگوہ میں پرورش پائی تھی، مولانا جس زمانے میں مالٹا میں تھے ان پر اثناء ذکرو شغل میں ایک کیفیت پیدا ہوئی کہ خودکشی کی رغبت ہوئی تھی مگر کر نہ سکے اور اس وجہ سے ایسے ضیق میں مبتلا تھے کہ مرجانا بہتر سمجھتے تھے، انہوں نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور مدد چاہی حضرت نے حسبِ عادت انکسار کا جواب لکھا، جس میں یہ فقرے بھی تھے کہ ''حیرانم کہ بچہ دہقان، را بچہ کار سپرانند، صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا'' مجھے ایسے کام کے لیے اہل کیوں سمجھ لیا وغیرہ وغیرہ۔

آخر میرٹھ سے دیوبند گئے اور وہاں سے تھانہ بھون کا ٹکٹ لے کر سہارنپور پہنچے۔ اتفاق سے تھانہ بھون کی گاڑی نہ ملی مجبوراً مدرسہ مظاہر علوم میں آئے۔ بعد نمازِ ظہر حضرت سے ملے تو حضرت نے محبت کے ساتھ پاس بٹھایا اور جب حاضرین چلے گئے تو ان کی طرف خطاب فرمایا کہ تم نے کیا لکھا تھا، مجھے تعجب ہوا کہ جانتے بوجھتے تم ایسی بات لکھتے ہو، بھلا میں اس کا اہل کہاں۔ مولوی کفایت اللہ صاحب نے جرأت سے کام لیا اور کہا کہ حضرت اگر کوئی کہے کہ آپ اہل نہیں تو یہ آپ پر نہیں بلکہ حضرت گنگوہی پر اعتراض ہے کہ انہوں نے آپ کو خلیفہ کیوں بنایا آپ یقیناً اہل ہیں اور حضرت گنگوہی کے خلیفہ ہیں چونکہ میں نے اسی دروازے پر تربیت پائی ہے جہاں سے آپ کو سب کچھ ملا ہے۔ اس لیے میرا فرض تھا کہ اپنا دکھ درد عرض کردوں۔ اس پر حضرت نے سکوت فرمایا اور پھر پوچھا کہ اب کیا حالت ہے۔ عرض کیا کہ کچھ نہیں۔ بعد عشاء بکمال شفقت حال سنا اور ذکر دوازدہ تسبیح میں کچھ ترمیم فرما کر ارشاد فرمایا کہ حضرت گنگوہی کے یہاں ایک شخص کو یہی حالت پیش آئی تھی تو حضرت نے بھی یہی بتایا تھا جو میں نے بتایا ہے۔ یہ کہیں کہ کسی طرح اس مصیبت سے نجات مل جائے کہ درس تدریس میں لگیں چھوڑو اس ذکرو شغل کو جس میں جان سے عاجز ہو گیا اور حضرت اصرار فرمادیں کہ گھبراؤ مت، ذکرو شغل جاری رکھو اور کرتے رہو جو کر رہے ہو، یہاں تک کہ جب مکان تشریف لے جانے لگے تو فرمایا کہ کتب خانہ کے سامنے والے کمرے میں پچھلی رات کو بیٹھ کر اتنے زور سے بارہ تسبیح کرنا کہ میرے گھر تک آواز جائے اور پھر صبح کو نماز فجر کے بعد ارشاد ہوا کہ یہاں حجرے سے باہر مراقب ہو کر بیٹھ جاؤ۔

مولانا لکھتے ہیں کہ اس وقت کی کیفیت ذکر میں نہیں آسکتی کہ اندر بیٹھے کیا کر رہے تھے، پھر مجھے اپنا قلب زخمی نظر آتا ہے جیسے اس میں پیپ پڑ گئی ہے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ حضرت اس کو اپنے دستِ مبارک سے صاف فرما رہے ہیں۔ بعض دفعہ میں چونک پڑتا اور پھر مراقب ہو کر بیٹھ جاتا تھا، بعد اشراق حضرت حجرہ سے باہر تشریف لائے اور درس کے لیے تشریف لے چلے تو مجھے ساتھ

لیا اور بخاری شریف کا سبق ہونے لگا۔ سبق میں مجھے وہ کیفیت نظر آئی کہ پھر نصیب ہونا مشکل ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ حضرت تقریر کو طول دیں اور اس کے لیے حضرت کو چھیڑنے کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میں نے الٹے سیدھے سوالات شروع کر دیئے، پھر کیا تھا گویا سمندرُ میں تلاطم آ گیا۔ حضرت نے ایک ایک سوال کے کئی کئی جوابات دینا شروع کیے اور بعض دفعہ یہ بھی فرمایا کہ اس جواب کو کتاب میں تلاش مت کرنا یہ جواب کتابی نہیں بعض دفعہ میں اشکال پیش کرتا تو اس کا جواب دے کر فرماتے کہ یہاں ایک دوسرا اشکال اور ہے جس سے شراح نے تعرض نہیں کیا اور اس کے بعد وہ اشکال مع جواب خود ارشاد فرماتے۔ غرض وہ حال رہا اور طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا تو میں نے عرض کیا کہ میں نے ٹکٹ تھانہ بھون کا لیا تھا۔ فرمایا کہ اچھا جاؤ مگر واپسی میں کم از کم ایک دن یہاں کے واسطے رکھنا کہ ابھی خامی باقی ہے، چنانچہ واپسی میں بجائے ایک دن کے دو دن حضرت کے پاس قیام کیا اور جو خامی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی وہ محسوس ہونے لگی کہ جب نماز فجر کے بعد حجرہ کے باہر مراقب ہو کر بیٹھتا تو معلوم ہوتا کہ قلب میں کوئی چیز بھری جا رہی ہے جس سے دل میں سکون وقوت اور راحت معلوم ہوتی، غرض اول حاضری میں زخم قلب کو آلائش سے پاک صاف فرمایا اور دوسری میں زخموں کو مندمل کیا اور آئندہ مرہم پٹی سے مستغنی اور بے نیاز بنا دیا۔ اللہ جزائے خیر دے حضرت کو کہ میری ایسی دستگیری فرمائی کہ جس کا شکر یہ تمام عمر ادا نہیں ہو سکتا۔ فقط

(تذکرۃ الخلیل: ص۴۰۹)

مفتی محمود صاحب بیان فرماتے ہیں کہ میرے والد صاحب فرماتے تھے کہ یہ واقعہ براہ راست مولوی کفایت اللہ صاحب نے مجھ سے بھی بیان فرمایا تھا۔

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری کے واقعات

اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ کی کرامات اور تصرفات تو بہت مشہور ہیں۔ مگر جیسا پہلے بھی لکھوا چکا ہوں ان چیزوں کا اخفاء اکابر کے ہاں بہت رہتا تھا۔ ایک قصہ متعدد لوگوں سے سنا کہ حضرت کے باغ کے قریب جو نہر چلتی ہے اس کی سڑک پر حضرت حسبِ معمول صبح کے وقت چہل قدمی کے لیے تشریف لے جا رہے تھے ایک ضرورت سے دوسری طرف جانا پڑا۔ لنگی نہر پر ڈال کر کشتی کی طرح سے دوسری طرف تشریف لے گئے۔ مولانا میرٹھی تذکرۃ الخلیل میں حضرت رائپوری کے حالات میں لکھتے ہیں کہ حضرت کو حق تعالیٰ نے توکل کی نعمت نصیب فرمائی تھی اور اس لیے مدرسہ کا یہ بڑا کارخانہ نہ کسی محصل کا محتاج تھا نہ سفیر کا:

ہر کسے را بہر کارے ساختند

آپ کا ایک رنگ خاص تھا۔ جس میں آپ مستغرق تھے اور اس لیے بلا اسباب ظاہری آپ کے سارے کام منجانب اللہ انجام پایا کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کا قدم ابتلاء و امتحان کے وقت ڈگمگاتا نہ تھا۔ ایک مرتبہ مُلّا عبدالعزیز صاحب، کہ آپ کے قدیم مخلص خادم اور مدرسہ کے نگران اعظم تھے۔ آکر اطلاع دی کہ آٹا بھی ختم ہو چکا اور لکڑیاں بھی ختم ہوگئیں۔ کل کے لیے نہ جنس کا دانہ ہے نہ پاس کوئی پیسہ ہے۔ آپ سن کر خاموش ہوگئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ مگر خود فرماتے تھے کہ دل میں اپنے مالک سے یہ دعاء ہوئی کہ اے کریم آقا یہ تیری مخلوق جو تیرے کلام کی تلاوت و تعلیم میں مشغول ہے کیا فاقہ کرے گی اس کے بعد خود ہی یہ مضمون دل پر جما کہ تو جان تیرا کام۔ اگر فاقہ ہی کرانا منظور ہے تو صبر کی توفیق بخشئے کہ یہ بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

رات ہوئی اور موجودہ غلہ پک پکا کر مٹکے خالی ہوگئے۔ مگر آپ کی طبیعت پر نہ ہراس و پریشانی آئی نہ کسی سے قرض مانگنے کا وسوسہ ہوا۔ صبح نہ ہوئی تھی کہ طالب علم جو نہانے کے لیے ندی پر گئے ہوئے تھے، دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ حضرت جی ندی میں تو لکڑیاں بہی چلی آرہی ہیں۔ خوشی کے مارے آپ کا چہرے دمکنے لگا اور آپ نے فرمایا کہ کریم رزاق نے تمہاری روزی کا سامان بھیجا ہے جاؤ جتنی سمیٹی جائیں سمیٹ لاؤ، چنانچہ سارے طالب علم دوڑ پڑے اور روک لگا کر لکڑیاں لادنا شروع کردیں کہ دو گھنٹے میں اتنا اونچا ڈھیر لگ گیا جس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہ تھی۔ لکڑیوں کی آمد بھی بند ہوگئی اور اب آٹے کی ضرورت رہ گئی۔ دو گھنٹے کے بعد ڈاکیہ آیا کہ ڈیڑھ سو روپے کا منی آرڈر پیش کیا۔ جس میں لکھا تھا مدرسۃ القرآن کے لیے بھیجتا ہوں، اس کے خرچ میں لائیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں نے بھیجنے والے کا نام پوچھا تو ایسے شخص کا نام جس کو میں جانتا بھی نہ تھا۔ میں نے بارہا کہا کہ کسی اور کا ہوگا۔ کیونکہ بھیجنے والا میرے ذہن میں نہیں آیا۔ مگر ڈاکیے نے کہا کہ پتہ، آپ کا نام آپ کا مرسل کو آپ پہچانے یا نہ پہچانے مگر اس میں کوئی شک ہی نہیں یہ آپ کا ہے۔ بس آپ نے وصول فرمایا اور یہ کہہ کر ملا عبد العزیز کے حوالہ کیا، لو ملا جی! اللہ نے اپنے مہمانوں کے آگے لکڑی کا سامان کردیا۔ روٹی کا وقت آگیا، اس لیے جلدی آٹا منگالو کہ لکڑی موجود ہے، موٹی موٹی روٹیاں پکا کر نمک سے سب کھالیں، آپ فرمایا کرتے تھے کہ وہ لکڑیاں پورے چھ مہینے کام آئیں اور روپیہ تو آج تک پتہ نہ چلا کہ کس نے بھیجا تھا۔ الحمدللہ اس کے بعد مدرسہ کو کبھی ایسی صورت پیش نہ آئی اور نہ میں نے جانا کہ مولائے کریم کہاں سے بھیجتے ہیں اور کس سے دلواتے ہیں۔ (تذکرۃ الخلیل: ص ۲۴۰)

کار ساز مابساز کار ما
فکر ما در کار ما آزما

اب سب واقعات کے ساتھ اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہے جیسا کہ میں آپ بیتی نمبر۲ میں لکھوا چکا ہوں کہ میرے اکابر کے یہاں تصرفات کی کوئی وقعت کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ ان کے روکنے کی کوشش ہوئی۔ اپنے ایک مخلص دوست مولوی عبدالرحمٰن گنگوہی کا واقعہ لکھوا چکا ہوں کہ وہ جب کسولی میں امام تھے اور ذکر شغل کیا کرتے تھے تو ان کے خطوط اپنے حالات رفعیہ کے بہت آیا کرتے تھے۔ جن میں اپنی اجابت دعاء اور تصرفات کا ذکر ہوتا تھا۔ میں نے ان کا ایک خط حضرت قدس سرہٗ کو سنایا۔ جس میں بہت ہی تصرفات اور خوارق لکھے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ اس پر حضرت بیعت کی اجازت لکھوائیں گے کہ لونڈا تو چوتھے آسمان پر پہنچ گیا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب حضرت قدس سرہٗ نے اس کے جواب میں مجھ سے یہ لکھوایا کہ اذکار و اوراد سب چھوڑ دو۔ فرائض اور سنن مؤکدہ کے علاوہ جملہ نوافل جملہ اوراد فوراً بند کر دو۔ وہاں یہ بھی لکھوا چکا ہوں کہ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ابتدائی سلوک میں جو خطوط خوارق یا مکاشفات کے ہوتے تھے تو میرے حضرت ان کے جوابات میں یہ لکھوایا کرتے تھے کہ ان چیزوں کی طرف التفات ہرگز نہ کریں یہ ترقی سے مانع ہیں۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۱۵

اکابر کا معمول، تنقیدات اور آپس کے اختلاف کے بارے میں

اکابر کا معمول اپنے اوپر تنقیدات کے بارے میں بہت ہی اونچا اور قابل رشک تھا۔ کاش اس سیہ کار کو بھی ان اکابر کے اوصاف حسنہ میں سے کچھ مل جاتا تو کیسا اچھا ہوتا۔ یہ حضرات اجانب کی نہیں بلکہ مریدین اور شاگردوں کی تنقیدوں کو بھی بشرطیکہ اخلاص پر مبنی ہوں، محض عناد مقصود نہ ہو، بہت غور سے سنتے تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ جس کے واقعات بہت کثرت سے سنے اور پڑھے۔

سید احمد شہید کے واقعات

تذکرۃ الرشید میں حضرت سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت سید احمد شہید صاحب قدس سرہٗ کی شادی کے بعد نماز میں کچھ دیر سے تشریف آوری ہوئی۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب نے سکوت فرمایا کہ شائدنئی شادی کی وجہ سے تاخیر ہوگئی ہو، اتفاقیہ کچھ دیر ہوگئی ہو۔ اگلے دن پھر ویسا ہی ہوا کہ سید صاحب کو اتنی دیر ہوگئی کہ تکبیر اولیٰ ہو چکی تھی۔ مولوی عبدالحیٔ صاحب نے سلام پھیرنے کے بعد کہا عبادت الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت سید صاحب چپ ہو رہے اور اپنی غلطی کا اقرار کرلیا اور پھر نماز میں اپنے معمول طریق پر تشریف لانے لگے۔

(تذکرۃ الرشید: ص۲۷۲رج ۲)

حضرت سید صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے باورچی خانہ کے منتظم میاں عبدالقیوم اور عبداللہ بہرے تھے اور قادر بخش حضرت کا کھانا پکایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ گوشت پکا رہے تھے اور گوشت میں پانی کم تھا۔ اس عرصہ میں مغرب کی اذان ہوگئی۔ انہوں نے حاجی عبداللہ سے یہ کہہ کہ ذرا گوشت کی خبر رکھنا، میں نماز کو جارہا ہوں۔ حاجی عبداللہ نے گوشت کے نیچے سے آگ کھینچ کر خود بھی نماز کو چلے گئے۔ بعد نماز جب قادر آئے تو دیکھا کہ گوشت میں داغ لگ گیا تھا۔ انہوں نے صاف بوٹیاں نکال کر اس میں شوربہ کر دیا، پھر بھی جلنے کا اثر باقی رہ گیا اور جب سید صاحب کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا تو حضرت نے قادر بخش سے فرمایا کہ آج کیسا کھانا پکایا کہ گوشت جل گیا۔

انہوں نے واقعہ عرض کیا۔ یہ واقعہ سن کر بے ساختہ حضرت کی زبان سے نکل گیا کہ تم اس مردود کے گوشت حوالہ کر کے نماز کو کیوں چلے گئے۔ یہ سخت لفظ حضرت کی زبان سے عادت کے خلاف سن کر سب متحیر رہ گئے۔ جب عشاء کے بعد فارغ ہو کر حضرت تشریف لائے تو چند خدام نے آپس میں کہا کہ حضرت کی زبان سے یہ لفظ خلاف معمول نکل گیا، اس پر متنبہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ حضرت نے بار بار ارشاد فرمایا ہے کہ میں بشر ہوں، اگر کسی وقت بے جا کلام شریعت کے خلاف میری زبان سے صادر ہو تو مجھ سے ضرور اطلاع کرو اور اگر نہ کرو گے تو قیامت کے روز تمہارے دامن گیر ہوں گا۔ اس لیے اس بات کی اطلاع کرنی ہم پر واجب ہے کہ ہم بری الذمہ ہو جائیں۔

اس بات پر متفق ہو کر سب آپ کے پاس دستور کے موافق آئے اور بیٹھ گئے۔ پھر دو صاحبوں نے عرض کیا کہ حضرت سب بھائی لوگ جو حاضر ہیں، یہ کہہ رہے ہیں آج حضرت کی زبان سے مردود کا لفظ نکل گیا، یہ لفظ کسی مسلمان کو کہنا کیسا ہے آپ نے اس سوال کو سن کر دیر تک سکوت فرمایا اور کہا کہ یہ بات کسی مسلمان کو نہیں کہنا چاہیے۔ یہ کلمہ میری زبان سے بے اختیاری میں بے ساختہ نکل گیا اور بڑا قصور ہوا اور تم سب بھائیوں نے خوب کیا جو اس قصور سے مجھ کو آگاہ کیا، پھر آپ نے حاجی عبداللہ کو اور باورچی خانہ کے سب لوگوں کو بلوایا اور ہر ایک جماعت کے بہت لوگ اس وقت حاضر تھے اور حاجی عبداللہ بہت سادہ مزاج صالح آدمی تھے۔ حضرت نے ان کو پاس بٹھا کر فرمایا کہ حاجی صاحب! ہم تمہارے قصور مند ہیں۔ اس وقت غصہ میں بے اختیار ہماری زبان سے مردود کا جو لفظ نکل گیا ہماری یہ خطا اللہ معاف کر دو اور ہم سے مصافحہ کر لو۔ وہ سنتے کم تھے۔ اپنے جی میں ڈر گئے اور عذر کیا کہ حضرت آپ کا سالن مجھ سے جل گیا، میں بہت نادم ہوں، میری یہ خطا خدا کے واسطے معاف کر دیں۔ آپ نے ان کے کان میں زور سے پکار کر کہا، تمہاری کچھ خطا نہیں ہے، خطا ہم سے ہوئی کہ مردود کا لفظ ہماری زبان سے نکل گیا۔ تم ہم کو معاف کر دو۔ یہ سن کر انہوں نے حضرت کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ حضرت میں نے معاف کر دیا، آپ میرے لیے دعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت کرے اور آپ نے مصافحہ کیا۔ پھر آپ نے اسی مجلس میں سب کے سامنے بآواز بلند کہا، میں اپنی خطا سے توبہ کرتا ہوں۔ اب کبھی ایسا بے جا کلام ان شاء اللہ میری زبان سے نہ نکلے گا۔ پھر دیر تک اسی مضمون پر تقریر فرماتے رہے۔

چند روز بعد حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب تشریف لائے تو لوگوں نے سارا واقعہ حضرت شہید کو سنایا تو حضرت نے فرمایا کہ اولیاء کی زبان سے بشریت کے سبب کوئی کلام مکروہ شریعت کے خلاف نکل جاتا ہے اور وہ اس سے توبہ کرتے ہیں تو حقیقت میں وہ کلام حکمت اور فائدہ سے

خالی نہیں ہوتا اور نہ اس سے ان کا مرتبہ کم ہوجاتا ہے بلکہ ان کا درجہ اس کے سبب بڑھ جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کھانا اور جنت سے نکالا جانا بظاہر تو بے شک ان سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوئی اور انہوں نے اپنی خطاء سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے وہ خطا عفو فرمائی مگر اس میں حکمت الٰہی یہ تھی کہ اس خطا کے سبب وہ جنت سے نکالیں جائیں اور دنیا میں آئیں ان سے انبیاء واولیاء مومن مسلمان پیدا ہوں، دنیا کا کارخانہ جاری ہو۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک قبطی کو قتل کیا اور فرعون کے خوف سے مدین چلے گئے۔ وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی لڑکی سے ان کا نکاح ہوا اور چند سال وہاں رہ کر مصر کو چلے تو کوہِ طور پر رسالت ملی۔ اب خیال چاہیے کہ اس خطا میں اور وہاں سے بھاگنے میں کتنی حکمتیں تھیں۔ اگر ان سے وہ خطا نہ ہوئی ہوتی تو یہ فوائد کیوں کر ظہور میں آتے۔

(مختصراً سیرت سید احمد شہید: ص ۵۰۵/ ج ۲)

سفر حج میں آپ کے ساتھ عبداللہ نومسلم دہلوی اور ان کی بیوی جو آپ کے گھر کی ملازمہ اور خدا کی ایک نیک بندی تھی، ساتھ تھے۔ اس عورت کی گود میں ایک بچہ تھا اور آپ کی ایک صاحبزادی بھی، شیر خوار تھی۔ وہ عورت دونوں بچوں کو دودھ پلاتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اس کا دودھ کم ہوگیا۔ اس نے صاحبزادی کو دودھ پلانا چھوڑ دیا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ کو اس پر غصہ آیا اور انہوں نے ایک دن حضرت سے شکایت کی۔ آپ نے اس خادمہ سے کہا کہ تم اس بچی کو ضرور دودھ پلاؤ۔ ہم تمہاری خوراک ایسی مقرر کردیں گے کہ دودھ بڑھ جائے گا۔ اس نے کہا کہ میں نے بہت سے چیزیں کھائیں لیکن دودھ نہیں بڑھا۔ میں اس بچی کو دودھ پلانے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن پوچھتی ہوں اگر میرا بچہ بھوکوں مر گیا تو اس کا گناہ مجھ پر ہے یا نہیں۔ آپ نے اپنی بچی کا دودھ اس سے چھڑا دیا۔ اس کا میاں عبداللہ کو بھی بہت رنج ہوا۔

چار پانچ دن کے اندر آپ کو بہت تردد و پریشانی لاحق ہوئی اور دعاء ومناجات وغیرہ میں کمی محسوس ہوئی۔ اس پر آپ نے مغموم ہوکر بارگاہ بے نیاز میں بہت دعاء والتجاء کی آپ کو متنبہ ہوا کہ بچی کو دودھ پلانے کے واقعہ میں آپ سے ایک غریب عورت کی دل شکنی ہوئی اور اس کے بچہ کی حق تلفی ہوئی۔ آپ صبح ہی صبح مکان پر تشریف لائے اور لوگوں کو جمع کرکے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے اس معاملہ میں قصور ہوا اور سب واقعہ بیان کیا پھر سب مستورات کو ساتھ لے کر آپ میاں عبداللہ کی بیوی کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ یہ دیکھ کر ڈر گئیں اور رونے لگیں۔ آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا، ہم سے خطا ہوئی کہ ہم نے تم کو بچی کے دودھ پلانے کا حکم دیا، خدا کے لیے معاف کردو۔ یہ سن کر وہ زیادہ رونے لگی۔ عورتوں نے ان کو سمجھایا کہ زبان سے کہہ دو کہ ہم نے معاف کیا۔ اس

طرح تین بار ان کی زبان سے کہلوایا اور پھر آپ نے ان کے لیے دعاءِ خیر فرمائی اور اہلیہ محترمہ کو بڑی تاکید فرمائی کہ اس عورت کی پہلے سے بھی زیادہ خاطر مداری اور دل جوئی کرنا، پھر آپ شیخ عبداللطیف تاجر کے مکان پر تیز قدمی کے ساتھ تشریف لائے۔

شیخ صاحب موصوف، مولانا عبدالحئی، مولانا محمد اسماعیل اور حکیم مغیث الدین وغیرہ دالان میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کہ میں اس وقت تمہارے پاس ایک ضروری کام کے لیے آیا ہوں، آپ نے میاں عبداللہ کو پہلو میں بٹھایا اور ایک بڑی پراثر تقریر کی، جس میں پروردگارِ عالم کی بے نیازی کا مضمون بیان کیا اور یہ کہ سب بندوں سے قصور اور نافرمانی ہوتی ہے اور سب یکساں خدا کے محتاج ہیں۔ پھر آپ کھڑے ہو گئے اور آپ کے ساتھ سب اہلِ مجلس کھڑے ہو گئے۔ آپ نے بچی کو دودھ پلانے کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا کہ میں نے میاں عبداللہ کی بیوی سے تمام عورتوں کے روبرو معافی مانگ لی ہے لیکن چاہتا ہوں کہ میاں عبداللہ سے آپ کے اور سب مسلمانوں کے سامنے معافی مانگ لوں تاکہ آپ سب بھی دعاء میں داخل ہو جائیں۔ آپ کے اس فرمانے سے تمام اہلِ مجلس پر رقت طاری ہوگئی۔ میاں عبداللہ اتنا روئے کہ جواب کی طاقت نہ رہی۔ انہوں نے انتہائی عجز سے عرض کیا کہ میں آپ کا خادم اور فرمانبردار ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ تم ہمارے بھائی ہو۔ ہم سے قصور ہوا اب ہمارے معافی مانگنے اور تمہارے معاف کر دینے میں بڑی خیر و برکت ہے تم کو معاف کر دینا چاہیے۔ میاں عبداللہ پر ایسا گریہ طاری تھا کہ بات زبان سے نہ نکلتی تھی، ایک دوسرے شخص نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہو میں نے معاف کیا۔ میاں عبداللہ نے عرض کیا کہ اگر میرے کہنے ہی پر موقوف ہے تو میں نے دل و جان سے معاف کیا۔ اس کے بعد آپ نے دعاء کے لیے ہاتھ اٹھائے اور بڑے گریہ و زاری سے مسلمانوں کے لیے عموماً اور میاں عبداللہ کے لیے خصوصیت سے دعاء فرمائی۔ (سیرت سید احمد شہید: ص ۵۰۳)

اس نابکار کا بھی اپنی ابتدائی مدرسی ۱۳۳۵ھ سے اولاً مولانا عبدالرحمٰن صاحب سابق صدر مدرس مظاہر علوم اور ان کے بعد میرے محترم دوست قاری سعید مرحوم کے ساتھ یہ معمول اور میری تاکید رہی کہ اس سیہ کار کے اقوال و افعال کی نگرانی تمہارے ذمہ ہے۔ ان دونوں دوستوں کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ یہ ہمیشہ میری بہت ہی نگرانی فرماتے رہے۔ اس زمانہ میں چونکہ اس نابکار پر غصہ اور جوش کا دور دورہ تھا اور یہی دونوں حضرات بلکہ دیگر اکابر بھی مجھے اس پر ابھارتے رہتے تھے کہ ان خواص پر چاہے روساء ہوں، چاہے اکابر مدرسہ میرے حضرت قدس سرہٗ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے اعزہ اقارب ہوں، ان پر نکیر تو ہی کر سکتا ہے، ہم لوگوں کے بس کی بات نہیں۔

یہ کم ظرف ان فقروں سے اور بھی پھول جاتا اور بہت سختی ان خواص کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ اگر چہ میرا معمول ہمیشہ یہ بھی رہا کہ جس پر سختی کرتا کسی دوسرے وقت اس کی تلافی بھی کر دیتا۔ حتیٰ کہ اس وقت میں بعض طلبہ کے یہ فقرے بھی میرے کان میں پڑتے تھے کہ شیخ نے بہت دنوں سے کچھ مرمت نہیں کی۔ یہاں چائے پینے کے واسطے پیسے نہیں رہے۔ اس کے باوجود جن طلبہ کے متعلق یہ دونوں حضرات اپنے اپنے وقت میں یہ کہہ دیتے کہ فلاں کو سزا جرم سے زیادہ ملی۔ میں ان کی تلافی کا بہت اہتمام کیا کرتا تھا اور بے تکلف معافی مانگ لیتا تھا۔ ان دونوں حضرات کے بعد بھی موجود احباب سے بھی درخواست کرتا رہتا ہوں۔ مگر یہ حضرات ان دنوں حضرات جیسی نگرانی اس سیہ کار کی نہیں کرتے۔

اس ناکارہ کا معمول اپنی جملہ تصانیف عربی اور اردو میں ہمیشہ یہی رہا کہ ان دونوں اکابر کی زندگی میں تو بڑے اہتمام سے دونوں کو ہر چیز دکھلاتا تھا اور وہ دونوں حضرات بڑی فراخدلی سے میرے مسودوں کے صفحے قلم زد کر دیتے تھے میں قرآن وحدیث سے دلائل بھی پیش کرتا مگر ان کا آخری جواب یہ ہوتا تھا مضمون تو صحیح ہے، مگر عوام کے قابل نہیں۔ فقہا کے قول ''ھذا مما یعلم ولا یقتدی'' کی آڑ لے کر قلم زد کر دیتے تھے۔

اب تو نہ وہ جوش وخروش رہا اور نہ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ رہا۔ پھر بھی جو کچھ تھوڑا بہت ہوتا ہے وہ موجودہ احباب کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں اور ہمیشہ بہت اہتمام سے رمضان میں اور حرمین شریفین میں اس کی دعاء کرتا رہتا ہوں، جس کی سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی تعلیم فرمائی ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا ارشاد ابوداؤد شریف میں نقل کیا گیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی پر ناراض ہوتے تو ناراضی میں کچھ الفاظ فرما دیا کرتے تھے۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ میں فرمایا:

''میری امت میں سے جس شخص کو میں نے غصہ میں کوئی گالی دی ہو یا لعنت کی ہو، میں بھی بشر ہوں جب لوگوں کو غصہ آتا ہے مجھے بھی کسی وقت غصہ آجاتا ہے یا اللہ تو میری سخت کلامی کو ان لوگوں کے لیے رحمت بنا دیجیے۔''

ابوداؤد میں اس حدیث کے ساتھ ایک قصہ لکھا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر غصہ میں کوئی لفظ یا کچھ زیادتی کسی پر ہوجائے اولاً اس کو معاف کرانے کی کوشش کی جائے اور ثانیاً اس کے لیے دعاء اتنی کثرت سے کی جائے کہ قیامت کے دن جب اس کو اس زیادگی کے اجر وثواب اور دعاؤں کا حال معلوم ہو تو وہ بجائے مطالبہ کرنے کے خود یہ تمنا کرنے لگے کہ اس سے زیادہ پڑتی تو بہت ہی اچھا ہوتا۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید نور اللہ مرقدہٗ ہندوؤں کے کسی میلہ میں گئے۔ سید صاحب اس زمانہ میں ان سے پڑھتے تھے وہ بھی ان کے ساتھ گئے جب یہ دونوں میلے میں پہنچے تو سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر ایک جوش سوار ہوا اور نہایت غصہ آیا اور تیز لہجے میں مولانا شہید سے فرمایا۔ آپ نے فرمایا آپ نے کس لیے پڑھا تھا کیا سواد کفار بڑھانے کے لیے، آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت کہاں ہیں، آپ غور فرمائیں کہ ایک عالم اور شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کا بھتیجا کفار کے میلہ کی رونق بڑھائیں کس قدر شرم کی بات ہے۔

مولانا پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے فرمایا کہ سید صاحب آپ نہایت بجا فرماتے ہیں واقعی یہ میری غلطی ہے اور یہ فرما کر فوراً لوٹ آئے اور پھر کبھی کسی میلہ میں نہیں گئے، حضرت حکیم الامۃ اس کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں ''شاگرد کی نصیحت کو تیز لہجہ میں قبول کر لینا اور عمل کرنا کس قدر مجاہدہ عظیمہ ہے''۔ (ارواح: ص۹۰)

حضرت شاہ اسحاق کا واقعہ

استاذ الکل حضرت شاہ اسحاق صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ایک شاگرد اجمیر میں رہا کرتے تھے اور وہاں مواعظ کے ذریعہ سے اشاعت دین کیا کرتے تھے۔ انہوں نے حدیث ''لا تشد الرحال'' کا وعظ کہنا شروع کیا اور لوگوں پر اثر بھی ہوا، اتفاق سے شاہ اسحاق صاحب کا اس زمانہ میں قصد ہجرت ہو گیا۔ جب شاہ صاحب کے قصد کی ان کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے شاہ صاحب کو لکھا کہ جناب عازم سفر ہجرت ہوں تو اجمیر تشریف نہ لاویں۔ کیونکہ میں لا تشد الرحال کا وعظ کہہ رہا ہوں اور لوگ راہ پر آچلے ہیں۔ آپ کی تشریف آوری سے جو کچھ اثر ہوا ہے اس کے غتر بود ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ شاہ صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں اجمیر کے قصد سے نہ آؤں گا، لیکن چونکہ اجمیر راستہ میں پڑے گا اور خواجہ صاحب ہمارے مشائخ میں ہیں۔ اس لیے مجھ سے نہ ہو سکے گا کہ میں بلا حاضر ہوئے بالا بالا چلا جاؤں۔ جب میں آؤں تم وعظ کہنا اور وعظ میں بیان کرنا کہ اسحاق نے غلطی کی جو وہ اجمیر آیا اس کا فعل حجت نہیں اور میرے سامنے کہنا اور یہ خیال نہ کرنا کہ شاید مجھے ناگوار ہو مجھے ہرگز ناگوار نہ ہو گا اور میں اقرار کر لوں گا کہ واقعی میری غلطی ہے اس سے وہ ضرر رفع ہو جائے گا جس کا تم کو اندیشہ ہے اور شاہ صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ یہ مجاور اور قبر پرست ہمارے رقیب ہیں۔ رقیبوں کے ڈر سے محبوب کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔

(ارواح ثلاثہ: ص ۱۱۷)

حضرت گنگوہی کے واقعات

میرے والد حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ایک واقعہ ارواح ثلاثہ میں نقل کیا گیا ہے کہ مولانا محمد یحیٰی صاحب کہا کرتے تھے کہ مجھ سے مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ مولوی یحیٰی! احمد رضا خاں مدت سے میرا رد کر رہا ہے۔ ذرا اس کی تصنیف ہمیں بھی تو سنا دو۔ میں نے عرض کیا حضرت! ان میں تو گالیاں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اجی دور کی گالیوں کا کیا ہے، پڑی گالیاں ہوں تم سناؤ۔ آخر اس کے دلائل تو دیکھیں۔ شاید کوئی معقول بات ہی لکھی ہو، تو ہم ہی رجوع کر لیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھ سے تو نہیں ہوسکتا۔ حضرت حکیم الامۃ اس کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں اللہ اکبر یہ ہے حق پرستی کہ اس کے طلب واتباع کے غلبہ میں دشمن کی بیہودگی سے بھی متاثر متغیر نہ ہوں اور مولانا محمد یحیٰی صاحب کا یہ کہنا کہ مجھ سے تو نہیں ہوسکتا۔ ''ھو کقول علی لا امحوک''۔ (ارواحِ ثلاثہ)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جس قول کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ صلح حدیبیہ کا فقرہ ہے۔ جس کا پورا قصہ بڑی تفصیل کے ساتھ بخاری شریف میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب عمرہ حدیبیہ میں کافروں نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور کئی دن کی ردوقدح وآمدورفت کے بعد یہ طے ہوا کہ اس سال کفارِ مکہ مسلمانوں کو عمرہ نہیں کرنے دیں گے۔ آئندہ سال آ کر کریں۔ اس گفتگو کے طے ہونے کے بعد جب یہ صلح نامہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوانا شروع کیا تو ان ضدی جاہلوں نے ہر ہر چیز پر ضدیں شروع کیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ کی ابتداء ان الفاظ سے کرائی۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

تو بے وقوفوں نے اسی پر جھگڑا شروع کر دیا کہ ہم نہیں جانتے رحمٰن کیا ہے باسمک اللّٰھم لکھ جو زمانہ جاہلیت کا دستور ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میں ان نالائقوں کی ہر شرط کو قبول فرما رہے تھے، اس کو بھی منظور فرمالیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوانا شروع کیا ''ھذا ما قاضیٰ علیہ محمد رسو ل اللّٰہ '' یہ تحریر وہ فیصلہ ہے جس پر محمد رسول اللہ اور فلاں فلاں کا معاہدہ ہوا۔ اس پر بھی وہ سب اکڑ گئے کہ ہم رسول اللہ نہیں لکھنے دیں گے۔ محمد ابن عبداللہ لکھ، یعنی محمد عبداللہ کا بیٹا جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام نامی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں چاہے تم مانو یا نہ مانو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اس معاہدہ کے کاتب تھے، ان سے فرمایا کہ رسول اللہ کے لفظ کو مٹا دو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ کے لفظ کونہیں مٹا سکتا، مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کاغذ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لے کر اپنے دستِ مبارک سے مٹایا۔ اسی کی طرف حکیم الامۃ نے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ سے افاضات یومیہ میں نقل کیا ہے کہ میں نے اپنے ابتدائی استاد مولانا فتح محمد صاحب سے سنا ہے کہ ایک بار جب کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں بمقام مکہ معظمہ حاضر تھے۔ حضرت حاجی صاحب کے پاس مولود شریف کا بلاوا آیا۔ حضرت نے مولانا سے پوچھا مولوی صاحب چلو گے۔ مولانا نے فرمایا کہ نا حضرت میں نہیں جاتا۔ کیونکہ میں ہندوستان میں لوگوں کو منع کیا کرتا ہوں۔ اگر میں یہاں شریک ہوگیا تو وہاں کے لوگ کہیں گے، وہاں بھلے شریک ہوگئے تھے۔

حاجی صاحب نے بجائے برا ماننے کے مولانا کے اس انکار کی بہت تحسین فرمائی اور فرمایا کہ میں تمہارے جانے سے اتنا خوش نہ ہوتا جتنا تمہارے نہ جانے سے خوش ہوں۔ اب دیکھیے پیر سے زیادہ کون محبوب و معظم ہوگا، مگر دین کی حفاظت ان کے اتباع سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے دونوں کے ظاہری تعارض کے وقت اسی کو ترجیح دی۔ واقعی حفاظت دین بڑی نازک خدمت ہے۔ سارے پہلوؤں پر نظر رکھنی پڑتی ہے کہ نہ چھوٹوں کو نقصان پہنچے، نہ بڑوں کے ساتھ جو عقیدت ہونی چاہیے اس میں فرق آئے۔

مولانا نصیر الدین صاحب کو اپنے شیخ حضرت سلطان جی سے مسئلہ سماع میں اختلاف تھا۔ مزامیر کے ساتھ وہ بھی نہ سنتے تھے۔ لیکن مولانا نصیر الدین بلا مزامیر سننے کو بھی خلاف سنت سمجھتے تھے۔ کسی نے کہا کہ سلطان جی تو سماع سنتے تھے۔ مولانا نے جواب دیا ''فعل پیراں سنت نباشد۔'' کسی نے ان کا یہ قول سلطان جی سے نقل کر دیا تو آپ نے فرمایا ''نصیر الدین راست می گوید۔'' سبحان اللہ یہ حضرات تھے دین کے سچے خادم اور سچے عاشق۔ ع

وزیرے چنیں شہر یارے چناں

حاجی محمد علی انبہٹوی نے حج سے واپس آکر یہ مشہور کیا کہ حضرت حاجی صاحب نے مجھ کو سماع کی اجازت دے دی ہے۔ کسی نے حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہ روایت نقل کی۔ مولانا سن کر فرمایا کہ وہ غلط کہتے ہیں اور وہ اگر صحیح کہتے ہیں تو حاجی صاحب غلط کہتے ہیں۔ ایسے مسائل میں خود حاجی صاحب کے ذمہ ہے کہ وہ ہم سے پوچھ پوچھ کر عمل کریں، البتہ اصلاح نفس کے مسائل میں ہمارے ذمہ ہیں حضرت حاجی صاحب کا اتباع۔ اس ارشاد پر عوام میں بڑا چرچا ہوا مگر اس مفسدہ کا جو ان صاحب کی روایت سے ہوتا، بالکل انسداد ہوگیا تو مولانا نے حفاظت دین

کے مقابلہ میں اپنی بدنامی کی بھی پرواہ نہ کی۔ لوگوں نے حضرت حاجی صاحب تک یہ شکایتیں پہنچائیں مگر وہاں بھلا کیا اثر ہوتا۔ گو اوروں کو شکایت ہوئی مگر حضرت پر کچھ اثر نہ ہوا جن کے ساتھ اختلاف تھا۔

اس محبوب اختلاف پر یاد آیا۔ ان ہی بزرگوں کے صدقہ میں ہم جیسوں کو بھی ان حضرات کے تشبہ کی تھوڑی بہت توفیق ہوگئی۔ چنانچہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ میرے استاذ اور ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے تھے۔ مگر سیاسی تحریک میں شرکت کے متعلق میں نے مولانا سے اختلاف کیا، مگر نہایت ادب کے ساتھ اور مولانا کو بھی میرے اس اختلاف سے ذرہ برابر ناگواری نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک بار ایک مقرب معتقد نے میرٹھ میں مجمع کے سامنے مجھ پر نکتہ چینی کی۔ جو مولانا کو اس کی خبر پہنچی تو اظہار ناراضگی فرمایا اور فرمایا کہ وہیں جا کر اسی مجمع میں اپنے قول کو رد کرو اور اس مسئلہ میں کیا مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے، یہ محض میری رائے ہے، ممکن ہے کہ اس کی رائے صحیح ہو اور مولانا سے تجاوز کر کے میں نے تو حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی بعض مسائل میں اختلاف کیا اور اس اختلاف کا علم بھی مولانا کو میں نے کرا دیا۔ لیکن شفقت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں۔ بلکہ جب میں نے والد صاحب مرحوم کی بینک اس میں تنگی نہ تھی، تو مولوی محمد یحییٰ صاحب نے عرض کیا کہ پھر آپ اسے (یعنی مجھ سے) لے لینے کو کیوں نہیں فرماتے۔

اس پر مولانا نے فرمایا کہ سبحان اللہ! ایک شخص اپنی ہمت سے تقویٰ اختیار کرنا چاہتا ہے کیا میں اس کو تقویٰ سے روکوں تو دیکھئے مولانا اس اختلاف سے ناراض تو کیا ہوئے، اس کا نام تقویٰ قرار دے کرا لئے خوش تھے۔ غرض اگر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف نیک نیتی کے ساتھ اور محض دین کے لیے ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ (اضافات: ۲/۹ص ۳۰۶)

حضرت حکیم الامۃ نے فرمایا ایک بے تکلف دیہاتی نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بمقام آبہہ، جبکہ خدام مولانا کا بدن دبا رہے تھے۔ سوال کیا کہ مولوی جی! تم تو بہت ہی دل خوش ہوتے ہوگے لوگ خوب خدمت کر رہے ہیں فرمایا بھائی جی تو خوش ہوتا ہے کیونکہ راحت ملتی ہے۔ لیکن الحمد للہ بڑائی دل میں نہیں آئی۔ یہ دل میں نہیں آتا کہ میں بڑا ہوں اور جو خدمت کر رہے ہیں وہ مجھ سے چھوٹے ہیں۔ یہ سن کر وہ گاؤں والا کیسا صحیح نتیجہ نکالتا ہے۔ بولا کہ اجی! اگر یہ دل میں نہیں آتا تو بس خدمت لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (اضافات: ۲/۹ص ۴۲۲)

حضرت گنگوہی کا ایک مکتوب

حضرت امام ربانی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے ایک گرامی نامہ میں جو حکیم عبدالعزیز صاحب کو لکھا

ہے فرماتے ہیں۔

حکیم عبدالعزیز خان صاحب السلام علیکم!

آپ کا پہلا خط مع مولوی اسماعیل کے آیا۔ اب کیا لکھوں کہ مولوی اسماعیل کو فقط زبانی باتیں سن کر خیال پک گیا اور وہ فقط اس کی ظاہری باتیں تھیں۔ چنانچہ مفصل لکھ چکا ہوں۔ اب دوسرا خط آپ کا آیا۔

الحق یہ بیس روپے مجھ کو لینا سخت معلوم ہوتا ہے کہ اس وجہ سے لیے جائیں۔ میرے دل کی خواہش یہ کہ اس کو واپس کردوں۔ مگر تم ایسا کچھ لکھتے ہو۔ اب پھر بار بار لکھنا تو فضول ہے مگر اس قدر محقق ہے کہ لاریب آپ کو بوجہ حضرت کے بندہ سے خیال ہے اور یہ ناکارہ خودغرض ہے نہ کسی کی بھلائی مجھ سے ہو سکے نہ کسی کے کام کا ہوں۔ اگر زبانی دعاء کردی تو کیا ہوا۔ تم کو جو کچھ مجھ سے خیال ہے وہ محض حسن ظن ہے اور میں اپنے اندر کو جانتا ہوں کہ اپنی محبت اور غرض سے پُر ہے۔ تم تو وہ دوسرے درجہ میں الحق کہ خود حضرت مرشدنا سے بھی مجھ کو جیسی چاہیے اعتقاد و محبت نہیں۔ ایک بار خدمت میں حضرت کے بھی عرض کردیا تھا کہ آپ کے سب خادموں سے اس بات میں کم ہوں۔ ہر شخص کو کسی درجہ کی آپ کی محبت ہے اور اعتقاد، مگر مجھ نالائق کو کچھ بھی نہیں اور یہ اس واسطے ذکر کیا تھا کہ نفاق اپنا ظاہر کردوں اور حقیقت الحال کو عرض کردوں۔ سو اب دیکھو کہ جب خود اس شخص مبارک سے کہ جس کے پاپوش کے بدولت دنیا میں عزت ہورہی ہے اور یہ توجہ آپ کو ہے اس کے ہی ساتھ اپنا یہ حال ہو تو پھر اور کوئی تو دوسرے درجہ میں ہے۔

پس جب یہ حال خار اپنا اپنے دوستوں کے ساتھ ہوا تو کس طرح ہدایا اپنے حوصلہ سے زیادہ قبول کردوں۔ وہ کسی خیال میں اور اپنا کچھ اور حال۔ تو اب کیا کہوں، نہ کہہ سکتا ہوں نہ چپ رہ سکتا ہوں۔ اس قدر پھر لکھتا ہوں کہ یہ روپیہ تمہاری غرض میں خرچ نہ ہو آپ ایسی حالت میں اگر قبول کرلو تو بہتر ہے۔ آخر ہر روز لیے جاتا ہوں۔ فی الواقع یہ امر مقرر ہے کہ مجھ کو کسی محسن دوست، عزیز سے آشنائی نہیں۔ اپنے دل میں اپنی راحت وغرض اس قدر جاگزیں ہے کہ نہ کسی کے رنج سے رنج ہے نہ کسی کی فرحت سے فرحت۔ ہر دم اپنی ہی غرض درپیش ہے۔ اگرچہ اس اپنے حال زار سے نادم ہوں، مگر طبعی بات کو ندامت سے سود نہیں ہوگا شرمندہ ہوتا ہوں اور پھر تو وہی طبیعت سرزد ہوتی ہے تو اب آپ چشم پوشی کریں تو بہتر ہے ورنہ کیا کروں۔

حق تعالیٰ آپ کے حسن سے میرے ان اخلاق ناز یبا کو زائل کردے اور تھوڑی سے عقیدت اپنے مرشد کی اگر دے دیں تو پھر برادران دینی سے البتہ کچھ الفت ہوجائے ورنہ قیامت کو میری حقیقت منکشف ہوکر اندیشہ ندامت ہے۔ اس ہی واسطے اب ظاہر کرتا ہوں کہ میرا نفاق ظاہر

ہو جائے کہ دوست یوں جانتے ہیں کہ یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور میں بالکل ان کی طرف سے غافل اپنی غرض میں مبتلا ہوں۔

سوائے برادر دین! تم سے بھی توقع ہے کہ میرے واسطے اس امر کی دعاء کرو کہ حق تعالیٰ مجھ کو اپنی حب دے تو اس کی حب سے حب لے کر اولیاء کی ہووے اور پھر اس حب سے حب برادران دینی کی ہووے۔ ورنہ جس قدر میری کوئی شکایت کرے بجا ہے، میں خود مقر ہوں اور اپنا حال جانتا ہوں اور یہ بھی ضرور ہے کہ جب آدمی کو رنج ہوتا ہے تو خلاف توقع ہوتا ہے کہ جہاں آدمی توقع کسی امر کی رکھتا ہے اور وہ توقع برآمد نہیں ہوتی تو رنج ہو جاتا ہے، اس واسطے غیروں سے رنج کم ہوتا ہے اور عزیزوں سے اور دوستوں سے رنج ہو جاتا ہے کہ ان سے توقع بھلائی رکھتا ہے، جب بھلائی وقوع میں نہ آئی رنج ہوا، خلاف توقع ہونے کے سبب دل پر صدمہ ہوا سو چونکہ اپنے آپ سے مجھے خود توقع نہیں کہ کسی سے سلوک کروں اور اپنے آپ قابل دوستی کے نہیں جانتا تو الحق اگر کوئی میری شکایت کرے تو مجھ کو ہی بری نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اپنے آپ کو ایسا ہی جان رہا ہوں اور کی شکایت کو بجا جانتا ہوں کیونکہ میرے افعال ظاہر پر لوگ مغرور ہو کر وہ مجھ کو اپنا دوست جان گئے پھر جب معاملہ خلاف پیش آیا تو ضرور شکایت ہونی چاہیے۔

سو اب آپ سنو! کہ سہارنپور کا آنا یا پنجلاسہ پہنچنا ایسا کیا مشکل تھا، مگر اپنی غرض سے جو دل پر تھا سو حیلہ حوالہ پیش کر دیئے تو آپ کی کمی توجہ کا باعث نہیں، تم تو حضرت کی محبت وعقیدت کے ظل سے اس ناکارہ پر توجہ تام رکھتے ہو تم میں کوئی قصور نہیں، سراسر کوتاہی بندہ کی ہے۔ اب میں صاف صاف لکھتا ہوں کہ اگر خود حضرت مرشدنا کو کوئی خدانخواستہ تکلیف پیش آ جائے تو بخدا مجھ کو توقع اپنے نفس سرکش سے یہ نہیں کہ ان کی خدمت گزاری میں ذرا بھی تکلیف گوارا کرے، سو یہ میری شامت اعمال ہے کہ کسی کا کیا قصور۔ حضرت کی عنایات سے تو دنیا میں سب کچھ مشہور ہو گیا، اپنا کیا علاج کروں۔

اے خدا! اگر آخرت میں اس کا دسواں حصہ بھی نصیب ہو جائے تو میرے برابر کوئی صاحب نصیب نہیں۔ مگر چونکہ دنیا ظاہر ہے اور آخرت میں باطن ظاہر ہو جائے گا وہاں کچھ بھی تو توقع نہیں بنتی۔ الٰہی توبہ توبہ! بس ختم کرتا ہوں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ تم نے مولوی پیر محمد خاں سے شکر رنجی کا قصہ لکھا، مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ کیا وجہ ہوئی، باہم شکر رنجی چاہی نہیں۔ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ قصور فہم ہو جاتا ہے، بات کچھ ہوتی اور فہم میں دوسری طرح آ جاتی ہے، تو صفائی عمدہ بات ہے، جب آپ ظاہر لکھ دیں، اس وقت پیر محمد سے پوچھو اور زیادہ اب کو بھی نہیں لکھ سکتا کہ بیمار ہو۔ کیا تکلیف دوں۔ فقط اہل پنجلاسہ کی دشمنی پر صبر کرنا لازم، وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنے واسطے کرتے ہیں۔

عبدالمجید کا البتہ افسوس آتا ہے کہ وہ کیوں ایسا کام کرے جس سے آپ کو ناخوشی ہو۔ مگر ایک نصیحت آپ کو لکھتا ہوں کہ حتی الامکان دوسرے کے فعل کی تاویل حسن کرنا اور جہاں تک ہو سکے دوسرے کی بات کو بھلائی پر حمل کرنا اچھا ہے اور تھوڑے سے قصور پر چشم پوشی کرنا عمدہ ہے، اس میں آپ کو بہت راحت رہے گی اور دشمن کے فعل کے بدلہ نکوئی کرنا تو بہت عجیب بات ہے کہ ہر ایک کا کام نہیں، فقط ان فقرات کو اس طرح نہ جاننا کہ آپ پر طعن ہے یا عبدالمجید کی طرف داری ہے بلکہ تمہاری ہی راحت کے خیال سے لکھتا ہوں۔ ان فقروں سے ناراض نہ ہونا اور ان فقرات کی تصدیق حضرت مرشدنا سے کرانا کہ یہ فقرات مجھ سے عمل میں نہیں ہے آپ کو لکھتا ہوں، بھلا آپ ہی عمل کریں، یہ قدیم نصائح ہیں۔ فقط والسلام (مکاتیب رشیدیہ: ۶۰ ص ۵۲)

حضرت سہارنپوری کے واقعات

حضرت اقدس سہارنپوری قدس سرہٗ کے متعلق تذکرۃ الخلیل میں لکھا ہے کہ بایں تفقہ (حضرت کے تفقہ کے چند واقعات ذکر کیے ہیں) آپ کو اپنے کسی کمال پر ناز نہ تھا اور نہ ضد تھی۔ ایک بار آپ تھانہ بھون گئے اور فساد صلوۃ بمحاذاۃ النساء کے مسئلہ میں مولوی احمد حسن سنبھلی کا حضرت سے مکالمہ ہوا تو حضرت تو حنفیہ کے قول کو قوی فرما رہے تھے اور مولوی احمد حسن ضعیف۔ حضرت نے فرمایا تم پہلے میری تقریر سن لو پھر جو کہنا ہے وہ کہنا، مگر مولوی صاحب نے درمیان میں آپ کا کلام قطع کرنا شروع کر دیا۔ حضرت کو تکدر ہوا اور لہجہ میں تیزی آ گئی۔ مولوی احمد حسن بھی تیزی پر آ گئے، تب آپ نے تحمل کیا اور خاموش ہو گئے۔ جب آپ ریل پر آنے لگے تو آپ نے خود ابتداء بالسلام کی اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر فرمایا، اگر مجھ سے کچھ گستاخی آپ کی شان میں ہو گئی ہو تو معاف فرما دیں۔ اس بندہ خدا نے اس پر بھی کوئی معذرت نہیں کی۔

(تذکرۃ الخلیل: ص ۲۹۷ پاکی)

تذکرۃ الخلیل میں تو یہ قصہ اتنا ہی نقل کیا ہے۔ لیکن حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کو اس واقعہ سے بہت قلق ہوا اور مولوی احمد حسن کو تنبیہ بھی کی کہ اکابر کے سامنے یوں گستاخانہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ حضرت حکیم الامت خوان خلیل میں تحریر میں فرماتے ہیں کہ مسجد پیر محمد والی سمت جنوب میں جو سہ دری مسجد میں ملی ہوئی ہے۔ اس پر سائبان ڈالا گیا تو مولانا نے اس کے متعلق از خود کچھ تحریر فرمایا جس کا یہاں جواب عرض کیا گیا۔ چند بار اس میں مکاتبت ہوئی، جس میں کوئی اخیر فیصلہ نہیں ہوا اس مکاتبت کا نام "مسائلة اهل الخلة فی مسئلة الظلة" ہے جو ترجیح الراجح کے حصہ دوم کے اخیر میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مکتوب سوم کے شروع میں ایک عجیب دلربا جملہ ہے وہی

ھذہ گرامی نامہ موجب برکت ہوا۔ کئی کئی روز تک تو یہ خیال رہا کہ مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کروں یا نہ کروں مبادا تکرار موجب بار ہو۔ بالآخر یہ خیال ہوا کہ اپنا خیال ایک دفعہ اور عرض کر دوں۔ الخ ملاحظہ فرمایا جائے اس جملہ میں رعایت حق اور رعایت خاطر دونوں کو کس طرح جمع فرمایا گیا ہے۔ اس کا اثر احقر پر یہ ہوا کہ اس پر جو عرض کیا گیا باوجودیکہ اس کا جواب نہیں آیا۔ مگر مجھ کو ایک تنبیہ میں اس لکھنے کی ضرورت ہوئی کہ اس جواب نہ آنے کو محبت نہ سمجھا جائے۔ الی قولی، اس باب میں اہلِ علم سے مزید تحقیق کی جائے۔ (خوان خلیل: ص۹ ر ج ۷)

حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ نے حسن العزیز میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کا ایک واقعہ ذکر فرمایا ہے کہ حضرت شیخ الہند مراد آباد مدرسہ کے جلسہ میں تشریف لے گئے، لوگوں نے وعظ کے لیے اصرار کیا (مولانا وعظ سے بچتے تھے) عذر کیا مجھے عادت نہیں، لوگوں نے نہ مانا۔ آخر مولانا کھڑے ہوئے اور حدیث "**فقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد**" پڑھی اور اس کا ترجمہ یہ کیا "یہ ایک عالم شیطان پر ہزار عابد سے بھاری ہے۔" وہاں ایک مشہور عالم بھی تھے وہ کھڑے ہوئے اور کہا یہ ترجمہ غلط ہے اور جس کو ترجمہ بھی صحیح کرنا نہ آئے اس کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ بس مولانا فوراً ہی بیٹھ گئے اور کہا میں پہلے ہی کہتا تھا کہ مجھے وعظ کی لیاقت نہیں ہے اور بعد میں مولانا ان کے پاس آئے اور پوچھا کیا غلطی ہوئی، کہا اشد کا ترجمہ اضر ہے نہ کہ اثقل۔ مولانا نے کہا حدیث کیفیت وحی میں بھی یہ لفظ آیا ہے "**ویاتینی احیانا کصلصلة الجرس و هو اشده علی**" وہاں اضر کا ترجمہ کیسے بنے گا۔ بس ان عالم صاحب کی یہ حالت کہ رنگ فق تھا اور سر سے پیر تک عرق میں ڈوبے ہوئے تھے۔ (حسن العزیز: ص ۲۴۰ ر ج ۴)

حضرت تھانوی کے واقعات

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق یہ ناکارہ خوان خلیل کے حواشی میں حکایات شکایات سے ایک مضمون نقل کر چکا ہے اور اپنے رسالہ جوابات میں بھی نقل کر چکا ہوں جس کی تمہید میں حضرت حکیم الامۃ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مدت دراز سے مجھ پر عنایت فرماؤں کی طرف سے بے جا اعتراضوں کی بوچھاڑ ہے۔ جس میں سے اکثر کا سبب تعصب اور تحزب ہے جس کے جواب کی طرف احقر نے اس لیے التفات نہیں کیا کہ میں نے ان اعتراضوں کو قابل التفات نہیں سمجھا۔ نیز یہ بھی خیال ہوا کہ آج کل جواب دینا قاطع اعتراضات نہیں ہوتا بلکہ زیادہ مطول کلام ہو جاتا ہے تو وقت بھی ضائع ہوا اور غایت بھی حاصل نہیں ہوئی، تیسرے مجھ کو اس سے زیادہ اہم کام اس کثرت سے رہا کہ اس کام کے لیے مجھ کو وقت بھی نہیں مل سکتا تھا،

چوتھے میں نے جہاں تک دل کو ٹٹولا ایسے اعتراضوں کا جواب دینے میں نیت اچھی نہیں پائی۔ میں اہلِ خلوص کو کہتا نہیں مگر مجھ جیسے مغلوب النفس کی نیت تو زیادہ یہی ہوتی ہے کہ جواب نہ دینے میں معتقدین کم ہو جائیں گے، شان میں فرق آجائے گا جس کا حاصل ارضاء عوام ہے سو طبعاً مجھ کو اس مقصود یعنی ارضاء عوام سے غیرت آتی ہے۔ (خوان خلیل: ص ۳۲)

اشرف السوانح میں حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ پر معترضین کی بھرمار بوچھاڑ کے ذیل میں لکھا ہے کہ حضرت والا نے اپنے معترضین کے مقابلہ میں کبھی رد کی کوشش نہیں فرمائی، بلکہ ان کے اعتراضوں پر بھی بالخصوص جہاں مظنہ نیک نیتی کا تھا، اس نیت سے نظر فرمائی کہ اگر اعتراضات میں کوئی امر واقعی قابل قبول ہو تو اس کو قبول کر کے اس پر عمل کیا جائے۔ (اشرف السوانح: ص ۶۳ / ج ۲)

افاضات یومیہ میں حضرت الامت نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ صاحب اور حضرت سید صاحب میں ایک مسئلہ پر طویل گفتگو ہوئی۔ بالآخر مولانا شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے معافی چاہی اور عرض کیا کہ مجھ کو آپ کی بات بلا چوں و چراں مان لینا چاہیے تھا اس پر سید صاحب نے فرمایا توبہ کرو یہ تو نبی کا مرتبہ ہے کہ اس کی بات کو بلا چوں و چرا مان لیا جائے اور یہ بھی شرک فی النبوت ہے، مولانا شہید فرماتے ہیں کہ اس ارشاد سے مجھے شرک فی النبوت کے متعلق ایک باب عظیم علم کا مفتوح ہوا۔ (افاضات: ۱ / ص ۹۱)

اشرف السوانح میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ حضرت والا پر اگر کوئی کسی قسم کا اعتراض کرتا تو اس سے اپنا تبریہ فرمانے کی ہرگز کوشش نہیں کرتے بلکہ اگر وہ اعتراض علمی رنگ کا ہوتا ہے اور قابل قبول ہوتا ہے تو اس کو قبول فرما کر اپنی تحقیق سابق سے بلا تامل رجوع فرمالیتے ہیں اور ترجیح الراجح میں اپنا رجوع شائع فرما دیتے ہیں۔ یہ معاملہ تو علمی رنگ کے اعتراضات کے ساتھ فرماتے ہیں اور اگر اعتراض معاندانہ رنگ کا ہوتا ہے تو اس کی مطلق پرواہ نہیں فرماتے۔

چنانچہ اگر ایسا اعتراض بذریعہ جوابی لفافہ کے موصول ہوتا ہے تو بجائے اپنا تبریہ فرمانے کے نہایت استغناء کا جواب تحریر فرما دیتے اور ایسے عنوان سے کہ معترض پر ظاہر ہو جائے کہ اس کے اعتراض کو بالکل لغو اور غیر قابل التفات سمجھا گیا، مثلاً ایک شخص کو جس نے واہی تباہی اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے تحریر فرما دیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ عیوب ہیں، مگر مجھے تو اپنے عیوب کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوتی تم ان کو مشتہر کر دو تا کہ لوگ دھوکے میں نہ رہیں اھ اور اگر خط جوابی نہیں ہوتا تو اس کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ (اشرف السوانح: ص ۱۵۴ / ج ۳)

ایک سلسلہ میں فرمایا کہ مولوی محمد رشید مرحوم جنہوں نے مجھ سے پڑھا تھا بڑے حق گو لیکن اس کے ساتھ بڑے باادب تھے، ایک بار میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا وہاں ریز گاری کی ضرورت پڑی،

ایک صاحب کے پاس موجود تھی، ان کو روپیہ دے کر میں نے ریز گاری لے لی۔ مولوی صاحب بھی اس وقت موجود تھے وہ آگے بڑھے اور مجھ سے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا بیع میں تو داخل نہیں مجھے فوراً تنبیہ ہوا میں نے کہا کہ خیال نہیں رہا یہ معاملہ واقعی بیع ہی میں داخل ہے، جو مسجد میں جائز نہیں۔ پھر میں نے ان صاحب کو جن سے معاملہ ہوا تھا، ریز گاری واپس کر کے کہا کہ میں اب اس معاملہ کو فسخ کرتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ مسجد سے باہر چلو، وہاں پھر اس معاملہ کو از سر نو کریں گے، چنانچہ مسجد سے باہر آ کر اور روپیہ دے کر میں نے پھر ان سے ریز گاری لے لی۔ مولوی محمد رشید کی اس بات سے میرا جی بڑا خوش ہوا۔ کیونکہ ظاہر کرنا تو ضروری ہی تھا، لیکن انہوں نے نہایت ادب سے ظاہر کیا، یہ پوچھا کہ کیا یہ بیع میں تو داخل نہیں۔ (اضافات: ۲/۹ ص ۳۵۳)

مضمون بالا بہت طویل ہے اور میرے اکابر کا معمول اس میں بہت ہی قابلِ رشک ہے۔ حقیقت میں تو یہ تواضع کے ابواب سے ہے اہمیت کی وجہ سے ان واقعات کو علیحدہ لکھوایا اور نمونہ کے طور پر علیحدہ لکھوایا۔ ان سب کا مدار اپنی کم مائیگی کے استحضار پر ہے، جتنی بھی اندر میں اپنی کم مائیگی ہوگی اور اس کا استحضار ہوگا اتنا ہی زیادہ دوسروں کے اعتراض اور تنقید پر غصہ کم آئے گا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم سہارنپوری کے واقعات

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری جو بڑے صاحب کشف و کرامات تھے سہارنپور ہی میں ان کا مزار بھی ہے۔ عیدگاہ سے سرسادہ کی سڑک پر جاتے ہوئے بائیں جانب ایک مسجد کے قریب ہے اور ان کے کشف و کرامات کے بہت قصے مشہور بھی ہیں۔ ''میرا چاند'' ان کا تکیہ کلام تھا۔ ہمارے کاندھلہ کے مولوی روشن علی خاں اپنے بچپن میں ان کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ وضو کر رہے تھے، ایک قندیل اوپر اڑا جا رہا تھا۔ فرمانے لگے میرے چاند! یہ دیکھا کیا جا رہا ہے۔ مولوی روشن علی صاحب نے فرمایا کہ حضرت مجھے تو پتہ نہیں یہ کیا ہے۔ فرمانے لگے یہ جادو جا رہا ہے اور مجھے اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ میں اس کو اتار لوں، مولوی روشن علی صاحب نے کہا ضرور اتا لیں۔ حضرت شاہ صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا وہ نیچے اتر آئی، اس میں ایک آدمی کا پتلا بنا ہوا تھا اور اس میں بہت سی سوئیاں اوپر سے نیچے تک چبھائی ہوئی تھیں۔

حضرت نے اس سے پوچھا تو کون ہے۔ اللہ نے اس کو گویائی عطاء فرمائی، اس نے کہا میں جادو ہوں۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا، اس نے بتایا فلاں جگہ سے آیا ہوں فلاں کو مارنے جا رہا ہوں۔ حضرت نے اس سے دریافت فرمایا کہ جس نے بھیجا اس کا

کہنا مانے گا یا ہمارا۔ اس نے عرض کیا کہ اب تو آپ کا ہی کہنا مانوں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ میں نے اس لیے کیا کہ نہ معلوم وہ اور کتنوں کو مارے گا۔

ایسے ہی ان کی کرامات و کشف کے سلسلہ کا دوسرا واقعہ بھی مشہور ہے کہ پنجاب سے حکیم نور الدین بسلسلہ معالجہ حضرت شاہ صاحب کے پاس آئے۔ حضرت نے ان سے فرمایا کہ حکیم صاحب پنجاب میں کوئی جگہ قادیان ہے۔ وہاں سے کسی نے نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا؟ حکیم صاحب نے کہا کہ کسی نے نہیں کیا، حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ وہاں سے ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا اور لوح محفوظ میں آپ کو اس کا مصاحب لکھا ہے۔ آپ کے اندر ایک مرض ہے (بحث کرنے اور الجھنے کا) یہ مرض آپ کو وہاں لے جائے گا اور آپ مبتلا ہوں گے۔ ہم تو اس وقت نہ ہوں گے، مگر آپ کو پہلے سے مطلع کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور یہ حکیم صاحب اس سے مناظرہ کرنے کے لیے گئے اور اس کے دام میں پھنس گئے اور اس پر ایمان لے آئے اور پھر اس کے خلیفہ اول ہوئے۔ (نعوذ باللہ منہ)

ہمارے اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ انہی عبدالرحیم صاحب سے بیعت تھے اور ان کے اجل خلفاء میں تھے۔ اس کے بعد حضرت امام ربانی قطب عالم گنگوہی کی طرف رجوع کیا۔ کسی نے حضرت سے پوچھا کہ آپ نے اپنے دونوں مشائخ میں کیا فرق پایا؟ تو حضرت نے جواب دیا کہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں عجب و پندار کا سر کٹا ہوا تھا۔ درحقیقت یہ ایسا سم قاتل ہے کہ اس کی نحوست بہت ہی مہلک اور اکابر کے ہوتے ہوئے بھی اپنی نحوست دکھلائے بغیر نہیں رہتی۔

اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ حنین کی لڑائی میں سید الکونین خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہوئے بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ابتداء مغلوب ہونا پڑا۔ فتح مکہ کے بعد معلوم ہوا کہ حنین کے کفار یعنی قبیلہ ہوازن کے لوگوں نے جو تیر اندازی میں بہت مشہور تھے، قبائل عرب کو جمع کر کے حنین میں اجتماع کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو یہ خیال کر کے کہ بدر کی لڑائی میں ہم چند سینکڑوں نے ایک ہزار کے چھکے چھڑا دیئے تھے یہ ہمارے سامنے کیا چیز ہیں۔ ابتداءً ہزیمت اٹھانی پڑی۔ جس کو قرآن پاک میں ''و یوم حنین اذا عجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئاً'' سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ حنین کی لڑائی میں جب تمہاری کثرت نے تمہیں گھمنڈ میں ڈالا تو اس کثرت نے تمہیں کچھ کام نہ دیا اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے، حالانکہ سید الکونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم خود بہ نفس نفیس اس جنگ میں شریک تھے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام جب مسیلمہ کذاب (جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا) کی سرکوبی کے لیے تشریف لے گئے، اعتدال میں یہ قصہ مفصل لکھا ہے کہ طلیحہ الکذاب پر فتح پانے کے بعد مسیلمہ کی جماعت سے لڑائی ہوئی جس میں بہت سخت مقابلہ ہوا اور ہزاروں آدمی اس کی جماعت کے قتل ہوئے اور مسلمانوں کی بھی بڑی جماعت شہید ہوئی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے سپہ سالار تھے۔ فرماتے ہیں کہ جب ہم طلیحہ کذاب سے فارغ ہو گئے اور اس کی شوکت کچھ زیادہ نہ تھی تو میری زبان سے ایک کلمہ نکل گیا اور مصیبت گویائی کے ساتھ وابستہ ہے۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ بنو حنیفہ ہیں ہی کیا چیز یہ بھی ایسے ہی ہیں جیسے لوگوں سے ہم نبٹ چکے ہیں۔ مگر جب ہم ان کی جماعت سے بھڑے تو ہم نے دیکھا کہ وہ کسی سے مشابہ نہیں ہیں۔ طلوع آفتاب سے لے کر عصر کے وقت تک وہ برابر مقابلہ کرتے رہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ خود اقرار فرماتے ہیں کہ ایک کلمہ زبان سے نکل گیا تھا، جس کی وجہ سے اتنے سخت مقابلہ کی نوبت آئی۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یرموک کی لڑائی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو جو عراق میں تھے ایک خط لکھا کہ عراق پر اپنا جانشین مقرر کر کے فوراً یرموک پہنچو۔ اس خط میں ان کی تعریف فرمائی تھی اور کامیابی پر مبارکباد تھی اور یہ لفظ بھی لکھا تھا "تمہارے اندر عجب ہرگز پیدا نہ ہو کہ اسی سے نقصان اٹھاؤ گے اور ذلیل ہو جاؤ گے اپنے کسی عمل پر ناز نہ کرنا۔ اللہ ہی کا احسان ہے وہی بدلہ کا مالک ہے"۔ (اعتدال: ص ۱۲۰)

عجب وپندار کے مضر اثرات اور مظاہر العلوم کی اسٹرائیک

اس ناکارہ نے اپنی زندگی میں عجب وپندار کے بہت ہی نقصانات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور چھوٹوں کی اور نادانوں کی زبان کی بدولت بڑے بڑے اکابر کو پریشانیوں میں مبتلا دیکھا۔ واقعات تو بہت ہی کثرت سے اس ناکارہ پر اور اس کے سامنے گزرے ہیں۔ اس وجہ سے میں تو اس سے بہت ہی زیادہ ڈرنے لگا۔

ہمارے مدرسہ مظاہر علوم کی ۱۳۸۴ھ کی ناکام اسٹرائیک اسی عجب وپندار وثمرات کا نتیجہ تھی۔ مدارس میں طلبہ کا اخراج ہوتا ہی رہتا ہے روزمرہ کے واقعات ہیں۔ لیکن اس عجب کی نحوست نے ایک معمولی طالب علم کے اخراج کو اسٹرائیک تک پہنچا دیا، اس سیہ کار کو سوچنے کا مرض بہت ہے اور خالی پڑا پڑا واقعات کا ایک دوسرے سے جوڑ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اس ہنگامہ کی بنیاد تو اس سیہ کار کی نگاہ میں حضرت اقدس شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کا سایہ سرپرستی مدرسہ سے

اٹھنا تھا کہ حضرت قدس سرہٗ کا وصال لاہور میں ۱۴ ربیع الاول ۸۲ھ پنجشنبہ کو ہوا اور مدرسہ پر خش و خاشاک گرنے شروع ہوئے، اسی وجہ سے میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا کہ مدرسہ کے ممبران میں اہل الرائے، اہل تجربہ محاسب دنیا کے حالات سے واقف جتنے بھی ہوں لیکن ہر مدرسہ کی حیثیت کے موافق اس کے ممبران کی ایک مقدار اللہ والوں کی ضرور ہونی چاہیے۔ اہل مدارس کو بھی میں ہمیشہ یہی مشورہ دیتا رہا۔ اس کی جزئیات تو بہت ہیں۔ جن کا یہ موقع نہیں۔ مگر مدرسہ پر تو میری نگاہ میں خس وخاشاک اسی وقت سے گرنے شروع ہوگئے تھے جب سے حضرت کا وصال ہوا اور مدرسہ حضرت قدس سرہٗ کی سرپرستی سے محروم ہوا۔

اس ایندھن پر دیا سلائی ہمارے ایک مخلص دوست کے ایک فقرہ نے لگائی اس نے جلالین کے سبق میں ایک مدرسہ کی اسٹرائیک کا ذکر کرتے ہوئے کہہ دیا کہ مظاہر میں نہ کبھی اسٹرائیک ہوئی نہ ہوگی۔ بقول حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ''البلاء موکل بالمنطق'' جو اوپر گزرا، دیا سلائی جلا دی اور ایک طالب علم جس کی بہت سی شکایتیں بہت دنوں سے شاخ مدرسہ خلیلیہ کے ناظم کے پاس پہنچ رہی تھیں، سینما بازی، انگریزی بال، اساتذہ کا عدم احترام، نماز کی عدم پابندی۔ مدرسہ کے اہلِ شوریٰ کے مشورہ سے اس کا اخراج کیا گیا۔ ۱۰ ربیع الثانی کی شب میں جب کہ شاخ کے کیواڑ بند ہوگئے تو لیبر یونین کے ایک غیر مسلم لیڈر کے مشورہ پر جس سے اس کے قدیم تعلقات تھے۔ رات میں تقریر کی کہ میرا اخراج تم سب کے اتفاق سے رک سکتا ہے، ورنہ میرا تو اخراج ہو ہی گیا، لیکن اگر تم سب متفق ہو جاؤ تو میرا بھی اخراج رک سکتا ہے اور تم سب بھی اخرج سے رک سکتے ہو۔

زکریا کو پنجشنبہ ۱۰ ربیع الثانی کو یہ اطلاع ملی کہ رات شاخ میں یہ گزرا۔ اس نے اسی وقت ناظم صاحب شاخ کو بلا کر ان سے تاکید کی کہ اس ہنگامہ کی خبر لے، مگر انہیں بھی کچھ اپنی نظامت پر اس قدر گھمنڈ تھا کہ انہوں نے بہت زور سے زکریا کو اطمینان دلایا کہ آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ اس کی یہ مجال نہیں کہ وہ کوئی حرکت کر سکے، ہر چند زکریا نے اس کی اہمیت بیان کی کہ اس کے پاس تفصیل پہنچ چلی تھی۔ مگر ناظم صاحب شاخ کو بہت ہی اپنے زور پر اعتماد تھا۔ انہوں نے کچھ اہمیت نہ دی۔

۱۷ ربیع الثانی شنبہ کی صبح کو معلوم ہوا کہ طلبہ شاخ نے اندر سے کیواڑ بند کر کے ایک درخواست ناظم صاحب مدرسہ کے پاس بھیجی، جس میں بہت سے لغو مطالبات پائخانوں، غسل خانوں کی عدم صفائی، شاخ کے درمیان میں ایک بہت بڑا بجلی کا بلب لگایا جائے، جو ساری رات جلے۔ منجملہ یہ بھی تھا کہ فلاں طالبِ علم کا اخراج ملتوی کیا جائے اور جب تک ہمارے مطالبات پورے نہ ہوں

ہم اپنا عمل جاری رکھیں گے۔ مدرسہ کے سب اکابر ناظم صاحب حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ مولانا امیر احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صدر مدرس مدرسہ اور اکابر مدرسین نے بارہا فہمائش کی۔ مگران کے لیڈر نے ان کو سمجھا دیا تھا کہ اتنے مطالبات پورے نہ ہوں جمے رہنا۔ اس ناکارہ نے بھی کئی دفعہ جانے کا ارادہ کیا مگر ہمارے شہر کے قاضی جناب قاضی ظفر احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے شدت سے زکریا کو منع کرایا اور کئی دفعہ آدمی بھیجا کہ تم نہ جانا، میں نے ان سے درخواست بھی کی مگر مرحوم نے بار بار آدمی بھیج کر منع کیا۔

کئی دن کی گفت وشنید افہام وتفہیم کے بعد ان نادانوں نے کیواڑ نہ کھولے تو ربیع الثانی پنجشنبہ کو ناظم صاحب شاخ اور بعض اکابر مدرسین نے جا کر زبردستی کیواڑ کھلوائے اور احتیاطاً حلقہ کے تھانہ والوں کو بھی اطلاع کر دی تھی۔ وہاں حفاظتی پولیس بھی باہر پہنچ گئی اور اس ہنگامہ پر مدرسہ کے طلبہ نے بھی عصبیت جاہلیہ میں ان کا ساتھ دینے کا تہیہ کیا۔ ہر چند کہ ان کا تعلق اس واقعہ سے نہیں تھا۔ مگر مدرسہ میں بھی ایک جمعیۃ الطلبہ فوراً قائم ہوئی اور ناظم اور صدر متعین ہو کر حلفاً حلفی ہوئی کہ اتنے شاخ والوں کے مطالبات پورے نہ ہوں مدرسہ میں بھی اسٹرائیک کی جائے۔

مدرسہ کی مجلس شوریٰ میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو اس سیہ کار سے بھی ایک بڑی حماقت سرزد ہوئی کہ شوریٰ میں اس سیہ کار نے بڑے زور اور گھمنڈ کے ساتھ کہا تھا کہ دورہ کا کوئی طالب علم شریک نہیں۔ ہمارے مدرسہ کے نائب مہتمم تعلیمات مولوی عبدالمجید صاحب نے بڑی دبی زبان میں کہا کہ نہیں ''دورہ والے'' بھی ہیں۔ مگر مجھے اپنا گھمنڈ تھا کہ میں نے ان کی بڑے زور سے تردید کی کہ وہ دورہ کا کوئی شخص نہیں ہوسکتا اور اس گھمنڈ کا مبنی یہ تھا کہ اس سیہ کار کو حدیث کے اسباق پڑھانے کا سلسلہ ۴۰ھ سے شروع ہو گیا تھا اور یہ ناکارہ حدیث کے طلبہ کو ہر سال بار بار ان کا مقام ان کی حیثیت اور یہ کہ تم عنقریب مقتدائے قوم بننے والے ہو، تمہارا قول وفعل امت کے لیے اسوہ بننے والا ہے اور اس سال خاص طور پر مجھے یاد ہے کہ بخاری شریف کا کوئی سبق ایسا نہیں ہوا ہوگا جس میں میں نے پانچ سات منٹ کی ادنیٰ مناسبت بلکہ بغیر مناسبت کے بھی اس مضمون کو زور شور سے نہ کہا ہو۔ اس وجہ سے مجھے بہت ہی پختہ یقین تھا کہ اس سال کے دورہ والوں کی اکثریت اپنے زمانہ کے جنید وشبلی بنیں گے۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب آہستہ آہستہ یہ تحقیق ہوتی رہی کہ دورہ کی تو پوری جماعت الا ماشاء اللہ اس میں پیش پیش ہے اور زیادہ قلق اس کا ہوا کہ مجھ سے خصوصی تعلق رکھنے والے، ناظم صاحب دام مجدہم سے خصوصی تعلق رکھنے والے مولانا امیر احمد صاحب، صدر مدرس سے خصوصی تعلق رکھنے والے اس میں در پردہ شریک رہے۔ صورۃً ہم لوگوں کے ساتھ رہے اور ہماری باتیں

جو اپنے خیال میں ان سے راز میں نہیں سمجھی گئیں دوسروں تک پہنچاتے رہے۔ دورہ کی اس جماعت کے حالات پر جو قلبی چوٹ لگی ہے وہ آج دس برس تک بھی فراموش نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ اس ناکارہ کو اس جماعت کے ساتھ بہت ہی تمنائیں وابستہ تھیں:

وہ محروم تمنا کیوں نہ سوئے آسماں دیکھے
کہ جو منزل بہ منزل اپنی محنت رائیگاں دیکھے

زیادہ رنج اس بات کا ہوا کہ کذب، فریب، جھوٹی قسموں میں بھی ان لوگوں نے کوئی باک نہیں کیا، اس ہفتہ میں شاخ مقفل رہی، ان لوگوں نے مولانا عبدالحفیظ صاحب پشاوری مرحوم مدرس شاخ کو بار بار بلایا اور ہر دفعہ میں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ہمارے لیڈر نے منع کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ مولانا وقار صاحب مدرس اور مولانا عبدالحفیظ صاحب کو دو قاصد بھیج کر بلایا گیا۔ یہ دونوں حضرات پہنچے تو یہ کہہ کر کیواڑ کھولنے سے انکار کر دیا کہ ہم نے نہیں بلایا۔ جناب الحاج شاہ مسعود صاحب رئیس بہٹ سرپرست مدرسہ کے پاس یہ خود گئے کہ آپ سرپرست ہیں، آپ ہماری مدد کریں۔ انہوں نے کہا کہ کل دن میں آؤں گا اور دن میں جب وہ پہنچے تو باوجود بلانے کے ان کے لیے بھی کیواڑ نہیں کھولے۔

۱۲ ربیع الثانی کو جب شاخ کے کیواڑ کھلے اور چودہ طلبہ کا اخراج ہوا، جس کا اوپر ذکر آیا، تو شاہ صاحب کو اللہ جزائے خیر دے وہ ان چودہ کو بہٹ ہاؤس اپنے مکان میں یہ کہہ کر لے گئے کہ تم میرے یہاں ٹھہرو۔ میں ایک دو دن میں مدرسہ سے تمہاری معافی کرا کر اخراج واپس کرا دوں گا، مگر اصل مئی فساد نہ آئے، لیکن یہ لوگ اس کو بھی اپنے ساتھ لے گئے، شاہ صاحب نے بہت زیادہ اہتمام ان کے کھانے کا کیا۔ مگر ان ناقدروں نے ان کے باورچی کے ساتھ بھی ہر وقت جنگ و جدل رکھا۔ مظاہر کے طلبہ بھی وہاں ہر وقت مسلط رہتے تھے۔

شاہ صاحب نے تنگ آ کر چند روز بعد ان کی مہمانی سے معذرت کر دی، مگر انہوں نے شاہ صاحب کے مکان سے جانے سے انکار کر دیا، سڑک پر سے گزرتے ہوئے جب لوگ شاہ صاحب کے ملازمین سے پوچھتے کہ یہ شاہ صاحب کے مکان میں کیا ہنگامہ ہو رہا ہے تو ان کے ملازمین کہتے کہ چند مولویوں کو شاہ صاحب نے مہمان بنا لیا تھا وہ اب جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اس وقت اللہ کی وہ کھلی مددیں ہوئیں کہ ان کی تفصیل تو بہت ہی زیادہ لمبی ہے اور میرے کاغذات میں سب محفوظ ہے، یہاں تفاصیل کا موقع نہیں۔

سب سے بڑا احسان حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ہے کہ ہنگامہ کی خبر سننے کے بعد تقریباً فرو ہونے تک گویا سہارنپور ہی میں رہے۔ ایک دو دن کے واسطے نظام الدین

تشریف لے جاتے۔ ہنگامہ کے شروع ہی میں انہوں نے اپنی ایک تبلیغی جماعت کو علی التبادل دار الطلبہ جدید کی مسجد میں مستقل ٹھہرادیا جو ذکر و تلاوت اور ادعیہ میں مصروف رہتے اور چونکہ مولانا کا بھی قیام اس زمانہ میں زیادہ یہیں رہا، اس لیے کلکتہ، بہار، مدراس اور مختلف اضلاع و صوبہ جات کی جو جماعتیں نظام الدین آتیں وہ بھی مولانا کے وہاں ہونے کی وجہ سے یہاں آتی رہیں اور ہر صوبہ والے اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطاء فرمائے اپنے اپنے صوبہ کے طلبہ کو بہت ہی سمجھاتے رہے، مگر ان پر اصلاح کا وہ جذبہ غالب تھا کہ اپنے صوبہ کے بڑوں کا بھی احترام نہ کیا۔

اہلِ کلکتہ جناب الحاج غلام رسول صاحب وغیرہ ۳۰ ربیع الثانی کی شب میں کلکتہ کی بڑی جماعت کے ساتھ سہارنپور پہنچے دراصل تو نظام الدین آئے تھے مگر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کو سہارنپور بھیج دیا کہ بنگالی طلبہ کو سمجھائیں۔ حاجی صاحب کا قیام ہفتہ عشرہ رہا، ان کے رفقاء واپس جاتے رہے اور دیگر اہلِ کلکتہ آتے رہے حاجی صاحب نے بھی بہت کوشش کی ان سورماؤں کو سمجھانے کی مگر ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم حلف اٹھا چکے ہیں کہ صدر اور ناظم صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔ حالانکہ یہ مدرسہ کے داخلہ فارم پر جو شرائط داخلہ لکھی گئی ہیں، اس میں نمبر ۱۲ یہ ہے کہ تم قیام مدرسے کے زمانہ میں کسی انجمن یا جماعت بنانے یا اس میں شریک ہونے اور کسی قسم کا رسالہ وغیرہ نکالنے کے ہرگز مجاز نہ ہوگے اور اس فارم پر ان کا حلفیہ بیان اور تصدیق کے دستخط ہوتے ہیں، مگر مدرسہ کا حلف تو ان کے نزدیک نا قابلِ اعتبار تھا۔

کلکتہ کے بعض لوگوں نے مجھ سے خود بیان کیا کہ کئی سال ہوئے، شاہی مسجد مرادآباد میں ایک اسٹرائیک ہوتی تھی، وہاں کے طلبہ نے ہم لوگوں کو اپنی مظلومیت کی جو داستانیں لکھیں اور ہمارے یہاں کے اخبارات میں شائع ہوئیں اس کی بناء پر ہم لوگوں نے مظلوم طلبہ کی بہت ہی حمایت اور مدد کی، ان کے اصرار پر مدرسہ کا چندہ بند کرانے کی بہت کوشش کی۔ مگر جو مناظر ہم کئی روز سے یہاں دیکھ رہے ہیں اس سے تو بہت رنج ہوا اور اپنی ناپاک حرکت پر بہت ہی ندامت ہے۔ اب واپس جا کر مدرسہ شاہی کو ہماری کوششوں سے جو نقصان پہنچا ہے، اس کی بہتر تلافی کریں گے۔ بہار کی ایک جماعت نے مجھ سے کہا کہ بہار کے اخبارات میں تو یہاں کے متعلق جو واقعات ہم پڑھ کر آئے ہیں اور فلاں فلاں طلبہ کے دستخطوں سے شائع ہوئے ہیں، یہاں آ کر تو بالکل ہی ضد دیکھی۔

مولانا الحاج اسعد مدنی کو بھی اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائے کہ وہ بھی بار بار اس ہنگامے کے دوران دو تین گھنٹے کے لیے اکثر آتے رہتے تھے۔ ان سورماؤں کے رکنِ اعظم چونکہ حضرت شیخ

الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے عقیدت کا بھی دم بھرتے تھے۔ اس لیے مولانا اسعد صاحب نے اور حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے متعدد اعزہ نے ان کو بار بار سمجھایا مگر وہ تو اس وقت اسلام اور دین اور علم کی کوشش میں منہمک تھے، ان پر حضرت شیخ الاسلام یا ان کے اخلاف کیا اثر ہوتا۔

۱۹ ربیع الثانی کو لکھنؤ سے واپسی پر مولانا اسعد صاحب کے ساتھ مولانا عبدالرحیم صاحب صدر مدرس مدرسہ دھامپور بھی آئے تھے جنہیں دیوبند جانا تھا مگر مولانا اسعد صاحب نے ان سے کہا کہ ان میں آپ کے بھی تو شاگرد جو دھامپور سے پڑھ کر آئے ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ کئی ہیں۔ مولانا اسعد صاحب نے ان کا دیوبند جانا ملتوی کر دیا۔ جس کو مولانا عبدالرحیم صاحب نے بھی بہت ضروری سمجھا اور کئی دن یہاں قیام کر کے اپنے شاگردانِ رشید کو بہت سمجھایا، مگر اس وقت ان کے افہام اپنے سب اکابر سے اونچے پہنچے ہوئے تھے۔

مولانا محمد قاسم صاحب شاہجہان پوری نائب ناظم جمعیۃ علماء یوپی ۲۸ ربیع الثانی کو مظفرنگر میں تعلیمی کانفرنس کے افتتاح کے لیے شب میں تشریف لائے۔ اشتہارات میں اخبارات میں ان کا افتتاح شائع بھی ہو چکا تھا مگر جب سہارنپور کے اسٹیشن پر ان کو مظاہر کے ہنگامہ کا حال معلوم ہوا تو اس ناکارہ پر احسان فرمایا اور اپنا مظفرنگر کا سفر ملتوی فرما کر مدرسہ تشریف لے آئے۔ ایک ہفتہ تک یہاں قیام کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر عطاء فرمائے کہ انہوں نے اپنے بہت ضروری کاموں کا حرج بھی کیا۔

۳۰ ربیع الثانی کی صبح کو حضرت ناظم صاحب کا قاصد پہنچا جب کہ یہ ناکارہ مہمانوں کو چائے پلا رہا تھا کہ طلبہ نے دارالطلبہ کے دونوں زینوں پر ہجوم کر رکھا ہے، دربان کو گھنٹہ بجانے سے منع کر دیا۔ میں نے قاصد سے کہا کہ میں حاضر ہو رہا ہوں، خود ہی گھنٹہ بجادوں گا آپ فکر نہ کریں۔ مگر مولانا محمد قاسم صاحب نے پیش قدمی کی اور اپنی پیالی نہایت عجلت سے پوری کر کے دارالطلبہ جا کر خود گھنٹہ بجایا۔ بعض سورماؤں نے ان سے بھی مزاحمت شروع کی مگر ان کی اکثریت نے شدت سے مخالفت کی کہ ان کو نہ چھیڑو۔ مولانا نے جا کر گھنٹہ بجایا، پیچھے پیچھے یہ ناکارہ بھی پہنچ گیا اور مدرسین حضرات سے درخواست کی کہ اسباق کے لیے درس گاہوں کا ہونا ضروری ہے نہ کہ چٹائیوں اور بوریوں کا، زمین پر بیٹھو اور اسباق شروع کراؤ۔

مدرسین حضرات کو اللہ جزائے خیر دے کہ انہوں نے بلا تامل زمین پر بیٹھ کر اسباق شروع کرادیئے۔ مولانا امیر احمد صاحب صدر مدرسہ مرحوم نے دارالطلبہ کے بیچ میں چبوترے پر بیٹھ کر سبق شروع کرایا، مگر ایک طالب علم نے اپنے حجرہ سے جا کر فوراً دوتہی لا کر بچھادی، اس پر دوسرے مدرسین حضرات کے نیچے بھی طلبہ نے اپنے اپنے کپڑے بچھادیئے اور اسباق شروع ہو گئے۔ ایک

گھنٹہ کا بھی سبق ضائع نہیں ہوا۔ اسی لیے میں اس اسٹرائیک کو ناکام اسٹرائیک لکھا کرتا ہوں۔

ابتداء میں تو ہر جماعت میں نصف سے زائد تھے، مگر سبق شروع ہونے کے بعد چند سورماؤں کے سواخواستہ یا نخواستہ سبھی اسباق میں شریک ہوئے۔ اسی دوران میں جناب الحاج ابراہیم اسحاق ممباسہ افریقی نظام الدین آئے تھے اور مولانا یوسف صاحب کے ارشاد پر فورا سہارنپور آئے اور عشاء کے وقت پہنچے۔ انہوں نے کھانے کے دوران مجھ سے فرمایا کہ میرے جواہرلال سے بہت خصوصی تعلقات ہیں۔ اگر تو اجازت دے تو میں ابھی رات کی گاڑی سے دلی واپس جاؤں اور یہاں کے حکام کے نام وزیراعظم کا حکم بلا تردد لاسکتا ہوں کہ ان سب شورش پسند مفسدوں کو شہر بدر کردیا جائے۔

میں نے شدت سے منع کردیا کہ میں تو یہاں کے حکام تک بھی ان کے خلاف کوئی چیز پہنچانا نہیں چاہتا۔ گویا لوگ ہماری جھوٹی شکایتیں حکام تک بلکہ لکھنؤ تک بھیج رہے ہیں۔ اسی پر حاجی صاحب نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں ان کے صدر سے بات کرلوں۔ میں نے کہا بڑے شوق سے۔ میں نے اسی وقت ایک آدمی اعلیٰ حضرت صدر صاحب کی خدمت اقدس میں بھیجا کہ میرے ایک معزز مہمان فلاں صاحب افریقہ سے آئے ہیں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ مدرسے کے مہمان خانہ میں تم ان سے آکر مل لو۔ انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا:

''ہمیں کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں، جس کو ملنا ہو ہم سے یہاں آکر مل جائے۔

مجھے تو اس جواب کی ندامت شرمندگی آج تک ہے۔ مگر حاجی صاحب کو اللہ بہت بلند درجہ عطاء فرمائے، انہوں نے فرمایا کہ صحیح ہے کہ ملنے کی غرض تو ہماری ہے میں وہیں جاکر ان سے ملوں گا۔ میں نے مدرسہ کے ایک منشی کے ساتھ ان کو دارالطلبہ بھیج دیا۔ جو ان کے صدر صاحب کے حجرہ تک پہنچادے۔ حاجی صاحب تشریف لے گئے۔

انہوں نے حجرہ ہی میں بیٹھے ہوئے صدر صاحب سے کہا کہ ہم آپ سے تنہا گفتگو کرسکتے ہیں، مدرسے کا کوئی آدمی ساتھ نہ ہو، صدر صاحب نے منشی کو واپس کردیا اور تنہا ان سے گفتگو کی۔ حاجی صاحب نے ان سے اسٹرائیک کی وجوہ پوچھیں، جس کو انہوں نے اپنے زعم میں بہت ہی مدلل بیان کیا۔ حاجی صاحب نے پوچھا کہ آپ لوگ مدرسہ میں کتنی فیس داخل کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مدرسہ میں فیس نہیں ہوا کرتی۔

سوال: آپ لوگ فارغ ہونے کے بعد مدرسہ کی کیا خدمت کرتے ہیں؟

جواب: کوئی متعین نہیں، جس کو جو توفیق ہو۔

سوال: آپ لوگ کھانے کا اپنے خود انتظام کرتے ہیں یا مدرسہ میں قیمت داخل کرتے ہیں؟

جواب: ہمارا کھانا مدرسہ کی طرف سے مفت ملتا ہے، وغیرہ وغیرہ چند سوال جواب ہوئے۔

حاجی صاحب نے ان سے کہا کہ ہم لوگوں کو مزدوروں کی اسٹرائیک سے بہت سابقے پڑتے ہیں اور خوب پڑتے ہیں۔ ان کے مطالبہ کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ محنت ہم کرتے ہیں، کماتے ہم ہیں اور ہماری کمائی میں سے ہم کو حصہ محنت سے کم ملتا ہے۔ آپ لوگ نہ مدرسہ کی کوئی مدد کرتے ہیں نہ کما کر اس کو کچھ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف مدرسہ آپ کو مفت کھانا دیتا ہے، مفت کتابیں دیتا ہے، مفت کپڑا دیتا ہے۔ پھر آپ کا کیا زور ہے کہ آپ اسٹرائیک کریں۔

تین گھنٹے تک حاجی صاحب ان کو سمجھاتے رہے مگر اخلاص کے جذبہ نے حاجی صاحب کی کوئی بات قبول نہ ہونے دی۔ بالآخر مجبور ہو کر ۲ جمادی الاولیٰ کو رؤس المفسدین چھ طلبہ کے اخراج کا اعلان مدرسہ کے بورڈ پر چسپاں کیا گیا۔ اس پر ان لوگوں نے لکھ دیا کہ یہ اخراج غیر قانونی ہے۔ لہذا نا قابلِ تسلیم ہے۔ اس پر جناب الحاج مولوی ظہور الحق صاحب بیرسٹر سہارنپور سے مشورہ کیا گیا۔ انہوں نے اسی مضمون کو قانونی الفاظ میں لکھ کر دیا، جس کو چسپاں کیا گیا۔ اس پر ۴ جمادی الاولیٰ کو ان چھ طلبہ کا اخراج کیا گیا۔ جس پر ان کے حامیوں نے از خود کتابیں داخل کرنا شروع کیں، جو بطیب خاطر قبول کر لی گئیں اور شام تک خارجین کی تعداد ساٹھ تک پہنچ گئی۔ جب انہوں نے اپنی مغلوبیت دیکھی تو شہر کے ایک لیڈر کی خوشامد درآمد کر کے کلکٹر صاحب اور ایس پی کی خدمت میں اس کی کوشش کی کہ اخراج واپس ہو جائے۔

سہارنپور کے جج صاحب جو حضرت ناظم صاحب کے خاص معتقدین میں تھے اور ان ہی کی وجہ سے اس ناکارہ سے بھی کبھی کبھی ملاقات کر لیا کرتے تھے۔ ان تک لیڈر صاحب مذکور کی معرفت پر پہنچا کہ زکریا یہ کہتا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں جج صاحب کے مشورہ سے کر رہے ہیں اور اسی قسم کی ایک درخواست لکھنؤ بھی بھیج دی۔ جس پر جج صاحب کو جتنا بھی رنج ہم لوگوں سے ہو قرین قیاس اور ضرور ہونا چاہیے تھا۔ چونکہ حکام سے یہ ہنگامہ واقعہ سے بھی زیادہ بھیانک صورت میں پہنچایا جا رہا تھا۔ اس لیے شہر کے چار حلقوں کے چار تھانیداروں کو باخبر اور متنبہ رہنے کی ہدایت تھی۔ وہ غریب بار بار دن میں اور رات میں کئی کئی دفعہ آتے، حالات کی تحقیق کرتے۔ ان کو یہ باور کرایا گیا کہ یہ درحقیقت زکریا کی اور ناظم صاحب کے اقتدار کی جنگ ہے۔ زکریا چاہتا ہے کہ ناظم صاحب کو نظامت سے ہٹا کر اپنے سمدھی جناب الحاج محمد ایوب صاحب کو ناظم بنایا جائے۔ یہ سب داروغہ بہت ہی حیرت میں تھے کہ ہم جب ناظم صاحب سے کسی بات کو پوچھتے ہیں، ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ اتنے شیخ سے مشورہ نہ کر لوں کوئی جواب نہیں دے سکتا اور زکریا سے جب وہ گفتگو کرتے تو اس کا یہ جواب ہوتا تھا کہ

میں اتنے ناظم صاحب سے بات نہ کرلوں اتنے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بعض تھانیداروں نے مجھ سے خود بیان کا کہ طلبہ کی بات کا ہم یقین نہ کرتے مگر آپ کے مدرسہ کے بعض ذمہ داروں نے ہم سے یہ بات کہی ہے۔ میں نے زور سے اس کی تردید کی آپ کو میرے اور ناظم صاحب کے تعلقات کا خود ہی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ حیرت اس پر ہو رہی ہے کہ ہم آنکھوں سے تو یہ مشاہدہ کر رہے ہیں اور روایات یہ سن رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ناظم سے بھی یہ اشکال کیا۔ ناظم صاحب نے جواب دیا کہ میں تو شیخ ہی کے حکم پر اس مصیبت کو بھگت رہا ہوں۔ اگر وہ کسی دوسرے کو تجویز کرنا چاہیں تو میں بڑے شوق سے استعفیٰ دوں گا اور ہر نوع سے نئے ناظم کی اعانت کروں گا۔ اسی دوران میں حضرت ناظم صاحب میرے پاس آئے کہ محلّہ کے فلاں فلاں نے ہمارے سامنے یہ کہا ہے کہ یہ صرف اقتدار کی لڑائی ہے، ان کا اصرار ہے کہ ان صاحب کو بلا کر ہمارے سامنے حلف اٹھوا دیں کہ انہوں نے یہ نہیں کہا ہے ورنہ ان کو مدرسہ سے فوراً علیحدہ کیا جائے وہ فساد پھیلا رہے ہیں۔ ناظم صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ وہ سب مدرسہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، اگر آپ مشورے دیں تو میں ان صاحب کو ان سب کے سامنے بلا کر دریافت کروں۔ میں نے عرض کیا بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔ آپ ان حضرات کا شکریہ ادا کیجئے کہ انہوں نے ہماری مدد کی اور ان سے کہہ دیجئے کہ آئندہ بھی اس قسم کی کوئی بات آپ کے علم میں آئے تو ناظم صاحب کو مطلع کر دیجئے اور ہم آپس میں مشورہ کے بعد اس کا تدارک کریں گے۔

قصہ کہاں سے کہاں چلا گیا۔ مجھے تو صرف یہ کہنا تھا کہ تین شخصوں کے گھمنڈ اور پندار نے جن میں سب سے زیادہ اس سیہ کار کا غرور و پندار تھا یہ ہنگامہ پیدا کیا اور جب اس کی سمیت نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہوئے حنین میں اپنی مضرت دکھلائی اور یمامہ کی لڑائی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ کہنا پڑا کہ یہ ساری مشقت میرے ایک جملہ کی وجہ سے تھی، جو میری زبان سے نکل گیا تھا، تو ما و شما کا شمار ہی کیا۔ اس سے بچنے کی بہت ضرورت ہے کہ بڑی نقصان دہ ہے۔

اسی اسٹرائیک کے واقعہ کے ذیل میں ''تحدیث بالنعمۃ'' کے طور پر مجھے خیال آیا کہ اپنے حج کے اسفار کا تذکرہ بھی اسی موقع پر کروں کہ میرے مسلسل اسفار حجاز کا سلسلہ اسی اسٹرائیک کے بعد ایسا شروع ہوا کہ تلافی مافات ہوگئی:

عدو شرے بر انگیزد کہ خیر ما دراں باشد

ناکارہ کا سفر حج ۹۰ھ

مظاہر کی اس اسٹرائیک کے بعد میرے مسلسل سفر حجاز حج وعمرہ ہوتے رہے جن کی تفصیل آپ بیتی نمبر ۴ میں گزر چکی ہے۔ وہ رسالہ چونکہ ۹۰ھ میں طبع ہوگیا تھا اور اس میں آخری سفر حج ۸۹ھ کی تفصیل آئی تھی۔ دو سال سے احباب کا شدید اصرار تھا کہ اس کے بعد کا سفر لکھواؤں، جس کا کوئی جوڑ تو اب تک سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مگر اس سیہ کار کے اسفار حج کا سلسلہ اسٹرائیک ہی کے بعد سے اللہ کے فضل سے شروع ہوا۔ اس لیے اس کے بعد کے سفر حج کا ذکر بھی متبعاً ذکر کر دینا یہیں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آپ بیتی نمبر ۴ میں لکھ چکا ہوں کہ ذی الحجہ ۸۸ھ کے سفر حج میں یہ ناکارہ مولانا انعام الحسن صاحب کے ساتھ بوجوہ حاضر نہیں ہوسکا تھا۔ لیکن اس سال مکہ مکرمہ میں بہت ہی طوفانی بارش کہ حرم کعبہ کے دروازہ تک پانی پہنچ گیا اور کاریں اتنی کثرت سے بہیں کہ حد وحساب نہیں اور اموات بھی کثرت سے ہوئیں۔ نہ معلوم کس جذبہ کے تحت علی میاں نے جو مولوی انعام الحسن صاحب کے ساتھ حج کے موقع پر جانے کے حامیوں میں تھے، بہت ہی شدت سے اس وقت حجاز جلد حاضری کا اصرار کیا اور ان کے شدید اصرار پر جیسا کہ آپ بیتی نمبر ۴ میں تفصیل سے گزر چکا ہے کہ ۵ صفر ۸۹ھ مطابق ۱۵ دسمبر کو مدینہ پاک سے بہ نیت ہند واپسی ہوئی۔ ۲۱ دسمبر یکشنبہ کو مکہ سے جدہ اور ۱۱ شوال ۸۹ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۶۹ء کو جدہ سے کراچی پہنچے اور وہاں ڈھڈیاں، سرگودھا، لائل پور کے اسفار کے بعد ۱۰ ذیقعدہ ۸۹ھ مطابق ۱۹ جنوری ۷۰ء دوشنبہ کو کراچی سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹے میں دہلی پہنچ گئے۔ بہت ہی بڑا مجمع دہلی میں مطار پر تھا مگر حضرت نظام الدین بھوپال کے اجتماع میں گئے ہوئے تھے۔

جناب الحاج بھائی محمد شفیع صاحب نے مطار ہی پر مولانا انعام صاحب اور مولانا عمران خاں صاحب کا پیغام پہنچایا کہ میں طیارہ سے یا فرسٹ کلاس سے بھوپال روانہ ہوجاؤں۔ میرا بھی حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت کی وجہ سے بہت ہی جی چاہ رہا تھا، مگر ہجوم بہار، بنگال، بمبئی کلکتہ، علی میاں، مولانا منظور نے بھی اس ناکارہ کی وجہ سے بھوپال کے اجتماع کی شرکت ملتوی کر رکھی تھی، اس لیے نہ جاسکے۔ بہت افسوس کے ساتھ ٹیلیفون سے معذرت کرادی۔

اسی وقت مولانا انعام صاحب نے اطلاع دی کہ میں بذریعہ طیارہ واپس آرہا ہوں۔ اس لیے نظام الدین میں قیام کرنا پڑا اور ۱۳ ذیقعدہ مطابق ۲۲ جنوری پنجشنبہ کو نظام الدین سے چل کر

سہارنپور پہنچنا ہوا۔ سب ہی کو حیرت رہی اور خود مجھے بھی کہ گزشتہ سال حج کے موقع پر مولانا انعام صاحب کے ساتھ حاضری نہ ہو سکی اور حاضری ہوئی تو حج کے بعد اور واپسی ہوئی ذیقعدہ میں عین حج کے وقت نہ تو حجازی دوستوں میں سے کسی کی سمجھ میں آیا نہ ہندی پاکی اور خود میری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے بعد احباب حرمین کے اصرار تو ہر وقت موقع حج پر ہوتے رہتے ہیں، غیر موقع حج میں بھی۔ مگر:

قدم یہ اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں

چونکہ ۸۸ھ کے سفر حج میں یہ ناکارہ مولانا انعام الحسن صاحب کے ساتھ نہیں تھا اور اس پر اہل حجاز پاکی اور غیر ملکی احباب کو بہت رنج وقلق ہوا جس کا بھی دوستوں نے مولانا انعام صاحب سے اظہار کیا اس لیے (حج ۹۰ھ) کے سفر میں اس سیہ کار کا جانا گویا ۸۸ھ ہی سے طے شدہ تھا۔ مگر اس سال کے سفر میں نظام الدین میں بہت زیادہ بے ترتیبی اور گڑبڑ رہی۔ تاریخوں میں کئی مرتبہ ناسخ منسوخ ہوتا رہا۔ آخری تجویز یہ قرار پائی کہ زکریا ۲۳ جنوری ۷۱ء کو سہارنپور سے روانہ ہوئے اور ۲۵ کو دہلی سے بمبئی حضرات دہلوی کے ساتھ روانگی ہوئی اور ۲۹ ذیقعدہ ۹۰ھ مطابق ۲۷ جنوری ۷۱ء کو بمبئی سے جدہ کے لیے روانگی ہوئی۔ مگر جناب الحاج محمد یعقوب صاحب کا برقیہ پہنچا کہ سفر ایک ہفتہ مقدم ہو گیا۔ لہٰذا انہایت عجلت میں سفر کے نظامات متغیر کرنے پڑے۔

۱۵ ذیقعدہ ۹۰ھ مطابق ۱۳ جنوری ۷۱ء، بدھ کو نظام الدین کی مستورات عزیزان مولوی اظہار و ہارون، زبیر سلمہم کے ہمراہ دو کاروں میں ایک حاجی شفیع صاحب کی، دوسری بھائی کرامت کی سہارنپور پہنچے اور مولانا انعام الحسن صاحب کا یہ پیام کہ تو اپنی آمد کے لیے دونوں رکھنی چاہے تو دونوں رکھ لے اور ایک رکھنی چاہے تو بھائی کرامت کا ڈرائیور اس سے پہلے کبھی ان اسفار میں زکریا کے ساتھ نہیں رہا، راستوں سے واقف نہیں تھا۔ اس لیے بھائی شفیع صاحب کی گاڑی اپنے لیے روک لی اور کرامت کی گاڑی میں بھائی اکرام مرحوم عزیزان ہارون زبیر وغیرہ نظام الدین روانہ ہو گئے اور زکریا پنجشنبہ ۱۶ ذیقعدہ ۹۰ھ مطابق ۱۴ جنوری گنگوہ اور وہاں سے دس بجے سیدھے رائپور حاضر ہوا اور بعد عصر رائپور سے واپسی ہوئی۔ جناب الحاج حافظ عبدالعزیز صاحب گم تھلوی پہلے سے رائپور شریف تشریف رکھتے تھے۔ ایک دن قبل لودھی پور جا چکے تھے۔ تجویز تو یہ تھی کہ وہ جمعرات کے دن دوپہر تک تشریف لے آئیں گے۔ مگر واپسی نہ ہوئی۔

۱۸ ذیقعدہ مطابق ۱۶ جنوری کو براہِ دیوبند سوا چھ بجے سہارنپور سے چل کر سات بجے دیوبند اور دس بجے وہاں سے اٹھ کر پونے بارہ بجے میرٹھ حضرت میرٹھی کے مزار پر گزرتے ہوئے ۱۲ بجے ننھے خان کے مکان پر پہنچے۔ رفقاء نے وہاں کھانا کھایا، زکریا نے وہاں مردوں اور عورتوں کو بیعت

کر کے سوا بجے وہاں سے چل کر چند منٹ حاجی شفیع صاحب کے کوکا کولا کے کارخانہ پر ٹھہرتے ہوئے تین بجے نظام الدین پہنچے۔

۱۸ جنوری کو ۹ بجے دہلی سے طیارہ کی پرواز کی اطلاع تھی۔ اس لیے صبح آٹھ بجے بھائی کرامت کی گاڑی میں کہ انہوں نے اپنی گاڑی کے لیے پہلے سے طیارہ تک لے جانے کی اجازت لے رکھی تھی سوار ہو کر مطار کے اندر کے حصہ میں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بمبئی جانے والا طیارہ تو ابھی تک دہلی نہیں پہنچا کلکتہ کھڑا ہے۔ اس لیے زکریا اپنی کار میں رہا اور مولانا انعام صاحب نے کار سے باہر کھڑے ہو کر دعاء کرائی۔

علی میاں اور مولانا محمد منظور صاحب حاجی شفیع صاحب کی کار میں پہلے سے مطار کے اندر پہنچ چکے تھے اس لیے اطمینان تھا کہ وہ تو طیارہ تک پہنچ ہی جائیں گے۔ مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ صرف کاریں جو ہیں وہی جا سکتے ہیں۔ اسی لیے مولوی انعام صاحب نے کار میں ایسے لوگوں کو تجویز کیا جو آگے جانے والے نہ ہوں اور خود مع زبیر ہارون وغیرہ کے کار سے اتر گئے اور کار میں صرف سلمان، شاہد زکریا کے ساتھ طیارہ تک پہنچے۔ علی میاں وغیرہ سے الوداعی ملاقات نہ ہونے سے بہت قلق ہوا کہ پہلے سے اطمینان تھا کہ طیارہ پر الوداع ہوگی۔ مگر زکریا کی کار کے طیارہ پر پہنچنے پر یہ معلوم ہوا کہ جانے والوں کے علاوہ بجز سلمان، شاہد کے یہ اٹھانے والوں میں تھے اور کسی کو طیارہ تک آنے نہیں دیا۔

طیارہ ایک گھنٹہ لیٹ ہونے کی وجہ سے سوا دس بجے چل کر ۱۲ بجے بمبئی پہنچا، وہاں طیارہ کی کرسی پر زکریا باہر گیا اور عزیزان ابوالحسن زبیر میرے ساتھ رہے، بقیہ سب احباب معروف راستہ سے کسٹم میں ہو کر آئے، مطار پر بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں، مولوی انعام صاحب نے اول بڑی طویل دعاء کرائی، اس کے بعد بھائی عبدالکریم ماہیم والوں کی گاڑی میں زکریا ابوالحسن طلحہ کو ان کے گھر بھیج دیا اور مولانا انعام الحسن صاحب مع بقیہ رفقاء کے بہت دیر میں پہنچے۔ عزیزان ابوالحسن اور طلحہ بمبئی تک پہنچانے کے لیے گئے تھے۔ آئندہ سفر میں دونوں ساتھ نہیں تھے۔

جناب الحاج مفتی محمود حسن صاحب بھی اس سال بعض احباب کے اصرار پر بذریعہ طیارہ حج کو جا رہے تھے اور ہم سے ایک ہفتہ قبل بمبئی پہنچ چکے تھے اور وہ دن مفتی صاحب کی روانگی کا تھا۔ چنانچہ وہ حسب قرار داد عصر کے وقت احرام باندھ کر ہم سے رخصت ہو کر مطار پہنچے۔ رات کو ساڑھے دس بجے مطار سے ان کا ٹیلیفون پہنچا کہ جہاز جدہ سے نہیں آیا۔

منگل ۱۹ جنوری کو صبح کو مفتی صاحب احرام کی حالت میں ہمارے مستقر پر پہنچے اور یہ خبر لائے کہ جدہ کا جہاز جو حجاج کو لے جانے والا تھا وہ رات نہیں پہنچا اور ۱۸ جنوری دوشنبہ کی صبح جو بمبئی سے

جدہ گیا تھا وہ جدہ پر روک دیا گیا اور واپس نہیں آیا۔ اس لیے سارے ہندوستان کی طرح سے بمبئی بھی لڑاکا شہر قرار دے دیا تھا۔ پہلے سے بمبئی مستثنیٰ تھا۔ اس دن اور بدھ کے دن بلکہ جمعرات جمعہ کو بھی کوئی طیارہ حاجیوں کا بمبئی سے نہیں چلا۔

جناب الحاج بھائی یونس سلیم صاحب بھی کسی سرکاری ضرورت سے اور ہم لوگوں سے ملاقات کی وجہ سے دہلی سے بمبئی پہنچ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ انہوں نے ہماری اور سارے جہازوں کی روانگی کے سلسلہ میں بہت ہی جدوجہد کی۔ نیز بمبئی کے حج کمیٹی والوں نے اور سفیر ہند مقیم جدہ نے بھی بہت ہی سعی کی۔ امیر فیصل صاحب سے بار بار ٹیلیفون پر گفتگو کرتے رہے۔

جمعرات کی صبح کو یونس صاحب یہ مژدہ لے کر آئے قرنطینہ یہاں ہوگیا اور جمعہ سے بمبئی سے طیاروں کی روانگی شروع ہو جائے گی، یونس سلیم صاحب کی بہت کوشش سے زکریا مولوی انعام اور ایک رفیق صرف تین ٹکٹوں کی اجازت ہوئی اس لیے کہ مفتی صاحب والا جہاز جو کئی دن سے کھڑا تھا اس کی سواریاں مقدم تھیں مگر مولانا الحاج انعام الحسن صاحب نے پنجشنبہ کی شب میں کراچی ٹیلیفون کرایا تھا کہ یہاں سے جدہ جہازوں کی پرواز بند ہے۔ کوئی صورت ایسی نہیں ہو سکتی ہے کہ ہم کراچی کے راستہ کو جا سکیں۔

جناب الحاج محمد یعقوب صاحب بمبئی والے اور دیگر احباب بمبئی بھی اس سلسلہ میں مختلف کوششیں دن رات کرتے رہے کہ کسی دوسری کمپنی کے جہاز میں براہِ راست جدہ کے علاوہ کسی کویت وغیرہ کے راستے سے جانے کی صورت پیدا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ان دوستوں کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے۔ جناب الحاج یونس سلیم صاحب کی پیشکش پر مولوی انعام صاحب نے کہہ دیا کہ تین آدمی تو صرف زکریا کو چاہیے ہم نے کراچی ٹیلیفون کر رکھا ہے۔ شاید وہاں سے کوئی صورت سہولت کی پیدا ہو جائے۔

کراچی سے جناب الحاج پوری صاحب اور بھائی یوسف رنگ والوں کا ٹیلیفون آیا کہ تم کسی بھی جہاز میں کراچی آجاؤ۔ یہاں سے روانگی بہت آسان ہے۔ مگر چونکہ ہم لوگوں کے پاس کراچی کا ویزا نہیں تھا۔ بغیر ویزا کے محض اس اطمینان پر کہ مطار پر ویزا مل جائے گا جانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ احباب بمبئی جناب الحاج محمد یعقوب صاحب اور دیگر احباب کو اللہ جل شانہ بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ انہوں نے بمبئی سے کراچی کے لیے ویزا حاصل کر لیا۔

دو دن اہلِ بمبئی بھی دن رات جدوجہد اور گردش میں رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ ان کی مساعی جمیلہ سے یہ مسئلہ حل ہو گیا اور اتفاق کی بات کہ پنجشنبہ ۲۱ جنوری اے

ہی کو مطار سے ۱۲ بجے کے قریب ان دوستوں کا ٹیلیفون پہنچا کہ ایک افریقی جہاز دو بجے کراچی ہوتا ہوا افریقہ جا رہا ہے۔ اس میں جملہ رفقاء نو آدمیوں کے ٹکٹ لے لیے گئے ہیں۔ ساڑھے بارہ بجے تک مطار پر ضرور پہنچ جائیں۔ اس لیے انتہائی عجلت میں جو جس حال میں تھا سب چھوڑ کر سامان کچھ باندھا کچھ بھائی عبدالکریم بھائی کے مکان پر چھوڑا کہ بمبئی سے بعد میں آنے والے رفقاء میں سے کوئی لا سکے تو لا دے اور ساڑھے بارہ بجے بمبئی کے مطار پر پہنچ گئے۔ جناب الحاج یونس سلیم صاحب بھی مطار پر وقت سے پہلے پہنچ گئے اور ان کی کوشش سے بھائی عبدالکریم کی کار کو طیارہ تک جانے کی اجازت مل گئی۔ مطار پر ظہر کی نماز پڑھ کر زکریا کی کار کو طیارہ سے دور کھڑا کر دیا گیا، اس لیے کہ مطار پر ہجوم بہت بڑھتا جا رہا تھا کہ طیارہ کی پرواز کے وقت یہ کار طیارہ کے قریب پہنچا دے گی اور صرف دو آدمیوں کو زکریا کے پکڑنے کے واسطے طیارہ پر جانے کی اجازت ہوئی۔ اس لیے ابوالحسن اور طلحہ کار میں رہے اور بقیہ سب پاؤں کے راستہ سے گئے۔

سوا تین بجے جہاز بمبئی سے چلا پونے پانچ بجے کراچی پہنچے، وہاں کراچی میں چونکہ کوئی اطلاع بجز اس ٹیلیفون کے جو بمبئی سے مولانا انعام صاحب نے پوری صاحب اور بھائی یوسف رنگ والے عزیزان مولوی احسان واسرار جو اپنے والد صاحب کو رخصت کرنے کے لیے کراچی گئے ہوئے تھے باہر کھڑے تھے۔ جناب الحاج فریدالدین صاحب بھی ہمارے مطار سے باہر جانے کے بعد پہنچے، لیکن طیارہ والوں نے بمبئی کا منظر یونس سلیم صاحب اور بمبئی کے چیئرمین وغیرہ کا مطار پر ہونا دیکھ رکھا تھا اس لیے انہوں نے زکریا کو طیارہ سے اپنی کرسی پر بذریعہ لفٹ اتارا اور اپنی ہی کرسی پر کسٹم تک پہنچایا۔ وہاں یہ حضرات جو باہر کھڑے تھے مل گئے۔ حاجی فریدالدین صاحب بھی پہنچ گئے جن کی وجہ سے کسٹم میں کوئی چیز کھول کر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اتنے میں ہم باہر پہنچے بہت سی کاریں اور احباب ٹیلیفون کی اطلاع پر مطار پر جمع ہو گئے عصر کے بعد نماز کسٹم کے میدان میں پڑھی اس کے بعد کاروں میں مکی مسجد پہنچ گئے، جمعہ کے دن وہاں قیام رہا۔

شب جمعہ میں مولوی انعام مولوی عمر وغیرہ نے تقریریں کیں جس کے متعلق یہ اشکال بھی ہوا کہ موجودہ حالت میں نہیں کرنی چاہیے۔ مگر دوستوں کے اصرار پر ہو ہی گئی۔ شنبہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۹۰ھ جنوری ۱۹۷۱ء کراچی سے نو بجے طیارہ کی پرواز کی اطلاع تھی، حاجی فریدالدین صاحب کار لے کر مسجد پہنچ گئے، مگر طیارہ دس بجے وہاں سے چلا، جدہ میں جدہ کی ظہر سے ایک گھنٹہ پہلے طیارہ پہنچا۔

عزیز سعدی ماموں یامین اور جدہ اور مکہ کے مختلف احباب شب جمعہ سے جدہ کے مطار پر گشت کرتے رہے، دن رات تلاش میں رہے۔ مگر چونکہ بمبئی سے جہازوں کی بندش کی اطلاعات مل رہی تھیں اور اتنا وقت نہیں تھا کہ بمبئی سے انہیں اطلاع مل سکے یا اطلاع پہنچ نہیں سکی، اس لیے یہ

حضرات بمبئی سے آنے والے جہازوں کو دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔

ہمارا طیارہ جس وقت جدہ کے مطار پر اُتر رہا تھا اس وقت یہ سب حضرات جدہ کے مطار پر تھے مگر یہ معلوم ہو کر کہ یہ تو کراچی سے آرہا ہے یہ حضرات واپس چلے گئے، البتہ عزیز عبدالحفیظ اپنی گاڑی سمیت ایک دن پہلے جدہ کے مطار پر پڑا ہوا تھا اور ڈاکٹر اسماعیل بھی صبح سے مطار پر گھوم رہے تھے، طیارہ والوں نے اپنی کرسی پر مجھے کسٹم تک پہنچادیا، اس لیے کہ وہ بھی کراچی میں چڑھانے کا منظر دیکھ چکے تھے۔

کسٹم کے باہر سے جناب الحاج ڈاکٹر ظفیر صاحب اور بھائی اشفاق صاحب نے دیکھ لیا تھا اور بڑی مشکل اور بڑی جدوجہد سے وہ زکریا کو اس کی کرسی پر کسٹم سے باہر لے گئے، کسٹم میں ڈاکٹر اسماعیل اور بہت سے احباب مل گئے، جو مجھے عبدالحفیظ کی گاڑی میں جدہ کے مطار کی مسجد میں پہنچا گئے، وہاں بھائی یحییٰ کراچی والے مقیم مدینہ اور متعدد احباب ملے، پیشاب و وضو وغیرہ کے بعد جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی۔

ظہر کے بعد احباب جدہ نے اپنے یہاں لے جانے پر اصرار کیا اور بعض دوستوں نے ٹیکسی کر کے سیدھے مکہ جانے پر اصرار کیا مگر زکریا نے کہہ دیا کہ اتنے مولوی انعام صاحب نہ آئیں اتنے تو یہیں انتظار کرنا ہے، ظہر کے بعد مولوی انعام بھی مسجد میں پہنچ گئے، مولوی عبیداللہ، عزیز ہارون، مولوی محمد عمر وغیرہ کسٹم میں سامان کے ساتھ محبوس رہے۔

کسی شخص نے مجھے مطار کی مسجد میں دیکھ کر صولتیہ ٹیلیفون کر دیا کہ وہ سب حضرات دو روز سے جدہ کے مطار پر گھومتے رہتے تھے، مولوی عبداللہ عباس صاحب نے طیارہ تک گاڑی لے جانے کی اجازت لے رکھی تھی، صولتیہ کے اس فون پر عزیز شمیم نے سعدی کو اس وقت فون کیا، عزیز سعدی جدہ سے واپسی پر جبھی دستر خوان پر بیٹھا تھا، فون سنتے ہی مولوی عبداللہ عباس صاحب کو ساتھ لے کر ان کی گاڑی میں جدہ کے لیے روانہ ہوگئے اور پہلی چوکی پر انتظار میں رہے۔

مولوی انعام صاحب زکریا بذریعہ ٹیکسی صوفی اقبال بھائی یحییٰ ٹیکسی سے جدہ سے روانہ ہوئے اور عزیز عبدالحفیظ مع اپنی گاڑی کے کسٹم والوں کے انتظار میں مطار پر ٹھہرے رہے، مکہ کے بعد پہلی چوکی پر عزیز سعدی اور مولوی عبداللہ عباس صاحب کھڑے ہوئے تھے، زکریا نے جو جدہ ہی سے دونوں طرف دیکھتا آرہا تھا عزیز سعدی کو پہچان کر آواز دی وہاں سے عزیز سعدی ہماری ٹیکسی میں اور ہماری گاڑی میں سے بھائی یحییٰ مولوی عبداللہ عباس کی گاڑی میں منتقل ہوگئے۔

زکریا نے مولوی انعام صاحب وغیرہ کے لیے چائے تیار کرنے کا تقاضا کیا کہ حرم شریف کے عصر سے پہلے فراغ ہو جائے اور صولتیہ فون کرایا وہاں سب شدید انتظار میں تھے، قاضی

صاحب بھائی افضل شمیم وغیرہ فوراً پہنچ گئے، بھائی سلیم کا اصرار تھا کہ پہلے صولتیہ لاکر پھر حرم جایا جائے، مگر نماز میں اتنی گنجائش نہیں تھی، سعدی کے گھر سے حرم کاروں میں جاکر بعد عصر صولتیہ پہنچے، عزیز ہارون وغیرہ مغرب کی اذان تک کسٹم میں محبوس رہے، مغرب کے بعد عبدالحفیظ کی گاڑی میں مکہ مکرمہ پہنچے۔

۴ فروری کو منیٰ حاضری ہوئی اور ۵ فروری جمعہ کے دن عرفات پر حاضری ہوئی، چونکہ پاکستانی احباب کے ساتھ اس سال ان کی مستورات بھی تھیں، اس لیے وہ حضرات اپنی اپنی مستورات کے ساتھ علیحدہ گاڑیوں میں گئے اور ہم سب مکی مرزوقی کی زیر قیادت ان کی لاری میں ان کے خیمہ میں پہنچ گئے، وہاں پہنچ کر جملہ رفقاء جو مستورات کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ ہو گئے تھے، ایک جگہ مجتمع ہو گئے۔

مکی مرزوقی نے بڑی فراخدلی سے بہترین دعوت کوزی کی حسبِ معمول کی، زکریا نے اتباعاً للسنت صرف دودھ پیا، بعد مغرب وہاں سے چل کر شب کو مزدلفہ میں مزدلفہ کے منتہاء پر بہترین جگہ اللہ کے فضل سے مل گئی جو بہت وسیع اور کھلی ہوئی تھی، علی الصباح نماز پڑھ کر وہاں سے منیٰ چاشت کے وقت پہنچ گئے اور عصر کے وقت ملک عبدالحق صاحب کی گاڑی میں طوافِ زیارت کے لیے آئے، مگر راستے بند ہونے کی وجہ سے بہت چکر کاٹنا پڑا، ۱۳ ذی الحجہ کو رمی سے فراغ پر با اطمینان مکہ مکرمہ حاضری ہوئی۔

منیٰ کے قیام میں تبلیغی حلقے، تعلیمی حلقے تقریباً ہر معلم کے خیموں میں ہوتے رہے اور مسجد خیف مبلغین کا خاص مرکز رہا کہ وہاں سے جماعتیں دوسرے مقامات پر منتشر ہوتی تھیں اور مجتمع ہوتی تھی، حج کے بعد مکہ مکرمہ میں بھی تبلیغ و تعلیم کا سلسلہ اور ملک وار اجتماعات ہوتے رہے، جس مین ۱۰ فروری کو بحرین اور سارے پرانے عرب حضرات کا اجتماع ہوا، اسی دن اہلِ کویت کا اجتماع ہوا، ۱۱ فروری افریقہ و بیرونِ ممالک کا اجتماع ہوا۔

۲۱ فروری اتوار کے دن عصر کے وقت مدینہ منورہ پہنچے، اس سیہ کار کی ڈائری مکہ مکرمہ کی باوجود تلاش کے نہیں ملی، اس میں تو بہت تفاصیل تھیں، مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد سے تواریخ مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری کی ڈائری سے نقل کرائیں، ۲۵، ۲۶، ۲۷ فروری کو مدینہ طیبہ کا ماہانہ اجتماع ہوا، جو ہر مہینے مکہ، جدہ، طائف وغیرہ میں بدلتا رہتا ہے، جیسا کہ آپ بیتی نمبر ۴ میں مفصل گزر چکا۔

۱۳ مارچ کو قبا جاکر قبیل ظہر واپسی ہوئی، ۱۴ مارچ کو خیبر جانا ہوا، وہاں مسجد علی اور مسجد سوق میں تقریریں بھی ہوئیں، شام کو وہاں سے واپسی ہوئی، خیبر کے مزارات پر جو جذب و کشش سابقہ حاضری میں ہوئی تھی، جس کو آپ بیتی نمبر ۴ میں لکھوا چکا ہوں، اس کی وجہ پر بھی بہت

مختلف تبصرے ہوتے رہے۔

۱۷ تا ۱۹ مارچ مدینہ پاک میں مشورہ کا اجتماع ہوا، جس میں طائف، مکہ، جدہ، الخبر، دمام تک کے حضرات بھی شریک ہوئے، اس میں مسجد حفائر مکہ مکرمہ جو زیر تعمیر ہے کے نام پر بھی طویل گفتگو ہوئی، مگر کوئی استقلال اس وقت نہیں ہوا، ۳ اپریل ۷۱ھ شنبہ کو حاجی صالح کی کار میں مدینہ پاک سے مکہ مکرمہ کے لیے روانگی ہوئی، بعد ظہر مکہ پہنچے اپنی ظہر صولتیہ میں پڑھی کہ جدہ کا ماہانہ اجتماع ۵ تا ۷ اپریل مدینہ پاک کے اجتماع میں طے ہو چکا تھا، ۸ اپریل کو مکہ مکرمہ واپسی ہوئی، ۱۰ اپریل کو مغرب کے بعد مہاجرین کا اجتماع مدرسہ صولتیہ میں ہوا، ۱۲ اپریل کو مدرسہ صولتیہ میں اہلِ بنگال کا بہت بڑا اجتماع ہوا، ۱۲ اپریل دوشنبہ کو بعد مغرب مدرسہ صولتیہ میں بہت بڑا اجتماع ہوا، جس میں سید علوی مالکی اور سید حمزہ جعلی، الحاج رشید فارسی صاحب، شیخ غزاوی شاعر ملک وغیرہ اعیان مکہ مدعو تھے، بہت زوردار دعوت الوداعی جناب الحاج محمد سلیم صاحب کی طرف سے ہوئی اور اس میں خاص لوگوں سے تبلیغ پر مولانا انعام الحسن صاحب کی گفتگو بھی ہوئی۔

۱۳ اپریل کو جدہ اور ۱۴ اپریل کو سعودی ایئر لائن سے جدہ سے سیدھے بمبئی، تین دن بمبئی قیام کے بعد ۱۷ اپریل کو بمبئی سے بذریعہ طیارہ دہلی اس ناکارہ کا ارادہ کچھ طویل قیام کا تھا کہ اپنے امراض کی کثرت اور اعذار کی وجہ سے بار بار آنے جانے میں بڑی ہی دشواریاں ہیں، بالخصوص ٹانگوں کی معذوری کی وجہ سے مگر جدہ کے اجتماع میں جب اس ناکارہ کی آمد ہوئی تو مجھے بھائی افضل صاحب کے ذریعہ یہ روایت متعدد حضرات کی طرف سے پہنچی کہ بضرورت تبلیغ تیرا ہندوستان جلد جانا بہت ضروری ہے۔

میرے ذہن میں تو کوئی خاص ضرورت نہیں آئی، لیکن چونکہ سب ہی حضرات کا اصرار میری جلد واپسی پر تھا اس لیے میں نے کہہ دیا کہ اس وقت تو میں صرف جدہ کے اجتماع میں شرکت کے لیے آیا تھا، میرا سب سامان مدینہ پاک میں پڑا ہوا ہے اور سب سے اہم وہ کتابیں ہیں جو اس سیہ کار نے مدینہ پاک کے قیام میں اِدھر اُدھر سے جمع کر رکھی ہیں، اس لیے کہ اس سیہ کار نے بخاری شریف کے پڑھانے کے دوران میں اس کے تراجم کے متعلق عربی میں کچھ یادداشتیں لکھی تھیں۔

مدینہ پاک کے اس طویل قیام میں ان کو سننا شروع کر دیا تھا، یہ سمجھ کر کہ سہارنپور کے قیام میں تو بیگاریں بہت مسلط رہتی ہیں، مدینہ پاک کے قیام میں علاوہ فراغت کے وہاں کی برکات کا خاص طور سے اوجز کے زمانہ میں مشاہدہ کر چکا تھا کہ وہاں تین مہینے میں اتنا مسودہ ہو گیا تھا کہ سہارنپور واپس آنے پر اس کی نظر ثانی اور تبییض کئی ماہ میں ہوتی، اس لیے میں نے وقت کو غنیمت سمجھ کر اس کا سننا شروع کیا تھا اور اس کی وجہ سے مدرسہ شرعیہ سے اور دوسرے احباب سے کچھ کتابیں بھی جمع کر

رکھی تھیں، ان کی واپسی کا مجھے بہت فکر تھا، اس لیے ان حضرات کے ساتھ واپس نہ آ سکا۔

عزیزان مولوی ہارون، مولوی زبیر سلمہما کو بھی میرے ساتھ آنے کے لیے مولانا انعام صاحب چھوڑ گئے اور جناب الحاج قاضی عبدالقادر صاحب جھاوریاں پاکستانی اللہ ان کو بہت ہی بلند درجے عطاء فرمائے اپنے قرب خاص سے نوازے، اس ناکارہ کے ان طویل اسفار حجاز میں میری سرپرستی کے لیے بہت اہتمام سے میرے ساتھ رہے اور میری ہر نوع کی راحت رسانی کی ہر وقت فکر رکھتے تھے اس سفر میں بھی اپنے رفقاء اور مولانا انعام الحسن صاحب کی واپسی کے بعد اس ناکارہ کی سرپرستی کے لیے میرے ساتھ ہی ٹھہر گئے اور کراچی تک میرے ساتھ ہی آئے، اللہ تعالی ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے، درجات عالیہ نصیب فرمائے اپنے قرب خاص سے نوازے، ان کے احسانات کا دونوں جہان میں اپنی شایان شان بہترین بدلہ عطاء فرمائے۔

اس ناکارہ نے چونکہ مدینہ پاک میں طویل قیام کا ارادہ کر رکھا اور اس کے لیے عزیزم الحاج ملک عبدالحفیظ مکی اور اپنے نواسے الحاج مولوی زبیر الحسن ابن امیر التبلیغ مولانا انعام الحسن صاحب سے ''الابواب و التراجم للبخاری ''سب کی تسوید یہ ناکارہ اپنے بخاری شریف پڑھانے کے دوران میں وقتاً فوقتاً تقریباً چالیس سال تک کرتا رہا، اس کو از سر نو سننا شروع کیا اور اس کے لیے کتابیں بھی بہت جمع کر لی تھیں، مگر ان حضرات کے تقاضے پر مجھے آنا ہی پڑا، اخیر اپریل میں مدینہ پاک سے بصد حسرت واپسی ہوئی، تین چار روز مکہ مکرمہ میں قیام رہا، اس کے بعد کراچی کا ویزہ تو ہم لوگوں کے پاس نہیں تھا مگر مرور کا ویزہ تین دن کا ملا، تین دن کراچی کے قیام کے بعد ۴ جون جمعہ کو عین جمعہ کے وقت دہلی پہنچنا ہوا، اس کا بہت ہی قلق ہے کہ اس ناکارہ کی کاپی حجاز کے قیام کی اس وقت تک نہ ملی، اگر بعد میں مل جائے تو عزیزان اس سے اس قیام کی تفصیلات نقل کر دیں۔

اسی قیام میں روانگی سے تقریباً بیس یوم قبل اس ناکارہ کے قدمچہ پر سے گرنے اور پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے کا واقعہ پیش آیا، مدرسہ شرعیہ میں اس ناکارہ کا قیام تھا، وہاں قبل ظہر استنجاء کے لیے اور نماز کی تیاری کے لیے تقریباً ایک گھنٹہ قبل جانا ہوا، استنجاء پاک کرنے کے وقت دوران سر ہو کر یہ ناکارہ گرا، دوست احباب باہر پہلے ہی سے کھڑے ہوئے تھے، میرے گرنے کی آواز پر اندر آ گئے، چونکہ لنگی باندھنے کی عادت پہلے سے تھی اس لیے کشف عورت سے محفوظ رہا وہاں سے اٹھا کر دو آدمی پکڑ کر باہر لائے اور پردہ کر کے لنگی بدلی، ٹانگیں پاک کیں اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حسب معمول ظہر کی نماز کے لیے چلا گیا، نماز کے بعد سے احباب کا اصرار ہوا کہ ایکسرے لیا جائے، وہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب مدینہ پاک حاضری کے بعد سے ہی برابر مجھ پر ایکسرے کا

اصرار کر رہے تھے، اس لیے کہ اس مرتبہ مکہ مکرمہ کے قیام میں اولاً تھوک کے ساتھ اور اس کے بعد ناک سے خون نکل چکا تھا اور کئی دن مسلسل رہا تھا۔

جناب الحاج ڈاکٹر وحید الزمان صاحب اور ان ہی کی شفقت سے متعدد ڈاکٹروں کی تجویز سے متعدد دوائیں ہوئیں، جس سے وہاں تو تین دن کے بعد خون بند ہو گیا، لیکن مدینہ پاک کی حاضری کے موقع پر بدر میں پھر ناک سے خون آ گیا، اس لیے مدنی اور پاکی احباب کا بہت ہی اصرار تھا کہ میں ایکسرے کراؤں اور میں یہ کہتا رہا کہ ایسی معمولی چیزیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں، لیکن اس گرنے کی وجہ سے شفاخانہ جانا ہی پڑا اور ڈاکٹر صاحب نے پاؤں کے ساتھ سینہ پسلیاں کمر وغیرہ سب ہی چیزوں کا ایکسرے موقع غنیمت جان کر کیا، مگر اللہ کے فضل سے بدن اور کسی حصہ میں تو کوئی اثر معلوم نہیں ہوا البتہ بایاں پاؤں کی ایڑھی کی ہڈی میں شگاف آ گیا، جس کے متعلق ان ڈاکٹر صاحب کی تجویز تو یہ تھی کہ میں ایک ہفتہ قیام مدینہ پاک میں کرلوں تو یہ ہڈی جڑ جائے گی، مگر میں اپنے نظامِ سفر کی اطلاع مکہ مکرمہ، کراچی، ہندوستان کر چکا تھا اور تغیر میں بہت وقت تھی کہ مظاہرہ اور ہند کے احباب خبر سننے کے بعد دور دور سے جمع ہو جاتے، وہاں مدینہ پاک کے قیام میں نہ تو پلاسٹر کی ضرورت پیش آئی نہ کسی اور چیز کی، وہاں کے ڈاکٹر صاحب نے ایک دوا ایڑھی پر مالش کی دی تھی، دو تین وقت مالش ہوتی رہتی تھی اور وہاں کے قیام میں بلا کسی دقت کے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری بھی ہوتی رہی اور کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی تھی۔

تین دن بعد جب مکہ مکرمہ حاضری ہوئی تو ڈاکٹر وحید الزماں زادمجد ہم اور دوسرے ڈاکٹروں نے اصرار کیا کہ چونکہ سفر قریب ہے اور اس میں مرض کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، ہڈی اچھی طرح نہیں جڑی، اس لیے پلاسٹر کا لگانا نہایت ضروری ہے، ان سب احباب کی مساعی سے ایک ڈاکٹر نے اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے میری کاپی میں ان کا نام لکھا ہوا ہے، اس وقت تو مجھے یاد نہیں، مجھ سے پوچھا کہ آپ کو پلاسٹر بندھوانے میں کس وقت سہولت ہے، میں نے کہا عشاء سے دو تین گھنٹے بعد، اس لیے کہ میں عشاء کے بعد طواف کیا کرتا ہوں۔

انہوں نے بہت ہی شفقت و محبت سے عشاء سے دو گھنٹے بعد میرے مستقر عزیزم الحاج محمد سعید رحمت اللہ کاتب العدل کے مکان پر جہاں میرا قیام تھا کہ اس زمانہ میں گرمی کی شدت کی وجہ سے میرا قیام شب میں تو عزیز موصوف ہی کے مکان پر ہوتا تھا کہ وہاں بہت کھلی جگہ ہوادار اور دن کو مدرسہ صولتیہ کے دیوان اکابر میں رہتا تھا، ڈاکٹر صاحب نے آدھے گھنٹے کے اندر پلاسٹر باندھا، اس قدر نرم تھا کہ ذرا بھی اس میں کوئی چیز محسوس نہیں ہوئی، بلکہ بڑی ہی راحت محسوس ہوئی اور دو گھنٹے میں وہ اس قدر خشک ہو گیا کہ ذرا بھی نمی اس میں نہ رہی، مگر مقدر کہ دوسرے دن دوپہر کو ظہر

کے قریب پیشاب کے لیے اُٹھا اور جہاں دوسرے، بہت سے عوارض ساتھ لگے رہے ہیں، پیشاب بھی تقاضے کے بعد پھر مہلت نہیں دیتا، اتنے میں پیشاب کے لیے بیت الخلاء جو بالکل دیوان کے اندر ہے گیا تو راستہ ہی میں جو چند قدم ہے، پیشاب کے ساتھ اسہال ہو گیا، جس سے پلاسٹر بہت ہی خراب ہو گیا۔

میرے دوستوں نے نماز کے قرب کی وجہ سے اس کو کھولنا چاہا تو اتنا مضبوط کہ کلہاڑی سے بڑی دِقت سے وہ کاٹا گیا، نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ ٹیلیفون کیا، وہ اسی وقت آئے تسلی دی کہ کوئی ایسی بات نہیں، رات کو دوسرا باندھ دوں گا۔

عشاء کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تلاش میں عزیز سعدی اور مولانا عبداللہ عباس وغیرہ احباب پھرتے رہے مگر وہ کہیں چلے گئے تھے، کئی گھنٹے بعد واپس آئے تو دیر ہو گئی تھی، انہوں نے مشورہ دیا کہ پرسوں کو تو پاکستان جانا ہے وہاں بندھوالیا جائے تو زیادہ اچھا رہے گا، پاکستان چونکہ قیام دو ہی دن کا تھا اس لیے وقت نہیں ملا، دہلی پہنچنے پر احباب کا مزید اصرار ہوا بالخصوص مولانا الحاج انعام الحسن صاحب، جناب الحاج محمد شفیع صاحب، جناب الحاج بھائی کرامت صاحب وغیرہ کا کہ سہارنپور جانے سے پہلے پلاسٹر بندھنا ضروری ہے۔

یہ ناکارہ جمعہ کے دن نظام الدین پہنچا تھا، شنبہ کی دوپہر کو ایک ڈاکٹر صاحب کے شفاخانہ میں جانا ہوا، انہوں نے بہت ہی محنت سے آدھے گھنٹے میں پلاسٹر لگایا، مگر وہ دو گھنٹے تک بھی خشک نہ ہوا تو عزیز الحسن نے ہیٹر سے چار گھنٹے میں اس کو خشک کیا اور زکریا نے شکایت کی کہ مکہ مکرمہ میں تو دس منٹ میں پلاسٹر بندھ گیا تھا اور آدھ گھنٹہ میں خود بخود خشک ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ وہاں والوں کے پاس اپنی تو کوئی چیز ہی نہیں، کچھ جرمن، کچھ امریکہ، کچھ لندن سے منگاتے ہیں، ہمارے یہاں ساری چیزیں اپنی ہیں، ہم باہر سے تھوڑا ہی منگاتے ہیں، یہ جواب میرے دماغ میں آیا تو نہیں مگر احتراماً چپکا ہو گیا اور پلاسٹر کے بعد ۶ جون اتوار کو نظام الدین سے تین کاروں میں بمعیت مولانا انعام الحسن صاحب دیوبند ٹھہرتے ہوئے ظہر کے وقت سہارنپور پہنچے اور عصر کے بعد دار الطلبہ جدید میں حسب اعلان مصافحے ہوئے۔

۶ تا ۸ جون سہارنپور کا تبلیغی اجتماع تھا، اس میں شرکت کے لیے روانگی ہوئی اور ۷ جون کی صبح کو علی الصباح گنگوہ حاضری ہوئی، گیارہ بجے وہاں سے واپس ہو کر اجتماع میں شرکت ہوئی، ۹ جون کی صبح کو مولانا انعام الحسن صاحب اجتماع سے فراغ پر عبدالحفیظ دہلوی کی کار میں نظام الدین دہلی کو روانہ ہوئے، اسی دن مولانا عیسیٰ محمد صاحب گجراتی پالنپوری کا دوپہر ۱۲ بجے انتقال ہوا جو تبلیغ کے سرگرم کارکنوں میں تھے اور اس سیہ کار سے بھی خصوصی تعلق تھا۔

سہارنپور آنے کے بعد وہ پلاسٹر سخت ہو گیا، ۱۵ دن کے بعد بھائی کرامت صاحب کے بھائی صاحب ایک دوسرے ڈاکٹر کو لے کر آئے، انہوں نے دیکھ کر کہا کہ پہلا پلاسٹر سخت بندھ گیا اس لیے تکلیف بڑھ گئی، انہوں نے پہلے پلاسٹر کو کاٹ کر دوسرا بدلا، دو ماہ تک وہ بھی بندھا رہا مگر ٹانگوں میں ایسا جمود ہو گیا کہ اب کھڑا ہونا تو درکنار زمین پر پاؤں رکھنا بھی دشوار ہو گیا، چارپائی کے قریب قدمچہ لگا رہتا تھا، چار احباب چارپائی سے میت کی طرح اٹھا کر قدمچہ پر بٹھا دیتے ہیں، فراغ پر اٹھا کر چارپائی پر ڈال دیتے ہیں، اسی درمیان میں ڈاکٹری، یونانی، ہومیوپیتھک اور پہلوان کی مالش کے علاج بدلتے رہے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

یہ تو پہلے بار بار لکھا جا چکا ہے کہ اس ناکارہ کے اسفار حج کا سلسلہ اسٹرائیک کے بعد سے ہی شروع ہوا، جس کی اصل وجہ یہ ہوئی کہ اس اسٹرائیک نے اس سیہ کار کی طبیعت کو اس قدر تکدر اور رنج پہنچایا کہ تعلیم و تدریس سے طبیعت بالکل ٹھنڈی ہو گئی، بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ اسٹرائیک والے سال میں اس سیہ کار نے طلبہ کی اصلاح اور ان کو اپنے مقام پہچاننے کی اسلاف کے اتباع کی ہر سبق میں اتنی ترغیبیں دی تھیں کہ جن کا ذکر اسٹرائیک کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔

مجھے اس سال کے طلبہ پر بہت ہی حسنِ ظن قائم ہو گیا تھا اور جب نتیجہ اس کے بالکل ضد اور خلاف نکلا اور مجھے واقعی یہ خیال ہوا کہ اس ناکارہ ہی میں اس کی صلاحیت نہیں ورنہ اثر ہوتا ہی، اس لیے تدریس سے تو اسی سال طبیعت بالکل ہی سرد ہو گئی اور اس کے بعد سے جتنے سال بھی بخاری شریف پڑھانے کی نوبت آئی وہ جبر و اکراہ اور آورد سے ہوئی، آمد سے نہیں ہوئی اور اسی بناء پر ہر سفر حج میں مدینہ پاک قیام کی تمنا لے کر جاتا تھا مگر میری گندگی وہاں بھی قیام نہ کرنے دیتی، جن کی تفاصیل تو گزر چکی اور بالآخر ۸۸ھ سے تعلیم کا سلسلہ چھوٹ ہی گیا، مگر بچپن سے چونکہ عادت کام کرنے کی پڑ چکی تھی اور وہ طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، اس لیے احباب کے اصرار بالخصوص عزیز شاہد سلمہ کی جولانی طبع سے پڑے پڑے بعض مسودات کے سننے کی نوبت آئی اور سلسلہ چلتا رہا۔

یہ رسالہ بھی جیسا کہ اس میں کئی جگہ لکھا جا چکا کوئی تالیفی چیز نہیں، بلکہ خالی پڑے پڑے کچھ بے ترتیب واقعات یاد آ جاتے ہیں تو جوڑ بے جوڑ ان کے لکھوانے کی نوبت بھی آتی رہتی ہے، اسی لیے اعجاب کے مضمون کو لکھتے لکھتے اسٹرائیک کا منظر سامنے آ گیا ورنہ اصل چیز تو اعجاب ہی چل رہی ہے۔

اعجاب کے متعلق جو کچھ میں نے اُوپر لکھوایا وہ اس سے احتراز اور بچنے کے لیے تنبیہ کے واسطے لکھوایا کہ یہ لعنت اکابر کے ہوتے ہوئے نقصان پہنچاتی ہے، اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے صحابہ کو اس اعجاب کی وجہ سے ابتداءً ہزیمت اُٹھانی پڑی۔

لیکن اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اہل اللہ کی لغزشوں پر ان کی شان میں گستاخی کرنا سم قاتل ہے، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آپس میں لڑائیوں کے متعلق حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ سے کسی نے استفسار کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا:

''اللہ جل شانہ نے ہمارے ہاتھوں کو ان کے خونوں سے محفوظ رکھا ہے تو ہم اپنی زبانوں کو ان میں کیوں ملوث کریں۔'' یہ مضمون رسالہ اعتدال صفحہ ۲۴ میں تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے۔

اس کے ساتھ یہ قابل لحاظ بات ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو کسی چیز کی عار لگاتا ہے، اللہ جل شانہ مرنے سے پہلے اس کو اس عیب میں مبتلا کرتا ہے، اس مضمون کو یہ ناکارہ آپ بیتی نمبر۴ اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے حالات کے ذیل میں تفصیل سے لکھ چکا ہے، اس کو ضرور دیکھا جائے، اہل اللہ یا اکابر سے اگر لغزش ہو جائے تو اس میں لب کشائی ہرگز نہیں کرنی چاہیے، یہ بہت خطرناک ہے، علامہ شعرانی نے تحریر فرمایا ہے کہ ''لحوم العلماء مسمومة'' علماء کے گوشت زہریلے ہوتے ہیں یعنی ان کی غیبت کرنا سم قاتل ہے۔

اورِاح ثلاثہ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے ایک نہایت ہی سخت مقولہ نقل کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہی ان سے محفوظ رکھے کہ جو لوگ علماء دین کی توہین اور ان پر طعن وتشنیع کرتے ہیں ان کا قبر میں قبلہ سے منہ پھر جاتا ہے اور یوں بھی فرمایا کہ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

(اورِاح ثلاثہ: ص ۳۰۷)

اسی میں ایک دوسرا واقعہ لکھا ہے کہ مولوی محمد قاسم صاحب کمشنر بندوبست ریاست گوالیار ایک بار پریشانی میں مبتلا ہوئے، ریاست کی طرف سے تین لاکھ کا مطالبہ ہوا، ان کے بھائی یہ خبر پا کر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں گئے، حضرت مولانا نے وطن دریافت کیا، انہوں نے عرض کیا دیوبند، مولانا نے تعجب سے ساتھ فرمایا کہ گنگوہ حضرت مولانا کی خدمت میں قریب تر ہے وہاں کیوں نہ گئے، اتنی دُور دراز کا سفر کیوں اختیار کیا، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے عقیدت کھینچ لائی، مولانا نے ارشاد فرمایا کہ تم گنگوہ ہی جاؤ، تمہاری مشکل کشائی حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ہی کی دعاء پر موقوف ہے، میں اور تمام زمین کے اولیاء بھی اگر دعاء کریں گے تو نفع نہ ہوگا، چنانچہ واپس ہوئے اور بوسیلہ حکیم ضیاء الدین صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، حکیم صاحب نے سفارش کی تو مولانا نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تو کوئی قصور نہیں کیا، بلکہ یہ صاحب مدرسہ دیوبند کے مخالف ہیں جو اللہ کا ہے، قصوروار اللہ کے ہیں اللہ سے توبہ کریں بندہ بھی دعاء کرے گا، چنانچہ ادھر انہوں نے توبہ کی اُدھر مطالبہ سے برأت کا کمشنر صاحب کے پاس سے حکم آ گیا۔ (اورِاح ثلاثہ: ۳۰۷)

درحقیقت آدمی پر جو مصائب آتے ہیں وہ اپنے ہی اعمال کا خمیازہ ہوتا ہے، اس مضمون کو یہ ناکارہ اپنے مختلف رسائل میں مختصر، مفصل، بہت ہی کثرت سے لکھوا چکا ہے۔

''ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم''

مغالطہ اور غلط فہمی میں عوام اور جہلاء نہیں بلکہ خواص اور علماء بھی کثرت سے مبتلا ہوتے ہیں۔ جب آدمی پر کوئی مصیبت آتی ہے، مثلاً جیل ہوگئی، چوری ہوگئی کوئی جھوٹا مقدمہ قائم ہوگیا تو وہ سب اس سوچ میں لگ جاتے ہیں کہ اس قصہ میں تو یہ شخص بالکل بری ہے کہ یہ ناگہانی آفت منجانب اللہ کہاں سے آگئی جھوٹا مقدمہ کیسے قائم ہوگیا؟

حالانکہ میرا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ مصائب بے محل کبھی نہیں آتے، مگر ہوتا یہ ہے کہ آدمی کو اپنا کیا ہوا کبھی نظر نہیں آتا، نہ اپنے مظالم کی طرف کبھی توجہ ہوتی ہے، نہ دوسروں کے حقوق مالی یا جانی جو ضائع کیے ہیں ان کو کچھ اہمیت دی جاتی ہے بلکہ یاد بھی نہیں رکھتے، لیکن اللہ کے سپاہی ہر وقت مونڈھوں پر سوار رہتے ہیں اور ''ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید'' کے تحت جرائم کی مثل تیار ہوتی رہتی ہے اور اللہ جل شانہ کے لطف وکرم اور حلم کی وجہ سے سزا میں تاخیر ہوتی رہتی ہے کہ شاید توبہ کرلے، لیکن بجائے توبہ کے جب تقاصیر میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے تو ملاء اعلیٰ سے سزا کا حکم ہوتا ہے، جو جرائم کی کثرت کے مناسب ہوتا ہے، چاہے سزا ہو، چاہے مقدمہ ہو، چاہے چوری ہو، چاہے بیماری ہو، چاہے کوئی اور سزا ہو۔

وہاں سے حکم تو دراصل ان مثلوں پر ہوتا ہے جس کا انبار ہوگیا تھا، البتہ وہ نافذ ایسے وقت میں ہوتا ہے جب یہاں کوئی دوسرا واقعہ پیش آیا ہوتا ہے، جس میں یہ بے قصور ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ مصیبت فلاں واقعہ کی وجہ سے آئی ہے، جس میں بالکل بے قصور ہوں، جس کی وجہ سے دوسروں پر بھی الزام لگاتا ہے کہ ناحق میرا نام لیا، جھوٹا مجھ پر الزام لگادیا اور بعض تو بے صبری میں مالک الملک پر بھی الزام لگادیتے ہیں جو رؤف الرحیم ستار وغفار ہے، حالانکہ یہ سزا کسی ایک آدھ جرم کی نہیں ہوتی، مالک کے یہاں تو بڑی مہلت دی جاتی ہے کہ اپنے قصور کی تلافی توبہ یا ادائیگی سے کردے، مگر جب ہمیں اپنی فکر ہی نہ ہو تو مثل مشہور ہے کہ مالک کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مصائب رفع درجات کے لیے ہیں

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہمشیرہ اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سر میں جب درد ہوتا تو سر پر ہاتھ رکھ کر فرماتیں کہ یا اللہ! مجھ سے کیا گناہ ہوا، اعتدال میں یہ مضمون بہت تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ اس کی تائید میں متعدد احادیث ذکر کی گئیں ہیں، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا

گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آیت ''مَا اَصَابَکُمْ'' آلایۃ کی تفسیر تجھے بتاتا ہوں۔

''اے علی! جو کچھ بھی تجھے پہنچے مرض ہو یا کسی قسم کا عذاب ہو یا دنیا کی کوئی بھی مصیبت ہو وہ اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے۔''

اس پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ مصائب تو انبیاء کرام علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام پر بھی بہت کثرت سے آئے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:

''أشد الناس بلاء الأنبياء ثم الأمثل فا لأمثل''

کہ سب سے سخت بلائیں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ہوتی ہیں، پھر جو ان سے قریب ہو، پھر جو ان سے قریب ہو''۔

اس کا جواب بھی میں تو اپنے کسی رسالہ میں مفصل لکھ چکا ہوں، جو اس وقت ذہن میں نہیں، مگر حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کی تالیف ''البدائع'' میں ایک مستقل بدیعہ اس کے متعلق تحریر فرمایا ہے، جس میں آیت شریفہ'' ما اصابکم من مصيبة ''الخ کے جواب میں مفصل تحریر فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

مصائب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقت مصیبت۔ ایک صورت مصیبت ہوتی ہے اور جس کا معیار یہ ہے کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں، گو صورت میں اس کی مشابہ ہو، اس معیار کو سامنے رکھ کر انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے مصائب کو دیکھ لے کہ ان کو ان مصائب سے انقباض ہوتا ہے یا تسلیم ورضاء میں اضافہ، بغل میں لے کر دبانا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک چور مجرم کو پکڑ کر بغل میں دبانا، گو دبانے والا حسین ومحبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو بغل میں لے کر دبائے، اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے، کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوشِ محبت سے نکلنا چاہے گا، ہر گز نہیں''۔ بلکہ یوں کہے گا کہ:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں، چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے اور عشاق کی یہ حالت ہے۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند
شکارش نجوید خلاص ازکمند

اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا
اس کا شکار جال سے خلاصی تلاش نہیں کرتا

حقیقت مصیبت تو واقعی گناہوں سے آتی ہے اور صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے لیے بھی آتی ہے، حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو بہت تفصیل سے لکھا ہے، جس کو میں نے مختصراً نقل کرایا تاکہ اشکال رفع ہوجائے۔

جمعیۃ الطلبہ کے اثرات

''اکابر کی نظر میں''

اس کے متعلق اُوپر کے مضمون میں بھی مختصراً آچکا ہے، اہمیت کی وجہ سے کہ میرے نزدیک یہ بہت اہم مضمون ہے اس واسطے یہ دوبارہ لکھوانا پڑا کہ یہ ناکارہ مدارس عربیہ میں جمعیۃ الطلبہ کا انتہائی مخالف ہے، اس کی قباحت تو طالب علمی کے زمانہ ہی سے میرے دل میں پڑی ہوئی ہے، مگر دن بدن تجربات نے مجھ کو تو اس سے اس قدر متنفر بنادیا کہ اس کے نام سے نفرت ہوگئی، اس کے شرکاء سے طبیعت میں انقباض ہوتا ہے، اس ناکارہ کا اپنے اکابر کے ساتھ ایک معمول ہمیشہ رہا ہے کہ یہ ناکارہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرح کہ وہ ہر فعل کو یوں فرمایا کرتے تھے ''**کیف افعل ما لم یفعله رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم**'' اور علامہ منذری نے ترغیب و ترہیب میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے ''**البرکة مع اکابر کم**''
(ترغیب: ص۵۳/ج۱)

میرے اکابر جو حقیقی معنی میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارثین و نائبین ہیں اور ان کے اقوال وافعال کو میں نے سنت کے بہت ہی زیادہ موافق پایا ہے اور اس کے خلاف ہمیشہ نقصان ہی پایا، ان سب اکابر کو بھی میں نے ہمیشہ جمعیۃ الطلبہ کے مخالف ہی پایا اسی رسالہ کی فصل ''اکابر کے طرزِ تعلیم'' میں اولین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے زمانے دارالعلوم میں ایک جمعیۃ الطلبہ قائم ہوئی تھی، جس کا نام ''فیض رساں'' تھا۔

حضرت مولانا نور اللہ مرقدہٗ کو جب اس کا علم ہوا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ خبیثو! ایک ایک آ ؤ میں انجمن قائم کراؤں گا اور سب نالائقوں کو نکالوں گا، بس فیض کی بجائے حیض جاری

ہو گیا اور حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے رسائل النور وغیرہ میں ۴۶ھ کے پرچوں میں بڑی کثرت سے اس کے خلاف مضامین پڑھے، جن میں سے بعض اپنے رسالہ اسٹرائیک میں نقل بھی کرا چکا ہوں اور پھر اپنی آنکھوں سے یہ مناظر بھی دیکھے کہ اس کی صدارت کے انتخاب پر ایک طالب علم کا قتل بھی ہوا۔

اکابر کی بے حرمتی اپنے نظماء اور صدر کے مقابلہ میں اکابر مدرسہ اور اساتذۂ کرام کی حکم عدولی توہین وغیرہ کے مناظر گزرے، جب سے تو بہت ہی نفرت بڑھ گئی، ان طلبہ میں اکابر کا احترام تو بالکل ہی نہیں رہتا، علوم سے مناسبت بھی قائم نہیں رہتی، اچھی تقریر تمرین سے پیدا ہو جاتی ہے، جس سے وہ اپنے آپ کو عالم فاضل سمجھنے لگتے ہیں اور اساتذہ پر تنقید شروع کر دیتے ہیں، جس سے علم سے محرومی طے شدہ ہے۔

الیکشنوں کے حالات سب ہی کو معلوم ہیں، یہ ساری چیزیں ان جمعیتوں کے انتخاب میں بھی پیش آتی ہیں، شہری اور قصباتی لوگ اپنے اپنے گھروں پر رہتے ہیں، ان کی مخالفتیں دور دور رہتی ہیں، لیکن ان طلبہ کا قیام ایک ہی جگہ رہتا ہے اور اس انتخابی مخالفت میں ایک فریق کی دوسرے فریق کے متعلق جھوٹی اور فرضی شکایتیں اکابر مدرسہ کے پاس ہر وقت پہنچنا اور آپس میں مار پیٹ کے قصے ہر وقت کے مشاہدے ہیں، اہلِ مدارس کے لیے بھی ایک مستقل مصیبت اور ایک مستقل مشغلہ ان کے مقدمات کے فیصلے کرنے کا بڑھ جاتا ہے اور ان کے لیے بھی اسباق کا پڑھنا مطالعہ کرنا تو الگ رہا ہر وقت کا ایک مستقل مشغلہ دوسرے فریق کی ایذاء رسانی اور مدرسہ سے اخراج کی تدابیر، جھوٹ، فریب ایک مستقل مشغلہ بن جاتا ہے، اس وجہ سے مجھے تو بہت ہی اس کے نام سے بھی نفرت ہو گئی ہے، اللہ تعالیٰ معاف کرے۔

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۱۶

متفرقات

اس فصل کے اندر کچھ مضامین متفرق طور پر ذہن میں آئے ہیں، ان سب کو جمع کرایا، نیز خیال آیا کہ اپنے چند تجربات اور عادات کا ذکر کروں جو اپنے اکابر کے صدقہ اور ان کی جوتیوں کے طفیل سے حاصل ہوئے، شاید حق تعالیٰ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو متمتع فرمائے، نمبروار جو ذہن میں آئے کیف ما اتفق ان کو لکھوا رہا ہوں۔

(۱)......نظر کی احتیاط

اس مضمون کا تعلق تقویٰ سے ہے اور اس میں کچھ اس کے مضامین آ بھی چکے ہیں، مگر اہتمام کی وجہ سے اور ابتلاء کی وجہ سے نیز اپنے اکابر کا معمول اس میں لکھوانے کے واسطے مستقل لکھوا رہا ہوں، اللہ جل شانہ نے کلام پاک میں مومنین کو اور مومنات کو نیچی نگاہیں رکھنے کا حکم دیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نامحرم (جس میں مرد بھی داخل ہے) کی طرف نگاہ آنکھ کا زنا ارشاد فرمایا ہے۔ (مشکوٰۃ: ص ۲۶۱) دوسری جگہ ارشاد ہے کہ نظر کو نظر کے پیچھے نہ لگاؤ۔ (مشکوٰۃ: ص ۲۶۱)

مقصد یہ ہے کہ اگر نظر پڑ جائے بے ارادہ ہو تو معاف ہے، لیکن دوبارہ اس کی طرف دیکھنا نگاہ جمائے رکھنا معصیت میں داخل ہے، ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اللہ کی لعنت دیکھنے والے پر بھی اور جس کو دیکھا جائے اس پر بھی'' (یعنی اس کی طرف سے اگر بے حجابی و نظر کے اسباب پیدا ہوں) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''نامحرم عورتوں کے پاس آمد و رفت رکھنے سے بچا کرو''۔

ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھلا دیور کے حق میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ''دیور پوری موت ہے''۔ موت اس لیے شاید فرمایا کہ دیور ہر وقت گھر میں رہتا ہے، اگر خدانخواستہ آنکھ لڑ گئی تو اس سے جس قدر خطرناک نتائج پیدا ہوں گے ظاہر ہے۔

حافظ ابن قیم نے ''الجواب الکافی'' (صفحہ ۲۰۴) میں بہت تفصیلی بحث اس پر کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حوادث کی ابتداء نظر سے ہوتی ہے، جیسا کہ آگ کے شعلوں کی ابتداء ایک چنگاری سے ہوتی ہے، اس لیے شرمگاہ سے زیادہ حفاظت نظر کی ضروری ہے، اس لیے کہ ابتداء تو نظر سے ہوتی ہے، اس کے بعد دل میں خیال جمنا شروع ہوتا ہے، پھر ادھر قدم اُٹھتے ہیں اور اس کے بعد پھر

ابتلاء ہو جاتا ہے، اسی واسطے کہا گیا کہ جو ان چاروں چیزوں کی حفاظت کر لے، اپنے دین کی حفاظت کر لیتا ہے، نظر، پھر دل کا خیال پھر بات چیت پھر قدم، آدمی کو چاہیے کہ ان چاروں ہی چیزوں سے بچنے کی کوشش کرے کہ ان ہی دروازوں سے دشمن (شیطان) گھروں میں گھستا ہے اور پھر گھر کی بربادی اور ہلاکت کا ذریعہ بنتا ہے، اس کے بعد حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان چاروں پر تفصیلی بحث کی ہے۔

سب سے پہلے نظر سے ابتداء کی ہے کہ اس کی حفاظت شرم گاہ کی حفاظت کا اصل ذریعہ ہے کہ جو اپنی نظر کو آزاد چھوڑ دے وہ ہلاکت کے مواقع میں پہنچا دیتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے ''نظر شیطان کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔'' جو شخص اپنی نگاہ کی حفاظت کرے کسی عورت یا مرد کی خوبیوں سے اللہ تعالیٰ کے واسطے، اللہ تعالیٰ اس کے دل میں عبادت کی حلاوت پیدا کر دیتے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عام راستوں پر نہ بیٹھا کرو، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا یارسول اللہ! ہماری نشست گاہیں تو وہی ہیں (یعنی مکانوں کے سامنے جو زمین پڑی ہوئی ہوتی ہے، غرباء کے لیے وہی مردانہ مجلسیں ہوتی ہیں) وہاں کے علاوہ تو ہمارے پاس بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس کے بغیر چارہ نہیں تو وہاں کے حقوق ادا کرو، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! وہاں کے کیا حقوق ہیں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نگاہ کو محفوظ رکھنا، دوسرے کو تکلیف پہنچانے سے بچنا، سلام کا جواب دینا، فقط اور عام حوادث نگاہ ہی کی بدولت پیش آتے ہیں کہ نظر ہی دل میں وسوسہ اور خطرات کا سبب بنتی ہے۔'' حافظ ابن قیم نے بہت طویل کلام کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نگاہ کا تیر جس کی طرف پھینکا جائے، اس سے پہلے تیر پھینکنے والے ہی کو قتل کرتا ہے کہ نگاہ ڈالنے والا دوسری نگاہ کو اپنے زخم کا مداوا سمجھتا ہے، حالانکہ وہ زخم کو زیادہ گہرا کرتا ہے، بڑا اچھا مضمون ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ''احیاء العلوم'' جلد ثالث ص ۹۰ میں اس پر بڑا اچھا کلام کیا ہے اور کئی قصے بھی لکھے ہیں، منجملہ ان کے حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ کے دو قصے لکھے ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مدینہ منورہ سے حج کو گئے، راستے میں ابواء منزل پر مقیم تھے، ان کے رفیق نے دستر خوان لیا اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں لینے بازار گیا، حضرت سلمان خیمہ میں تھے، جو نہایت حسین و جمیل اور نہایت پرہیز گار تھے۔ ایک بدوی عورت نے پہاڑ کی چوٹی سے خیمہ میں بیٹھے ہوئے ان کو دیکھا اور فریفتہ ہوگئی اور پہاڑ سے اُتر کر ان کے خیمہ میں آئی، برقع بھی تھا اور ہاتھوں پر دستانے بھی تھے، ان کے پاس آکر برقع اُٹھا دیا وہ عورت

بھی حسن و جمال میں چاند کا ٹکڑا تھی اور حضرت سلیمان سے کچھ طلب کیا۔

سلیمان بن یسار کا قصہ

حضرت سلیمان رحمہ اللہ تعالیٰ سمجھے کہ کچھ کھانے کو مانگ رہی ہے وہ دستر خوان کی طرف بڑھے کہ کچھ کھانے کو دیں، اس نے کہا مجھے یہ نہیں چاہیے، مجھے تو وہ چاہیے جو آدمی اپنی بیوی سے چاہتا ہے، حضرت سلیمان نے فرمایا:

"تجھے شیطان نے میرے پاس بھیجا ہے" یہ کہہ کر دونوں گھٹنوں پر منہ رکھ کر بے تحاشا رونا شروع کر دیا اور چلا چلا کر رونے لگے وہ عورت تو یہ منظر دیکھ کر چلی گئی، یہ بیٹھے روتے رہے، اتنے میں ان کے رفیق آئے دیکھا تو یہ رو رہے ہیں اور آنکھیں پھول رہی ہیں، انہوں نے یہ منظر دیکھ کر سبب پوچھا اور کہا بچے یاد آ گئے؟ انہوں نے کہا ہرگز نہیں تمہاری غیبت میں ایک قصہ پیش آ گیا اور پھر واقعہ سنایا، ان کے ساتھی بھی ان کے پاس بیٹھ کر زور وشور سے رونے لگے، دستر خوان وغیرہ بھی اُٹھا لیا۔

حضرت سلیمان رحمہ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو، انہوں نے کہا کہ اس پر رو رہا ہوں کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو مجھ سے صبر نہ ہوتا، یہ دونوں روتے ہی رہے اور جب مکہ پہنچے، طواف سعی سے فارغ ہو کر حجرِ اسود کے سامنے حضرت سلیمان رحمہ اللہ تعالیٰ ایک چادر میں لپٹے بیٹھے تھے کہ نیند آ گئی۔

خواب میں ایک نہایت حسین وجمیل شخص کی زیارت ہوئی، انہوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کون ہیں فرمایا یوسف! انہوں نے عرض کیا یوسف صدیق آپ ہی ہیں؟ انہوں نے فرمایا ہاں، انہوں نے فرمایا کہ آپ کے اور زلیخا کے قصہ میں بڑی تعجب کی بات ہے تو حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ابواء والی عورت کا قصہ اس سے زیادہ عجیب ہے۔

میرے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ ایک زمانہ میں جب کہ جناب الحاج حافظ قمر الدین صاحب نور اللہ مرقدہٗ بیمار تھے تو ان کی نیابت میں جامع مسجد سہارنپور پانچوں وقت نماز پڑھانے کے لیے مدرسہ سے تشریف لے جایا کرتے تھے، عصر کے وقت جا کر مغرب کی نماز پڑھا کر تشریف لایا کرتے تھے، اس تشریف بری میں یہ ناکارہ بھی کبھی کبھی ساتھ ہوا کرتا تھا، میں ہمیشہ غور سے دیکھتا تھا کہ مدرسہ سے لے کر جامع مسجد تک اپنے پاؤں پر نظر جمائے رہتے تھے کہ بازار میں راستہ تھا، مگر نگاہ کبھی بھی اِدھر اُدھر دوکانوں پر نہیں پڑتی تھی، میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ کو بھی بارہا دیکھا راستہ میں تشریف لے جاتے وقت بہت کم نگاہ اُوپر اُٹھاتے تھے زمین ہی پر اکثر نگاہ ہوتی تھی یہ نہایت ہی مہلک مرض ہے ایک تجربہ تو میرا بھی اپنے بہت سے احباب پر ہے کہ ذکر شغل کی

ابتداء میں لذت و جوش پیدا ہوتا ہے اور اس جوش سے عبادات میں ایک لذت پیدا ہوتی ہے مگر اس بدنظری سے سب سے پہلے عبادت کی حلاوت اور لذت فنا ہوتی ہے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ عبادات کے چھوٹنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی بہت سے قصے اس کے ذکر کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک قصاب کا قصہ ذکر کیا ہے کہ ایک قصائی اپنی کسی پڑوسی عورت پر فریفتہ ہوگیا۔ اس عورت کو اس کے گھر والوں نے کسی ضرورت سے دوسرے گاؤں میں بھیج دیا۔ تو یہ بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا اور موقع پا کر اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ اس عورت نے کہا کہ ایسا نہ کر، اس لیے کہ محبت تو مجھے تیرے ساتھ تجھ سے بھی زیادہ ہے مگر اللہ کا خوف غالب ہے۔ اس نے کہا تو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور میں نہ ڈروں؟ اور یہ کہہ کر توبہ کرتا ہوا لوٹ آیا۔

راستہ میں نہایت شدت سے پیاس نے ستایا کہ پیاس کی شدت سے موت کے قریب پہنچ گیا۔ اتنے میں اس زمانہ کے نبی کا کوئی قاصد ملا اس نے کہا کیا حال ہے۔ اس نے پیاس کی شدت بیتابی بتائی۔ انہوں نے کہا اللہ سے دعاء کر۔ اس نے کہا میرے پاس تو کوئی نیک عمل نہیں۔ جس کی وجہ سے دعاء کروں، آپ دعاء کریں۔ انہوں نے کہا اچھا میں دعاء کرتا ہوں تو آمین کہنا۔ اس کے بعد ان نبی کے قاصد نے دعاء کی اور اس قصائی نے آمین کہی تو ایک نہایت گہرے بادل نے ان پر سایہ کیا۔ گاؤں تک تو وہ دونوں ساتھ چلتے رہے مگر گاؤں پہنچنے کے بعد جب دونوں کا راستہ علیٰحدہ علیٰحدہ ہوا تو وہ ابر اس قصائی کے ساتھ ہولیا۔ ان رسول نے فرمایا کہ تو تو کہتا تھا کہ میرے پاس کوئی عمل نہیں۔ اپنی صحیح صحیح حالت بیان کر اس پر اس نے سارا قصہ سنایا تو ان رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچی توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے کہ دوسرا وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔

ایک دوسرا قصہ طویل لکھا ہے کہ ایک نہایت حسین و جمیل نوعمر جوان متقی پرہیز گار مسجد میں رہا کرتا تھا۔ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مسجد میں آ رہا تھا ایک حسین و جمیل عورت مسجد میں ملی، جو حسن و جمال میں رشکِ قمر تھی۔ اس نے کہا کہ اے جوان! میری ایک بات سنتا جا۔ انہوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا اور اس کی بات کا جواب بھی نہیں دیا۔ چند روز بعد پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

اس لڑکی نے پھر بھی کہا کہ میری ایک بات سنتے جاؤ۔ انہوں نے تھوڑی دیر توقف کیا اور کہا کہ یہ جگہ تہمت کی ہے، ایسی جگہ پر بات کرنا مناسب نہیں اور عورت نے کہا کہ میں بھی سمجھتی ہوں کہ تم عابد زاہدوں کے لیے تھوڑی سی چیز بھی بڑی سخت ہے، مگر میری حالت تمہاری محبت

میں بے قابو ہے اوراس نوجوان نے اس کی بات سنی اور مسجد میں چلے گئے۔ مگر وہاں جانے کے بعد جب نماز کی نیت باندھی تو کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا پڑھیں اور کس طرح پڑھیں، تو اس نے ایک پرچہ لیا اور اس پر لکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اے عورت!

''جب کوئی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو پہلی مرتبہ تو مالک حلم کا معاملہ فرماتا ہے اور دوسری مرتبہ ستاری فرماتا ہے اور تیسری مرتبہ ایسا ناراض ہوتا ہے کہ آسمان و زمین بھی اس سے تنگ ہوجاتے ہیں'' قصہ تو بہت طویل ہے مجھے تو صرف متوجہ کرنا تھا کہ مالک اپنے حلم وکرم سے اولاً درگزرا اور ستاری فرماتا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ جس کو اللہ جل شانہٗ نظر بد سے محفوظ رکھے اور دوسرے درجہ میں وہ جس کے مالک توبہ کی توفیق عطاء فرمائے۔ (فضائل ذکر: ص ۱۲۴)

فضائل ذکر میں ایک قصہ لکھا ہے ایک شخص کے جب مرنے کا وقت ہوا اس کو لوگ کلمہ طیبہ کی تلقین کرتے تھے تو کہنے لگا کہ مجھ سے نہیں کہا جاتا۔ لوگوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ ایک عورت مجھ سے تولیہ خریدنے آئی تھی مجھے وہ اچھی لگی میں اسے دیکھتا رہا۔

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مستقل ''وعظ غض البصر'' کے نام سے مطبوع ہے اس میں آنکھ کی حفاظت کے متعلق بہت ہی اہم مضمون قابل دیکھنے کے ہے۔ جس کی ابتداء اللہ جل شانہٗ کے پاک ارشاد: ''یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور'' سے ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ بدنگاہی کا گناہ ایسا ہے کہ لوگ اس کو گناہ سمجھتے بھی نہیں ایسا سمجھتے ہیں جیسا کہ کسی اچھے مکان کو دیکھ لیا۔ اس لیے اس گناہ کے بعد دل پر رنج کا بھی اثر نہیں ہوتا اور یہ ایسا سخت گناہ ہے کہ اس سے بوڑھے بھی بچے ہوئے نہیں۔ بدکاری کے لیے تو بہت سی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں۔ پیسہ بھی پاس ہو۔ دوسرا بھی راضی ہو وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس گناہ کو کرنے میں کچھ سامان کی ضرورت نہیں اور نہ اس میں کچھ بدنامی ہے۔ چونکہ اس کی خبر تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ کیسی نیت ہے۔ کسی کو گھورلیا، مولوی صاحب مولوی صاحب رہے، قاری صاحب قاری صاحب رہے، نہ اس گھورنے سے مولوی صاحب کے مولوی ہونے میں فرق آیا نہ قاری صاحب کے قاری ہونے میں فرق آیا اور اس گناہ کی کسی دوسرے کو خبر نہیں ہوتی اور جن اکابر کو خبر بھی ہوجاتی ہے تو وہ ایسے عالی الظرف ہوتے ہیں کہ وہ اس کا اظہار بھی گوارا نہیں کرتے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا، جو بدنظری کے گناہ میں مبتلا تھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تو اس کا نام لے کر کچھ نہیں فرمایا لیکن یہ فرمایا کہ ''لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان

کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے'' جن اکابر کو چھپی ہوئی باتیں معلوم ہوجاتی ہیں اور کشف ہوتا ہے۔
انہوں نے لکھا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایسی بے رونقی پیدا ہوجاتی ہے جس کو تھوڑی سی بھی سمجھ ہوگی، وہ پہچان لے گا کہ اس شخص کی نگاہ پاک نہیں ہے۔ خاص طور سے لڑکوں پر بدنگاہی کرنا بالکل ہی زہر ہے، اس سے کھلم کھلا شرع نے منع کیا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس کی جو برائیاں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی بھاری بلاء ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں بد نگاہی شیطان کا تیر ہے۔ یعنی اس بدنگاہی کی بدولت آدمی شیطان کا شکار ہوجاتا ہے۔
حضرت ابو قاسم قشیری ایک بزرگ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص دیندار ہونا چاہے اس کے لیے عورتوں اور لڑکوں کے ساتھ ملا جلا رہنا نہایت نقصان کی چیز ہے اور اس کے حق میں یہ ڈاکو ہے کہ اس کو اس کے مطلب تک ہرگز پہنچنے نہ دے گا۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں کہ'' اللہ تعالیٰ جس کو اپنے دربار سے نکالنا چاہتے ہیں اس کو لڑکوں کی طرف خواہش اور محبت دے دیتے ہیں'' اور بد نگاہی میں ایک اور بھی بڑی بھاری خرابی یہ ہے کہ جو اور کسی گناہ میں نہیں وہ یہ کہ اور گناہ تو ایسے ہیں کہ جب ان کو خوب دل بھر کے کر چکے تو پھر ان سے دل ہٹ جاتا ہے۔ مگر بدنگاہی ایسی بری چیز ہے کہ جتنی بدنگاہی کرتا ہے اتنی ہی اور زیادہ خواہش بڑھتی جاتی ہے۔
ایک بزرگ تھے وہ پردہ کرانے میں زیادہ احتیاط نہ کرتے تھے بلکہ عورتوں کو اپنے سامنے آنے دیتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ میں تو اب بہت بوڑھا ہوگیا ہوں۔ اب میرے سامنے آنے میں کیا خرابی ہے۔ ایک اور بزرگ تھے، انہوں نے ان کو نصیحت کی کہ میاں غیر عورتوں کو اپنے سامنے مت آنے دیا کرو، انہوں نے ان کی نصیحت کا کچھ خیال نہ کیا۔ آخر ایک مرتبہ خود انہوں نے خواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی مسئلہ کو دریافت کیا کہ میں بوڑھا ہوں اب عورتوں کو میرے سامنے آنے میں کسی بری بات کا تو خوف ہے نہیں تو کیا اب بھی پردہ کرانا ضروری ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''اگر مرد اتنا بزرگ ہوجائے جتنا جنید کے مرتبہ کو پہنچ جائے اور عورت اتنی بزرگ ہوجائے کہ رابعہ بصری کے مرتبہ کو پہنچ جائے، پھر بھی اگر یہ دونوں ایک جگہ تنہا مکان میں جمع ہوں گے، تو شیطان بھی ان کے پاس آموجود ہوگا۔
اور ان سے کچھ نہ کچھ کرا ہی دے گا۔ پھر تمہیں کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ عورتوں کو اپنے سامنے آنے دو''۔
ایک بزرگ خانہ کعبہ کا طواف کررہے تھے اور ان کی ایک آنکھ پھوٹی ہوئی تھی وہ طواف کرتے

جاتے اور یہ کہتے جاتے تھے۔ اے اللہ! میں آپ کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ کسی نے پوچھا اس قدر کیوں ڈرتے ہو۔ کیا بات ہے؟ فرمایا ''میں نے ایک لڑکے کو بری نظر سے دیکھ لیا تھا، غیب سے ایک چپت لگا اور آنکھ پھوٹ گئی''۔ اس لیے ڈرتا ہوں کہ کہیں دوبارہ ایسا نہ ہو جائے۔

ایک بزرگ کی خوبصورت لڑکے خدمت کیا کرتے تھے اور یہ بزرگ کبھی کبھی انہیں پیار بھی کر لیا کرتے تھے۔ ایک روز ان کے مرید نے بھی اس لڑکے کو پیار کر لیا۔ پیر صاحب سمجھ گئے کہ اس نے میری دیکھا دیکھی ایسا کیا ہے۔ ایک روز بازار گئے لوہار کی دُکان پر گئے دیکھا کہ لوہا سرخ انگارہ سا ہو رہا ہے پیر صاحب نے فوراً جا کر اس کو پیار کر لیا اور اس مرید سے کہا کہ آیئے تشریف لایئے اس کو بھی پیار کر لیجئے۔ پھر تو گھبرا گئے اس وقت انہوں نے اس کو ڈانٹا کہ خبردار کبھی ہم سے برابری کا خیال نہ لانا کیا اپنے کو ہمارے برابر سمجھتا ہے۔ ایک اور بزرگ تھے ان کو کسی نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکے سے پاؤں دبوا رہے ہیں۔ اس شخص کو وسوسہ ہوا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں لڑکے سے پاؤں دبواتے ہیں۔ فرمایا آگ کی انگھیٹی لاؤ۔ دہکتی ہوئی آگ میں پاؤں رکھ دیئے اور یہ فرمایا کہ ہم کو کچھ حق نہیں۔ ہمارے نزدیک یہ آگ اور یہ لڑکا دونوں برابر ہیں۔

(ماخوذ از وعظ غض البصر)

حضرت حکیم الامت ''السنۃ الجلیہ'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ واسطی کا ارشاد ہے:

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو ذلیل فرمانے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کو ان مردار گندوں میں پھانس دیتے ہیں یعنی نوعمروں کی صحبت میں مبتلا کر دیتے ہیں''۔

حضرت نے جو اُوپر مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایسی بے رونقی ہو جاتی ہے کہ جس کو تھوڑی سی بھی سمجھ ہو گی وہ پہچان لے گا۔ اس مقولہ پر مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی زبان سے سنا ہوا اپنے شیخ اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا واقعہ بیان کیا ہے کہ اعلیٰ حضرت ایک مرتبہ وضو فرما رہے تھے۔ ایک پیر دھو چکے تھے اور دوسرا دھو رہے تھے کہ دو شخص آئے، ایک پہلے سے بیعت تھا دوسرا نیا آدمی تھا، جو پہلے سے بیعت تھا۔ اس کے متعلق فرمایا کہ تمہارا تو کچھ بگڑا نہیں سستی چستی آدمی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ (ذکر کی پابندی یہ شخص نہیں کرتے تھے) نئے آدمی کے متعلق فرمایا کہ ایک مرض تو اس کی آنکھ میں ہے اور قلب بھی خراب ہے، یعنی بدنگاہی کا مرض تھا اور عقائد بھی صحیح نہیں تھے۔

(۲) میری ایک عادت خط لکھنے کے سلسلے میں

اس ناکارہ کی بری عادتوں میں جن کا سلسلہ تو بہت ہی لمبا ہے اور بہت سی چیزیں یاد بھی آتی

رہتی ہیں مگر سراپا عیوب کے عیب آدمی کہاں تک لکھوائے اور کہاں تک یاد رہے سابقہ مضمون لکھوارہا تھا کہ متعدد وجوہ سے یہ عیب دفعۃً خیال آیا کہ اسے ضرور لکھوایا جائے۔ اس ناکارہ کی ہمیشہ بہت بری اور گندی عادت یہ رہی کہ اکابر کو چھوڑ کہ ان کی خدمت میں تو ہمیشہ عمدہ کاغذ اور سادے لفافے کا اہتمام رہا لیکن دوستوں اور چھوٹوں کے خطوط میں عمدہ کاغذ اور سادہ لفافہ لکھنے کا معمول نہیں رہا۔ ایک عرصہ تک تو حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کی طرح سے میرا بھی یہ دستور رہا کہ ڈاک کے لفافوں کو پلٹ کر ان ہی پر خطوط بھیجا کرتا تھا۔ اگر ڈاک کے ہوں تو مستقل کوئی خط لکھنا ہوا تب تو سادہ لفافہ ڈاکخانہ سے خریدنا پڑتا تھا، لیکن جن خطوط میں ٹکٹ آتے یا دستی خط ہوتا ان کو پلٹے ہوئے لفافے میں بھیجا کرتا اور اب تو ڈاک کے ہجوم اور کثرت کی وجہ سے کہ چالیس پچاس خطوط کا روزانہ کا اوسط ہے۔ یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا کہ ڈاک کے آئے ہوئے خطوط پر اپنا پتہ کاٹ کر مکتوب الیہ کا پتہ لکھوا دیتا ہوں۔

غالباً آپ بیتی میں کسی جگہ اپنے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کا ایک واقعہ لکھوا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ معمولی کاغذ میں ردی لفافہ میں حضرت کے نام عریضہ لکھ دیا۔ حضرت قدس سرہٗ کی تشریف آوری تو خوب کثرت سے ہوتی ہی تھی۔ خالی تو کوئی ہفتہ نہیں جاتا ہوگا۔ ایک ہفتہ میں دو دو، تین تین مرتبہ بھی تشریف آوری ہوجاتی تھی۔ میری اس حماقت کے بعد جب حضرت کی تشریف آوری ایک دو دن بعد ہوئی تو اپنے سفری بیگ میں سے نہایت نفیس عمدہ لفافے تقریباً پانچ سو ہوں گے یا شاید ہزار اور خطوط کے کاغذ کے پیڈ دس بارہ نہایت نفیس کاغذ کے نکال کر مجھے مرحمت فرمائے کہ تمہارے پاس خط لکھنے کے واسطے نہ کاغذ ہے نہ لفافہ ہے۔

میں نے عرض کیا حضرت عطیہ تو سر آنکھوں پر مگر میرے استعمال میں یہ آنے کے نہیں۔ فرمایا کیوں؟ میں نے یہ عرض کیا کہ حضرت! یہ خطوط ''کوکب'' یا ''اوجز'' کا مسودہ تو ہے نہیں جن کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا جائے۔ خط کا مقصد تو وقتی بات معلوم ہوجانا ہے۔ اس کے لیے عمدہ کاغذ اور بہترین لفافہ ضائع کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ یہ تو حضرت ہی کو مبارک ہو کہ دو بالشت کے لمبے چوڑے عمدہ کاغذ پر دو سطریں لکھ کر اور نفیس لفافہ میں اس کو رکھ کر اس لفافہ پر بھی مکتوب الیہ کا پتہ تحریر فرمادیں، جس سے وہ لفافہ بھی بیکار ہوجائے۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے وہ لفافے اور پیڈ میرے ہاتھ میں سے لے کر اپنے بیگ میں رکھ لیے۔ ان ہی حرکتوں پر حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ مجھے بخیل فرمایا کرتے تھے اور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ بخیل کے یہاں سے جو وصول ہو غنیمت ہے۔ حضرت مدنی قدس سرہٗ کے حالات میں بھی یہ بخیل کا لفظ شاید کئی دفعہ گزرا ہو۔

گزشتہ سال ایک مخلص دوست قاری جلیل محمد، مولانا بدرعالم مرحوم کے نواسے نے ایک پیکٹ جس میں خطوط کے کاغذ کے پیڈ تھے اور بہت عمدہ لفافے بھی تھے ایک حاجی کے ہاتھ بھیجا۔ میں نے عزیز موصوف کو لکھا کہ پیارے! یہ بات نہیں کہ میرے پاس کاغذ نہیں یا لفافے نہیں۔ میری نگاہ میں اب تک خطوط جیسے بے کار کام کے لیے اچھے کاغذ اور لفافے خرچ کرنے کی ضرورت سمجھ نہیں آئی۔ اب واپس کرنا تو مشکل ہے کہ حاجیوں کی واپسی کا زمانہ ہے۔ البتہ تمہاری دل داری اور حرمین شریفین کے خطوط کے احترام میں یہ ارادہ ضرور کرلیا کہ حرمین شریفین کے خطوط تمہارے کاغذ پر لکھواؤں گا۔ مگر اس میں بھی ایک طرف مضمون اور دوسری طرف سادہ، مجھے اپنے لیے تو گراں گزرتا ہے۔ اس لیے بقدرِ ضرورت کاغذ لے کر دونوں طرف لکھوانے کی کوشش کرتا ہوں۔

بعض مرتبہ شروع مضمون خاص ذہن میں نہیں ہوتا، دورانِ خط میں مضمون ذہن میں آجاتا ہے تو میں بے تکلف مکتوب الیہ کو لکھوا دیتا ہوں کہ کاغذ ختم ہوگیا۔ لہٰذا فقط والسلام اس پر میرے عزیز محمد شمیم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ نے میرے کاتب کو دو روپے مجھ سے مخفی بھیجے تھے کہ اس کے کاغذ خرید کر خطوط کے واسطے رکھوالیں اور یہ چیز دراصل میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ ہی کی تعلیمات کا اثر ہے۔ یہاں تجارت کا سلسلہ تو تھا ہی اور اس واسطے چٹیں جن پر مقام ضلع وغیرہ طبع ہوا ہوتا تھا اور دوسری طرف سادی ہوتی تھی۔ جدھر گوند لگایا جاتا تھا ان کا معمول اس سادے حصہ پر کچھ لکھنے لکھوانے کا رہا۔ اگر ان سے کوئی ذرا سا گوند مانگنے آتا کہ لفافہ چپکانا ہے یا کوئی چیز چپکانی ہے اور کاغذ پر یا کسی چیز پر لے جانا چاہتا تو انکار فرما دیتے تھے اور گوند دانی اس کے حوالے کر دیتے تھے کہ کاغذ چپکا کر یہ گوند دانی واپس کر دینا اور فرمایا کرتے تھے کہ تمہارا کاغذ چپکنے کے بعد جتنا گوند اس کاغذ پر رہ جائے وہ ضائع ہوگا اس کو تم پھینک دو گے۔

میرے دوستوں میں یا میرے چھوٹوں میں جو شخص محض اعزاز میں جوابی لفافہ لکھتا میں ہمیشہ اس کو بڑے اہتمام سے یہ لکھواتا ہوں کہ یہ مضمون تو جوابی کارڈ پر بھی آسکتا تھا، جوابی لفافہ کیوں ضائع کیا گیا۔ البتہ جو تعویذ منگائے اس کی تو مجبوری ہے کہ وہ نہ کارڈ پر آسکتا ہے نہ ۱۵ پیسے کے لفافہ میں۔ اس کے لیے تو ۲۵ پیسے کا لفافہ ضروری ہے، ورنہ جوابی کارڈ کا جواب بھی بہت آسان ہے اور جلدی جاتا ہے۔ لفافہ کے جواب میں دیر بھی لگتی ہے اور محض اعزاز میں پورا لفافہ جس میں نہایت مختصر مضمون ہو مجھے بہت ہی گراں گزرتا ہے۔ اسی لیے اور ان ہی حرکتوں پر مجھے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ بخیل فرمایا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ تبعاً یہ بھی لکھوادوں کہ میرا گھر والوں سے ہمیشہ یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی مہمان کے فلاں چیز کیوں پکی۔ محض اپنے یا اپنے گھر والوں کے لیے کوئی اچھی سی چیز پکنا مجھے بہت گراں گزرتا ہے۔ البتہ مہمانوں کے لیے مجھے ہمیشہ اہتمام

رہا کہ فرشتے اس چیز کو لکھیں تو مہمانوں کے نامۂ اعمال میں اور کھائیں ہم۔ اتفاق سے خاص ضرورت سے یہ مضمون بے محل آگیا کہ بعض لوگ اس کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ خدانخواستہ ان کی اہانت مقصود نہیں بلکہ بخل کا اظہار ہے ورنہ عیوب کی مقدار تو لا تعدو لا تحصٰی ہے:

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(۳) ایک ضروری نصیحت یا بہترین عادت

یہ ناکارہ آپ بیتی میں متعدد مرتبہ کئی کئی جگہ یہ لکھوا چکا ہے کہ مجھے اکابر کی جوتیوں کی بدولت اوران کی عادات شریفہ کو کثرت سے دیکھنے کی وجہ سے مدرسہ کے امور میں ہمیشہ بہت ہی فکر و احتیاط رہی۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کوئی لغزش نہیں ہوئی ہوگی۔ ''وَمَا أُبرِّئُ نفسی إن النفس لأمارة بالسو''لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی یاد کے موافق عمداً مدرسہ کے معاملات میں کوتاہی ان شاء اللہ نہیں ہوئی ہوگی۔ میں کہیں لکھوا چکا ہوں کہ میرے اعلیٰ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ واعلی اللہ مراتبہ کا مشہور قول تھا کہ مجھے مدرسہ کی سرپرستی سے جتنا ڈر لگتا ہے اتنا کسی سے نہیں۔

حضرت کا ارشاد تھا کہ ہم مدرسہ کے مال کے مالک تو نہیں، امین اور محافظ ہیں۔ اس لیے کسی کوتاہی پر ہمارے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتا۔ البتہ اگر ہم بمصالح مدرسہ کسی کو معاف کریں یا چشم پوشی کریں تو اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ ہم سے درگزر فرمادے گا، لیکن ہمارے معاف کرنے سے اس کا معاف نہیں ہوگا اور اگر اپنے تعلقات کی وجہ سے کسی سے درگزر کریں تو اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی مبتلاء معصیت ہوں گے۔ اپنے حضرت قدس سرہٗ اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مدرسہ کے سابق مہتمم حضرت مولانا الحاج عنایت الٰہی صاحب اعلی اللہ مراتبہم کے قصے وقتاً فوقتاً اپنے اپنے موقع پر گزر چکے ہیں۔

یہ ناکارہ رجب ۲۸ھ میں مدرسہ میں طالب علم کی حیثیت سے آیا تھا اور اب محرم ۹۳ھ تک طالب علمی مدرسی سرپرستی، سارے ہی مراحل طے کر چکا۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ ان سارے ادوار میں کسی طالب علم کی اپنے تعلق کی وجہ سے مدرسہ میں کھانا جاری کرنے کی سفارش کی ہو۔ بارہا بلکہ بیسیوں مرتبہ اس کی نوبت آئی کہ کسی طالب علم کا کسی جرم یا امتحان کی ناکامی پر کھانا بند ہوا اور اس نے حضرت مولانا الحاج عبداللطیف صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے خود یا اپنے اولیاء کے ذریعہ سفارش کرائی اور حضرت ناظم صاحب نے تحریر فرمادیا کہ اگر زکریا سے سفارش لکھوا دو تو میں جاری کردوں گا۔ (اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ حضرت ناظم صاحب قدس سرہٗ کو یہ خیال ہوتا تھا کہ یہی گستاخ جرح

کرے گا) اور جب وہ کاغذ یا پیام میرے پاس آتا تھا تو میرا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ مدرسہ سے تو سفارش نہیں کروں گا جب تک اس کا کھانا بند ہے میرے ساتھ کھالیا کرے۔

مدرسہ کے معاملات میں احتیاط اور ذاتی تعلق کی وجہ سے سفارش سے گریز

بارہا اس کی نوبت آئی کہ مدرسہ سے ایسے طلبہ کا اخراج ہوا، جن کو مجھ سے خصوصی تعلق تھا، مگر مجھے وثوق سے یاد ہے کہ میں نے اپنے تعلق کی وجہ سے کبھی اخراج کی مخالفت یا معافی کی سفارش کسی بھی ناظم سے کی ہو۔ بعض طلبہ کو مجھ سے کبیدگی ہوتی تھی وہ میری مخالفت بھی کرتے تھے۔ جھوٹے الزام بھی لگاتے تھے، مگر میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی ان کے اخراج کی کنایۃً یا اشارۃً تحریک نہیں کی۔ طلبہ کی ناراضگی کی وجہ بھی برحق ہوتی تھی کہ یہ ناکارہ خواص یعنی اکابر کے متعلقین کے بارے میں ہمیشہ سخت رہا۔ کیونکہ میرے ذہن میں یہ تھا کہ ان پر نکیر یا تنبیہ ہر مدرس کے بس کی بات نہیں۔

مزید براں میرے دو مخلص دوست حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب صدر مدرس مدرسہ اور قاری مفتی سعید احمد صاحب صدر مفتی مدرسہ بھی مجھے ابھارتے ہوتے تھے کہ فلاں شخص کی یہ شکایت ہے، ہم نکیر پر قادر نہیں تو قادر ہے، تیرے عدم نکیر سے تجھ سے باز پرس ہوگی۔ وہ زمانہ بھی میری شدت کا تھا کہ اس زمانہ میں میرا ہاتھ میری زبان سے زیادہ چلتا تھا۔ اسی لیے یہ خواص مجھ سے ناراض رہا کرتے تھے۔

آپ بیتی نمبر ۲ میں مخصوص طلبہ پر میرے تشدد کے ذیل میں یہ مضمون آ بھی چکا۔ اسی میں یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ ۵۷ھ میں انہی خواص نے طلبہ پر سختی کی شکایات ظلم وتعدی کی شکایات اخبار ''مدینہ'' میں چھپوائی جو حضرت شیخ الاسلام حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی شفقتوں سے تحقیقات میں بالکل غلط ثابت ہوئی۔ اس کی تفصیل تو وہاں گزر چکی مگر جب مدرسہ نے ان کے سرغنہ لوگوں کا اخراج تجویز کیا تو اس ناکارہ نے بمصالح مدرسہ ان کے اخراج کی بہت شدت سے مخالفت کی۔ دو دن تک یہ مسئلہ ہماری مجلس شوریٰ میں زیر بحث رہا۔ سب اہلِ شوریٰ ان کے اخراج پر متفق ومتحد تھے کہ ان کا جھوٹ علی الاعلان ثابت ہو چکا تھا۔ صرف یہ ناکارہ دو دن تک ان حضرات سے لڑتا رہا کہ ہرگز اخراج نہ کریں کہ ان کے اخراج سے آپ حضرات کو مشکلات پیش آ جائیں گی مجھ تک ان شاء اللہ کوئی نہیں پہنچے گا۔ مگر ان طلبہ کے دینی یا دنیوی اکابر سے آپ حضرات کو خصوصی تعلق ہے۔ آپ حضرات کو ان کے اخراج میں بڑی مشکلات پیش آئیں گی۔ حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے تو یہ ارشاد فرمایا کہ یہ معاملہ اس کی ذات کا ہے اس میں اس کی رائے معتبر نہیں اور حضرت

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ جن اکابر کا یہ اندیشہ بتا رہا ہے وہ محض اس کا خیال ہے ان کی طرف سے کوئی چیز ایسی پیش نہیں آئے گی مگر خوب آئی۔

ملازمین مدرسہ میں بھی اس سیہ کار نے کبھی تعلق کی وجہ سے نہ کسی سے سفارش کی نہ کسی کی علیحدگی کی تحریک یا کوشش کی۔ میرے محسن مخلص مولوی نصیر الدین سلمہ جس سال دورہ سے فارغ ہوئے انہوں نے چاہا کہ مدرسہ کا کوئی سبق پڑھانے کو مل جائے بلا تنخواہ میں نے ان سے کہا کہ تمہاری استعداد کے لوگ شاخ پڑھا رہے ہیں۔ ناظم صاحب کی خدمت میں درخواست میں کاغذ آیا تو میں موافقت نہیں کروں گا۔ کہ تمہارے بارے میں میری رائے متہم ہے۔

میرے حضرت مولانا الحاج عبدالقادر صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ کے عزیز مولوی عبدالرحمٰن شاہ پوری جس سال دورہ سے فارغ ہوئے ان کے ساتھ بھی یہی قصہ پیش آیا اور میں نے عزیز مولوی نصیر الدین والا جواب ان کو بھی دیا، مگر حضرت قدس سرہٗ کی وجہ سے، بمصالح مدرسہ میں نے ان کو ایک مشورہ دیا کہ حضرت ناظم صاحب اکثر میرے ساتھ رائے پور تشریف لے جاتے ہیں۔ اب کے جب تشریف لے چلیں تو تم ساتھ چلنا اور حضرت قدس سرہٗ کی مجلس میں بشرطیکہ میں اس مجلس میں موجود نہ ہوں۔ حضرت ناظم صاحب سے ایسے آہستہ سے درخواست کرنا کہ حضرت نہ سنیں۔ اس لیے کہ مجھے حضرت سے بھی یہی اندیشہ تھا کہ وہ اپنے تعلق کی وجہ سے کوئی لفظ خلاف کا نہ فرما دیں۔

چنانچہ ایک موقع پر جب کہ ہم دو تین آدمی ہی حضرت کی مجلس میں بیٹھے تھے میں گویا پیشاب کے لیے اٹھا اور مولوی عبدالرحمٰن کو اشارہ کر گیا۔ انہوں نے حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے پاس بیٹھ کر بہت چپکے سے درخواست کی۔ حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ مروّت اور ادب کے پتلے تھے اور یہ گستاخ اکابر کی شان میں بھی ہمیشہ گستاخ ہی رہا۔ چنانچہ عزیز موصوف نے چپکے سے درخواست کی اور حضرت ناظم صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ سہارنپور جا کر درخواست دیجیو۔ چنانچہ انہوں نے یہاں آ کر درخواست دی اور عزیز موصوف کو سبق مل گیا۔

میرے مخلص دوست مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی حال سرپرست مدرسہ ذیقعدہ ۵۱ھ میں معین مفتی ہوئے اور دس روپے تنخواہ تھی۔ اس کے دو سال بعد شوال ۵۳ھ میں نائب مفتی ہوئے اور پندرہ روپے تنخواہ ہوئی۔ ان دو سالوں میں بہت ہی دوستوں نے مجھ پر اصرار کیا۔ بالخصوص جناب الحاج حافظ محمد یعقوب صاحب گنگوہی نواسہ قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے تو مجھے کئی دفعہ ڈانٹا کہ دس روپے میں کیا گزر ہو سکتا ہے تو سفارش کر دے تو تنخواہ کا اضافہ ہو جائے۔ میں یہی کہتا رہا کہ ان کا مجھ سے خصوصی تعلق ہے۔ میں سفارش نہیں کروں گا

اور بھی بہت سے نظائر اس کے مفتی یحییٰ، عزیز عاقل، عزیز سلمان کے مواقع میں پیش آچکے ہیں۔ جن کو ہمارے سرپرستان خوب جانتے تھے اور جانتے ہیں۔ اس کے بالمقابل اپنی ذاتی مخالفت کی وجہ سے میں نے کسی کو مدرسہ سے علیحدہ کرنے کی یا ترقی روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی بھی بیسیوں نظیریں اللہ کے فضل سے گزر چکیں۔

میری ابتداء ملازمت میں مدرسہ کے ایک ملازم جن کو اصالۃً تو میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے عناد تھا اور ان کی وجہ سے ان کے بعد اس ناکارہ سے اور میرے چچا جان حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے مخالفت تھی۔ انہوں نے اور ان کے اعوان نے ہم دونوں کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہ حضرت قدس سرہٗ کے اوپر انگریزوں کی طرف سے جاسوس مقرر ہیں اور یہ ناکارہ چونکہ حضرت قدس سرہٗ کی ڈاک بھی لکھا کرتا تھا۔ حجرہ شریفہ سے ڈاک کا نکالنا ڈیکس کا لانا، حجرہ کا قفل کھول کر ان سب چیزوں کو باہر حضرت کی خدمت میں لانا اور فراغ پر ان سب چیزوں کو اندر رکھ کر حضرت کے حجرہ کو قفل لگانا میرے ہی ذمہ تھا۔

حضرت قدس سرہٗ نے اس سیہ کار کے ڈیکس میں ایک امانت طلائی زیور کی رکھی تھی وہ چوری ہوگیا تو دوستوں نے اس سیہ کار ہی کو متہم کیا اور کرنا ہی چاہیے تھا کہ حجرہ کی آمد و رفت میری ہی تھی، اگرچہ میرے حضرت قدس سرہٗ اعلی اللہ مراتبہ نے اس الزام کو سنتے ہی فوراً تردید فرمادی کہ یہ اس کا کام نہیں جس پر احمقوں نے حضرت قدس سرہٗ پر بھی فرط محبت کا الزام لگایا اور مالک کے احسانات سے یہ بھی بعد میں ثابت ہوگیا کہ وہ ایک اور صاحب کی حرکت تھی اور انہوں نے اقرار بھی کرلیا۔ مگر جب تک وہ امانت نہیں ملی اس ناکارہ پر چوری کا الزام خوب زوروں پر عائد رہا۔ میرے کاتب کہتے ہیں کہ یہ قصہ تو پہلے گزر چکا۔ اس لیے مختصر کردیا۔ لیکن اس دور کے متعدد واقعات کثرت سے پیش آئے اور میرے والد صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی مخالفت رنگ لائی کہ یہ صاحب حضرت قدس سرہٗ کے یہاں سے معتوب ہوئے۔ مدرسہ سے علیحدہ ہوئے اور جب اس سیہ کار نے حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں بہت اخلاص سے ان کی معافی کی سفارش کی اور میرے حضرت قدس سرہٗ نے بہت استعجاب سے فرمایا کہ تم بھی اس کی سفارش کرتے ہو مجھے اپنے الفاظ خوب یاد ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ حضرت کی ناراضی سے اس کے دین و دنیا دونوں برباد ہوجائیں گے اور اس گستاخیوں بے ادبیوں سے حضرت کی شان میں فرق تو پڑتا نہیں۔ مگر میرے حضرت نے میری سفارش تو قبول نہیں کی۔ مگر مجھے خوب محسوس ہوا کہ اس قصہ سے مجھ پر حضرت کی شفقت خوب بڑھ گئی تھی۔

بیماری کے نام سے رخصت لینے کا نتیجہ

اسی کے ساتھ اس سیہ کار کا ایک تجربہ اور بھی اپنی طویل زندگی میں گزرا۔ جس کا ظہور ابتداء میں تو بہت کثرت سے ہوتا تھا اور اب بہت دیر سے ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جس نے بھی بغیر بیماری کے مدرسہ سے بیماری کی چھٹی لے۔ وہ ضرور بیماری میں مبتلاء ہوا۔ یا کسی دوسری قسم کی خیانت مدرسہ کی کی، اوقات کی یا اموال کی، اس کو بہت بری طرح سے بھگتا۔ بیسیوں واقعات میرے تجربہ میں آئے ہیں۔ یا چوری ہوئی یا کسی مقدمہ میں ابتلاء ہوا اور سینکڑوں پر پانی پھرا اور عجیب بات یہ بھی دیکھی کہ جو دین سے جتنا زیادہ قریب تھا اس کو سزا جلدی ملی۔ مگر تھوڑی اور جو شخص دین سے جتنا دور تھا، اتنی ہی دیر میں سزا ملی مگر سخت ملی۔

اس کی وجہ تو میرے ذہن میں ہے جس کو یہ ناکارہ اعتدال کے باب چہارم میں جو مستقل ''مسلمانوں کی پریشانیوں کے علاج'' کے نام سے اس کا عربی ترجمہ ''اسباب السعادۃ'' کے نام سے ندوہ، کراچی بیروت میں چھپ چکا اور انگریزی ترجمہ ''مسلم افلکشنس'' اور گجراتی ترجمہ ''وردودوا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے میں تفصیل سے گزرا ہے اور اس لیے اس ناکارہ کی اپنے سے تعلق رکھنے والے دوستوں کو وصیت ہے مدرسہ کے معاملات میں بہت ہی محتاط رہیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارا ٹوکنے والا کوئی نہیں یا ہمیں کون ٹوک سکتا ہے۔ کسی کا تو نہ ٹوکنا یا ٹوک سکنا اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس سیہ کار کو بھی اس لکھے ہوئے پر عمل کی مزید توفیق عطاء فرمائے اور میرے دوستوں کی بھی اس سے زیادہ سے زیادہ حفاظت فرمائے۔

(۴) ایک عجیب تجربہ

اپنے تجربات تو بہت سے ہیں، اچھے بھی برے بھی۔ اکابر میں بھی بہت سے تجربات کیے اور اپنی ذات میں بہت کچھ کیے ایک تجربہ میرا یہ بھی ہے کہ اکابر کے خدام اور مقبولیت میں روز افزوں اضافہ سے مجھے بجائے خوشی کے ہمیشہ ڈر لگا کرتا ہے۔ میرے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے اخیر رمضانوں کی جو مقبولیت عام اور وسعت بیعت کے خطوط ان جگہوں سے آتے ہیں، جہاں حضرت کا رمضان گزرتا تھا اور میرے دوست بہت ہی مسرتوں کے ساتھ ان رجوعات عامہ اور لوگوں کے زیادہ سے زیادہ حلقہ بگوش ہونے کی خبریں لکھا کرتے تھے۔ میں ان کے خطوط میں اجمالاً یہی لکھا کرتا تھا کہ بھائی یہ خبریں میرے لیے تو زیادہ موجب مسرت نہیں۔ زیادہ تفصیل تو میں نہیں لکھتا تھا مگر اجمالی ضرور لکھتا رہتا تھا۔

اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کا بھی آخری دور دیکھا، پھر حضرت رائے پوری ثانی نور اللہ

مرقدہٗ کا بھی آخری دور دیکھا۔ عزیز مولوی یوسف نور اللہ مرقدہٗ کے وصال سے دو سال قبل میں نے عزیز ہارون سلمہ کو نہایت اہتمام سے بہت تنہائی میں بلا کر بہت ہی تفصیل سے یہ مضمون سمجھایا تھا کہ تیرے ابا جان کی جو پرواز ہو رہی ہے میرے نزدیک خطرناک ہے جو کچھ کرنا ہے کر لے، غنیمت سمجھ، بہت ہی وضاحت سے بہت کچھ اس کو کہہ دیا تھا۔ مگر وہ تو بچہ تھا۔

اس ستتر (۷۷) سالہ بوڑھے کو بھی باوجود تجربات کے اور دیکھنے کے عبرت حاصل نہ ہوئی اور یہ مضمون دراصل مشکوٰۃ شریف کے پڑھنے کے زمانہ سے غور کرنا شروع کیا تھا کہ جب احادیث میں یہ مضمون نظر سے گزرا کہ جب حضور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا ابتدائی اشارہ سورۂ نصر کے نزول سے ہوا اور اس میں ''اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح '' کے ساتھ ''ورایت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا '' پر ''فسبح بحمد ربک '' کو مرتب فرمایا۔ اسی وقت سے یہ مضمون سوچ اور غور میں آنے لگا تھا۔ اس لیے اکابر کے ہر آخری دور میں بہت ہی ڈرتا رہا۔ اپنے دوستوں کو یہ بھی وصیت کرتا ہوں کہ اکابر کی کثرت رجوع سے محض خوشی پر اور مسرتوں پر قناعت نہ کریں بلکہ جو لینا ہو غنیمت سمجھیں۔

اسی تکملہ میں ایک ضروری تنبیہ یہ بھی ہے کہ شاید کہیں ابھی لکھوا چکا ہوں کہ اکابر کے دیکھنے والے اور ان سے متمتع ہونے والے اس کے وصال کے بعد انتہائی محرومیوں میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ اکابر کے جانے کے بعد وہ بعد والوں کا مقابلہ جانے والوں سے کرتے ہیں۔ یہ بڑی غلطی کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے بعد والوں کے فیوض و برکات سے محروم رہتے ہیں۔

بزرگوں کی طرف رجوع عام ان کی اخیر عمر میں

میں نے حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کے وصال کے بعد بعض اکابر کو حضرت کے بعض اجل خلفاء کی طرف رجوع کا مشورہ دیا، مگر ان کی نگاہوں میں حضرت قطب الارشاد سمائے ہوئے تھے، انہوں نے رجوع نہ کیا۔ جس کا مجھے بہت ہی قلق ہے کہ وہ حضرات بہت ہی اونچے تھے۔ اسی طرح قطب الارشاد کے اجل خلفاء کے وصال کے بعد میں اپنے دوستوں کو ان کے خلفاء کی طرف متوجہ کرتا رہا۔ بہت سوں نے تو مانا، بہت سوں نے نہ مانا۔

خلفاء میں اکابر کے کمالات نہ پا کر ان سے ترک استفادہ سخت محرومی ہے

اب اس آخری دور میں مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے وصال کے بعد مجھ سے بعض لوگوں نے جب یہ شکایت کی کہ مولانا انعام الحسن صاحب اللہ تعالیٰ ان کو بہت دیر تک زندہ سلامت رکھے۔ ان میں وہ باتیں نہیں جو حضرت جی (مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ)

میں تھیں۔ تو میں نے ان کو یہی جواب دیا کہ حضرت جی میں وہ باتیں نہیں تھیں جو ان کے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ میں تھیں اور مولانا انعام الحسن صاحب کے بعد والوں میں یہ بھی نہیں دیکھو گے جو ان میں ہیں۔

اس لیے بہت ضروری تنبیہ، نصیحت اور وصیت ہے کہ میرے دوست احباب بعد والوں کو اس نگاہ سے نہ دیکھا کریں جس نگاہ سے جانے والوں کو دیکھا۔ بلکہ اس نگاہ سے دیکھا کریں کہ ان کے بعد ایسا بھی نہیں ملنے کا اور ظاہر بات ہے کہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں تو بقیہ انبیاء میں بھی نہیں تھیں۔ چہ جائیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خوبیاں حضرات تابعین میں اور ہلم جراً بعد والوں میں جانے والوں کی عادات کو تلاش کرنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔

جبکہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے: ''**لايأتي عليكم عام إلا بعده، شر منه** او کما قال صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم''، ''تم لوگوں پر کوئی ایسا سال نہیں ہوگا کہ بعد والا اس سے بدتر نہ ہوگا''۔

میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مقولہ بارہا سنا ہوا ہے کہ ہر سال کے دورہ والے پہلے سے گرے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنا بھی پچاس سالہ تجربہ یہی ہے۔ اپنی ابتدائی مدرسی میں طلبہ کی دینی حالت، دین کی رغبت و شوق جتنا دیکھا اب اس کی ضد دیکھ رہا ہوں:

ان نینوں کا یہی بسیکھ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے

میں نے اسی سلسلہ میں اپنے اکابر کا یہ تجربہ کیا کہ وہ حضرات جو کتابیں پڑھاتے تھے، ان کو اپنی حیثیت سے اونچا سمجھتے تھے اور اب یہ دیکھ رہا ہوں کہ جو کوئی بھی کوئی کتاب پڑھاتا ہے اپنے کو اس سے اونچا سمجھتا ہے۔ وہ حضرات اپنی تنخواہ کو چاہے کتنی ہی قلیل ہو اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھتے تھے اور اب جتنا بھی تنخواہوں میں اضافہ ہو جائے وہ اپنے کو اس سے زیادہ مستحق سمجھتے ہیں۔ اس مضمون کو میں اسی رسالہ میں فصل نمبر۶ میں اکابر کا اپنی تنخواہوں کو زائد سمجھنے کے ذیل میں تفصیل لکھوا چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ مجھے بھی توفیق عطاء فرمائے کہ یہ مضمون ذہن میں راسخ ہو جائے کہ دینے والی ذات صرف مالک کی ہے وہی رازق ہے وہی رب العلمین ہے اور باقی سارے ذرائع چاہے وہ مدرسہ ہو، ملازمت ہو، تجارت ہو، یہ سب مالک کے قاصد ہیں مالک کے یہاں سے جو مقدر ہے

وہ ضرور پہنچ کے رہتا ہے۔ چاہے وہ مہتمم مدرسہ کے ذریعہ سے پہنچے یا تجارت کے ذریعہ سے پہنچے یا کسی کے ذریعے سے ہدیہ پہنچے۔

اگر آدمی یہ غور سے سوچا کرے کہ مجھے اس ماہ میں کیا ملا پھر اس کا اس پر اصرار کہ وہ مدرسہ کی تنخواہ سے ملا ہے یا کسی کے ہدیہ سے یا کسی اور ذریعے سے، حماقت کے سوا اور کیا ہے۔ زبان سے تو یہ چیزیں ہم لوگ بھی کہتے رہتے ہیں، لیکن دل میں جگہ کرلیں تو دین ودنیا دونوں کی راحت ہے اور اس ناکارہ کو اس کے ذاتی تجربے بارہا ہوئے۔ ہزاروں سے بھی کہیں زیادہ کہ جب بھی کسی جگہ سے آمد کا ذریعہ کوئی بند ہوا۔ مسبب الاسباب مالک نے دوسرا دروازہ ہاتھ کے ہاتھ کھول دیا۔ آدمی اپنی کمائی سے عمدہ غذائیں کھائے یا دوستوں کے اصرار وہدایا سے عمدہ غذائیں کھائے دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ غذا جو مقصود تھی وہ ہر حال میں ایک ہی سی پہنچی پھر یہ سوچنا کہ فلاں کے ہاتھ سے آئی، فلاں کے ہاتھ سے نہیں آئی، یا فلاں کے ذریعہ آئی، فلاں کے ذریعہ سے نہیں آئی بیوقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔

جوتے کھا کر پلاؤ کھانے کی حکایت

بچپن میں اپنے والد صاحب قدس سرہٗ سے ایک قصہ سنا تھا کہ ایک رئیس زادہ تھا باپ مرچکا تھا، ماں بہت ہی لاڈ و پیار کرتی تھی۔ اول تو باپ کے مرنے کے بعد اولادیں ویسے ہی ماؤں کے قبضہ میں نہیں آیا کرتیں اور رئیسوں کی اولاد تو ماؤں کے قبضہ میں کبھی نہیں آئیں۔ وہ رئیس زادے فارسی پڑھا کرتے تھے۔ جب اس میں یہ مضمون گزرا جس کا حاصل یہ تھا کہ جو آدمی کے مقدر میں ہو وہ جبراً کھاتا ہے۔ خوشی سے نہ کھائے تو جبر سے کھانا پڑتا ہے۔ وہ من چلے صاحبزادے اس پر پہنچ کر استاد سے جھگڑ پڑے کہ میں نہیں کھاتا ہے کسی کے باوا کی مجال جو مجھے کھلائے اور یہ کہہ کر کتاب بند کر کے چلے آئے کہ آیندہ سبق جب پڑھوں گا جب کوئی اپنی ماں کا لال مجھے جوت مار کر کھلا کر دیکھے اور جا کر ماں پر بھی برس پڑے۔ کتاب بھی پھینک دی کہ میں ایسی جھوٹی کتاب نہیں پڑھوں گا۔ میں عہد کر کے آیا ہوں کہ میں نہیں کھاؤں گا۔ میں بھی دیکھوں کون یوں توں کرنے والا مجھے کھلا سکے۔

ماؤں کی شفقت تو ضرب المثل ہے۔ دن بھر بیٹے کی خوشامد، منت سماجت سب کچھ کرلی مگر اس پر تو ریاست کا سور چڑھ رہا تھا۔ مجھے تو یہ یاد پڑتا ہے کہ یہ قصہ کہیں لکھوا چکا ہوں مگر میرے کاتب یوں کہتے ہیں کہ آپ بیتی میں نہیں لکھوایا۔ اس لیے قصہ کو پورا کرتا ہوں کہ وہ لڑکا دن بھر تو اپنی ضد پر رہا۔ رات کو اس کو یہ خیال ہوا کہ بھوک بھی لگے گی اور ماں کا اصرار بھی ہوا، کہیں بات نہ بگڑ جائے۔

اس لیے آبادی کے قریب ایک تکیہ قبرستان میں چلا گیا۔ ماں کو تڑپ لگ رہی تھی۔ اس نے بچہ کے دوستوں سے پوچھا کہ ارے وہ تو گھر سے چلا گیا، کہیں تلاش کرو، تمہیں انعام دوں گی۔ بچوں نے تلاش کر کے بتایا کہ وہ تو قریب ہی تکیہ میں ہے۔ ماں نے ایک دیگچی بہت ہی نفیس پلاؤ پکائی، جس میں سونف، گرم مصالحہ وغیرہ بھی ڈلوایا، جس کی خوشبو دور تک جارہی تھی اور اس خیال سے کہ یہ بچے ضرور ساتھ کھائیں گے، ایک بڑی سی دیگچی میں پلاؤ پکا کر ان لڑکوں سے یہ کہا کہ میں تمہیں انعام دوں گی یہ دیگچی تکیہ میں اس کے قریب رکھ دو، اس کو خبر نہ ہو وہ ضدی ہے۔ اگر اسے پتہ چل گیا تو وہ بالکل نہیں کھائے گا، جب رات کو بھوک لگے گی، اِدھر اُدھر پھرے گا اس کے پاس آئے گا تو کھا ہی لے گا۔ لڑکے انعام کے شوق میں وہ دیگچی عشاء کے قریب اندھیرے میں اس تکیہ میں رکھ آئے۔

اتفاق سے رات کو کچھ ڈاکو اس بستی میں ڈاکہ ڈالنے کو آرہے تھے جب اس تکیہ پر پہنچے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ ارے یار پلاؤ کی خوشبو آرہی ہے۔ وہ خوب مہک رہی تھی۔ دیکھا تو ایک دیگچی میں گرم گرم پلاؤ رکھا تھا۔ اور اس کے قریب ہی ایک لڑکا چادر اوڑھے پڑا ہے۔ لڑکے کو ٹھوکر مار کر اٹھایا کہ یہ پلاؤ کیسی رکھا ہے۔ اول تو اس نے کہا کہ مجھے خبر نہیں تو خوب پٹائی ہوئی اور کہا کہ جھوٹ بولتا ہے یہ ہمارے مارنے واسطے زہر ملا کر یہاں رکھا ہے۔ اس لڑکے نے کہا کہ اس میں زہر وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ سارا قصہ سنایا تو دو جوت پھر کھائے کہ بات ملاتا ہے۔ اگر زہر نہیں تو پہلے کھا پھر ہم کھائیں گے اور جوت بازی شروع کر دی۔

وہ اکیلا تھا یہ کئی تھے۔ پلاؤ کھانا شروع کر دیا۔ جہاں سے یہ لڑکا کھاتا، وہاں سے چار لقمے وہ بھی جلدی جلدی کھا کر اس لڑکے سے کہتے اب ادھر سے کھا۔ تجھے خبر ہے کہ زہر کدھر ملایا ہوا ہے اور وہ جوتے کھاتا رہا اور پلاؤ کھاتا رہا اور جب وہ دیگچی صاف ہوگئی تو ڈاکو آگے چلے گئے۔ کیواڑ کھلوائے اور ماں سے کہا کہ ماں جوتے بھی کھائے اور پلاؤ بھی کھایا اور سارا قصہ سنایا صبح کو کتاب لے کر استاد کے پاس پہنچ گیا اور کہنے لگا استاد جی جو شعر لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ میں جوتے بھی کھا آیا اور پلاؤ بھی کھا آیا اور سارا قصہ سنایا۔ خود اس ناکارہ کے ساتھ بھی کئی واقعے اس نوع کے پیش آئے ہیں۔ واقعات تو کئی یاد ہیں اس وقت ایک ہی واقعہ لکھواتا ہوں۔

تقریباً بیس (۲۰) بیس سال قبل کا قصہ ہے۔ میرے مخلص دوست جناب حافظ محمد اسحاق صاحب سہارنپوری بیمار ہوئے اور بہت زیادہ بیمار ہوئے کہ مایوسی کی حالت ہوگئی۔ میں اپنے مخلص دوست قاری سعید احمد صاحب مرحوم کے ساتھ ان کی عیادت کو گیا۔ اس زمانہ میں ایک جذبہ اس سیہ کار پر غالب ہو رہا تھا کہ فضول چیزیں پھل مٹھائی وغیرہ نہیں کھانی چاہیے، جو کہیں سے آئے احباب کو دینی چاہیے۔ کئی دن سے یہ جذبہ غالب ہو رہا تھا۔

ہم دونوں کے پہنچنے پر حافظ صاحب کو اتنی زیادہ خوشی ہوئی کہ یا تو بغیر سہارے کے کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے یا فرطِ خوشی میں ایک دم بیٹھ گیا اور اپنے بچہ کو آواز دے کر جو پھل انگور، انار وغیرہ ان کے لیے آئے رکھے تھے وہ منگا کر اصرار کیا کہ اس میں سے کچھ کھالے۔ میں نے ان سے بہت اصرار کیا کہ میں اپنا حصہ لے جاؤں، انہوں نے اصرار ا کیا کہ حصہ تو میں ضرور دوں گا مگر میرے سامنے اگر کچھ انگور اور فلاں فلاں چیز کھالے تو میرا بہت جی خوش ہوگا۔ میں نے بہت ہی خوشامد کی کہ میرا حصہ دے دو، خیال تھا کہ بچوں یا دوستوں میں سے کسی کو دے دوں گا۔ مگر انہوں نے اس قدر بری طرح اصرار کیا کہ ان کی خاطر میں کھانا ہی پڑا۔ جوانی میں تو اس قسم کے جذبے وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے مگر اب ضعف و پیری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ''**یشیب ابن آدم یشیب فیہ خصلتان الحرص و طول الامل**۔'' (آدمی جوں جوں بوڑھا ہوتا ہے دو عادتیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں، ایک حرص، دوسری لمبی امیدیں)۔

اس ناکارہ پر تو آج کل حدیث پاک کے دونوں اجزاء کا بہت ظہور ہو رہا ہے۔ پہلے جن چیزوں کے کھانے کی طرف التفات وخیال بھی نہیں ہوتا تھا، بلکہ اضاعت وقت سمجھتا تھا۔ اب ہر کھانے کی چیز کا شوق ہے پہلے اپنی موت اس قدر قریب معلوم ہوتی تھی کہ ضروری کام بھی اور ضروری تعمیرات بھی اس جذبہ سے ملتوی کر دیتا تھا، زندگی کتنے دن کی ہے اور اب تعمیرات وغیرہ کا تو اللہ کے فضل سے شوق نہیں ہوا مگر قرض سے بڑی بڑی کتابیں چھپوانے کا جذبہ غالب ہو رہا ہے۔ میرے حضرت قدس سرہٗ کی شرح ابی داؤد ''بذل المجہود'' جو تقریباً تیس سال سے نایاب ہے اس کی ہندی اور عربی رسم الخط میں دو جگہ طباعت شروع کرا رکھی ہے۔ مصر میں اوجز المسالک شرح موطا امام مالک جس کے ٹائپ پر طبع ہونے کا کبھی واہمہ بھی نہیں گزرا اب وہ مصر میں طبع ہو رہی ہے۔ میرے قدیم اور ناقص مسودات میرا نواسہ عزیز شاہد سب کے طبع کرنے پر تل رہا ہے:

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(۵) ایک اور عادت

اس سراپا عیوب کی بری عادتوں کا تو پوچھنا ہی کیا:

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

یہ مضمون لکھواتے وقت جو پہلے سے چل رہا تھا ایک خاص واقعہ کی وجہ سے ایک بری عادت کی طرف اور ذہن منتقل ہوا جو بہت ہی قدیم اور اس ناکارہ کے بخل کا ثمرہ ہے۔ ان ہی حرکتوں کی وجہ سے میرے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ اور ان کے بڑے بھائی مولانا سید احمد مدنی رحمہ اللہ

تعالیٰ نے مجھے بخیل کا لقب دے دیا تھا جو بالکل صحیح ہے۔ وہ بری عادت یہ ہے کہ میرے دوستوں میں سے بالخصوص جو مجھ سے بیعت کا تعلق بھی رکھتے ہوں اور خصوصی تعلق بھی رکھتے ہوں۔ ان کا کسی چیز کو بغیر اجازت لے لینا اور کھالینا بہت ہی ناگوار ہے بالخصوص جب میری کوئی چیز اٹھائیں اور کھائیں۔ نفس امارہ یہ توجیہ دل میں ڈالتا ہے کہ جب یہ لوگ بیعت کے وقت میں مجھ سے یہ عہد کرتے ہیں کہ پرایا مال بے اجازت نہیں کھاؤں گا اور پھر میرے ہی مال میں کوئی تصرف بلا اجازت کرتے ہیں، تو بہت گراں ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی مطالبہ دنیا یا آخرت میں میرا ان سے نہیں ہے۔ مگر میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ جب میرے ساتھ یہ بے التفاتی ہے تو دوسروں کے ساتھ کیا ہوگا۔

میں نے اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد کئی سال تک پورا رمضان یا آخر رمضان یا آخری عشرہ عزیز مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی دل داری میں نظام الدین گزارا اور جو زمانہ نظام الدین میں گزرتا پورا رمضان ہو یا اخیر عشرہ وہ اعتکاف میں گزرتا اور عزیز مرحوم نور اللہ مرقدہٗ اخیر عشرہ کا اعتکاف ہمیشہ کیا کرتا تھا۔ اس کا معتکف میرے معتکف کے برابر ہی ہمیشہ رہا کرتا تھا مسجد کے غربی حصہ میں میرا معتکف ہوتا تھا، شرقی میں اس کا، مرحوم کی عادت شریفہ اپنے والد صاحب قدس سرہٗ کے اتباع میں ماہ مبارک میں مغرب کے بعد طویل نوافل کی تھی۔ عشاء کی اذان کے قریب سلام پھیرا کرتا تھا اور دس پندرہ منٹ کے لیے گرمی میں مسجد کے صحن میں اور سردی میں اپنے معتکف میں لیٹ جایا کرتا تھا۔ خدام بہت سے گھیر لیتے تھے اور دس پندرہ منٹ تک خوب بدن دباتے تھے۔

دوسرے کے مال میں زیادتی تعلق کی وجہ سے تصرف اور اس کا واقعہ

ایک مرتبہ عزیز مرحوم اپنی عادت کے موافق نفلوں کے بعد لیٹا، لوگ بدن دبا رہے تھے۔ کسی نے یہ شکایت کردی کہ فلاں آپ کی ڈبیہ میں سے پان نکال کر لے گیا۔ عزیز مرحوم کو اس قدر غصہ آیا کہ شاکی کو اس بری طرح ڈانٹا کہ شکایت کیوں کی۔ پان کھانے ہی کے واسطے ہوتے ہیں اور کاہے کے واسطے ہوتے ہیں۔ اس بے چارے کو لینے کے دینے پڑ گئے اور عزیز موصوف نے تقریباً دس منٹ تو اتنا ڈانٹا کہ حد نہیں۔ میں بھی اپنے معتکف میں سب کچھ سن رہا تھا۔ جب عزیز موصوف ڈانٹ چکا تو میں اپنے معتکف سے اٹھ کر اس مجمع کے قریب گیا اور میں نے شاکی سے کہا کہ بھائی حضرت جی نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اپنی ڈبیہ کے متعلق ارشاد فرمایا۔ میری ڈبیہ میں سے کسی کو پان نکالتے دیکھو تو دو تھپڑ تو میرے حکم سے وہیں مار دینا اور پھر کان پکڑ کر اس کو میرے پاس لانا۔ پان تو

کھانے کے واسطے یقیناً ہوتے ہیں مگر چرا کر کھانے کا کیا مطلب۔ اللہ تعالیٰ میرے ابتدائی عزیز، انتہائی بزرگ مولانا یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو بہت ہی بلند درجہ عطاء فرمائے کہ میں جب کبھی ان کی طبیعت کے خلاف کوئی بات کہتا تھا تو بجائے چہرے پر کسی قسم کے تکدر کے مرحوم بڑی خندہ پیشانی سے اس کو قبول کرتے۔

میں اس آپ بیتی میں اور اپنے دوسرے رسائل اعتدال، اکابر کا رمضان وغیرہ میں یہ مضمون تو کثرت سے لکھوا چلا ہوں کہ میرے اکابر نور اللہ مراقدہم ایک گلدستہ تھے۔ جس میں ہر رنگ اور ہر خوشبو کے مختلف انواع جمع تھے۔ میں نے اپنے اکابر میں بھی دونوں رنگ دیکھے ہیں۔ عزیز مولانا یوسف نور اللہ مرقدہٗ کا جو میں نے واقعہ لکھوایا۔ یہ رنگ میرے اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ میں خوب نمایاں تھا۔

اعلیٰ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے یہاں سے لوگ مختلف قسم کے قیمتی ہدایا کھانے پینے کے پیش کرتے اور جب یہ معلوم ہوتا کہ وہ کسی تبرک کے شوقین نے صاف کر دیئے تو بہت ہی اظہار مسرت سے فرمایا کرتے کہ الحمد للہ میرے سے بہتر جگہ خرچ ہوگئی۔ اگرچہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے خاص خدام تو اتنی احتیاط کرتے تھے کہ حضرت قدس سرہٗ کی شرعی اجازت بلکہ حکم کے باوجود بھی کوئی چیز اس وقت تک نہیں کھاتے تھے جب تک حضرت خود نہ مرحمت فرمادیں۔ حضرت رائے پوری ثانی نور اللہ مرقدہٗ کی سوانح میں علی میاں نے اس قسم کے واقعات مختلف مقامات پر ذکر بھی کیے ہیں، اس کے بالمقابل میرے بعض دوسرے اکابر کا دستور یہ تھا کہ بلا اجازت کوئی شخص کوئی چیز لے لیتا تو خوب ڈانٹ پڑتی، اس نوع کے بھی واقعات ان آنکھوں نے بہت دیکھے اور اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ اور عزیز مولوی یوسف کے یہاں رحیمی رنگ کے مظاہر بھی بہت دیکھے۔

(۶) میری ایک اور بُری عادت

اس سیہ کار پر ایک قدیم الزام جو اخبارات میں بھی شائع ہو چکا ہے اور خطوط میں تو اس کی بہت ہی بھر مار رہتی ہے اور صحیح بھی ہے، وہ یہ ہے کہ زکریا کے یہاں صورت دیکھ دیکھ کر چیز دی جاتی ہے، سب سے پہلے تو یہ الزام میرے ایک عزیز کی طرف سے جس کی میں بہت خاطریں کیا کرتا تھا اور اس کی آمد پر خاص طور سے روٹی بھی چپڑوایا کرتا تھا ایک خط میں مجھ پر یہ الزام لکھا تھا کہ صورت دیکھ دیکھ کر چیز دی جاتی ہے، دستر خوان پر سب کو یکساں ہونا چاہیے، میرے لیے تو روٹی چپڑی گئی مگر میرے ساتھ دو طالب علم اور تھے ان کو بے چپڑی دے دی گئی، اس کے بعد خطوط کی بھر مار شروع ہوگئی، ان خطوط میں اگر جوابی ہوتے ہیں یا جواب کا پتہ ہوتا ہے تب تو میں ان کو ان کے

الزام کی حقیقت بتا دیتا ہوں، گمنام ہوتے ہیں جواب کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو پھر جواب دینے کی کوشش نہیں کرتا۔

مہمانوں کی حیثیت میں امتیاز

میرا قدیم دستور یہ ہے کہ جب صبح کی چائے میں میوات کی جماعت ہوتی ہے تو میں خاص طور سے ان لوگوں کے لیے چائے کے ساتھ باسی روٹی کا بھی اہتمام کرتا ہوں حتیٰ کہ اگر میرے یہاں نہ ہو تو میں اپنی بچیوں کے یہاں بھی آدمی بھیج کر دریافت کراتا ہوں کہ جلد بھیج دو، جس کی زیادہ وجہ یہ ہوتی ہے یہ بے چارے پیدل لمبا لمبا سفر کرتے ہیں، میرا خیال ہوتا ہے کہ نہ معلوم جس گاؤں میں جائیں گے کس وقت پہنچیں گے، وہاں کھانے کا وقت ہوگا یا نہیں، حتیٰ کہ بعض مرتبہ اگر کوئی چیز نہ ملی تو بازار سے گڑ اور چنے منگا کر ساتھ کر دیئے، اگرچہ میرے امراض اور مہمانوں کے ہجوم کی وجہ سے آج کل یہ معمول بہت مغلوب ہو رہا ہے جس کا مجھے بہت قلق ہے، اس پر متعدد جگہوں سے جن کے نام نہیں لکھواتا، یہ ڈانٹ پہنچی کہ ہم بھی تبلیغ میں گئے ہوئے تھے اور ہم بھی بھوکے تھے لیکن میوات والوں کے واسطے تو روٹی سالن بھی منگایا گیا تھا، بازار سے گڑ بھی منگوایا گیا، مگر ہمیں جھوٹوں بھی نہیں پوچھا گیا کہ تم بھی شریک ہو جاؤ۔

ایک صاحب کا خط آیا کہ ہم بھی مہمان تھے اور کلکتہ والے بھی مہمان تھے ہم غریب تھے وہ رئیس تھے، ان کے لیے تو کئی کئی طرح کے سالن بھی تھے، چاول بھی تھے اور ہم کو غریب ہونے کی وجہ سے صرف شوربا اور دال پر ٹال دیا وغیرہ وغیرہ خوب ڈانٹ تھی، حالانکہ کلکتہ کے احباب جب آتے ہیں تو میرے محسن ان کے مخلص دوست صابری صاحب کے یہاں سے ان کے لیے کھانا آتا ہے، صابری صاحب کا تو ہمیشہ یہ اصرار رہتا ہے کہ یہ حضرات ان کے مہمان بنا کریں اور میں بھی اپنی عادت کے موافق جو آپ بیتی نمبر ۲ میں مہمانوں کے متعلق اپنی عادت لکھوا چکا ہوں بڑی خوشی سے قبول بھی کر لیتا ہوں، مگر کلکتہ کے ان دوستوں کا اصرار ہوتا ہے کہ دن کا کھانا میرے ہی ساتھ کھائیں، اس لیے یہ ناکارہ صبح ہی کو کھایا کرتا ہے، اس لیے صابری صاحب میرے ان مہمانوں کے لیے اپنے یہاں سے اپنی اور ان کی شان کے موافق کچھ بھیجتے ہیں اور چونکہ یہ ان ہی کے لیے ہوتا ہے اس لیے میں اہتمام سے وہ ان ہی لوگوں کے سامنے رکھواتا ہوں، مگر بہت سے دوستوں کو اس پر بہت ہی غصہ آتا ہے کہ رؤسا کے لیے تو اہتمام کیا جاتا ہے، حالانکہ اگر ایسا ہو بھی تو ناگواری یا غصہ کی بات نہیں، یہ غصہ دین سے ناواقفیت کی علامت ہے۔

ابوداؤد شریف میں ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک سائل آیا

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو ایک روٹی کا ٹکڑا دے دیا، اس کے بعد ایک شخص ذی ثروت جس پر اچھا لباس بھی تھا آیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو بٹھایا اور کھانا کھلایا (اعتراض کرنے والوں سے تو کونسا زمانہ خالی ہوگا) کسی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اعتراض کیا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ ہمیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''لوگوں کو ان کے مرتبہ پر اُتارو۔''

سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک بالکل حکمت پر مبنی ہے کہ ''جو لوگ اپنے گھر دو، دو وقت کے فاقے کے بعد روٹی چٹنی یا پیاز سے روٹی کھاتے ہوں ان کے کھانے میں اگر دال گوشت دونوں چیزیں مل جائیں تو ان کے لیے پلاؤ زردہ ہے، لیکن جو لوگ اپنے یہاں مرغن غذائیں کھانے کے عادی ہیں، ان کے لیے تو پہلی قسم کا کھانا فاقہ ہے شاید پیٹ میں بھی درد ہو جائے۔

انفاس عیسیٰ صفحہ ۵۹۴ میں حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کا ایک ملفوظ نقل کیا ہے کہ غرباء اور امراء کی ملاقات میں دلجوئی کی رعایت تو امر مشترک ہے مگر کیفیت دلجوئی ہر شخص کی جُدا ہے اس کی حالت وطبیعت وعادت کے تفاوت سے یعنی امراء کی مجموعی حالت طبیعت وعادت کی ایسی ہے کہ جب تک زیادہ توجہ ان کی طرف نہ کی جائے وہ خوش نہیں ہوتے اور غرباء تھوڑی توجہ سے راضی ہو جاتے ہیں، اس لیے دونوں کی دلجوئی کے طریق میں ایسا تفاوت مذموم نہیں، فقط۔

مہمانوں کے بارے میں گلدستہ امدادیہ کے پھولوں میں بھی بڑا فرق ہے، حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں اس کا بہت اہتمام تھا کہ اگر خصوصی مہمانوں کے لیے کوئی چیز پکے تو سارے مہمانوں کے لیے ہو ورنہ ان خصوصی مہمانوں کو علیحدہ کمرے میں کھلایا جاتا تھا، مگر میرے حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں بارہا اس کی نوبت اس سیہ کار کو پیش آئی کہ کوئی خاص چیز دستر خوان پر آئی تو حضرت نے دوسروں کا حصہ بھی اس سیہ کار کے پاس رکھوا دیا، اس گستاخ نے کئی دفعہ بے ادبی سے سختی سے انکار بھی کر دیا، مگر حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا کہ یہ مخصوص نہیں ہوا، جب ان کے پاس رکھا جائے گا جب ان کا ہوگا، چونکہ جوانی میں اس سیہ کار کو گوشت اور مرچوں کا بڑا شوق تھا، جواب بالکل متروک ہو گیا تو حضرت نور اللہ مرقدہٗ ایسی چیزوں میں خاص طور سے فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس کے پاس رکھ دو، اس نوع کے واقعات تو بڑے پر لطف اور بہت یاد ہیں مگر معلوم نہیں کہ ان کی نقل میں کہیں کوئی بے ادبی نہ ہو جائے۔

(۷) ایک اور تجربہ

سیدوں سے ناجائز محبت انتہائی خطرناک ہے اور اگر اس میں کچھ جبر بھی شامل ہو جائے تو کریلا اور نیم چڑھا، ایسے شخص کی دیر ہو یا سویر رسوائی ہوئے بغیر نہیں رہتی، اس سیہ کار کے علم میں بہت سے واقعات اس قسم کے آئے ہیں جو لکھنے کے قابل نہیں، اسی طرح سے ان سے عداوت ان کی ایذا رسانی بھی انتہائی خطرناک ہے، اس کے بھی سینکڑوں واقعات اس سیہ کار کی نظر سے گزرے ہیں، ان دونوں جزؤں سے بہت ہی احتیاط کرنا چاہیے، ان حضرات کو ستانے والا ایذا دینے والا انتہائی مصائب میں مبتلا ہوتا ہے، پہلے جزء والا تو رسوا ہوتا ہے اور دوسرے جزء والا مصائب میں مبتلا ہوتا ہے، یہ اس سیہ کار کا ساٹھ سالہ تجربہ ہے، بعض لوگ اپنی کسی علوشان یا علومرتبت کی وجہ سے کسی سید کے ساتھ بُرا معاملہ کرتے ہیں تو بہت جلد انقلاب کا شکار ہوتے ہیں، اپنے دوستوں کو اور اپنے سے تعلق رکھنے والوں کو ان دونوں چیزوں کی طرف بہت ہی اہتمام سے متوجہ کرتا ہوں۔

(۸) اس ناکارہ کی ایک اور عادت

یہ ناکارہ اپنے بُری عادتوں میں ایک عادت سفارش نہ کرنے کے سلسلہ میں آپ بیتی نمبر۳ پر لکھوا چکا ہے کہ سفارش کرنے سے مجھے بہت ہی گرانی اور گریز رہا اور اس سلسلہ میں اپنے دادا صاحب نوراللہ مرقدہٗ اور شیخ الاسلام نوراللہ مرقدہٗ کا معمول بھی اپنے خلاف لکھوا چکا ہوں، اورِح ثلاثہ میں ایک قصہ سننے میں آیا، جس میں اپنے اکابر کا معمول اس سلسلہ میں مختلف رہا، وہ یہاں لکھوا رہا ہوں، آیندہ طباعت میں اس کو بھی بُری عادتوں ہی میں ذکر کر دیا جائے تا کہ سارا مضمون ایک ہی جگہ ہو جائے۔

امیر شاہ خان صاحب نے فرمایا کہ چار شخص حضرت شاہ (ولی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ) کے خاندان میں بہت سخی تھے، ایک شاہ رفیع الدین صاحب (خان صاحب نے حضرت شاہ صاحب کی سخاوت کے چند قصے لکھے پھر لکھا کہ) دوسرے سخی مولانا شاہ اسحاق صاحب تھے، حضرت شاہ صاحب کی سخاوت کا قصہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ حال تو ان کا اپنا تھا اور اگر کوئی درخواست کرتا کہ حضرت فلاں شخص سے میری سفارش کر دیجئے تو آپ بے تکلف سفارش کرتے تھے، چنانچہ فرخ آباد والے نواب کو ایک سال میں ایک ہزار سفارشی خط لکھے اور اس نے ہر خط کی تعمیل کی، آخر مجبور ہو کر عرض کیا کہ حضرت کے سفارشی والا نامے اس سال ایک ہزار پہنچے ہیں، اس پر آپ نے فرمایا کہ واقعی آپ کو بہت تکلیف ہوئی، مگر میں سفارش کیے بغیر رہ نہیں سکتا، تم میری تحریروں پر عمل نہ کیا کرو۔

مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ بیان فرما کر فرمایا کہ اپنی اپنی طبیعت ہے، چنانچہ مولوی محمد یعقوب صاحب کی طبیعت اس کے خلاف تھی اور وہ کبھی کسی کو سفارشی خط نہ لکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس میں دو تکلیفیں ہوتی ہیں، اگر سفارش نہ کی جاوے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے جو خواہان سفارش ہے اور سفارش کی جائے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے جس سے سفارش کی جاتی ہے، لیکن چونکہ طالب سفارش کی تکلیف کا منشاء خود اس کی طلب ہے اور جس سے سفارش کی جاتی ہے اس کی تکلیف محض بلاوجہ، اس لیے میں طالبِ سفارش کی تکلیف کو اس کی تکلیف پر ترجیح دیتا ہوں، جس سے سفارش کی جائے اور یہ بیان فرما کر مولانا گنگوہی نے فرمایا:

''میرا مذاق بھی وہی ہے جو مولانا محمد یعقوب صاحب کا تھا اور میں بھی سفارش نہیں کرتا''۔

اس پر حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ احقر بھی اسی مذاق کا متبع ہے، یعنی بشاشت سے سفارش نہیں کرتا، کیونکہ جو سفارش مسنون ہے وہ اس وقت نہیں رہی، جبر وکراہت رہ گئی جو کہ ناجائز ہے، اس کے بعد خان صاحب نے تحریر فرمایا کہ تیسرے سخی حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمہ اللہ تعالیٰ تھے اور چوتھے ان کے صاحبزادے مولانا محمد عمر صاحب دونوں کی سخاوت کے قصے لکھے، میرا مقصود چونکہ صرف سفارش کا مضمون تھا اس لیے اسی پر قناعت کی۔

(ارواحِ ثلاثہ)

......☆☆☆☆☆......

فصل نمبر ۱۷

تصوف کا بیان

تصوف میرے اکابر کا اہم ترین مشغلہ ہے۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہو سنا کے ندا ندا جام و سنداں با ختن

کے سچے مصداق تھے، یہ حضرات ایک جانب فقہ، حدیث اور علوم ظاہریہ میں اگر ائمہ مجتہدین اور ائمہ حدیث کے حقیقی جانشین اور سچے متبع تھے تو دوسری جانب تصوف کے ائمہ جنید و شبلی کے قدم بقدم ان اکابر نے تصوف، فقہ، حدیث کے ماتحت چلایا اور اپنے قول و فعل سے بتا دیا کہ یہ مبارک فن حقیقت میں قرآن وحدیث کا ہی ایک شعبہ ہے اور جو رسوم و بدعات اس مبارک فن میں بعد زمانہ سے بڑھ گئی تھیں ان کو چھانٹ دیا، تصوف کو بعض ناواقفوں نے ظاہر شریعت کا مقابل نہیں تو علیحدہ ضرور بنا دیا، یہ یا غلو ہے یا جہل، حقیقی تصوف کو جس کا دوسرا نام احسان ہے، حضرت جبرائیل علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے دریافت کر کے یہ واضح کر دیا کہ یہ شریعت ہی کی روح اور مغز ہے اور حضرت جبرائیل کے اس سوال پر کہ احسان کیا چیز ہے، سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک ارشاد نے ''أن تعبد اللّٰہ کانک تراہ'' (تو اللہ کی عبادت ایسی کرے گویا کہ اس کو دیکھ رہا ہے) احسان کے معنی اور تصوف کی حقیقت واضح کر دی، عنوانات تو اس کے جو جو بھی اختیار کر لیے جائیں لیکن مرجع سب کا یہی حقیقت ہے۔

اوری بسعدیٰ والرباب وإنما
انت الذی تعنی وانت المؤمل

شاعر کہتا ہے کہ چاہے میں مشہور محبوبہ سعدیٰ کا نام لوں یا معروف معشوقہ رباب کا نام لوں، ہر چیز سے مقصود تو ہی ہے اور تو ہی مطلوب ہے، یہ تو حقیقت ہے اس کے بعد جو چیزیں ذکر و شغل مجاہدات، ریاضات، یہ حضرات تجویز کرتے ہیں، وہ حقیقت میں سب علاج ہیں، چونکہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جتنا بعد ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی قلوب میں زنگ اور امراض ردیہ دلوں میں پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور جیسا کہ یونانی اطباء اور ڈاکٹر جدید امراض کے لیے تجربات یا قواعد سے وقتی اور نئی نئی دوائیں تجویز کرتے ہیں، اسی طرح سے یہ روحانی اطباء قلبی

امراض کے لیے ہر شخص کے حال کے موافق اور زمانہ کے موافق دوائیں تجویز کرتے ہیں۔

حضرت مولانا وصی اللہ صاحب جو حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے اجل خلفاء میں ہیں، ان کا ایک رسالہ ''تصوف اور نسبت صوفیہ'' مختصر اور قابل دید ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ابو یحییٰ زکریا انصاری شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تصوف کی اصل، حدیث جبرائیل ہے، جس میں آیا ہے کہ ''ما الا حسان قال ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ '' [الحدیث] چنانچہ تصوف احسان ہی کا نام ہے، اس سے معلوم ہوا کہ صوفی مقرب اور محسن کو کہتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خود کتاب اللہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمت میں مختلف درجہ کے لوگ ہیں بعض ان میں سے اصحاب الیمین ہیں اور بعض کو مقربین کہا جاتا ہے، جو شخص اپنے ایمان کو صحیح کرے اور شرعی اوامر و نواہی کے مطابق اپنا عمل رکھے تو یہ وہ لوگ ہیں جو اصحاب الیمین کہلاتے ہیں اور ان امور کے ساتھ ساتھ جس شخص کی غفلات بھی کم ہوں اور نوافل و طاعات کی کثرت ہو اور اس کے قلب پر ذکر اللہ کا استیلا ہو جائے اور حق تعالیٰ سے مناجات کا تسلسل اور دوام اس کو حاصل ہو گیا ہو، ایسے شخص کو مقرب اور محسن کہتے ہیں اور اسی کو صوفی بھی کہا جاتا ہے، حضرت ابو یحییٰ زکریا کا جو قول نقل کیا گیا ہے یہاں ہم اس کو ناظرین کے افادہ کے لیے بعینہ درج کرتے ہیں۔

اصل رسالہ میں تو عربی عبارت بھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اور یہ حضرات جو صفات بالا کے ساتھ متصف ہیں مقربین کہلاتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو کہ صفت احسان کے ساتھ متصف ہیں، اُمت کے لوگوں کے درجات مختلف ہیں، بعضے اصحاب یمین کہلاتے ہیں اور بعضوں کو مقربون کہا جاتا ہے، جیسا کہ خود قرآن حکیم میں آیا ہے، لہٰذا جن کا ایمان دُرست ہو گیا اور انہوں نے مامورات شرعیہ پر عمل کیا وہ اصحاب یمین کہلاتے ہیں اور جس کی غفلات کم ہو گئیں اور نوافل میں دوام و استمرار اس کو حاصل ہو گیا اور اس کی طاعات کثیر ہو گئیں اور ذکر اللہ کا قلب پر استیلاء ہو گیا اور اپنی تمام حوائج میں حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور اسی سے دُعا کرنا جس کا حال بن گیا وہ مقرب کہلاتا ہے اور اسی شخص کو محسن کہا جاتا ہے اور اس کو صوفی بھی کہا جاتا ہے، جو صفاء سے مشتق ہے یعنی یہ شخص اخلاق مذمومہ سے پاک وصاف ہو گیا اور اخلاق محمودہ کے ساتھ متصف ہو گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو محبوب بنا لیا اور جملہ حرکات اور سکنات میں اس کا محافظ اور نگران ہو گیا، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مجھ سے تقرب حاصل کرنے والوں میں سے کسی نے اس جیسا تقرب حاصل نہیں کیا جو کہ فرائض کی ادائیگی کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے، یہ قرب فرائض کہلاتا ہے اور بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب حاصل کرتا رہتا ہے یعنی ادائے فرض کے بعد کیونکہ (اس کے بدون نوافل سبب قرب تو کیا معتبر بھی نہیں) یہاں تک

کہ میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں اور جب وہ مجھے محبوب ہوجاتا ہے تو پھر میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، یہ قربِ نوافل کہلاتا ہے۔

بعنوان دیگر اس کو یوں کہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کے بعد مسلمانوں میں سے جو لوگ کہ اپنے وقت کے فاضل ہوتے تھے، ان کا کوئی خاص نام بجز صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ہوتا تھا، اس لیے کہ صحابیت سے بڑھ کر کوئی فضل وشرف ہی نہ تھا، جس کی جانب ان کو منسوب کیا جاتا، پھر جب صحابہ کا دور ختم ہوا اور قرنِ ثانی آیا تو جن حضرات نے صحابہ کی صحبت پائی تھی ان کو تابعین کہا جانے لگا اور یہی اس وقت ان کے حق میں سب سے بڑی تعریف سمجھی جاتی تھی۔

پھر ان کے بعد تبع تابعین لقب سے ملقب ہوئے پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ لوگ مختلف درجات اور متباین مراتب میں تقسیم ہوگئے تو اس وقت خواص ناس جن کو امُورِ دین کا شدت کے ساتھ اہتمام تھا زہاد اور عباد کے نام سے پکارے جانے لگے، یعنی یوں کہا جاتا تھا کہ فلاں عابد، فلاں زاہد۔

پھر اس کے بعد بدعات کا شیوع ہوگیا اور سب فرقوں میں باہم تقابل اور تنافس ہونے لگے، یہاں تک کہ ہر فریق دعویٰ کرنے لگا کہ ان کے اندر زہاد ہیں یہ دیکھ کر خواصِ اہل سنت نے جنہوں نے کہ اپنے لیے معیت الٰہی کو تجویز کیا اور جنہوں نے اسباب غفلت سے اپنے قلوب کی حفاظت کی انہوں نے اپنے مسلک اور طریق خاص کے لیے اسم تصوف تجویز کیا۔

چنانچہ اسی نام سے اس جماعت کے اکابر دوسو (۲۰۰) ہجری سے پہلے پہلے مشہور ہوگئے، یعنی ان ہی حضرات کو صوفی کہا جاتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ تصوف کا نام اگرچہ بہت دنوں کے بعد زبانوں پر آیا، تاہم اس کا مصداق اسلام کے قرن اول میں بھی موجود تھا، جیسا کہ صاحبِ ابداع لکھتے ہیں (یہاں اصل عبارت عربی کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے):

''اور تصوف جس وقت اسلام کے قرن اول میں ظاہر ہوا تھا اس کے لیے ایک عظیم شان تھی، یعنی وہ ایک عظیم المرتب چیز تھی اور ابتداء اس سے مقصود تقویم اخلاق، تہذیب نفوس اور طبائع کو اعمالِ دین کا خوگر بنانا اور ان کو اس کی جانب کھینچ کر لانا اور دین وشریعت کو نفس کی طبیعت اور اس کا وجدان بنانا، نیز دین کے حکم واسرار سے تدریجاً نفس کو واقف کرانا تھا''۔ (ترجمہ ختم ہوا)

اور یہ ظاہر ہے کہ ان مقاصد میں سے ہر ہر مقصد اپنی جگہ پر نہایت ہی صحیح ضروری اور شریعت کے عین مطابق تھا، اس لیے ان سے کسی کو اختلاف یا ان کا انکار نہ ہونا چاہیے۔

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی، جس کی تعریف علماء تصوف نے یہ فرمائی ہے کہ ھو علم الخ وہ ایسا علم ہے کہ جس کے ذریعہ نفوس کا تزکیہ، اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر وباطن کی تعمیر کے احوال پہچانے

جاتے ہوں، جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے، اب آپ خود غور فرمائیے کہ اس میں کونسی چیز غلط ہے، نفس کا تزکیہ غلط ہے یا اخلاق کا تصفیہ بُرا ہے، ظاہر و باطن کی تعمیر لغو ہے؟ یا سعادت ابدیہ کی تحصیل بے کار ہے، اسی طرح تقویم اخلاق تہذیب نفس نیز نفس کو اعمال دین کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنالینا ان امور میں کونسی شے مقاصد شرع کے خلاف ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، بلکہ ان سے ہر ایک شے کتاب وسنت کے عین مطابق اور اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منشاء کو پورا کرنے والی ہے۔

غرض ہم جس تصوف کے اثبات کے قائل ہیں وہی ہے جس کو شرع میں احسان کہتے ہیں یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے یا تعمیر الظاہر والباطن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ اُصول وآداب ہیں جن کی رعایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لُب کہنا بجا ہے اور جب ان آداب وشرائط ہی کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ غیر تصوف قرار دے دیا جائے تو پھر تو وہ طریق ہی نہیں جو کہ ہمارا موضوع بحث ہے، اس لیے کہ ان کی خرابیاں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح حقیقی تصوف اور طریق کو نہیں قرار دیا جاسکتا، اب اگر آپ کو تصوف سے محض اس بناء پر چڑ اور انکار ہے کہ اس کا نام محدث ہے تو اس میں تصوف ہی تو متفرد نہیں نہ معلوم کتنی چیزیں اس وقت موجود ہیں اور آپ کا ان سے تعلق بھی ہے جو کہ ابتداء اسلام میں ان ناموں سے معروف نہ تھیں، میں کہتا ہوں کہ اس کا اسم اگر بدعت ہے تو مسمی تو اس کا بدعت نہیں، آپ اس کو احسان سے تعبیر کر لیجئے، علم الاخلاق اس کا نام رکھ لیجئے اور جو شخص کہ اس سے متصف ہو اس کو محسن، مقرب، متقی اور مخلص کہہ لیجئے اور احسان اور محسن اور متقی مخلص کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے، حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نور اللہ مرقدہٗ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ (اصل کتاب میں صرف عربی عبارت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی دعوت دی تھی، ان میں سب سے مہتم بالشان امور تین ہیں:

(۱)...... تصحیح عقائد جس کا ذمہ علماء اُمت کے اہل اصول نے اُٹھایا ہے، اللہ جل شانہ ان کی مساعی کو مشکور فرمائے۔

(۲)...... دوسری چیز اعمال کا صحیح طور پر ادا کرنا اور سنت کے موافق ان سب کو ادا کرنا، اس فن کو اُمت کے فقہاء نے اپنے ذمہ لیا، جن کی کوشش سے اللہ جل شانہ نے بہت سے لوگوں کو ہدایت فرمائی اور گمراہ فرقوں کے اعمال کو راہ راست پر لائے، اس کے بعد شاہ صاحب نے احسان کا بیان فرمایا ہے اور آیات واحادیث سے اس کو مبرہن فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ تصحیح اخلاص واحسان کہ

جواس دین کی اصل ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔

(۳)......اس کے بعد شاہ صاحب نے آیات واحادیث اخلاص واحسان کی تحریر فرما کر تحریر فرمایا ہے کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ تیسرا جزءِ شریعت کے مقاصد کا سب سے دقیق فن ہے اور بہت گہرا ہے جملہ شرائع کے مقابلہ میں جو بمنزلہ روح کے ہے بدن کے مقابلہ میں اور فن کا تکفن صوفیاء نے کیا ہے کہ انہوں نے خود ہدایت پائی اور دوسروں کو ہدایت فرمائی، خود سیراب ہوئے اور دوسروں کو سیراب کیا اور انتہائی سعادت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔

دیکھئے! شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اخلاص واحسان ایسی عظیم چیزیں ہیں کہ علوم واعمال کی ان کے بغیر حیثیت ہی باقی نہیں رہتی، اسی مضمون کو ملا علی قاری نے حدیث جبرائیل کی شرح میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد اخلاص ہے، اس لیے کہ اخلاص شرط ہے ایمان واسلام کی صحت کے لیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ احسان مرادف ہے اخلاص کا بغیر اس کے اسلام وایمان دونوں صحیح نہیں ہوتے اور عمل کی قبولیت بھی اسی پر منحصر ہے، اس کے بغیر علوم واعمال کی کچھ حیثیت ہی نہیں رہ جاتی، چنانچہ اعمال کے اعتبار سے تو یہ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ بدون اخلاص کے وہ جسم بلا روح رہ جاتے ہیں، یعنی مُردہ اور علوم کے اعتبار سے یوں تشبیہ دی کہ وہ گویا الفاظ بلا معنی رہ جاتے ہیں، بالکل مہمل اور شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی بھی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں کہ احسان اشارہ ہے اصل تصوف کی طرف اور تصوف کے جملہ معنی جن کی طرف مشائخ طریقت اشارہ فرماتے ہیں اسی طرف راجع ہیں۔

آگے شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ علم حدیث بالذات ہر چیز پر مقدم ہے لیکن حقیقت میں تصوف کتاب اللہ اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح ہے، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں کہ طریقت شریعت پر عمل کرنے کا نام ہے اور شریعت اعمالِ ظاہرہ کا نام ہے اور یہ دونوں اور حقیقت تینوں چیزیں آپس میں متلازم ہیں۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی ایک تحریر اور چند ملفوظات دربارہ تصوف

چنانچہ حضرت امام ربانی گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ بھی اپنے مکاتیب میں تحریر فرماتے ہیں ''فی الواقع'' شریعت بھی فرض اور مقصد اصلی ہے، طریقت بھی شریعت باطنی ہے اور حقیقت ومعرفت متمم شریعت ہے، اتباع شریعت بکمال بدون معرفت نہیں ہوسکتا۔''

(مکاتیب رشیدیہ: ص ۲۴)

مولانا وصی صاحب کا یہ رسالہ بہت طویل ہے اور اس کا اقتباس بھی بہت طویل ہے، اس میں

تصوف کی حقیقت، بیعت کی ضرورت، شیخ کی شرائط اور اس کے اتباع کی ضرورت پر بہت زیادہ کلام کیا گیا ہے، اس کا اختصار بھی بہت طول کو چاہتا ہے اسی طرح حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت امام ربانی گنگوہی قدس سرہٗ کی سوانح تذکرۃ الرشید کے حصہ دوم میں طریقت کے عنوان میں اس کی ضرورت پر بہت تفصیلی کلام کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ سلوک نام ہے ''تعمیر الظاہر والباطن'' کا یعنی اعضاء ظاہر اور قلب کا اپنے مولیٰ تعالیٰ شانہ کی طاعت و خدمت میں مشغول رکھنا بایں طور کہ ہادی عالم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریق اور تعلیم فرمائی ہوئی شریعت کے اتباع کی اس درجہ عادت پڑ جائے کہ سنت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنا طبعی شیوہ اور خلقی شعار بن جائے تکلف کی حاجت نہ رہے۔

تصوف اصل ایمان ہے کوئی زائد شے نہیں، یہی ایمان جس کا ہر مسلمان مدعی ہے، اصل، سلوک ہے بشرطیکہ اس کی اصلیت اور حلاوت قلب کو عطاء ہو جائے، یہی شریعت جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عالم کو سکھائی ہے، اصل درویشی اور طریقت ہے مگر اس وقت جب کہ اعضاء سے متعدی ہو کر قلب تک پہنچ جائے اور عمل واکتساب قلبی انس و تعلق کا ثمرہ بن جائے۔ ایک بیمار شخص جس کو مطلق بھوک نہ معلوم ہو طبیب کے حکم سے غذا کھاتا ہے مگر جبراً وقہراً تاکہ طاقت بنی رہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جو بحالت تندرستی وبصحت تامہ صادق اشتہاء پر غذا کھا رہا ہے۔ غذا کھانے میں دونوں برابر ہیں۔ مگر ایک جبر و کراہت سے کھا رہا ہے اور دوسرا رغبت واشتہاء سے۔ اسی طرح آدمی عبادت کرتا ہے مگر نفس کو مجبور بنا کر اور صاحب نسبت ولی اسی عبادت میں مشغول ہوتا ہے مگر بایں وجہ کہ دل کا تقاضہ اس طاعت میں مشغول ہونے پر اس کو مجبور کر رہا ہے۔ اسی صحت کاملہ کا نام طریقت ہے جو قلب کو حاصل ہوتی ہے اور اس روحانی غذا کا جس کو شریعت کہا جاتا ہے، سچا خواہش مند اور شیدا بنا دیتا ہے۔

مولانا نے تصوف کی حقیقت، اس کی ضرورت وغیرہ امور پر طویل کلام کرنے کے بعد حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کی ایک تحریر نقل کی ہے جو حضرت قدس سرہٗ نے اپنے اوائل عمر میں معلوم نہیں کس ضرورت سے تحریر فرمائی تھی اس کو تبرکاً بعینہٖ مع ترجمہ مولانا میرٹھی نقل کرتا ہوں۔ حضرت فرماتے ہیں:

''علم الصوفية علم الدين ظاهراً و باطناً و هوا لعلم الأعلى حالهم اصلاح الأخلاق و دوام الإفتقار إلى الله تعالىٰ، حقيقة التصوف التخلق بأخلاق الله تعالىٰ و سلب الإرادة كون العبد في رضا ء الله تعالىٰ، اخلاق الصوفية ما هو خلقه عليه السلام بقوله إنك لعلىٰ خلق عظيم وما ورد به الحديث وتفصيل أخلاقهم''

''هكذا التواضع ضده الكبر، المداراة واحتمال الاذىٰ عن الخلق المعاملة برفق و خلق حسن، و ترك غضب و غيظ، المواسات و الإيثار بفرط الشفقة على الخلق وهو تقديم حقوق الخلق على حظوظه، السخاوة، التجاوز والعفو، طلاقة الوجه والبشرة، السهولة ولين الجانب، ترك التعسف والتكلف، انفاق بلا اقتار و ترك الإدخار التوكل، لقناعة بيسير من الدنيا ألورع، ترك المراء و الجدال و العتب الابحق، ترك الغل والحقد والحسد، ترك المال و الجاه، وفاء الوعد، الحلم الإناءة، التواد و التوافق مع الإخوان والعزلة عن الأغيار، شكر المنعم، بذل الجاه للمسلمين الصوفي يهذب الظاهر والباطن في الأخلاق، والتصوف، أدب كله ادب الحضرة الإلهية، الاعراء عما سواه حياء و إجلا لا وهيبة، أسؤالمعاصى حديث النفس وسبب الظلمة۔''

ترجمہ: صوفیاء کا علم نام ہے ظاہر و باطن، علم دین اور قوت یقین کا اور یہی اعلیٰ علم ہے، صوفیاء کی حالت، اخلاق کا سنوارنا اور ہمیشہ خدا کی طرف لولگائے رکھنا ہے، تصوف کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے مزین ہونا اور اپنے ارادہ کا چھن جانا ہے اور بندہ کا اللہ تعالیٰ کی رضا میں بالکلیہ مصروف ہوجانا ہے، صوفیاء کے اخلاق وہی ہیں جو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق ہے، حسب فرمان خداوند تعالیٰ کہ بے شک تم بڑے خلق پر پیدا کیے گئے ہو اور نیز جو کچھ حدیث میں آیا ہے، اس پر عمل اخلاق صوفیاء میں داخل ہے، صوفیاء کے اخلاق کی تفصیل اس طرح ہے، اپنے آپ کو کمتر سمجھنا اور اس کی ضد ہے تکبر، مخلوق کے ساتھ تلطف کا برتاؤ کرنا اور خلقت کی ایذاؤں کو برداشت کرنا، نرمی اور خوش خلقی کا معاملہ کرنا، غیظ وغضب کا چھوڑ دینا، ہمدردی اور دوسروں کو ترجیح دینا، خلق پر فرطِ شفقت کے ساتھ جس کا یہ مطلب ہے کہ مخلوق کے حقوق کو اپنے حظِ نفسانی پر مقدم رکھا جائے، سخاوت کرنا، درگزر اور معاف کرنا، خندہ روئی اور بشاشت جسم سہولت اور نرم پہلو رکھنا، تصنع اور تکلف کا چھوڑ دینا، خرچ کرنا بلاتنگی اور بغیر اتنی فراخی کے کہ احتیاج لاحق ہو، خدا پر بھروسہ رکھنا، تھوڑی سی دنیا پر قناعت کرنا، پرہیزگاری، جنگ وجدل اور عتاب نہ کرنا مگر حق کے ساتھ، بغض وکینہ وحسد نہ کرنا، عزت وجاہ کا خواہش مند نہ ہونا، وعدہ پورا کرنا، بردباری، دوراندیشی، بھائیوں کے ساتھ موافقت ومحبت رکھنا، اغیار سے علیحدہ رہنا، محسن کی شکرگذاری، جاہ کا مسلمانوں کے لیے خرچ کرنا، صوفی اخلاق میں اپنا ظاہر و باطن مہذب بنالیتا ہے اور تصوف سارا ادب ہی کا نام ہے، بارگاہِ احدیت کا ادب یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے منہ

پھیر لیا جائے، شرم کے مارے حق تعالیٰ کے اجلال و ہیبت کے سبب، بدترین معصیت ہے تحدیث نفس یعنی نفس سے باتیں کرنا اور ظلمت کا سبب ہے"۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۱۲/ج ۲)

امام ربانی قدس سرہٗ کی یہ چند سطور سرنامہ اور عنوان ہیں، ان تمام مباحث کا جو طریقت کے فن میں ہزار ہا ضخیم کتابوں کے اندر اولیاء اللہ نے جمع کیے ہیں۔

۶ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ چند خاص لوگوں کے مجمع میں جب کہ آپ بوقت چاشت گولر کے نیچے دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ کی زبان مبارک سے یہ تقریر ظاہر ہوئی، جس کو مولوی برکت اللہ صاحب نے اسی وقت قلمبند کر لیا تھا، ہدیہ ناظرین کرتا ہوں وہ یہ ہے:

"تمام اذکار و اشغال و مراقبات وغیرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی حضوری ہر وقت میسر رہے، بعض نے اس حضوری کے بھی دو درجے کر دیئے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اسمِ ذات مخیلہ میں قائم ہو جائے، پھر اسم سے مسمیٰ کی طرف آسانی سے راستہ مل جاتا ہے یہ جو بزرگوں نے چلہ وغیرہ کا طریقہ ایجاد کیا تھا، اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ کوئی دوسرا خیال اور نقش مخیلہ پر نہ پڑے، مثلاً باہر نکلو تو گھونگھٹ کر کے نکلو کہ کسی کو دیکھو تو اس کی صورت کا نقش مخیلہ کو مکدر کر دے گا، جس طرح انسان کو اپنی ہستی کا ہمہ وقت علم ہے کہ میں ہوں، بس ایسا ہی علم حق تعالیٰ کے ساتھ رہنا چاہیے۔"

اپنے شیخ سے محبت اور اس کے چند واقعات

"پہلے بزرگ اخلاق سیئہ چھڑانے کی محنتیں کرایا کرتے تھے، تاکہ یہ کام آسان ہو جائے، مگر متاخرین خصوصاً ہمارے سلسلہ کے بزرگوں نے یہ طریق پسند کیا ہے کہ ذکر کی اس قدر کثرت کرے کہ اخلاق کے نیچے دب جائیں اور تمام باتوں پر غالب آ جائے، اخلاق سیئہ بہت سے ہیں مگر اکثر نے دس میں محصور کر دیا ہے، پھر ان دسوں کا خلاصہ تکبر کو بتایا ہے کہ اگر یہ دُور ہو جائے تو باقی خود دُور ہو جاتے ہیں"۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی شخص بیس سال رہا اور ایک روز عرض کیا کہ حضرت اتنی مدت میں مجھے آپ سے کچھ حاصل نہ ہوا، وہ شخص قوم کا سردار اور برادری میں ممتاز تھا، آپ سمجھ گئے کہ اس کے دل میں بڑائی ہے، فرمایا اچھا ایک بات کرو، اخروٹوں کا ایک ٹوکرا بھر کر خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور پکارو کہ جو شخص مجھے ایک جوتا مارے گا، اس کو ایک اخروٹ دوں گا اور جو دو مارے گا تو دو دوں گا، اسی طرح زیادہ کرتے جاؤ، جب یہ کام کر چکو اور اخروٹ کا ٹوکرا خالی ہو جائے تب میرے پاس آؤ، اس شخص نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ حضرت! یہ کام مجھ سے

ہر گز نہ ہوگا، حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ وہ مبارک کلمہ ہے کہ اگر ستر برس کا کافر ایک مرتبہ صدق دل سے پڑھ لے تو واللہ مومن ہو جائے، مگر تو اس وقت اس کے پڑھنے سے کافر طریقت ہوگیا، حالانکہ تجھے مجھ سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

دوسرے کسی بزرگ کا نام لے کر فرمایا کہ ان کے پاس ایک شخص مدتوں رہا اور پھر شکایت کی کہ قلب کی حالت دُرست نہ ہوئی، شیخ نے دریافت فرمایا کہ میاں، درستی سے تمہارا کیا مقصود ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ حضرت! جو نعمت آپ سے ملے گی وہ آپ سے لے کر دوسروں کو پہنچاؤں گا، شیخ نے فرمایا بس! اسی نیت کی تو ساری خرابی ہے کہ پہلے سے پیر بننے کی ٹھان رکھی ہے۔

اس بیہودہ خیال کو جی سے نکال دو اور یوں خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں طرح طرح کی نعمتیں دی ہیں ان کا شکر اور بندگی ہم پر فرض ہے۔ پس اس اُمید پر جو لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں یا نماز پڑھتے ہیں کہ ہمیں اس کا نفع ملے گا یہ ان کی حماقت ہے، ان کی نیت میں فساد ہے، کیسا نفع؟ کہاں کا اجر؟ یہ ہستی، یہ جسم، یہ آنکھیں، یہ ناک، یہ کان، یہ زبان، یہ حواس جو حق تعالیٰ نے ہمیں دے رکھے ہیں پہلے ان کا شکریہ سے تو فراغت ہولے تب دوسرے نفع اور اجر کی توقع کرے۔

حافظ زاہد حسین صاحب نے اس موقع پر سوال کیا کہ حضرت جیسا کہ آپ نے فرمایا اگر کوئی شخص ہر وقت اللہ کو یاد رکھے تو کافی ہے اور کچھ اس کے واسطے ضروری نہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا، بس فرائض اور سنن موکدہ، اللہ کا ذکر کرنا ہی زندگی کا فائدہ ہے، باقی تمام نقصان ہی نقصان ہے، اگر کسی سے بحضور قلب نہ ہو سکے زبان ہی زبان تک رہے، تاہم فائدہ سے خالی نہیں۔

(تذکرۃ الرشید: ص ۱۳ ار ج ۲)

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا یہ ارشاد میں غالباً آپ بیتی میں بھی کسی جگہ لکھوا چکا ہوں کہ ایک دفعہ حضرت قدس سرہٗ گھر سے کھانا تناول فرما کر دوپہر کے وقت تشریف لا رہے تھے، حجرہ کے قریب پہنچ کر ارشاد فرمایا کوئی ہے؟ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے فرمایا، حضرت یحییٰ! اور الیاس! یعنی میرے چچا جان، حضرت قدس سرہٗ نے نہایت بھرائی ہوئی آواز میں ارشاد فرمایا، غور سے سنو! اللہ کا نام چاہے کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا، میں نے اپنے اکابر کو اس سلسلہ میں ایک چیز کا بہت ہی پابند اور اہتمام کرتے ہوئے دیکھا ہے، یعنی شیخ سے محبت عشق کے درجے سے بھی آگے، میں اپنے رسالہ اسٹرائیک کے شروع میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے لکھوا چکا ہوں کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا الحاج صدیق احمد

صاحب انبہٹوی خلیفہ حضرت گنگوہی سے نقل کیا ہے کہ ہمارے حضرات کے سلسلہ میں بطریق جذب نفع پہنچتا ہے، نہ بطریق سلوک۔ (النور: ص ۱۱ ربیع ۴۲ھ)

میں نے اپنے اکابر کے حالات میں خود بھی دیکھا اور سوانحوں میں بہت کثرت سے پڑھا اور جو پڑھا وہ واقعی آنکھوں سے دیکھا بھی کہ اپنے شیخ سے محبت عشق کے درجہ سے زیادہ پائی، اعلیٰ حضرت گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ پان نہیں تناول فرمایا کرتے تھے لیکن اُگالدان رہتا تھا، کبھی کھانسی وغیرہ میں بلغم اس میں ہوتا تھا، سوکھ بھی جاتا تھا۔

حضرت شیخ الہند نوراللہ مرقدہٗ نے ایک مرتبہ اس اُگالدان کو بہت چپکے سے کوئی نہ دیکھے اُٹھایا اور باہر لے جاکر اس کو دھو کر پی لیا، علی میاں نے حضرات رائے پوری ثانی نوراللہ مرقدہٗ کی سوانح صفحہ ۶۸ میں یہ لکھا ہے کہ حضرت کا اپنے شیخ سے وہ عاشقانہ اور والہانہ تعلق تھا جس کو مناسبت اور ترقی باطن میں ہزار اذکار اور ریاضوں سے زیادہ دخل ہے اس کی کیفیت یہ تھی:

انبساط عید دیدن روئے تو
عید گاہِ ما غریباں کوئے تو

ذکر کے علاوہ حضرت کی خدمت میں مشغولیت رہتی تھی، ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت کو لٹا کر بدن دباتا تو دیر کے بعد حضرت فرمادیتے کہ جاؤ مولوی صاحب آرام کرو، میں کیواڑ بند کر کے اپنی جگہ آجاتا، پھر خیال آتا کہ کوئی مکھی منہ پر بیٹھ کر نہ ستاتی ہو، پھر دبے پاؤں آکر دیکھا، اسی طرح آتا جاتا رہتا، یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو جاتا، فرمایا کہ کبھی حضرت کی خدمت میں بے وضو حاضر نہیں ہوا اور ہر وقت باوضو رہتا تھا، حضرت اکثر شفقت اور محبت کا برتاؤ فرماتے، میں کبھی ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ میں تو اپنی اصلاح کے لیے آیا ہوں اور حضرت کی شفقتیں ایسی ہیں کہ جن سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں میں نااہل نہ سمجھا جا رہا ہوں اور مجھے ناکارہ سمجھ کر یہ شفقتیں ہو رہی ہیں۔

اس پر حضرت جواب فرماتے نہیں مولوی صاحب! میں تمہاری طرف سے بے خبر نہیں ہوں، اکثر یہ بھی ہوتا کہ بلا کسی قصور کے ڈانٹ دیا کرتے، پھر دیکھتے کہ مجھ پر اس ڈانٹ کا کوئی اثر تو نہیں، مگر الحمدللہ کہ مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ (سوانح حضرت رائے پوری: ص ۶۸)

تذکرۃ الرشید میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کے ابتدائی حالات میں میں ایک واقعہ شاید کہیں لکھوا بھی چکا ہوں، حضرت امام ربانی نوراللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو تھانہ بھون میں رہتے ہوئے چند روز گزرے تو میری غیرت نے اعلیٰ حضرت پر کھانے کا بار ڈالنا گوارا نہیں کیا، آخر میں نے یہ سوچ کر کہ دوسری جگہ انتظام کرنا بھی دشوار ہے اور ناگوار بھی، رخصت چاہی، حضرت نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ ابھی چند روز ٹھہرو، میں خاموش ہو گیا، قیام کا قصد تو کر لیا مگر اس کے

ساتھ ہی یہ بھی فکر ہوا کہ کھانے کا انتظام کسی دوسری جگہ کرنا چاہیے، تھوڑی دیر بعد جب اعلیٰ حضرت مکان تشریف لے جانے لگے تو میرے وسوسہ پر مطلع ہو کر فرمانے لگے۔ میاں رشید احمد! کھانے کی فکر مت کرنا ہمارے ساتھ کھانا، دوپہر کو کھانا مکان سے آیا تو ایک پیالے میں کوفتے تھے، نہایت لذیذ اور دوسرے پیالہ میں معمولی سالن، اعلیٰ حضرت نے مجھے دسترخوان پر بٹھالیا مگر کوفتوں کا پیالہ مجھ سے علیحدہ اپنی طرف رکھا اور معمولی سالن کا پیالہ میرے قریب سرکا دیا، میں اپنے حضرت کے ساتھ کھانا کھانے لگا، اتنے میں حضرت حافظ ضامن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تشریف لائے، کوفتوں کا پیالہ مجھ سے دور رکھا ہوا دیکھ کر اعلیٰ حضرت سے فرمایا۔ بھائی صاحب! رشید احمد کو اتنی دُور ہاتھ بڑھانے میں تکلیف ہوتی ہے اس پیالہ کو اِدھر کیوں نہیں رکھ دیتے، اعلیٰ حضرت نے بے ساختہ جواب دیا، اتنا بھی غنیمت ہے کہ اپنے ساتھ کھلا رہا ہوں، جی تو یوں چاہتا ہے کہ چوڑوں چماروں کی طرح الگ ہاتھ پر روٹی رکھ دیتا، اس فقرہ پر اعلیٰ حضرت نے میرے چہرے پر نظر ڈالی کہ کچھ تغیر تو نہیں آیا۔ مگر الحمدللہ میرے قلب پر بھی اس کا کچھ اثر نہ تھا، میں سمجھتا تھا کہ جو کچھ فرمارہے ہیں بالکل سچ ہے، اس دربار سے روٹی ہی کا ملنا کیا تھوڑی نعمت ہے، جس طرح بھی ملے بندہ نوازی ہے، اس کے بعد حضرت نے پھر کبھی میرا امتحان نہیں لیا، اس کے بعد فرمایا، اسی لیے مجھے کچھ یاد آیا نہیں۔

حضرت تھانوی کے ملفوظات

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حافظ محمد ضامن رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مرشد حضرت میاں جیو کے ہمراہ ان کا جوتا بغل میں لے کر توبرہ گردن میں ڈال کر جھنجھانہ جاتے تھے اور ان کے صاحبزادے کے سسرال بھی وہیں تھے، لوگوں نے عرض کیا کہ اس حالت سے جانا مناسب نہیں، وہ لوگ حقیر سمجھ کر رشتہ نہ توڑ ڈالیں، حافظ صاحب نے فرمایا کہ رشتہ کی ایسی تیسی، میں جانے میں اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ (اروحِ ثلاثہ:ص)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مولوی احمد حسن کانپوری جب حضرت حاجی صاحب قدس سرۂ العزیز کی خدمت میں پہنچے ہیں، منشی محمد جان مرحوم کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز مولوی صاحب کو دیکھا کہ حضرت کی جوتی جو کہ مجلس سے باہر رکھی تھی سر پر رکھ کر زار زار رو رہے تھے۔ (اورحِ ثلاثہ:ص ۴۲۵)

آپ بیتی نمبر ۲ میں ایک مضمون لکھوا چکا ہوں کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی رئیس الاحرار نے مجھ سے پوچھا تھا، بہت عرصہ کی بات ہوگئی کہ یہ تصوف کیا بلا ہے؟ بہت دلچسپ قصہ

ہے، مفصل تو اپنی جگہ گزر چکا، اس ناکارہ نے اس وقت یہ جواب دیا تھا کہ تصوف کی حقیقت صرف تصحیح نیت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتداء ''إنما الأعمال بالنيات'' سے ہوتی ہے اور انتہا ''ان تعبد الله كانك تراه'' اسی کو یادداشت کہتے ہیں اسی کو حضوری کہتے ہیں، اسی کو نسبت کہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ مولانا! سارے پاپڑ اسی ایک بات کے لیے بیلے جاتے ہیں اسی کے لیے شغل ہوتا ہے، اسی کے لیے مجاہدات اور مراقبے ہوتے ہیں اور جس کو اللہ جل شانہ اپنے لطف وکرم سے کسی بھی طرح سے یہ دولت عطاء کردے اس کو کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیا اثر سے ایک ہی نظر میں سب کچھ ہو جاتے تھے اور ان کو کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی، اس کے بعد اکابر اور حکماء اُمت قلبی امراض کی کثرت کی بناء پر مختلف علاج جیسا کہ اطباء بدنی امراض کے لیے تجویز کرتے ہیں، رُوحانی اطباء روحانی امراض کے لیے ہر زمانہ کے مناسب اپنے تجربات جو اسلاف کے تجربات سے مستنبط تھے، نسخے تجویز فرماتے ہیں جو بعض کو بہت جلد نفع پہنچاتے ہیں، بعضوں کو بہت دیر لگتی ہے، پھر میں نے مرحوم کو متعدد قصے سنائے جو وہاں گزر چکے اور جیسے شیخ کے ساتھ محبت اس سلسلہ میں ضروری ہے ایسے ہی شیخ کی ناراضی اس میں سم قاتل ہے۔

اشرف السوانح میں لکھا ہے کہ بالخصوص تعلق ارادت قائم کر لینے کے بعد پھر گستاخی اور بے ادبی کرنا تو خاص طور سے زیادہ موجب وبال ہوتا ہے، چنانچہ خود حضرت والا (حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ) فرماتے ہیں کہ اس تعلق میں بعض اعتبارات سے معصیت اتنی مضر نہیں ہوتی جتنی بے ادبی مضر ہو جاتی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ معصیت کا تعلق تو اللہ تعالیٰ سے ہے اور چونکہ وہ تاثر وانفعال سے پاک ہیں اس لیے توبہ سے فوراً معافی ہو جاتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ویسا ہی تعلق پیدا ہو جاتا ہے، بخلاف اس کے بے ادبی کا تعلق شیخ سے ہے اور وہ چونکہ بشر ہے اس لیے طالب کی بے ادبی سے اس کے قلب میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو مانع ہو جاتی ہے تعدیہ فیض سے، پھر حضرت والا نے فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی خوب مثال دی تھی۔

فرمایا کہ اگر کسی چھت کی میزاب کے مخرج میں مٹی ٹھونس دی جائے تو جب آسمان سے پانی برسے گا تو گو وہ چھت پر تو نہایت صاف وشفاف حالت میں آئے گا لیکن جب میزاب میں ہو کر نیچے پہنچے گا تو بالکل گدلا اور میلا ہو کر، اسی طرح شیخ کے قلب پر جو ملاء اعلیٰ سے فیوض و انوار نازل ہوتے رہتے ہیں ان کا تعدیہ ایسے طالب کے قلب پر جس نے شیخ کے قلب کو مکدر کر رکھا ہے مکدر صورت ہی میں ہوتا ہے جس سے اس طالب کا قلب بجائے منور و مصفا ہونے کے

تیرہ ومکدر ہوتا چلا جاتا ہے اھ۔

حضرت والا یہ بھی فرماتے ہیں کہ اپنے شیخ کے قلب کو مکدر رکھنے کا طالب پر یہ وبال ہوتا ہے کہ اس کو دنیا میں جمعیت قلب کبھی میسر نہیں ہوتی اور وہ عمر بھر پریشان ہی رہتا ہے، لیکن چونکہ یہ ضروری نہیں کہ ہر فعل موجب تکدر شیخ معصیت ہی ہو، اس لیے ایسی صورت میں اس فعل سے براہِ راست تو کوئی دینی ضرر نہیں پہنچتا، لیکن وہ بواسطہ اکثر سبب ہو ہی جاتا ہے، جس کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ اول شیخ کے قلب کا تکدر سبب ہوتا ہے، طالب کے انشراح قلبی کے زوال کا اور پھر یہ عدم انشراح اکثر سبب ہو جاتا ہے کوتاہی اعمال کا اور پھر یہ کوتاہی اعمال سبب ہو جاتی ہے دینی ضرر اور اخروی وبال کا، گو عدم انشراح کی حالت میں بھی اگر وہ اپنے اختیار وہمت سے برابر کام لیتا رہے اور اعمالِ صالحہ کو بتکلف جاری رکھے تو پھر کوئی بھی دینی ضرر نہ پہنچے، لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ انشراح کے فوت ہو جانے سے اعمال میں بھی کوتاہیاں ہونے لگتی ہیں، اس طرح بالواسطہ دینی ضرر کا بھی اکثر تحقق ہو ہی جاتا ہے، کیونکہ جو داعیہ عادیہ تھا، یعنی انشراح وہ تو جاتا رہا اور بلا داعیہ اکثر عمل بہت دشوار ہوتا ہے اھ۔

اسی سلسلہ میں حضرت والا یہ بھی فرمایا کرتے ہیں کہ گو میں خود کوئی چیز نہیں لیکن جس کسی نے کسی شخص کو اپنا معتقد فیہ بنالیا اور پھر بلا وجہ اس کے ساتھ خلاف اعتقاد معاملہ کر کے اس کو مکدر کر دیا تو اس صورت میں بھی ایسی ہی مضرتیں پہنچیں گی، جیسی کاملین ومقبولین کو مکدر کرنے سے پہنچتی ہیں۔
(اشراف السوانح: ص ۲۵ رج ۲)

آپ بیتی نمبر ۴ پر اپنے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک کشفی پیام لکھوا چکا ہوں کہ اللہ والوں سے ڈرتے رہنا، ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے، اس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا، حضرت اقدس مولانا الحاج عبدالقادر صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے میں نے اس کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ صحیح ہے کہ اُلٹی بات اُلٹی ہی ہوتی ہے لیکن اہل اللہ کے قلوب میں اگر کسی کی طرف سے تکدر پیدا ہو جائے، خواہ وہ کسی غلط بات ہی کی وجہ سے ہو تو ان کے پاک دل کا تکدر، خواہ وہ کسی غلط بات ہی کی وجہ سے رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ اس شخص کو کسی مصیبت میں پھانس دیتا ہے، یہ بات میری خوب سمجھ میں آ گئی اور اس کے نظائر میں نے بہت دیکھے، اسی لیے میں اسباق حدیث میں طلبہ کو اس پر بہت ہی زیادہ تنبیہ کرتا رہا کہ ان اللہ والوں سے بہت ڈرتے رہنا، ان کے دل میں تمہاری طرف سے تکدر نہ پیدا ہونا چاہیے اور یہ جب جملہ اہل اللہ کے ساتھ ہے تو جس شخص سے بیعت کا تعلق ہو اس کے قلبی تکدر سے تو بہت زیادہ ڈرنا چاہیے جیسا کہ حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں بھی گزر چکا اور میرے ذاتی تجربے بھی اس کے متعلق بہت کثرت سے

ہیں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اہل اللہ کے تکدر سے محفوظ فرمائے۔

ایک سلسلہ گفتگو میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اصلاح کا باب نہایت ہی نازک ہے ایسا ہی شیخ کا تعلق بھی نازک ہے، کیونکہ اس طریق میں نفع کا مدار مناسبت پر ہے، بدون مناسبت کے نفع نہیں ہوسکتا یہ اعظم شرائط ہے اور یہی مناسب پُل صراط ہے، ایک صاحب نے بہت عرصہ تک خط و کتابت کی اور ہر خط میں بیعت کی درخواست کی مگر میرا جی قبول نہ کرتا، آخر بہت ہی کھود کرید کے بعد چور نکلا، ایک خط میں لکھا کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کے مزاج میں سختی ہے، کیا اس خیال کے ساتھ نفع ہوسکتا ہے، اب بتلائیے میں مرید کر لیتا اور اس کے بعد یہ خط آتا تو کتنا رنج ہوتا، بعض چیزیں ذوقی اور وجدانی ہوتی ہیں، پہلے سے انقباض کی دلیل کیا بیان کی جائے، اس کا کوئی کیا انتظام کرسکتا ہے، میں نے لکھ دیا کہ کہیں اور جگہ اصلاح کا تعلق پیدا کرلو، مجھ سے تم کو نفع نہ ہوگا، اعتراض اور نفع دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ (افاجات: ص ۲۵۰)

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک مقولہ نقل کیا ہے کہ ''ہر درویشے کہ چوں وچرا کند وہر طالب علمے کہ چوں وچرا کند ہر دو را در چراگاہ باید فرستاد'' (یعنی جو مرید شیخ کے ساتھ چوں چراں کرے اور ہر طالب علم جو اُستاد کے ساتھ چوں و چراں نہ کرے ان دونوں کو چراگاہ میں بھیج دینا چاہیے یعنی جانور ہیں آدمی نہیں)۔

اس طریق میں اہم چیز طلب ہے

اس کے ساتھ ہی اس سلسلہ کی اہم چیز طلب ہے میں کسی جگہ غالباً لکھوا چکا ہوں کہ میرے حضرت میرے مرشد نور اللہ مرقدہٗ نے میرے ہی ایک خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ میری (حضرت قدس سرہٗ) کوئی حقیقت نہیں، میری تو مثال تو نل کی سی ہے کہ پانی کھینچنے والا جس قوت و شدت سے پانی کھینچتا ہے مبداء فیاض کی طرف سے اسی کے موافق عطاء ہوتا ہے، لیکن عطاء ہوتا ہے نل ہی کے ذریعہ سے، حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ اصل چیز طلب ہے اسی طلب پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جیسے بچے کو ماں کے دودھ کی طلب ہوتی ہے تو دودھ اس کے اثر سے اُترتا ہے تو ماں کو ناز نہ کرنا چاہیے کہ میں دودھ دیتی ہوں، دودھ خود بچے کی طلب کا اثر ہے، تجھ کو اسی واسطے عطاء فرمایا ہے کہ تو بچے کو دے، البتہ بچے کو ضروری ہے کہ اس کو اپنا محسن سمجھے، اسی بناء پر حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک بار فرمایا کہ شیخ اپنے پاس سے کچھ نہیں دیتا، مرید ہی میں سب ذخیرہ ہے، شیخ سے اس کا ظہور ہوجاتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لیکن مرید کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے، سبحان اللہ تحقیق اور تربیت دونوں کو کس طرح جمع فرمادیا۔

(افاضات: ص ۲۹۲)

اعلیٰ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے مکاتیب میں بکثرت یہ مضمون مختلف عنوانات سے مذکور ہے کہ اصل چیز طلب ہے، ایک جگہ اپنے اجل خلیفہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی نور اللہ مرقدہٗ کے خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں، اصل سب کا حضور ہے اور بس اور یہ نعمت دفعۃً حاصل ہو جانا محض احسان حق تعالیٰ کا ہے، اس ناکارہ کو ساری عمر گزری کچھ بھی نصیب نہ ہوا، چاہ (کنویں) سے پانی چلتا ہے اور بذریعہ نالی ونل کے زراعت میں جاتا ہے، نل نالی کو کچھ حظ نہیں محض واسطہ ہے، علیٰ ہذا یہ ناقص واسطہ واقع ہوا ہے گو خود خشک لب ومحروم ہے، اب خود آپ سے التجاء دعاء کرتا ہوں۔ (مکاتیب رشیدیہ: ص ۱۷)

دوسرے طویل مکتوب میں جو حضرت مولانا مرحوم ہی کے نام سے ہے تحریر فرماتے ہیں کہ خواب جو دیکھے اور نقل کیے، سب رویاء صالحہ ہیں، تعبیر کی ضرورت نہیں، البتہ اس کے بیان کی ضرورت ہے کہ آپ اس عاجز یا برہنہ کے پیچھے جو اپنے آپ کو دیکھتے ہو اس کی دو وجہ ہیں، ایک تو آپ کے عقیدہ میں یہ امر قرار پایا کہ یہ گمنام کچھ ہے، دوسرے فی الواقع اس ناکام کو اپنا وسیلہ ظاہر بنایا ہے، سو اگرچہ چاہ سے پانی نکلتے وقت رہٹ کے ظروف میں اول پانی آتا ہے مگر کھیت میں جا کر جمع ہو جاتا ہے، سو اولاً تو ظروف جز وطریق زراعت اور کچھ نہیں اور جو پانی ان میں آتا ہے یا رہتا ہے وہ بہت قلیل نسبت بزراعت ہے، اگرچہ ظروف مقدم زراعت پر ہیں، مگر نفس تقدم کو کیا شرف ہے، لہٰذا تقدم موجب فخر نہیں ہاں آپ کے اتباع سے فخر ہے۔

میرے اکابر نور اللہ مراقدہم کے واقعات سلوک کے لائن کے تو بہت کثرت سے ہیں، ان کا احاطہ بھی دشوار ہے اور ان سب اکابر کی سوانح عمریاں بھی مستقل شائع ہو چکی ہیں، چند قصے نمونے کے طور پر لکھواتا ہوں:

حضرت سید احمد شہید کی بیعت کے واقعات

حضرت سید احمد شاہ صاحب شہید رائے پوری بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت اُستاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت ہوئے تھے، اورِ ح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ جب بیعت ہونے کے بعد دوسری مرتبہ بغرض تعلیم حاضر ہوئے تو شاہ صاحب نے ان کو اس مسجد میں ٹھہرا دیا جو ان کے مدرسہ سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر واقع تھی، جس میں شاہ صاحب اور طلبہ نماز پڑھا کرتے تھے اور تعلیم اشغال فرما کر حکم دیا کہ آٹھویں روز ہم سے ملا کرو۔

چھ ماہ کے بعد شاہ صاحب کے خاندان میں کسی کے یہاں شادی کی تقریب ہوئی، اس تقریب میں شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب تینوں بھائی موجود

تھے اور شامیانہ تانا جا رہا تھا، اس مقام پر ایک نیم کا درخت تھا، جس کی وجہ سے شامیانہ اچھی طرح نہ تنتا تھا، بلکہ اس میں جھول رہتا تھا، اتنے میں سید صاحب بھی مسجد سے تشریف لے آئے، جب آپ نے یہ رنگ دیکھا تو کُرتے کو کمر سے باندھ کر نیم پر چڑھ گئے اور نیم پر چڑھ کر جو شامیانہ کھینچا تو شامیانہ بالکل ٹھیک تن گیا اور جھول بالکل نکل گیا، سید صاحب کی یہ دھج شاہ عبدالقادر صاحب کو پسند آ گئی اور انہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے عرض کیا کہ سید احمد کو مجھے دے دیجئے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ لے جاؤ اور سید صاحب کے کہہ دیا کہ میاں عبدالقادر کے ساتھ جاؤ۔

شاہ عبدالقادر صاحب ان کو اپنے پاس اکبری مسجد میں لے آئے اور ایک حجرہ میں ٹھہرا دیا اور اشغال کے متعلق فرمایا کہ میری سہ دری کے پاس بیٹھ کر کیا کرو، سید صاحب نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہ صاحب عبدالقادر صاحب کے حکم کے مطابق ذکر و شغل کرتے رہے اور جو جگہ شاہ صاحب نے ان کو بتا دی تھی، سید صاحب خواہ مینہ ہو یا آندھی یا دھوپ برابر اپنی جگہ بیٹھے رہتے تھے اور جب تک شاہ صاحب نہ کہتے تھے کہ اب یہاں سے اُٹھ جاؤ اس وقت تک نہ اُٹھتے تھے۔

شاہ صاحب نے سید صاحب کو ڈھائی برس اپنی خدمت میں رکھا اور ڈھائی برس کے بعد ان کو لے کر شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں آئے اور شاہ صاحب سے عرض کیا کہ سید احمد حاضر ہیں، انہیں پرکھ لیجئے پرکھا لیجئے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں عبدالقادر تم جو کچھ کہتے ہو ٹھیک کہتے ہو اب ان کو بیعت کی اجازت دے دو، شاہ عبدالقادر صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اجازت تو آپ ہی دیں گے اور ان سے آپ کا ہی سلسلہ چلے گا، شاہ صاحب نے ان کو بیعت کی اجازت دے دی۔ (اورِ ح ثلاثہ: ص ۱۲۴)

فرمایا کہ سید احمد شہید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ جس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں تھے تو شاہ صاحب نے ان کو شغل رابطہ بتایا تو سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس شغل سے عذر فرما دیا، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا:

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

تو سید صاحب نے جواب دیا کہ آپ کسی معصیت کا حکم دے دیجئے کر لونگا یہ تو معصیت نہیں شرک ہے، یہ تو گوارا نہیں، شاہ صاحب نے یہ سن کر ان کو سینے سے لگا لیا کہ اچھا ہم تم کو طریق نبوت سے لے کر چلیں گے، تم کو طریق ولایت سے مناسبت نہیں ہے۔

(جدید ملفوظات: ص ۱۴۴)

تصور شیخ کے متعلق اورِ ح ثلاثہ میں بھی خود سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ لکھا ہے، خاں

صاحب فرماتے ہیں کہ سید صاحب ایک مرتبہ اکبری مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک نو جوان سر سے پا تک حریر کا لباس پہنے ہوئے اور ڈاڑھی منڈائے ہوئے اور پوری پوری میں انگوٹھی چھلے پہنے ہوئے حاضر ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا اور چونکہ اس زمانے میں بانکوں کی وضع یہ تھی کہ ڈھیلا پاجامہ کلیوں دار پہنا کرتے تھے، اس لیے یہ شخص بھی ڈھیلا ہی پاجامہ پہنے ہوئے تھا، یہ شخص فوج میں ملازم تھا، مگر یہ یاد نہیں کہ دفعدار تھا یا کچھ اور، اس نے عرض کیا کہ حضور! میں فوج میں ملازم ہوں اور ہماری فوج کو یہاں چھ مہینے رہنے کا حکم ہے، میں چاہتا ہوں کہ حضور مجھے بیعت کر لیں۔

سید صاحب نے فرمایا کہ بیعت! کیا یہ صورت بیعت کی ہے؟ ڈاڑھی آپ کی منڈی ہوئی ہے، لباس سارا حریر کا ہے، ہاتھوں میں مہندی ہے، پوری پوری میں چھلے ہیں، اس نے جواب دیا کہ میں ان باتوں سے توبہ کرتا ہوں اور چھلے میں اسی وقت اُتار دیتا ہوں، لیکن کپڑے ابھی نہیں اُتار جا سکتا، کیونکہ نہ دوسرے کپڑے یہاں میرے پاس ہیں نہ گھر، رہی مہندی اور ڈاڑھی سو میں مہندی کے زائل کرنے سے بھی اس وقت عاجز ہوں اور ڈاڑھی بھی نہیں پیدا کر سکتا۔

سید صاحب نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان کے لیے کپڑوں کا انتظام کرایا جائے، چنانچہ لوگوں نے کرتہ پاجامہ دے دیا اور سید صاحب نے اپنا عمامہ اور چادر دی اس نے کپڑے اتار کر کپڑے خوشی خوشی پہن لیے اس کے بعد سید صاحب نے اسے بیعت کیا اور علیحدہ لے جا کر کچھ تعلیم فرمایا، بیعت ہونے کے بعد یہ شخص چھ سات روز تک صبح کے وقت اور بعد عصر روزانہ آتا رہا، لیکن ساتویں یا آٹھویں روز جو وہ آیا نہایت پریشان اور روتا ہوا آیا اور عرض کیا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ ہمارا قیام چھ، سات مہینے ہوگا اور میں حضور سے مستفید ہوں گا، مگر آج ہماری فوج کے تبادلہ کا حکم آ گیا کل ہمیں یہاں سے جانا ہوگا، مجھے اپنی محرومی اور حضور کی مفارقت کا نہایت صدمہ ہے۔

سید صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر شاہ عبدالقادر صاحب کے حجرہ میں لے گئے اور آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ حجرہ میں رہے، اس کے بعد سید صاحب تنہا حجرہ سے نکلے اور ہم لوگوں سے فرمایا کہ ان کو اُٹھا لاؤ اور ہوا دو اور یہ کہہ کر تیز قدمی کے ساتھ دوسرے حجرے میں تشریف لے گئے، ہم لوگ جب اندر گئے ہیں تو دیکھا کہ وہ شخص بالکل بے ہوش تھا، اسے حجرے سے سہ دری میں لے آئے اور پانی کے چھینٹے دیئے، پنڈول سنگھایا، کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تو یہ حالت تھی کہ بالکل مست تھا اور آنکھیں پھٹی پھٹی ہوئی تھیں اور کہتا تھا کہ واللہ باللہ جس طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہوں سید صاحب ہی نظر آتے ہیں "وہ میری آنکھوں میں بھی ہیں" یہ الفاظ اس نے تین دفعہ زور زور سے کہے۔

سید صاحب نے کیواڑ کھول کر اپنا چہرہ نکالا اور زور سے فرمایا کہ خاموش اور مجھ کتے کی صورت اپنے سامنے سے منہدم کر اور یہ الفاظ آپ نے بھی تین مرتبہ فرمائے اُس کا اثر یہ ہوا کہ وہ بالکل اچھا

ہو گیا۔ خان صاحب نے اپنے اُستاذ سے نقل کیا کہ تصور دو طرح کا ہوتا ہے، ایک تو وہ جواز خود ہو دوسرا وہ جو تصور کرنے سے ہو، سید صاحب جو تصور شیخ کو منع فرماتے تھے وہ وہ تصور تھا جو قصداً اور بتکلف کیا جائے اور جو تصور از خود ہو اس کو منع نہیں فرماتے تھے، اس پر حضرت حکیم الامت تحریر فرماتے ہیں قولہ جس طرف آنکھ اُٹھا کر الخ اقول یہ تصرف اس کے رنج مفارقت کے تدارک کے لیے کیا گیا ہو کہ اس طرح آجانے سے تسلی رہے گی اور اچھا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ نظر بند ہو گیا ہو، بلکہ اس میں تقلیل وتعدیل ہو گئی ہو۔

قولہ وہ تصور تھا جو قصداً اور بتکلف الخ اقول اس سے بھی وہ درجہ مراد ہے جس سے مقصودیت کی شان ہو، جیسے بطور شغل مستقل کے کرتے ہیں، جس میں قلب سے غیر کی نفی کا اہتمام کرتے ہیں کہ اس میں مشابہت شرک کی ہے، ورنہ اگر محبت میں قصداً بھی تصور کرے تو کچھ حرج نہیں اور جن بزرگوں سے اجازت منقول ہے وہ بقدر ضرورت ہے کہ خطرات دفع نہ ہو تو کسی شاہد چیز کے تصور سے حسب قاعدہ ''النفس لا تتوجه إلى شيئين في آن واحد'' ہو جاتے ہیں اور اس میں صورت شیخ وصورت دیگر اشیاء سب مساوی ہیں، مگر شیخ سے چونکہ طبعاً محبت زائد ہوتی ہے اس کی طرف توجہ اقوی ہونے سے دفعہ سہل تر ہوتا ہے، مگر بعد دفع خطرات کے پھر اس کو زائل کر دیتے ہیں اور عین تصور کے وقت بھی اس کا اہتمام نہیں کرتے کہ دوسرا کوئی تصور آنے نہ پائے، گو اس سے زیادہ محمود یا مقصود ہو۔ فقط (ارواحِ ثلاثہ: ص ۱۳۴)

عزلت نشینی میں ہمارے اکابر کا طرز عمل

اس شعر کے متعلق میں نے اکابر سے حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک قصہ بھی سن رکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک مولوی صاحب نے جو حضرت کے یہاں پڑھتے تھے اس شعر کا مطلب بھی پوچھا اور شرعی اشکال بھی کیا، حضرت قدس سرہٗ نے اس کو دس روپے دیئے اور فرمایا کہ فلانی سرائے میں چلے جاؤ اور خواجہ سرائے سے معلوم کرلو کوئی لڑکی خالی ہے یا نہیں۔

اول تو مولوی صاحب بہت سوچ میں پڑے مگر چونکہ خود ہی استفسار کیا تھا اس لیے تعمیل حکم میں گئے، خواجہ سرا نے کہا کہ ایک بہت حسین لڑکی ابھی آئی ہے، فلانی کوٹھری میں ہے، اس سے بات کر کے آتا ہوں وہ گیا اور اس سے کہا کہ اس کو راضی کر کے کہہ دیا کہ رات کو آجائیں، یہ رات کو پہنچے تو نہایت سر جھکائے بیٹھی رو رہی تھی، یہ بہت حیرت میں پڑ گئے، انہوں نے بہت زیادہ اصرار سے کہا کہ میں نے کوئی جبر نہیں کیا، کوئی زبردستی نہیں کی، مگر وہ ہچکیاں مار کر رونے

لگی، یہ مولوی صاحب مصیبت میں پھنس گئے۔

ایک گھنٹہ کے بعد اس عورت نے بتایا کہ میں ستم رسیدہ ہوں، مظلومہ ہوں کئی دن کا فاقہ ہے، پاؤں پھر رہی ہوں، میرا خاوند مجھے چھوڑ کر چلا گیا، ان کا کہیں پتہ نہیں چلا، دو تین ماہ سے ان کو تلاش کرتی پھر رہی ہوں، معلوم ہوا کہ اس کے خاوند یہی مولوی صاحب تھے، جو طلب علم کے شوق میں گھر سے بھاگ آئے تھے، کسی کو پتہ نہیں تھا، اس نے منہ کھولا ایک نے دوسرے کو پہچانا۔

رات بھر مولوی صاحب نے وہاں قیام کیا صبح کو حضرت کی خدمت میں آ کر عرض کیا حضرت شعر بالکل سچ ہے اس نوع کے اور بھی میرے اپنے اکابر سے قصے سنے ہوئے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ واقعی پیر مغاں ہو، جامع شریعت وطریقت ہو، واقف رموز اسرارِ الٰہی ہو، ہر مدعی بزرگی کا یہ کام نہیں، یہ وہی ہے کہ اللہ والوں کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔

خان صاحب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ جوش میں تھے اور تصور شیخ کا مسئلہ درپیش تھا، فرمایا کہ کہہ دوں؟ عرض کیا گیا فرمایئے، پھر فرمایا کہ کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ فرمایئے، پھر فرمایا کہ کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ فرمایئے، تو فرمایا کہ تین سال کامل حضرت امداد کا چہرہ میرے قلب میں رہا ہے اور میں نے ان سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کیا پھر اور جوش آیا، فرمایا کہہ دوں؟ عرض کیا گیا حضرت ضرور فرمایئے، فرمایا کہ اتنے (ناقل کو مقدار یاد نہیں رہی کہ خان صاحب نے کتنی بتائی تھی) سال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے قلب میں رہے اور میں نے کوئی بات بغیر آپ سے پوچھے نہیں کی، یہ کہہ کر اور جوش ہوا، فرمایا کہ اور کہہ دوں؟ عرض کیا گیا کہ فرمایئے! مگر خاموش ہو گئے، لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ بس رہنے دو، اگلے دن بہت سے اصراروں کے بعد فرمایا کہ بھائی پھر احسان کا مرتبہ رہا، اس پر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں، بار بار استفسار فرمانا کہ کہہ دوں امتحان واشتیاق واہلیت مخاطب کے لیے ہوگا، کیونکہ ایسے اسرار کے تحمل کا ہر شخص اہل نہیں ہے:

بر سماع راست ہر تن چیز نیست
طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

اور دوسری بار میں اس سوال کا تکرار نہ کرنا شاید اس لیے ہو کہ اب ضرورت نہیں رہی اور ایک بار سوال کرنا اس لیے کہ طلب کے بعد حصول واقع فی النفس ہے اور صورت کا حاضر رہنا اور اس سے مشورہ لینا یہ اکثر تو تخیل کی قوت سے اور کبھی بطور خرق عادت کے رُوح کا تمثل بشکل جسد ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں لزوم ودوام کے ساتھ حاضر وناظر ہونے کے اعتقاد کی یا استعانت واستغاثہ کے عمل کی گنجائش نہیں اور اس کے بعد کے مرتبہ کی نسبت فرمایا کہ بس رہنے دو

اوراس کے بعد اصرار پر جواب میں مرتبہ احسان کا ذکر فرمانا، اگر یہ اسی مرتبہ مسکوت عنہا کی تفسیر ہے تب تو اس وقت کا نہ بتلانا شاید اسی حکمت کے لیے ہو کہ اہل ظاہر کی نظر میں یہ پہلے دو مرتبوں سے زیادہ نہیں ہے تو اس کی کچھ وقعت نہ ہوتی، بعد اصرار کے فرمانے میں حالاً اس کی تعلیم ہے کہ یہ ان سب سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ یہ مقصود اور مقام ہے اور وہ مرتبے غیر مقصود اور حال ہیں، اشتان ما بینھما اور اگر یہ اس کی تفسیر نہیں ہے تو اس کا اخفاء فرمایا، شاید افہام عامہ اس کے متحمل نہ ہوتے، شاید تجلیات ربانیہ میں سے کوئی تجلی ہو اور اس کی کیفیت بتلانے سے علمی اشکالات واقع ہوں، جیسا کہ صوفیاء کے ایسے اسرار میں اہل ظاہر کو ایسے اشکالات ہوا کرتے تھے۔

(اورِح ثلاثہ: ص ۲۹۰)

تجلیہ اور تخلیہ کے بارے میں حضرت تھانوی کا ملفوظ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے حضرات خلوت عرفیہ پسند نہیں کرتے تھے، اس سے شہرت ہوتی ہے، مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی کبھی گوشہ نشینی اختیار نہیں کی، البتہ مولانا رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ پر بہ نسبت دوسرے حضرات کے قدرے اس کا غلبہ تھا (اور یہ اثر ان کے پہلے پیر کا تھا) باقی بقدر ضرورت خلوت یہ سب حضرات کا معمول تھا، چنانچہ مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی تھوڑی سی دیر حجرہ بند کر کے اس میں بیٹھتے تھے، ایک دفعہ میں نے مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کو لکھا کہ میرا جی یوں چاہتا ہے کہ سب سے علیحدہ ایک گوشہ میں بیٹھ جاؤں، مولانا نے تحریر فرمایا:

''ہمارے بزرگوں نے ایسا نہیں کیا اس سے شہرت ہوتی ہے''۔ (اورِح ثلاثہ: ص ۳۰۲)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے سبق پڑھانے کے اندر آنسو کثرت سے جاری ہو جاتے تھے، ایک دفعہ ہم نے چاہا کہ مولانا سے مثنوی شروع کریں تو مہتمم صاحب (حضرت مولانا رفیع الدین صاحب) نے فرمایا کہ انہیں مدرسہ میں بیٹھنے بھی دو گے یا نہیں؟ مثنوی پڑھانے لگے تو جنگلوں کو نکل جائیں گے، آگ بھڑک اُٹھے گی۔

(اورِح ثلاثہ: ص ۳۱۹)

ایک مرتبہ اجمیر میں مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ صبح کی نماز کو تشریف لا رہے تھے، راستہ میں کان میں بھڑ بھوجوں کے دھان کوٹنے کی آواز آئی، بس مولانا کو وہیں وجد ہو گیا۔

کسانیکہ یزدا پرستی کنند
بر آواز دولاب مستی کنند

حضرت امام ربانی گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کا ارشاد ہے وہ شخص جو شریعت کا تابع ہوگا اگرچہ اس کے قلب میں نور نہ ہو مگر اس شخص سے بہتر ہے جس کے قلب میں نور معلوم ہوتا ہے مگر وہ خلافِ شرع ہو۔ (تذکرۃ الرشید: ص ۳۴۳ ر ج ۲)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ سائیں توکل شاہ صاحب مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند سے فرماتے تھے کہ مولوی جی جب ذکر اللہ کرتا ہوں تو اللہ کی قسم منہ میٹھا ہو جاوے ہے، سچ مچ میٹھا ہو جاوے ہے، جیسے مٹھائی کھا کر، پھر فرمایا:

اللہ اللہ ایں شیریں است نام
شیر و شکر می شود جانم تمام

(اصل کتاب میں یہی لفظ ہے اور مجھے تن من تمام یاد ہے، (ناقل روایت لکھتے ہیں) ہمارے حضرت کے خادموں میں سے بھی ایک صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ ذکر کے وقت میرا منہ میٹھا ہو جاتا ہے، حضرت نے تحریر فرمایا کہ حلاوت معنویہ کا حلاوت حسیہ ہو جانا علامت ہے سرایت الذکر فی الذاکر کی، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے ''اللّٰھم اجعل فی قلبی نورا وفی لسانی نورا وفی لحمی نورا وفی دمی نورا'' ۔الخ (حسن العزیز: ص ۱۲۸، ۲۵۴ ر ج ۱)

ایک چیز اس ناکارہ نے اپنے چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے ذکر میں بہت کثرت سے محسوس کی، یہ تو میں پہلے بھی لکھوا چکا ہوں کہ مرض الوفات تک ان کا معمول ذکر بالجہر کا نہیں چھوٹا تمام سال تہجد کے بعد کیا کرتے تھے اور ماہ مبارک میں عصر سے مغرب تک ذکر کرتے، اس وقت ان کے ذکر میں بہت کثرت سے ایسی رطوبت محسوس ہوتی تھی کہ جو سننے والوں کو بھی بہت صاف محسوس ہوتی تھی، اس منظر کو دیکھ کر مجھے اکثر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد کی حقیقت ذہن میں آیا کرتی تھی، مشکوٰۃ شریف ص ۱۹۰ میں بروایت عبداللہ بن بُسر سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پاک نقل کی گئی ''ان رجلا قال یا رسول اللّٰہ !إن شرائع الاسلام قد کثرت علی فاخبرنی بشی أتشبث بہ قال، لا یزال لسانک رطبا من ذکر اللّٰہ'' ۔
(مشکوٰۃ شریف: ص ۱۹۰)

عبداللہ بن بُسر نے نقل کیا کہ ایک صاحب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! شریعت کے احکام تو بہت کثرت سے ہیں، مجھے تو کوئی ایسی چیز بتا دیجئے جس کو میں مضبوط پکڑ لوں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تیری زبان ہمیشہ اللہ کے پاک ذکر سے تر رہے'' ۔

مشکوٰۃ شریف کی ہی دوسری حدیث میں جو انہی صحابی سے نقل ہے ''قال جاء اعرابی إلی

النبی قال یا رسول اللّٰہ !أی الأعمال أفضل، قال أن تفارق الدنیا ولسانک رطب من ذکر اللّٰہ۔

ایک صاحب نے عرض کیا یا رسول اللہ! بہترین عمل کیا ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تو دنیا سے ایسی حالت میں رخصت ہو کہ تیری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے''۔
(مشکوۃ شریف: ص ۱۹۰)

یہ چیز جب حاصل ہوتی ہے جب اللہ کا پاک ذکر ذوق وشوق سے کیا جائے کہ اس سے لذت محسوس ہونے لگتی ہے، پھر زبان پر اس سے تراوٹ بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک دوست بہت ڈرتے ڈرتے کہتے تھے کہ مجھے یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کبھی اللہ میاں اس پر خفا نہ ہوں کہ تو اتنا متقی کیوں تھا، پھر فرمایا کہ حال بھی عجیب چیز ہے بعض وقت رخصت سے گزر کر عزیمت پر عمل کرنے سے دعویٰ کی صورت ہو جاتی ہے، اس سے ڈرنا عجب رستہ ہے، بعض دفعہ جب اس رستہ میں غلطی ہوتی ہے، تو کفر سے اِدھر نہیں رُکتا، بہت ہی نازک طریق ہے، اس لیے بہت مبصر شیخ کامل کی ضرورت ہے اور اس شیخ کو بھی خود تنبیہ علی الاغلاط کی ضرورت ہے، اگر کوئی زندہ بزرگ متنبہ کرنے والا نہ ہو تو خود اللہ تربیت فرماتے ہیں اور جس شخص کو وسائط میسر ہوں وہاں عادت اللہ یہ ہے کہ وسائط سے تربیت فرماتے ہیں، ہاں جب خود مستقل ہو جائے تو اس کی حق تعالیٰ خود تربیت فرمانے لگتے ہیں۔
(حسن العزیز: ص ۱۲۹، ۲۵۵ / ج ۱)

''البدائع'' صفحہ ۲۳۰ میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے مشائخ چشتیہ نقشبندیہ کے درمیان میں تربیت کے فرق کی بہت تفصیل تحریر فرمائی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں، مشائخ کا طریق یہ ہے کہ وہ وصل کی تدبیر پہلے کرتے ہیں، پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ غیر اللہ سے تعلق قطع ہوتا جاتا ہے اور دوسرے فصل کو مقدم کرتے ہیں پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جتنا غیر سے تعلق قطع ہوتا ہے اتنا ہی خدا تعالیٰ سے بڑھتا ہے کیونکہ دو ہی تعلق ہیں، ان میں اگر ایک بڑھے گا، دوسرا گھٹے گا اور ایک گھٹے گا تو دوسرا بڑھے گا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے اطباء میں اختلاف ہے کہ مریض کو صحت وقوت کی طرف لانا ہو تو اول صحت یعنی ازالہ امراض کی تدبیر کرنا چاہیے یا قوت کی، اطباء یونانی صحت یعنی ازالہ امراض کی تدبیر مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ازالہ مرض وصحت کے بعد قوت خود بخود آنے لگتی ہے اور ڈاکٹر تقویت طبع کی تدبیر مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب طبیعت میں قوت ہو جائے گی تو مرض خود ہی جاتا رہتا ہے۔

یہی اختلاف اطباء روحانی میں ہے کہ بعض ازالہ مرض کا اہتمام اول کرتے ہیں، یہ فصل ہے اور بعض تقویت کی تدبیر پہلے کرتے ہیں، یہ وصل ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک طریق کو کسی ایک خاندان کی طرف منسوب کرنا مناسب نہیں، کیونکہ ہر شیخ مجتہد ہوتا ہے وہ کسی کی تقلید نہیں کرتا، اگر ایک شیخ چشتی ہو اور کسی وقت اس کے اجتہاد میں مذاق چشتیہ سے نقشبندیہ کا مذاق راجح ہو تو وہ نقشبندی مذاق کو اختیار کرے گا اور اگر شیخ نقشبندی ہو اور اس کے مزاق میں چشتیہ کا مذاق راجح ہو تو وہ اسی کا مذاق اختیار کرے گا، فروع میں ہر شیخ مجتہد ہوتا ہے، کوئی بھی کسی خاص طریقہ کا پابند نہیں ہوتا، مگر اصول میں اکثر اپنے سلسلہ کا متبع ہوتا ہے، اس لیے اصولاً نقشبندیہ کی طرف تقدیم وصل منسوب ہے اور چشتیہ کی طرف تقدیم فصل منسوب ہے اور گو دونوں خاندانوں کے مشائخ ہر وقت اس کے پابند نہیں ہوتے، بلکہ طالب کے مناسب جو طریق ہوتا ہے اسی کو اختیار کرتے ہیں، لیکن نقشبندیہ پر اکثر تقدیم وصل کا رنگ غالب ہے اور چشتیہ پر تقدیم فصل کا رنگ، چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ ایک طالب علم کی مناسبت کا اسی اصل سے امتحان فرمایا تھا۔

وہ واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ مولانا منیر احمد صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ میں بیعت ہونا چاہتا ہوں مگر متردد ہوں کہ سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہوں یا نقشبندیہ میں تو آپ بتلا دیجئے کہ میرے لیے زیادہ کیا مناسب ہے، حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ بتلاؤ ایک شخص ایسی زمین پر تخم پاشی کرنا چاہتا ہے جس میں جھاڑ جھنکار بہت کھڑے ہیں تو اسے کیا کرنا چاہیے، آیا اول زمین کو جھاڑو سے صاف کرے، پھر تخم ریزی کرے یا پہلے تخم ریزی کردے پھر جھاڑو کو صاف کرتا رہے۔

مولوی منیر احمد صاحب نے فرمایا کہ حضرت میرے نزدیک تو مناسب یہ ہے کہ اول تخم ریزی کردے تاکہ کچھ تو ثمرہ حاصل ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ جھاڑو کی صفائی میں موت آ جائے، پھر یہ خالی ہاتھ ہی جائے، حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ تم نقشبندیہ میں جاؤ۔

شرح اس کی یہ ہے کہ نقشبندیہ کا مذاق یہ ہے کہ وہ پہلے ہی دن ذکر کی تلقین کر کے تخم ریزی شروع کر دیتے ہیں اور چشتیہ اول ازالہ رذائل کا کام شروع کر کے ناک چنے چبواتے ہیں، مگر چبواتے نہیں، بلکہ چبواتے تھے، کیونکہ اب تو وہ طالب علموں کی ضعف ہمت کی وجہ سے نقشبندیہ کے طریق پر عمل کرنے لگے، ورنہ پہلے یہ حالت تھی کہ حضرت شیخ ابو سعید گنگوہی جب طلب طریق کے لیے سلطان نظام الدین بلخی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پاپیادہ گنگوہ سے بلخ پہنچے اور حضرت شیخ کو اطلاع ہوئی تو اول تو بڑی خاطر کی، شہر سے باہر تک استقبال کو تشریف لائے اور ساتھ میں سلطان بلخ بھی تھا، کیونکہ وہ شیخ کا معتقد تھا۔

غرض مرشدزادہ کا بڑی شان سے استقبال کیا اور شہر میں لے جا کر خوب خدمت کی اور کئی روز تک بادشاہ اور وزراء وامراء کے یہاں ان کی دعوتیں ہوتی رہیں، جب کئی دن ہو گئے تو شاہ ابوسعید صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں گنگوہ سے بلخ تک پیادہ چل کر دعوتوں کے لیے نہیں آیا، فرمایا صاحبزادے، پھر جو خاص مطلب ہو وہ بیان فرمایئے، کہا میں وہ دولت لینے آیا ہوں جو آپ میرے گھر سے لائے ہے، بس یہ سنتے ہی شیخ کا یہ رنگ بدل گیا اور بزبان حال فرمایا:

ناز پر وردہ تنعم نہ برد راہ بدوست
عاشقی شیوہ رنداں بلاکش باشد

''ناز ونعمت سے پلا ہوا مقصود تک نہیں پہنچا کرتا، عاشقی تو جفا کش رندوں کا طریقہ ہے''۔

فرمایا صاحبزادے! اگر وہ دولت لینا چاہتے ہو تو پھر یہ شان وشوکت رخصت کرو اور آج سے حمام کی خدمت تمہارے سپرد ہے، جا کر حمام جھونکو (یہاں حضرت شاہ ابوسعید صاحب کا قصہ بہت مختصر نقل کیا ہے اور یہ قصہ آپ بیتی میں کئی جگہ گزر چکا ہے، اس لیے اس کو چھوڑ کر آگے لکھواتا ہوں) چنانچہ اس ریاضت شاقہ کے بعد اب شاہ ابوسعید کو اتنی اجازت ملی کہ شیخ کی مجلس میں آجایا کریں اور باتیں سنا کریں پھر کچھ عرصہ بعد ذکر تعلیم کیا گیا، گویا اب وصل کی تدبیر شروع ہوئی، ذکر شروع کرنے کے بعد کچھ حالات اور کیفیات طاری ہوئیں تو شیخ کو معلوم ہوا کہ ابوسعید میں عُجب پیدا ہو گیا ہے تو فوراً سب ذکر وشغل چھڑا دیا اور کتوں کی خدمت سپرد کی (اس کی تفصیل بھی پہلے گزر چکی ہے)۔

جب وہ کتوں کے ساتھ گھسٹ رہے تھے اسی حالت میں ان پر غیبی فضل ہوا کہ ایک تجلی خاص ان کے اُوپر ہوئی، جس کی لذت نے تمام تکلیف کو بھلا دیا، اِدھر حضرت شیخ کو یہ حالت منکشف ہوئی اور انہوں نے خدام سے فرمایا کہ اس وقت ابوسعید پر فضل ہو گیا اور ایک خاص تجلی سے حق تعالیٰ نے ان کو مشرف فرمایا، جاؤ جنگل سے ان کو اُٹھا لاؤ، خدام تو ادھر دوڑے اور ادھر سلطان نظام الدین رحمہ اللہ تعالیٰ پر شیخ الشیوخ حضرت شاہ عبدالقدوس قدس سرہٗ کی روحانیت منکشف ہوئی اور فرمایا:

''نظام الدین! تم کو اس سے زیادہ مشقت لینے کا بھی حق تھا، مگر ہم نے تو تم سے اتنی مشقت نہ لی تھی، یہ ایک محبت آمیز عتاب تھا، جس سے سلطان نظام الدین کے دل پر بڑا اثر ہوا، چنانچہ اب جو شاہ ابوسعید سامنے آئے ہیں تو سلطان جی نے ان کو محبت سے سینہ لگایا اور پھر ذکر وشغل میں لگا دیا اور خاطر ومدارات ہونے لگی۔''

شاہ ابوسعید کو اس تجلی کا بہت اشتیاق تھا کہ وہی تجلی پھر ہو، روزانہ ذکر کرتے وقت اس کے مشتاق

رہتے تھے، جب کئی روز تک نہ ہوئی تو ایک دن حبسِ دم کر کے بیٹھ گیا اور پختہ ارادہ کرلیا کہ جب تک وہ تجلی نہ ہوگی سانس نہ چھوڑوں گا، چاہے دم نکل جائے، کیونکہ ایسی زندگی سے مرجانا ہی اچھا ہے، اس طریق میں بھی کیا کیا حالتیں پیش آتی ہیں، جس پر گزرتی ہیں وہی جانتا ہے، چنانچہ کئی گھنٹے تک سانس روکے بیٹھے رہے، بالآخر وہ تجلی پھر ہوئی اور اس کی مسرت میں سانس اس زور سے چھوٹا کہ پسلی پر ضرب پہنچی اور ٹوٹ گئی اسی وقت غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس میں چمچہ کے اندر کوئی دوا تھی وہ ان کے منہ میں لگادی گئی، اس کے کھاتے ہی پسلی فوراً جڑ گئی وہی حالت ہوگئی کہ:

در دم نہفتہ بہ زطبیبان مدعی
باشد کہ از خزانہ غیبش دوا کنند

''میرا درد مدعی طبیبوں سے پوشیدہ رہے یہی اچھا ہے، ہوسکتا ہے کہ غیبی طور پر میرا علاج کر دیں'' اور اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ چوزے کا شوربا چند روز تک پینا، انہوں نے حالت فرو ہونے کے بعد شیخ سے یہ قصہ عرض کیا، شیخ نے فوراً چوزوں کا انتظام کر دیا اور کئی روز تک چوزے کھلائے گئے، اب حق تعالیٰ کی طرف سے خود حکم ہوتا ہے کہ عمدہ عمدہ غذائیں کھاؤ اور پہلے وہ مشقت تھی کہ حمام جھونکو جو کی روٹی کھاؤ، اس کے بعد خلافت عطاء ہوئی اور یہ شیخ کامل بن کر گنگوہ آئے۔

تو صاحب! پہلے تو چشتیوں کے یہاں یہ مصیبت تھی، ان کے یہاں پہلے فصل مقدم تھا اور نقشبندیہ کے یہاں وصل مقدم تھا، مگر اب تو چشتی بھی نقشبندی ہوگئے، کیا کریں طالبوں کی ہمتیں اب ویسی نہیں رہیں چونکہ اب ہمتوں میں ضعف ہے اور شیوخ مجتہد ہوتے ہیں، اس لے مجتہدین طریق نے اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وصل وفصل دونوں کو ساتھ ساتھ لے چلتے ہیں، اب چشتیہ نے تقدیم فصل کو ترک کر دیا ہے، کیونکہ یہ صورت اس وقت کے مناسب نہیں اور طبیب مجتہد ایک بات کا پابند نہیں ہوا کرتا، بلکہ مناسب کو اختیار کرتا ہے، سو آج کل یہی صورت مناسب ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں اور جو شیخ مجتہد نہ ہو وہ شیخ بنانے کے قابل نہیں اور یہ فیصلہ معیت ویسا ہی ہے، جیسے درس ظاہر میں مدرسین کی رائے پہلے مختلف تھیں، بعض معقول کی تقدیم کرتے تھے، بعض منقول کی اور ہر ایک کے پاس اپنی رائے کی ترجیح کے دلائل تھے، مگر اب محققین نے فیصلہ کردیا ہے کہ دونوں کو ساتھ ساتھ رکھنا چاہیے، اسی باطن میں محققین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وصل وفصل دونوں کو دوش بدوش لے چلو۔

مگر آج کل ایک نئی بدعت ایجاد ہوئی ہے کہ بعض نے محض وصل کو ہی لے لیا اور فصل سے بالکل ہاتھ روک لیا ہے، نہ اس کو مقدم رکھا نہ موخر، نہ ساتھ ساتھ ہی رکھتے ہیں، چنانچہ بعض اہل غلو جن پر

جوگیہ کا مذاق غالب ہے وہ تو وصل یعنی اعمال کو چھوڑ بیٹھے اور بڑا اہتمام جنگل میں رہنے اور لذت کے ترک کرنے لگے، یہ تو اہل باطل کا طریق ہے اور اہل حق میں سے اکثر مشائخ محض تعلیم ذکر پر اکتفا کرنے لگے، تزکیہ رذائل کا اہتمام مطلق نہیں کرتے، نہ مرید کے اعمال واخلاق پر روک ٹوک کرتے ہیں، نہ تعلقات بڑھانے پر اسے زجر کرتے ہیں اور جو ایسا کرے وہ بدنام ہے۔

مگر میں نصوص سے بتلا چکا اور صوفیاء کا اس پر اتفاق ہے کہ بدون وصل وفصل دونوں طریق طے نہیں ہو سکتا اس کا تو یہ اختیار رہے کہ تقدیم وتاخیر کسی کی کردی جائے مگر ایک سے بالکل ہاتھ روک لینا یہ طریق کے بالکل خلاف ہے اور جب تقدیم وتاخیر کا آج کل خلاف مصلحت ہونا اور معیت ہی کا مناسب ہونا اُوپر معلوم ہو چکا تو دونوں کام ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں کہ سالک کو ذکر وشغل کی تعلیم کے ساتھ اصلاح رذائل کا بھی امر کیا جائے اور ہر رذیلہ کی اصلاح کا علاج بتلایا جائے گا، گو زیادہ ضروری یہی علاج ہے رذائل کا مگر ذکر کے ساتھ رذائل کا علاج بہت سہل ہو جاتا ہے اس لیے ذکر میں بھی لگانا ضروری ہے، کیونکہ ذکر سے خود بھی ان بہمی وسبعی قوت میں کسی قدر ضعف ہو جاتا ہے، اب اگر تھوڑی سی توجہ سے کام لیا جائے تو اس طرح جمع کرنے سے وصل کے ساتھ فصل بھی کامل ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ وصل وفصل دونوں کا اہتمام کرو، خدا سے تعلق بڑھاؤ اور غیر سے تعلق کم کرو اور اس کا طریقہ کسی محقق سے پوچھو اور اگر شیخ میسر نہ ہو تو محققین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے کام شروع کرو، ان شاء اللہ ناکامی نہ ہوگی اور اگر مشائخ محققین موجود ہو تو ان سے مل کر طریق معلوم کرو، اگر ملنا نہ ہو سکے تو خط وکتابت سے مراجعت کرو اور عمل کا اہتمام کرو، کیونکہ بدون عمل کے باتیں یاد کر لینا اور تصوف کے مسائل رٹ لینا محض بے کار ہے۔ (البدائع: ص ۲۳۰)

حضرت مدنی کی سفارش مولوی عبدالماجد وعبدالباری کے بارے اور حضرت تھانوی کا جواب

حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ میرے پاس مولوی حسین احمد صاحب آئے تھے، مولوی عبد الماجد صاحب اور مولوی عبدالجبار صاحب کے لیے مجھ سے سفارش کی کہ آپ انہیں بیعت کر لیں، انہیں بہت اشتیاق ہے، میں نے کہا کہ آپ ہی کر لیں، انہوں نے کہا میں تو اس لائق نہیں میں نے کہا کہ یہ تو میں بھی کہہ سکتا ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ جنید اور شبلی نہ تو میں ہوں نہ آپ، لیکن انہیں

جنید وشبلی کی ضرورت نہیں ان کی خدمت کے لائق میں بھی ہوں اور آپ بھی، جیسے یہ طالب ہیں اسی درجہ کے ان کے شیخ کا ہونا بھی کافی ہے۔

اب جس طرح اساتذہ حدیث میں بخاری و مسلم نہیں اسی طرح مشائخ تصوف میں جنید وشبلی نہیں ہیں، مگر پھر بھی موجودہ اساتذہ ومشائخ ہی سے بقدر ضرورت کام چل رہا ہے، اگر تصوف میں جنید وشبلی کی ہی ضرورت سمجھی جائے تو پھر حدیث میں بھی بخاری و مسلم ہی کی ضرورت سمجھی جائے، جس کے معنی یہ ہوں گے کہ آج کل کوئی علم ہی حاصل نہ کیا جائے، اس لیے اگر آپ اور میں یہ کہیں کہ ہم جنید وشبلی نہیں تو آپ بھی سچے اور میں بھی سچا اور اگر میں کہوں گا یا آپ کہیں گے کہ ہم لوگ ان کی بھی خدمت کے لائق نہیں، تو میں بھی جھوٹ بولتا ہوں اور آپ بھی جھوٹ بولتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ کامل نہ تو میں ہوں نہ تو آپ، لیکن ان کی خدمت کے لیے میں بھی کافی ہوں اور آپ بھی آپ تو تواضع فرما رہے ہیں، لیکن اللہ نے مجھے کبر سے محفوظ رکھا ہے عرفی تواضع سے بھی محفوظ رکھا ہے ایسی تواضع میں طالبین کا ضرر ہے، اگر ہر مالدار یہی کہے کہ میں مفلس ہوں تو جو حاجت مند ہیں وہ کہاں جائیں اور کس کے سامنے اپنی حاجت پیش کریں، یہ نہیں چاہیے، بلکہ اگر کوئی اپنی ضرورت سے زائد مال رکھتا ہو اور اس کے پاس کوئی حاجت مند آئے تو بجائے اس کے کہ یوں کہے کہ میں مفلس ہوں یہ کہے کہ میں گو قارون کے برابر تو نہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ تیری خدمت کے لائق میرے پاس مال موجود ہے۔

خود حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مالدار آدمی کو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ کیا ہیئت بنا رکھی ہے؟ اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں کہ اپنے بندوں پر اپنی نعمت کا اثر دیکھیں، جب خدا نے پہننے، کھانے کو دیا ہے تو پہنو، کھاؤ، اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ حاجت مندوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ موقعے ہیں حاجت پیش کرنے کے نہیں تو ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ کس کے سامنے اپنی حاجت پیش کریں، غرض میں نے کہا کہ ان کی خدمت کے لائق تو میں بھی ہوں اور آپ بھی، لیکن اس طریق میں شرطِ نفع مناسبت ہے اور مناسبت ان کو جیسی آپ سے ہے مجھ سے نہیں کیونکہ آپ بھی خادم قوم ہیں یہ بھی خادم قوم ہیں اور میں ہوں نادم قوم، غرض میں نے دونوں کو ٹال دیا، بعض لوگ مجھ پر اعتراض کرتے ہیں کہ پہلے تمہارے اکابر میں اتنا تشدد نہ تھا میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ پہلے اصاغر میں اتنی خود رائی بھی نہ تھی، اس پر مامون الرشید کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

سب جانتے ہیں کہ مامون الرشید کی سلطنت کوئی معمولی سلطنت نہ تھی، بڑی آب وتاب اور شان وشوکت کی سلطنت تھی، مگر اس کے ساتھ ہی وہ بڑا حلیم اور خوش اخلاق بادشاہ تھا، یہاں تک

کہ اس کی خوش اخلاقی اور حلم کی وجہ سے اس کے غلام تک اس کے ساتھ گستاخی کا برتاؤ کرتے تھے، لیکن اس کو غصہ نہیں آتا تھا، اس لیے لوگ عموماً دلیر ہو گئے تھے، کسی نے ان سے کہا کہ آپ نائب ہیں خلفاء راشدین کے، کیونکہ وہی سلسلہ ہے سلطنت کا جواب تک چلا آرہا ہے، ان حضرات کے یہاں نہ یہ حشم وخدم تھے، نہ یہ ساز وسامان نہ نقارچی نہ نقیب، غرض بالکل سادگی تھی۔

مامون الرشید نے اپنے افعال کی تاویل نہیں کی بلکہ ایک عجیب جواب دیا کہا کہ تم نے حضرات خلفاء راشدین کے زمانے کے خواص کو تو دیکھا، مگر یہ نہ دیکھا کہ اس زمانہ کے عوام بھی ایسے تھے جیسے ابو ہریرہ، مقداد، انس رضوان اللہ علیہم اجمعین اور فلاں فلاں لوگ، اس زمانہ کے عوام جیسے ہو جاؤ تو میں بھی حضرات خلفاء جیسا ہو جاؤں گا اور اگر عوام تو ہوں متکبر جیسے ہامان اور فرعون اور میں بن جاؤں معمولی، تو تم لوگ تو مجھے چار ہی دن میں پاگل سمجھ کر نکال باہر کرو گے، اب تو برابر کا معاملہ ہے کہ جیسی رعیت ویسا بادشاہ، واقعی خوب جواب دیا یہ مامون الرشید بہت حلیم تھے۔

(افاضات: ۲/۹ ص ۲۳۲)

سلب نسبت کی تشریح

(۱۳)...... حضرت تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ ایک کام کی بات یاد آئی، یہ جو مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں بزرگ کی نسبت سلب کر لی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نسبت قرب الٰہی کا نام ہے اس کو کوئی سلب نہیں کر سکتا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چیز حق تعالیٰ بندے کو عطاء فرمائیں اور دوسرا کون ہے جو اس سے سلب کر لے، حقیقت اس کی صرف یہ ہے کہ کسی تصرف کسی کیفیت نفسانیہ کو مضمحل کر دے جس سے نشاط کی جگہ غباوت ہو جائے مگر وہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے، لیکن اگر مقاومت نہ کی پھر اخلال عمل کے سبب اس کا اثر نسبت تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ (افاضات: ص ۶۱ رج ۱)

(۱۴)...... حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے نقل کیا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک مجلس میں حضرت جنید رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہوں اور حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ہوں تو ہم حضرت جنید کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔

(افاضات: ۱/۷ ص ۱۷۲)

دیر و حرم میں روشنی شمس و قمر سے ہو تو کیا
مجھ کو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں

حضرت حاجی صاحب کا ایک مکتوب گرامی بنام

حضرت مولانا یعقوب صاحب

حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک مکتوب تصوف کے بارے میں نہایت قیمتی نظر سے گزرا اس کو بعینہ نقل کراتا ہوں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد حمد صلوٰۃ بخدمت بابرکت سعید دارین مقبول کونین مولوی محمد یعقوب صاحب زاد اللہ شوقہ و ذوقہ، وعرفانہ بعد از اداء مراسم، سلام مسنون! واشتیاق کثیر بہت:

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می گویمت دعاء ثنای فریست

واضح رائے آں عزیز کے ہو کہ بندہ جس حال میں کہ حق تعالیٰ رکھے خوش وخرم ہے۔ شعر:

نا خوش او خوش بو ددر جان من
جاں فدائے یار دل انجان من

نامہ محبت شامہ پہنچا، جس سے آتش اشتیاق اور تیز ہوگئی، حقیقت عزیز باتمیز کا اس کم نصیب کی نسبت ایسی ہی خوش اعتقادی ہے جیسے کہ حوالہ قلم کیا ہے، اگر چہ یہ کم نصیب روسیاہ اس قابل نہیں ہے، مگر کثیر طالبین خدا اسی حسنِ ظن کی وجہ سے ایسے مرتبے پر فائز ہوگئے کہ مرشد بھی اس مقام تک نہیں پہنچے۔

جب نہیں کہ آں عزیز بھی اپنی حسن عقیدت سے مقصود پر پہنچ جائیں، اس سے پہلے چاہتا تھا کہ چند احباب ہم مذاق جمع ہو کر سلوک کے حال وقال کا مذاکرہ کریں کہ رفتہ رفتہ یہ قیل وقال حال سے بدل جائے اور مقصود پر پہنچے:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کین دولت از گفتار خیزد

مگر کیا کیا جائے کہ بندہ مجبور ہے بجز تہمت اختیار کے کچھ نہیں ہے۔

ماہمہ شیراں دلے شیر علم
حملہ شاں ازباد باشد دم بدم

حق تعالیٰ جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور جو ارادہ کرتے ہیں وہی حکم کرتے ہیں بندہ پریشان

ہے کہ کیا کرے، روتا رہتا ہے اور کہتا ہے۔

اے رفیقاں راہ ہارا بستہ مار
آ ہوئے لن گیم او شیر شکار
جز کہ تسلیم و رضا چہ چارہ تر
درکف شیر نر خونخوار

اے عزیز تاہم طالب صادق کو چاہیے کہ اپنے مطلوب کی طلب میں مردانہ وار سرگرم و پرجوش رہے، ایک دم آرام نہ لے بقول عاشق۔

یا بم اور ایا نیا بم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیا ید آرزوئے می کنم
راز ہائے دل بیاں سازم بہ پیش یار خود
بشنو دیا نشنو من گفتگو ئے می کنم

اگر ایسا ہوتا رہے تو اس کے عام کرم سے امید قوی ہے کہ اپنے طالب کو محروم نہ چھوڑے گا۔

سایہ حق بر سر بندہ بود
عاقبت جوینده پائندہ بود
گفت پیغمبر کہ چوں کو بی درے
عاقبت زاں در بیروں آید سرے
چوں نشینی بر سرے کوئے سرے
عاقبت بنی تو ہم روئے کسے

''لا تقنطوا من رحمة الله إن الله يغفر الذنوب جميعا إنه هو الغفور الرحيم''

عزیز مولوی خورشید حسن (مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ) کہ خورشید حقیقی ہیں، بندہ کی طرف سے اس طرح اجازت بیعت وتعلیم کی ہے، جس طرح بندہ کو اپنے بزرگوں سے ہے، جو چاہے ان سے بیعت کر کے استفادہ کرے نیز ایک خط ان کے نام آپ کی درخواست کے موافق اخذ بیعت کے لکھا گیا ہے ان شاء اللہ پہنچے گا، صاحب موصوف انکار نہ کریں گے، اکرم الاکرمین سے امید قوی ہے کہ بہت فیضان ہوگا، عاقبت بخیر ہو۔

(مکتوبات امدادیہ نمبر ۴: ص ۲۹۹)

خط طویل ہے، اصل مکتوب شریف فارسی میں تھا اور اس کا ترجمہ بھی ساتھ تھا، اس لیے اس

ناکارہ نے ترجمہ پر ہی اکتفاء کیا کہ فارسی سمجھنے والا اب کون ہے۔

(۱۶)......اصل مقصود میرا اس مکتوب گرامی سے وہی مضمون تھا کہ شیخ کے ساتھ حسنِ ظن اس طریق میں بہت مجرب اور موجب ترقی ہے، حضرت سید الطائفہ کا ارشاد ہے کہ حقیقۃً عزیز باتمیز کو اس کم نصیب کی نسبت ایسی خوش اعتقادی ہے جیسے کہ حوالہ قلم کیا ہے، اگر چہ یہ کم نصیب روسیاہ اس قابل نہیں مگر کثیر طالبین خدا اسی حسن ظن کی وجہ سے ایسے مرتبے پر فائز ہو گئے کہ مرشد بھی اس مقام تک نہیں پہنچے۔

حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک طویل مکتوب جو مستقل بھی طبع ہو چکا ہے، نواب صاحب چھتاری کے نام آیا تھا جب کہ انہوں نے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ مستقل قیام کا ارادہ فرمایا تھا، اس میں ارشاد ہے کہ قیام کے لیے ریاست سے اپنے اخراجات کے لیے روپیہ منگانا تجویز کریں، مگر داد و دہش کے لیے منگانے کا انتظام نہ کریں کہ یہ بھی غیر حق کی طرف مشغولی ہے جو عابد مجرد کے لیے تو زیبا ہے مگر عاشق کے لیے زیبا نہیں اور یہ شعر لکھا:

نان دادن خود سخائے صادق ست

جان دادن خود سخائے عاشقی ست

اور یہاں مکہ مکرمہ میں رہ کر مشغول بغیر حق سخت مضر ہے اور اصل بات تو یہ تھی کہ تم اپنے لیے منگانا تجویز نہ کرتے، اس لیے کہ کریم کے دروازہ پر کھانا باندھ کر لانا بہت ہی سوء ادب ہے، مگر چونکہ تم ابتداء سے اس کے خوگر ہو اس لیے تم اپنے لیے انتظام کر کے لاؤ، ورنہ موجب تشویش ہوگا اور تشویش بھی مضر ہے، کیا ٹھکانا ہے حضرت کی اس بصیرت کا بزرگوں کے یہاں اس کا ہمیشہ اہتمام رہا کہ مشغولی بغیر حق نہ ہو۔ (افاضات الیومیہ: ۱/۷ص ۱۴۳)

حضرت سید الطائفہ نے جو ارشاد فرمایا، بہت ہی اہم قابلِ قدر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، مگر اس کا لحاظ ضروری ہے کہ یہ ارشاد ان ہی لوگوں کے لیے ہے کہ جو غیر حق کے ساتھ مشغول نہ ہونے پر قادر ہوں۔

محض ان الفاظ کو دیکھ کر نا اہلوں کو ان الفاظ کی اتباع میں بغیر زادِ راہ سفر ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ وہاں کی حاضری کے بعد بجائے حق کے ساتھ مشغولی کے مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑیں، کھانے کے وقت پر کھانے والوں کے پاس جا کر بیٹھ جائیں کہ شریف آدمی بُلا وے ہی گا اور ہر وقت لوگوں سے پیسے ملنے کی اُمیدیں، کوشش اور تدبیروں میں لگے رہیں، کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔

بنام حضرت مولانا قاسم نانوتوی

(۱۷)......مکتوب سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ بنام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد حمد وصلوٰۃ بخدمت بابرکت مقبول دارین مولوی محمد قاسم صاحب دام ذوقہ وشوقہ،

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اوراشتیاق ملاقات واضح رائے شریف ہو کہ نامہ عالی پہنچا، مسرور کیا مضمون سے اطلاع ہوئی، آپ جیسے مقبول الٰہی کے جو کچھ حوالہ قلم کیا ہے ایک بندہ عاجز کو اپنی نسبت ایسا ہی گمان کرنا چاہیے، اگر چہ اپنی دانست واعتقاد واعمال کو بہتر اور لائق خیال کرتے ہیں، لیکن نعوذ باللہ منہا حضرت کردگار کے دربار عالی وقار کے ساتھ ہرگز لائق وشایاں نہیں ہے، لیکن بندہ گندہ ونادم کے لیے اس سے چارہ نہیں ہے کہ بُری بھلی طرح بندگی کرتا رہے، بہرصورت اسی شکستہ وخستہ حالت میں اپنی کوتاہی کے اقرار کے ساتھ درگاہ کریم کارساز پر ہمیشہ پڑا رہے اور نہ یہ خیال کرے کہ میں سبحانہ تعالیٰ کے دربار کے لائق نہیں ہوں:

تو مگو ماراباداں شہ بار نیست
با کریماں کار ہا دشوار نیست

از زکریا عفی عنہ حضرت حاجی صاحب ہی کا ایک شعر مضمون بالا کے مناسب یاد آگیا۔

گرچہ میں بدکار و نالائق ہوں اے شاہ جہاں
پر تیرے در کو بتا اب چھوڑ کر جاؤں کہاں
کون ہے تیرے سوا مجھ بے نوا کے واسطے

اس کے بعد سید الطائفہ اپنے مکتوب بالا میں تحریر فرماتے ہیں، بلکہ ہمت کے ہاتھ سے رحمت کے دامن کو نہ چھوڑے اور امیدوار رہے، اگر اسی طرح کرتا رہے تو امید قوی ہے کہ ارحم الراحمین اپنے بندہ شکستہ کو نہ چھوڑے گا، کیونکہ خداوند تعالیٰ اپنے بندہ سے جز شکستگی وخستگی کچھ نہیں چاہتے، چنانچہ عارف روم کا قول ہے:

من نہ گردم پاک از تسبیح شاں
پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں
چند ازیں الفاظ و اضمار و مجاز
سوز خواہم سوز با آں سوز ساز

غرض ان کی درگاہ بے نیاز میں بجز تضرع وزاری کے کوئی کامیابی کا طریقہ نہیں اس سے زیادہ عرض کرنا تکلف ہے کہ بفضلہ آں عزیز عالم وعاقل ہیں، الغرض کریم کارساز پر نظر کر کے اور اپنے پیروں اور پیشواؤں کا طریقہ سمجھ کر جو کچھ آپ کو بزرگوں سے پہنچا ہے اور نیز کتاب ''ارشاد الطالبین'' و''جواہر خمسہ'' و''رسالہ مکیہ'' کو کہ ان میں ہمارے خاندان کے اشغال ہیں لے کر جو طالب صادق آئے، اس کے مناسب حال واستعداد تعلیم میں مضائقہ نہ کریں اور آئندہ جس ہادی اور نافع رساں نے طالب کو بھیجا ہے خود وہی فائدہ وہدایت وتوفیق بخشیں گے۔

(مکتوبات ۱۰ امدادیہ: ص ۲۸۸)

حضرت سید الطائفہ نے جو کچھ تحریر فرمایا حقیقت واضح ہے کہ ہر جگہ اسی چیز کی قدر ہوتی ہے جو چیز وہاں نایاب ہو، ہندوستان میں کوئی مرچوں کا تحفہ لائے یا کابل میں انگور کا تحفہ لے جائے تو اس کی قدر نہیں ہر جگہ اسی چیز کی قدر ہوتی ہے جو وہاں نایاب ہو، عجز وافتقار احتیاج مالک کے دربار میں مفقود ہے اس لیے اس کریم آقا کے یہاں جتنی قدر اس جنس کی ہے اوروں کی نہیں ہے۔

(۱۸)...... مکتوب سید الطائفہ بنام حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ (اور اپنے اسم گرامی کو عبد الکریم سے تعبیر فرمانا ایک خاص وقتی مصلحت سے تھا) طرف سے فقیر عبد الکریم کے عزیز القدر عالی مرتبت مولوی محمد قاسم زاد شوقہ وذوقہ باللہ تعالیٰ کو بعد سلام مسنون اشتیاق مشحون کے ملاحظہ فرمائیں، دو خط مسرت نشان عزیز القلوب کے پہنچے جو مورخہ پندرہ ۱۵ رجب کے تھے، تیسرا خط...... رشید احمد گنگوہی کے ہاتھ جو درد وسوز سے بھرا ہوا تھا پہنچا، طبع کو مسرور کیا، ہمیشہ ایسا ہی ''ھل من مزید'' رہے۔

عزیز من! اس راہ میں سوائے درد وناکامیابی کا ادعاء ہستی کی صورت ہے اور ہستی سالک کے لیے بلا ہے اور نیستی بے انتہاء ثمرات کا باعث، پس جب تک زندگی ہے اسی درد ونایافت میں بسر کرے اور کام میں مشغول رہے اور حسب اجازت مشائخ مخلوق کی خدمت کرے ہم اور تم وسیلہ سے زیادہ نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان ہی وسائط کے بہانے سے اپنے فیضان کو چھپا کر اپنے ممالک کا خود انتظام کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمارے تمہارے ساتھ ہے۔ الخ

(امداد المشتاق: ص ۳۰۴)

بنام حکیم ضیاء الدین صاحب

(۱۹)...... مکتوب سید الطائفہ بنام جناب حکیم ضیاء الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ مناسب ہے کہ اوراد واشغال کی تعلیم میں یارانِ طریقت کی قصور اور سستی کو راہ نہ دیں اور کتب اخلاق اور

ملفوظات مشائخ اور مکتوبات کا مطالعہ کرتے رہیں اس واسطے کہ کلمات مشائخ مرد کو شیر بناتے ہیں اور نامرد کو مرد اور اپنے حال سے اطلاع کرتے رہیں، اسی خط میں جناب احمد حسین صاحب کے خط سے عزیزم یوسف کا الور جانا معلوم ہوا افسوس ہے کہ اس کے حال نیک میں خلل واقع ہوا، نہایت آزمائش پیش آئی اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، فقر و فاقہ مومنین کے حق میں معراج ہے، طاقت نہ رکھ کر قناعت کے گوشہ اور صبر سے باہر ہو گیا، اگر چند تکلیف برداشت کرتا اور اس پر قناعت رکھتا تو چند عرصہ میں تمام تکلیف دور ہو جاتی۔ (مکتوبات ۱۱: ص ۳۳۰)

بنام عبدالواحد خان صاحب

(۲۰)...... مکتوبات سید الطائفہ بنام عبدالواحد خان صاحب...... اپنے مرشد کو اپنے سے غافل نہ جانیں اور دوسری طرف مائل نہ ہوں جب تک کہ اجازت شیخ کی نہ ہو، کیونکہ ہر جائی ہمیشہ خراب ہوتا ہے اور پیروں کی نظر سے گر جاتا ہے اور ہر گز منزل مقصود پر نہیں پہنچتا، یک در گیر محکم گیر ان شاء اللہ طالب صادق محروم نہ رہے گا، خاطر جمع اس میں (اس کے بعد دو رکعت نفل اور مراقبہ کا عمل لکھنے کے بعد تحریر فرمایا کہ) اس زمانہ میں جو کچھ واردات واقعہ ہوں مولوی رشید احمد صاحب یا مولوی محمد قاسم صاحب سے دریافت کر لیں، تحریر کی حاجت نہیں۔ (مکتوبات: ص ۴۰۹)

(۲۱)...... مکتوب سید الطائفہ بنام عبدالواحد خان صاحب، چاہیے کہ باوجود مشغولی بارہ تسبیح و پاس انفاس وغیرہ کے ذکر لسانی اسم ذات کا بھی چوبیس ہزار اللہ۔ اللہ اس طریقہ سے کہ اس کو غیر ذات نہ جانیں اس تصور کے ساتھ کہ زبان دہن ولسانی قلب باہم تلفظ کریں۔ ہر روز کرتے رہیں۔ اگر نہ ہو سکے بارہ ہزار بار ضرور مکمل رکھیں۔ نیز اپنی استعداد کے موافق حبس دم کا شغل بھی مناسب اور کیفیت اس کی مشغولی کے وقت واضح ہوگی اور اس کی ترکیب مولویوں یعنی مولوی رشید احمد صاحب یا مولوی محمد قاسم صاحب سے دریافت کر لیں۔ تحریر کی حاجت نہیں۔

(مکتوبات: ص ۴۰۹)

(۲۲)...... مکتوب سید الطائفہ بنام عبدالواحد خان صاحب، میاں رحیم بخش کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کو کوئی مرض لاحق ہو گیا ہے جس کا علاج چاہتے ہیں عشق مجازی حقیقت کا رہبر اسی وقت تک ہے کہ معشوق مجازی سے وصال نہ ہو ورنہ نقصان عاشق ہے۔

عاشقی گر زیں سر و گر زاں سر است
عاقبت مارا براں شہ رہبر است

یعنی طالب حق کو چاہیے کہ مجاز میں حقیقت کو دیکھے اگر مجاز کا غلبہ ہو تو اس کے دفعہ کی صورت یہ

ہے کہ نفی واثبات کے ذکر کے وقت معشوقِ مجازی کی صورت اپنے قلب میں تصور کرے اور کلمہ ''لا'' کو اندرون دل سے تمام شدت وقوت سے کھینچ کر اور ''الٰہ'' کو داہنے مونڈھے پر پہنچا کر اور سر کو پشت کی طرف کر کے تصور کرے کہ محبوب مجازی کی صورت اور اس کی محبت کو دل سے باہر نکال کر پس پشت ڈال رہا ہوں اور سانس کو چھوڑ کر لفظ ''الا اللّٰہ'' قوت وزور کے ساتھ دل پر ضرب کرے اور ملاحظہ کرے کہ نور الٰہی اور محبت کو دل میں لایا ہوں اسی کشا کش و دمادم کے ساتھ ذکر کرے اور چند روز عمل کرے ان شاء اللہ چند عرصہ میں عشق مجازی عشق حقیقی ہو جائے خاطر جمع رکھے اور پانچ سو بار ''اللہ الصمد'' پڑھیں اور بعد نماز عشاء ایک سو ایک بار ''یا عزیز'' اور اسی قدر ''یا ارحم الراحمین'' ہمیشہ پڑھے اور ہمیشہ اپنا حال لکھتے رہیں۔ (مکتوبات امدادیہ: ص ۴۲۱)

بنام حکیم ضیاء الدین صاحب

(۲۳)...... مکتوب سید الطائفہ بنام حکیم ضیاء الدین صاحب...... معلوم ہوا کہ صورت قیام آں عزیز کی بھوپال میں بذریعہ طباعت چالیس روپے تنخواہ پر ہوئی تھی، آں عزیز نے قبول نہ کیا خیر! جو کچھ مناسب جانیں بہتر ہے مگر فقیر کے نزدیک ایسی سرکار اسلامیہ اور زمرہ اہل اسلام میں آں عزیز کا قیام مناسب معلوم ہوتا ہے اس واسطے کہ وطن کے خرخشوں سے محفوظ رہنا اور دلجمعی سے مشغول ہونا بہتر ہے، خصوصاً حق میں آں عزیز از جان کے۔

بہر حال دلجمعی سے اشتغال باطنی خصوصاً آخر عمر میں بہت ہی ضروری ہے اگر ایک بار ملاقات آں عزیز کی پھر میسر آئے فقیر کی دلی خواہش کا سبب ہے اور میں نے سنا ہے کہ مولوی رشید احمد کا بھی ارادہ ہے، خدا کرے اس حج میں شریک ہوں آمین اور اب فقیر ارادہ کرتا ہے کہ باقی عمر مدینہ میں بسر ہو اور خاتمہ اس متبرک جگہ میں میسر ہو اور خاک بقیع ہو، مولوی رشید احمد صاحب وغیرہ کی ملاقات کا انتظار ہے۔

ملفوظ حضرت تھانوی

(۲۴)...... حضرت تھانوی نے فرمایا کہ بہت لوگوں نے مجھ سے پیری مریدی کے متعلق خط و کتابت کی، جب دیکھا کہ کچھ کرنا پڑتا ہے، بیٹھ گئے، آج کل یہی ہو رہا ہے، چاہتے ہیں کہ جنت میں پہنچ جائیں اور کچھ کرنا نہ پڑے، یہ کیسے ہو سکتا ہے جو کام کرنے سے ہوتا ہے اس میں تو کرنا ہی پڑے گا تب ہی کوئی نتیجہ مرتب ہوگا اور اس مرض میں اہل علم تک کو ابتلاء ہے عوام بیچاروں کی تو شکایت ہی کیا ہے۔ (افاضات: ۸/۲ ص ۳۲۷)

ملفوظ حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ

(۲۵)......سوانح حضرت رائے پوری میں علی میاں لکھتے ہیں کہ ایک صاحب رائے پور شریف حاضر ہوئے وہاں ماہ مبارک میں سب حاضرین ذکر وشغل تلاوت وغیرہ میں مشغول رہتے ہی تھے، وہ صاحب یہ منظر دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم سے تو یہ چکی نہ پیسی جائے گی، غالباً! کسی نے حضرت سے ذکر کر دیا ہوگا، شام کے کھانے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ دوست آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حصہ کی پڑیا بنی رکھی ہے، مل جائے گی، جیب میں ڈال کر لے آئیں گے، مگر یہاں بغیر محنت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس راستہ میں محنت لازمی ہے، غالباً اس کے بعد آیت:

''والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا '' پڑھ کر روشنی ڈالی۔

مگر چند دنوں بعد حضرت کے کانوں میں پھر یہی الفاظ ڈالے گئے کہ فلاں بزرگ دوستوں کی یہاں شب و روز محنت دیکھ کر گھبراتے اور کہتے ہیں کہ اتنی محنت یہاں کون کرے، دوبارہ بڑے جوش سے فرمایا کہ اگر کوئی گھر آپ لوگوں کو ایسا معلوم ہو جہاں دو روٹیاں پکی پکائی مل جاتی ہوں تو میں بھی ٹوکری پکڑ کر تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں تاکہ کچھ حاصل کر سکوں، مگر دوست صرف چکی ہی پیسنے کی شکایت کرتے ہیں۔

مگر میں کہتا ہوں کہ چکی پیسنے کا ہنر تو بہت روز میں آتا ہے، پہلے تو زمین کو جوتنا ہے، اچھا بھلا بیج گھر سے نکال کر کھیت میں بکھیرنا ہے، پھر سینچنا ہے، تاکہ کھیتی بڑھ کر پکنے کی حد تک پہنچے اور پک جائے تو پھر کاٹنا اور گاہنا اور غلہ کو بھوسے سے الگ علیحدہ کرنا ہے، پھر جیٹھ کی گرمی کو برداشت کرنا ہے، پھر چکی پیسنا ہے، آٹا بن جانے کے بعد مشقت سے گوندھنا بھی ہے اور آگ جلانا پکانے کا سامان مہیا کرنا ہے، پک کر تیار ہو جانے کے بعد مشقت سے توڑ کر منہ کے زور سے نگلنا ہے، ان ساری کوششوں کے بعد اگر ہضم ہو جائے تو محض میرے مولا کا فضل سمجھنا چاہیے ورنہ قے ہو کر باہر نکل سکتا ہے۔ (سوانح حضرت رائے پوری: ص ۳۳۹)

(۲۶)......خان صاحب نے فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ چھتہ کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے وضو کر رہے تھے اور میں پیچھے کھڑا ہو گیا تھا، آپ مجھ سے باتیں کر رہے تھے، حکیم عبدالسلام ملیح آبادی حاجی محمد عابد حسین صاحب سے باتیں کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ ایک میرے دوست لکھنؤ کے باشندے نصف مجذوب مکہ معظمہ کو ہجرت کر گئے تھے۔

جب میرا مکہ جانے کا اتفاق ہوا تو واپسی کے وقت انہوں نے بہت شد و مد سے یہ فرمایا کہ تم یہیں رہو ہندوستان مت جاؤ، اس واسطے کہ وہاں انقلاب ہو رہا ہے جو غدر سابق سے بڑھ کر ہوگا،

یہ سن کر جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے چونک کراور پیچھے کومڑ کران کی طرف دیکھااور فرمایا کہ وہ کون ہےاوران کو ہندوستان سے کیاتعلق ہے، ہندوستان ہمارا ہے یااُن کا؟ یہاں کچھ نہیں ہونے کا، رات کوان کی دن کوان کا، یہ فقرہ کئی دفعہ فرمایا، بوریا لپٹ جائے گا، جھاڑو پھر جائے گی، کسی قسم کا غدر نہیں ہوگا، اس پر حاجی محمد عابد صاحب نے حکیم عبد السلام سے کہا کہ سن لو یہ ہمارے مجذوب ہیں، اس پر حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ قولہ وہ کون ہے اقول یہ اسی شان قطبیت کی فرع ہے۔ (اورحِ ثلاثہ:ص۳۱۳)

(از زکریا، واقعہ بھی ایسا ہی ہوا کہ رات انگریزوں کی اور دن کانگریس کا، غدر تو واقعی نہیں ہوا مگر جھاڑو پھر گئی)

(۲۷)......ایک مرتبہ صبح کے وقت جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرسہ میں اپنی درسگاہ میں پریشان اور خاموش بیٹھے ہوئے تھے، میں اور چند دوسرے اشخاص اس وقت پہنچ گئے، مولانا نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ:

اُفو! رات مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی، میں نے حق تعالیٰ سے کچھ عرض کیا، حضور نے کچھ جواب ارشاد فرمایا، میں نے پھر عرض کیا (جو کچھ ظاہراً گستاخی میں داخل تھا) اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ بس چپ رہو، بکومت، ایسی گستاخی، یہ سن کر میں خاموش ہوگیا اور بہت کچھ استغفار معذرت کی، بالآخر میرا قصور معاف ہوگیا۔

اس کے بعد آسمان سے ایک پیڑھایا ؎ ولا اترا جس کی پٹیاں، سیروے، پائے سب الگ الگ تھے۔

میں نے عرض کیا کہ حضور میں سمجھ گیا حضور نے فرمایا: "ہاں"۔

اس کے بعد خان صاحب فرماتے ہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا جس زمانہ میں حضرت مولانا نانوتوی بمرض الموت علیل تھے، مولوی فخر الحسن نے اس واقعہ کو حضرت مولانا (نانوتوی) کی خدمت میں بیان کیا تو آپ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور گھبرا کر فرمایا۔

اُفو! مولوی محمد یعقوب نے ایسا کہا، توبہ توبہ توبہ، بھائی یہ انہی کا کام تھا، کیونکہ وہ مجذوب ہیں، اگر ہم ایسی گستاخی کرتے تو ہماری تو گردن نپ جاتی، اس کے بعد حضرت تھانوی ارشاد فرماتے ہیں کہ بعض مراتب مجذوبیت میں ایسے اقوال دخل ادلال ہوکر عفو فرما دیئے جاتے ہیں اور بعض مجاذیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر جذب کا اثر کسی وقت ہوتا ہے۔

(اورحِ ثلاثہ:ص۳۱۴)

(۲۸)......حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ چندہ کے متعلق میری مولانا صاحب سے بہت گفتگو ہوئی، میں کہتا تھا کہ خطاب خاص میں وجاہت کا دخل ہوتا ہے دینے والے کے قلب پر

ماننے والے کی وجاہت کا اثر پڑتا ہے، مولانا نے فرمایا کہ ہم کیا اور ہماری وجاہت کیا؟ اس کا کیا اثر ہوتا ہے، میں نے جواب دیا آپ کی نظر میں بیشک اپنی وجاہت نہیں ہے، لیکن لوگوں سے پوچھئے کہ ان کے قلوب میں آپ کی کتنی وجاہت ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ نہیں جی، بہت دیر گفتگو رہی لیکن انہوں نے میری رائے نہیں مانی اپنی رائے پر قائم رہے۔

(ارواح ثلاثہ:ص۳۸۵)

(۲۹)...... حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک مولوی صاحب نے مجھ کو عربی میں درخواست بیعت کا خط لکھا ہے، میں نے لکھ دیا کہ مفید کا مستفید سے افضل ہونا لازم ہے اور یہاں معاملہ برعکس ہے، کیونکہ میں ایسی عربی لکھنے پر قادر نہیں، اس لیے تعلق رکھنا ہی بے کار ہے۔

دیکھئے خواہ مخواہ عربی لکھتے ہیں، مقصود لیاقت کا اظہار ہے جو ناشی ہے جاہ سے۔

سمجھتے ہیں کہ اظہارِ قابلیت پر قدر ہوگی، یہاں یہ قدر ہوتی ہے کہ لتاڑ پڑتی ہے وہ عالم ہی کیا جو اپنے کو عالم سمجھے۔

ایک اور صاحب نے عربی میں خط لکھا تھا، میں نے لکھا کہ عربی میں خط لکھنے کی کیا مصلحت تھی؟ لکھا کہ اہلِ جنت کی زبان ہے، میں نے لکھا کہ "قسم کھا کر لکھو کہ اگر یہاں آنا ہو تو عربی زبان میں گفتگو کرو گے، اس لیے کہ اہلِ جنت کی زبان ہے" پھر جواب نہیں آیا۔

تاویل کرتے ہوئے شرم بھی تو نہیں آئی کیا لکھنے کے وقت یہی نیت تھی یا اظہار قابلیت مقصود تھا، اپنے کو بڑا عقل مند سمجھتے ہیں، یہاں یہ چالاکیاں چلنا مشکل ہیں۔

اللہ کا شکر ہے اپنے بزرگوں کی دعاء کی برکت سے فوراً ذہن میں اصل حقیقت آجاتی ہے۔

چاہے لوگ ظاہر نہ کریں، مگر نکلتی وہی بات ہے جو سمجھ میں آتی ہے۔

میں نے ایک صاحب سے کہا تھا کہ "تمہارے اندر کبر ہے اس کا علاج کرو۔ اس وقت قبول نہیں کیا بلکہ اور برا مانا۔ پھر پانچ برس کے بعد خود اقرار کیا کہ تمہاری تشخیص بالکل صحیح تھی۔ میرے اندر کبر کا مرض ہے"۔ (اضافات:۸/۳ص۲۳۰)

اس رسالہ میں چند امور اور لکھنے کا ارادہ تھا۔ مگر دو ہفتہ سے ایسا ہجوم مہمانوں کا رہا کہ لکھوا نہ سکا اور اب تو سفرِ حجاز سر پر ہے۔ جو امور لکھوانے کے تھے ان کو اجمالاً نوٹ کر دیا اور عزیزانِ مولوی عاقل، مولوی سلمان سلمہما سے کہہ دیا کہ میری زندگی میں واپسی ہوگئی تب تو ان شاء اللہ پوری کرا دوں گا، ورنہ وہ ہر دو عزیزان اس کا اضافہ کر دیں۔

حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل وکرم سے جو اس بے ربط تحریر میں لغزشیں ہوئی ہیں، ان کو معاف

فرمائیں۔

''واللّٰہ الموفق لما یحب ویرضی وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا و مولانا محمد وا لہٖ وصحبہٖ وبارک وسلم تسلیماً کثیرا کثیراً برحمتک یاارحم الراحمین''۔

ناکارہ
محمد زکریا کاندھلوی

......☆☆☆☆☆......

مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ
اور مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ سے
ذکر کے سلسلے میں حضرت شیخ کے مکاتیب حضرت
رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہند و پاک وحجاز کے اسفار
سہارنپور میں کیے جانے والے رمضانوں کی
تفصیل نیز تصوف وسلوک کے متعلق بعض اہم
مضامین شامل ہیں

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدظلہٗ العالی کی

آپ بیتی (خودنوشت سوانح)

ایک نظر میں

حضرت شیخ مدظلہ بچپنے سے پیرانہ سالی تک حق تعالیٰ شانہٗ کے جن گوناگوں خصوصی الطاف و عنایات کے مورد رہے ہیں وہ اس دور میں نادر الوجود ہیں۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح مولانا محمد ثانی حسنی نے مرتب کی، اس کے باب اول میں جو حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں زید مجدہم کے قلم سے تھا۔ حضرت شیخ مدظلہ کے حالات وسوانح اور آپ پر الطاف ربانی کا مختصر تذکرہ آیا، حضرت شیخ مدظلہٗ نے اس کی اشاعت پر مؤلف ''سوانح یوسفی'' کے نام ایک گرامی نامہ تحریر فرمایا کہ جو باتیں لکھنے کی تھیں وہ چھوڑ دیں اور جو نہ لکھنے کی تھیں وہ لکھ دیں۔

یہ گرامی نامہ ''آپ بیتی نمبر ا'' قرار پایا، اس کے بعد احباب کے تقاضوں سے مزید واقعات لکھوانے شروع کیے اور انہیں ابواب وفصول پر مرتب فرمادیا، چنانچہ اب تک اس کے سات نمبر طبع ہو چکے ہیں۔

سیر وسوانح میں ''آپ بیتی'' سب سے دلچسپ اور مبنی برحقائق تصنیف ہے اور کسی نابغہ شخصیت کی آپ بیتی سے تمام تر سادگی، جذبہ خمول وکسر نفسی کے باوجود محض دلچسپ ہی نہیں حکمت آگیں اور سبق آموز بھی ہوتی ہے۔ ''آپ بیتی'' سے مصنف کی شخصیت، اس کے اخلاق و عادات اور نفسیات کے دقیق سے دقیق پہلو بھی بلاحجاب سامنے آجاتے ہیں اور پھر حضرت مدظلہٗ کی آپ بیتی صرف آپ بیتی ہی نہیں ہے بلکہ اپنے اکابر کے حالات وسوانح کا حسین مرقع اور مختصر سا ''انسائیکلوپیڈیا'' ہے۔ جس کے مطالعہ سے نہ صرف دل اور دماغ اور قلب ونظر کی بہت سی گرہیں کھلتی ہیں بلکہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان ملکوتی صفت اہل اللہ کی محفل علم وعرفان سے مستفیض ہو رہا ہے۔

تقریظات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

حامداً ومصلیاً ومسلماً۔ یہ رسالہ ''آپ بیتی'' بھی میرے گلے کا کچھ ایسا ہار بن گیا کہ بار بار اس کو ختم کر چکا ہوں، کئی مرتبہ تمت کر چکا ہوں مگر کچھ تو دوستوں کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور بعض اکابر کے واقعات کے متعلق اپنا بھی سر کھجلانے لگتا ہے کہ یہ کہیں محفوظ ہو جاتے تو اچھا تھا، مگر مشاغل اور امراض کے ہجوم کے علاوہ میری نگاہ میں اس تالیف کی کچھ اہمیت اب تک نہیں ہوئی۔ جب لوگ اس کے متعلق کچھ ذوق شوق ظاہر کرتے ہیں تو میں ان کو یہی کہتا ہوں کہ اللہ کے بندو! فضائل کی کتابیں پڑھو وہ اصل سرمایہ ہے، یہ تو خالی بیٹھے کے قصے تھے اخباری حیثیت کے، مگر ایسے اونچے لوگوں کی طرف سے کہ جن پہ مجھے بھی حیرت ہے زبانی اور خطوط میں اس کی اہمیت پہنچتی رہی اور میں اس پہ تعجب بھی کرتا رہا۔ ان کو محفوظ رکھنے کی یا طبع کرانے کا تو کبھی خیال نہیں آیا، مگر حال ہی میں حضرت مولانا الحاج مفتی محمد شفیع صاحب ناظم دارالعلوم کا گرامی نامہ آیا جو بعض دوستوں کے اصرار پر یہاں بھی نقل کراتا ہوں:

مخدومنا المحترم حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت کا مراسلہ تحفہ گرمی تمور مدینہ اور تمور ہی کی تسبیح وصول پائی۔ حیرت ہوئی کہ اتنے مشاغل اور اتنے احباب واصحاب کے ہجوم میں بھی اس ناکارہ کا خیال آپ کے ذہن سے نہ گیا، اول تو ساری ہی عمر فضولیات بلکہ معاصی میں گزری اور جو کچھ بشکلِ حسنات کیا بھی اب غور کرنے سے وہ بھی بے رُوح معلوم ہوتا ہے اور اس وقت حال یہ ہی ہے کہ ضعف نے پوری نماز کھڑے ہو کر پڑھنے کے قابل نہیں چھوڑا، اب تو یہ صرف بزرگوں کی شفقت ودُعاء ہی کا سہارا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت کے ساتھ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے، آپ کی تصنیف آپ بیتی جو پاکستان میں چھپی اور غالباً آپ ہی کے ارشاد سے اس ناکارہ کے پاس پہنچی، نصائح وعبر کا خزانہ ہے اس میں جو

خط آپ نے مظاہرِ علوم کے مدرسین اور ملازمین کے نام لکھا ہے آج ہی میں نے اپنے مدرسہ کے سب مدرسین کو جمع کر کے وہ خط سنایا الحمدللہ بہت ہی مؤثر نظر آیا، وفقنا اللّٰہ لا تباعہ ،حضرت کی دُعاء کا بہت ہی محتاج اور امیدوار ہوں، والسلام

بندہ محمد شفیع

۱۹ محرم ۱۳۹۴ھ

اس جیسے بہت سے خطوط اور اس سے بڑھ کر اکابرِ زمانہ کے اصرار کی بناء پر آج مدنی ۱۳ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ، ہندی ۱۲ ربیع الاول جمعۃ المبارک فی آخر ساعۃ من یوم الجمعۃ ، میں عزیز محترم الحاج ملک عبدالحفیظ سلمہ اللہ تعالیٰ ورقاہ اللہ المراتب العلیاء واسقاہ من شراب حبہ جرعۃ واسعۃ کے مبارک ہاتھ سے بسم اللہ کراتا ہوں، عزیز موصوف اور ان کے والد ملک عبدالحق اللہ تعالیٰ دونوں کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے، اپنے قربِ خاص سے نوازے، مکارہ سے حفاظت فرمائے اور اپنے اپنے وقت پر حسنِ خاتمہ کی دولت سے مالا مال کرے، میرے ان مخلص محسنوں میں ہیں جنہوں نے میرے سفرِ حجاز میں جس کا سلسلہ ۱۳۳۸ھ سے شروع ہوا تھا جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا، اس وقت سے آج تک میرے ہر سفرِ حجاز میں ملک صاحب کی ایک گاڑی میرے لیے وقف رہتی، جو حسبِ ضرورت بڑی اور چھوٹی ہونے کے اعتبار سے بدلتی بھی رہتی، مثلاً مدینہ پاک کے سفر میں جس میں سامان بھی خوب ہوتا ہے اور رفقاء بھی بہت ہوتے ہیں، بڑی سے بڑی گاڑی بدلی جاتی ہے اور مکہ کے قیام میں چونکہ صرف حرم شریف جانا ہوتا ہے یا عزیز سعدی کے گھر، تو چھوٹی گاڑی کافی ہوتی ہے، مدینہ پاک میں تو چونکہ اس سیہ کار کا مستقر جناب الحاج سید محمود صاحب نور اللہ مرقدہٗ برادر خورد حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ مرقدہما کی شفقت سے مدرسہ شرعیہ کا ایک حجرہ مستقل رہا اور آپ کے صاحبزادے عالی جناب سید حبیب صاحب مدیر اوقاف مدینہ منورہ کی شفقت سے وہی مستقر ہے اور وہ مسجدِ نبوی کی دیوار کے بالکل قریب ہے، کار کی ضرورت نہیں ہوتی، میں ہی خود تقاضے سے واپس کر دیتا ہوں کہ وہاں کے لیے تو میری ہاتھ کی گاڑی جس کو میرے دوست کھینچتے ہیں کافی ہو جاتی ہے، میں نے یہ بھی سنا کہ میری آمد کی خبر سن کر ملک صاحب نے بعض مرتبہ پندرہ بیس ہزار ریال میں نئی گاڑی یہ کہہ کر خریدی کہ وہ اب آرہا ہے یہ اُس کے لیے ہے اور ان کے صاحبزادے بلند اقبال عزیزی، محبی ومحبوبی الحاج عبدالحفیظ سلمہ اپنے انتہائی مشاغل کے باوجود میرے ساتھ ہی رہتے ہیں اور وہی گاڑی چلاتے ہیں اور میرا اور میرے مہمانوں کا جب تک کوئی مستقل انتظام نہ ہوا پنے آپ کو واحد ذمہ دار میزبانی کا سمجھتے ہیں۔

عزیز عبد الحفیظ سلمہ کو اس کے والد صاحب نے سب سے پہلے ۸۱ھ میں اس ناکارہ کے پاس سہارنپور بھیجا تھا، میں نے عزیز موصوف سے پوچھا تھا کہ تمہاری سہارنپور کی ابتدائی روانگی کی تاریخ معلوم ہے؟ اس نے بتایا کہ مجھے تو یاد نہیں لیکن بھائی تاج القادری میرے ساتھ تھے، اس لیے کہ ابا جان نے مکہ سے مفتی زین العابدین کے ساتھ بھیجا تھا کہ کسی کے ساتھ اس کو سہارنپور بھیج دیں، ان کے پاس سب لکھا ہوا ہے میں اُن سے منگاتا ہوں، عزیز موصوف کے کہنے پر انہوں نے جو خط لکھا میرا خیال ہے کہ اسی کا خلاصہ نقل کرادوں، وہ لکھتے ہیں کہ:

''اگست ۱۹۶۱ء کے پہلے ہفتے کی بات ہے کہ جناب مفتی زین العابدین نے مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ مکہ سے ملک عبد الحق صاحب کا لڑکا عبد الحفیظ آیا ہوا ہے چونکہ انہیں معلوم تھا کہ میرے پاس انڈیا کا ویزا موجود ہے اس کو میں تمہارے ساتھ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں بیعت کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں، میں نے حامی بھرلی اور دوسرے یا تیسرے روز ہم انڈیا کے لیے عازم سفر ہوئے، پہلے لاہور جاکر سلطان فونڈری میں دو (۲) شب قیام کیا، اسی دوران میں ہم نے کرنسی حاصل کرلی، لاہور سے ۱۲ بجے ریل چل کر امرتسر سے گاڑی بدلنا پڑی، رات کے ۳:۳۰ بجے سہارنپور پہنچی اور سیدھے مدرسہ پہنچے، حضرت شیخ سے ملاقات صبح کو ہوئی، چائے کے وقت میں نے عبد الحفیظ کا تعارف حضرت شیخ سے کرایا اور حاضری کا مقصد بیان کیا، حضرت شیخ نے بیان فرمایا کہ تم تو رائے پور جارہے ہو چلے جاؤ اس کو یہاں چھوڑ جاؤ، میں ایک ہفتہ بعد واپس ہوا اور دریافت کیا شیخ نے فرمایا کہ ابھی بیعت نہیں ہوا تم اُس سے خود پوچھ لو وہ چاہتا ہے یا نہیں اس نے نوعمری کی وجہ سے صاف جواب نہیں دیا، اس پر شیخ نے فرمایا کہ اس کو لے کر تم رائے پور چلو میں بھی کل آرہا ہوں، چنانچہ شیخ دوسرے دن پہنچ گئے اور نمازِ عصر سے پہلے مجھ سے فرمایا کہ عبد الحفیظ سے کہو کہ غسل کرے، حضرت سے بیعت کرادوں گا اور عصر کے بعد حضرت شیخ نے حضرت رائے پوری سے بیعت کرادیا، شیخ تو سہارنپور واپس آئے اور عبد الحفیظ وہیں رہ گیا، چند روز کے بعد عبد الحفیظ کا نظام، نظام الدین مولانا یوسف صاحب کی خدمت میں جانے کا تھا، میرا ویزا چونکہ دہلی کا نہیں تھا اس لیے خانقاہ میں مشورہ ہوا، اتفاق سے شاہ نفیس احمد دہلی جانے والے تھے، ان کے ساتھ عزیز عبد الحفیظ کو بھیج دیا، ۲۰ اگست ۶۱ھ کو رائے پور سے عزیز موصوف دہلی پہنچ گیا۔ عبد الحفیظ وہاں جماعت کے ساتھ روانہ ہوا اور وہاں سے لائل پور واپس چلا گیا۔

حضرت قدس سرۂ کے وصال کے بعد اس نے اس ناکارہ سے رجوع کیا، مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے آخری سفرِ پاکستان میں اُن کے ساتھ رہا، وصال کے بعد صفر ۸۵ھ میں سہارنپور دوبارہ گیا اور اس سفر میں اس ناکارہ سے رجوع کیا، اس کے بعد وقتاً فوقتاً سہارنپور کی آمدورفت

ہوتی رہتی اور ۸۸ھ میں ایک سال دورہ حدیث کے لیے قیام بھی کیا وہ سال اس ناکارہ کی تدریس حدیث کا آخری سال تھا، اس کے بعد اپنے امراض کی وجہ سے یہ ناکارہ تدریسِ حدیث سے معذور ہوگیا، ۲۷ رمضان ۸۶ھ کی شب میں اس نابکار نے اپنی نااہلیت کے باوجود عزیز موصوف کو بیعت کی اجازت بھی دے دی، اللہ تعالیٰ ترقیات سے نوازے۔

سفرِ حجاز ۹۳ھ

خدا شرے برانگیزد روخیرے نہاں باشد

بُھلایا بتوں نے جو دل سے مجھے
میرے ساتھ یادِ خدا ہو گئی

یہ تو متفرق مواقع پر مختلف مضامین کے ذیل میں یہ ناکارہ لکھ چکا ہے کہ اس ناکارہ کی پیدائش ۱۱ رمضان ۱۵ھ کو ہے، ساتھ (۷) سال کی عمر تک تو پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ کچھ ایسا شروع نہیں ہوا، جس کی بہت تفاصیل پہلے گزر چکیں کہ میری دادی صاحبہ میرے باپ اپنے لڑکے نور اللہ مرقدہٗ کو بہت بری طرح سے ڈانٹا کرتی تھیں کہ تو تو سات (۷) سال کی عمر میں حافظ ہو چکا تھا اور یہ بیل جانوروں کی طرح سے یونہی پھر رہا ہے اور میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا ایک ہی خواب تھا کہ آپا جتنے دن کھیلنے کے ہیں کھیلنے دو، ایک دفعہ جب اوکھل میں سر رکھے گا تو قبر میں جا کر ہی سر اُٹھاوے گا۔

سات (۷) سال کی عمر میں ضابطہ کی تعلیم شروع ہوئی تھی، چند روز تو پیار محبت میں اور اس کے بعد باپ کے جوتے نے پڑھنے پڑھانے کی طرف متوجہ کیا اور پندرہ (۱۵) سال کی عمر تک یومافیوما اپنی طبیعت بھی پڑھنے کی طرف چلنی شروع ہوگئی اور ۳۰ھ سے علمی ذوق شروع ہوا اور وہ بڑھتا ہی چلا گیا، محض مالک کا احسان اور صورتاً باپ کے ابتدائی جوتوں نے ایسا یکسو کیا کہ علمی اشتغال کے سوا کسی طرف دل کا میلان نہ ہوا۔

بہت مختلف جگہ مختلف قصے ہے اس کے لکھوا چکا ہوں کہ شادیوں میں جانا یا کسی دوسری تقریب میں شرکت میرے لیے انتہائی وحشت کی چیز بن گئی، البتہ جنازوں میں شرکت میری انتہائی مرغوب چیز رہی، اموات کو غسل دینا، حتیٰ کہ اجانب تک کو بھی اور طلبہ کو تو خاص طور سے، ان کی تجہیز

وتکفین، تدفین میں شرکت میری ٹانگوں کی معذوری سے پہلے تک بدستور رہی، اس کی تفصیل پہلے شاید کہیں گزر چکی، اس کے بہت سے واقعات متفرق جگہوں میں لکھوا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ میرا جوتا اُٹھ گیا تھا تو چھ (۶) مہینے تک مجھے اس کی ضرورت پیش نہ آئی کہ مدرسہ کے دروازے سے نکلنے کی ضرورت پیش نہ آئی، حد یہ ہے کہ میرے دو (۲) بزرگ حضرت شیخ الاسلام، حضرت رائے پوری ثانی نور اللہ مرقدھما نے اپنے ساتھ حج میں لے جانے کی کوشش کی اور اس ناکارہ کے علمی انہماک نے اس سعادت سے بھی محروم رکھا، مگر ۸۲ھ کے مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ نالائق کو تدریس سے ایسا مایوس کیا اور ایسا اُچاٹ کیا کہ ساری اُمنگیں ختم کر دیں، امیر شریعت بہار میرے مخلص کرم فرما مولانا منت اللہ صاحب بہاری نے جب اس ناکارہ نے دار العلوم کی ممبری سے استعفاء دیا تھا مولانا کا خیال تھا کہ میں نے وہاں کے اسٹرائیک کی وجہ سے استعفاء دے دیا ہے تو مظاہر کی اسٹرائیک پر یہ پیام بھیجا تھا کہ دار العلوم کی ممبری سے استعفاء دے دیا اب کیا کرو گے؟ میں نے زبانی پیام کا جواب زبانی بھیجا تھا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ بھی دیکھ لیں گے میں کیا کروں گا، ان شاء اللہ ایسا قدم تو نہ کبھی اُٹھایا نہ اُٹھاؤں گا کہ جس سے کسی مدرسہ کو نقصان پہنچے، چہ جائیکہ دار العلوم مظاہر علوم، مگر مالک کے احسانات تو لا تعد و لا تحصیٰ ہیں "وان تعدو نعمة الله لا تحصوها" کہ مالک نے اپنے اور اپنے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کی حاضری کی آسانیاں پیدا کر دیں۔

آپ بیتی نمبر ۴ میں سفرِ حجاز ۹۰ھ لکھوا چکا ہوں، میرے احباب کا اصرار اس آپ بیتی میں اسفار حج کا بہت زیادہ ہے، جب سے سفرِ حجاز کا سلسلہ شروع ہوا مکی مدنی احباب کے علاوہ پاکی احباب کا اصرار سب سے زیادہ، اس لیے کہ یہاں کہ راستے تو اکثر مسدود ہی رہتے ہیں اور ان حضرات کے لیے حجاز کی آمد جتنی آسان ہے کہ ہم لوگوں کے لیے ہندوستان آنا تو مشکل ہے اور تیرا پاکستان آنا مشکل ہے اور حجاز آنا دونوں کے لیے آسان ہے، اس کے علاوہ افریقی لندنی احباب کو بھی وہاں کی حاضری آسان ہے اور اس ناکارہ کے لیے بینائی سے معذوری کی وجہ سے کوئی علمی مشغلہ بھی نہیں رہا، اس لیے ظاہر ہے کہ خالی پڑے رہنے کے لیے ایک مسلمان کے واسطے حرمین سے زیادہ اچھی کونسی جگہ ہوگی؟ مگر کچھ اہل مدرسہ کا اصرار اور کچھ اہلِ تبلیغ کا اصرار اور کچھ دوسرے عوارض سے تاخیر ہوتی ہی چلی گئی۔

بالآخر وہ وقت آ ہی گیا، جس میں حجاز کی مستقل حاضری مقدر تھی اور ۱۸ ربیع الاول ۹۳ھ مطابق ۲۳ اپریل ۷۳ء کو بابو جی کی کار میں زکریا، مولوی انعام، شاہ ابوالحسن، حبیب اللہ، ابراہیم افریقی اور کاندھلہ تک مفتی محمود بھی ساتھ تھے۔ اپنی فجر پڑھ کر ۵:۳۰ پر روانہ ہوئے، ۶ بجے مولانا محمد

یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر جو سڑک ہی پر ہے تقریباً نصف گھنٹہ قیام ہوا، اس کے بعد نانوتہ کی بسوں کے اڈہ پہنچ کر تقریباً دس منٹ قیام ہوا جہاں حافظ عبدالعلام کے لڑکے کی بسم اللہ کرائی اور مسجد اور مدرسہ کی بنیاد کے لیے اینٹیں پڑیں، ۶:۴۵ پر وہاں سے چل کر ۷ بجے تھانہ بھون کے اڈہ پر پہنچے اور ۷:۳۵ پر پیروں میں حاضری ہوئی اور وہاں سے ۹:۱۵ پر چل کر ۲۰ منٹ شاملی میں ایک جانب سے دوسری جانب تک پہنچنے میں لگ گئے، ۱۰:۲۰ پر جھنجھانہ پہنچے، ۱۰:۳۰ پر اُٹھ کر ۱۵ منٹ مصافحوں میں لگے اور ۱۲:۳۰ پر کاندھلہ پہنچے۔

چونکہ سب کا وضو تھا اس لیے جاتے ہی نماز پڑھی باقتداء مولوی انعام صاحب، نماز کے بعد زکریا تو سو گیا، بقیہ احباب نے صوفی افتخار صاحب کے مکان پر جا کر کھانا کھایا، ۳ بجے اُٹھ کر پیشاب وضو کے بعد اول مردوں کو بیعت کرایا، پھر زنانہ میں جا کر عورتوں کو بیعت کرایا، ۴:۲۰ پر وہاں سے چل کر عزیزم الحاج قاضی ابرار کے باغ میں باقتداء مولوی انعام عصر پڑھی، زکریا نے لسی پی اور رفقاء نے طویل ناشتہ کیا جس میں چھ (۶) سات (۷) قسم کے پھل، چائے، کوکا کولا بھی تھا، کسی نے پیا کسی نے نہ پیا، عزیز ابرار سے یہ شرط ہوگئی تھی کہ چائے کے سوا کچھ نہ ہوگا مگر اُس نے وعدہ خلافی کی جس کی وجہ سے حجاز سے واپسی پر جب اُس نے مکرر اپنے باغ میں جانے کا اصرار کیا تو زکریا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تو نے چونکہ پہلے وعدہ خلافی کی تھی اس لیے اب نہیں جاؤں گا۔

کاندھلہ سے چل کر ۷ میل پر بابو جی کی گاڑی خراب ہوگئی اس لیے وہ حافظ عبدالعزیز کی گاڑی میں جو ساتھ تھی بڑوت جا کر سامان لائے اور حاجی عبدالعلیم صاحب مُرادآبادی نے جن کی کار ساتھ تھی زکریا اور انعام کو مع رفقاء باصرار بٹھا کر روانہ کر دیا اور خود مع رفقاء بابو جی کی کار میں منتقل ہو گئے، حاجی صاحب نے اپنے ڈرائیور کو حکم دے دیا تھا کہ تیز نہ چلانا، اس نے ان کے تعمیل حکم میں اتنا آہستہ چلایا کہ پونے ۹ بجے دہلی نظام الدین پہنچے، اس سفر میں کاروں کا بڑا جمگھٹا ہو گیا، اس لیے حافظ عبدالعزیز صاحب کی ایک کار علی گڑھ اور ایک کار مرادآباد والوں کی حاجی صاحب کی کار کے علاوہ اور بھائی کرامت کی گاڑی مستورات کے لیے چھوڑ دی تھی جو صبح کو فجر کے بعد سہارنپور سے روانہ ہو کر ۹:۳۰ بجے دہلی پہنچی، منگل کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر مہندیوں میں حاضری ہوئی، ۷ بجے وہاں سے اُٹھ کر خواجہ باقی اللہ کے مزار پر گئے اور دوسرے دن قطب صاحب حاضری ہوئی اور وہاں سے واپسی پر عزیز گرامی قدر مولانا الحاج اسعد صاحب مع اپنے رفقاء کے الوداع کے لیے آئے کہ رات کو اُن کو طویل سفر پر جانا تھا، میں سہارنپوری اعزہ کو شدت سے منع کر آیا تھا کہ دہلی کوئی نہ آئے، مگر ان سے نہ رہا گیا، عزیزان

عاقل سلمان و دیگر احباب یکے بعد دیگرے پہنچتے رہے۔

۲۳ ربیع الاول شنبہ کی صبح کو مولانا محمد عمر صاحب، عزیز ابوالحسن صاحب شاہد وغیرہ رفقاء تو سامان لے کر نماز سے پہلے مطار پر چلے گئے وہیں نماز فجر پڑھی، صبح کی نماز کے بعد بھائی کرامت کی گاڑی میں یہ ناکارہ مولانا انعام صاحب، علی میاں، عزیز ہارون میاں اور عزیز زبیر مطار پر گئے، چونکہ بمبئی تک جانے والوں میں الحاج ابوالحسن، الحاج نصیر الدین علی گڑھی، بھائی کرامت، مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری بھی تھے اس لیے سامان کے کرایہ میں کچھ دینا نہیں پڑا بلکہ بہت گنجائش باقی رہی۔

یہ نابکار اپنی نااہلیت کی وجہ سے نہ تو تقریر کے قابل نہ وعظ کے، نہ جہری دُعاء کے، نہ اجتماعات میں شرکت کے، اب تک کا اس ناکارہ کا سفر ہمیشہ مولانا یوسف علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن صاحب اور علی میاں کے ساتھ ہوتا رہا، اس لیے یہ ضروریات وہ حضرات پوری کرتے رہے، اس مرتبہ ان اکابر میں سے کوئی بھی ساتھ نہیں تھا اس لیے اس ناکارہ نے مولوی انعام صاحب اور مولانا محمد عمر صاحب کی خدمت میں ۲۰، ۲۵ دن پہلے سے یہ اطلاع کر دی تھی کہ مولانا محمد عمر صاحب ان ایام کو خالی رکھیں اور اس سیہ کار کو جہاز تک پہنچا کر آئیں، ان دونوں بزرگوں نے میری درخواست کو قبول فرما کر مولانا محمد عمر صاحب کے ایام خالی کر رکھے تھے، اس لیے وہ بھی میرے ساتھ بمبئی تک تشریف لے گئے، عزیز مولوی ارشد سلمہ سے حجاز سے واپسی پر بمبئی میں ملاقات ہوئی کہ وہ حج سے واپس آرہے تھے، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا عمران خان صاحب بھوپالی بھی میری وجہ سے بمبئی تشریف لے گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان سب دوستوں کو ان کی محبت کا بہترین بدلہ عطاء فرمائے، چونکہ اس سال بچیوں کا حج بھی طے تھا، عزیزان عاقل سلمان مع اپنے اہل وعیال کے حج کو جانے والے تھے، اس لیے بمبئی کے دوران قیام میں چیئر مین صاحب اور دیگر عمال حج سے جو ملنے آتے رہتے تھے زکریا گفتگو کرتا رہتا تھا، مگر سب اطمینان دلاتے رہتے تھے کہ بے فکر رہیں سب کام ہو جاوے گا، اس سفر کی تفصیلات تو بہت مفصل میری ڈائری میں موجود ہیں، مختصر یہ کہ منگل ۲۶ ربیع الاول ۹۳ھ یکم مئی ۷۳ء کو ۳:۳۰ بجے بعد ظہر رفقاء سامان وغیرہ لے کر مطار پہنچے، ۴:۳۰ پر عصر کی نماز پڑھ کر زکریا وغیرہ بھائی عبدالکریم کی گاڑی میں مطار پر گئے، وہاں پہنچ کر مولانا محمد عمر صاحب کو بُلایا اور انہوں ۶ بجے تک لمبی چوڑی دعاء کرائی، مجمع **لا تعد و لا تحصیٰ** تھا، زکریا تو اپنی کار میں مجمع سے الگ بیٹھ گیا اور عین جہاز کے وقت پر اندر چلا گیا، بقیہ رفقاء کسٹم سے گزر کر گئے، ساتھ جانے والوں میں عزیز شاہد، مولوی حبیب اللہ چمپارنی، مولوی محمد علی مینار سورتی، مولوی

ابراہیم میاں افریقی تھے، بمبئی سے روانگی کے وقت تو غروب بہت قریب تھا مگر جوں جوں جہاز اُوپر کو چڑھتا رہا غروب مؤخر ہوتا رہا، مغرب سے پہلے جہاز والوں نے کھانے سے بھی نمٹا دیا، ہندی ۹ بجے جہاز ہی میں مغرب کی نماز جماعت سے پڑھی، زکریا کا اصرار تھا کہ دو (۲) بجے، دو (۲) آدمی الگ الگ جماعت کر لیں، مگر شاہد نے نا مانا اور کہا کہ جگہ وسیع ہے ایک ہی جماعت ہو جائے گی، زکریا نے کہا کہ جہاز کے عملہ کو دِقت ہوگی کہ وہ چل پھر رہے ہیں، مگر شاہد نے کہا کہ کوئی دِقت نہیں، چنانچہ ایک ہی جماعت ہوئی۔

۹ بج کر ۲۰ منٹ پر طیارہ دُبئی اُترا، زکریا کو تو خیال نہیں تھا، مگر مولانا محمد عمر صاحب نے بمبئی میں حبیب اللہ سے کہہ دیا تھا کہ شاید دبئی میں کوئی ملنے آجائے، مولوی حبیب اللہ پیچھے کی سیڑھی تلاش کر رہے تھے کہ ایک نوجوان نے آگے کے زینے سے آکر پیچھے کی جانب سے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا کہ نیچے چلیے، میں نے کہا کہ بھائی میں تو اُترنے سے معذور ہوں، اس نے کہا کہ نہیں آپ کو چلنا ہوگا، بہت بڑا مجمع آپ کے انتظار میں ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ میں بالکل بے قابو ہو گیا ہوں تو ساتھیوں کو آواز دی، وہ میری کرسی لائے اور مجھے اس میں بٹھا کر سیڑھی سے نیچے اُتارا، جہاز سے اُترتے وقت کپتان نے بڑے زور سے کہا "خمس دقائق خمس دقائق" اس نوجوان نے کہا کہ ایسی کی تیسی اس کی بھی اور اس کے خمس دقائق کی بھی، اتنے آپ واپس نہیں آتے، جہاز چھوٹ نہیں سکتا، واپسی پر معلوم ہوا کہ اصل وقت میں بھی دو تین منٹ باقی ہیں اور اس نے مطار کی کرسی پر بٹھا کر اس زور سے بھگایا کہ مجھے گرنے کا خوف ہوتا رہا، مگر اس ناکارہ نے جدہ، کراچی، لاہور، دہلی، بمبئی کے مطار دیکھے اس قدر صاف سڑک کہیں کی نہیں دیکھی، نہ کہیں اُونچ نیچ نہ کہیں روڑا تھا، چار پانچ سڑکوں کو عبور کر کے ایک بہت بڑے کمرے میں لے گیا، جس کے قریب ایک بہت ہی ضعیف، نحیف، خفیف الجثہ ایک بڑے میاں کھڑے تھے، اس نوجوان نے وہاں گاڑی روکی اور کہا کہ یہ ہمارے تبلیغی امیر ہیں، ان سے مصافحہ کیجئے، بہت ہی شفقت سے ملے اور کمرے کے اندر میرے ساتھ گئے، وہاں پہنچ کر انہوں نے بہت دھیمی آواز سے کہا کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ اُٹھے نہ مصافحہ ہوگا نہ کچھ اور صرف بیعت ہوگی اور دُعاء، میری جتنی حیرت دبئی کی سڑکوں سے ہوئی تھی، اس سے زیادہ حیرت اس منظر سے ہوئی کہ ان بڑے میاں کی آواز پر کسی شخص نے جنبش نہ کی۔

چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا دور بھی دیکھا، مولانا یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی دیکھا اور اب مولانا انعام صاحب سلمہ کا دور دیکھ رہا ہوں، ہر جگہ پر، ہر موقع پر ان حضرات کو انتہائی زور شور لگانے پڑتے ہیں پھر بھی کسی جگہ آج تک مجمع قابو میں نہیں آیا، معلوم نہیں ان بڑے میاں کی زبان میں کیا

تاثیر تھی کہ کسی نے حرکت تک نہ کی، اس ناکارہ نے مجمع کو بیعت کیا اور پھر مختصر دعاء کرائی اور بغیر مصافحہ کے وہاں سے آکر طیارہ پر پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ ہی کا انعام تھا کہ اتنے مراحل گزرے مگر آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

واپسی پر جناب الحاج میر آلِ علی صاحب کے برادر زادہ میر قمر الحسن نے دوسو (۲۰۰) ریال دیئے، زکریا نے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جانا مشکلات کا سبب ہوتا ہے میں کبھی نہیں لے جاتا، مگر مولوی ابراہیم افریقی صاحب نے یہ کہہ کر کہ ہم افریقہ والے ان قواعد سے بالاتر ہیں ان سے لیے اور مکہ میں دے دیے، اللہ تعالیٰ معطی اور وسائط کو جزاء خیر دے، واپسی پر اس نوجوان نے اپنا تعارف کرایا کہ الطاف حسین نام ہے، لاہور کا رہنے والا ہوں، یہاں ہسپتال میں ملازم ہوں، میں نے پندرہ (۱۵) دن ہوئے تجھے خواب میں دیکھا تھا اور خواب ہی میں تجھ سے بیعت ہوا تھا اس لیے تیری صورت دیکھتے ہی پہچان لیا آمدورفت میں آٹھ دس سپاہی بندوقیں لٹکائے ہوئے ملے مگر کسی نے نہ ٹوکا نہ پوچھا کہ کون ہے، جب وہ مجھے طیارہ پر سوار کرا کر واپس ہوا تو بعد میں لوگوں نے روایت نقل کی کہ اس کو چار پانچ جگہ سپاہیوں نے ٹوکا اور وہ یہ کہتا ہوا ہر جگہ جواب دیتا ہوا گزر گیا کہ اب جتنا چاہو سوال جواب کرلو، میرے ساتھ وہ زور نہیں جس نے تمہاری زبان بند کر رکھی تھی، وہاں سے چل کر ظہران انگریزی ۴۵: ۱۱ پر پہنچے، ظہران میں کسٹم ہوا رفقاء کسٹم میں گئے مگر عزیز اختر علی سہارنپوری کی برکت سے کہ وہ دن میں پہنچ گیا تھا کسٹم کا افسر میرے پاسپورٹ وغیرہ کاغذات طیارہ پر ہی دیکھ گیا، ۱۲ بجے ظہران سے روانہ ہوئے، ۵۰: ۱ پر جدہ کے مطار پر پہنچے، وہاں سے عزیز سعدی اور بھائی اشفاق مطار کی گاڑی میں بٹھا کر باہر لائے، وہاں بہت بڑا مجمع تھا، مامون یامین، شمیم مع ابناء، قاری سلیمان وغیرہ بڑا مجمع تھا اور بہت نفیس بڑی ساری کار کسی کی لے گئے تھے جس میں میں اور میرا کموڈ اور میرے رفقا بھی جو کسٹم سے دیر میں پہنچے سعدی کے گھر آئے۔

میں نے تو بہت اصرار کیا تھا کہ میرا کوئی سامان بلٹی نہ ہوگا سب ساتھ جائے گا، محصول جتنا بھی ہو، مگر بمبئی میں حاجی یعقوب اور عزیز ابوالحسن کے مشورہ سے یہ طے پا گیا کہ دو اٹیچیاں ایک دن پہلے بلٹی کر دیجائیں، آدھا محصول لگے گا۔ ساتھ کا سامان تو ہمارے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ بعد پہنچ گیا مگر ان دونوں اٹیچیوں نے بہت دق کیا۔ اس وقت تو کہہ دیا کہ مدیر صاحب نہیں ہیں کل صبح کو پانچ بجے ملیں گے۔ ان دونوں کی کنجیاں جدہ کے احباب کو دے کر آ گئے۔ اگلے دن بھی وہ نہ نکل سکیں تیسرے دن بھائی اقبال خلجی اور کئی احباب نے کئی گھنٹے صرف کیے اور ان لوگوں نے بھی بہت بری طرح سے ایک ایک کپڑے کو نکال کر دیکھا، ایک ایک رسالہ پر جرح کی۔ میری عطر کی شیشیاں

اور کئی ڈبے بھی گم ہو گئے، ایک مخملی عطر دان بہت خوب صورت بھی کسی کو پسند آ گیا۔ یہ مصیبت ہر سال کی ہے کہ کسٹم والوں کو اشکال ہوتا ہے کہ کیا یہ عطر کی تجارت کرتا ہے اور ہر سفر میں ۵، ۷ شیشیاں تو لے ہی لیتے ہیں۔ اس سال چونکہ ہم میں سے کوئی ساتھ نہ تھا اس لیے جو پسند آیا لیا۔ میرے ساتھ تاریخ کبیر بھی تھی بہت گھورتے رہے کہ یہ کیرم کا نٹے کیا ہیں۔

عزیز سعدی کے گھر سے پیشاب وضو کر کے طواف کے لیے گئے، طواف کے بعد عشاء کی نماز وہیں جماعت سے پڑھی اور سعدی کے گھر آ گئے۔ سعدی نے کہا کچھ کھاؤ گے؟ زکریا نے کہا ضرور۔ اس لیے کہ ایک عشرہ سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ اس کا واہمہ بھی نہیں تھا کہ میں کچھ کھاؤں گا۔ تاہم کوفتے اور بازار کی روٹی رفقاء نے کھائی اور زکریا نے کوفتے اور کچھ پھل وغیرہ کھائے۔ دہلی میں بڑے لذیذ کھانے دعوتوں میں آتے رہے مگر ذرا طبیعت نہیں چلی، صبح کی نماز کے دو گھنٹے بعد سلیم بھی سعدی کے گھر پہنچ گئے۔ جس پر زکریا کو بہت ہی گرانی ہوئی۔ ان کو الوداع کر کے عبدالحفیظ کی گاڑی میں اول مسعیٰ پر جا کر سعی کی پھر صولتیہ پہنچے۔ حسب سابق صبح کا کھانا تو رفقاء نے اپنا کھایا اور زکریا نے شرکت نہیں کی۔ عشاء کے بعد کھانے میں بہت بڑا مجمع ہوتا۔

دیوان میں زکریا، شاہد، عبدالحفیظ، حبیب اللہ اور مولوی اسماعیل جو کہ پہلے سے مکہ میں موجود تھے دیوان میں ٹھہرے اور بقیہ رفقاء مولانا انعام صاحب والے دیوان میں قیام پذیر ہوئے، طواف کے بعد عزیز سعدی کے یہاں گرمی کی وجہ سے آنا ہوا تھا اور صبح کو ناشتہ کے بعد صولتیہ، ۲ مئی کی شام کو بھائی سلیم نے بہت پُر تکلف دعوت سلیق کی جس میں علماء مکہ اور عمائدین کو بھی مدعو کیا تھا، ۳ مئی کی شام کو مسجد حفائر کا ہفتہ واری اجتماع تھا، زکریا بھی عصر کے بعد پہنچ گیا، اُس وقت تک تبلیغی اجتماع میں مکہ کا ہو یا مدینہ کا زکریا کی طبیعت اتنی خراب نہ تھی اس لیے اہتمام سے شرکت کرتا تھا، اجتماع سے فارغ ہو کر سعدی کے یہاں رفقاء کی وجہ سے کھانا کھایا پھر وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر حرم میں آیا، میں کار سے اُتر رہا تھا تو کسی نے کہا کہ قاضی صاحب بھی کار سے اُتر رہے ہیں، جناب الحاج قاضی عبدالقادر صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر مرحمت فرمائے کہ یوسف مرحوم کے بعد سے جب بھی میری حجاز حاضری ہوتی ہے قاضی صاحب اس سے ایک دو دن پہلے ہی پہنچ جاتے ہیں اور میرے قیام تک تشریف فرما رہتے ہیں، چاہے کتنا ہی طویل ہو جائے، ہر چند کہ قاضی صاحب سے مجھے رُوحانی اور مادی دونوں طرح کی بہت ہی راحت ہے، روحانی برکات تو قابل ذکر نہیں اور نہ پسند کریں گے کہ کیا کیا وہ مجھ پر شفقتیں فرماتے ہیں، مبشرات ملاحظہ فرماتے ہیں مگر مادری اعانتیں بھی لا تعد و لا تحصٰی ہیں۔

عزیز مولوی نصیر الدین نے میری شکایت ایک مرتبہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے کی تھی شاید کہیں

تفصیل گزر چکی ہو کہ زکریا کو نہ تو آمد سے تعلق کہ کہاں سے آوے، کیا آوے، نہ انتظام سے تعلق، دستر خوان پر بیٹھ کر جو آس پاس ہوں ان کو دعوت دے دینا اور ویسے بھی جو ملنے والا کوئی خصوصی آئے چاہے وہ مدرسہ میں آئے چاہے محلہ میں کہیں، اس کو یہ کہہ دینا کہ کھانا میرے ساتھ کھانا اور مجھے خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہی بری عادت اس ناکارہ کی ہمیشہ سے حجاز میں بھی ہے، فرق اتنا ہے کہ سہارنپور میں تو میرا دستر خوان دن میں ہوتا ہے اور حجاز میں عشاء کے بعد، قاضی جی کو اللہ تعالیٰ دونوں جہان میں بہترین جزائے خیر عطاء فرمائے، درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے کہ وہ عشاء کے بعد دستر خوان کے وقت معلوم کیا کرتے ہیں کہ کتنے آدمی زائد ہیں اور جتنی ضرورت ہو فوراً آدمی بازار دوڑا کر روٹیاں منگواتے ہیں، اتنے پہلا کھانا ختم نہیں ہوتا کہ جدید روٹیاں آجاتی ہیں، سالن تو افراط سے ہوتا ہی ہے، مجھے قاضی صاحب کا یہ طویل قیام اور غیب عن الباکستان بہت گراں ہے، اس لیے کہ پاکستان کے تبلیغی مراحل کے مشیرِ اعلیٰ، روحِ رواں، وہاں کی مجلسِ شوریٰ کے سربراہ قاضی صاحب ہی ہیں، میں ہر چند قاضی صاحب سے بواسطہ، بلاواسطہ بار بار درخواست کرتا رہتا ہوں کہ آپ کے طویل قیام سے پاکستان کے تبلیغی کام کا بہت حرج ہو رہا ہے، یہ سیہ کار نابکار بجائے اس کے کہ تبلیغی کاموں میں خود شرکت کرے میری وجہ سے قاضی صاحب جیسے اہم آدمی سے بھی پاکستان کی تبلیغ محروم ہے، اس کا مجھ پر واقعی بہت بار رہا، مگر قاضی صاحب کی محبت اس تذکرہ کو سننا بھی گوارا نہیں کرتی بلکہ میرے بار بار کے اصرار پر ان کو گرانی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی قاضی صاحب کو درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے اور قاضی صاحب کی غیبت سے پاکستان کے قیام میں کوئی نقص پیدا نہ ہو۔

اس مرتبہ سفر چونکہ سخت گرمی کے زمانہ میں ہوا تھا، سہارنپور میں بھی خوب گرمی تھی اور مکہ میں بھی، اس لیے میری طبیعت پر بہت اثر ہوا، تیمارداروں کے علاوہ ڈاکٹر وحید الزماں صاحب حیدرآبادی جو حجاز کے میرے اصل معالج ہیں انہوں نے کئی ڈاکٹروں کے ساتھ دو دن تک ملاحظہ کرنے کے بعد یہ بتایا کہ تعب کا اثر اعصاب پر ہو گیا، ڈاکٹر صاحب مسجد حفائر کے اجتماع میں شریک تھے، وہاں سے واپسی پر سعدی کے مکان پر بہت غور سے دیکھا اور کہا کہ اس وقت تو ایک انجکشن بہت ضروری ہے اور بہت اصرار سے ایک انجکشن اسی وقت لگایا اور کہا کہ بغیر اس کے مرض کے طویل ہو جانے کا اندیشہ ہے اور دوسرا دوسرے دن، تفاصیل تو میری ڈائری میں بہت کچھ ہیں خدا کرے شاہد کے حوالہ نہ ہوں وہ اس الف لیلہ کو بھی چھاپ دے گا۔

مدینہ پاک جانے کا تقاضا تو مکہ مکرمہ پہنچنے کے دوسرے ہی دن سے شروع ہو گیا مگر مرض کا جس شدت سے حملہ ہو رہا تھا تو کہ بھوک بالکل بند، اس لیے نہ تو تیمارداروں میں سے کسی کی رائے

ہوئی اور نہ ڈاکٹروں میں سے اور سب سے بڑھ کر قاضی صاحب جن کا احترام میں ان کے احسانات کی وجہ سے بہت ہی زیادہ کرتا ہوں اور حتی الوسع ان کی رائے کو مانتا ہوں، احباب کو بہت زیادہ اصرار تھا اور سید حبیب صاحب ہمیشہ مجھ پر اصرار کرتے ہیں کہ بجائے کار کے مکہ سے آمد ورفت ہوائی جہاز سے رکھ، سید صاحب نے یہ بھی کئی دفعہ فرمایا کہ تیرے اور تیرے ساتھیوں کے جتنے ٹکٹ ہوں میں منگادوں، مگر مجھے اس میں بڑی مشقت معلوم ہوئی کہ طیارہ اگرچہ مدینہ سے جدہ تک ۲۳ منٹ میں پہنچتا ہے مگر یہاں کے مطار پر ایک گھنٹہ پہلے جانا پڑتا ہے ورنہ باوجود ٹکٹ اور سیٹ ہونے کے سب فسخ ہو جاتا ہے اس کا تجربہ عزیز مولوی اسعد مدنی کو مجھ سے بہت زیادہ ہے اور پھر جدہ سے مکہ ان کے واسطے کاروں کے انتظام سے ہمیشہ مجھے یہ اہون معلوم ہوا کہ اپنے قبضہ کی سواری میں صولتیہ سے چل کر مدرسہ شرعیہ پہنچ جاؤں یا اس کا اُلٹا، اس لیے کہ میں نے ہمیشہ موٹر ہی کو ترجیح دی اور پھر جب کہ وہ اختیاری بھی ہو۔

۱۹ مئی ۷۳ء کو شنبہ کے دن عصر کے بعد عزیز عبدالحفیظ کی ہیجو میں ۱۱ بجے چلے، میری گاڑی میں قاضی صاحب، شاہد، حبیب اللہ، عبدالقدیر اور حسان تھے اور الحاج یونس کی گاڑی میں مولوی سعید خان وغیرہ ودیگر رفقاء، ملک عبدالغنی کی گاڑی میں وہ خود اور بقیہ رفقاء اور عبدالوحید کی گاڑی میں محمد علی بمبئی وغیرہ تھے، مفرق پر جا کر مغرب پڑھی، اسی جگہ عبدالوحید کی گاڑی بھی پہنچ گئی ۱۲:۳۰ پر مفرق سے چلے، قرار یہ پایا تھا کہ کھانا بدر میں کھائیں گے، مگر زکریا نے شاہد، حبیب اللہ وغیرہ اپنے نئے رفقاء سے مستورہ کی مچھلی کا وعدہ کر رکھا تھا، مستورہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ حکومت نے دو سڑکیں کر دیں، ایک مستورہ کے اندر کو جہاں بازار وغیرہ ہے اور دوسری باہر کو جہاں کچھ نہیں ملتا، مگر عزیز عبدالحفیظ نے واقعی یا شاہد کی خاطر یوں کہا کہ مجھے تیل ڈلوانا ہے اس لیے اندر کو جانا ہے، مستورہ پہنچ کر قاضی صاحب نے شدت سے انکار کیا کہ مچھلی اُچھلی کچھ نہیں لینا ہے جلدی سے تیل ڈلوالو، عزیز عبدالحفیظ اپنی گاڑی کو تیل کے پمپ پر کھڑی کر کے دکان سے تین مچھلیاں گرم گرم تلوا لایا، زکریا نے کہا کہ مجھے تو کھانا نہیں تم لوگ دکان پر ہی کھڑے ہو جاؤ، شط وغیرہ جو کچھ لینی ہو لے لیجو، قاضی جی اول تو کار ہی میں بیٹھے رہے، مگر زکریا کی درخواست پر شریک ہو گئے اتنے میں مولانا سعید خان صاحب آئے، کہنے لگے یہ کیا ہو رہا ہے؟ معاہدہ تو بدر کا تھا، ہم نے کہا کہ وہ تو برقرار ہے، گاڑی میں تیل ڈلوانا ہے اور بچوں کو تفریح کرنی ہے، قاضی صاحب اول تو بہت متشدد، مخالفت میں تھے مگر پھر بچوں کے امام بن گئے۔

بدر پہنچ کر بھی زکریا نے کھانے سے انکار کر دیا، رفقاء نے کھانا کھایا اور زکریا نے وضو کر کے چند رکعت اہل بدر کو ایصال ثواب کے لیے پڑھیں، زکریا کا بستر قہوے کی دو کرسیوں کو ملا کر بنایا گیا تھا

جو بڑی وسیع مسہری بن گئی تھی، صبح کی نماز پڑھ کر صبح کا وقت ۹:۳۰ کے قریب ہوجاتا تھا رفقاء نے مختصر چائے پی، زکریا نے پیشاب کے ڈر کے مارے نہیں پی، ۱۰:۳۰ پر شہداء حاضری ہوئی، ۱۱ بجے واپسی ہوئی، سیدھے مدرسہ شرعیہ ۱۲:۳۰ بجے پہنچ گئے جہاں صبح سے صوفی اقبال، مولوی انعام کریم صاحب، الحاج عدنان ناظم مدرسہ انتظار کررہے تھے، مولانا سعید خان صاحب کا اصرار تھا کہ اول سب کاریں مسجد نور جائیں مگر زکریا نے طول امل ہونے کی وجہ سے انکار کردیا اس پر قاضی صاحب نے یہ طے کیا کہ زکریا کی گاڑی صرف مدرسہ شرعیہ جائے گی، بقیہ سب مسجدِ نور، مگر زکریا کی گاڑی کے پیچھے پیچھے مدرسہ آگئیں۔

صوفی اقبال نے دوطرح کا قہوہ تیار کر رکھا تھا، سب نے پیا اور غسل کرکے سب روضۂ اقدس پر حاضر ہوگئے اور زکریا تکان کی وجہ سے لیٹ گیا، ۴:۳۰ بجے حاضر ہوا اور چونکہ گزشتہ سفرِ مدینہ میں ٹانگ کے ٹوٹنے کی وجہ سے اب اقدام عالیہ سے محروم ہوگیا، اس لیے مشرق دیوار کے برابر بابِ جبرائیل سے ملحق جو چبوترہ ہے اس کو مستقر بنایا، یہاں کا نظام یہ رہا کہ ۴:۳۰ پر ظہر کے لیے حاضری، تقریباً ۵:۳۰ پر ظہر کی نماز، اس کے دس منٹ بعد مدرسہ واپسی، اس کے بعد جملہ رفقاء صوفی اقبال کے گھر کھانا کھانے جاتے تھے اور ڈاکٹر اسماعیل اور صوفی اقبال میرے پاس رہتے تھے، ان کھانے والوں کی آمد کے بعد یہ دونوں گھر چلے جاتے تھے، ۸:۳۰ پر عصر کے لیے روانگی اور پونے دس بجے پر واپسی، اس کے بعد مجلس عامہ مدرسہ شرعیہ کے صحن میں اور ۱۱:۳۰ پر مغرب کے لیے حرم کی روانگی، بعد عشاء ۲:۳۰ پر واپسی، اس کے بعد دسترخوان عامہ۔

مولوی سعید خان صاحب کا اصرار تھا کہ رات کا کھانا مسجد نور ہوا کرے، مگر چوں کہ بہت سے احباب اپنا اپنا کھانا لے کر آتے تھے تو ان سب کو مسجدِ نور جانے میں دِقت ہوتی اس لیے بمشورہ قاضی صاحب یہ قرار پایا کہ کھانا تو مدرسہ شرعیہ ہی میں ہو کہ بہت سے رفقاء کو سہولت رہے گی، چونکہ گرمی بہت شدید تھی اور مسجدِ نور میں بہت ہوادار جگہ، صبح کو ناشتے کے بعد ایک بجے مسجدِ نور سے واپسی طے تھی، مگر اس پر عمل نہ ہوا کہ ناشتہ بہت لمبا ہوتا تھا، صبح کی نماز کے بعد مجلسِ ذکر ہوتی پھر تھوڑی دیر لیٹتے، پھر رفقاء ناشتہ کرتے، قرار یہ تھا کہ واپسی میں بقیع قیام ہو مگر دھوپ اتنی شدید ہوجاتی کہ اس کا تحمل دشوار ہوتا، حتیٰ کہ اس کی وجہ سے شدت سے بخار کا سلسلہ شروع ہوا، البتہ منگل کی شب میں چونکہ مسجد نور کا اجتماع ہوتا تھا اس لیے مغرب پڑھتے ہی وہاں روانگی ہوجاتی تھی اور عشاء بھی وہیں ہوتی تھی۔

اس ناکارہ کی کفالت، ٹکٹ کا بھیجنا وغیرہ امور مستقلاً عزیز الحاج محمد سعید رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ رہتا تھا اور میرے آنے کے بعد ویزے میں توسیع کی ہمیشہ کوشش شروع کردیتا تھا، چنانچہ اس

مرتبہ بھی عزیز موصوف نے آنے کے بعد سے ہی کوششیں شروع کردی اور شیخ محمد صالح قزاز امین عام رابطہ کے زریعہ سے سلسلہ جنبانی شروع کی، شیخ صاحب کو بھی اس کا بہت اہتمام تھا، وہ بھی عزیز سعدی پر بار بار تقاضا کرتے رہتے تھے کہ درخواست جلد بھیجنی چاہیے کہ دفتروں میں بہت دیر لگ جاتی ہے، عزیز سعدی کا خیال تھا کہ مولانا عبداللہ عباس صاحب کہیں سفر پر گئے ہیں اُن کی واپسی پر رکھا جائے، مگر شیخ صالح کا خیال تھا کہ اس میں تاخیر کا احتمال ہے وقت کے اندر توسیع ہونی چاہیے، اس نابکار وسیہ کار پر مالک کے لا تعد و لا تحصی احسانات میں سے یہ بھی ہے کہ حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ کے وصال کے بعد سے سلسلہ کے اکابر علماء کی حد سے زیادہ خصوصی توجہات رہیں۔

مولانا یوسف بنوری ناظم مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی سے پاکستان کے سفر میں اور حجاز میں متعدد دفعہ ملاقاتیں ہوچکی تھیں اور ہر بار ملاقات میں ان کی شفقتیں پہلے سے زیادہ بڑھتی رہتی تھیں، ان پر اللہ جل شانہ کے احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ اُن کے لیے حجاز آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی، اخیر عشرہ رمضان کا مدینہ منورہ کا اور حج کا سفر تو مستقل مولانا کے لیے سبب آمد ہے اور درمیان سال میں بھی جب جی چاہتا ہے تشریف لاسکتے ہیں۔

مولانا افریقہ کے اجتماع کے بعد یورپ کا دورہ کرکے ۳۰ مئی کو بذریعہ طیارہ جدہ اور اسی وقت مدینہ منورہ بذریعہ کار پہنچے اور فرمایا کہ میں نے سفر ہی میں یہ نیت کرلی تھی کہ واپسی میں سب سے پہلے روضۂ اقدس کی زیارت کروں گا، اس کے بعد تم سے ملوں گا، پھر کسی اور سے ملوں گا، مولانا کا کئی دن قیام رہا اور مولانا کی وجہ سے مکی علماء کثرت سے مولانا سے ملنے آتے رہتے تھے اور چونکہ مولانا عصر کے بعد مستقل طور پر میرے پاس تشریف لاتے تھے اس لیے عصر کے بعد جو مجمع آتا وہ سید ھا مدرسہ شرعیہ آتا، دو تین دن بعد عصر کے بعد کی مجلس میں مکی علماء کے ساتھ استاذ الحرم الشیخ محمد علوی المالکی بھی تشریف لائے، ان علماء میں سے کسی نے مجھ سے پوچھا کہ کب تک قیام ہے میں نے کہہ دیا کہ تین ماہ کا ویزا ہے، الشیخ الاستاذ محمد علوی نے کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا، آپ تین مہینے میں ہرگز نہیں جاسکتے۔

اس کے والد شیخ علوی اکابر علماء میں تھے اور ''اوجز المسالک'' کی وجہ سے اس نا کارہ سے کئی سال سے غائبانہ واقف، حجاج کی معرفت مرحوم کے پیام سلام بھی پہنچا کرتے تھے ان کا یہ مقولہ بھی کئی دفعہ پہنچا کہ اگر شیخ زکریا مقدمہ میں اپنے آپ کو حنفی نہ لکھتے تو میں کسی کے کہنے سے بھی اُن کو حنفی نہ مانتا، میں اُن کو مالکی بتاتا اس لیے کہ ''اوجز المسالک'' میں مالکیہ کی جزئیات اتنی کثرت سے ہیں کہ ہمیں اپنی کتابوں میں تلاش میں دیر لگتی ہے اور اس میں سہولت سے مل جاتی ہیں۔

میری ۸۳ھ والی آمد پر مرحوم نے اپنے صاحبزادے محمد علوی کو بہت اہتمام سے بار بار میرے پاس بھیجا، اُس وقت استاذ محمد علوی کو بہت خصوصی تعلق پیدا ہوگیا اور والد مرحوم کے بعد اُن کی جگہ استاد الحرم المکی بنائے گئے، اس کے بعد سے جب بھی اس ناکارہ کی حجاز آمد ہوتی ہے اور حرم مکہ میں میری آمد کی خبر اُن کو ہو جاتی ہے تو سبق کے بعد بہت اہتمام سے مع شاگردوں کے آکر ملتے ہیں۔

استاذ علوی کے اصرار پر میں نے کہہ دیا کہ عزیز سعدی کوشش کر رہا ہے آپ اس سے ملاقات کر لیں، انہوں نے کہا کہ ضرور کروں گا، مجھے چونکہ یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان دونوں کوششوں میں مزاحمت نہ ہو، اس لیے میں نے مولانا علوی سے کوشش کرنے کو قبول نہیں کیا، البتہ مکہ ایک آدمی جا رہا تھا، اس کے ذریعہ دستی خط عزیز سعدی کو لکھا جس میں مولانا علوی کی گفتگو نقل کی، عزیز موصوف نے اسی وقت ایک مستقل آدمی ایک خط میرے نام اور ایک مولانا علوی کے نام لے کر مدینہ بھیجا مجھے لکھا کہ ضرور مان لیجئے اس سے بہتر ذریعہ نہیں ملنے کا اور ایک بند خط مولانا علوی کے نام بھیجا جس کا مضمون مجھے معلوم نہیں، میں نے جواباً لکھدیا کہ وہ تو واپس جا چکے ہیں، مگر میں نے ان سے وعدہ لے لیا کہ آپ سے ملیں اس کے بعد کی کاروائی معلوم نہیں کیا ہوئی اور درخواست کس نے لکھی، کس ذریعہ سے گئی۔

مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ میں جون ۷۳ھ کی ۱۷ تاریخ مطابق ۱۶ جمادی الاولیٰ ۹۳ھ کو جب میں مغرب کو بیٹھا ہوا تھا کہ حاجی دلدار جو ملک عبدالحق صاحب کی دوکان میں ملازم ہیں وہ بھاگے ہوئے آگئے اور مجھ سے اقدام عالیہ میں ملے اور کہا کہ سعدی کا ٹیلیفون آیا ہے، آپ کو مبارکباد دی ہے، میں تو خالی الذہن تھا، ویزا یاد بھی نہیں رہا تھا، اس نے کہا کہ اقامہ بن گیا ہے، میں نے وہاں لمبی چوڑی بات نہیں کرنی چاہی (اس ناکارہ کا معمول حرمین میں مغرب سے ایک گھنٹہ پہلے جا کر عشاء بعد واپسی کا ہے) عشاء کے بعد آکر معلوم ہوا کہ حاجی دلدار نے تو سارے مدینہ میں اودھم مچادیا، اتنا عزیز سعدی نے بھی کہا کہ تمہارا اقامہ معجزہ ہی ہے، یہاں دس دس پندرہ پندرہ برس سے لوگ پڑے ہوئے ہیں مگر اب تک باوجود بڑوں بڑوں کی سفارش کے بھی نہیں بنا، عزیز موصوف نے یہ بھی کہا کہ درمیانی عملہ کو اس پر غصہ بھی ہے کہ یہ بالا بالا بادشاہ تک کیسے پہنچ گیا، اس لیے کہ اس ناکارہ کا اقامہ براہِ راست ملک فیصل مرحوم نے بغیر مجلس کے خود ہی منظور کر کے بھیج دیا، عزیز سعدی نے لکھا کہ درمیانی عملہ کو اس پر تعجب ہے کہ ہماری بغیر منظوری درخواست کیسے چلی گئی، بہرحال اس میں شیخ صالح قزاز اور شیخ محمد علوی کی مساعی جمیلہ کو دخل ہے، اللہ تعالیٰ دونوں کو جزائے خیر دے، اقامہ تو ضابطہ کی کاروائیوں کے

بعد بہت تاخیر سے ملا، اقامہ کی ابتداء ۲۳ جمادی الثانیہ ۹۳ھ کو ہوئی۔

اس ناکارہ کی تمنا و خواہش عرصہ سے رائے ونڈ اور بھوپال کے اجتماع میں شرکت کی ہمیشہ رہی اور احباب کے اصرار پر ایک دفعہ کلکتہ کا بھی وعدہ اور ارادہ رہا اور اپنے قلبی تقاضہ سے رائے بریلی کا بھی کئی سال سے تقاضا ہو رہا ہے، مگر جب بھی ارادہ کیا کوئی مانع پیش آتا رہا، اس مرتبہ اہل رائے ونڈ کا مشورہ یہ ہوا کہ میں حجاز سے واپسی پر رائے ونڈ کے اجتماع میں شرکت کر کے سہارنپور پہنچ جاؤں رمضان وہاں گذار دوں، اس سلسلہ میں پاکی احباب تو پاکی ویزے کی بہت امیدیں دلاتے رہے اور ہندوستان کی سفارتِ جدہ کے سفیر صاحب نے تو شروع ہی میں انکار کر دیا تھا کہ میرے اختیار میں نہیں، مگر چونکہ سفیر صاحب پہلی مرتبہ سفیر بن کر آئے ہیں قواعد سے واقف نہیں، اس لیے قاضی صاحب، مفتی زین العابدین صاحب مولانا اسعد صاحب کا اصرار تو یہ رہا کہ مرور کے واسطے سفارت کی اجازت کی ضرورت نہیں، مگر علی میاں جو رابطہ کی طرف سے افغانستان، ایران کے دورہ پر تجویز ہوئے تھے اور ۲۳ جون کو مکہ اور مدینہ پہنچ گئے تھے اور اتوار کو لبنان کا سفر تجویز تھا ان کی رائے زکریا کے موافق تھی کہ تجھے بغیر اجازت سفارت ہند کے جانا نہیں چاہیے اس لیے کہ ہمارے پاسپورٹ پر پاکستان کٹا ہوا ہے، مگر قاضی صاحب کا اصرار تھا کہ ہم نے کئی ملکوں کے سفر کیے ہیں جہاز کی اجازت نہیں مگر مرور میں کوئی حرج نہیں اور مولوی اسعد قاضی صاحب کے ہم زبان تھے کہ میں نے کئی ملکوں کے سفر اسی طرح کیے، پاسپورٹ پر لکھوانے کی ضرورت نہیں، مفتی زین العابدین صاحب ۱۲ اگست کو مدینہ منورہ پہنچے انہوں نے فرمایا کہ پاکستانی ویزا کے کاغذات سب مکمل کر آیا ہوں، پرسوں جہاز کے وقت تک آ نہیں سکا تھا، اب روانہ ہو گیا ہوگا، مگر پاکستان سے خطوط اور برقیات پہنچتے رہے کہ فلاں وجہ سے دیر ہوئی، مفتی صاحب، قاضی صاحب کا اصرار یہ ہوا کہ پاکستانی ویزا تو پہنچ گیا ہوگا، مکہ چل کر ہندوستانی کی کوشش کرنی چاہیے، چنانچہ ۲۳ اگست کو مفتی صاحب مع اہلیہ کے مکہ گئے اور شام کو اُن کا ٹیلیفون آیا کہ سفارتِ پاکستان نے پوچھا ہے کہ زکریا ہے کون؟ اس کو لکھو، کراچی کی سفارت سے جدہ کی سفارت کو آیا کہ زکریا کون ہے؟ جس پر قاضی صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور بھائی یوسف رنگ والوں کا پندرہ اگست کا خط ملا کہ روانہ ہو چکے، جس سے اور بھی زیادہ تعجب ہوا، سفارت ہند میں جدہ کے ایک صاحب نے یہ وعدہ کرالیا تھا کہ ایک ماہ کا حق سفر صاحب کو ہے اور پندرہ دن کا مجھے، میں پندرہ دن کی اجازت خود بھی دے دوں گا، مگر اتفاق سے ڈاکٹر ظفیر صاحب سے اُن کی ملاقات پر اور دریافت پر ان صاحب نے جنھوں نے وعدہ کیا تھا زکریا کا حال دریافت کیا، انہوں نے وہ آسمان زمین کے قلابے ملائے کہ اتنے مرید ہندوستان میں اور اتنے پاکستان میں ہیں، اس نے کہا کہ اتنے مشہور کو

میں اجازت نہیں دے سکتا، قاضی صاحب کے اصرار پر ہم لوگ ۲۵ اگست شنبہ کی شام مولوی عبد اللہ عباس کی گاڑی میں مکہ کے لیے روانہ ہو گئے، وہاں پہنچ کر ایک طرف تو سفارت ہند میں کوششیں ہوتی رہیں اور دوسری طرف پاکستانی ویزے کا انتظار رہا، بقیہ رفقاء عبدالوحید کے ساتھ ملک صاحب کی گاڑی میں مع سامان روانہ ہوئے، مغرب بدر میں پڑھی، رفقاء نے چائے پی، وہاں سے چل کر ۴ بجے شام کو عزیز سعدی کے مکان پہنچے اس کے بعد فوراً پیشاب وضو کے بعد حرم گئے، اولاً عشاء کی نماز پڑھی، پھر طواف کیے اور سعدی کے یہاں روانہ ہو گئے، مگر قاضی صاحب اور حبیب اللہ ٹھہر گئے کہ ہم سعی کر کے آئیں گے، یکشنبہ کی صبح کو ۲ بجے عربی چل کر سعی کرتے ہوئے دیوان میں پہنچے، بقیہ رفقاء جو عبدالوحید کے یہاں تھے وہ بعد میں پہنچے معلوم ہوا کہ محمد بن ملک عبدالحق نے ناشتہ میں بہت زور باندھے تھے۔ اس لیے دیر ہوگئی، زکریا نے محمد کو تنبیہ کی کہ تو نے ۱۰،۱۲ ہی چیزوں پر قناعت کی، تیرے پاس پیسے نہیں تو کسی سے قرض لے لیتا۔

چونکہ رائے ونڈ کا اجتماع قریب آ گیا تھا اس لیے زکریا نے کوشش کر کے ۹ ستمبر ۷۳ء مطابق ۱۲ شعبان ۹۳ھ کو قاضی صاحب کو اور مولوی سعید خان صاحب کو روانہ کر دیا، اس لیے کہ ۱۶ تا ۱۸ ستمبر اجتماع رائے ونڈ میں تھا اور زکریا مکہ میں عزیزان عاقل سلمان کے انتظار میں جن کا بحری جہاز سے آنا تجویز تھا، ٹھہر گیا، مکہ کے قیام کا نظام پہلے لکھ چکا ہوں کہ گرمی کی وجہ سے رات سعدی کے یہاں گزرتی تھی، عشاء کے بعد صولتیہ کے دیوان میں کھانا کھانے کے بعد جو حسب معمول چندہ کا ہوتا تھا کہ متعدد احباب اپنا اپنا کھانا لے کر آتے تھے مگر ہر ایک اپنے کھانے کے بعد ایک کھانا میرا بھی، جس کی وجہ سے بے تکلف ۲۰، ۲۵ مہمانوں تک کو دعوت دے دیتا تھا، کھانے کے بعد پیشاب وضو سے فارغ ہو کر حرم شریف طواف کے لیے جانا ہوتا اس لیے کہ میں اپنی ٹانگوں کی معذوری سے عربیہ پر کرتا تھا جس میں عزیز سعدی کا ہونا تو بہت ضرور تھا اس لیے کہ عربیہ کا اجازت نامہ اُسی کے پاس رہتا تھا، عزیز موصوف نے اس کے فوٹو تو کئی کرا رکھے تھے، لیکن اس سے مدیر حرم بھی واقف تھا اور بڑے بڑے شرطی بھی، اس لیے اوروں کو دق ہونا پڑتا، اس کو سہولت سے شرطی چھوڑ دیا کرتے تھے، ان طوافوں میں عزیزان عبدالقدیر اور حسان میں مقابلہ بھی ہوتا تھا کہ یہ دونوں میری گاڑی کو بہت چلاتے تھے، میں نے رفع نزاع کے واسطے چار چار طواف ہر ایک کے مقرر کر دیئے تھے مگر ہر ایک اپنے نمبر پر کوشش کرتا کہ اس کے پانچ ہو جائیں، میں تو دونوں کے پانچ پانچ کر دیتا، مگر ہمارے قاضی صاحب خود تو طواف دن میں بھی کر آتے مگر اُس وقت مجھ پر کنٹرول کرتے کہ سونا بھی ہے، اس لیے ۸ سے زیادہ عموماً نمبر نہیں ہوتا تھا، یہ طواف میں اپنے اکابر، اعزہ، احباب اور محسنوں کی طرف سے کرتا رہتا تھا۔

عزیزان عاقل سلمان ابوالحسن مع اپنی مستورات کے حجازی ۲۷ شعبان کے مطابق ۲۴ ستمبر دوشنبہ کو پہنچے، میں تو بھلا جدہ کہاں جاتا، ایک ڈاکٹر جو مکہ میں رہا کرتے تھے اور حجاج کی خبر گیری ان کے ذمہ تھی اتفاق سے صولتیہ عشاء کے بعد کی مجلس میں آئے اور باہر کھڑے ہوکر عزیز شمیم کو بلایا اور میرا دستر خوان بچھا ہوا تھا میں نے بجائے شمیم کے جانے کے ان سے کہہ دیا کہ یہاں پردہ نہیں ہے، یہیں تشریف لے آیئے، ان کو دیکھ کر عزیز شمیم نے بڑی تعریف کی چناں ہیں چنیں ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ بہت اچھے موقع پر آئے اور میں نے بہت اچھا کیا کہ آپ کو بُلا لیا، میری مستورات فلاں جہاز سے پرسوں ترسوں کو آرہی ہیں اُس میں آپ جو مدد کر سکتے ہوں، انہوں نے کہا یہ وہی مستورات ہیں جن کے متعلق عزیز عبدالقدیر نے مدینہ میں مجھ سے بات کی ہے؟ میں نے کہا کہ ضرور، میں جب گودی پر جاؤں تو میری کار میں بیٹھ جانا، عبدالقدیر جو صبح ہی سے جدہ گیا تھا ان کی یا کسی اور کی کار میں گودی پر پہنچ گیا، گودی والوں نے سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب کا ملازم ہے، اس نے جہاز پر چڑھ کر سامان کے لیے ایک مزدور سے بات چیت کر لی، چونکہ جہازوں کا ہجوم بہت تھا اس لیے محمدی جہاز کے کپتان نے وائرلیس سے جدہ کے کسٹم افسر سے پوچھا کہ اگر تم میرے جہاز کو جلدی لے تو میں جس طرح ہو سکے فلاں دن کو آجاؤں ورنہ اطمینان سے آؤں، عزیز سعدی، ماموں یامین وغیرہ جو بچوں کے استقبال کے لیے جدہ دوپہر سے گئے ہوئے تھے ٹیلیفون سے معلوم کر کے جہاز شام کو پہنچے گا بھائی شجاع کے گھر چلے گئے۔ ابوالحسن اور مفتی محمود صاحب سامان کی وجہ سے کسٹم میں رہے اور جہاز ۳:۳۰ بجے ہندی پہنچ گیا۔

عبدالقدیر نے جہاز پر جاکر ڈاکٹر صاحب کی مدد سے بچیوں کے پاسپورٹ کی تکمیل کرائی اور عبد الوحید کی گاڑی میں بھائی شجاع کے گھر پہنچ گیا، حاجی محمد سردار جو تبلیغی جماعت کے بڑے کارکن ہیں انہوں نے بڑے احتیاط سے سامان کو مدینۃ الحجاج میں پہنچادیا، سعدی فوراً معلم کے وکیل کے یہاں گیا اور وہاں سے کاغذات کی تکمیل کے بعد بھائی شجاع کے گھر آکر سب نے کھانا کھایا اور مستورات کو لے کر عبدالوحید کی گاڑی میں ۵ بجے رات کو گھر پہنچا جبکہ زکریا اُسی وقت طواف سے فارغ ہوکر پہنچا تھا، بھائی سلیم کا تقاضا مستورات کو بُلانے کا دوسرے ہی دن تھا، مگر سامان کی گڑ بڑی کی وجہ سے دو چار روز بعد گئیں، بھائی سلیم صاحب نے بڑی زور دار دعوت کی دو تین دن میرے عمرے کا نظام بدستور رہا۔ اس میں لڑکے میرے ساتھ رہتے مگر علی التوالی ایک عورتوں کے ساتھ رہتا، میں طواف سے فارغ ہوکر عبدالحفیظ کی گاڑی میں سعدی کے گھر پہنچ جاتا اور عورتیں بعد میں عبدالحفیظ کی دوسری گاڑی میں پہنچتیں۔

جمعرات کو مکہ میں پہلا روزہ ہوا اور دہلی میں شنبہ کا پہلا روزہ ہوا، رمضان کا نظام یہ رہا کہ بھائی سلیم کے یہاں سے کھانے سے فراغ کے بعد سیدھے تنعیم جاتے وہاں سے احرام عمرے کا باندھ کر طواف سعی سے فارغ ہو کر پھر عزیز سعدی کے یہاں جاتے، جمعہ اور شنبہ کی درمیانی شب میں سحر کے قریب ابوالحسن نے مجھے جگایا کہ میں جب ہی لیٹا تھا، ابوالحسن نے روتے ہوئے یہ خبر سنائی کہ بھائی ہارون کا انتقال ہوگیا جو جمعہ کے دن ۱۱:۳۰ بجے دوپہر کو ہوا تھا، اُسی وقت نظام الدین سے بمبئی ٹیلیفون کیا گیا تھا کہ زکریا کو اطلاع کردو۔

حاجی یعقوب صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ وہ ان کاموں میں بہت مستعد اور ہم لوگوں سے زیادہ ہمت والے ہیں، انہوں نے اس ٹیلیفون کی ایک نقل ایک پرچہ پر کرکے مطار پر بھیجی کہ جمعہ کی شام کو جہاز آرہا تھا اس میں ڈاکٹر ظفیر صاحب جو میرے بہت ہی محسن قدیم کرم فرما ہیں ان کو دیا کہ یہ بہت ہی اہم کاغذ ہے اس کو زکریا تک جلدی پہنچانا ہے، انہوں نے ۸ بجے داؤد ساعاتی کو دیا انہوں نے اولاً صولتیہ میں ٹیلیفون کیا وہاں کوئی نہ بولا تو ماموں یامین کو کیا، اُنہوں نے سعدی کے یہاں ٹیلیفون کیا کہ ڈاکٹر ظفیر بہت اہم پرچہ زکریا کے نام لائے ہیں، ابوالحسن اور سعدی نے کہ دونوں ٹیلیفون پر تھے کہا کہ یہ پڑھ کر بتادیجئے، بھائی داؤد ساعاتی نے پڑھ کر حادثہ کی اطلاع دی، زکریا نے سعدی اور ابوالحسن کو کہہ دیا کہ ابھی تو نہ بچوں کو خبر کریں نہ گھر میں، سحری ضائع ہوگی، سحری کے بعد بچوں کو خبر کردیں اور کہہ دیں کہ مستورات کو سو کر اُٹھنے سے پہلے نہ کہیں۔

سحری کے وقت عزیزان عاقل سلمان کو خبر تو نہ کی گئی مگر وہ سعدی اور ابوالحسن کے انداز سے کچھ سوچ میں پڑے رہے، کھانا کھانے کے بعد ان دونوں نے لڑکوں کو حادثہ کی اطلاع دی اور ساتھ ہی مستورات کو اطلاع کرنے سے منع کردیا، مگر معلوم نہیں کس طرح مستورات کو بھی سحری کے بعد علم ہو ہی گیا میں نے سو کر اُٹھنے کے بعد بچیوں کو بلایا اور اپنے دستور کے موافق ان سے کہا کہ تمہیں تو میرا قانون معلوم ہے، رنج وغم فطری چیز ہے مگر رونے سے نہ تو تمہیں کچھ فائدہ نہ مرحوم کو، جاؤ دن بھر بیٹھ کر مرحوم کے لیے کچھ پڑھو اور رات کو مرحوم کی طرف سے عمرے کچھ۔

ان کا دستور پہلے سے بھی عشاء کے بعد دوسری گاڑی میں تنعیم جانے کا تھا، اللہ تعالیٰ اُن کو بہت جزائے خیر دے کہ انہوں نے ہر موقع پر میری نصیحت پر بہت ہی زیادہ عمل کیا، صبح کو جب صولتیہ پہنچا تو معلوم نہیں مکہ میں یہ خبر کیسے پھیل گئی، پچاسوں افراد صولتیہ پہنچ گئے اور ہر شخص نے یہ کہنا شروع کردیا کہ بڑا صدمہ ہوا، بہت ہی رنج ہے، کب ہوا؟ کس طرح ہوا؟ میں نے ان سب سے خطاب کرکے کہا کہ رنج وقلق تو فطری چیز ہے مگر اس سے نہ تو مرحوم کو کوئی فائدہ اور نہ میری تعزیت ہوتی ہے، آپ ہی بتائیے کہ آپ نے خبر سننے کے بعد اس کو کیا بھیجا؟ میرا ان

حوادث میں فضول باتیں کرنے کو جی نہیں چاہا کرتا، آپ جائیے، ہو سکے تو اُس کی طرف سے عمرے کیجئے ورنہ کم سے کم طواف۔

سب اُٹھ کر چلے گئے اور جب عشاء کے بعد میں حسبِ معمول عمرے کو جانے لگا تو معمول کے خلاف بہت بڑا مجمع ساتھ تھا اور یکے بعد دیگرے تنعیم گاڑیاں پہنچتی رہیں، تنعیم پہنچ کر میں نے ان دوستوں سے دریافت کیا کہ ہارون کو کیا کیا بھیجا؟ بلا توریہ بلا مبالغہ مجھے دو (۲۰۰) سو سے زیادہ عمروں کی فہرست ملی، اللہ تعالیٰ ان دوستوں کو جزائے خیر دے بعضوں نے دو دو تین تین بھی عمرے دن میں کیے، اس کے بعد سے مکہ کے قیام تک تو روزانہ جب میں عمرے کو جاتا رہا مجھے ۲۰، ۳۰ عمروں کی بشارت ملتی تھی اور ۱۵ کو جب میں مدینہ منورہ روانہ ہو گیا تو وہاں کے دوران قیام ختم قرآن اور مالی ایصالِ ثواب کا مژدہ سنتا رہا جس سے بڑا ہی جی خوش ہوا، اللہ تعالیٰ نے مرحوم پر بڑا ہی فضل فرمایا کہ اتنے عمرے وہ بھی رمضان کے کہ "عمرة في رمضان كحجة معي" کے اس کو ملے، حسبِ معمول کہ میرا جو رمضان حجاز میں ہوتا ہے اس کا نصف اول مکہ میں عمروں کے شوق میں اور نصف آخر مدینہ پاک میں مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اعتکاف کی طلب میں۔

اس مرتبہ بھی ۱۵ رمضان کی تراویح پڑھ کر مع بچوں کے چلے، بدر میں سحری کھائی اور تھوڑی دیر سو کر صبح کی نماز کے بعد شہداء کی زیارت کر کے عربی ۳ بجے مدینہ منورہ پہنچ گئے، مستورات کے لیے صوفی اقبال کے گھر میں پہلے سے دو کمرے محفوظ کر رکھے تھے، بڑے میں عزیز عاقل مع اپنے اہل و عیال اور چھوٹے میں عزیز سلمان اہل و عیال، ابوالحسن چونکہ رات کو میرے پاس سوتا تھا اس لیے اس کی اہلیہ اُوپر کی منزل میں صوفی اقبال کی اہلیہ کے ساتھ رہتی تھی۔

شروع رمضان میں چونکہ رویت کا ثبوت دیر میں ہوا تھا اس لیے پہلی شب میں قرآن شریف شروع نہیں ہوا تھا، دوسری تاریخ سے شروع ہوا تھا، حرمین کا معمول ایک پارہ روز پڑھنے کا ہے، دس رکعت میں ایک امام آدھا پارہ پڑھتا ہے اور دوسری دس میں دوسرا امام آدھ پارہ پڑھتا ہے، ۱۵ کی شب میں یہاں ۱۴ پارے ہوئے تھے، خیال یہ تھا کہ حسبِ معمول مدینہ منورہ میں جا کر جوڑ مل جائے گا، مگر یہاں امام صاحب نے ۱۶ کی شب میں پارہ نمبر ۱۷ سے شروع کیا جس کی وجہ ایک تو یہ ہوئی کہ یہاں پہلی شب کو قرآن شروع ہو گیا تھا، دوسری وجہ یہ ہوئی کہ مکی امام ایک پارہ روز پڑھتے ہیں قرآن پورا ہو یا نہ ہو اور مدنی امام ایک پارہ تھوڑا تھوڑا کر کے وسط میں پڑھ لیتے ہیں اور ۲۹ کو قرآن ختم کر دیتے ہیں۔

بہرحال ہم لوگوں سے جو دو پارے رہ گئے تھے وہ عزیز سلمان نے اعتکاف کے زمانہ میں تیئیسویں (۲۳) شب میں پڑھے، رفقاء سے کہہ دیا تھا کہ امام کے ساتھ تراویح کی نیت نہ

کریں نفلوں کی نیت کریں دو پارے اور چوبیسواں پارہ اس شب کا عزیز سلمان نے چار رکعت میں سنائے۔

عزیزم مولانا اسعد سلمہ اور عزیزم مولوی ارشد نے بھی یہ رمضان مدینہ ہی میں گزارا تھا کہ اس سے پہلے سال جب وہ حج کو آئے تھے تو بھائی حبیب کے کہنے پر وہ وعدہ کر گئے تھے کہ اگلا رمضان میں مدینہ کروں گا اور زکریا کو بھی ساتھ لاؤں گا، چنانچہ وہ افریقہ وغیرہ کے طویل سفر سے لوٹ کر رمضان سے ایک ہفتہ پہلے مکہ پہنچ گئے تھے اور عزیز ارشد ہندوستان سے ۲۹ ہندی کو مکہ پہنچ گئے تھے اور مولوی اسعد مدینہ سے عمرہ کی نیت سے جمعہ کو مکہ پہنچ گئے، وہاں دونوں کی ملاقات ہوئی اور عمرہ کے بعد دونوں مدینہ آئے، رات کو طواف میں ان دونوں عزیزوں سے ملاقات ہوئی، یہ دونوں تو طواف اور عمرے سے فارغ ہوکر جدہ روانہ ہوگئے اور وہاں سے اگلے دن مدینہ منورہ۔

مولانا بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اُوپر لکھوا چکا ہوں کہ ان کا اخیر عشرہ رمضان مدینہ میں گزرتا ہے وہ بھی ۲۰ رمضان کو مدینہ منورہ پہنچ گئے تھے، مدینہ پاک میں اعتکاف کی جگہ بابِ سعود سے بابِ عمر تک اور وہاں سے بابِ مجیدی تک ہوا کرتی ہے، اس مرتبہ اس سیہ کار کا معتکف بابِ سعود سے ذرا آگے چل کر تھا اور اس سے آگے چل کر بابِ عمر کے قریب عزیز مولوی اسعد سلمہ کا اور ان کے مقابل بابِ عمر کی دوسری جانب مولانا بنوری کا، مسجد کی تراویح کے بعد اس ناکارہ کے معتکف پر وہ دونوں حضرات بھی کبھی کبھی تشریف لے آتے اور کچھ تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے اپنے مستقر پر جا کر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے۔

۲۶ ویں رمضان کی شب میں اسرائیلی جنگ کی بڑی سخت خبریں سننے میں آئیں مولانا بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کل کو ختمِ بخاری کرنا ہے، میری عقل میں نہ آیا کہ کس طرح ہوسکتا ہے، میں نے کہا کہ یہاں بخاری پڑھنے والے کہاں ملیں گے اور پارے کہاں ملیں گے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس سال اعتکاف میں علماء کی جماعت بہت زیادہ ہے، زیادہ تر تو تیری وجہ سے آئے ہوئے ہیں اور کچھ تھوڑے سے میرے ساتھ ہیں، مجھے پھر بھی یقین نہ ہوا، یہ تو میں خبریں سن رہا تھا کہ اس ناکارہ کے اعتکاف کی وجہ سے بہت سے ملکوں کے احباب اعتکاف کے لیے آئے ہوئے ہیں، مگر میرا اندازہ نہ تھا کہ ان میں علماء اتنے ہوں گے مولانا بنوری نے کہا کہ پاروں کا انتظام میں کردوں گا، چونکہ مولانا نے مختلف مدارس اور احباب سے علی الصباح بخاری کے پارے جمع کرلیے اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب عربی ۴ بجے بخاری شروع ہوکر ۶ بجے پر ختم ہوگئی، ۵:۳۰ پر نماز ہوتی تھی، نماز کے بعد عزیز عبدالحفیظ نے دعاء کرائی اور مولانا بنوری کے اخلاص ہی کی برکت سمجھتا ہوں کہ رات کے ریڈیو پر جنگ کے بند ہونے کا اعلان ہوگیا۔

اس سال رمضان گزارنے والے حضرات تو مدینہ میں جمع ہو گئے تھے، مگر یہ ناکارہ اپنی نااہلیت سے ہر آنے والے سے یہ کہہ دیتا تھا کہ سہارنپور نہیں ہے، اپنے قیام وطعام کا انتظام خود کریں، اس لیے کہ مدینہ پاک میں کوئی ایسی اجتماعی جگہ نہیں ہے، جہاں مہمان سب اکٹھے رہ سکیں، چنانچہ میرے احباب سب اپنی اپنی تجویز سے مختلف جگہ قیام کا انتظام کرتے رہے اور بطور خود کھانے کا انتظام کرتے رہے مگر ہمارے قاضی صاحب کی رحمدلی نے اس کو گوارا نہ کیا کہ اعتکاف کے زمانہ میں بھی یہ حضرات اپنے کھانے کا انتظام کریں۔ زکریا نے قاضی صاحب سے کہلایا کہ جس کا انتظام آپ کریں دس روز کے ۴۰ ریال ہر شخص سے پہلے وصول کرلیں، جو جمع کرے اُس کا انتظام کریں، جو جمع نہ کریں اُس کا انتظام نہ کریں۔

قاضی صاحب نے اول تو کہا کہ میں خود زکریا سے بات کروں گا اور مجھ سے گفتگو میں یوں فرمایا کہ حضرت! اعتکاف کے دنوں میں تو سب کو اپنا ہی مہمان رکھیں۔ میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ قاضی صاحب نے ابوالحسن وغیرہ سے کہلوایا کہ میری ہمت تو پڑتی نہیں آپ اپنی طرف سے اعلان کرادیں زکریا نے ابوالحسن سے شدت سے اعلان کرادیا کہ قاضی صاحب صرف اُسی کا انتظام کریں گے جو ۴۰ ریال پیشگی جمع کرادے۔ لہٰذا بہت سے ایسے لوگوں نے جو بغیر اعلان کے یقیناً قاضی صاحب کے ذمہ ہوتے اعلان کے بعد اپنا انتظام کرلیا اس لیے کہ وہ ایک ریال روزانہ میں اپنی سحری اور افطاری کے کھانے کا انتظام سہولت سے کر سکتے تھے۔

میں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ جس شخص کو بغیر داموں کے شریک کرنا چاہیں بہت شوق سے اور جن کے پیسے جمع کرائے ہیں رمضان بعد ان کے بھی واپس کردیں تو بہت شوق سے بلکہ ضرور کردیں۔ میں نے اس لیے اعلان کرایا کہ بغیر اس کے کھانے والے اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ انتظام آپ کے بس کا نہیں رہے گا۔ ایک دو آدمی ۴۰، ۵۰ کا تو سہولت سے پکا سکتے ہیں، دو سو سے زیادہ کا پکانا مشکل ہے۔ اس وقت قاضی صاحب نے بھی اس رائے کو پسند کیا، رمضان بعد جن سے پیسے لیے گئے تھے اُن کے واپس کیے، لیکن جن لوگوں نے واپس لینے سے انکار کیا ان کو رکھ لیا۔

۱۵ رمضان کو مکہ سے مدینہ آتے وقت یہ طے ہوگیا تھا کہ مولانا انعام صاحب یا علی میاں کسی کی آمد ہو جائے گی تو اس وقت بندہ دوبارہ حاضر ہو جائے گا اور حج تک قیام کرے گا مگر رمضان کے بعد سے زکریا کو اتنی شدت سے بخار کا سلسلہ روز افزوں شروع ہوا کہ سفر کی ہمت نہ رہی۔ رفقاء اور مکی احباب کا اصرار حج پر ہونا ہی چاہیے۔ مدنی صاحب کا بھی اصرار تھا کہ میں حج کو جاؤں اس لیے کہ وہ مجھے مدینہ چھوڑ کر حج کو جانا نہیں چاہتے تھے اور ان کی وجہ سے نیز اپنے جنازہ برداروں کی

وجہ سے دل میرا بھی چاہتا تھا کہ ضرور جاؤں۔ مگر بیماری نے ایسا زور باندھا کہ ہمت نہ ہوئی۔ اسی دوران شب ۱۲ ذیقعدہ میں زکریا نے خواب دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قاضی عبدالقادر صاحب کو پیام بھیجا ہے کہ زکریا کو حج پر لیجانے پر اصرار نہ کریں اور خود قاضی صاحب نے بھی ''بین النوم والیقظہ'' دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم احرام تقسیم کررہے ہیں اور زکریا پاس کھڑا ہے مگر تجھے احرام نہیں دیا اور میں قاضی صاحب دل میں سوچ رہا ہوں کہ اس کو احرام کیوں نہیں دیا۔ زکریا نے قاضی صاحب سے کہا کہ اب تو آپ نے خود بھی ملاحظہ فرمالیا کہ اس ناکارہ کو حج کو جانا نہیں ہے، مگر احباب کا اصرار ہوتا ہی رہا مگر یہ ناکارہ نہ گیا۔

مولانا انعام الحسن صاحب بمبئی سے بذریعہ طیارہ ۱۰ ذیقعدہ ۴ دسمبر منگل کو دبئی کے لیے روانہ ہوئے اور اسی دن عزیز زبیر، صوفی افتخار، ماسٹر محمود صاحب، زبیر کی اہلیہ اور ہمشیرہ کو لے کر بحری جہاز سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے، ان دونوں بچیوں کی روانگی میرے سامنے طے نہیں ہوئی تھی ورنہ عاقل سلمان ہی کے ساتھ آجاتیں۔ ان کی روانگی کے بعد مولانا انعام صاحب کو خیال ہوا کہ یہ دونوں بچیاں بھی اگر چلی جائیں تو اپنی بڑیوں کے ساتھ حج کرلیں۔ میں تو ان کے تنہا آنے کی موافقت نہ کرتا کہ دونوں کمسن بچیاں تھیں اور دونوں کے ساتھ ایک ایک چوزہ بھی، مگر اچھا ہی ہوا کہ وہ دونوں بھی نمٹ گئیں، ورنہ اس سال تو ضعفاء اور عورتوں کا حج بہت مشکل ہوگیا۔

مولانا انعام صاحب ۴ دسمبر کی شام کو دبئی کے لیے روانہ ہوئے، دو دن دوبئی قیام کے بعد ۷ کو شارجہ، ۸ کو ابوظہبی اور ۹ کو دوبئی واپسی ہوئی اور اس دن شام کو جدہ کے لیے روانہ ہوئے، عربی سوا چھ پر رات کو جدہ پہنچے، اسی وقت سعدی کے ساتھ مولوی محمد عمر، ماموں یامین، زعیم شمیم، شاہد جو مولوی انعام کے استقبال کے لیے جدہ گیا ہوا تھا، سعدی کے گھر روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر مدرسہ صولتیہ ٹیلیفون کیا اس لیے کہ شمیم کا اصرار سعدی پر یہ تھا کہ ان کو مدرسہ سیدھے لائیں اپنے یہاں نہ ٹھہرائیں، مگر صولتیہ سے کوئی جواب نہ ملا تو زعیم شمیم کو مدرسہ بھیجا کہ اگر وہ لوگ منتظر نہ ہوں تو مدرسہ آئیں، اس نے ٹیلیفون پر جواب دیا کہ یہاں کوئی نہیں صرف مفتی زین العابدین صاحب سو رہے ہیں، اس لیے مولانا انعام الحسن صاحب مع رفقاء عزیز سعدی کے گھر سو گئے اور صبح کو ۲½ بجے ناشتہ سے فارغ ہوکر مولانا عبداللہ عباس کی گاڑی میں مدرسہ گئے مدرسہ کا سالانہ اجتماع شروع ہوچکا تھا، عزیز شمیم خبر سنتے ہی مسجد میں لے گئے۔ عصر کے بعد مولانا انعام صاحب نے عمرہ ادا کیا اور عزیز زبیر مع اپنی مستورات کے ۱۸ ذیقعدہ کو مکہ پہنچے۔

مولانا انعام صاحب کو مکہ پہنچ کر زکریا کی بیماری اور حج کو نہ جانا معلوم ہوا تو انہوں نے زکریا کی عیادت کے لیے مدینہ آنے کا ارادہ کیا۔ زکریا نے شدت سے اصرار سے بار بار منع کرایا مگر وہ ۲۲

ذیقعدہ یکشنبہ کو عصر کے بعد مدینہ پہنچ گئے۔ عزیز زبیر، مولوی محمد عمر اور مفتی زین العابدین صاحب بھی ہمراہ تھے چونکہ مدرسہ میں قیام کی جگہ نہ تھی اس لیے یہ حضرات بعد عشاء کھانے کے بعد مسجد نور چلے گئے، پیر کی صبح کو پھر آئے اور بعد ظہر کھانے سے فراغ پر پھر مسجد نور گئے اور عصر کے بعد پھر آئے اور عشاء کے بعد گئے۔

۲۴ ذیقعدہ منگل کی صبح کو عزیز عبدالحفیظ کی بیجو میں یہ سب حضرات مکہ گئے، عزیزان عاقل سلمان مع اپنی زوجات کے ۱۹ ذیقعدہ کو عزیز عبدالحفیظ کی بیجو میں ۵ بجے روانہ ہو کر ایک بجے بعد مغرب عزیز سعدی کے گھر پہنچ گئے۔ سامان ان کا عزیز عبدالحفیظ کے ٹرک میں گیا قاضی صاحب، ابوالحسن صاحب عزیز حبیب اللہ زکریا سے مایوس ہو کر ۶ ذیقعدہ کو مکہ روانہ ہو گئے زکریا کے پاس مولوی اسماعیل بدات ڈاکٹر اسماعیل یحییٰ کراچوی عبدالوحید اور ڈاکٹر شہید الدین مولوی سلیمان پانڈور، صوفی اقبال، احمد ناخدا رہے۔ بھی کا حج اس ناکارہ کی وجہ سے فوت ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان سب دوستوں کو حج کا بہترین بدلہ عطاء فرمائے۔

حج کے بعد عزیزان عاقل سلمان، ابوالحسن مع اپنی زوجات کے ۱۵ ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ سے جدہ کے لیے اور ۱۶ ذی الحجہ کو جدہ سے بمبئی کے لیے محمدی جہاز سے روانہ ہوئے اور ۲۶ ذی الحجہ کو ان کا جہاز بمبئی پہنچ گیا۔

عزیز شاہد میرے ساتھ طیارہ سے آیا تھا اور اس کے والدین اور اہل وعیال کی وجہ سے طبیعت کے خلاف میں نے عزیزان عاقل سلمان کے ساتھ جانا تجویز کر رکھا تھا اور اس کے طیارہ کے ٹکٹ کے دام کہہ دیا تھا کہ بمبئی جا کر واپس کرالے۔ مگر جب مولانا انعام الحسن کے ساتھ اس کی اہلیہ اور ہمشیرہ بھی پہنچ گئی تو پھر عزیز شاہد کا جانا بجائے عزیز عاقل کے ساتھ کے اس کی اہلیہ اور ہمشیرہ کے ساتھ تجویز کر دیا۔ اس لیے عزیز شاہد جدہ تک ان کو پہنچا کر مکہ واپس آ گیا۔

عزیز عاقل سلمان کے جہاز کے پہنچنے میں دو دن کی تاخیر ہوئی یعنی بجائے ۸ دن کے بمبئی ۱۰ دن میں پہنچا۔ عجائب قدرت کا کرشمہ ہے کہ محمدی جہاز میں پیٹرول کی کمی ہو گئی تھی، سعودی اور عدن کی بندرگاہوں نے تیل دینے سے انکار کر دیا اور وائرلیس سے فرانس کے تابع بندرگاہ جیبوٹی سے دریافت کرنے پر اس نے وعدہ کر لیا اور وہاں سے تیل لے کر آیا اس لیے تاخیر ہوئی۔

عزیزان عاقل سلمان کا جہاز بمبئی ۱۹ جنوری ۲۶ ذی الحجہ کو پہنچا۔ خالد انصاری وغیرہ ان کے استقبال کی مد میں ایک ہفتہ پہلے پہنچ گئے جس پر زکریا نے شدت سے نکیر کی کہ اول تو استقبال کے نام سے تفریح کے لیے آنا بہت بے محل تھا اور پھر خواہ مخواہ ایک ہفتہ پہلے آ کر دوسروں پر بوجھ بننا ہرگز مناسب نہ تھا۔ عزیزان مذکور ۲۰ جنوری ۲۷ ذی الحجہ کو بمبئی سے دہرہ ایکسپریس سے روانہ ہو کر

۲۸ کو سہارنپور پہنچے مگر راستہ میں میرٹھ سہارنپور کے درمیان ہنگامہ ہوجانے کی وجہ سے گاڑی ۸ گھنٹے لیٹ پہنچی۔ جس کی وجہ سے سہارنپور والے بہت پریشان رہے۔

مولانا انعام الحسن صاحب نے مع اپنے رفقاء مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ کے اور عزیزان زبیر شاھد نے مع اپنی زوجات کے ۲۴ ذی الحجہ کو عزیز عبدالحفیظ کی ہیجو میں عربی ۴ بجے چل کر ظہر بدر میں پڑھی اور وہاں کھانا وغیرہ جو سعدی نے بہت پُر تکلف ساتھ کیا تھا اور بدری مچھلیاں کھا کر شہداء کی زیارت کر کے عصر مسجدِ عریش میں پڑھ کر مغرب مدینہ پاک میں مسجدِ نور میں پڑھی اور وہاں چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر سامان اُتروا کر مع مستورات عشاء مسجدِ نبوی میں پڑھی۔

مستورات کو صوفی اقبال کے یہاں پہنچا دیا کہ عزیزان عاقل سلمان کے کمرے خالی تھے، ان دونوں میں زبیر شاہد مع اپنی زوجات مقیم ہو گئے اور مولانا انعام صاحب مع اپنے رفقاء مسجدِ نور چلے گئے، مولانا کا قیام مسجدِ نور ہی میں رہا، مولانا انعام الحسن صاحب مع اپنے رفقاء کے عزیز عبدالحفیظ کی گاڑی میں صبح اور ظہر پڑھ کر واپس چلے جاتے تھے اور عصر پڑھ کر تشریف لاتے تھے بعد عشاء کھانے سے فراغ کے تقریباً دو گھنٹے پھر شوریٰ میں خرچ ہوتے اس لیے کہ ان کے دن بھر کے مشوروں میں جو مسجدِ نور میں ہوتے تھے جن چیزوں کا ذکر زکریا کے مناسب ہوتا وہ اس مجلس میں طے ہوتی تھیں۔

دو تین دن مولانا انعام صاحب کی طبیعت ناساز رہی اس لیے بجائے ان کے زکریا مسجدِ نور جاتا رہا، جماعتوں کی رخصت ہمیشہ سے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا کرتی تھی مگر بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس سال مسجدِ نور ہی سے کرنی پڑی اس لیے زکریا یکم محرم جمعرات کو علی الصباح مسجدِ نور چلا گیا اور عصر کے بعد واپس آ گیا کہ عصر کے بعد مستقل زکریا کے یہاں مجلس کا دستور تھا، دوسرے دن جمعہ ہونے کی وجہ سے زکریا نے صبح کی حاضری سے معذرت کر لی اور شنبہ کی صبح کو الوداعی مصافحہ کے لیے مسجدِ نور چلا گیا اور جماعتیں روانہ ہوئیں۔

ان مشوروں میں بڑا اہم مسئلہ جدہ کی مسجد بن لادن کے مرکز کے باقی رہنے کے سلسلہ میں تھا جو طویل الابحاث ہے، آخر فیصلہ یہ ہوا کہ بدھ کا اجتماع تو مسجدِ مذکور میں بدستور رہے اور جماعتوں کے قیام کے لیے مسجدِ عتیق جس کو جدید مرکز بنانے کے لیے جدہ کے عرب مصر تھے وہاں رہے، مسجد بن لادن میں جماعتوں کے ٹھہرنے پر طرفین کی طرف سے ناگوار واقعات پیش آ رہے تھے۔

مولانا انعام الحسن صاحب مع اپنے رفقاء اور عزیزان زبیر و شاہد مع اپنی مستورات کے ۲۴ محرم ۹۴ھ مطابق ۱۶ فروری ۷۴ء مدینہ سے روانہ ہوئے، مولانا انعام صاحب کی رائے تو صبح کی نماز پڑھ کر ہی روانگی کی تھی مگر چھوٹے بچوں کی وجہ سے عبدالحفیظ کی گاڑی میں ۲ بجے روانہ

ہوئے کہ عزیزان کا بحری جہاز ۲۲ فروری کو جدہ سے روانہ ہونے والا تھا اور ان کو روانہ کرنے کے بعد مولانا انعام صاحب کا طیارہ سے سوڈان جانا تجویز تھا، مگر مولانا کا سفر سوڈان کا ویزانہ ملنے کی وجہ سے نہ ہوسکا۔

عزیزان زبیر وشاہد مع مستورات صوفی افتخار وغیرہ مکہ سے جمعرات ۲۹ محرم ۲۱ فروری کی صبح کو جدہ کے لیے روانہ ہوئے کہ جمعہ کے دن ان کا بحری جہاز تھا، جمعہ کے دن عربی چھ بجے جہاز پر سوار ہوئے آٹھ بجے روانگی کی اطلاع تھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ جہاز رات بھر وہیں کھڑا رہا، شنبہ کی صبح کو روانہ ہوا اور حاجی یعقوب صاحب کا برقیہ مرسلہ ۴ مارچ جو چھ کو مدینہ پہنچا، اس میں تھا آج عزیزان زبیر وشاہد مع مستورات بخیریت پہنچ گئے۔

مولانا انعام صاحب کا سوڈان کا سفر تو ملتوی ہوگیا مگر ۴ صفر ۲۶ فروری کو ظہران سے مع رفقاء کے طیارہ سے تشریف لے گئے، وہاں ۲۴ گھنٹے قیام رہا، ۲۷ کو ظہران سے بذریعہ طیارہ بمبئی کے لیے روانہ ہوئے اور تین بجے شام کو بمبئی پہنچ گئے، مطار پر بہت بڑا مجمع تھا، مولانا نے دُعاء کرائی اور وہاں سے کھوکھا بازار کی مسجد میں تشریف لے گئے، عشاء کے بعد بمبئی کی جامع مسجد میں اجتماع طے تھا، اُس میں مولانا نے تقریر کی اور یہاں کے چار روز قیام میں پونہ، بھیمڑی، باندرہ اور گورے گاؤں کا دورہ ہوا، پہلے سے بمبئی کے اس قیام میں متعدد جگہ کے قیام تجویز تھے، اس لیے خود مولانا انعام الحسن صاحب نے یہ ارادہ فرمارکھا تھا کہ زبیر وشاہد کا انتظار بمبئی میں کریں گے اس دوران میں بمبئی کے قرب وجوار میں کئی جگہ تشریف لے گئے۔

۵ مارچ مطابق ۱۱ صفر منگل کو بمبئی سے چل کر ۶ مارچ کو مع زبیر وشاہد اور مستورات کے نظام الدین پہنچ گئے، شاہد اپنی ہمشیرہ اور اہلیہ کے ساتھ ۱۱ مارچ کو سہارنپور پہنچ گیا۔

......☆☆☆☆☆......

سفر ہندوستان ۹۴ھ

اب تک یہ ناکارہ ''سفرِ حج سنہ فلاں'' یا ''سفرحجاز سنہ فلاں'' لکھواتا تھا، آج پہلی مرتبہ ''سفرِ ہند سنہ فلاں'' لکھوا رہا ہوں، اس لیے کہ اُوپر کے مضامین سے تو یہ معلوم ہو چکا کہ ۲۳ جمادی الثانیہ ۹۳ھ کو اس ناکارہ کو اقامہ مل گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب حجاز کا قیام اصل ہے اور ہندوستان کا عارضی کہ چھ ماہ سے زیادہ صاحبِ اقامہ کو باہر رہنے کی اجازت نہیں ورنہ اقامہ منسوخ ہو جائے گا۔

ہارون مرحوم (اللہ تعالیٰ اُس کو بہت بلند درجے عطاء فرمائے) کے حادثہ کے بعد میرے محسن مخلص قاضی عبدالقادر صاحب زادمجدہم کا تو شدید اصرار یہ تھا کہ میں رمضان ہی میں نظام الدین جاؤں اور بار بار تقاضا فرمایا، میں نے کئی دفعہ پوچھا کہ میرے جانے کا تو خود بھی دل چاہتا ہے ہارون مرحوم کے بچوں کی وجہ سے، مگر فوری جانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، میں نے کہا کہ آپ ضرورت بتادیں میں جا کر کیا کروں گا؟ مولانا انعام الحسن صاحب وہاں موجود ہیں جو مقدر تھا وہ ہو گیا۔

قاضی صاحب نے کوئی وجہ تو بتائی نہیں مگر یہ فرماتے رہے کہ میرا طبعی تقاضا ہے کہ تو جلدی جا، مگر اس ناکارہ کے لیے اول تو ہمیشہ سے ہی ''السفر قطعة من النار'' کا ظہور ہے اور پھر رمضان کا سفر تو اور بھی ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ تحمل ہے، اس کے علاوہ ذیقعدہ میں مولانا انعام الحسن صاحب خود آرہے ہیں اور شروع ذی الحجہ میں علی میاں رابطہ کے اجتماع میں آرہے ہیں، ان حضرات سے بھی کچھ مشورے کرنے ہیں، اس لیے حج کے بعد ان کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔

دہلی سے بھی اور میوات سے بھی میرے فوری پہنچنے کے تقاضے کے خطوط تو آتے رہے مگر عجلت کی وجہ کسی نے نہ لکھی اور میں خصوصی لوگوں کو یہ لکھتا رہا کہ میری آمد کی وجہ جلد تحریر فرمادیں اور عام طور سے یہ لکھتا رہا کہ یہ ناکارہ یہاں رہ کر مرحوم کے لیے جتنا کچھ کرا سکتا ہے وہاں نہیں ہو سکتا۔

علی میاں اور مولانا انعام صاحب نے بھی آنے کے بعد جانے پر تو زور دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی مشورہ دیا کہ تیرا گزشتہ رمضان حجاز میں ہوا تھا اس لیے سفر کی ترتیب ایسی رکھنی چاہیے کہ رمضان سہارنپور میں ہو جاوے، میری نگاہ میں تو زیادہ اہمیت اس کی بھی نہیں رہی اس لیے کہ ہندوستان میں میرے متعدد احباب ایسے ہیں کہ جو اپنے اپنے مقامات پر رمضان کا اہتمام کر سکتے ہیں، مگر خود ان دوستوں کا بھی جن کے متعلق میرا خیال تھا، میرے آئندہ رمضان سہارنپور گزارنے کے تقاضے آئے۔ میں تو ہارون مرحوم کے بچوں کی وجہ سے جلدی جانا چاہتا تھا مگر یہ مصلحت بھی جو یہ احباب وہاں رمضان گزارنے کی بتا رہے تھے بالکل نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے یہ طے

ہوا کہ میں ایسے وقت میں سفر کروں کہ چھ ماہ کے اندر رمضان بھی آ جائے۔ اس کے ساتھ ہی پاکی احباب نے جب یہ سنا کہ جب میرا سہارنپور کا ارادہ ہے تو ان کے از سر نو تقاضے شروع ہوئے کہ ہندوستان جاتے وقت پاکستان کا ضرور وقت رکھنا ہے اس لیے کہ شعبان میں باوجود کوشش کے کوئی صورت نہ ہو سکی تھی۔

عزیز مولوی اسعد سلمہ ۱۴ ربیع الاول ۹۴ھ مطابق ۶ اپریل ۷۴ء رابطہ کے ایک خصوصی اجتماع میں شرکت کے لیے آئے تھے اور اس جہاز سے مولانا ابو اللیث بھی ساتھ تھے اور ہمارے قاضی صاحب بھی جو عالمی اجتماع مسلم سربراہوں کا لاہور میں ۲۲ فروری ۷۴ء سے طے تھا، زکریا کا اصرار تھا کہ قاضی صاحب، مفتی صاحب اور رائے ونڈ کے اکابر اس وقت لاہور میں ضرور موجود ہوں اور رائے ونڈ کے دیگر اکابر جن میں خاص طور سے مولوی احسان، بھائی عبدالوہاب لاہور رہے۔ اس اجتماع کی تفاصیل تاریخ کبیر میں ہیں۔

قاضی صاحب بھی اس اجتماع سے فراغ پر اسی جہاز سے تشریف لائے جس سے مولوی اسعد صاحب۔ مولانا اسعد صاحب رابطہ کے اجتماع سے فراغ پر ۱۰ اپریل کو مدینہ پہنچ گئے۔ ان کا بھی اصرار تھا کہ زکریا پاکستان ضرور چلے۔ زکریا کا وہی شعبان والا عذر تھا کہ اتنے سفارت ہند سے اجازت نہ ہو اتنے میں نہیں اتروں گا۔

مولانا اسعد صاحب نے (اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے) ہندوستان واپس جا کر زکریا کے پاکستان اترنے کی اجازت پر کوشش کی اور ۱۵ مئی کو ان کا پہلا برقیہ مدرسہ صولتیہ کے پتہ سے پہنچا کہ آپ کے پاسپورٹ میں مع دو رفقاء کے خصوصی حکم نامہ پاکستان درج کرنے کے لیے احکامات جدہ سفارت خانہ کو جا چکے ہیں سفارت سے رجوع کریں۔ اسی مضمون کا دوسرا برقیہ مدینہ کے پتہ سے ۲۰ مئی کو پہنچا جو عرفات مدینہ کے پتہ سے بھائی حبیب اللہ کے پاس پہنچا۔ اس پر سفارت ہند مقیم جدہ سے مراجعت کی تو معلوم ہوا کہ اجازت آ چکی۔ پاکی احباب کو تو شعبان میں بہت اطمینان تھا کہ پاکی ویزا ضرور آ جائے گا اس لیے اس وقت تو اور اطمینان ہو گیا۔ اس مساعی سے پاکستان کے ۴ مواضع کا ویزا مل گیا۔ جن میں سب سے اول ایبٹ آباد تھا کہ وہاں سے میرے رشتہ کے ماموں الحاج مولوی داؤد صاحب ایڈوکیٹ ایبٹ آباد کی درخواست پر شعبان میں کوشش شروع ہوئی تھی۔ اسی درخواست کی بنیاد پر ویزا منظور ہوا اور کراچی رائے ونڈ، ایبٹ آباد، پنڈی، ڈھڈیاں جو ضلع سرگودھا میں آ گیا اور لائل پور کے ویزے منظور ہوئے اور اس بناء پر ۲۴ مئی مطابق ۳ جمادی الاولیٰ کو مدینہ پاک سے مکہ کے لیے روانگی ہو گئی۔

بھائی یونس دہلوی اور مولانا عبداللہ عباس کی گاڑیوں میں یہ ناکارہ، علی میاں اور قاضی صاحب

اور رفقاء روانہ ہوئے۔ بعد مغرب روانہ ہوئے اور شب ڈاکٹر اسماعیل صاحب (جو اس زمانہ میں بدر کے ڈاکٹر تھے۔) کی درخواست پر تقریباً ۲۰ گھنٹے بدر میں قیام رہا۔ شب کو مسجد عریش کے میدان میں سوئے۔ صبح کو شہداء کے مزارات پر حاضری ہوئی۔ بعد عصر بدر سے چل کر پونے تین بجے مدرسہ صولتیہ پہنچے۔

بھائی سلیم نے بہت پرتکلف دعوت کا انتظام کر کے رکھا تھا۔ اس میں نہ معلوم کتنے مرغ کاٹ دیئے۔ زکریا کے نکیر پر فرمایا کہ دنبہ سے مرغ سستا پڑتا ہے اور یہ صحیح کہا کہ گوشت اس زمانہ میں بارہ ریال کلو تھا اور مرغ چار ریال جس میں تقریباً پون کلو گوشت ہوتا ہے اور آج کل صفر ۹۵ھ میں مدینہ میں دنبہ بکرا ۱۸ ریال فی کلو اور مرغ چھ ریال۔ بھائی سلیم کی دعوت میں مرغ پلاؤ، مرغ مسلم اور نہ معلوم کتنی چیزیں تھیں۔ کھانے کے بعد علی میاں کو مولوی عبداللہ عباس کے گھر بھیج دیا اور ہم عمرہ سے فارغ ہو کر چھ بجے عزیز سعدی سلمہ کے گھر پہنچ گئے۔

زکریا کی واپسی کے ٹکٹ کی میعاد چند روز پہلے ختم ہو رہی تھی اور اس کی توسیع کے لیے جدہ بھیج رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ توسیع کا وقت ختم ہو چکا تھا اس لیے اس کو بھائی یونس کے مشورہ سے جدید ٹکٹ کے ساتھ تبدیل کرا دیا گیا۔ جو جدہ تا کراچی تا لاہور تا دھلی تا بمبئی تا کراچی تا جدہ تھا۔ اس میں پیسے تو زیادہ لگے مگر سابقہ ٹکٹ بے کاری سے بچ گیا۔

علی میاں مدینہ منورہ سے تو ہمارے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے لیکن میرا سفر تو کچھ تاخیر سے تھا اور پاکستان ہو کر جانا تھا اور علی میاں کو سیدھے ہندوستان جانا تھا، اس لیے علی میاں ۵ جون جمادی الاولیٰ کو طیارہ سے بمبئی روانہ ہوئے۔ کراچی کے مطار پر بڑا جمع تھا۔ ظہر عصر وہیں جماعت سے پڑھیں اور مغرب کے وقت بمبئی پہنچ گئے اور بمبئی سے اندور مولانا معین اللہ کے یہاں ان کے لڑکے لڑکی کی شادی میں تشریف لے گئے۔ اتوار کو بمبئی اور دوشنبہ کو دھلی اور سہ شنبہ کو لکھنؤ پہنچ گئے۔

اس ناکارہ کی جدہ سے روانگی شنبہ ۲۲ جون کی طے تھی۔ اگرچہ اس سال طیاروں کی تاریخوں میں بار بار تقدیم تاخیر ہوتی رہی اور اس سے فکر بھی تھا کہ علی میاں کو اس کی وجہ سے دقت اٹھانی پڑی۔ مگر اس ناکارہ کا طیارہ بدستور رہا اہلِ جدہ کا اصرار تھا کہ یہ ناکارہ جمعہ کے دن جدہ پہنچ جائے اور شب کو وہاں قیام کر کے آگے جائے، مگر قاضی صاحب نے (اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے کہ وہ میری راحت کا اس قدر فکر رکھتے ہیں کہ اس کا تصور بھی نہیں ہوتا) اس کو یہ کہہ کر قبول نہیں کیا کہ جدہ کے قیام میں زکریا کو دقت ہوگی۔

ان ایام میں صبح کی نماز پونے دس بجے ہوتی تھی، عزیز سعدی کے مکان سے سوا دس بجے عزیز عبدالوحید کے ساتھ اس کی اونیٹ میں عزیزان مولوی حبیب اللہ، مولوی اسماعیل اور

عزیز اختر علی سہار نپوری جو کئی سال سے جدہ میں مقیم ہے اور ہر آمد پر ظہران مجھے لینے کے لیے جاتے ہیں، روانگی کے وقت بھی میری مشایعت کا بہت اہتمام کرتے ہیں، جمعرات کی شام سے یہاں آئے ہوئے تھے، جدہ روانہ ہوئے کہ وہ جدہ کی ایئر لائن میں ملازم ہیں ان کی وجہ سے بہت سہولت ہوتی ہے۔

۳۰: ۱۰ بجے بھائی عبدالکریم مہندس کی کار میں یہ ناکارہ، قاضی صاحب، عزیز سعدی اور خود بھائی عبدالکریم چل کر ۳۰: ۱۱ پر مطار پہنچ گئے۔

عزیز عبدالحفیظ اس وقت بیروت میں تھے ان کا وعدہ تو یہ تھا کہ وہ پاکستان کے سفر سے پہلے یہاں واپس آجائیں گے اور میرے ساتھ پاکستان و ہندوستان جائیں گے مگر اہلِ مطابع کے کرم سے نہ پہنچ سکے۔

ڈاکٹر ظفیر صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے، میرے اور میرے متعلقین کی آمد و رفت میں بہت مدد ڈاکٹر صاحب سے ملتی ہے، اس مرتبہ بھی انہوں نے کئی دن پہلے سے اجازت لے رکھی تھی کہ طیارہ پر میں ان کی کار میں جاؤں گا، مگر عین وقت پر معلوم نہیں کیا گڑ بڑ ہوئی کہ مطار والوں نے ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کو جانے سے روک دیا جس پر فوراً ڈاکٹر صاحب اپنے کسی واقف ملازم مطار کی کار میں لے کر آئے اور طیارہ پر پہنچا دیا، قاضی صاحب اور دوسرے رفقاء کسٹم ہو کر طیارہ پر پہنچ گئے، ہاتھ کا سامان بھی اُوپر نہ پہنچ سکا اس لیے کہ جو مجھے پہنچانے گئے تھے اُن کو میرے پاس بیٹھنا زیادہ اہم معلوم ہوا اس لیے دستی سامان بھی دوسرے سامانوں کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔

جدہ سے ۷ بجنے والی (انگریزی) چل کر پون گھنٹہ طیارہ دبئی ٹھہرا، بڑا فکر تھا کہ دبئی میں اگر پہلے کی طرح سے اطلاع ہوگئی ہوگی تو دقت ہوگی کہ میری گاڑی بھی اندر ہی ہے، مگر ساتھ ساتھ ہی دوستوں سے ملنے کا اشتیاق بھی تھا، مگر دبئی میں باوجود تلاش کے کوئی نہیں ملا اور عربی سوا چھ بجے اور پاکی ۲۵: ۳ پر کراچی پہنچ گئے وہاں مجمع بہت تھا حاجی فریدالدین صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے، حسب معمول اپنی کار لے کر طیارہ پر پہنچ گئے تھے، انہوں نے دریافت فرمایا کہ ظہر پڑھ لی ہے یا پڑھنی ہے؟ میں نے کہا نہیں پڑھی مطار پر ڈھائی تین ہزار کا مجمع ہے یہاں پڑھی گئی تو دیر لگے گی، میں نے کہہ دیا کہ مکی مسجد میں پڑھنی ہے پیشاب بھی کرنا ہے، اس لیے حاجی صاحب نے اپنی کار میں مجھے اور عزیز مولوی احسان، مولوی اسرار، بھائی یحییٰ کراچوی اور اپنے صاحبزادے کو بٹھا کر نہایت تیزی سے مطار سے ایک میل باہر مجھے چھوڑ گئے اور گاڑی صاحبزادے کے حوالہ کر دی اور خود رفقاء اور سامان کی وجہ سے دوبارہ مطار پر آ گئے۔

کی مسجد میں بہت بڑا مجمع تھا، مگر ان سے یہ کہہ کر ملاقات اور مصافحہ عصر کے بعد ہوں گے اپنے مستقر پر پہنچ گیا، وہیں پیشاب، وضو، کر کے جماعت کی، کراچی کی گرمی سے بہت فکر تھا، مگر وہاں کے ایئر کنڈیشن اور کولروں نے بھائی سلیم اور عزیز سعدی کے کولر اور ایئر کنڈیشن کو بھی مات دے رکھی تھی، کئی کئی لگ رہے تھے، ایک گھنٹہ بعد رفقاء بھی مع سامان کے پہنچ گئے، وہاں بجائے گرمی کے اس قدر سردی لگی کہ ایک گھنٹہ بعد کولر بند کرنا پڑا اور رات کو بھی سردی لگی۔

عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور پیر ہاشم جان مجددی صاحب وغیرہ تشریف لے آئے اور مغرب تک تشریف فرما رہے اور قادیانی سلسلہ کا ہنگامہ سناتے رہے۔

میں نے جمعہ کی شب سے کھانے کا مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا، مگر کراچی کے دوستوں نے اتوار کی شب میں اتنا بڑا دستر خوان تیار کر رکھا تھا کہ اس کو دیکھ کر رہی سہی بھوک بھی جاتی رہی، ایک بُری عادت یہ بھی ہے کہ اگر دستر خوان پر بہت سی چیزیں ہو تو رغبت ختم ہو جاتی ہے، یہ اصل میں گدھے کی عادت ہے، یہ مشہور ہے کہ گدھا جتنا برسات میں دُبلا ہوتا ہے اور کسی موسم میں نہیں ہوتا، اس لیے کہ سبزہ بہت زیادہ ہوتا ہے وہ کھڑا سوچتا ہے کہ کہاں سے چروں، یہ حماری عادت مشابہ بالحمار میں بھی ہے، دستر خوان پر پانچ چھ طرح کی مچھلیاں، سات آٹھ قسم کے چاول اور اتنے ہی مختلف سالن اور سات آٹھ قسم کے میٹھے کہ طبیعت ان کو دیکھ کر بالکل بھر گئی اور باوجود خواہش کے کچھ نہ کھایا گیا۔

حاجی فریدالدین صاحب نے مدینہ پاک ہی میں یہ وعدہ لے لیا تھا کہ کراچی کے قیام میں ایک شب میری ہے، ان سے یہ وعدہ ہو گیا تھا کہ جس دن بھی پہنچنا ہو اس سے اگلے دن کی شام کی دعوت آپ کے یہاں طے ہے اور حضرت قاضی صاحب سے بھی اس کی منظوری لے لی گئی، چنانچہ حاجی صاحب نے بھی دوشنبہ کی شب میں اپنی شایان شان دعوت کے وہ زور باندھے اور اتنے اکابر کو جمع کر رکھا تھا کہ کھانا تو نہیں مگر ان سب دوستوں سے بیک وقت ملاقات ہو گئی۔

کراچی سے منگل کے طیارہ سے لاہور ہوتے ہوئے رائے ونڈ کا جانا طے تھا کہ پیر کی صبح کو میرے پاس سرکاری حکمنامہ زبانی پہنچا کہ تمہارے سارے ویزے کراچی کے علاوہ منسوخ، تم اپنی طرف سے سب جگہ التواء لکھ دو، میں نے کہہ دیا کہ میں سب جگہ اطلاعات دے چکا ہوں، میرے پاس التواء کی کوئی وجہ نہیں، آپ باضابطہ منع کر دیں تو عذر ہو جائے گا، چنانچہ پیر کی شام کو تحریری حکم نامہ بھی پہنچ گیا۔

پیر کی صبح کو جناب الحاج مفتی محمد شفیع صاحب کے مدرسہ میں جانا ہوا، مفتی صاحب نے بھی ناشتہ کا بڑا اہتمام کر رکھا تھا، واپسی میں بھائی یوسف رنگ والے اور جس جس کا گھر سڑک پر پڑتا

رہا، کہیں صرف موٹر میں بیٹھ کر اور کہیں تھوڑی دیر کو اُترتے ہوئے مکی مسجد پہنچنا ہوا، یہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی ٹنڈو الہ یار سے تشریف لائے، اُن کی آمد پر سارے مجمع کو اُٹھا دیا، مولانا نے خلاف معمول سو (۱۰۰) روپے زکریا اور پچاس (۵۰) روپے مولانا اسعد اللہ صاحب ناظمِ مظاہر علوم کے لیے مرحمت فرمائے میں نے بہت ہی معذرت پر اصرار کیا، مگر مولانا نے حکماً فرمایا کہ اسے قبول کرنا ہوگا۔

شام کو ظہر کے بعد مولانا بنوری صاحب کے مدرسہ میں جانا ہوا، ناشتہ تو یہاں بھی بہت زور کا تھا، مگر زکریا نے عزیز محمد بنوری سے کہہ دیا تھا کہ صرف سادی چائے پیئوں گا، ناکارہ نے تو اپنی جگہ بیٹھے ہوئے چائے پی اور رفقاء نے تھوڑی دور پر ناشتہ کیا۔

دوسرے دن مفتی شفیع صاحب باوجود علالت کے خود بھی تشریف لائے، زکریا کی نکیر پر فرمایا کہ دل نہ مانا، زکریا اس دوران میں بار بار اصرار کرتا رہا کہ مجھے کراچی سے دہلی بھیج دو مگر قاضی صاحب پر اصرار کرتے ہوئے شرم آتی تھی، ویزے کی منسوخی جو مجھ تک تو نہیں پہنچا تھا، بھائی افضل کو ملا اسی وقت جناب الحاج فرید الدین صاحب نے (جو میرے پاکی سفروں میں بہت زیادہ اہتمام فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ بہت ہی زیادہ دارین میں بہترین صلہ عطاء فرمائے) ٹیلیفون کی بھرمار شروع کی اور جناب الحاج مفتی زین العابدین صاحب نے اور الحاج احمد شاہ صاحب نے رات ہی کو طیارہ سے اسلام آباد اور لاہور کے سفر شروع کیے اور اگلے دن شام تک ان سب حضرات کی مساعی جمیلہ سے رائے ونڈ کی اجازت ملی اور یہ ناکارہ بجائے منگل کے جمعہ کی صبح کو رائے ونڈ طیارہ سے گیا۔

بھائی احمد حسین قادری صاحب جو عرصہ سے پاکی جہازوں کے کیپٹن ہیں اور اتفاق سے مولانا محمد یوسف مرحوم کی معیت میں پہلی دفعہ ان سے ملاقات ہوئی تھی جب بھی اس ناکارہ کے پاکستان جانے کی خبر سنتے اُسی جہاز میں اپنی ڈیوٹی لگوا لیتے، وہ رات ہی امریکہ سے آئے تھے اور آج کا دن اُن کا فارغ تھا، مگر اُنہوں نے دوسرے کیپٹن سے بات کر کے ہمارے جہاز پر اپنی ڈیوٹی لگوالی اور خود ہمارے جہاز کو لے گئے، راستے میں انہوں نے تواضع کی کہ جہاز رانی کا معائنہ کریں، زکریا نے تو انکار کر دیا کہ مجھے کونسا جہاز چلانا ہے، مگر احسان اسماعیل، حبیب اللہ کے منہ میں پانی بھر آیا، میں نے بجائے اپنے ان کو بھیج دیا، انہوں نے خوب تفصیل سے دکھایا۔

رائے ونڈ میں کئی دن سے منگل کے پہنچنے کی خبر پر ہجوم جمع ہوتا جارہا تھا اور خوب جمع ہو گیا، وہاں پہنچنے کے بعد چار پانچ ڈاکٹر بھی ازراہِ شفقت و محبت میرے اوپر مسلط ہو گئے، ایکسرے کا سامان اور بجلی کا گھٹنوں کا علاج وغیرہ سب میرے کمرے کے پاس جمع ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ ان دوستون کو بہت جزائے خیر دے۔ ہر چند کہ میں اپنی عادت کے موافق شدت سے انکار کرتا رہا کہ سفر میں ایسے اہم علاج نہیں ہوا کرتے، مگران محبت کے پتلوں نے ازراہِ محبت یہ اصرار کیا کہ ڈاکٹر بھی سفر میں ساتھ رہیں گے اور ایک کار مستقل بجلی کے سامان کی اور تیری دواؤں کے سامان کی مستقل ساتھ رہے گی، مگر:

از قضا سر کنگبیں صفر انمود
روغن بادام خشکی می نمود

میرے امراض کہ جن کا سلسلہ کئی سال سے چل رہا ہے علاجات تو ڈاکٹری، یونانی، ہومیو پیتھک، مالش بھی کچھ دوستوں کی محبت سے ہورہے ہیں، مگر میری طرح سے جومرض بھی آتا ہے وہ ایسا عہدی بن کرآتا ہے کہ اُس سے اُٹھانہیں جاتا۔

چونکہ میرے سب دوستوں کو یہ بات معلوم تھی کہ میرے پاکستان پہنچنے کے بعد ڈھڈیاں کی حاضری سبھی کی نگاہ میں اہم ہے، میں نے تو یہ حالت دیکھ کر دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ زیادہ جہدوجہد نہ کریں مبادا یہاں کے حکام کو ناگوار گزرے، مگر دوستوں نے نہ معلوم کس کس ذرائع سے ڈھڈیاں کی بھی اجازت لے لی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ہماری روانگی کے بعد وہاں مرکز سے یہ حکم آیا تھا کہ رائے ونڈ کے علاوہ کسی دوسری جگہ کی اجازت نہ دی جائے جو ہماری روانگی ڈھڈیاں کے بعد پہنچا، اسی وجہ سے جن جگہوں کا ویزا حاصل تھا اُن میں جانا نہ ہوسکا، اسی وجہ سے ایبٹ آباد کا زیادہ قلق ہے کہ ابتدائی کوشش جوشعبان سے ہورہی تھی اور میرے ماموں مولوی داؤد کی کوشش سے ہورہی تھی وہ بھی رہ گیا اور قریشی صاحب کے حادثہ کے بعد سے پنڈی کا بھی تقاضا ہورہا تھا اور رائے ونڈ کے چند روزہ قیام میں قریشی صاحب مرحوم کی اہلیہ محترمہ مع صاحبزدگان اور ملک دین محمد صاحب اپنی علالت اور ضعف کے باوجود رائے ونڈ ہی رہے اور میرے ڈھڈیاں جانے پر دوستوں سے وعدہ اور اُمید لے کر پنڈی گئے تھے کہ ڈھڈیاں سے واپسی پر پنڈی کی اجازت بھی ان شاءاللہ تعالیٰ مل جائے گی مگر نہیں ہوسکی۔

ان ڈاکٹروں نے پانچ چھ جگہ سے خون لیا، سوکر اُٹھنے کے بعد، ناشتہ کے بعد، کھانے کے بعد، ہر وقت کا پیشاب بار بار جانچا، ایک خاص رگ کی تلاش میں کئی جگہ انجکشن لگائے مگر وہ نہ ملی، پانچ جگہ کے پیشاب کے بعد انہوں نے خون نکالا، پانچویں مرتبہ میں رگ ملی اور ڈیڑھ تولہ خون نکالا، اس کے بعد دفعۃً کپکپی شروع ہوگئی اور بہت شدت کے ساتھ بخار ہوگیا، سب پنکھے وغیرہ بند کردیئے گئے، مگر سردی نہ گئی، کمبل بھی دوتین اوڑھے، ایک گھنٹہ کے بعد بخار ۱۰۳ ڈگری زور کا ہوا،

اس کے ایک گھنٹہ کے بعد ۱۰۱ ہوا پھر ۹۹ ہوا۔ رات کے ایک بجے تک یہ ڈاکٹر حضرات مسلط رہے، خاص طور سے سعید رانا صاحب، بدھ کی صبح کو بخار تو نہیں تھا مگر ضعف بہت زیادہ تھا۔

یکم جولائی دوشنبہ کو رائے ونڈ کے مدرسہ عربی فارسی خاص طور سے قرآن کے مکتب کا معائنہ اور بچوں کا قرآن سننا، قرآنی مکتب کی بدنظمی کی شکایت پر ایک تحریر رجسٹر پر لکھی جس میں مولوی احسان کو تعلیم کا نگراں اور حاجی متین احمد صاحب ابن مخدوم رشید احمد صاحب مرحوم کو مالیات کا نگراں بنا کر میاں جی عبداللہ کے سامنے دونوں سے کہا کہ آج سے مدرسہ کی نگرانی میری ہے، تم دونوں حضرات ہر تیسرے ماہ تعلیمی رپورٹ بھیجتے رہو۔

پنجاب کی حکومت نے تو ایبٹ آباد کے علاوہ سب کی اجازت دے دی تھی مگر مرکز کی ممانعت کی وجہ سے جو بعد میں پہنچی مجبوری ہوگئی۔ ۶ جولائی شنبہ کے متعلق طے ہوگیا تھا کہ علی الصباح اپنی جماعت کر کے کاریں یکے بعد دیگرے روانہ ہوتی رہیں۔ اکٹھی نہ جائیں کہ خواہ مخواہ نگاہیں اٹھیں گی۔ لیکن رات کے بارہ بجے لاہور سے ٹیلیفون ملا کہ بھائی افضل کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ بھائی افضل نے تو اس پر اصرار کیا کہ میں ابھی لاہور جا کر گھر والوں کی تعزیت کر کے واپس آجاؤں اور سابقہ نظام باقی رہے، برادران تجہیز و تکفین کر لیں گے۔ مگر زکریا نے اس کو نہ مانا کہ میں نمازِ جنازہ پڑھ کر ڈھڈیاں جاؤں گا۔ اس لیے شنبہ کی صبح کو اپنی نمازیں پڑھ کر بجائے ڈھڈیاں کے لاہور روانگی ہوئی۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی افضل کے برادروں نے ۱۰ بجے نمازِ جنارہ کا اعلان کر رکھا ہے۔ اس لیے زکریا کے اصرار پر صبح کو جنازہ کی نماز زکریا، قاضی صاحب بھائی افضل وغیرہ نے الگ پڑھی اور دس بجے بقیہ برادران نے مجمع کے ساتھ سابقہ تجویز میں تو یہ تھا کہ اپنی نماز پڑھ کر ڈھڈیاں چلے جائیں گے تاکہ دھوپ سے پہلے پہلے پہنچ جائیں، مگر اس حادثہ کی وجہ سے لاہور سے چلنے میں تاخیر ہوئی۔ اس لیے زکریا نے یہ کہا کہ واپسی کا اندازہ معلوم نہیں کہ کیا ہو، دیر تو ہو ہی گئی ہے اس لیے ماموں شعیب اور عزیز مولوی ادریس کاندھلوی مرحوم سے بھی ملاقات کرتا جاؤں۔

ماموں شعیب نے تو (اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے) دھوپ کی وجہ سے جلدی ہی اجازت دیدی، مگر مولوی ادریس مرحوم نے اپنی قدیم عادت کے موافق بیجا اصرار شروع کیا کہ دھوپ اوپ کچھ نہیں اور جب زکریا نے اپنے رفقاء سے کہا کہ مجھے اٹھا کر کار میں بٹھا دو تو مرحوم بھی اپنے تلامذہ کی مدد سے میری کار کے برابر کیواڑ کھول کر زمین پر بیٹھ گیا جس سے نہ کیواڑ بند ہو سکے نہ کار آگے یا پیچھے ہوسکی۔ زکریا بار بار اصرار کرتا رہا کہ دھوپ ہو رہی ہے آپ تشریف لے جائیں ان کے خدام سے بھی کہا کہ مولانا ادریس کو اٹھا کر جاؤ، مگر وہ مولانا کی منشاء کے خلاف کیوں مانتے۔ اس

لیے زکریا نے اپنے رفقاء سے کہا کہ مولانا کو اٹھا کر ان کے کمرے میں بٹھا دو اور بس جا رہا ہوں تمہارا سڑک پر انتظار کروں گا۔ میرے چار پانچ رفقاء نے مولانا کو اٹھایا اور زکریا نے بھائی افضل سے کہا کہ جلدی چلو۔ دو فرلانگ آ کر سڑک پر کار روکی۔

عزیز ماموں داؤد ایبٹ آباد مجھے لے جانے کے لیے میرے لاہور پہنچنے سے پہلے سے مقیم تھے اور اخیر تک ساتھ رہے۔ ان کا ارادہ ڈھڈیاں جانے کا بھی تھا، مگر جمعہ کے دن ان کو ایبٹ آباد سے کوئی تار ملا جس کی وجہ سے ان کو ایبٹ آباد کسی عدالتی کام کی وجہ سے جانا ہو گیا اس لیے شنبہ کی صبح کو ان سے رخصت ہو کر ڈھڈیاں روانگی ہوئی۔

سابقہ تجویز تو یہ تھی کہ ۶ جولائی کو دس گیارہ بجے تک ان شاء اللہ تعالیٰ ڈھڈیاں پہنچ جائیں گے، مگر لاہور تاخیر ہوتی چلی گئی اور زکریا جو اس پر مصر تھا کہ راستہ میں کہیں ٹھہرنا نہیں ہوگا، مگر دھوپ اتنی تیز ہو گئی کہ دوران سر شروع ہو گیا اس لیے ۱۲ بجے جھاوریاں پہنچ کر زکریا تو لیٹ گیا۔ رفقاء نے کھانا کھایا اور قاضی صاحب نے جھاوریاں میں بہت اہتمام فرما رکھا تھا۔

مرد تو سارے کچھ لاہور سے ساتھ تھے اور کچھ ڈھڈیاں پہنچ گئے تھے مگر مردوں سے دس گنی زیادہ عورتیں ساری سڑک کو گھیرے کھڑی تھیں۔ بھائی افضل صاحب کار چلانے والے تھے اور وہ یہاں کے رگ ریشہ سے خوب واقف تھے، عورتوں کو ہٹاتے ہوئے مجھے پہنچا کر کیواڑ بند کر کے باہر چلے گئے۔ بعد میں قاضی صاحب وغیرہ کی کاریں پہنچتی رہیں۔

۴ بجے اٹھ کر زکریا نے ظہر پڑھی اور عورتوں کو بیعت کرایا اور عصر پڑھ کر مسجد پہنچا جہاں بڑا ہجوم تھا۔ مصافحہ ہوئے اور غروب سے آدھ گھنٹہ چل کر مغرب ڈھڈیاں میں پڑھی۔ یہاں کے قیام میں اہل الرائے کے مشورہ سے یہ طے ہو گیا تھا کہ دس جولائی بدھ کے دن یہاں سے چل کر ایک روز لاہور ٹھہر کر جمعہ کو دوبارہ کراچی اس لیے جانا پڑا۔ کہ جس جہاز کے ٹکٹ تھے اور پہلے سے طے تھا وہ لاہور سے سیدھا دہلی جاتا تھا، مگر افغانی حکومت نے بلا سابقہ اطلاع کے ایک دم اس جہاز کی روانگی ملتوی کر دی تھی جس کی وجہ میں مختلف آراء گھومتی رہیں۔ بہر حال ۱۰ جولائی کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر جھاوریاں ہوتے ہوئے روانگی ہوئی۔ زکریا نے احباب سے مشورہ کیا کہ سرگودھا حافظ صاحب کی خدمت میں جانا بہت ضروری ہے مگر سب کی رائے یہ ہوئی کہ سرگودھا کا ویزا ہے نہیں اور اس کو قادیانی مرکز اور فوجی مرکز ہونے کی وجہ سے اہمیت زیادہ ہے اس لیے شہر میں نہیں جانا چاہیے۔

بہر حال لائل پور ہوتے ہوئے کہ مفتی صاحب کی علالت کے علاوہ ابراہیم پہلوان کے کارخانے میں بھی جو شہر سے باہر ہے اس کے قدیم وجدید احسانات کی وجہ سے چند منٹ قیام کا وعدہ تھا اور پیشاب کا بھی تقاضا تھا، لاہور روانہ ہو گئے۔ مفتی صاحب کو کسی نے یہ غلط اطلاع

دے دی تھی کہ شام تک قیام رہے گا اس لیے انہوں نے کھانے کا بہت اہتمام اور لوگوں کو بھی مدعو کر رکھا تھا مگر وہاں چند منٹ ہی قیام رہا۔ ساڑھے دس بجے لاہور پہنچ گئے۔ مفتی صاحب کو اس غلط اطلاع کا بہت قلق رہا مگر یہ اطلاع ہم میں سے کسی کی طرف سے نہیں تھی لوگوں نے خود ہی تجویز کر کے اطلاع کر دی تھی۔

حاجی فریدالدین صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر دے کہ وہ رات ہی کو میرے اور رفقاء کے ٹکٹ لے کر کراچی روانہ ہو گئے تا کہ اتوار ۱۲ جولائی کے امریکن جہاز سے جو بہت بڑا تھا ٹکٹوں کی تبدیلی کرا دیں۔ یہ غالباً پہلے لکھوا چکا ہوں کہ میرا سابقہ ٹکٹ مدت گزرنے جانے کی وجہ سے بے کار ہو گیا تھا تو مکہ اور جدہ کے احباب کی تجویز پر کچھ پیسے زیادہ دے کر اس کو جدہ، کراچی اور لاہور، دھلی، بمبئی جدہ تک واپسی کا کرالیا تھا۔ حاجی فریدالدین صاحب جو کراچی سے ٹکٹ تبدیل کرائے وہ کراچی، دھلی، بمبئی، مدینہ، جدہ کے کرائے جو زائد پیسے تھے وہ ادا کیے اور یہ مصلحت بتائی کہ واپسی میں حج کا زمانہ ہوگا ہجوم بہت زیادہ ہوگا جو تیرے بس کی نہیں اور پس منظر یہ بھی تھا کہ دوبارہ کراچی آوے کئی ماہ سے ایک جہاز کراچی سے سیدھا مدینے آنے لگا جو جدہ نہیں جاتا۔

جمعرات کے دن صبح کو اولاً حاجی متین صاحب کے یہاں ناشتہ ہوا۔ پھر ماموں شعیب سے ملنے ان کے مکان پر گیا۔ ماموں محمد عمر صاحب نے کھانے پر بہت اصرار کیا کہ آج رات کو یا کل صبح کو، مگر زکریا نے عذر کر دیا، لیکن وہ شدید اصرار کرتے رہے البتہ ماموں شعیب صاحب نے اُن کو اصرار سے روک دیا، ۱۲ جولائی کو لاہور سے کراچی جانا ہوا، کیپٹن احمد حسین رات ہی فرانس سے آئے تھے، یہ اُن کی تعطیل کا دن تھا، مگر انہوں نے اپنی عادت کے موافق ساتھی سے دن مانگ لیا اور کراچی لے گئے، چونکہ نظام الدین میں پہلے سے جمعہ کو پہنچنے کی اطلاع تھی اس لیے تجویز یہ ہوا کہ مستقل آدمی بھیجنا چاہیے، اس لیے مولوی محمود افریقی کو جو مفتی صاحب کے مدرسہ میں تعلیم پا رہے ہیں خط دے کر نظام الدین بھیجا اس لیے کہ افریقہ والوں کے لیے ہندی ویزا کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

۳۰: ۱۰ بجے لاہور سے جہاز چلا اور ۱۲ بجے کراچی پہنچا اور جہاز پر حسب معمول جناب الحاج فریدالدین صاحب اپنی کار لے کر موجود تھے، وہ مجھے، مولوی احسان، حبیب اللہ اور اسماعیل کو لے کر مکی مسجد پہنچ گئے، ۱:۳۰ بجے جمعہ کی نماز پڑھی، حاجی فریدالدین صاحب نے ٹکٹوں کی تبدیلی اور پاسپورٹ وغیرہ کا اندراج کرایا پاکستان کے سفر کی تفصیلات عزیز احسان نے جو عزیز طلحہ کے نام ایک روزنامچہ لکھا تھا، اُس میں زکریا کے اس سفر میں جدہ میں بڑی گڑبڑ رہی اور کراچی میں بھی، جدہ میں تو مدت کی توسیع کے لیے ٹکٹ بھیجے گئے تھے انہوں نے تاخیر ہو جانے کی وجہ سے اس

کو جدہ تا کراچی تا لاہور تا دہلی تا بمبئی تا جدہ بنوایا، مگر لاہور کا جب جہاز بند ہوگیا اور دوبارہ کراچی جانا پڑا اور حاجی فرید الدین صاحب کو ٹکٹ اس لیے دیئے کہ ان کو کراچی تا دہلی بنوادیں تو انہوں نے ازراہِ شفقت بجائے کراچی تا دہلی تا بمبئی تا جدہ کے دھلی تا بمبئی تا کراچی تا مدینہ تا جدہ بنوا دیئے کہ چند ماہ سے کراچی سے ایک طیارہ سیدھا مدینہ منورہ آتا ہے جو جدہ وغیرہ نہیں جاتا اور مصلحت یہ بتائی کہ تیری واپسی کے وقت حجاج کا ہجوم بہت ہوگا جو تیرے بس کا نہیں، اس لیے واپسی میں بمبئی سے کراچی آجایئے، چند روز قیام کے بعد سیدھا مدینہ چلے جایئے اور حج کے بعد اسی ٹکٹ سے مکہ ہوآیئے۔

اس میں تو شک نہیں کہ میرے لیے اس طرح بہت سہولت تھی اور یہ ناکارہ چونکہ صورۃً حج کئی مرتبہ پہلے ادا کر چکا ہے اس لیے مکہ جانا ضروری بھی نہیں تھا مگر ٹانگوں کی معذوری کی وجہ سے ۴ رفقاء میرے ساتھ ضروری ہیں اور میری وجہ سے ان کا حج بھی خطرے میں پڑتا تھا، اگرچہ میرے رفقاء (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے) اس پر تیار تھے کہ سیدھے مدینہ جاویں اس لیے کہ وہ سب بھی حج کر چکے تھے مگر میری غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ میری وجہ سے دوسروں کے حج بھی ضائع ہوں، اس لیے واپسی میں بمبئی تا جدہ آنا ہوا، جس کی تفصیل تو اپنی جگہ پر آئے گی مگر ہارون مرحوم کے انتقال کے بعد ہمارے قاضی عبدالقادر صاحب کا (اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے) شدید اصرار تھا کہ میں رمضان ہی میں ہندوستان واپس جاؤں۔

ہر چند میں نے جلدی کا سبب پوچھا اور یہ رمضان کا سفر میرے بس کا نہیں، اس کے بعد شوال ذیقعدہ میں دہلی اور میوات کے بہت سے خطوط شدید تقاضے کہ پہنچے کہ ہارون مرحوم کے حادثہ کی وجہ سے تیرا آنا بہت ضروری ہے اور میں یہی جواب دیتا رہا کہ جو ہونا تھا ہوگیا میں آکر کیا کروں گا، تقاضے کی وجہ کسی نے نہیں لکھی، البتہ یہ سنتا رہا کہ کچھ حاسدین تبلیغ نے مرحوم کے حادثہ کو فتنہ بنانا چاہا مگر اللہ کے فضل سے نہ بن سکا، البتہ مولانا انعام الحسن صاحب کی بھی رائے مدینہ پاک میں ہوئی تھی کہ ہندوستان آنا ہو تو میوات کا ایک سفر بھی ضروری ہے اور یہ صحیح بھی تھا کہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کے دور میں تو بہت کثرت سے میوات جانا ہوتا تھا، چچا جان کا جب گرامی نامہ پہنچ جاتا کہ فلاں وقت میوات جانا ہے تو یہ ناکارہ تعمیل میں فوراً آجاتا، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ یہ ناکارہ دہلی پہنچا اور چچا جان نور اللہ مرقدہٗ نظام الدین سے دہلی اُسی وقت پہنچ گئے اور میوات سے واپسی پر سہارنپور پہنچ گئے، نظام الدین جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

عزیز مولانا یوسف مرحوم کے ابتدائی دور بھی تقسیم ہند تک دو تین ماہ میں ایک سفر ہو ہی جاتا تھا، مگر تقسیم کے بعد اول تو راستوں کے مخدوش ہوجانے کی وجہ سے دوسرے اس ناکارہ کے روز

افزوں امراض کی وجہ سے کالعدم سا ہو گیا تھا اس لیے یہ ناکارہ ۱۴ جولائی کو جب کہ کراچی سے دہلی پہنچا تو میں نے مولانا سے درخواست کی کہ آپ نے میوات کا سفر تجویز فرمایا تھا ایک ہفتہ اس کے لیے تجویز فرما دیجئے، اسی وقت مشورہ سے طے ہو گیا تھا کہ ۱۰ اگست کو میوات کا سفر ہے، میں تو جلدی چاہتا تھا مگر مولانا کی اور مولانا محمد عمر صاحب منشی بشیر صاحب وغیرہ کی رائے یہ ہوئی کہ ذرا تاخیر سے کیا جائے تا کہ ہم نظام بنا سکیں اور لوگوں کو اطلاع کر سکیں، اس لیے تاخیر کرنی پڑی اور ایک دن دہلی قیام کے بعد منگل ۱۶ جولائی کو علی الصباح براہ میرٹھ سہارنپور جانا ہوا کہ حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب کی اہلیہ کا انتقال ۱۲ محرم ۹۴ ھ کو ہو چکا تھا۔

قاری صاحب کی خدمت میں تعزیت کے لیے بھی حاضری ضروری تھی، نیز مولوی اسعد سلمہ سے بھی مدینہ پاک میں وعدہ ہو گیا تھا کہ سہارنپور جاتے ہوئے تمہارے جدید مکان میں تعمیل حکم میں حاضری دوں گا، اس لیے دیو بند حاضری پر اول حضرت قاری صاحب کے مکان پر بسلسلہ تعزیت حاضری ہوئی اور وہاں سے مزارات پر حاضری کے بعد مولانا اسعد صاحب کے مکان پر جانا ہوا، مولانا نے اس ناکارہ کے لیے خاص طور سے ثرید تیار کر رکھا تھا اور رفقاء کے لیے کھانا، انہیں کے مکان پر حضرت قدس سرہٗ کی اہلیہ محترمہ بھی آ گئی تھیں، ورنہ میرا خیال حضرت قدس سرہٗ کے مکان پر جانے کا تھا، وہاں زنانہ اور مردانہ میں اتنی دیر ہو گئی کہ ظہر کا وقت ہو گیا، مولانا ہی کے مکان پر ظہر پڑھ کر سہارنپور روانگی ہوئی۔

باوجودیکہ میں مدینہ پاک ہی سے احباب کو لکھوا رہا تھا کہ میری آمد پر کوئی صاحب سہارنپور نہ آویں، سہارنپور کا تبلیغی اجتماع وسطِ شعبان میں ہے اُسی وقت تشریف لے آویں ملاقات بھی ہو جاوے گی اجتماع میں شرکت بھی، میں نے تو سہولت کے لیے یہ تجویز کی تھی مگر کارآمد نہ ہوئی، ہجوم ہر سال سے زیادہ ملا، کئی دن لا تعد و لا تحصیٰ مجمع رہا، یہ دہلی سے اطلاع کرا دی تھی کہ سہارنپور میں ملاقات اور مصافحے دار جدید کی مسجد میں عصر کے بعد ہوں گے، دیو بند سے ظہر کے بعد چل کر اول مدرسہ قدیم کی مسجد میں حاضری ہوئی وہاں بھی مصافحوں کا ہجوم ہو گیا، وہاں سے فراغ پر دار جدید کی مسجد میں جانا ہوا اور مغرب تک بلکہ عشاء کے بعد گھر پر بھی ہجوم رہا، یہ سلسلہ تو کئی دن تک قائم رہا۔

۶ رجب کو عزیز مولوی عاقل سلمان سلمہ کی لڑکی کا عقیقہ ہوا، ۲۹ جولائی کو دو بجے دوپہر کو کوثر نیازی نے پاکستان سے آ کر اعلان کیا کہ شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس صاحب کا انتقال کل ۱۱:۳۰ شب میں ہو گیا، چونکہ قرب و جوار میں لوگ عزیز مولوی ادریس صاحب سے تو واقف نہیں تھے، شیخ الحدیث سے یہی ناکارہ مشہور تھا اس لیے شہر میں کہرام مچ گیا، تحقیقات کے واسطے جوق در جوق آدمی

زکریا کے مکان پر پہنچتے رہے اور باہر سے ٹیلیفون اور تاروں کی بھر مار ہوئی کہ زکریا کی خیریت سے مطلع کرو، مولوی انعام صاحب نے لکھا کہ نظام الدین میں بھی اس ناکارہ کی خیریت کے تار اور ٹیلیفون کثرت سے آئے۔

علی میاں اس ناکارہ سے ملنے کے لیے مع رفقاء ۲۷ رجب ۶ جولائی کو آئے اور شام کو دیوبند میں شوریٰ میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے، بدھ کے دن ظہر کے قریب واپس آئے، دیگر ممبران بھی زکریا سے ملاقات کے واسطے ظہر کے قریب پہنچے، زکریا نے قاضی زین العابدین صاحب پر اعتراض کیا کہ اور حضرات سے تو بے تکلفی نہیں مگر آپ سے بے تکلفی ہے اکابر کو مجمع کے ساتھ بے وقت پہنچنا جس میں مہمانوں کو دِقت ہو میزبانوں کو بھی آپ کی شان کے مناسب نہ تھا، انہوں نے فرمایا کہ اعتراض بالکل صحیح ہے مگر ہم ۹ بجے کے دیوبند سے چلے ہوئے ہیں، مدرسہ کی جیپ میں آئے تھے۔

سہارنپور پہنچ کر ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ ادھر کو چلو اُس نے کہا کہ آپ مجھے مدرسہ کا پتہ بتا رہے ہیں میں تو کثرت سے آتا رہتا ہوں اور وہ ان کو بجائے مظاہر علوم کے اسلامیہ اسکول لے گیا، اس لیے کہ جناب الحاج قاری طیب صاحب کی یہاں کثرت سے آمد ورفت ہوتی رہتی ہے اور جو ہم نے کہا کہ مظاہر علوم جانا ہے تو وہاں سے مظاہر کا راستہ نہ وہ جانتا تھا نہ ہم جانتے تھے اس لیے خوب چکر کاٹ کر پہنچے، علی میاں نے تو یہ کہہ کر مجھے تکان بہت ہوگئی ہے اگر زکریا کھانے پر بلاوے تب بھی نہ جگانا لیٹ لیے۔

اہلِ رائے پور کا علی میاں پر عرصہ سے اصرار تھا کہ دو تین دن کے لیے رائے پور آئیں علی میاں نے ان کو لکھا تھا کہ اس سفر میں رائے پور بھی آؤں گا اور دیوبند سے واپسی پر جمعرات علی الصباح رائے پور جانا شاہ مسعود صاحب سے طے ہوگیا تھا، چائے رائے پور جا کر پینی ہے مگر کار کے آنے میں دیر ہوئی اس لیے چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ۸ بجے کے قریب گئے، زکریا پر بھی چلنے کا اصرار کیا مگر زکریا نے عذر کر دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ حضرات آپ سے تخلیہ میں بات کرنا چاہتے ہیں اس وقت میں نہیں جاؤں گا، علی میاں کی سیٹیں چونکہ جمعہ کی شام کی ریزرو تھیں اس لیے جمعہ کی صبح کو واپس ہوئے اور بہت ہی متاثر واپس آئے اور زکریا پر بہت اصرار کیا کہ رائے پور کی حاضری میں کمی بالکل نہ آوے، بلکہ اضافہ ہو سکے تو اچھا ہے، بلکہ میری تمنا تو یہ ہے کہ رمضان تیرا رائے پور میں گزرے، مگر مجمع کی کثرت کی وجہ سے اس کی تو کوئی صورت ہے نہیں۔

علی میاں رائے پور کے حضرات سے یہ وعدہ کر کے آئے تھے کہ شوال میں زکریا کو ساتھ لے کر دو تین دن کے لیے آؤں گا، علی میاں نے یہ بھی کہا کہ اتنا زمانہ گزر گیا مگر انوار و برکات خوب

زوروں پر ہیں، مگر شوال میں علی میاں کو فرصت نہیں ہوئی، ذیقعدہ میں زکریا کی واپسی حجاز ہوگئی اس لیے اجتماعی حاضری نہ ہوسکی۔

اس سال حجاج پر تین تنگیاں عائد ہوئیں، نمبر ا ڈیک کے کرایہ میں پانچ سو کا اور فرسٹ میں پندرہ سو کا اضافہ ہوا، نمبر ۲ ایک سال سے سولہ سال تک بچوں کو لے جانے کی ممانعت ہوگئی، نمبر ۳ سعودی نے چونکہ کرنسی بڑھادی اس لیے پہلے دو ہزار میں تو سو ریال ملتے تھے اس سال دو ہزار چھ سو میں گیارسو ریال ملیں گے اور جس کے پاس اتنی رقم نہ ہو اُس کو جانے کی ممانعت ہے۔

۱۲ شعبان کو یکے بعد دیگرے دو برقیے پہنچے، نمبر ا مولوی یوسف تلی کا کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا، نمبر ۲ اہلیہ عبدالحفیظ مکی کی طرف سے کہ ہفتہ کی شب میں لڑکا پیدا ہوا مبارکباد، نمبر ۳، ۱۸، ۱۹ شعبان، ۶، ۷ ستمبر کی درمیانی شب میں وزیر اعظم بھٹو نے قادیانیوں کو اقلیت ماننے کا اعلان کردیا، مولانا بنوری نے لکھا کہ اعلان پر سارے پاکستان میں انتہائی خوشی منائی گئی کہ دکانوں پر مٹھائیاں ختم ہوگئیں، ہر محلّہ میں مستقل دیگیں تیار ہوئیں اور خوب جشن منے، ہر محلّہ میں مستقل شادیوں کا سا ہنگامہ ہو رہا تھا۔

۲۳ شعبان کی صبح کو مدرسہ قدیم کی مسجد میں ایک شخص نے مصلے پر پہنچ کر تکبیر کا تقاضا کیا، ہم لوگ سمجھے کہ اصل امام کہیں گیا ہوگا، مگر نماز اُس نے بہت بے تکی پڑھائی، کبھی بہت آہستہ کبھی خوب جہر سے، زکریا نے نماز کے بعد اُس کو بلوایا تو ننگے پاؤں باہر بھاگ گیا معلوم ہوا کہ کوئی دیہات کا رہنے والا مدرسہ کا قدیم طالب علم جس کا پہلے بھی دماغ خراب ہوکر گھر چلا گیا تھا کئی دن سے آیا ہوا تھا، مفتی عبدالقیوم صاحب کے فتوے پر نماز کا اعادہ کیا گیا کہ اس کی پاکی ناپاکی کا حال معلوم نہیں۔

سفرِ میوات

اس کے بعد دہلی کے قرارداد کے موافق ۱۰ اگست کی صبح کو بھائی کرامت کی گاڑی میں کہ مولانا انعام صاحب اسی میں شب شنبہ میں سہارنپور پہنچ گئے تھے، زکریا نے تو بڑے زور سے بابو جی سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ جیپ لے کر آدیں کہ بارش کا موسم تھا کہ راستہ میں تھانہ بھون اور جھنجھانہ بھی حاضری کا خیال تھا، لیکن بھائی کرامت کے اصرار پر یہ ناکارہ اُن کی گاڑی میں اور بقیہ رفقاء بابو جی کی گاڑی میں ۵:۳۰ بجے سہارنپور سے چل کر ۸ بجے کاندھلہ پہنچے اس لیے کہ بارش بہت ہو رہی تھی، خیال یہ تھا کہ آدھ گھنٹہ کاندھلہ ٹھہر کر ۱۱ بجے تک دہلی پہنچ جائیں گے مگر صوفی افتخار نے کہا کہ میں کھانے کا انتظام کرچکا ہوں اور خیال یہ تھا کہ ۱۲ بجے تک پہنچو گے اور لوگوں کو بھی مدعو کرچکا ہوں، اس لیے ٹھہرنا پڑا۔

ہندوستان میں اس زمانہ میں بجلی کی گڑبڑ ہورہی تھی، کئی کئی گھنٹے بند رہتی تھی اور کاندھلہ تو قصبہ تھا اس لیے ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی بجلی بند ہوچکی تھی، مگر بابو سعید صاحب کاندھلہ نے بجلی گھر پر پرچہ بھیجا کہ میرے بہت معزز مہمان آئے ہوئے ہیں اس لیے ۱۱ بجے تک بند نہ ہو، چنانچہ فوراً بجلی جاری ہوگئی اور ۱۱ بجے بند ہوگئی، مگر موصوف نے دوبارہ پرچہ بھیجا لہٰذا پھر دوبارہ جاری ہوگئی۔

شنبہ کا دن کاندھلہ میں پینٹھ کا ہوتا ہے مگر بارش کی کثرت کی وجہ سے راستہ صاف تھا، عزیز ابرار سلمہ سے یہ طے ہوگیا تھا کہ چند منٹ تمہارے باغ میں ٹھہرنا ہے بشرطیکہ تم زور شور نہ باندھو، انہوں نے تو اپنی شرط کو پورا نہ کیا مگر بارش نے اتنا زور باندھا کہ عزیز موصوف کی دعوت ناقص رہ گئی، زکریا تو اپنی کار سے اُترا نہیں بقیہ رفقاء نے اُتر کر کھایا عزیز ابرار سلمہ کی ہمشیرہ کی سسرال کے معززین بھی مدعو کیے گئے تھے مگر ان سے بھی کار ہی میں بیٹھے بیٹھے مصافحے ہوئے اور پون بجے وہاں سے چل کر ۲:۳۰ بجے نظام الدین پہنچے اور ظہر کی نماز پڑھ کر زکریا تو لیٹ گیا، رفقاء نے کھانا کھایا۔

یکشنبہ کی صبح کو اپنی جماعت کر کے قطب صاحب ایک گھنٹہ ٹھہرتے ہوئے نمبردار محراب کی قبر پر جو فیروز پور نمک میں مرحوم کی وصیت سے لبِ سڑک بنائی گئی ہے تاکہ اکابر نظام الدین میوات کے سفر میں تھوڑی دیر یہاں ٹھہرتے جائیں، وہاں کے لوگوں نے بہت انتظام کر رکھا تھا، زکریا تو کار ہی میں رہا مگر مولانا انعام صاحب نے تقریر شروع کر دی دعائیں اور نصیحتوں کے بعد ۹:۳۰ بجے مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح میں پہنچ گئے، عصر کے وقت پنڈال میں اجتماع تجویز تھا، کچھ دیر بعد زکریا کو بھی بُلایا گیا، وہاں تقاریر پر تشکیل وغیرہ ہوئی۔

واپسی پر چوہدری طیب صاحب کے اصرار پر اُن کے اسکول کے ایک کمرے کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور مغرب کے بعد سے پھر طویل اجتماع شروع ہوا، پیر کی صبح کو ۱۰ بجے تک جماعتوں کی روانگی مصافحے ہوئے اور فراغ کے بعد کامیڈا کے لیے روانہ ہوئے، ہجوم نوح میں بھی کافی تھا اور کامیڈا میں اضعافاً مضاعفاً ہوگیا، وہاں ۲۴ گھنٹے تقاریر پر تشکیل وغیرہ ہوتی رہیں اور منگل ۱۳ اگست کی صبح کو جماعتوں کی روانگی سے نمٹ کر ایک بجے کھانے اور نماز سے فراغ پر سنگھار کے لیے روانہ ہوگئے، راستہ میں شاہ چوکھے کے مدرسہ میں ٹھہرتے ہوئے ۳ بجے سنگھار پہنچے۔

یہاں تو اتنا ہجوم تھا کہ دو فرلانگ پہلے ہی سے ہجوم شروع ہوگیا، زکریا نے تو واپسی شروع کر دی مگر عزیز مولوی اظہار سلمہ کے شدید اصرار پر قیام کا ارادہ کرنا پڑا اور اچھا ہی ہوا، بعد میں معلوم ہوا کہ زکریا کے واپسی کے ارادہ پر کئی سو آدمی سڑک پر لیٹ گئے کہ کار واپس نہیں جانے دیں گے، بدھ کے دن تین بجے طعام اور نماز سے فراغت پر واپسی ہوئی اور آدھ گھنٹہ سرائے کے مدرسہ پر

قیام ہوا، ۳ بجے کے قریب نظام الدین پہنچے۔

زکریا کا ارادہ پہلے سے تو جمعرات ہی کو سہارنپور واپسی کا تھا جس کی زیادہ اہمیت عزیز ابو الحسن کی وجہ سے تھی کہ اس کی رخصت جمعرات تک کی تھی، مگر اتوار کے دن مولانا انعام الحسن صاحب کو گلاؤٹھی کے اجتماع میں جانا تھا اس لیے زکریا نے بھی شرکت کا ارادہ کرلیا اور ابوالحسن کو واپس کر دیا۔

۱۵ اگست کو مہندیوں میں جانا تجویز تھا، مگر معلوم ہوا کہ یوم آزادی ہے، سارے راستے بند ہیں، لیکن بھائی کرامت کا ڈرائیور گاڑی کو نکال کر لے ہی گیا، بعد میں زکریا کی رائے اور خود مولانا انعام صاحب کی رائے بھی گلاؤٹھی کی نہیں ہوئی، لیکن سابقہ تجویز کی بناء پر اتوار تک دہلی قیام رہا۔

اتوار ۲۸ اگست کی صبح کو بھائی کرامت کی گاڑی میں زکریا سہارنپور روانہ ہو گیا سہارنپور واپسی پر معلوم ہوا کہ مولانا یونس صاحب نے بخاری کا ختم روک رکھا ہے اس لیے حسب سابق دوشنبہ کی صبح کو ۹:۳۰ پر زکریا اور ناظم صاحب بھی پہنچ گئے، معلوم ہوا کہ ایک حدیث روک رکھی ہے، عبارت تو خود مولانا نے پڑھی، دعاء کے بعد زکریا اور ناظم صاحب تو واپس آ گئے، اس کے بعد مولوی یونس صاحب نے سبق ختم کرایا، دعاء مولوی وقار صاحب نے کرائی اور اس کے بعد ناظم صاحب نے کچھ طلبہ کو نصائح فرمائے۔

سہارنپور کے تبلیغی اجتماع کی تاریخ کئی ماہ پہلے سے ۳۱ اگست تا ۲ ستمبر طے شدہ تھی، سہارنپور میں اسلامی شفاخانہ کی بنیاد دو (۲) سال پہلے زکریا نے ہی رکھی تھی، اس سال اس کی جدید تعمیر کے سنگِ بنیاد پر بھی بہت اصرار ہوا، اول تو زکریا نے بہت معذرت کی مگر جناب حکیم عبدالخالق صاحب کے اصرار کی وجہ سے کہ ان کے احسانات مدرسہ پر بہت ہیں قبول کرنا پڑا، ۲۵ اگست کو اس کا سنگِ بنیاد زکریا نے بمعیت ناظم صاحب مدرسہ رکھا، یہ اُن لوگوں نے احسان کیا کہ ہم دونوں کو جلدی واپس کر دیا اور ان کے جلسہ کی کاروائی شام تک ہوتی رہی۔

......☆☆☆☆☆......

اجتماعِ سہارنپور ۱۳۹۴ھ

سہارنپور کا تبلیغی اجتماع عزیز مولانا یوسف صاحب مرحوم کے زمانہ سے اسلامیہ اسکول میں ہوتا چلا آتا ہے اور کسی سال ملتوی بھی ہو جاتا ہے، اس مرتبہ کئی ماہ پہلے سے اجتماع کی تاریخیں ۳۱ اگست تا ۲ ستمبر طے شدہ تھیں، اس اجتماع کے درمیان میں عزیز مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا انعام الحسن صاحب سلمہ کا معمول یہ رہا اور ہے کہ اجتماع کے دنوں میں وہ گھر بھی نہیں آتے، اسکول ہی میں شب و روز قیام رہتا ہے، اجتماع سے فارغ ہو کر گھر آیا کرتے ہیں اور یہ ناکارہ بھی یہ تین دن اسکول ہی میں شب و روز گزارتا ہے جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا، کئی ماہ پہلے سے زکریا مدینہ منورہ سے احباب کو جو میرے ہند پہنچنے کی تاریخیں معلوم کرتے تھے، یہی لکھتا رہا کہ میری آمد پر دہلی یا سہارنپور کا ارادہ نہ کریں، اجتماع کے موقع پر آئیں کہ ملاقات بھی ہو جائے گی اور اجتماع میں شرکت بھی ہو جائے گی۔

اس کی وجہ سے آمد کے موقع پر تو کچھ کمی نہ ہوئی لیکن اجتماع کے موقع پر اضعافاً مضاعفاً مجمع بڑھ گیا، زکریا کے کمرے کو ایسا بُری طرح گھیرا کہ ہر وقت کیواڑ بند رکھنے پڑے، ہر چند لوگوں کو سمجھایا جاتا کہ اجتماع گاہ میں جائیں اور حسبِ نظام الاوقات صبح کو بھی زکریا پنڈال میں رہے گا اور عشاء کے بعد بھی وہیں آپ حضرات بھی تشریف رکھیں اور مصافحے اجتماع کے ختم پر ایک دفعہ ہی ہوں گے، اس پر بھی نے زور دیا، سمجھایا مگر ہجوم نے ایسا گھیراؤ کیا کہ اسکول کے کیواڑ ٹوٹنے کا بھی ڈر ہو گیا۔

پہلی رات کو ۱۲ بجے مولانا انعام صاحب نے کہا کہ ہم لوگوں کے سونے میں تو کوئی دقت نہیں مگر تو تو باہر نہیں سو سکتا اس لیے رات کو ۱۲ بجے بند کار میں مکان پہنچنا ہوا، دوسری رات کو بھی یہی ہوا، اجتماع تو صبح کی نماز کے بعد سے ہی شروع ہو جاتا تھا مگر متفرق تقاریر ہوئی تھیں اور ۸ بجے ناشتہ کے لیے حسبِ دستور سابق وقت دیا جاتا تھا اور ۹ بجے سے اصل اجتماع شروع ہوتا تھا اس لیے زکریا دونوں راتوں میں یہ طے کرآیا تھا کہ صبح کو ۹ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔

چونکہ کاریں بہت تھیں اور صبح کا وقت خالی تھا اس لیے مولوی انعام صاحب سے یہ طے ہو گیا تھا کہ میں صبح کی نماز پڑھ کر گنگوہ پہنچ جاؤں گا اور آپ بھی موقع پا کر پہنچ جائیں واپسی ساتھ ہو جاوے گی اور دوسرے دن یہی صورت رائے پور کے متعلق طے ہوئی، زکریا بابو جی کی گاڑی میں یک شنبہ کو گنگوہ اور دوشنبہ کو رائے پور حاضر ہوا مولانا انعام صاحب بھی متعدد کاروں کے ساتھ گنگوہ پہنچ

گئے اور رائے پور کے دن تو اذان ہی کے وقت مدرسہ پہنچ گئے اور چونکہ کاریں بہت سی تھیں، اس لیے جو بھی ستتا رہا گنگوہ یا رائے پور پہنچتا رہا۔

حاجی غلام رسول صاحب کو مدینہ سے زکریا نے لکھ دیا تھا کہ وہ آمد کے موقع پر نہ آئیں، اجتماع میں آئیں، وہ تقریباً سو (۱۰۰) نفر کے ساتھ پنجشنبہ کی شب میں سہارنپور پہنچ گئے۔

اجتماع تو شنبہ کی شب سے شروع ہو گیا تھا لیکن مولانا انعام صاحب وغیرہ حضرات شنبہ کو دس (۱۰) بجے پہنچے، زکریا نے حکماً کہا کھانا کھا کر یہیں سو جاؤ، عصر پڑھ کر چلے جانا، میں بھی اسی وقت چلا جاؤں، حاجی غلام رسول کے علاوہ ۳۰۰ نفر بنگال کے پہنچے اور اسی طرح بہار، گجرات وغیرہ کا مجمع **لا تعد و لا تحصیٰ** پہنچتا رہا۔

اتوار کی صبح کو افضال صابری کے بھائی کا نکاح تھا جس کا پہلے سے زکریا پر اصرار تھا، زکریا نے اجتماع پر طے کر دیا تھا، اس لیے گنگوہ سے واپسی پر زکریا تو سیدھا پنڈال پہنچ گیا اور مولانا انعام صاحب سے کہہ دیا کہ آپ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر آویں، مگر ان حضرات کے آنے میں تاخیر ہوئی، عزیز ابوالحسن نے بار بار ٹیلیفون بھی کیے، ۱۱ بجے کے قریب آئے، اُسی وقت مہرِ فاطمی پر نکاح ہوا۔

قاری طیب صاحب ہمیشہ کے معمول کے خلاف اس اجتماع میں شریک نہ ہو سکے جس کا قلق رہا، جب قاری صاحب کو ابتدائی دعوت نامہ گیا تھا اُس وقت تو قاری صاحب طویل سفر میں تھے، اتوار کے دن ظہر کے بعد قاری صاحب کی تشریف آوری کا حال معلوم ہوا اُسی وقت آدمی بھیجا گیا مگر چونکہ وقت تھوڑا تھا اور شام ہی کو جلسہ کا اختتام تھا اور پیر کی صبح کو جماعتوں کی روانگی، ہدایات اور مصافحے تھے، اس لیے شرکت نہ ہو سکی جس کا بہت قلق ہے۔

زکریا مجمع کے مصافحے سے یہ کہہ کر انکار کر رہا تھا کہ جلسہ کے اختتام پر جماعتوں کے ساتھ ہوگا لیکن جب مصافحوں کا وقت شروع ہوا تو ہجوم سے اسلامیہ اسکول کا سارا میدان لبریز تھا، اس لیے مصافحوں پر قابو نہ پا سکے، سبھی نے مقامی اور منتظم جلسہ نے آدھ گھنٹے تک زور باندھا، لوگوں کو سمجھایا مگر پنڈال کے بھی گر جانے کا ڈر ہوا۔

اس لیے مولانا انعام صاحب نے تجویز کیا تو بند کار میں چپکے سے بیٹھ کر مدرسہ چلا جا، بہت مشکل سے نیچے کو جھکے جھکے کار میں بیٹھ کر زکریا تو چلا گیا اس کے بعد مولانا انعام صاحب نے بہت اطمینان سے مصافحے کیے، جماعتوں کو روانہ کیا اور مغرب کے قریب مدرسہ پہنچے اور منگل کی صبح کو وہ حضرات مع مستورات دہلی کے لیے ۸ بجے روانہ ہو گئے۔

حاجی غلام رسول کے رفقاء تو منگل ہی سے جانے شروع ہو گئے مگر وہ مع اپنے مخصوص رفقاء کے

جوتقریباً ۳۰ تھے، جمعرات کے دن روانہ ہوگئے، اجتماع کی تفاصیل زکریا کے روزنامچہ میں تفصیل سے ہیں، یہ مختصر رسالہ اس کا متحمل نہیں ہے۔

رمضان ۱۳۹۴ھ

اس ناکارہ کے پاس احباب کے رمضان گزارنے کا سلسلہ تو تقریباً تیس چالیس سال سے ہے، شروع میں تو دس بارہ آدمی ہوتے تھے اور اس ناکارہ کا معمول یہ تھا کہ رمضان کے چند روز ان مہمانوں کو اپنے پاس رکھ کر رائے پور حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں رمضان گزارنے کے واسطے بھیج دیتا اور ایک پرچہ بھی لکھ دیتا کہ ان کو حضرت کی خدمت میں رمضان گزارنے کے واسطے بھیج رہا ہوں اس کی وجہ سے حضرت قدس سرہٗ کی توجہات عالیہ میرے مہمانوں پر خصوصی رہتیں، اس میں مولوی عبداللہ کرسوی کے رفقاء خاص طور سے بہت قدیم آنے والوں میں تھے اور کئی رمضان انہوں نے رائے پور ہی میں گذارے، بعض لوگوں کی حالت بہت اچھی ہوئی اور حضرت قدس سرہٗ کی توجہات سے اور بھی زیادہ پرواز کرتے مگر وہاں کے بعض مقیمین حضرات نے میرے بعض مہمانوں سے یہ کہ دیا کہ تمہیں اب تک شیخ نے اجازت کیوں نہیں دی، یہ چیز ان بیچاروں کے لیے سم قاتل بن گئی کہ وہ اپنے کو کچھ سمجھنے لگے اس فن کا مسلم اصول یہ ہے کہ جب تک آدمی اپنے کو ناکارہ و نااہل سمجھتا رہے تو کامیاب ہے اور جب اپنے کو اہل سمجھنے لگے تو ناکام ہے، مجھے اپنے اکابر کے خدام اور دوستوں میں بہت سوں پر اس کا تجربہ ہوا، اس نابکار کو میرے حضرت قدس سرہٗ نے ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں اجازت دی تھی، مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے بلا کسی توریہ اور مبالغہ کے حضرت اقدس رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کے پاؤں پکڑے تھے کہ ہندوستان میں اس کا ذکر مت کیجئے گا مگر حضرت نے فرمادیا کہ میں تو ضرور کروں گا اور وہیں سے لکھنا شروع کردیا۔

یہاں آنے کے بعد ایک عرصہ تک بیعت کی ہمت نہیں پڑی، شاید آپ بیتی میں کہیں اس کا ذکر آگیا کہ چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کی ڈانٹ پر بلکہ شدید عتاب پر شروع کی، اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام اور حضرات رائے پوری نور اللہ مرقدھما کی خدمت میں بار بار عرض کیا کہ میری نااہلیت کے پیش نظر آپ حضرات میں سے کوئی بیعت منع کردے تو میرے لیے گنجائش نکل آئے مگر ہر مرتبہ ان حضرات نے اُلٹا مجھے ہی ڈانٹ دیا، اس وقت تو مجھے حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا ایک فقرہ یاد آگیا کہ میری درخواست پر حضرت نے نہایت غصہ میں فرمایا تھا ''اپنے کو اہل سمجھ کر کون بیعت کرتا

ہے، جو اپنے کو اہل سمجھے وہ نااہل ہے'' کامیاب وہی ہے جو اپنے کو نااہل سمجھتا رہے۔
مضمون تو یہ بہت اہم ہے اور لکھنے کے قابل، مگر غیر متعلقہ ہے اس وقت تو صرف اتنے ہی پر تنبیہ کافی ہے کہ اس لائن میں جو شخص بھی اپنے کو کسی قابل سمجھنے لگتا ہے وہ بجائے ترقی کے تنزل کی طرف چلنے لگتا ہے۔
بہرحال لکھ تو یہ رہا تھا کہ میرے بعض دوستوں کی ترقی اس سے رک گئی، اس کے علاوہ ہر سال مجمع بھی بڑھنا شروع ہو گیا اس لیے رائے پور بھیجنے کا مستقل اہتمام تو چھوٹ گیا کہ حضرت قدس سرۂ کے بھی رمضان پاکستان وغیرہ میں ہونے لگے، ۱۳۸۲ھ سے حضرت رائے پوری قدس سرۂ کے وصال کی وجہ سے مجمع میں اضافہ شروع ہو گیا، ۱۳۸۴ء میں تو مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیت کا اعتکاف چھوڑ کر ۵ انفر سہارنپور پہنچے مگر یہاں جگہ نہیں تھی، ان بیچاروں کا اعتکاف بھی رہ گیا، اللہ تعالیٰ اجر عطاء فرمائے، زکریا نے اس سال پورے ماہ کا اعتکاف مدرسہ قدیم کی مسجد میں کیا تھا اس وجہ سے جگہ کی اور بھی تنگی ہو گئی، اس لیے ۱۳۸۵ھ سے دارالطلبہ جدید کی مسجد میں رمضان گذارنا شروع کیا، وہاں بھی ہر سال مجمع بڑھتا ہی چلا گیا، چنانچہ اس سال ۴۰ نفر معتکف تھے اخیر میں ۲۰۰ تک مقدار پہنچ گئی۔
۱۳۸۶ء میں معتکفین ۲۰۰ تک شروع ہی سے ہو گئے، ۱۳۸۷ھ میں تقریباً ۵۰ نفر کو یہ کہہ کر انکار کرنا پڑا کہ مسجد میں جگہ نہیں رہی، دارالطلبہ جدید میں خیمے لگانے پڑے طلبہ کے حجرے خالی تھے اُن میں مہمانوں کو ٹھہرانا شروع کیا۔
۱۳۸۹ میں تو اس ناکارہ کا حرمین شریفین میں رمضان گزرا، حرمین شریفین کے رمضان کا معمول یہ ہے کہ نصف اول مکہ مکرمہ میں تاکہ عمرات فی رمضان ہو جائیں ''**عمرة فی رمضان تعدل حجة معی**'' اور نصف آخر مدینہ منورہ میں تاکہ مسجد نبوی میں اعتکاف نصیب ہو جائے۔
چونکہ ۱۳۹۳ھ کا رمضان بھی اس ناکارہ کا حرمین شریفین میں گزرا تھا اس لیے احباب کا اندازہ یہ تھا کہ ۱۳۹۴ھ میں مجمع بہت ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا ۱۳۹۳ھ ہی سے احباب نے زکریا پر یہ زور دینا شروع کیا تھا کہ دارالطلبہ جدید کی مسجد دو منزلی ہو جائے تو معتکفین کو سہولت ہو مگر زکریا عذر کر دیتا تھا کہ میری زندگی کتنے دن کی ہے۔
چونکہ ۱۳۹۳ھ میں اہلِ مدرسہ نے بھی زکریا پر زور دینا شروع کیا کہ مدرسہ کی ضرورت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دارِ جدید کی مسجد دو منزلی ہو جائے کہ طلبہ ہر سال بڑھتے جاتے ہیں اور اس وقت چونکہ احباب کا خود اصرار ہو رہا ہے اس لیے مسجد کے بننے میں سہولت رہے گی، زکریا نے بھی خوب خیال کیا کہ واقعی مدرسہ کی ضرورت تو بڑھے گی ہی اس لیے زکریا نے منظوری دے دی اور احباب

نے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے) چند ماہ میں دار الطلبہ جدید کی مسجد کو دو منزلی بنوا دیا۔ مگر چونکہ گزشتہ سال زکریا کا رمضان سہارنپور نہیں ہوا تھا، اس لیے مجمع اندازہ سے زیادہ بڑھ گیا اور دو منزلی مسجد بھی معتکفین کے لیے کافی نہیں ہوئی، جتنے مسجد کے دونوں حصوں میں آسکے، اُن کا اعتکاف ہوا باقی مہمانوں کے لیے دار الطلبہ جدید کے حجرے خالی کرائے گئے کہ طلبہ اپنے گھر جانے والے تھے، اُن کا سامان ایک حجرے میں منتقل کیا اور جو رمضان سہارنپور گزارنے والے تھے اُن کو ایک ماہ کے لیے دار الطلبہ قدیم میں منتقل کیا، شروع رمضان میں آٹھ نو سو کا اندازہ تھا اور اخیر رمضان میں عزیز مولوی نصیر الدین نے کہا کہ آج ۱۸ سو مہمان ہیں، اجتماع میں جو لوگ آئے تھے اُن میں سے بھی ۳۰، ۴۰ کے قریب رمضان گزارنے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔

اس ناکارہ کا اصل مذاق پہلے کہیں گزر چکا ہے کہ انتہائی یکسوئی کا ہے۔ جس کو حکیم طیب مرحوم کے الفاظ میں کہیں پہ نقل کرا چکا ہوں کہ ''بھائی جی رمضان سب کے یہاں آوے مگر بخار کی طرح سے نہیں آتا'' مگر اپنے ذوق اور طبیعت کے خلاف موجودہ دور کے اکابر اور احباب کے اصرار پر یہ ہجوم گوارا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیشہ سے اس کی کوشش رہتی ہے کہ اگر خدانخواستہ کچھ اپنے کو معمولی نقصان بھی پہنچ جائے اور دوسرے کو اس سے زیادہ نفع پہنچ جائے تو اسے برداشت کر لینا چاہیے۔

اس روز افزوں ہجوم کی کمی کے سلسلہ میں تو کئی سال سے اپنے مخلصین مولانا منور حسین صاحب، مفتی محمود حسن صاحب، بھائی جمیل صاحب حیدرآبادی جو پورا رمضان وہاں گزارتے ہیں یا رمضان میں آمد کا خاص طور سے اہتمام کرتے ہیں۔

جیسے مولانا یوسف مرحوم مولانا انعام الحسن صاحب سلمہ، علی میاں مولانا منظور احمد صاحب نعمانی وغیرہ سے ہر سال مشورہ بار بار ہوتا رہتا ہے، مگر یہ حضرات اس مجمع کی زیادتی کو لوگوں کے لیے مفید بتاتے ہیں۔ گو ان میں بہت سے لوگ غیر متعلق بھی آجاتے ہیں اس ناکارہ کو کام کرنے والوں کی آمد پر تو زیادہ گرانی نہیں ہوتی، چاہے اس سے بھی بڑھ جائیں بشرطیکہ وہ رمضان کو نہایت یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رکھیں۔

لیکن ایسے لوگ جو محض تفریحاً رمضان گزارنے آتے ہیں یا مدارس کے وہ طلبہ جن کے کھانے رمضان میں بند ہو جائیں اور ان کو دوسرے سال کسی دوسرے مدرسہ میں منتقل ہونا ہو اور تعطیل کے یہ ایام یہاں گزار دینا چاہتے ہوں، ایسوں کی آمد گراں گزرتی ہے۔ اس ناکارہ کے یہاں ماہ مبارک میں کھانے پر کوئی پابندی نہیں لیکن بلا مجبوری کسی سے بات کرنا بدترین جرم ہے۔ اسی لیے جب میرے کان میں کسی کے متعلق یہ پڑتا ہے کہ وہ باتیں کرتا ہے تو ایک دو دفعہ کی تنبیہ کے بعد اس سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کہیں دوسری جگہ رمضان گزاریں۔

بعض احباب نے یہ مشورہ دیا کہ مدارس کے مدرسین کے علاوہ کو آنے کی اجازت نہیں دے جائے۔ مدرسین کو تو یہ مجبوری ہے کہ سال بھر ان کو اپنے مدارس کی وجہ سے آنے کا وقت نہیں ملتا مگر دوسرے لوگ تو دوسرے وقت بھی آسکتے ہیں لیکن اس ناکارہ نے اس کو کبھی قبول نہیں کیا کہ مجھے بھی دوستوں سے یکسوئی سے ملنے کا وقت رمضان ہی میں ملتا ہے اور بھی بہت سی تجویزیں احباب ہر سال پیش کرتے رہتے ہیں مگر اس ہجوم کی تقلیل کی کوئی ایسی صورت اب تک قابو میں نہیں آئی۔

بعض مخلصین کا یہ اصرار ہے کہ بعض اکابر کی طرح رمضان میں کھانے کا انتظام اپنے ذمہ نہ رکھا جائے۔ یہ تو ظاہر ہے ایسی صورت میں مجمع کی قلت بہت ہو جائے گی مگر اس میں ان لوگوں کا بہت حرج ہے کہ جو واقعی کام کرنے کی نیت سے آتے ہیں کہ ان کو سحر وافطار کے انتظام میں وقت بہت ضائع کرنا پڑے گا۔ ماہِ مبارک بہت ہی قیمتی زمانہ ہے کاش میرے دوست اس کی اہمیت کو پہچانیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی کوشش کریں کہ اس کی برکات سال بھر تک رہتی ہیں۔

حضرت قطب الارشاد قطب عالم گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کا تو دور میرے بہت بچپن کا تھا اس کا تو خواب سا نقشہ یاد ہے مگر اس کا خاکہ بڑے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے دور میں خوب دیکھا۔ چار سو سے زیادہ مجمع ہوتا تھا اور حضرت قدس سرہٗ کے یہاں مجلس میں حاضری کا کوئی وقت نہیں تھا، جب حضرت قدس سرہٗ مسجد میں نماز کے لیے جاتے تھے تو ہر شخص اپنی اپنی جگہ کھڑا ہوا مجسمہ دیوار بنا ہوا سراپا اشتیاق زیارت کر لیتا تھا، اس کے علاوہ نہ آپس کا ملنا جُلنا نہ بات چیت، مہمانداری حضرت قدس سرہٗ کے یہاں تھی مگر افطار ہو یا سحر ایسا خاموشی سے سب حضرات کھانے پینے سے چائے اور افطار سے ایسی فراغت پاتے تھے کہ شور وشغب کی آواز اس وقت بھی کان میں نہیں پڑتی تھی۔

جب سے اس ناکارہ کا رمضان دار جدید میں منتقل ہوا ہے تراویح میں ۳ پارے روز سننے کا معمول ہے تا کہ ہر عشرہ میں ایک قرآن ہو سکے اور جو لوگ ایک عشرہ کے لیے آتے ہیں اُن کا قرآن ناقص نہ رہے، میرا تراویح کا مستقل امام عزیز سلمان سلمہ جو ماشاء اللہ بہت اچھا پڑھتا ہے اور یاد بھی خوب ہے اور نمازی اس سے خوش بھی خوب ہیں، لیکن ایک قرآن بعض وجوہ سے کوئی دوسرا بھی پڑھ دیتا ہے، ۱۳۹۱ھ میں حضرت ناظم صاحب کے حکم سے پہلا قرآن قاری احمد گورا مدرس تجوید مدرسہ نے پڑھا اور ۱۳۹۰ھ میں عزیز زبیر سلمہ نے ایک قرآن پڑھا، ۱۳۸۸ھ میں حافظ فرقان پارچہ فروش نے ایک قرآن درمیانی عشرہ میں پڑھا، مفتی یحییٰ نے بھی دو رمضانوں میں ایک ایک قرآن سنایا اور ۱۳۹۴ھ میں ایک قرآن عزیز سلمان کے چھوٹے بھائی عزیز خالد نے سنایا۔

اس سال ''اوجز'' کی بیروت میں طباعت کی تجویز عزیز عبدالحفیظ نے کی تھی اور اہلِ بیروت نے وعدہ بھی کرلیا تھا کہ اگر پروف دیکھنے والے متعدد ہوں تو ہم ڈیڑھ ماہ میں کتاب پوری کر دیں گے، اس لیے عزیز عبدالحفیظ، قاری یوسف متالا مع اہل وعیال، مفتی اسماعیل، مولوی اقبال ندوی ان سب حضرات کو بیروت جمع کر دیا، مگر وہ ڈیڑھ ماہ چار پانچ سال میں بھی پورا نہ ہوا اور شعبان میں یہ مجمع منتشر ہو گیا، مولوی یوسف متالا مع اہل وعیال لندن چلے گئے، مفتی اسماعیل عمرہ کرتے ہوئے ۱۰ رمضان کو بمبئی پہنچے اور ایک ہفتہ گھر رہ کر ۱۹ رمضان کو سہارنپور پہنچے، عزیز مولوی عبدالحفیظ سلمہ، ۲۱ رمضان کو جدہ سے چل کر بمبئی ہوتے ہوئے ۲۲ کو عصر کے وقت سہارنپور سیدھے پہنچ گئے۔

اس سال مسجد کے دوچند ہونے کی وجہ سے خیال تھا کہ سہولت رہے گی مگر ہجوم اندازہ سے زیادہ ہو گیا، عشرہ اولیٰ کے ختم پر ایک ہزار تک پہنچ گئے، ۲۷، ۲۸ کو تقریباً دو ہزار تک پہنچ گئے۔

کئی سال سے ماہِ مبارک میں صبح کو گیارہ بجے کے قریب ایک گھنٹہ وعظ بھی سلسلہ رہا، ظہر کے بعد عصر تک حسب ختم خواجگان اور ذکر بالجہر، عصر کے بعد اکمال الشیم، ارشاد الملوک مغرب کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ نوافل اور طعام اس کے بعد عشاء کی اذان تک نو وارد آنے والوں سے اور مقیمین سے ملاقات، یہ معمولات قدیم رہے، اس سال مولانا منور صاحب اور مولانا عبیداللہ صاحب مع اپنے اہل وعیال کے سہارنپور میں مقیم رہے۔

یکم شوال ۱۸ اکتوبر یوم جمعہ کو نمازِ عید طلوع آفتاب کے آدھ گھنٹہ بعد مولانا عبیداللہ صاحب نے دارِ جدید میں اور دارالطلبہ قدیم میں ۹ بجے قاری رضوان نسیم نے پڑھائی، اس سال چونکہ مجمع بہت زیادہ ہو گیا تھا جس کی واپسی میں تاخیر ہوتی رہی، اس لیے اس ناکارہ کو بھی عید کے بعد دارِ جدید کی مسجد میں کئی دن تک قیام کرنا پڑا ورنہ ہمیشہ کا معمول ۲ یا ۳ شوال کو گھر آجانے کا تھا، مگر مجمع جو رمضان کا بچا ہوا تھا وہ مدرسہ قدیم میں نہیں آسکتا تھا اس لیے اس ناکارہ کو بھی دیر تک ٹھہرنا پڑا۔

۲ شوال کی صبح کو کار سے حضرت مولانا قاری طیب صاحب، مولانا فخر الحسن صاحب صدر المدرسین دارالعلوم وغیرہ حضرات تشریف لائے اور مولانا منور حسن صاحب، مولانا عبیداللہ صاحب کی درخواست پر پون گھنٹے سے زائد تقریر بھی فرمائی، قاری صاحب نے فرمایا کہ کوئی بات تقریر کی تو ہے نہیں میں تو صرف دعائیں اور مبارکباد دینے آیا تھا، زکریا نے کہا کہ دعائیں تو بہت اہم ہیں اللہ تعالیٰ ان دوستوں کی آمد کو قبول فرمائے، حضرت قاری صاحب نے اس پر تفصیل سے مبارکباد دی اور دعاء کی اپنی راحت وآرام کو چھوڑ کر ایک ماہ اعتکاف کیا، جناب الحاج عبدالعلیم صاحب مرادآبادی نے بھی پورا ماہ مع اپنے رفقاء کے دارالطلبہ جدید ہی میں قیام کیا جن کی وجہ سے

مرادآبادی احباب کا بہت بڑا مجمع وقتاً فوقتاً آتا رہا۔

علی میاں اور مولانا منظور صاحب بھی متفرق اوقات میں تشریف لائے کہ رمضان کے بعد اس ناکارہ کی واپسی حجاز کی جلد ہی تجویز تھی، بھائی سعید گنگوہی کا قدح چشم بھی گنگوہ میں اسی ماہ ہوا۔

۱۳ شوال کو قاری طیب صاحب کی دوبارہ تشریف آوری کچھ مہمانوں کے ساتھ ہوئی، قاری صاحب نے فرمایا کہ یہ حضرات بذریعہ کار تجھ سے ملنے کے لیے آرہے تھے میں نے سوچا کہ میں بھی تھوڑی دیر کو قند مکرر ان کے ساتھ آجاؤں۔

۱۱ شوال کو اٹلی کے دو صاحب مع اپنی مستورات کے آئے جو پہلے بھی دو (۲) سال پہلے آئے تھے اور ایک اُن میں سے بیعت بھی ہو کر گیا تھا، اُنہوں نے تخلیہ کا وقت مانگا، بندہ نے عشاء کے دو (۲) گھنٹے بعد بتادیا، وہ آئے اور تصوف کے ابحاث وسوالات شروع کیے "وحدۃ الوجود" "وحدۃ الشھود" وغیرہ امور کی تفصیل، زکریا نے کہہ دیا کہ یہ چیزیں بحثوں اور تقریروں کی نہیں اور مبتدیوں کو ان چیزوں میں نہیں پڑنا چاہیے معمولات کا انگریزی پرچہ جو دو (۲) سال پہلے لے گئے تھے اُس پر بتاؤ کیا کیا عمل ہوا، اس پر عمل میں تقصیر پر زکریا نے تنبیہ بھی کی کہ جو کرنے کا کام ہے وہ تو ہوتا نہیں ان زوائد کے درمیان میں اوقات ضائع کر رہے ہو اُنہوں نے اصرار کیا کہ ہم سمجھنا چاہتے ہیں، زکریا نے کہہ دیا کہ یہ سمجھنے کی چیز نہیں جب یہاں پہنچو گے تو خود ہی سمجھ میں آجائے گی، اُنہوں نے کہا کہ دہلی میں حضرت شاہ ابوالخیر صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خانقاہ میں اس پر بحث ہوتی ہے، زکریا نے کہا کہ آپ کا جی چاہے تو شریک ہو جایا کرو ورنہ محض وقت ضائع کرنا ہے۔

۷ اشوال کو دہلی سے مستورات عزیز خالد کے نکاح میں شرکت کے لیے بابو جی کی گاڑی میں آئیں، زکریا نے مفت کی گاڑی دیکھ کر علی الصباح دیوبند کا ارادہ کیا، دیوبند پہنچ کر معلوم ہوا کہ قاری طیب صاحب مع متعدد حضرات ممبران دارالعلوم کے مجھ سے ملنے سہارنپور گئے ہیں، اس لیے اپنے قیام دیوبند کو مختصر کر کے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ قاری صاحب تو واپس تشریف لے جا چکے مگر قاضی زین العابدین وغیرہ ابھی انتظار میں موجود تھے۔

عزیز خالد، برادرِ خورد عزیز سلمان کا نکاح جو ایک سال پہلے سے زکریا کی تجویز میں تھا بعض وجوہ سے نہیں ہوسکا، ۲۵ شوال دوشنبہ کی شب میں بعد مغرب بعبارت مولانا انعام الحسن صاحب بمہر پانچ ہزار ہوا، مہر پر رد وقدح بھی ہوئی، حکیم جی نے یہی مقدار تجویز کر رکھی تھی کہ ہمارے خاندان کا مہر مثل یہی ہے، مہر مثل کی رعایت ضروری ہے عزیز خالد کا نکاح از دخترِ حکیم الیاس، مولوی انعام صاحب نے فرمایا کہ مہر مثل ماں اور خالہ کا معتبر ہوتا ہے ان دونوں کا مہر مہر فاطمی ہے

مگر حکیم جی کے اصرار پر ان ہی کی رائے پر عمل ہوا، اجتماع سرپرستان بھی جو پہلے سے تجویز تھا مگر اس خیال سے کہ دو وقت آنا مشکل ہے اسی وقت پر محول کر دیا تھا۔

زکریا کے سفر کی وجہ سے مظاہر کے تقسیم اسباق میں بھی عجلت کی گئی، ۲۵ شوال کو اسباق کا افتتاح ہوا، مولوی یونس صاحب شیخ الحدیث نے اول مسلسل بالاولیت پڑھی، پھر بخاری شریف کی حدیث پڑھی اور مولانا انعام الحسن صاحب نے طویل دُعاء کرائی۔

عزیز مصباح مرحوم کو صبح کی چائے میں ۲۷ شوال کو کھانسی شروع ہوئی اور غفلت، حاجی نصیر، حاجی عظیم اللہ وغیرہ حضرات بھی سہارنپور گئے ہوئے تھے، مگر زکریا کی درخواست پر ان لوگوں نے قیام ملتوی کر دیا اور عزیز موصوف کو لے کر علی گڑھ آگئے، وہاں مرض بڑھتا ہی گیا، بالآخر ۱۵ جنوری کو علی گڑھ کے ہسپتال میں مرحوم کا انتقال ہو گیا نعش کاندھلہ لائی گئی، مولوی انعام صاحب بھی خبر پا کر سیدھے کاندھلہ پہنچ گئے اور خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

اس سال رمضان میں بھی زکریا کی طبیعت خراب رہی اور امراض بڑھتے ہی چلے گئے، پندرہ (۱۵) ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۷۴ء شنبہ کو سہارنپور سے سفر حجاز کی روانگی شروع ہوئی، تین چار کاریں تھیں، باوجود زکریا کی شدید ممانعت کے کہ روانگی کے وقت کوئی نہ آئے اتنا ہجوم ہو گیا کہ زکریا کے گھر سے دار الطلبہ تک آدمی ہی تھے، بہت مشکل سے دوستوں کی مدد سے کار سے روانگی ہوئی، آنے والوں کو بہت شکایت ہوئی کہ الوداعی مصافحہ نہ ہو سکا، حجاز بھی شکایت کے خطوط پہنچے کہ ہم تو مصافحے کے لیے گئے تھے، مگر کار کا دروازہ بند کر دیا کہ ہجوم اتنا تھا کہ مصافحہ شروع ہوتا تو ظہر تک بھی نہ نمٹتا۔

شاہ معین الدین صاحب اعظم گڑھی بمعیت ہارون ندوی جو کئی سال سے بار بار تشریف لا رہے تھے، روانگی سے چند روز قبل دفعۃً بلا اطلاع پہنچ گئے، زکریا نے نکیر بھی کی کہ اس ہجوم میں آپ کہاں آگئے، مرحوم نے فرمایا کہ بے اختیار طبیعت پر ایسا تقاضا ہوا کہ علی میاں کو اطلاع نہیں کی بس سیدھا چلا ہی آیا، میں نے کہا کہ اس قدر ہجوم ہو رہا ہے کہ ملاقات کا بھی وقت ملنا مشکل ہے۔

مرحوم نے کہا کہ مجھے دار الطلبہ قدیم یا جدید میں ایسی جگہ بتا دو کہ میں قیام کر لوں، میں نے دار الطلبہ جدید میں ایک حجرہ ان کے لیے تجویز کرایا جس کو مرحوم نے بہت پسند کیا اور خوش ہوئے، مگر بعد میں مولوی عبد المالک صاحب مہتمم مالیات نے مدرسہ قدیم میں اپنے حجرہ قیام کی پیش کش کی جس کو مرحوم نے اور بھی زیادہ پسند کیا اور بہت خوش ہوئے کہ نمازوں میں شرکت ہوتی رہے گی۔

چند روز قیام کے بعد ۲۷ شوال چارشنبہ کو ہجوم کی کثرت کی وجہ سے یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جی تو نہیں چاہتا مگر ہجوم بڑھتا جا رہا ہے، دورانِ قیام میں صبح کو ذکر کی مجلس میں اہتمام سے شرکت

فرماتے اور اپنے حالات بھی تبتل اور انقطاع کے یکسوئی کے خواہش کے ذکر کرتے رہتے تھے کہ سب چیزوں کو چھوڑ یکسو رہنے کو جی چاہتا ہے، زکریا نے دار المصنفین کے قیام پر شدت سے اصرار کیا کہ وہیں رہتے ہوئے جتنی یکسوئی ہو سکے کرتے رہیں، اس کو چھوڑ کر نہ جائیں، یہاں سے واپسی کے بعد اپنی آمد پر اور دلبستگی پر بہت لمبا خط بھی لکھا، دوبارہ طویل قیام کی تمنا بھی لکھی لیکن مقدرات اپنی جگہ پر اٹل ہوتے ہیں، یہاں سے واپسی کے بعد سے علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ۱۳ دسمبر جمعہ کے دن جمعہ کی نماز پڑھی پھر آرام کیا اور عصر کے وقت وضو کے لیے پانی منگایا اتنے میں خادم پانی لایا اتنے حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال فرما گئے۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون، اللهم اغفرله، وارفعو درجاته

چونکہ زکریا کو بخار کی شدت تھی اس لیے حسب معمول صبح کی نماز سے پہلے روانگی نہ ہو سکی کہ سردی بہت تھی ورنہ ہمیشہ کا معمول اپنی صبح کی نماز پڑھ کر روانگی کا تھا کہ اس میں ہجوم نہیں ملتا تھا، جلال آباد پہنچ کر معلوم ہوا مسیح اللہ خان صاحب زاد مجدھم دیر سے مدرسہ کے باہر سڑک کے قریب انتظار میں ہیں، زکریا کا ارادہ پہلے مدرسہ ہو کر جانے کا تھا مگر حضرت مولانا کی ملاقات کی وجہ سے سڑک ہی پر طلبہ اور مدرسین سے مصافحہ کرنے کے بعد آگے روانگی ہوئی، ظہر جھنجھانہ میں پڑھ کر ایک گھنٹہ بعد کاندھلہ پہنچے اور کاندھلہ میں شنبہ کو ہمیشہ پینٹھ لگتی ہے اس لیے قصبہ میں پہنچنا تو مشکل تھا اس لیے صوفی افتخار الحسن صاحب نے عید گاہ کے قریب قیام کا انتظام کر رکھا تھا، وہاں پہنچ کر زکریا کا قیام تو عید گاہ ہی پر رہا اور رفقاء نے صوفی جی کے گھر جا کر کھانا کھایا۔

زکریا کی علالت اور ہجوم کی کثرت اور مولانا انعام الحسن صاحب کے سفر گجرات کی وجہ سے اس مرتبہ دہلی کا قیام بھائی کرامت صاحب کے گھر پر رہا وہاں ہجوم پر بھی قابو رہا اور بیعت اور ملاقات کے لیے مسجد میں وقتاً فوقتاً آمد رہی، مولانا انعام الحسن صاحب وغیرہ حضرات ۱۳ ذیقعدہ کو گجرات کے دورہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ وہاں سے فارغ ہو کر بمبئی تشریف لے آئیں گے۔

۳ دسمبر ۱۹۷۴ء مطابق ۱۸ ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ سہ شنبہ کی صبح کو دہلی سے طیارہ سے روانہ ہو کر زکریا ۱۰:۳۰ بجے بمبئی پہنچا، اُسی دن علی الصباح مولانا انعام الحسن صاحب بمبئی پہنچ چکے تھے، مطار پر ملاقات ہوئی، ۶ دسمبر مطابق ۲۱ ذیقعدہ ہندی جمعہ کے دن بعد مغرب بھائی عبد الکریم کے مکان سے چل کر مطار پر پہنچے، رفقاء مع سامان مغرب سے پہلے جا چکے تھے، جہاز کی پرواز پہلے ۱۰ بجے تجویز تھی مگر لیٹ ہونے کی وجہ سے ۱۱ بجے چلا، سردی شدت کی تھی اور زکریا کو بخار بھی تھا، کراچی کے مطار پر حاجی فرید الدین صاحب (اللہ تعالیٰ اُن کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ میرے

ہر سفر کا بہت انتظام فرماتے ہیں) جہاز پر تشریف لائے اور فرمایا کہ مجمع تو باہر بہت زیادہ ہے مگر سردی بہت شدید ہے، ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی ہے اور تجھے بخار ہو رہا ہے میری رائے اُترنے کی نہیں ہے، مولوی احسان وغیرہ متعدد احباب نے بھی یہی مشورہ دیا، تقریباً ایک گھنٹہ جہاز وہاں رہا، پھر ظہران ٹھہرتے ہوئے ریاض پہنچا، خیال تھا کہ وہاں صبح کی نماز پڑھ لی جائے، مگر وقت میں بھی کچھ دیر تھی اور سواریوں کی آمد و رفت بھی ہو رہی تھی اسی لیے تجویز یہ ہوا کہ طیارہ کی روانگی کے بعد طیارہ ہی میں صبح کی نماز پڑھ لی جائے گی کہ طلوع آفتاب میں ایک گھنٹہ بتایا گیا تھا مگر ریاض سے طیران کے بعد چند ہی منٹ میں آفتاب بالکل سامنے آگیا اور نماز قضاء ہوگئی، اس کا اندازہ نہیں تھا کہ چند منٹ میں آفتاب سامنے آجائے گا، ہندی سوا دس بجے جدہ پہنچے معلوم ہوا کہ احباب رات کو بھی جہاز کی تحقیقات کرتے رہے کہ وہ لیٹ پر لیٹ ہوتا رہا، عزیز سعدی وغیرہ کے ساتھ اس کے گھر پہنچے، ہجوم حرم میں اتنا تھا کہ وہاں تک رسائی مشکل تھی، صبح کی قضاء و ظہر سعدی کے گھر میں پڑھی، ظہر کے بعد ہجوم کم تھا تو طواف کرتے ہوئے صولتیہ آگئے اور بعد عشاء سعی کی اور صولتیہ واپس آکر حلق کرا کر عمرہ کا احرام کھولا۔

زکریا کا اصرار جلد از جلد مدینہ کا تھا اور ایک خواب کی بناء پر مولوی اظہار کے کسی دوست نے دیکھ رکھا تھا کہ مولوی اظہار بھی اس سال حج میں شریک تھے زکریا کو اور بھی زیادہ تقاضا مدینہ کا ہو رہا تھا۔ مگر مکی احباب کے علاوہ ہمارے قاضی صاحب کا شدید اصرار حج کے بعد ان کے ساتھ مدینہ آنے کا تھا۔ اس زمانہ میں ہجوم کی کثرت کی وجہ سے شب روز مدرسہ ہی میں قیام رہا لیکن ۷ تاریخ کو مستقلاً عزیز سعدی کے یہاں روانگی ہوگئی جب کہ میرے رفقاء مولوی حبیب اللہ وغیرہ منیٰ کے لیے روانہ ہونے لگے تھے۔

اس سال حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی اہلیہ عزیز امجد کے ساتھ پہلے سے تشریف لائی ہوئی تھیں، مدینہ پاک میں قیام تھا اور ۲۶ ذیقعد کو مولانا الحاج اسعد مدنی طیارہ سے جدہ آکر سیدھے مدینہ منورہ پہنچ گئے، حج کے بعد دوبارہ مدینہ آکر ۳ جنوری کو افریقہ کی روانگی تجویز تھی، طیارہ کا ٹکٹ بھی آگیا تھا۔ مگر جب مدینہ کے مطار پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سیٹ تو دوسرے کو دے دی گئی اس لیے بذریعہ کار جدہ روانہ ہو گئے اور وہاں سے افریقہ کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس سال مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی اور مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری بھی اسی طیارہ سے تشریف لائے جس سے زکریا آیا، مگر ان دونوں حضرات کا ارادہ جدہ سے سیدھے مدینہ جانے کا تھا اس لیے احرام بھی نہیں باندھا تھا اور جدہ اتر گئے، مگر مدینہ کے راستہ میں ایک دن پہلے سے طوفانی بارش ہوئی تھی اس لیے بہت مشقت سے کئی دن مدینہ پہنچے اور وہ حضرات

حج کے بعد دوبارہ بھی مدینہ گئے۔

مولانا سعید خان صاحب وغیرہ کا اصرار تھا کہ زکریا حج میں ضرور شریک ہو، مگر زکریا اپنی معذوری اور بیماری کی وجہ سے معذرت کر رہا تھا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ زکریا ۸ تاریخ کو منیٰ نہ جائے، ۹ کی صبح کو عزیز عبدالحفیظ کی کار میں عزیز سعدی، مولوی اسماعیل، مولوی احمد درویش، ڈاکٹر اسماعیل سعدی کے مکان سے چل کر ۱۵ منٹ میں منیٰ اور ۵ منٹ میں مزدلفہ اور ۵ منٹ میں عرفات میں مکی کے خیمہ میں پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ ملک فیصل مرحوم کو بہت بلند درجے عطاء فرمائے کہ مرحوم نے اس سال مکہ سے عرفات تک بالا بالا کئی سڑکیں بنوادی تھیں جن میں نہ منیٰ میں جانا پڑتا تھا نہ مزدلفہ میں۔ آدھ گھنٹہ میں معلم سید مکی مرزوقی کے خیمہ میں پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی جزائے خیر عطاء فرمائے کہ وہ ہر سفر میں اس ناکارہ کی راحت کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔

انہوں نے خیمہ کا نصف حصہ زکریا کے لیے متعین کر رکھا تھا اور دوسرا نصف رفقاء کے لیے۔ ہمارے پہنچنے کے ۲ گھنٹے کے بعد رفقاء اور قاضی صاحب وغیرہ جو شب میں منیٰ میں مقیم تھے پہنچے کہ راستے میں لاریوں کی وجہ سے بہت تاخیر ہوتی رہی۔ غروب کے بعد عرفات چل کر زکریا کی کار اور رفقاء کی گاڑی مزدلفہ پہنچی۔ وہاں مغرب عشاء پڑھ کر کچھ دیر قیام کرنے کے بعد زکریا تو عزیز عبدالحفیظ کی کار میں عزیز سعدی کے گھر پہنچ گیا اور ۱۰ ذی الحجہ کو صبح حرم شریف پہنچ گئے اور عید کی نماز کے بعد طواف زیارت کر کے عزیز سعدی کے گھر پہنچ گئے۔

حجاج کا ہجوم اس سال اتنا زیادہ تھا کہ صولتیہ سے عزیز سعدی کے گھر آنا جانا مجھ جیسے ضعیف کے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے کئی دن قیام عزیز سعدی ہی کے مکان پر شب و روز رہا۔ زکریا کی رمی تو توکیل سے ہوئی کہ منیٰ پہنچنا مشکل تھا۔ اس پر احباب میں رسہ کشی ہوئی کہ میری وکالت کون کرے۔ پہلے دن عزیز عبدالحفیظ نے، دوسرے دن قاضی صاحب نے، تیسرے دن مفتی زین العابدین صاحب نے، چوتھے دن کی مولانا سعید خان صاحب کی تجویز قرار پائی تھی مگر بعض وجوہ سے ۱۲ کی شام کو ہی یہ حضرات چلے آئے تھے۔

۱۵ ذی الحجہ ۲۹ دسمبر اتوار کو عصر کی اذان کے وقت مدرسہ صولتیہ سے چل کر عصر تنعیم میں پڑھی۔ رات کو عربی ۲ بجے بدر پہنچے۔ ڈاکٹر اسماعیل کے مکان پر جو آج کل وہاں ڈاکٹر ہیں ان کے گھر والے مکہ ہی تھے رات میں قیام کر کے صبح ۲ بجے بدر سے چل کر ۴ بجے مدینہ پاک پہنچے مگر اتنا ہجوم تھا کہ بقیع سے آگے گاڑی نہ آسکی۔ زکریا تو اپنی عربیہ پر دوستوں کی مدد سے پہنچ گیا۔ حمالوں کے ذریعہ سے سامان منتقل کیا گیا۔ قاضی صاحب بھی زکریا کے ساتھ ہی تھے۔ روضہ اقدس پر پہنچنا تو

مشکل تھا، نمازیں بھی مدرسہ کی چھت پر ہوتی تھیں، لیکن حاجی دلدار صاحب نے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے) رئیس الاغوات، رئیس الشرطہ وغیرہ سے اجازت لے لی تھی۔ زکریا سلام کے لیے ہجوم میں تو آنہیں سکتا۔ رات کو کیواڑ بند ہونے کے وقت اس کو بلالیا جائے۔

اس لیے ۱۸ ذی الحجہ کی شام کو ۳:۳۰ بجے جب کے ہم لوگ مصلی الجنائز پر کھڑے تھے بلایا۔ زکریا نے تو منع کیا تھا کہ اس اہتمام کی ضرورت نہیں، مگر ان دوستوں نے نہ مانا اور جب کے مسجد نبوی بالکل خالی تھی زکریا کو اپنی عربیہ پر اندر پہنچا دیا۔ اس قدر رعب اس وقت طاری ہوا کہ نہ اس سے پہلے طاری ہوا نہ بعد۔ زکریا تو اقدام میں رہا چند منٹ قیام رہا اس کے بعد زکریا کے تقاضے پر فوراً آ گئے۔

اس سال جناب الحاج قاری طیب صاحب بھی اپنے چند مدراسی رفقاء کے ساتھ حج کے لیے تشریف لائے تھے اور ان رفقاء کی وجہ سے فندق افریقیہ میں خلاف معمول قیام فرمایا اور ورنہ ہمیشہ کا معمول مدرسہ صولتیہ میں قیام کا تھا اور حجاج کی کثرت اتنی زیادہ تھی کہ ہوٹل سے صولتیہ تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانا تھا۔ اس لیے کہ اس سال حجاج کی اتنی کثرت تھی کہ بروایت عزیز محمد سعید رحمت اللہ ۷ا دسمبر کو ۵۰ طیارے فضاء میں گھومتے رہے کہ جدہ کے مطار پر ان کے اترنے کی جگہ نہیں تھی۔

۱۹ دسمبر کی شب میں قاری صاحب جدہ پہنچے تھے اور ۱۰ جنوری ۲۷ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ پہنچے۔ یہاں کے تبلیغی احباب کا اصرار تھا کہ ان کے اجتماع میں قاری صاحب کی تقریر ہو، مگر مرکز تبلیغ مسجد نور ذرا دور ہے اور وہاں عربوں کا مجمع ذرا زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس ناکارہ کے مشورہ سے مدرسہ شرعیہ کی چھت پر جو مسجد نبوی کے بالکل برابر میں ہے بعد عصر ۲ محرم کو ایک گھنٹہ تقریر ہوئی جس میں بہت تفصیل سے قاری صاحب نے فرمایا کہ دین کی مرکزیت بھی مدینہ پاک کو حاصل ہے۔ تبلیغ کی مرکزیت کو بھی یہاں اہمیت دی جائے۔

مکہ اور مدینہ منورہ کے قیام میں قاری صاحب کی طرف سے اور اہل پاکستان کی طرف سے اس کی برابر کوشش رہی کہ واپسی میں چند روز پاکستان اترنے کا ویزا مل جائے۔ احباب کی کوشش سے وہ مل گیا اور ۱۹ جنوری ۷۵ء ۷ محرم ۹۵ھ کو مدینہ سے سیدھے جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت ویزا قاری صاحب کا نہیں ملا تھا مگر کراچی پہنچ کر جناب الحاج فریدالدین صاحب جو ہم لوگوں کے لیے کراچی کے طیاروں کے سفر میں بہت معین اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ اس ناکارہ کو تو حجاز کی آمد و رفت میں ہمیشہ کراچی مطار پر اترنے میں اور وہاں کے قیام میں بہت ہی سہولتیں رہیں، قاری صاحب کی روانگی تو بمبئی کے لیے تھی مگر کراچی کے مطار پر حاجی صاحب نے فرمایا کہ ویزا مل گیا دو ہفتے پاکستان کی

مختلف جگہوں پر قیام کے بعد ۷ کو بمبئی کے لیے روانہ ہوئے اور ۸ کو دہرہ سے دیوبند کے لیے روانہ ہوگئے۔

عزیز مولوی مصباح الحسن مرحوم اس ناکارہ کی روانگی حجاز کے وقت بیمار ہوئے تھے اور ان کو علی گڑھ کے ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا خطوط کے ذریعہ ان کی بیماری کا مدوجزر بہت کثرت سے پہنچتا رہا۔ ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء ۵ محرم ۹۵ھ یوم جمعہ کو حاجی نصیر کا برقیہ علی گڑھ سے چلا ہوا ملا کہ مولوی مصباح کا انتقال ہوگیا۔ مولانا انعام الحسن صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ بدھ ۱۵ جنوری کو صبح دس بجے کے قریب انتقال ہوا، مگر ان کی اہلیہ کے اصرار پر تدفین کاندھلہ میں ہوئی، علی گڑھ سے نعش کاندھلہ مع ان کی اہلیہ کے گئی اور نظام الدین ٹیلیفون کر دیا۔ مولوی انعام صاحب وغیرہ عصر کے وقت کاندھلہ پہنچ گئے اور مغرب کے بعد مولانا انعام صاحب کی امامت میں صلوۃ جنازہ کے بعد خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ بکثرت خطوط سے معلوم ہو کہ تدفین کے وقت چہرہ اتنا منور تھا کہ روشنی ہر شخص کو نظر آرہی تھی۔ حادثہ کی خبر سن کر یہ ناکارہ مکہ مکرمہ تعزیت کے لیے جانے کا برابر ارادہ کرتا رہا اس لیے کہ مرحوم کی صاحبزادی عزیز محمد سعید رحمت اللہ کے نکاح میں مکہ مکرمہ میں ہے۔ مگر اس ناکارہ کو مسلسل بخار تپ ولرزہ وغیرہ عوارض رہے نیز ہمارے قاضی عبدالقادر صاحب نے اللہ تعالیٰ ان کو بہت بلند درجے عطاء فرمائے مجھ سے مخفی ڈاکٹر منیر صاحب کو لاہور سے آنکھ بنانے کے لیے آنے کا تقاضہ کر رکھا تھا جس کا مجھے علم نہ تھا وہ بھی تاخیر پر اصرار فرماتے رہے۔ سردی بھی بہت شدید تھی، امروز فردا ہوتے رہے۔

۱۱ مارچ کو بسلسلہ تعزیت مکہ جانا پڑا۔ سلیم دہلوی نے نئی کار خریدی تھی اور اس کا اصرار تھا کہ اس میں زکریا مکہ کا سفر کرے کہ اس میں ایئر کنڈیشن ہے۔ جس کی وجہ سے عربی ۴ بجے صبح کو چل کر ظہر مستورہ پڑھی اور عصر کے وقت مکہ پہنچے۔ ان ہی ایام میں مکرم و محترم جناب الحاج مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب جامعہ اسلامیہ کے اجتماع میں ۲۶ جنوری کو تشریف لائے ۱۴ فروری کو واپسی کے ارادہ سے مکہ روانہ ہوئے اور ۲۱ فروری کو جدہ سے بمبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔

۲۱ فروری جمعہ کے دن میرٹھ میں حضرت مولانا عاشق الٰہی نور اللہ مرقدہٗ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے حافظ مقبول الٰہی کا انتقال ہوگیا۔ طبیعت تو معمولی سی دو تین دن سے خراب تھی، جمعہ کے دن غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر جامع مسجد جانے کے انتظار میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ ہارٹ فیل ہوگیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ

عزیزان مولوی عاقل صدر مدرس مدرسہ مظاہر علوم اور عزیز مولوی سلمان یکے از مدرسین علیا

مظاہر علوم اس ناکارہ کے تراجم بخاری جو وقتاً فوقتاً زکریا بخاری پڑھانے کے زمانے میں تقریباً ۲۵ سال میں لکھتا رہا اس کی تبیض عرصہ سے کر رہے تھے، لیکن مدرسہ میں اسباق کے مشاغل خانگی مشاغل کی وجہ سے بہت تاخیر ہو رہی تھی۔

ذیقعدہ میں زکریا کے ساتھ مدرسہ سے ایک سال کی چھٹی لے کر مدینہ پاک میں اس کی تبیض کے لیے آنے پر اصرار کر رہے تھے۔ زکریا نے اول تو مدرسہ کے اسباق کے حرج کی وجہ سے خلاف کیا کہ مدرسہ کا حرج ہوگا، لیکن قاری مظفر صاحب نائب ناظم مدرسہ نے (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے) بڑی بشاشت سے اس کو قبول کیا اور یہ کہا کہ اسباق کا انتظام کر لیا جائے گا۔ نیچے کے درجے میں ضرورت ہوئی تو کسی مدرس کا انتظام کر لیں گے۔

اس لیے زکریا عزیزان سے یہ کہہ آیا تھا کہ اس وقت توجہ کا ہنگامہ ہے کام نہیں ہونے کا، محرم میں ایک سال کی چھٹی لے کر آجائیں، مگر مختلف عوارض کی وجہ سے قانونی اور مدرسہ کی چھٹی وغیرہ میں تاخیر ہوتی رہی نیز حاجی یعقوب صاحب نے بمبئی سے لکھا کہ بمبئی سے اگر ظہران کا ٹکٹ لیا جائے تو تین ہزار سات سو میں آئے گا اور بمبئی جدہ پانچ ہزار ایک سو پچاسی میں آئے گا اس لیے مناسب یہ ہے کہ یہ حضرات بمبئی سے ظہران کا ٹکٹ لیں اور وہاں سے کار سے مکہ۔ دونوں ٹکٹوں میں چونکہ ڈیڑھ ہزار کا فرق تھا اس کے علاوہ زکریا کو اس کی لالچ تھی کہ ظہران سے مکہ کے راستہ میں طائف پڑتا ہے، مستقل سفر تو وہاں کا مشکل ہوگا، دوران سفر میں ایک شب کا قیام طائف کا ہو جائے گا۔ اس تجویز کو پسند کر کے اطلاع کر دی، نیز اسی دوران میں مولانا انعام الحسن صاحب کے ساتھ بمبئی آجائیں اور وہاں سے یہ ظہران کو اور وہ افریقہ کو روانہ ہو جائیں۔

چنانچہ ۱۳ مارچ کی شام ایکسپریس سے عزیزان دھلی پہنچ گئے اور ۱۵ کی صبح کو بذریعہ طیارہ مولانا کے ساتھ بمبئی پہنچ گئے۔ پہلے سے یہ تجویز تھی کہ ظہران سے سیدھے مدینہ آجائیں گے، مگر اس زمانہ میں زکریا مکہ مکرمہ بسلسہ تعزیت گیا ہوا تھا، اس لیے عزیز الحاج عبدالحفیظ سلمہ کو (اللہ تعالیٰ اس کو اور اس کے والد کو بہت ہی جزائے خیر دے) کہ ان کی گاڑیاں زکریا کے لیے وقف ہیں۔ عزیز عبدالحفیظ اپنی کار لے کر ظہران پہنچ گیا اور عزیز عبدالقدیر کو بھی ساتھ لے گیا۔ میری تمنا تو یہ تھی کہ ایک شب طائف کا قیام ہوتا مگر راستہ میں اتنی تاخیریں ہوتی رہیں کہ طائف میں چند ہی گھنٹے قیام رہا۔

۱۸ مارچ کی صبح کو عزیزان بمبئی سے ظہران پہنچے اور اسی دن شام کو مولانا انعام الحسن صاحب افریقہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ میرے مخلص دوست الحاج اختر علی سہارنپوری جو جدہ میں سعودی ایئر لائن میں ملازم ہیں اور میری ہر آمد پر ظہران میں مجھے ملا کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے مجھے بہت

راحت ظہران پر ملتی ہے۔ میں نے ان کو بھی لکھ دیا تھا کہ ۱۸ کی صبح کو ظہران پہنچ جائیں اور عزیزان کو اتار کر جدہ آ جائیں۔ اللہ تعالیٰ اس عزیز کو بھی بہت جزائے خیر کرے کہ وہ بھی ظہران پہنچ گیا تھا۔

عزیزان نے ظہران میں بھائی عبدالباسط کے یہاں کھانا کھایا اور پٹرول کا مخزن اور کمپنیوں کی سیر کی۔ عصر کے بعد وہاں سے چل کر شب کو ریاض پہنچے اور اگلے دن صبح کو ریاض سے چل کر چند گھنٹے طائف ٹھہرتے ہوئے عصر کے وقت مدرسہ صولتیہ پہنچ گئے، زکریا کا ارادہ مکہ کے قیام کا اس سفر میں مختصر ہی تھا، مگر حاجی یعقوب صاحب کا برقیہ مل گیا کہ ۱۸ کو عزیزان ظہران کے لیے روانہ ہو رہے ہیں اس لیے مزید قیام کرنا پڑا اور ۲۴ مارچ کو دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول کو عصر کی نماز کے وقت عزیز عبدالحفیظ کی کار میں صولتیہ سے چل کر تنعیم میں عصر کی نماز پڑھی، عزیز سلیم کا پہلے سے اصرار تھا اور کئی ٹیلیفون بھی جا چکے تھے کہ مکہ سے میں تجھے اپنی گاڑی میں لاؤں گا مگر زکریا شدت سے انکار کر رہا تھا کہ عبدالحفیظ کی کار کو جانا ہے کہ وہ مجھے پہنچا کر ریاض جاوے گی، دوسری کار کی ضرورت نہیں، مگر وہ اپنی کار لے کر اپنے والد کے ساتھ ایسے وقت مکہ مکرمہ پہنچا کہ میں عبدالحفیظ کی کار میں مدینہ کے لیے بیٹھ چکا تھا۔

میں صولتیہ سے چل کر عزیز سعدی کے گھر پر اُس کی اہلیہ سے الوداعی ملاقات کے لیے اُس کے مکان پر پہنچا اور ماموں یامین، عزیز سعدی، بھائی حبیب اللہ سلیم کی کار میں تنعیم پہنچے کہ وہاں عصر پڑھنا پہلے سے طے تھا اور ہمیں نہ دیکھ کر یہ لوگ واپس ہو رہے تھے کہ ایک پٹرول پمپ پر ملاقات ہوگئی اور ہمارے ساتھ تنعیم واپس جا کر عصر پڑھی اور سلیم کے اصرار پر تنعیم سے ہم تو مع عاقل سلمان سلیم کی کار میں اور سلیم مع بھائی حبیب اللہ وغیرہ رفقاء عبدالحفیظ کی کار اور اونیٹ میں آئے۔

دو بجے ہم لوگ بدر پہنچ گئے، وہاں عشاء کی تکبیر ہو رہی تھی ہم لوگ تو نماز میں شریک ہو گئے مگر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسماعیل نے تو وہاں کے مقامی آدمیوں کو بھی کئی کو مدعو کر رکھا ہے اس لیے زکریا نے نماز کے بعد دستر خوان بچھانے کا تقاضا کیا اور کھانا شروع ہونے تک یکے بعد دیگرے ہمارے رفقاء بھی پہنچ گئے، شب کو کچھ لوگ مسجد عریش کے اندر اور کچھ باہر میدان میں سوئے اور صبح کی نماز کے بعد چائے سے فراغ پر شہداء میں حاضری دیتے ہوئے پونے دو پر چل کر سوا تین پر مدرسہ شرعیہ پہنچ گئے، راستہ میں چند منٹ حبیب صاحب کے مکان کے سامنے کار ہی میں سید صاحب سے ملاقات کی، زکریا نے تو اندر آدمی دیکھنے کو بھیجا تھا کہ وہ ہیں یا نہیں مگر وہ آدمی کے ساتھ ہی چلے آئے۔

یہاں پہنچ کر عصر سے پہلے شاہ فیصل مرحوم کے حادثہ کی اطلاع ملی کہ اُن کے بھتیجے فیصل بن مساعد نے تین گولیاں یکے بعد دیگرے مار کر شہید کر دیا، مرحوم کی بیدار مغزی، سطوت وغیرہ

اوصافِ جمیلہ اتنے زیادہ ہیں کہ اس مختصر میں آنے مشکل ہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرما کر اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطاء فرمائے، سیاسی باتیں تو اہلِ سیاست جانیں ہم جیسے ضعفاء مرضاء کے لیے تو مرحوم کا ایک ہی کارنامہ مشاعر حج وغیرہ کے راستوں کی سہولت ایسا بڑا کارنامہ ہے کہ ہر حاجی بے اختیار دُعائیں کرنے پر مجبور ہے، حج کے زمانہ میں منیٰ سے عرفات پہنچنا ایسا مشکل اور تھکا دینے والا تھا کہ لاریوں کی لائن منیٰ سے عرفات تک آٹھ دس گھنٹے لے لیتی تھی مگر اس سال میں نے اپنی معذوریوں اور بیماریوں کی وجہ سے حج میں شرکت کا ارادہ ملتوی کر رکھا تھا مگر دوستوں نے کہا کہ اتنی نئی سڑکیں بن گئیں ہیں کہ دِقت نہیں ہوگی۔

چنانچہ شارع منصور سے چل کر راستہ میں ایک دکان سے دوستوں نے کھانا بھی خریدا اور دس منٹ میں منیٰ کے مقابل اور وہاں سے پانچ منٹ میں مزدلفہ اور وہاں سے پانچ منٹ میں اپنے معلم جناب الحاج سید مکی مرزوقی کے خیمہ میں پہنچ گیا، سید صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی درجات عالیہ نصیب فرمائے وہ ہمیشہ میرے لیے ایک خیمہ کا مخصوص حصہ اس میں چارپائی، پانی وغیرہ کا انتظام پہلے سے کر کے رکھا کرتے ہیں، ۲۰ منٹ میں مکہ سے چل کر اُن کی چارپائی پر پہنچ گیا اور یہی صورت تقریباً واپسی میں ہوئی، جاتے آتے اور اس کے بعد بھی ملک مرحوم کے لیے بہت دُعائیں کرتا رہا، اللہ تعالیٰ سیئات سے درگزر فرمائے اور اپنے قربِ خاص سے نوازے، حادثہ کی خبر سننے کے بعد سے دوستوں کو زبانی اور تحریری دُعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی بہت ہی تاکید کرتا رہا اور اب بھی جب اپنے حج کا منظر یاد میں یا ذکر تذکرہ میں آجائے تو دُعاء ضرور کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اہلِ عرب اور دُنیائے اسلام کے لیے نعم البدل نصیب فرمائے۔

یہاں پہنچ کر دوسرے ہی دن سے عزیزان نے تراجم جلد چہارم کی تبییض شروع کر دی، مدینہ پاک کی برکات کا تو پوچھنا ہی کیا اس ناکارہ کو تو ۴۵ھ میں اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ بذل کے اختتام پر شعبان میں اوجز کا افتتاح اقدام عالیہ میں کیا تھا اور آخر ذیقعدہ میں مکہ کے لیے روانگی ہوئی تھی، ساڑھے تین ماہ میں اوجز کی ڈیڑھ جلد کی تسوید یہاں ہوگئی تھی اور ہندوستان پہنچنے کے بعد ساڑھے چار جلدیں ۳۰ برس میں پوری ہوئیں اگرچہ اس دوران میں متفرق رسائل، کوکب حاشیہ بھی لکھا گیا پھر بھی دیر لگی، عزیزان نے ۱۴ ربیع الاول کو جلد رابع کے تراجم کی تبییض شروع کی تھی اور ۲۷ جمادی الاولی کو ایک تبییض پوری ہوگئی۔

میری آنکھ میں نزولِ آب کا سلسلہ تو دسمبر ۶۰ء سے شروع ہوا تھا، شاید اس کی تفصیل کہیں آچکی ہو مگر اس طرح کہ بائیں آنکھ میں زیادہ تھا داہنی میں کم، جب بائیں آنکھ قدح کے قابل ہوگئی تو علی گڑھی دوستوں نے بالخصوص حاجی نصیر الدین اور حاجی عظیم اللہ نے بہت اصرار کیا، بار بار مستقل

میرے لینے کے لیے کار بھی لاتے رہے، عزیزم الحاج مولانا یوسف صاحب نور اللہ مرقدہٗ اعلی اللہ مراتبہ تقاضا کرتے رہے کہ اگر میرے سامنے آنکھ بنوالے تو تیرے قیام علی گڑھ میں مستقل یہاں قیام کرلوں گا اور اپنے سارے اسفار ملتوی کردوں گا۔

ایک مرتبہ سب کے تقاضے پر علی گڑھ جانا بھی ہوا تو سول سرجن نے بہت غور سے آنکھ دیکھنے کے بعد کہا کہ بننے کے قابل تو ہوگئی مگر مجھ سے تنہائی میں یہ کہہ دیا کہ اگر تین چار سال مؤخر ہو جائے تو کچھ نقصان نہیں چونکہ داہنی آنکھ اتنا کام دے رہی تھی کہ چلنے پھرنے میں دِقت نہیں تھی اور علمی مشاغل کی امراض کی کثرت اور دماغی کمزوری کی وجہ سے چھوٹ رہے تھے اس لیے میں نے کہہ دیا کہ ابھی ضرورت نہیں۔

جس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ ڈاکٹر نے مجھ یہ کہا کہ تمہارے رمضان کا مہینہ آرہا ہے اور اس میں تم سنا جاگا بھی بہت کرو اور کام بھی زیادہ ہو اور آنکھ بننے کے چند ماہ بعد تک راحت کی ضرورت ہوگی، مشقت کا کام اس میں بالخصوص زیادہ جاگنا اور محنت کا کام کرنا مضر ہوگا، لیکن احباب کے بار بار اصرار پر مارچ ۷۰ء داہنی آنکھ کا آپریشن علی گڑھ میں ہوا، ڈاکٹر اگرچہ غیر مسلم تھے لیکن اللہ تعالیٰ اُس کے احسانات کا بہترین بدلہ نصیب فرمائے کہ اُس نے میری راحت رسانی میں اتنی کوشش کی کہ دوسری آنکھ کے آپریشن پر اُس کی تفاصیل معلوم ہوئیں۔

۱۲ مارچ پنجشنبہ کو ڈاکٹر نے کہا کہ ہمیں جتنے معائنے خون، پیشاب، پاخانے وغیرہ کے کرنے تھے سب کر چکے اور آج آنکھ بنانے کے لیے بالکل تیار ہوں مگر کل کو جمعہ ہے جو آپ کے یہاں بہت اہم ہے، اگر اس کی نماز کے لیے جامع مسجد جانا چاہیں تو پرسوں پر رکھوں؟ میں نے کہا ضرور چنانچہ ۱۴ مارچ شنبہ کی صبح کو دس بجے کے قریب اُس نے آنکھ بنائی اور یہ کہہ دیا کہ تین چار گھنٹے سیدھے لیٹے رہو اس کے بعد کروٹ دے دوں گا، اس نے نرسوں کو منع کر دیا کہ اس کے کمرے میں کوئی نہ جائے صرف مرد کام کریں، کارکنوں نے پیشاب دانی اور پاخانے کا برتن میری چارپائی کے نیچے رکھ دیا، ڈاکٹر نے پاخانہ کا برتن وہاں سے اُٹھوا دیا صرف پیشاب دانی رہنے دی اور اسی وقت میری چارپائی کے قریب کمرہ کی دیوار کے نیچے سے تڑوا کر اُس میں ایک نالی بنوائی جو باہر نکلتی تھی اور کہا کہ جب استنجے کی ضرورت ہو تو اس نالی پر کرلیں، بھنگی باہر سے کمالے گا اور ظہر کی نماز میری چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میرے ساتھیوں کے ساتھ جماعت سے پڑھوائی، میری آنکھ پر تو جو کچھ بھی لگا ہو مگر مجھے بے ہوش کرنے کی یا نیند آور کوئی گولی نہیں دی اور تیسرے دن آکر کہا کہ آپ کی عیادت کے واسطے سارے دن آدمی آتے رہتے ہیں، ہر وقت کے آنے میں مشکلات ہیں، اگر آپ کوئی وقت مقرر کر دیں تو میں اس وقت میں اجازت دے دیا کروں کہ جو پریشان پھرتے ہیں

اُن کوسہولت ہواور مجھے بھی، میں نے عصر کے بعد کا وقت مقرر کر دیا۔

اُس وقت مجمع دوسو، ڈھائی سو تک ہو جاتا تھا اور وہ اپنے عملہ کے لوگوں کو بھی حتیٰ کہ اپنے لڑکوں کو بھی تاکید سے اُس وقت بھیجا کرتا کہ جاؤ درشن کر کے آؤ، اس وقت چونکہ مجمع بہت ہو جاتا تھا اور بولنے کو میرا ابھی دل نہیں چاہتا تھا، اس لیے اپنے معمول کے موافق اس وقت میں نے اپنے مشائخ کی کتابیں سننی شروع کر دیں، دو تین دن تک نیند نہیں آئی تو اُس نے کہا کہ ہمارے یہاں ایک ہی علاج ہے، نیند آور گولی، مگر میری درخواست یہ ہے کہ چاہے کوئی بھی ڈاکٹر تجویز کرے نہ کھاویں، اس واسطے کہ نیند تو اس سے خوب آتی ہے مگر قلب کو نقصان پہنچتا ہے۔

ایک چھوٹا ڈاکٹر نوعمر شاملی کا رہنے والا اس سے تو خاص دوستی ہو گئی تھی کمپوڈر کا کام اپنے اصرار سے وہی کیا کرتا تھا اُس نے سہارنپور آ کر دو تین دن رہنے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر جس دن میں علی گڑھ سے چلا اُس کے دوسرے دن وہ آگرہ کا سول سرجن بنا کر بھیج دیا گیا۔

یہ تو شاید تفصیلات اپنی جگہ پر پہلے آ چکی ہیں، اس کے دو برس کے بعد سے دوسری آنکھ بنوانے پر اصرار شروع ہو گیا اور میری آمد و رفت حجاز کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، جب میں ہندوستان جاتا تو علی گڑھ کے احباب کا شدید اصرار آنکھ بنوانے پر ہوتا اور میں یہ عذر کر دیتا کہ میرا سفر قریب ہے اور جب حجاز آتا تو میرے محسن مخلص ڈاکٹر ظفیر الدین صاحب جو آنکھ بنانے میں بہت ماہر ہیں، جدہ کے شفاخانہ میں سول سرجن تھے اور حجاز کی آمد میں ہمیشہ طیارہ سے اُتارنے اور باہر لانے میں میرے معین رہے کہ ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے وہ طیارہ پر پہنچ جاتے تھے، کئی بار مدینہ طیبہ تشریف لائے اور آنکھ بنانے کا سامان بھی ساتھ لائے کہ میں حجرہ ہی میں آنکھ بناؤں گا اور دو دن بعد مسجدِ نبوی میں بھیج دوں گا میرا ان سے وعدہ بھی تھا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ جب بنواؤں گا آپ ہی سے بنواؤں گا، مگر اس وقت تو ہندوستان کا سفر درپیش ہے، اسی طرح یہ زمانہ گزرتا رہا مگر ہمارے قاضی صاحب جناب الحاج عبدالقادر صاحب جو میرے سفرِ حجاز کے قیام میں ہمیشہ یہاں قیام فرماتے ہیں اور اپنا اور تبلیغ کا بہت سا حرج کرتے، یہیں تشریف فرما ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے روحانی برکات کے علاوہ مادی برکات بھی بہت پہنچتی ہیں کہ مجھے اپنے مہمانوں کے کھانے، پینے، چائے ناشتہ کسی چیز کا فکر نہیں رہتا۔

قاضی صاحب ہی ماں باپ بن کر اپنے ذمہ رکھتے ہیں، اُنہوں نے میری بلا اطلاع جناب الحاج ڈاکٹر منیر لاہوری پاکستان کو جو اس فن کے بہت ماہر ہیں اور لندن سے خاص ڈگری آنکھ بنانے کی حاصل کر کے آئے ہیں، جس میں آپریشن کے بعد آنکھ کو سینا نہیں پڑتا پھر نہ ٹانکے کاٹنے پڑتے ہیں، زخم کو کسی چیز سے چپکا دیا جاتا ہے، جو خود بخود اندر ہی اندر اچھا ہو جاتا ہے ان کو خط لکھ کر

کہ زکریا کی آنکھ بنانے کے لیے چھٹی لے کر آجاؤ۔

قاضی صاحب کا مولانا انعام الحسن صاحب کے ساتھ افریقہ کا سفر بھی طے تھا مگر انہوں نے مولانا انعام الحسن صاحب کو لکھ دیا تھا کہ اگر ڈاکٹر منیر صاحب کی چھٹی اس زمانہ میں منظور ہوگئی تو میں نہیں جانے کا، مجھے اس قصے کی خبر جب ہوئی جب ڈاکٹر منیر صاحب کا خط میرے پاس آیا کہ میری چھٹی فلاں تاریخ تک منظور ہوگئی اور سامان سب ساتھ لے کر آؤں گا۔

جب میں نے تحقیق کیا کہ سامان کیسا؟ تو معلوم ہوا کہ قاضی صاحب نے کوئی منصوبہ بنا رکھا ہے اور جب میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ آپ کو تو افریقہ کا سفر درپیش ہے جو مولانا انعام صاحب کے خط سے خبر ہوئی، مگر ڈاکٹر صاحب کی جو تاریخ منظور ہوئی تھی وہ افریقہ کے اصل اجتماع کی تاریخ کے بعد تھی اس لیے قاضی صاحب افریقہ کے اجتماع میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے اور ۸ اپریل کو جدہ واپس تشریف لے آئے مگر اس زمانہ میں مکہ مدینہ کے درمیان میں سیلاب کا زور تھا اس لیے مکہ مکرمہ دو دن قیام کے بعد ۱۰ اپریل کو مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور پاکستان میں بھی ریلوں کی ہڑتال ہو رہی تھی اس لیے ہمارے ڈاکٹر صاحب کے آنے میں تاخیر ہوئی اور ۲۱ اپریل کو جدہ تشریف لا کر ۲۲ اپریل کو طیارہ سے مدینہ تشریف لائے، سید آفتاب صاحب بن مولانا بدر عالم نور اللہ مرقدہٗ اپنی کار میں مطار سے ان کو لائے۔

سابقہ تجویز تو یہ تھی کہ مدرسہ شرعیہ میں میرے ہی حجرہ میں آپریشن ہوگا مگر یہاں شور و شغب کی وجہ سے سب کا مشورہ یہ ہوا کہ آپریشن تو شفا خانہ میں ہونا چاہیے، اس لیے ۲۴ اپریل کو صبح کو سید آفتاب صاحب کی کار میں ہسپتال گیا اور دو گھنٹے بعد وہاں آپریشن ہوا جس میں ہسپتال کے مدیر اور جناب الحاج ڈاکٹر ظفر احمد صاحب بھی شریک تھے، ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ بہت ہی جزائے خیر دے کہ اُنہوں نے از راہِ شفقت خود ہی یہ فرمایا کہ اجازت ہو تو میں بھی آپریشن کے وقت آجاؤں۔

مجھے تو بڑی شرم آرہی تھی کہ وہ بار بار اصرار کر چکے تھے اور میں وعدہ بھی کر چکا تھا مگر قاضی صاحب نے سارا منصوبہ میری بغیر اطلاع کے بنا دیا تھا اس لیے میں مجبور تھا، ڈاکٹر منیر نے ڈاکٹر ظفر سے کہا کہ ضرور تشریف لادیں چنانچہ وہ بھی تشریف لے آئے۔

۲۸ کی صبح کو ہسپتال سے مدرسہ واپسی ہوئی، یہاں آنے کے تقریباً ایک ماہ بعد میرے دوستوں نے بتایا کہ تو اپنی تین دن کی نمازیں قضا کیجیے، ان تین دن میں تجھے نیند کی گولیاں اور غفلت کے انجکشن کثرت سے لگتے رہے، جس سے بہت ہی رنج اور قلق ہوا، اللہ تعالیٰ ہی معاف فرمائے۔

عزیزم الحاج ابوالحسن میرے آپریشن کی خبر سن کر ایک دم تڑپ گیا اور بار بار اس کے دمادم خطوط آئے کہ میں آپریشن کے موقع پر ضرور آنا چاہتا ہوں، اس کو اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے کہ علی

گڑھ کے آپریشن میں بھی وہ کثرت سے آتا جاتا رہا، چنانچہ عزیز موصوف بھی بمبئی سے بذریعہ طیارہ ظہران اور وہاں سے بذریعہ طیارہ ۱۸ اپریل کو عین جمعہ کے وقت جب کہ میں مسجد میں جاچکا تھا مسجد میں پہنچا اور میرے مخلص احباب ڈاکٹر اسماعیل اور صوفی اقبال محض اندازہ پر مطار پہنچ گئے تھے کہ ظہران سے آنے والا جہاز قبیل جمعہ یہاں پہنچتا تھا اس وجہ سے عزیز موصوف کو جمعہ بھی مل گیا، اللہ تعالیٰ اس کو بہت جزائے خیر عطاء فرمائے کہ میری راحت رسانی میں بہت ہی کوشاں رہتا ہے نہ کسی کی طعن و تشنیع کی پرواہ کرتا ہے نہ میری ڈانٹ کا، اس کے یہاں ڈاکٹروں کے احکام میری درخواست پر بھی مقدم ہیں، اس کے تفصیلی حالات تو آپ بیتی اور مختصرا اکابر کے رمضان میں آئے ہیں۔

ڈاکٹر منیر صاحب اپنی چھٹی ختم ہوجانے کی وجہ سے ۱۳ مئی کو تشریف لے گئے اور ابوالحسن کو ساری دوائیں لکھوا گئے جس کو عزیز موصوف بہت اہتمام سے کرتا رہا، ڈاکٹر ظفیر صاحب بھی دو جمعہ آنکھ دیکھنے کے لیے تشریف لاتے رہے مگر چونکہ وہ طیارہ سے آتے تھے اور ہمراہ طیارے سے واپس جاتے تھے اور دوسو (۲۰۰) ریال کا ٹکٹ تھا، زکریا کے اصرار پر بھی اُنہوں نے کرایہ لینے سے انکار کردیا اس لیے زکریا نے کہہ دیا کہ بار بار تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں، دوائیں تو آپ نے ملاحظہ فرما ہی لیں، جون کے پہلے ہفتہ میں ڈاکٹر منیر بھی کہہ گئے اور آپ کی بھی رائے ہے تو اس وقت اگر ملاحظہ کی ضرورت ہوگی تو تکلیف فرمالیں، ان کے آنے میں تاخیر ہوئی اس لیے ان کے ٹیلیفون سے ۲۱ جون کو دس نمبر کا آئینہ لگایا گیا، ڈاکٹر کو بھی تقاضا کر گئے تھے کہ وہ وقتاً فوقتاً دیکھتے رہیں، میں نے بھی اُن کو کئی مرتبہ اطلاع دی مگر وہ تو تشریف نہیں لاسکے۔

ڈاکٹر ظفیر صاحب سے ٹیلیفون پر ان کے بار بار دریافت کرنے پر حالت بتائے جاتے تھے اور وہ دواؤں میں تغیر کرتے رہتے تھے، جس کی تفصیلی اطلاع عزیز ابوالحسن ڈاکٹر منیر کو کرتا رہتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب کا کوئی خط نہیں آیا، معلوم نہیں میرا خط نہیں پہنچا یا اُن کا جواب نہیں پہنچا یا خط لکھنے کی فرصت نہیں ہوئی، اسی لیے میں اب تک انتظار کر رہا تھا کہ میری رائے یہ تھی کہ آنکھ اُسی سے بنوائی جائے جس سے ہر وقت ملاقات ہوسکے اور چونکہ ہندستان کو سفر بار بار ہوتا تھا اس لیے ڈاکٹر ظفیر صاحب سے بنوانے کی نوبت آئی اور علی گڑھ میں بنوانے کی نوبت آئی۔

مولانا انعام الحسن صاحب ۱۸ مارچ کو افریقہ روانہ ہوئے تھے اور دس بارہ ملکوں میں مارشیش، ری یونین، جنوبی افریقہ، موزمبیق، روڈیشیا، ملاوی، کینیا، تنزانیہ وغیرہ وغیرہ ہوکر ۶ مئی کو جدہ پہنچے، اصل اجتماع ۲۸ مارچ سے ۳۱ مارچ تک کینیا اور جنوبی افریقہ کا تھا، باقی سارا دورہ تبعا، جس کی تفاصیل مولانا محمد عمر صاحب کی کاپی میں ہیں اور مولوی محمد سلیمان جھانجھی کے

خطوط میرے کاغذات میں ہیں۔

۶ مئی کو جدہ اور ۱۰ مئی کو مدینہ منورہ تشریف لائے، ۳۱ مئی کو یہاں سے عزیز سلیم کی کار میں اور بقیہ رفقاء جو تقریباً ۴۰ کے قریب تھے عبدالحفیظ کی کار اور اونیٹ میں مکہ سے جدہ اور جدہ سے عین زوال کے وقت پی آئی اے کے طیارہ کی پرواز تھی، مگر اللہ جل شانہ کے فضل سے جہاز لیٹ ہوا اس لیے ظہر جدہ کے مطار پر اور عصر کراچی کے مطار پر پڑھی۔

وہاں بڑا ہجوم تھا، مولانا بنوری مطار پر تشریف فرما تھے، وہاں نماز کے بعد بڑی طویل دُعاء ہوئی اس کے بعد مکی مسجد کے لیے روانہ ہوئے، مغرب راستہ میں پڑھی، مکی مسجد میں اتنا ہجوم تھا کہ کاریں باہر روکنی پڑیں عشاء کے بعد مختصر بیان ہوا، پھر حیاۃ الصحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پڑھی گئی، ۱۶ جون کو کراچی سے بمبئی پہنچے۔

یہ آپ بیتی کوئی مستقل تصنیف نہیں یہ کئی دفعہ لکھا جا چکا ہے کہ کشکول ہے کوئی بات یاد آ جائے اور طبیعت میں تقاضا ہو جائے تو بے جوڑ بھی لکھوا دیتا ہوں، آج ۹ جمادی الثانیہ ۹۵ھ مطابق ۱۸ جون ۷۵ء کو اپنے چچا نور اللہ مرقدہٗ اعلیٰ اللہ مراتبہ کا ایک واقعہ یاد آ گیا اور طبیعت میں بہت ہی تقاضا ہوا کہ اس کو ضرور لکھنا چاہیے۔

یہ تو میں اپنی مختلف تالیفات میں نہ جانے کہاں کہاں لکھوا چکا ہوں کہ کاندھلہ میں ہمارے خاندان کے آپس کے تعلقات مودت، محبت، اخلاص ایسے ضرب المثل تھے کہ دور دور تک شہرہ تھا اور میری پیدائش سے پہلے کا یا پیدائش کے بعد بے شعوری کے زمانہ کا ایک واقعہ دو بھائیوں کا بھی لکھوا چکا ہوں کہ دو حقیقی بھائیوں میں ایک جائیداد پر مقدمہ بازی تھی، کاندھلہ سے سات میل کیرانہ میں تحصیل تھی جس میں مقدمہ تھا، دونوں بھائی رئیس تھے، دونوں کے پاس اپنی بیل گاڑیاں تھیں، جونسا بھائی اپنے بہلوان کو گاڑی جوڑنے کو کہہ دیتا دوسرا بھی اسی میں بیٹھ جاتا، نہ پوچھا نہ کچھ۔

کیرانہ جا کر ایک ہی سرائے میں قیام ہوتا، وہاں پہنچ کر بھٹیاری سے جونسا پہلا کھانے کو کہہ دیتا دوسرا اُسی کے ساتھ کھانا کھاتا اور عدالت میں خوب زوردار بحثیں ہوتیں اور عدالتی کمرہ سے باہر آ کر پھر بھائی بھائی۔

بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا، چھوٹے بھائی نے مرحوم کی اہلیہ کے پاس مقدمہ کے سارے کاغذات بھیج دیئے اور کہلا بھیجا کہ میری لڑائی بھائی سے تھی تم سے یا ان کے بچوں سے نہیں، ان کاغذات کو چاہے جلا دو اور اب فیصلہ وہ ہوگا جو تم کہو گی، یہ قصہ تو میں نے اپنے والد صاحب سے ابتداً سنا تھا مگر پھر تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے گھر کا بڑا مشہور قصہ ہے۔

یہ دور میرے عنفوان شباب تک رہا اس کے بعد کاندھلہ میں الیکشن کی لعنت پہنچ گئی، گھر گھر میں لڑائی، باپ بیٹوں میں مخالفت، بھائی بھائی میں مخالفت، الیکشن تو بڑی قیمتی چیز تھی اور بڑی کار آمد اور بہت مفید بشرطیکہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خلافت کے سلسلہ میں حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جیسا الیکشن ہوتا، یہ قصہ تو بہت طویل ہے لیکن کتب حدیث اور کتبِ تواریخ میں بہت مشہور ہے، کسی مولوی سے سنا جا سکتا ہے۔

اسی دوران میں اپنے عزیزوں میں دو بزرگوں میں لڑائی تھی، دونوں نیک ایک عمر میں بڑے مگر چچا جان نور اللہ مرقدہٗ سے رشتہ میں دور، دوسرے عمر میں چھوٹے مگر رشتہ میں بہت قریب اور مسجد کے امام بھی تھے، بڑے نے اس مسجد میں نماز پڑھنی بھی چھوڑ دی، میرا یا چچا جان نور اللہ مرقدہٗ کا اس دور میں ایک دو دن کے لیے صرف جانا ہوا کرتا تھا اور جانے پر وہاں کی نئی سیاست اور نئی لڑائیوں کے قصے سننے میں آتے تھے۔

ایک مرتبہ چچا جان کاندھلہ تشریف لے گئے یہ ناکارہ بھی ساتھ تھا، چھوٹوں سے چونکہ قرابت زیادہ تھی، اس لیے چچا جان نے ان سے درخواست کی اور مصالحت فضائل اور صلح کی ابتداء کی درخواست کی اور ان کو راضی کر کے بڑوں کے گھر لے گئے، معافی مانگنے پر آمادہ کر لیا کہ وہ بڑے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان چھوٹے کو بہت ہی جزائے خیر دے بہت بلند درجے عطاء فرمائے، یہ گئے اور جا کر معافی کی درخواست کی، مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، ان بڑوں نے پہلے تو ان کی کمر پر تھپڑ مارا اور پھر مصافحہ کیا صلح صفائی ہو گئی، مجھے چچا جان کی جو ادا اُس وقت پسند آئی وہ یہ کہ جب وہاں سے چلنے لگے تو چچا جان نے ان بڑوں کے پاؤں کو بوسہ دیا تھا میرے اکابر کا معمول یہی رہا اور میں نے بہت ہی دیکھا:

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

اس وقت یہ مضمون ایک خاص وقتی ضرورت سے ذہن میں آ گیا اگرچہ اکابر کا معمول مخالفین کے ساتھ پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے، میری اپنے دوستوں کو نصیحت ہے کہ مخالفت کے حدود ہوتے ہیں جس میں آج کل بہت ہی افراط و تفریط ہو رہی ہے، جس سے ذرا سی مخالفت ہوئی ہر برائی اس کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے محض تو ہمات پر حکم لگائے جاتے ہیں، حالانکہ قرآن پاک کا ارشاد ہے ''اِن السمع والبصر والفوأد کل اولئک کان عنہ مسؤلا'' اللہ جل شانہ کا پاک ارشاد ہے کہ کان، آنکھ، دل ہر چیز سے قیامت میں سوال کیا جائے گا بلا تحقیق ایسی حالت

میں کہ ہماری اس سے مخالفت ہے ہر چیز کو اس کی طرف منسوب کر دینا بڑی سخت ذمہ داری ہے۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیلة

کما أن عین السخط تبدی المساویا

(محبت کی آنکھ ہر عیب سے اندھی ہوتی ہے جیسا کہ غصہ کی آنکھ ہر عیب کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک قصہ یاد آ گیا ایک صاحب کے یہاں چولہے پر دودھ کا دیگچہ رکھا ہوا تھا اور اس پر ملائی خوب جمی ہوئی تھی وہ جب آئے تو گھر میں سے کُتا نکل رہا تھا اُس کا منہ دودھ میں بھرا ہوا تھا بلکہ دودھ ٹپک رہا تھا، دودھ کے اندر ملائی ٹوٹی ہوئی تھی، مولوی نے فتویٰ دیا کہ دودھ ناپاک ہے اس واسطے کہ ظاہر یہی ہے۔

ایک محقق عالم نے سوال کیا کہ کتے کو دودھ میں منہ ڈالتے کسی نے دیکھا ہے؟ لوگوں نے کہہ دیا کہ دیکھا تو ہے نہیں، انہوں نے کہہ دیا کہ دودھ پاک ہے۔

بعض لوگوں کو علماء سے للہ بغض ہوتا ہے، اسی قسم کے ایک صاحب نے اس فتوے کو بہت اُچھالا، ان عالم پر بڑی گالیاں برسائیں، ہر جگہ جا کر اس کا چرچہ کرتے کہ فلاں مولوی صاحب نے ایسا غلط فتویٰ دے دیا، مالک کے یہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں۔

چند سال بعد یہ صاحب جنگل سے آ رہے تھے، راستہ میں ایک غار میں سے کچھ آواز گڑ گڑانے کی آئی، انہوں نے وہاں جا کر دیکھا تو ایک آدمی تازہ مرا پڑا ہے، خون نکل رہا ہے، ایک چھُری بھی خون میں بھری پڑی ہے، یہ اُدھر کو حالت دیکھنے کے واسطے گئے تھے، پیچھے سے دو تین آدمی اور آ گئے اُن کو غار میں سے نکلتے دیکھا، ان کو پکڑ لیا، قاضی کے یہاں مقدمہ پہنچا۔

قصہ تو بڑا طویل ہے، انہوں نے درخواست پیش کی فلاں مولوی صاحب سے مسئلہ دریافت کیا جائے، ان مولوی صاحب نے یہاں بھی یہی سوال کیا کہ کسی نے قتل کرتے دیکھا؟ اور جب ان عالم صاحب نے فتویٰ دیا جو پہلے کتے کے مسئلہ میں دیا تھا تو ان معترض صاحب کی جان خلاصی ہوئی۔

یہاں ایک بات اور بھی ضروری قابلِ تنبیہ یاد آئی، شاید پہلے بھی لکھوا چکا ہوں اور چونکہ آج کل چند واقعات اس قسم کے پیش آ رہے ہیں اس واسطے جی تو بہت تفصیل سے لکھوانے کو چاہ رہا ہے مگر طبیعت بہت گری ہوئی ہے اس لیے مختصر ہی پر قناعت کر رہا ہوں اور دو ضروری چیزوں پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں۔

بڑی اہم تو یہ ہے کہ محض معمولی سی مخالفت پر ہر چیز کو بلا تحقیق دوسرے کے ذمہ تھوپنا بڑی خطرناک چیز ہے اور پھر قیاسات سے ان کو روایات بنا دینا بڑی سخت ذمہ داری ہے، اس سے

میرے دوستوں کو بڑے احتراز کرنے کی ضرورت ہے، یہ بہت خطرناک چیز ہے دوسری چیز نہ معلوم کتنے دفعہ لکھوائی ہوگی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ظلم کسی پر نہیں۔

"اِن اللّٰــہ لا یظلــم مثقــال ذرۃ" (اللہ تعالیٰ ایک ذرہ کے مقدار میں بھی کسی پر ظلم نہیں فرماتے)۔

لیکن ایک بہت قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گرفت میں جلدی نہیں ہوتی، مہلت اور ڈھیل دی جاتی ہے کہ شاید یہ توبہ کرلے اور اپنی حرکت سے باز آجائے اور جب یہ نہیں ہوتا تو گرفت ہوتی ہے لیکن جب گرفت ہوتی ہے تو اس وقت اتفاق سے کوئی واقعہ ایسا ہو چکا ہوتا ہے جس میں یہ بے گناہ ہوتا ہے مگر وہ واقعہ چونکہ قریب کا ہوتا ہے یہ سمجھتا ہے کہ اس واقعہ میں گرفت ہوئی ہے، حالانکہ یہ گرفت اس سے پہلے واقعہ کی وجہ سے ہوئی ہوتی ہے، اس لیے اس شور مچانے کی بجائے کہ میں تو بے قصور ہوں مجھ پر ظلم ہوا، فلاں نے جھوٹا الزام مجھ پر لگا دیا وغیرہ وغیرہ۔

بہت غور سے بیٹھ کر اپنی پرانی حرکتوں کو سوچا کریں اور بہت زور سے استغفار میں مشغول رہا کریں، بہت اہتمام سے توبہ کیا کریں۔

"ماأصاباکم من مصیبة فبما کسبت أیدیکم و یعفو عن کثیر"

"جو مصیبت تم پر پیش آتی ہے تمہارے ہی اعمال کا ثمر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو بہت معاف کرتے ہیں"۔

حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مشہور قصہ ہے کہ جب ان کے سر میں درد ہوتا تو سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کرتیں کہ اللہ! "مجھ سے کیا گناہ ہوا۔"

اگر چہ بعض موقع پر کسی دوسری مصلحت سے تکالیف پہنچتی ہیں، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، مجھے تو اس وقت چند وقائع کی وجہ سے اس اہم مضمون کو بیچ میں ذکر کر دینا تھا۔

اس سلسلہ کی بہت اہم بات یہ بھی ہے کہ انتقام جوارح سے نہیں ہوتا بلکہ بددعاؤں سے بھی ہوتا ہے، کسی پر انتقامی جذبہ میں بددعاء ہرگز نہیں کرنی چاہیے، بالخصوص علماء اور سیدوں پر کہ جو واقعات تمہارے نزدیک ان کی طرف منسوب ہیں اُن کی قطعیت تو معلوم نہیں، ممکن ہے کہ کتے کے دودھ کی طرح سے واقعہ کسی اور کا ہو اور تم اپنے قیاس سے کسی کی طرف منسوب کر کے اس پر بدُعائیں شروع کر دو تو اس کے حق میں تم ظالم ہو گئے۔ یہ تو بہت اُونچی چیز ہے کہ تم انتقام کا ارادہ ہی نہ کرو۔

"ولمن صبرو غفران ذالک لمن عزم الامور"

لیکن اگر اس پر قدرت نہ ہو اور آدمی سے بدُعاء کیے بغیر رہا نہ جائے تو نام لے کر نہ کرے بلکہ یوں کہے یا اللہ! "جس نے میرے ساتھ ظلم کیا تو ہی اس کا بدلہ دے میں تو عاجز ہوں تو ہی

میری حفاظت فرما۔‘‘

اسی کے ساتھ بیچ میں ایک مضمون اور ضرورۃً پیش آ گیا، وہ یہ کہ میں اس مضمون کو آپ بیتی میں کئی جگہ لکھوا چکا ہوں مگر آج کل پھر اس کا زور ہو رہا ہے کہ اکابر کے بعض خلفاء پر لوگ تنقیدیں کرتے ہیں اور وہ صورۃً تو ان لوگوں پر تنقید ہوتی ہے مگر پس منظر ان اکابر پر ہوتی ہے جنہوں نے اجازت دی۔

ان میں زیادہ تر حصہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جن میں بدگمانیوں کو زیادہ دخل ہوتا ہے، محض سنی سنائی باتوں پر بلا تحقیق بدگمانیاں اور غلط فہمیاں اس کا سبب ہوتی ہیں، حالانکہ اس کے متعلق تو میں کئی دفعہ تنبیہ کر چکا ہوں کہ آدمی کو دوسروں کی فکر نہیں کرنی چاہیے، اپنی فکر رکھنی چاہیے، قیامت میں کسی سے یہ سوال نہیں ہونے کا کہ فلاں نے فلاں کو اجازت کیوں دی تھی، وہاں سوال تو اپنے ہی اعمال سے ہوگا:

مرا پیر دانائے مرشد شہاب
دو اندرز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ بر خویش خودبیں مباش
دگر آنکہ بر غیر بدبیں مباش

اس لیے آدمی کو اپنے اعمال میں فکر کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی توفیق عطاء فرمائے کہ یہ ناکارہ ’’ما استقمت فما قولی لک استقم ‘‘ میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اکابر پر تنقید کی نحوست سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ غیب کا علم تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں ہے، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

’’حوضِ کوثر پر چند لوگ میرے پاس پیش کیے جائیں گے۔‘‘

’’لیردنّ علی أقوام أعرفھم و یعرفوننی ثم یحال بینی و بینھم فأ قول إنھم منی فیقال إنک لا تدری ما أحدثو بعدک فاقول سحقا سحقالمن غیّر بعدی۔‘‘

’’حوضِ کوثر پر کچھ لوگ میرے پاس پیش کیے جائیں گے جن کو میں پہچانتا ہوں اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے، پھر میرے اور ان کے درمیان آڑ کر دیا جائے گا میں کہوں گا یہ تو میری اُمت میں سے ہیں تو کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد دین میں کیسا تغیر کر دیا تو میں کہوں گا کہ ہلاکت ہو ان لوگوں کے لیے جنہوں نے میرے بعد دین میں تغیر پیدا کیا۔‘‘

فتح مکہ کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معافی عامہ کا اعلان فرمایا اور فرمایا:
''جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے اُس کو بھی امن ہے جو ابوسفیان کے گھر میں ہو جائے اُس کو بھی امن ہے وغیرہ وغیرہ۔''
ایک شخص نے آکر کہا کہ حضور! ابن خطل کعبہ کے پردہ سے لپٹا ہوا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قتل کر دو'' حالانکہ یہ شخص کاتبِ وحی تھا مسلمان ہو چکا تھا اور بھی اس قسم کے متعدد واقعات حدیث میں آئے ہیں۔

مشائخ حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم تو کیا صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے اور آج کل کے مشائخ تو قدماء مشائخ کے بھی برابر نہیں ہو سکتے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد والوں کا حال معلوم نہ ہو سکا کہ کیا کریں گے تو مشائخ کو علم غیب تو ہوتا نہیں، موجودہ حالت پر اجازت دی جاتی ہے اگر بعد میں کسی کی حالت بدل جائے تو اکابر پر اس کا کیا الزام آسکتا ہے، اس لیے بہت ہی ڈرنے کی چیز ہے۔

میرا جی تو اس کو بہت تفصیل سے لکھوانے کو چاہ رہا تھا مگر طبیعت اس وقت خراب بھی ہے، موت وحیات کا اعتبار نہیں، اس لیے دوستوں کو تنبیہ کے واسطے یہ مختصر لکھوا دیا جہاں صریح بے دینی کسی خلیفہ کی معلوم ہو جائے اُس وقت بھی اکابر پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے، اس میں اپنے آپ کو ہی برباد کرنا ہے، اس لیے کہ جیسا اُوپر لکھا گیا اجازت تو اجازت کے وقت کے حالات پر ہوتی ہے، اگر اجازت کے وقت کسی شخص کا حال اس قابل ہو اور بعد میں بدل جائے تو اس میں اجازت دینے والے پر کیا الزام ہو سکتا ہے۔

حضرت تھانوی قدس سرۂ کے یہاں تو تنبیہات وصیت کا ضمیمہ ہر سال چھپتا تھا، اس میں بعض خلفاء کے متعلق لکھا جاتا تھا کہ اب وہ دوسرے کام میں لگ گئے یا اب اہل نہیں رہے۔ لہٰذا اب اجازت باقی نہیں رہی۔

حضرت شیخ الاسلام مدنی نور اللہ تعالیٰ مرقدۂ اپنے مکاتیب (ص ۱۶۶ جلد ۴ مکتوب نمبر ۴۹) میں تحریر فرماتے ہے اجازت کے لیے الہام اور کشف ضروری نہیں ہے، ممکن ہے بڑوں میں یہ پایا گیا ہو مگر ہم جیسے ناکارہ اور نالائق ایسی قابلیت کہاں رکھتے ہیں اجازت استعداد اور قابلیت پر ہوتی ہے''۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معیارِ قابلیت اجازت مندرجہ امور تھے، مرقومات امدادیہ صفحہ نمبر ۳۰۹ کے حاشیہ پر فرماتے ہیں وہ امور بنائے خلافت یہ ہیں۔
(۱) صلاحیت ظاہرہ قدر معتد بہ۔ (۲) مناسبت طریق علماً و عملاً۔ (۳) توقع اہتمام صلاحیت و

رسوخ حال مگر حضرت گنگوہی قدس سرہٗ العزیز فقط امور مذکورہ بالا پر اکتفاء نہیں فرماتے تھے جب تک ملکہ یادداشت پیدا ہو کر قائم نہ ہو جائے جب تک اجازت نہیں دیتے، ملکہ یادداشت کی تعریف ''صراط مستقیم'' میں حسب ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

''وحقیقش التفات دائمی ست بسوئے ذات بے چوں و بچگون درہمہ اوقات نشست و برخاست برکاست وعروض مکاسب ومصائب واوقات خوردن وآشامیدن بہ حیثیتے کہ ہیچ امر مانع التفات نہ گردد، بمثا آنکہ ہرگاہ محبت چیزے یا اہتمام کارے دردل شخصے کہ راسخ می گردد پس درعین اشتغال بحوائج ضروریہ اعمالِ معاشیہ کما ینبغی بسوئے ہمہ امر متوجہ می ماند''

(ص ۱۰۸)

الغرض ہر وقت ذاتِ مقدسہ جناب باری عزوجل کی طرف متوجہ رہے اور اس کو بلا رنگ وروپ تمام کمالات سے متصف اور تمام نقائص سے منزہ دھیان میں رکھے کہ وہ ہر چیز کا دیکھنے والا سب سے زیادہ قریب اور ہر وقت میں ساتھ ہے اپنی توجہ اور دھیان میں ہمیشگی پیدا کرنی چاہیے، اسی کو ملکہ یادداشت کہتے ہیں، اپنے تمام کاروبارِ دینی اور دنیوی انجام دیتے ہوئے بھی اس التفات اور دھیان کو قائم رکھنا چاہیے۔ فقط

مختصر الفاظ میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت مدنی قدس سرہما کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ سخت گرمی کے زمانہ میں روزہ دار کو پیاس کی شدت کی وجہ سے جو اثر ہوتا ہے وہ اثر ہونا چاہیے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے دل میں برابر لگی ہوئی

اس ناکارہ کو جب میرے مرشد حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ نے اجازت دی تھی اس کے بعد تو حضرت کی خدمت میں قیام کی بہت کم نوبت آئی اور اس کے ساتھ ساتھ پوچھتے ہوئے ڈر بھی معلوم ہوا کہ ابھی سے مشیخیت کا خواب دیکھنے لگا البتہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے کئی سال بعد اس سیہ کار نے پوچھا تھا کہ اجازت کن چیزوں پر دی جاتی ہے تو حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے نہایت مختصر الفاظ میں بڑی جامع بات ارشاد فرمائی تھی کہ شیخ کے قلب پر بلا کسی محرکِ ظاہری کے بار بار تقاضا ہو اس کو اول چند مرتبہ دفعہ کیا جائے اس کے بعد بھی اگر یہ تقاضا غالب رہے تو اجازت دی جائے۔ فقط

بندہ کے خیال میں اکابر کے طرز سے جو چیز میں نے استنباط کی وہ مرید کے قلب میں اجازت کا داعیہ بلکہ واہمہ بھی نہایت مضر ہے، میں نے اپنے اکابر کو بہت کثرت سے دیکھا کہ جس کے متعلق بھی یہ خیال ہو جاتا کہ یہ خلافت کا اُمیدوار یا خواہش مند ہے اس کو اجازت دینے میں بہت دیر کرتے۔

کسی سے بیعت ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ فلاں کا مجاز ہے بلکہ اس کے موجودہ حالات کا دیکھنا ہے کہ اتباعِ شریعت کس درجہ میں ہے کہ اصل مدار اتباعِ شریعت ہے، اتباعِ سنت میں جو شخص جتنا عالی ہوگا اُتنا ہی مقتدا بننے کے قابل ہے کسی پر بدگمانی کرنا دوسری چیز ہے اور اُس کا معتقد ہو کر بیعت ہونا دوسری چیز ہے ان دونوں میں بہت فرق ہے اور دونوں میں احتیاط کی ضرورت ہے کسی پر بدگمانی کرنے میں بھی اور کسی کو شیخ بنانے میں بھی، ارشاد الملوک میں شیخ بنانے کے لیے جو شرائط لکھی ہیں وہ بہت اہتمام سے دیکھنے کی ہیں اُن کو سرسری نہیں سمجھنا چاہیے، بہت اہتمام سے دونوں مضمونوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھنا چاہیے اور اس پر عمل بھی کرنا چاہیے، محض سنی سنائی باتوں پر نہ بدگمانی کرنی چاہیے نہ شیخ بنانا چاہیے۔

ارشاد الملوک صفحہ ۷ میں شیخ بنانے کی شرائط بہت تفصیل سے لکھی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک کے لیے شیخِ کامل کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ اس کے راستہ کا رفیق بنے اور اس کو راستہ کی اونچ نیچ سمجھاتا رہے جس کا اصل مدار اتباعِ سنت اور اتباعِ شریعت پر ہے اور طریقہ کار میں تجربہ کار ہونا ضروری ہے، اس کا شریف النسب ہونا ضروری نہیں بلکہ بہت سے غریب و نادار اور وہ پیشہ ور جن کو لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے باعزت مشائخ بن چکے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''کسی کا ظاہری اسلام تم کو مسرور نہ بنائے جب تک اس کی قلبی حالت اور عقیدہ سے پوری واقفیت حاصل نہ کرلو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ حقانیت کا مدار اصلاح عقائد پر ہے۔

پس جو شخص اجماعِ اُمت اور کتاب وسنت کے موافق عقائد رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ طریقت وحقیقت کے علم کا بھی ماہر ہو وہ بے شک شیخ بنانے کے قابل ہے اور یہ حالات اس کے مریدوں کے حالات اور ہم عصر ثقہ و دیندار لوگوں کی زبانوں سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس کے مریدوں کے دین کی پختگی اور اتباعِ شریعت میں کیا حالت ہے اور صلحاء زمانہ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ سو اگر علماء وقت اس پر معترض نہ ہوں بلکہ بعض اہلِ علم اور سمجھدار صلحاء اور اہلِ دانش بھی اس سے فیض حاصل کرتے ہیں اور دینی محبت اس سے رکھتے ہوں اور طریقت وحقیقت میں مستند تسلیم کرتے ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ درحقیقت وراہِ حق کا ماہر ہے پس اُس کا دامن پکڑ لینا چاہیے

اور جب اُس سے بیعت کر لے تو دل سے اُس کا فرمانبردار بن جانا اور توحیدِ مطلب کے ساتھ اس کی اطاعت کا حلقہ کان میں پہن لینا چاہیے۔

توحید مطلب یہ ہے کہ اپنے شیخ کے متعلق اس کا یقین رکھے کہ دنیا میں اس کے علاوہ مجھ کو مطلوب تک کوئی نہیں پہنچا سکتا اور اس زمانہ میں دوسرے مشائخ بھی ہوں اور انہی اوصاف کاملہ سے متصف بھی ہوں مگر میرا منزلِ مقصود پر پہنچنا اسی ایک کی بدولت ہوگا سو توحیدِ مطلب سلوک کا بڑا رکن ہے اور جس کو یہ حاصل نہ ہوگا وہ پراگندہ و پریشان اور ہر جائی بنا پھرے گا اور کسی جنگل میں بھٹکتا ہوا کیوں نہ ہلاک ہو جائے حق تعالیٰ کو مطلق پرواہ نہ ہوگی، یہ مضمون بہت ہی اہم اور سالکین کے بہت غور سے اصل کتاب میں پڑھنے کا ہے۔

اسی دوران میں حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ (صفحہ ۱۲) ''مجذوب اگرچہ مطلوب تک پہنچا ہوا ہوتا ہے مگر چونکہ راستوں کی آفتوں سے انجان اور راہ کی بلاؤں سے بے خبر ہوتا ہے اس لیے شیخ بنائے جانے کے قابل نہیں، کیونکہ راستہ قطع کرانا اور رہبری اس سے نہیں ہو سکتی''۔

پس شیخ میں جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے وہ یہ ہیں کہ قرآن و حدیث کا عالم ہو اور عالمِ ہی ہونا کافی نہیں بلکہ صفاتِ کمال سے متصف ہو، دنیا اور جاہ و مال کی محبت سے رُوگرداں ہو، ایسے مشائخِ ربانیین سے طریقت حاصل کیے ہوئے ہوں۔ جن کا سلسلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل ہو، اپنے شیخ کے حکم کے موافق ریاضت ومجاہدہ کر چکا ہو کہ گفتگو، کھانا، سونا، مخلوق سے ملنا جلنا کم اور صدقہ وسکوت، نماز روزہ میں کثرت رکھ چکا ہو، مکارمِ اخلاق اور حسنِ ادب مثلاً صبر، شکر، توکل، یقین، سخاوت، قناعت، امانت، بردباری، تواضع اور آخرت پر کفایت، صدق، اخلاص، حیاء، وقار، سکون اور کام کو سوچ سمجھ کر کرنا اور جاہ و مال وغیرہ کو خیر باد کہہ دینا اس کی خصلت بن چکا ہو۔

مشعلِ نبوت کی روشنیاں اپنے اندر پیدا کر کے جملہ اخلاق ذمیمہ تکبر وخود پسندی، بخل وحسد کینہ، حرص وامل وخفیف الحرکاتی وغیرہ کو مضمحل بنا چکا ہو، بے تکلف مجاہدہ و ریاضت کی صورت تجلیات کے ساتھ حلاوت ولذت پانے کے سبب اس کے چہرے پر چمک رہی ہو، دنیا اور اہل دنیا سے خلوت اختیار کر کے دریائے جلال کے سیراب ہوا ہو، شطحیات یعنی ایسی باتیں جو غلبہ حال ومستی میں بے اختیار نکل جاتی ہیں جو بظاہر خلافِ شرع میں اس کی زبان سے نہ نکلتی ہوں، نیز شیخ کا جملہ علوم پر حاوی ہونا ضروری نہیں بلکہ عبادات میں فرائض وسنن ونوافل کی مقدار، محرمات وممنوعات کی اقسام اور جائز وناجائز کی تمیز کے قابل علم کافی ہے۔

کوچہ گرد، سیرانی نہ ہو کہ فضول سیر وسیاحت کرتا پھرے نہ دنیا پرست ہو نہ زینت وجاہ کا

طلبگار ہو، نہ مریدوں کی کثرت کا خواہش مند ہو، یہ طویل مضمون ہے اور بہت اہم شیخ بننے کے لیے اس کا دیکھنا ضروری ہے، ارشادالملوک صفحہ ۷ سے صفحہ ۱۶ تک یہ مضمون شیخ بننے کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔

سفر ہند ۱۳۹۵ھ

یہ ناکارہ جیسا کہ پہلے بھی لکھوا چکا ہے، جب تک کسی علمی کام کے قابل رہا باوجود اکابر کے تقاضے کے بھی حجاز کا ارادہ نہیں کیا، حضرت شیخ الاسلام مدنی اور حضرت رائے پوری نوراللہ تعالیٰ مراقدھما کے اصرار کے باوجود بھی ان اکابر کی ہمراہی نہ اختیار کرسکا، لیکن جب علمی کام کا نہ رہا جس کی ابتداء تو ۸۲ھ کی اسٹرائیک سے ہوئی جس کی تفصیل کہیں لکھوا چکا ہوں کہ مجھے اس کا بہت ہی رنج اس واسطے پہنچا کہ میں نے اس سال بہت اہتمام اس کا کیا تھا کہ طلبہ حدیث حقیقی معنی میں طالبِ علم اور مقتداءِ قوم بن کر نکلیں۔

بخاری کے اسباق میں روزانہ کچھ نہ کچھ نصیحتیں اور تنبیہوں میں اور طلبہ کے ان کے مقام پہچاننے میں خرچ کرتا اور یقین کر رہا تھا کہ اس سال کے طلبہ انؔ شاء اللہ تعالیٰ بہترین نمونہ ہوں گے جس کی تفصیل تو اپنی جگہ پر گزر چکی کہ میری تدریس سے بددلی کی ابتداء تو یہاں سے ہوئی اور اس پر مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے شدید اصرار ۸۲ھ سے سفرِ حجاز کا سلسلہ شروع ہوا اور مولانا مرحوم اس سال حجاز والوں سے وعدہ کر گئے تھے کہ ہر تیسرے سال میں آؤں گا اور زکریا بھی میرے ساتھ آئے گا۔ وہ خود چل دیئے مگر میرے لیے سفرِ حجاز کا راستہ کھول گئے اور مجھے بھی یہ خیال ہوا کہ جب علمی کام نہیں ہے تو دارالکفر میں خالی پڑے رہنے کی بجائے دیارِ حبیب اللہ میں وقت گزر جائے تو یہاں کی برکات میں سے اس ناکارہ پر بھی شاید کچھ اثر پڑ جائے۔ اس لیے جی تو یوں چاہتا رہا کہ کہیں پڑا رہوں۔ میرے امراض اور عوارض کا تقاضا بھی یہی تھا سفر نہ کروں مگر جب بھی یہاں آنا ہوا ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے اکابر واحباب کا تقاضا واپسی کا مسلط رہا۔

اس سال میرا جانے کا بالکل دل نہیں چاہتا تھا اور ایک بزرگ نے جنہوں نے نام ظاہر کرنے کا منع کر دیا، استخارہ بھی کیا اور ۱۶ جمادی الاولیٰ ۹۵ھ کو خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور میرے ہند کے سفر کے بارے میں استفسار کیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’کیا یہاں وہ بیکار رہے‘‘؟ عرض کیا بیکار تو نہیں کام میں تو یہاں بھی لگا رہتا ہے تو ارشاد فرمایا:

''جب ہمارے مدینہ منورہ میں بھی کام میں لگے ہوئے ہیں تو پھر باہر جانے کی کیا ضرورت ہے''؟ عرض کیا کہ حضرت والا کیا آپ کا منشاء یہ ہے کہ حضرت شیخ مدینہ منورہ میں رہیں؟ تو ارشاد فرمایا:

''ہاں ہمارا منشاء تو یہی ہے''۔

عرض کیا بالکل پکی بات ہے جا کر کہہ دوں؟

تو ارشاد فرمایا:

''ہاں ہمارا منشاء تو یہی ہے''۔ تو اس پر زکریا نے نہ جانا بالکل طے کر لیا مگر تعجب ہے، اس سال مکی مدنی احباب اور پاکی احباب کا بہت شدید اصرار رمضان ہند گزارنے پر ہوا بالخصوص میرے محسن جناب الحاج قاضی عبدالقادر صاحب تو اتنے مصر ہوئے کہ باوجود باقی احباب کے ان کو بلانے کے تقاضے کے بھی انہوں نے جانے سے انکار کر دیا کہ میرے جانے کے بعد یہ سفر ہند ملتوی کر دے گا اس کا تصفیہ مولانا انعام الحسن صاحب پر رکھا کہ وہ افریقہ سے واپسی پر جو طے کر دیں گے اُسی پر عمل ہوگا، مگر مولانا موصوف نے بھی کوئی فیصلہ نہ کیا۔ بار بار دوستوں نے ان پر اصرار کیا کہ وہ کوئی فیصلہ کریں۔ وہ ہر دفعہ میں یہی کہتے رہے کہ وہاں کی مختلف ضرورتوں کا تقاضا تو جانے کا ہے مگر اس کی بیماری کی حالت کو دیکھ کر میری ہمت جانے کو کہنے کی نہیں پڑتی۔ اسی دوران میں عزیز عبدالحفیظ نے یکے بعد دیگرے استخاروں پر دو خواب مسلسل دیکھے، دوسرے خواب میں جانے کی تاکید حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریراً فرمائی۔

خواب دونوں طویل ہیں، اس لیے ارادہ کر ہی لیا۔ ہندوستان سے بھی بعض دوستوں کے خواب اسی کی تائید میں پہنچے اور اس ناکارہ کا تو ہمیشہ سے معمول ہے کہ جب ہندوستان جاتا ہے تو پہنچنے کے بعد واپسی کا استخارہ شروع کر دیتا ہے اور جب حجاز واپسی ہوتی ہے تو دو تین ماہ بعد سے احباب کے اصرار پر استخارہ شروع کر دیتا ہے۔

اس ناکارہ کا تقریباً پچاس (۵۰) سال سے معمول ہے کہ اہم کام میں استخارہ کا اہتمام کرتا ہے۔ مقاصد حسنہ صفحہ ۳۶۶ میں طبرانی کے حوالہ سے بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے ''ما خاب من استخار'' (الحدیث) کہ جو استخارہ کرے وہ نامراد نہیں ہوتا۔ اس لیے ہندوستان جانے میں یا حجاز آنے میں اپنا جذبہ کچھ نہیں ہوتا، استخارہ کا اہتمام ضرور کرتا ہوں اور دوستوں کو بھی اس کی تاکید کرتا ہوں کہ اہم امور میں بالخصوص نکاح کے بارے میں استخارہ کا ضرور اہتمام کیا کریں۔

جتنے تقاضے ہوتے رہے ہیں اس کو استخارہ کا ثمرہ سمجھتا رہا اور بہت سے موئیدات جن کا تحریر کرانا

بھی مناسب معلوم نہیں ہوا ایسے پیدا ہوئے کہ جن کی بناء پر اس ناکارہ نے رمضان ہندوستان گزارنے کا ارادہ کرلیا اور اس میں سب سے زیادہ دخل میرے محسن ومخلص الحاج قاضی عبدالقادر دام مجدھم کا ہے کہ وہ التواء پر کسی حال میں راضی نہیں ہوتے تھے۔

یا کی احباب کے زیادہ اصرار پر مبنیٰ یہ بھی تھا کہ ان کو بہت قوی امید تھی کہ کثرت سے ویزا مل جائے گا، مگر افسوس کہ بہت مشکل سے قاضی صاحب کو اور عزیز مولوی محمد بنوری بن مولانا محمد یوسف صاحب بنوری اور مولوی شاہد صاحب نائب مفتی مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن اور ایک دو کے علاوہ اور کسی کو ویزا نہیں ملا۔ عطاء الرحمٰن اور ان کے بھائی حاجی یعقوب الحاج احمد ناخدا۔ صوفی محمد اقبال، عزیز عبدالحفیظ، الحاج محمد الیاس، نیز ملک عبدالحق صاحب وغیرہم بھی تھے۔ چونکہ یہ ناکارہ قاضی صاحب سے پختہ وعدہ کر چکا تھا اور اسی بناء پر قاضی صاحب نے اپنا سفر پاکستان اختیار کرلیا تھا، وہاں سے بھی ان کے خطوط آتے رہتے کہ میں تجھے لینے کے واسطے حجاز آؤں گا اور اس ناکارہ نے اُن کو سختی سے منع کر دیا کہ میں آپ سے پختہ وعدہ کر چکا ہوں اور آپ کے آنے میں حرج وخرچ زیادہ ہوگا، اس لیے یہ ناکارہ بار اتوار کی شب میں سلیم کی کار میں زکریا عزیز عبدالحفیظ ابوالحسن، عبدالقدیر اور حبیب اللہ، اسماعیل تین بجے رات کو چل کر ۴:۳۰ بجے مسجد عریش پہنچے، کھانا وغیرہ کھا کر ۵:۳۰ پر آرام کیا، صبح کی نماز کے بعد پھر سو گئے، ۱۰:۳۰ بجے ناشتہ کیا۔

زکریا مکہ مکرمہ اور سلیم عبدالحفیظ کی کار کو لے کر مدینہ واپس چلا گیا، جس میں صوفی اقبال وغیرہ پہنچانے آئے تھے مگر صوفی اقبال اور الیاس کو زکریا نے روک دیا اس لیے کہ صبح کی نماز کے وقت یوسف تتلی افریقہ سے بدر پہنچ گئے اور دو ہی دن ان کے مدینہ قیام کے تھے اس لیے ان دونوں کو اقبال اور الیاس کی جگہ مدینہ بھیج دیا۔ زکریا براہ جدہ ۴:۳۰ پر مدرسہ صولتیہ پہنچ گیا اس لیے کہ وادی فاطمہ کا راستہ خراب تھا۔

راستہ میں ڈاکٹر ظفیر، وحید الزماں کے مکانات پر چند منٹ کو ٹھہرنا ہوا۔ اول الذکر ملے نہیں جس کی تلافی میں وہ شام کو مکہ آئے۔ احرام وعمرہ کا زکریا نے حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ، ابوالحسن نے والدہ طلحہ، اسماعیل نے والد زکریا فضل الرحمٰن نے والدہ زکریا، عبدالقدیر نے چچا جان، حبیب اللہ نے حضرت مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ، عبدالحفیظ نے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے باندھا۔

۲۸ رجب ۹۵ھ ۶ اگست ۷۵ء چارشنبہ کی صبح کو عربی نو بجے مکہ مکرمہ سے بارادہ ہند چل کر حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھی۔ عزیز شمیم اور ماموں یامین کو زکریا نے جدہ آنے سے منع کر دیا تھا، مگر وہ مولوی عبداللہ عباس کی گاڑی میں صبح کی نماز پڑھنے کے واسطے حدیبیہ تک آئے اور پھر ان کی گاڑی

میں واپس چلے گئے۔

حدیبیہ سے سیدھے مطار پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر ظفیر نے اپنی گاڑی طیارہ تک لے جانے کی اجازت لے رکھی تھی مگر عین وقت پر مطار والوں نے کہہ دیا کہ نہیں یہ نہیں جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب کے کوئی دوست وزراء کے مخصوص دروازوں سے مطار کی کار میں لے گئے۔ اتنے میں رفقاء بھی کسٹم کے دروازہ تک پہنچ گئے تھے۔ جدہ سے ۱۵:۱۲ عربی وقت پر مشی اور ۲۰:۱۲ پر پرواز کی۔ ظہران ۰۵:۲ پر پرواز۔ دبئی ۲۵:۴ تا ۱۵:۵ پر روانہ ہوا ۲۲:۵ پر پرواز۔ کراچی ۰۵:۷ پر پہنچا۔ ۵۵:۷ پر مشی۔ ۰۰:۸ پر پرواز ۹ بجے بمبئی پہنچا جب کہ وہاں مغرب کی نماز کا وقت تھا اور بارش دو گھنٹہ قبل ہی سے خوب ہو رہی تھی۔ میری کار میں اسماعیل ہاشم حاجی یعقوب کہ میرے رفقاء کسٹم میں تھے بارش چونکہ خوب ہو رہی تھی وہاں جگہ نہ تھی، اس لیے راستہ میں ایک شفاخانہ میں مغرب کی نماز پڑھی اور عشاء کے وقت بھائی عبدالکریم کے یہاں پہنچے۔ ہماری روانگی کے وقت مطار پر بہت زوردار بارش ہوئی کہ نکلنے کا راستہ رفقاء کو نہ ملا، دیر کے بعد پہنچے اور عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھایا۔ کسٹم میں صرف دس منٹ لگے۔ دیر بارش کی وجہ سے ہوئی۔

بمبئی میں مولوی محمد عمر صاحب دو دن سے گئے ہوئے تھے چونکہ گزشتہ سال ان کی لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے ان کے ناشتہ میں زکریا شریک نہیں ہو سکا تھا اس لیے ان کو بہت قلق تھا اور مدینہ میں ان کے خطوط پہنچنے شروع ہو گئے تھے اس کی قضاء میں اس لیے جمعرات کی صبح کو ان کے یہاں ناشتہ ہوا، خصوصی مصافحے تو رات سے ہی ہو رہے تھے لیکن عمومی مصافحوں کا نو بجے سے اعلان ہوا اور اس کے بعد اسی مجلس میں بیعت ہوئی، مولوی محمد عمر صاحب نے طویل دعاء کرائی عصر کے بعد کئی نکاح ہوئے اور بیعت بھی ہوئی، بھائی عبدالکریم کا نکاح اسی مجلس میں ہوا اور اتوار کو ولیمہ۔

جمعہ کے دن فجر اپنی پڑھ کر مطار پر روانگی ہوئی اور رفقاء سامان کی وجہ سے پہلے ہی چلے گئے تھے، انہوں نے مطار پر نماز پڑھی، پانچ ٹکٹ ہمارے اور چھٹا ٹکٹ مولوی محمد عمر کے دام وضع ہو کر ۵۰ کلو زائد رہا جس کے =/۲۴۲ روپے زائد محصول دینا پڑا، جب کہ حاجی یعقوب صاحب نے پانچ کرتون یہ کہہ کر روک لیے تھے کہ میں ان کو براہِ راست بمبئی سے سہارنپور بھیج دوں گا، ایک کرتون (ڈبہ) بمبئی سے مسلسلات کی کھجوروں کا خریدا تھا وہ بھی اسی میں تھا، جس کو انہوں نے پھلوں کے ڈبہ میں ریل سے ہمروز بھیج دیا تھا، بقیہ سامان دو پیٹیوں میں کئی دن میں پہنچا۔

بمبئی سے روانگی صبح سات بجے ہندی تجویز تھی مگر جہاز میں کوئی خرابی آ گئی ۲۵ منٹ اسٹارٹ نہ ہوا اور موٹر کی خرابی کی طرح وہ بھی سیٹی سی بجاتا رہا، بہت ہی فکر ہو گیا، یا رب سلم سلم زکریا تو پڑھتا رہا ۲۵:۷ پر اسٹارٹ ہوا مگر پھر ٹھہر گیا مگر پھر ۴۰:۷ پر پرواز کی، مگر راستہ میں الحمدللہ کوئی دقت نہیں

ہوئی، ۹:۲۲ پر زمین پر مَشی ہوا اور ۹:۳۰ پر استقرار، بھائی کرامت نے طیارہ پر اپنی موٹر لے جانے کی اجازت لے رکھی تھی اس میں مولوی انعام، طلحہ، زبیر طیارہ پر پہنچ گئے اور بقیہ کاریں، بسیں اور لاریاں باہر کھڑی رہیں جس میں سہارنپور کے بچے تھے ان سے ملاقات نہ ہوسکی، مولوی انعام نے کہا کہ اگر سب سکون سے بیٹھ جائیں تو دعاء ہوگی ورنہ ہم جاویں، دس منٹ کے شور وشغب کے بعد مولوی انعام نے طویل دعاء کرائی، اس کے بعد پھر یکے بعد دیگرے نظام الدین میں گاڑیاں پہنچتی رہیں۔

بحمداللہ تعالیٰ ۱۸ اگست ۷۵ء یکم شعبان ۹۵ھ کو نظام الدین پہنچنا ہوا مولوی اظہار نے مصافحہ کے لیے پوچھا، میں نے کہا کہ کل صبح کو ہو جاوے گا، انہوں نے کہا کہ بہت سے لوگوں کو جانا ہے، میں نے کہا کہ عصر کے بعد ہو جاوے گا، مولوی انعام نے بھی بار کی صبح تجویز کی، مگر مولوی اظہار نے کہا کہ عصر کے بعد لوگ رُک جائیں گے اس لیے جمعہ کے بعد مصافحہ ہوا اور عصر کے بعد بخاری ختم ہوئی اور کئی نکاح ہوئے اور مفتی عتیق صاحب کو ٹیلیفون کر کے بلایا تھا تا کہ ان کو جج صاحب کا خط دیا جائے جو اُنہوں نے مولانا بدرِعالم کو حزب الاعظم کے سلسلہ میں دیا تھا مولوی محمد میاں صاحب وغیرہ خصوصی احباب سے ملاقات ہوئی۔

زکریا کا ارادہ بمبئی ٹھہرنے کا تھا، بار کو وہاں سے روانگی تھی مگر مولوی انعام صاحب کو بار کی صبح کو مالیر کوٹلہ کے اجتماع میں جانا تھا اس لیے انہوں نے بمبئی والوں کو اطلاع کی تھی کہ زکریا کو جمعہ کو بھیج دیں، میں نے تو اس کو بہت غنیمت سمجھا مگر بمبئی والوں نے مولوی انعام کو اور زکریا کو بھی مدینہ خطوط لکھے کہ بمبئی کے دو دن اور بڑھا دیئے جائیں کہ قرب وجوار کے لوگوں کو سہولت ہو، مگر زکریا نے کہا کہ میں دہلی اور سہارنپور دونوں جگہ اطلاع کر چکا ہوں اور دونوں جگہ سے بڑے مجمع کے اکٹھے ہونے کی (باوجود منع کرنے کے) اطلاع مل رہی ہے اس لیے جمعہ کی صبح کو بمبئی سے چل کر دہلی پہنچا۔

جیسا کہ اُوپر لکھا گیا اور بار کے دن کیونکہ وہاں سعودی مجمع بہت تھا اس لیے اپنے اکابر کے مزارات پر تو نہیں البتہ صبح کی نماز کے بعد کہ وہ لوگ تقریر میں مشغول رہے، سلطان جی کے مزار پر حاضری ہوگئی اور بارہ بجے کھانا کھا کر مولوی انعام صاحب ریل سے مالیر کوٹلہ روانہ ہوگئے اور میں ظہر پڑھ کر کاندھلہ کے لیے روانہ ہوا، چونکہ مستورات دلی کی بھی اور کاندھلہ کی بھی ساتھ آنے والی تھیں، اس لیے دو کاریں مستورات کی، دو زکریا اور رفقاء کی، زکریا کرامت کی گاڑی میں تھا مگر وہ خرابی کی وجہ سے آہستہ چلی، مستورات نے تو عصر کاندھلہ میں پڑھی، مگر زکریا کاندھلہ مغرب کے وقت پہنچا اور سیدھا عیدگاہ چلا گیا، وہاں بہت بڑا مجمع تھا۔

مغرب پڑھ کر اول قبرستان پر آدھ گھنٹہ قیام ہوا اور پھر مصافحے شروع ہوئے، مگر کچھ ہی ہوئے تھے کہ رول مچ گیا، پھر قصبہ میں گیا وہاں بھی بہت مجمع اکھٹا تھا مگر کار سے اترتے ہی سیدھا زنانے میں چلا گیا مگر وہاں پہنچتے ہی اہلیہ مصباح کو دورہ پڑ گیا، اس کے صبر و سکون کی تو بہت اطلاعیں پہنچ رہی تھیں اور بجائے متاثر ہونے کے متاثرین کو روک رہی تھیں، مگر معلوم ہوا کہ ایک دفعہ دورہ اس دن پڑا تھا جس دن عدت ختم ہوئی، آدھ گھنٹے بیٹھ کر چلا آیا، صبح کی نماز پڑھ کر چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر زکریا زنانے میں چلا گیا، اس وقت سکون رہا، اہلیہ مصباح نے کچھ راز میں باتیں کیں، اتنے ساتھیوں نے سامان رکھا اتنے زکریا گھر میں رہا اور سامان رکھنے کے بعد سیدھا کار میں بیٹھ گیا، مصافحوں سے انکار کر دیا، ۷ بجے چل کر ۸ بجے جھنجھانہ پہنچے۔

بھائی نسیم نے چائے پر اصرار کیا زکریا نے انکار کر دیا اور رفقاء کو کہا کہ پلا دو، ۱۰ بجے چل کر ۱۱ بجے تھانہ بھون اول حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر اور اس کے بعد حضرت حافظ صاحب کے مزار پر، اسی درمیان میں ظہر کی نماز بھی پڑھی، ۳ بجے وہاں سے چل کر ۴:۳۰ بجے سہارنپور پہنچ گئے، تحیۃ المسجد پڑھ کر اول گھر میں، پھر حکیم ایوب کے یہاں، پھر حضرت ناظم صاحب کے یہاں ہوتے ہوئے دارِ جدید پہنچ گیا، عصر کے بعد اول مولوی اظہار نے دُعاء کرائی اور پھر مغرب تک مصافحے ہوتے رہے۔

صوفی رشید مغرب کے وقت ملے انہوں نے کہا کہ گنگوہ کا ارادہ کیا ہے؟ میں نے کہا بالکل نہیں کیونکہ بارش سے راستہ مسدود ہے انہوں نے کہا کہ میں آج ہی قصداً راستہ دیکھ کر آیا ہوں بالکل راستہ صاف ہے، میں نے کہا کہ پھر صبح ہی چلنا چاہیے حاجی عظیم اللہ کی کار میں ۵:۰۵ پر چل کر ۶ بجے گنگوہ پہنچا وہاں سے ۱۰ بجے اُٹھ کر حکیم نہو سے ملتے ہوئے ہر دو خانقاہوں میں حاضری دے کر ۱۲ بجے صوفی رشید کے یہاں کھانا کھایا اور قاری شریف کی مسجد میں جا کر اول مشکوٰۃ شریف کا اختتام کرایا پھر تھوڑی دیر لیٹ کر ظہر کی نماز پڑھی، ظہر کے بعد رفقاء نے چائے وغیرہ پی، مگر زکریا حاجی جی کی کار میں مع شاہد، خالد، ابوالحسن عصر سے قبل سہارنپور پہنچ گیا۔

عصر کے بعد مسجد ہی کا اعلان تھا، مگر نصیر الدین کے اصرار پر کہ انہوں نے زکریا کے لیے حاجی عظیم اللہ کی سعی سے کمرہ بنوایا تھا اور اس کا افتتاح ان کی موجودگی میں کرانا چاہتا تھا، اس لیے عصر کے بعد مجلس مولوی نصیر کی ٹال میں ہوئی اسی دن یعنی پیر کے دن عشاء کے قریب مولوی انعام بھی مالیر کوٹلہ سے واپس آئے، مولوی یونس نے بخاری و مسلسلات دونوں روک رکھی تھیں، ان کو عشاء کے بعد بُلا کر کہا کہ چونکہ طلبہ کو اطلاع نہیں اس لیے صبح کے تین گھنٹوں میں سب کو اطلاع کرا دو اور ہم اپنی نماز پڑھ کر چار کاریں اور حافظ عبدالحفیظ کا جونگہ رائے پور روانہ ہو گئے۔

سہارنپور میں بھٹ تک بارش نہ تھی مگر بھٹ سے بارش شروع ہوئی، خیال تو تین گھنٹے وہاں قیام کا تھا مگر ایک گھنٹہ کار ہی میں بیٹھ کر واپس آ گئے، ابوالحسن اس سفر میں ساتھ نہیں ہو سکا کہ رات کو اس کے محلّہ میں چور آ گئے تھے اس کی وجہ سے جاگنا پڑا اس وجہ سے صبح کو آنکھ نہ کھلی، اس لیے وہ بھیگتا ہوا ٹھیلے میں گیا اور پٹری پر چلتا ہوا ملا، اس کو اپنی گاڑی میں بُلا لیا، شاہ صاحب کے مزار پر چند منٹ ٹھہرتے ہوئے ریڑھی کے مدرسہ میں گئے اس لیے کہ گزشتہ سال ریڑھی کے طلبہ و مدرسین یہ خبر سن کر کہ زکریا رائے پور گیا ہوا ہے، سڑک پر انتظار کرتے رہے اور بارش میں بھیگتے رہے اور بھاگ بھاگ کر آتے رہے، ان کی تلافی کے لیے جانا ہوا، تقریباً آدھ گھنٹہ وہاں قیام رہا اگرچہ کاروں ہی میں قیام رہا۔

وہاں سے چل کر ۹ بجے کے بعد سہارنپور پہنچ گئے اور دس بجے ۱۲ اگست ۷۵ء ۳ شعبان ۹۵ھ بخاری شریف کا ختم ہوا، اول مسلسل بالاولیۃ کی حدیث پڑھی گئی، اس کے بعد مولوی یونس نے بخاری کی آخری حدیث پڑھی، متن دونوں کا زکریا نے پڑھا، اس کے بعد کھانا کھایا اور حضرات نظام الدین ایک گھنٹہ لیٹ کر چلے گئے اور زکریا بھی چکنا چور ہو کر لیٹ گیا۔

یعقوب مدنی جو ایک ماہ سے نظام الدین تبلیغ میں گیا ہوا تھا، زکریا کے ساتھ کاندھلہ تک راشد کے اصرار پر اور تھانہ بھون تک زکریا کے کہنے پر اور سہارنپور تک اپنی رائے سے آیا اور گنگوہ رائے پور سفر میں ساتھ رہا اور آج مولوی انعام کے ساتھ کاندھلہ تک واپس آ گیا، صوفی افتخار صاحب جھنجھانہ تک اپنی رائے اور تھانہ بھون تک زکریا کی رائے سے آئے، دو کاریں جو دہلی سے ان سے ملنے آئی تھیں جھنجھانہ پہنچ گئی تھی اور تھانہ بھون تک آئیں اور یہاں سے صوفی جی راشد وغیرہ کو لے کر واپس چلے گئے۔

مسلسلات ۱۵ اگست ۹۵ھ، ۲ شعبان جمعہ کو ہوئی، مگر اس مرتبہ پہلے سے اطلاعات نہ ہونے کی وجہ سے مجمع کم تھا، ۷ اشعبان ۹۵ھ منگل کی صبح کو علی میاں مولانا منظور نعمانی صاحب مع سات آٹھ افراد کے ملاقات کے لیے آئے، گزشتہ سال علی میاں سے رائے پور ایک دو دن قیام کی نیت سے جانے کا وعدہ ہو چکا تھا، علی میاں کے ذہن میں اس سال اس کی قضاء تھی مگر زکریا کو کوئی اطلاع نہیں۔

مجمع چونکہ زیادہ ہو گیا تھا اس لیے دو سو روپے میں پوری لاری آمد و رفت کی گئی اس سے پختہ وعدہ بھی ہو گیا تھا، مگر منگل کی شام کو ایک صاحب حافظ صدیق کے ساتھ آئے اور بہت اصرار اس پر کیا کہ میں تجھے اپنی لاری میں لے جاؤں گا پہلے سے میں نے طے کر رکھا ہے، مگر ان کے شدید اصرار پر یہ طے ہوا کہ جس لاری والے سے ہم نے طے کیا ہے ان کو تم راضی کر لو، انہوں نے لاری

والے کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا، جس کی مقدار نہیں بتائی اور بدھ کے دن علی الصباح ۵ بجے مدرسہ سے چل کر ۶ بجے مزار پر پہنچے۔

زکریا نے پہنچتے ہی کہہ دیا کہ میں تو یہاں سے ۸:۳۰ پر اُٹھوں گا، آپ عطاء الرحمٰن سے جب چاہیں مل لیں میں ملاقات سے انکار کر چکا ہوں اور عطاء الرحمٰن کو بھی اطلاع کر دی کہ تمہیں جس جس کو بُلانا ہو ۹ بجے بلا لو، اس نے کہلا بھیجا کہ میرے بُلانے سے تو کوئی نہیں آئے گا، تو راؤ فضل الرحمٰن، عبدالحمید، عبدالرحمٰن کو بُلا لے، زکریا نے ان کے پاس آدمی بھیج دیا، مگر یہ حضرات وقت پر نہیں پہنچے اور ۱۰:۳۰ بجے یہ اطلاع ملی کہ کھانا آ گیا، لیکن جب کھانے کے لیے کوٹھی پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ غلط اطلاع تھی، ۱۱:۳۰ بجے کھانا ہوا اور لیٹ گئے اور طے یہ ہوا کہ ۳ بجے یہ سب حضرات پھر جمع ہوں گے مگر ۴ بجے صرف راؤ عطاء الرحمٰن آئے، مفتی عبدالعزیز صاحب نے میرے رفقاء سے عصر کے بعد اپنے مدرسہ لے جانے کا وعدہ لے رکھا تھا، لہٰذا وہ حضرات تو مدرسہ گئے اور زکریا عصر سے مغرب تک باغ کی مسجد میں رہا، مغرب کے بعد کھانا کھایا۔

اہل مرزاپور کا شدت سے اصرار تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے مرزاپور جاؤں، زکریا نے کہہ دیا کہ لاری والے کو آپ راضی کر لیں، سنا کہ مرزاپور والوں نے سو روپے دے کر اس کو راضی کیا، صبح کو نماز پڑھ کر زکریا تو مزار پر بیٹھ گیا اور رفقاء سے کہہ دیا کہ چائے سے فارغ ہو کر مجھے بھی لے لیں ۶:۳۰ بجے چل کر ۷ بجے مرزاپور پہنچے، دس لڑکوں نے حفظ قرآن ختم کیے، زکریا نے ختم کرنے والوں کو کچھ انعام بھی دیا ۷:۳۰ بجے چل کر ۸:۳۰ بجے کے قریب سہارنپور پہنچے، علی میاں وغیرہ کی شام کو ۵ بجے کی سیٹیں لکھنؤ کے لیے [illegible] تھیں، ۳۱ اگست کی صبح کو مولانا عمران خان صاحب بھوپالی تشریف لائے، ان کا پیر کے دن واپسی کا ارادہ تھا مگر اتوار کی شام کو یونس سلیم صاحب ملنے آ گئے، ان کا قیام تو دوسری جگہ تھا مگر یہ طے ہوا کہ پیر کی صبح کو نماز پڑھتے ہی وہ آئیں گے اور مولوی عمران صاحب کو ساتھ لے کر جائیں گے، مگر پیر کی صبح کو یونس سلیم صاحب نے اپنی گاڑی بھیج دی کہ میں تو نہیں آ سکتا، آپ آ جائیے، چنانچہ وہ روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد ایک ایک، دو دو دن کی فصل سے صوفی اقبال، عطاء الرحمٰن، یعقوب نیپالی، مولوی احمد ناخدا، احمد میاں افریقی، مولوی شاہد کراچوی، سعید انگار، عبدالحفیظ مع اہلیہ کچھ بوڈر سے سیدھے اور کچھ دہلی ہوتے ہوئے کار سے پہنچتے رہے، یکم رمضان المبارک دوشنبہ ۸ ستمبر کو ہوئی، زکریا اپنے معمول کے مطابق اتوار کے دن عصر کے بعد ہی دار جدید پہنچ گیا اور سارے مہمان ظہر کے بعد سے اتوار کو دار جدید کی مسجد میں منتقل ہوتے رہے، دار جدید میں عشرہ اولی زبیر، وسطی خالد نے آخر میں سلمان نے پڑھا۔

دارالطلبہ قدیم میں ناظم صاحب کے پوتے نے تین قرآن پڑھے، صوفی عثمان نے اسی رمضان میں بیداری میں رات کو دو بجے نظام الدین میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے، پہلے مزارات پر تشریف لائے، تین منٹ مراقب رہے، پھر مسجد میں دو رکعت پڑی اور صوفی عثمان کو پیام دیا کہ حضرت جی کو سلام کہنا اور کہہ دینا کہ دعاؤں کی مقدار میں اضافہ کریں، اس کا ایک قدم مسجد کی چھت پر اور دوسرے قدم میں غائب، تین سال پہلے بھی یہ ان کو دیکھ چکے تھے۔

......☆☆☆☆☆......

نظام الاوقات رمضان ۹۵ھ

بعد مغرب اوابین میں دو پارے بعدہٗ چائے استنجاء وغیرہ بعدہٗ مجلس از ۸ تا ۸:۳۰، اسی میں بیعت اور گفتگو، عشاء از ۹ تا ۱۰:۳۰ بعدہٗ ختم یٰسین ودعاء، بعدہٗ فضائل رمضان تا سوا گیارہ بعدہٗ الوداعی مصافحوں کے بعد ۱۲ پر کواڑ بند، کنجی زکریا کے پاس ۳ بجے تک، تین بجے کیواڑ کھلتے اور سحر کا انتظام ہوتا، اس کے بعد کچھ نماز پڑھنے والے، کچھ کھانا کھانے والے تا اذانِ فجر، زکریا تہجد دو پارے، بعدہ سحری دودھ پاپا جو کبھی نہیں کھایا، مگر اس سال اجابت نے پہلی مرتبہ اس کا استعمال کرایا، بعد نمازِ فجر آرام، زکریا ۹، ۹ بعدہٗ قرآن دو پارہ بالنظر تا گیارہ اور متفرقات تا ایک، بعد ظہر ختم خواجگان وذکر واسماع زکریا دو پارے، اس سال مولوی عاقل نے ذکر کی وجہ سے نہیں سنا، مفتی یحییٰ حکیم الیاس نے سنا، بعد عصر ارشاد واکمال، صبح ۹:۳۰ سے ۱۰:۳۰ تک حسب سابق وعظ مولانا عبیداللہ صاحب۔

۱۴ ستمبر کو کراچی میں مولانا بنوری احرام وغیرہ باندھ کر بہ نیت عمرہ مطار پر پہنچے۔ جہاز پر سوار بھی ہوگئے تو پولیس نے روک دیا کہ آپ نے صوبائی حکومت سے اجازت نہیں لی، دو دن بحالتِ احرام سعی بسیار کے بعد منگل ۱۶ ستمبر کو اجازت ملی، ڈاکٹر ظفیر بھی عشرہ ثانیہ میں پہنچ گئے، عزیزم زبیر کو ختم قرآن کے بعد شدت سے بخار ہوگیا، ۱۶ رمضان کو بھائی کرامت کی گاڑی میں مولانا انعام صاحب، مولانا محمد عمر صاحب وغیرہ آئے اور دو دن قیام کر کے واپس گئے، ۱۷ رمضان کی شب میں علی میاں وغیرہ ۴ نفر پہنچے اور ۱۹ کی صبح کو واپس گئے۔

اس رمضان میں بھی حاجی عبدالعلیم صاحب پورے رمضان رہے، جس کی وجہ سے مرادآباد والوں کی آمد ورفت کثرت سے رہی مولوی انعام کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کی مسجد سے ۲۸ ملکوں کے دوسو سے زائد نفر معتکف رہے، دارالطلبہ قدیم میں مولوی عبدالغنی احمد آبادی نے مع اپنی جماعت کے اعتکاف کیا، کاندھلہ میں صوفی افتخار کے مریدین نے سات آٹھ نے اعتکاف کیا، دارالعلوم میں مولوی بہاری نے اعتکاف کیا مولانا اسعد صاحب نے اپنی مسجد میں آخری عشرہ کا اعتکاف کیا، مولوی رشید الدین نے باوجود زکریا کے انکار کے دار جدید میں پورے ماہ کا اعتکاف کیا، آمد ورفت کی بڑی تفصیل رجسٹر میں موجود ہے، مولوی عبدالرحیم متالا، مفتی اسماعیل ۲۰ کو واپس چلے گئے، بارش کی کثرت کی وجہ سے خیمہ کا انتظام سارے رمضان گڑبڑ ہی رہا، قاضی عبدالقادر صاحب ویزا کی گڑبڑ کی وجہ سے سیلون وغیرہ ہوتے ہوتے ۲۲ رمضان کی

دوپہر کو بڑی مشکلات سے پہنچے۔

اس رمضان میں امراض کی کثرت رہی، آنکھوں کا دکھنا، بخار کا آنا وغیرہ عوارض کثرت سے پیش آتے رہے۔ مولانا منور صاحب اور مولانا عبید اللہ صاحب کی طبیعت بھی خراب رہی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا اور معتکفین سے مصافحہ کرنا وغیرہ منامات تفصیل تو روزنامچہ میں ہے، ۴ اکتوبر ۷۵ھ کو مولانا فاروق احمد صاحب بن مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی، شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ بھاولپور کا انتقال ڈبل نمونیہ میں ہوا۔ یکم شوار منگل ۷ اکتوبر طلوع آفتاب کے آدھ گھنٹہ بعد دار جدید میں نماز عید عزیزم سلمان نے پڑھائی، دار الطلبہ قدیم میں ۸:۳۰ نماز عید ہوئی۔ عید کی شب میں چائے تو سحر کے وقت نمٹا دی تھی، فجر کے بعد مسلسل بالعید اور افطار بالتمر ہوا۔ قاضی عبد القادر صاحب ۴ شوال کو دہرہ ایکسپریس سے دہلی اور وہاں سے ۷ شوال کو بمبئی اور ۸ کو طیارہ سے کراچی روانہ ہوئے، ۶ شوال کو ملک عبد الوحید دورہ کی تکمیل کے لیے سہارنپور پہنچے اور سال بھر قیام کیا اور دورہ کی تکمیل کی، ۹ شوال کو عزیز عامر تاروانگی زکریا سہارنپور قیام کے ارادہ سے پہنچا، حاجی شفیع نے اس کو تقاضا کر دیا تھا کہ مدرسہ کے اوقات میں مدرسہ کی نگرانی بھی کرتے رہیں۔ قاری مظفر نے اس کو بُلا کر حاجی شفیع صاحب کا خط بھی سنا دیا۔ ۱۵ شوال کو عزیزم شمیم مکی مع عزیزان زعیم وحشیم ندوہ کے جشن میں شرکت کے لیے نظام الدین پہنچے۔

۱۵ شوال کو مدرسہ کی تقسیم اسباق میں مدرسین مدرسہ کے سامنے بہت اہتمام سے ایک تقریر کی کہ یہ مضمون وقتاً فوقتاً مناسب کو سنا تا رہتا ہوں، آج اجتماعی طور سے سب کو نصیحت وصیت کرتا ہوں کہ مدرسہ کے معاملات میں کسی طالب علم کا اخراج ہو، داخلہ ہو، بندش طعام یا اجراء ہو، اپنے ذاتی تعلقات کو ہرگز دخل نہ دیں، بہت ہی اہم مشورہ بیان کیا، روزنامچہ میں اس کی تفصیل ہے۔ ۱۶ شوال کو بروز بدھ شام کو ۶:۳۰ بجے مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء کا انتقال ہوگیا، تفصیل روزنامچہ میں ہے۔

۳۱ اکتوبر تا ۳ نومبر ۷۵ء اہم اجلاس ندوہ لکھنؤ بنام مہرجان تعلیمی، جس میں غیر ملکی حضرات نے کثرت سے شرکت کی، زکریا نے اجتماع سے دو دن پہلے خواب دیکھا کہ علی میاں نے بہت سے مہمان غیر ملکی بھیج دیئے اور زکریا نے ان کے کھانے وغیرہ کا انتظام کیا، معرکۃ الآراء اجتماع ہوا، مستقل رسائل اس کی تفاصیل میں شائع ہو چکے ہیں اجتماع سے فراغت پر ۲۷ شوال ۲ نومبر الحاج محمد علوی مالکی مکی مع محمد محمود حافظ زکریا سے ملنے کے لیے پہنچے زکریا نے بھی لکھنؤ لکھ دیا تھا کہ میں تو مکہ جا ہی رہا ہوں وہیں ملاقات ہوگی مگر انہوں نے نہ مانا کہ تیرے یہاں حاضری ضروری ہے۔ ۲۸ شوال ۳ نومبر دوشنبہ کو عزیز خالد مع اپنی اہلیہ و دادی و حکیم اسرائیل و حافظ صدیق دہلی کے لیے

روانہ ہوئے اور دوسرے دن دہلی سے بمبئی کو روانہ ہو گئے۔

حضرت مولانا سر رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی شفقتیں اس ناکارہ پر بہت زیادہ رہیں، اللہ تعالیٰ ان کے احسانات کا بہترین بدلہ فرمائے، ہمیشہ مرحوم کے احسانات کے بدلہ کی دعائیں بہت کثرت سے کرتا ہوں۔ ایک دفعہ وہ حج کو تشریف لے گئے اور زکریا پر اپنے ہمراہ جانے پر بہت اصرار کیا اور فرمایا کہ اگر حضرت ہوتے تو میں ان پر اصرار کرتا، مگر اب تجھ پر اصرار کرتا ہوں، مگر زکریا کا وہ دور بہت مشغولی کا تھا، حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری کے اصرار پر بھی ان کی ہمرکابی نہ ہو سکی، مولانا سر رحیم بخش صاحب نے حج کی واپسی پر ایک معتد بہ رقم مجھے دی اور یہ فرمایا کہ یہ رقم تجھے حج پر لے جانے کے لیے تجویز کر رکھی تھی، اب تجھے نذر ہے، ان کے انتقال کے بعد سے وہ ناکارہ مکہ مکرمہ سے کبھی کبھی حج بدل ان کی طرف سے کراتا رہا مگر یہ بھی پختہ ارادہ رہا کہ ان کی وطن ٹھسکہ سے خود حج بدل کے لیے جاؤں مگر اب تو نوبت نہ آئی۔

اس سال چونکہ عزیز خالد اور اس کی اہلیہ کو حج کو بھیجنا تجویز ہو گیا اور نو عمر بچی اور والدہ عاقل بھی ساتھ جو خود ضعیف، اس لیے زکریا نے ان کی امداد کے لیے حافظ صدیق کو مولانا سر رحیم بخش کے حج بدل میں بھیجنا تجویز کر دیا اور ان کے ساتھ بھیجا، تمنا تو یہی رہی کہ خود کروں مگر اب تو اس کی امید نہیں رہی۔ ۱۱ نومبر کی شام کو بمبئی سے ان کا جہاز چلا اور ۱۷ کو جدہ پہنچا، ان کے لیے انتظامات تو بہت سوچے تھے، مستورات کے لیے چار ٹکٹ فرسٹ کلاس کے تجویز کر دیئے تھے، مگر سفروں میں گڑبڑ ہوا ہی کرتی ہے، فرسٹ کلاس کے ٹکٹ تو مل گئے مگر ایک کیبن نہ ملا اس لیے ایک کیبن میں عزیز خالد اور اس کی بیوی کو اور دوسرے میں حکیم اسرائیل کی والدہ و اہلیہ کو تجویز کرنا پڑا، یہ تو بڑی لمبی چوڑی تفصیل ہے۔

......☆☆☆☆☆......

واپسی از ہند

ایک ماہ سے یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ واپسی طیارہ سے براہِ کراچی ہو یا بذریعہ باڈر، مولوی انعام صاحب کی صلاح براہ باڈر آنے کی تھی کہ کرایہ کا سوال نہیں، مفت کی موٹریں دونوں جگہ ملیں گی، احسان اور بھائی عبدالوہاب نے بھی بڑے زور شور کے خطوط باڈر سے آنے کے تقاضے کے لکھے، مولوی انعام کی واپسی سرہند کے راستہ سے آنے کی تھی اور یہ وجہ زکریا کے لیے بھی جاذب تھی، مگر موٹروں کا لمبا چوڑا سفر دشوار معلوم ہو رہا تھا، قاضی صاحب نے بھی زکریا کی بڑی زور سے تائید کی اور خط لکھا کہ موٹروں سے بڑی تکلیف ہوگی کرایہ کی پرواہ نہ کریں، ہوائی جہاز سے آئیں، اس لیے زکریا اس پر مصر تھا، مگر معلوم ہوا کہ طیارہ سے جانے کے درمیان میں شاہد اور ابوالحسن جو مجھے کراچی تک پہنچانے آئے تھے، ان کے لیے پی فارم کی ضرورت ہے اور اس کے ملنے کی امید نہیں، اس لیے باڈر ہی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

روانگی سے تقریباً پندرہ دن پہلے کلکتہ سے ایک خط آیا تھا کہ تو سرہند کب جا رہا ہے؟ بڑی حیرت ہوئی غصہ بھی آیا، ان کو لکھ دیا کہ میرا ارادہ نہیں، مولوی انعام نے کہا کہ میں بدھ کو سہارنپور پہنچ جاؤں گا، جمعرات کو علی الصباح روانگی ہو جائے گی مگر صوفی افتخار نے بتایا کہ اگر کاندھلہ سے براہ پانی پت جانا ہو تو وہاں کئی اکابر کے مزارات ملیں گے، اس لیے زکریا نے مولوی انعام صاحب کو لکھ دیا کہ آپ بدھ کے دن بجائے سہارنپور کے کاندھلہ آ جائیں۔ میں بھی کاندھلہ آ جاؤں گا اور وہاں سے براہ پانی پت جانا ہوگا۔

زکریا کو ایک ہفتہ سے بخار کی شدت ہو رہی تھی تاہم بدھ کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر حسبِ معمول اندھیرے میں کاندھلہ کا ارادہ کیا، نیز سلمان کا اصرار تھا کہ تو اگر کاندھلہ کو جاوے تو میں اپنے بھانجہ کا عقیقہ بھی کرادوں، اس سے بھی زکریا نے کہہ دیا کہ بدھ کی شام کا کھانا تمہارے یہاں کھاؤں گا، زکریا بدھ ۳۰ شوال ۵ نومبر ۷۵ء کو سہارنپور سے پونے چھ پر چل کر سوا سات بجے بہت جلد عیدگاہ پہنچ گئے، وہاں کوئی نہیں تھا، بالکل تنہائی تھی، مگر قبرستان کے محافظ نے صوفی افتخار کو خبر دی، زکریا بھائی شفیع کی گاڑی میں تھا، حاجی عبدالعلیم صاحب اپنی گاڑی میں مرادآباد والوں کی دو گاڑیاں اور جورات میں ملاقات کے لیے آئی تھیں وہ بھی ساتھ ہو گئیں۔ مفتی محمود، مولوی منور سے زکریا نے پہلے کہہ دیا تھا کہ سید خلیل صاحب کی گاڑی میں بجائے سہارنپور کے بدھ کی شام کو کاندھلہ پہنچ جائیں کہ ان دونوں کا ساتھ جانا بھی زکریا نے تجویز کر رکھا تھا ان کے ساتھ حکیم

عبدالقدوس بھی ہوگئے تھے۔

۸ بجے کے قریب صوفی افتخار وغیرہ عیدگاہ پہنچ گئے اور زکریا ان کے ساتھ ۷، ۸ کاروں سمیت قصبہ میں پہنچ گیا، زکریا کو بخار ہورہا تھا اس لیے وہ تو دھوپ میں لیٹ گیا۔ سلمان، شاہد، وغیرہ اپنے اپنے اعزہ میں پھیل گئے اور اجنبی مہمان متفرق جگہ لیٹ گئے۔ عزیز خالد حج کے لیے روانہ ہوچکا تھا اور عزیز عاقل زکریا کے اصرار پر ان کو بمبئی پہنچانے گیا، گیارہ بجے مولوی انعام صاحب، مولوی محمد عمر، زبیر وغیرہ بھائی کرامت کی گاڑی میں کاندھلہ پہنچے، ان کے ساتھ اور بھی کئی گاڑیاں تھیں، زکریا سہارنپور میں کئی دن سے عصر کے بعد اپنی بیعت کے اعلان میں حسب معمول یہ کہلایا کرتا تھا کہ میں دو چار دن کا مہمان ہوں، مرنے کو بیٹھا ہوں اوروں سے بیعت ہوجائیں۔

نجیب اللہ احمد لولات کے بعد اس کام کو کیا کرتا تھا، منگل کے دن بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا مغرب کے بعد زکریا کے گھر کا محاصرہ شروع ہوگیا، لوگ کثرت سے آتے رہے، کاروں والے تو یہ سن کر وہ کاندھلہ چلا گیا کاندھلہ آگئے اور سرہند تک ساتھ رہے، بدھ کی شام کو سلمان کے بھانجہ کے عقیقہ میں زکریا مولوی انعام شریک ہوئے مگر صوفی افتخار شریک نہیں ہوئے، کھانے کے بعد مولوی انعام کے اٹھنے پر زکریا بیٹھا رہا اور اس نے قاضی نثار، سلمان، ابرار وغیرہ ان کے اعزہ کو بلا کر مجمع ہی کے درمیان میں کہا کہ بیٹھ جاؤ، مجھے معلوم ہوا ہے کہ صوفی افتخار صاحب دعوت میں نہیں آئے، مجھے ان کے نہ آنے سے بڑی خوشی ہوئی آنے سے شاید اتنی خوشی نہیں ہوتی۔

دنیا آج کل پاگل ہورہی ہے، کل سے تمہارے ہاں چہ مگوئیاں ہوں گی، کچھ صوفی افتخار کو گالیاں دیں گے حلال وحرام کی پرواہ نہیں کرتے، یہ حالات کی باتیں ہیں، صوفی جی مقامی ہیں، ان کو یہاں کے حالات کی تفصیلات زیادہ معلوم ہیں اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ بھائی ریاض کے باغ کے قصہ سے نثار کو کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے اکابر اللہ تعالیٰ ان کو بہت درجے عطاء فرمائے ہمیں سب کچھ سکھا گئے، حکیم طیب مرحوم کے ختنہ میں باوجود رامپور جانے کے حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرکت نہیں کی اور حضرت سہارنپوری وحضرت شیخ الہند نے شرکت کی تھی، دنیا کو تو گالیاں دینے میں مزہ آوے، کچھ نے ان کو دی اور کچھ نے ان کو اور عاقبت اپنی خراب کی، اس سے بڑھ کر مکہ مکرمہ کے ایک مولود میں حضرت سید الطائفہ کی شرکت اور حضرت گنگوہی کا شرکت سے انکار اور حضرت حاجی صاحب کا یہ ارشاد کہ تمہارے جانے سے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی تمہارے نہ جانے سے ہوئی۔

یہ مضمون تفصیل سے مجمع میں قصداً کہہ کر آیا، ۶ نومبر جمعرات کی صبح کو پونے سات پر کاندھلہ سے چل کر پہلے چند منٹ کیرانہ پہنچ کر مولانا انعام صاحب کی کار کو اہل کیرانہ نے گھیر لیا، مولوی انعام کی پہلے سے رائے تھی کہ چائے بجائے کاندھلہ کے کیرانہ میں پی لی جائے کہ لوگوں کا اصرار

ہے اس کو تو صوفی جی نے قبول نہیں کیا کہ دیر بہت ہو جائے گی، ۷:۳۰ پر پانی پت پہنچ گئے، سب سے اول شاہ شرف الدین کے مزار پر حاضری ہوئی ۲۰ منٹ قیام رہا، ان کے قریب ہی نواب مقری خان وزیر جہانگیر کا مزار تھا، جس کو ہمارا مورث اعلی بتایا گیا، وہاں بھی چند منٹ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے فاتحہ پڑھی، اس کے بعد شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء قاضی ثناء اللہ کے مزارات پر حاضری دیتے ہوئے شیخ جلال الدین تھانیسری کے مزار پر حاضری ہوئی جو بہت بڑی اونچائی پر تھا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور دوستوں کی مدد سے یہ اعرج بھی پہنچ گیا۔

اس کے بعد ۱۱:۳۵ پر وہاں سے چل کر بلاسپور پہنچے، جہاں ۱۱۳ انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کی قبور بتائی جاتی ہیں، ایک احاطہ ہے جس میں یہ قبر ہیں، آس پاس سکھوں وغیرہ کی آبادیاں ہیں، فالی اللہ المشتکی معلوم ہوا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تربیت السالک میں ان قبور کا ذکر ہے اور حضرت مجدد صاحب کے کسی مکتوب میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ صوفی افتخار صاحب سے یہ طے ہوا تھا کہ وہ سرہند میں ان مضامین کو مجھے دکھا دیں گے، مگر ہجوم کی وجہ سے فرصت نہیں ہوئی اس ناکارہ نے ان کو خط لکھا جس کے جواب میں انھوں نے کتب کی درج ذیل عبارات لکھیں جو یہ ہیں۔

سرہندی میں میری گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے میرا سامان ایسے وقت میں پہنچا کہ آپ آگے جا چکے تھے، اس لیے اس وقت تو دکھلانے کی ہمت نہ ہوئی، اب لکھتا ہوں۔

(ہندوستان میں انبیاء علیہم السلام کے مزار) حضرت تھانوی نے فرمایا، ہندوستان میں بھی بعض انبیاء علیہم السلام کے مزار ہیں، ''براس'' جو ایک جگہ ہے انبالہ سے آگے بنجارے کے سرائے اسٹیشن سے اتر کر وہاں ایک احاطہ ہے، اسمیں مزار ہیں، نشان کُل قبروں کے نہیں، حضرت مجدد صاحب کو مکشوف ہوا کہ یہاں انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے مزار ہیں، ہم بھی مولانا رفیع الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ دیوبند کے ساتھ گئے تھے۔ مولانا نے مراقبہ کیا، ان حضرات کی ارواح سے ملاقات ہوئی، گنتی میں تیرہ حضرات ہیں، ان میں ایک باپ بیٹے بھی ہیں، باپ کا نام حضرت ابراہیم ہے، بیٹے کا نام حذر (نہ معلوم بالضاد ہے یا بالذال) مولانا نے ان کی بعثت کا زمانہ پوچھا تو ایک راجہ کا نام لیا کہ اس کے زمانہ میں ہم تھے۔ (فرمایا حضرت والا نے کہ یہ نام میں بھول گیا، پھر یاد آیا، راجہ کرن) مگر اتنا یاد ہے کہ تقریباً اب سے دو ہزار برس پہلے ہوا ہے اور فرمایا حضرت والا نے کہ مولانا نے مجھ سے اس مراقبہ کا قصہ بیان نہیں کیا بلکہ اپنے ایک مرید سے بیان کیا اور انہوں نے مولانا کے داماد سے بیان کیا، داماد صاحب نے مجھ سے بیان کیا اور ان مرید صاحب کا نام حاجی حسین، بسی، ضلع، سرہند اور داماد کا نام ضیاء الحق ہے۔

یہ عبارت تو حسن العزیز کی میں نے پیش کردی، ہمارے مولانا یونس صاحب مظاہری نے یہ بھی

فرمایا کہ حضرت اقدس حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات میں اور بھی اس کی وضاحت ہے اور غالباً وہاں کے الفاظ یہ ہیں کہ جس کو چشم بصیرت ہو وہ آج بھی ان کے انورات دیکھ سکتا ہے۔

حضرت اقدس مجدد صاحب کی ایک سوانح جو حضرت مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہے، مولانا سید زوار حسین شاہ کی، تصنیف ہے اس کے صفحہ ۱۸۶، از ۱۲ربیع الاول ۱۰۲۵ھ تا ۱۱ربیع الاول ۱۰۲۶ھ۔ اس سال وبا کے دور ہونے کے بعد ایک دن حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کا شہر سرہند سے باہر جنوب مشرق کی طرف چند میل کے فاصلہ پر ایک موقع مقام براس سے گزر ہوا، اس گاؤں کے متصل شمالی جانب ایک بلند ٹیلہ ہے، آپ وہاں تشریف لائے، وہیں نماز ظہر ادا فرمائی اور پھر دیر تلک مراقبہ کرنے کے بعد ہمراہیوں سے فرمایا کہ نظر کشفی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبریں ہیں، مجھے ان بزرگوں کی روحانیت سے ملاقات بھی حاصل ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات وتنزیہ وتقدس کی نسبت جو کچھ اہل ہنود کے پیشواؤں نے لکھا ہے وہ ان ہی انبیاء علیہم الصلوٰۃ السلام کے علوم سے حاصل کیا ہے یہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہجرت گاہ ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ ایک مکتوب میں جو صاحبزادے حضرت خواجہ محمد سعید قدس سرہٗ کے نام ہے ان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے متعلق اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

اے فرزند! یہ فقیر جس قدر ملاحظہ کرتا ہے اور نظر کو وسیع کرتا ہے ایسی کوئی جگہ نہیں پاتا جہاں ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نہ پہنچی ہو بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ آفتاب کی طرح سب جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا نور پہنچا ہے، حتیٰ کہ یاجوج ماجوج میں بھی جن کی دیوار حائل ہے اور گزشتہ امتوں میں ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی جگہ بہت کم ہے جہاں کوئی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا، حتیٰ کہ زمین ہند میں بھی جو اس معاملہ سے دور دکھائی دیتی ہے معلوم کرتا ہے کہ اہلِ ہند سے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں اور صانع جل شانہ کی طرف دعوت فرمائی ہے اور ہندوستان کے بعض شہروں میں محسوس ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے انوار، شرک کے اندھیروں میں مشعلوں کی طرح روشن ہیں، ان شہروں کو متعین کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

(مکتوب: ۲۵۹ جلد اول ص ۳۸۴)

روضہ قیومیہ (صفحہ ۱۶۲)، (صفحہ ۱۶۳) پر بھی یہ مضمون ہے دو بجے ''براس'' سے روانہ ہو کر ۲:۳۰ بجے سرہند شریف پہنچے۔ وہاں پہلے سے ننھے خاں اور صوفی افتخار کے مریدین نے بہت کھانا بڑے مجمع کے لیے تیار کر رکھا تھا، نیز صوفی رشید گنگوہی جو سہارنپور سے سیدھے سرہند پہنچے تھے زکریا کے لیے خصوصی توشہ دان بھی لے گئے تھے زکریا کے حجرے میں تھے، ابوالحسن اللہ تعالیٰ ان کو جزائے

خبر دے، چونکہ ساتھ تھا، اس نے مختلف قیام گاہوں کو دیکھ کر خانقاہ کے باہر کے حصہ میں ایک مکان تجویز کیا، اسی میں پاخانہ، غسل خانہ، پانی کا نل وغیرہ سب چیزیں تھے، زکریا مع اپنے جملہ رفقاء اور جعفر وغیرہ اطفال کے جو زکریا سے پوشیدہ پہنچ گئے تھے ان کو ڈانٹا بھی تجھے کیا مصیبت تھی، باپ تو آیا نہیں تو آ گیا۔

صوفی افتخار صاحب نے درگاہ شریف کی کنجی لے لی تھی، لوگوں نے بیعت کے لیے بہت اصرار کیا مگر چونکہ مولوی انعام صاحب نے گزشتہ شعبان میں مالیر کوٹلہ کے اجتماع سے واپسی پر سرہند شریف حاضری ہوئی تھی تو خواب دیکھا تھا کہ حضرت مجدد صاحب نے اس کو فرمایا کہ یہاں والوں کو بیعت کر لے، اس خواب کی بناء پر زکریا نے بیعت کا تقاضا کرنے والوں کو انکار کر دیا کہ مولانا انعام صاحب کریں گے اور عصر مغرب کی نماز کے بعد بھی محمد کاندھلوی سے اعلان کرا دیا کہ جو بیعت ہونے کا ارادہ کرے مولانا انعام صاحب اسے بیعت کریں گے زکریا نہیں کرے گا، اس لیے مولانا انعام صاحب نے مجمع کو مختلف اوقات میں بیعت کیا، مجمع چونکہ بہت زیادہ تھا، اس لیے ظہر کے بعد کھانے میں دیر لگی، ہمارے پہنچنے پر چونکہ ظہر کی جماعت ہو چکی تھی اس لیے مختلف اپنی جماعتیں کیں، اس کے بعد زکریا اپنے توشہ دانوں سے نمٹ کر جس میں شاہد، ابوالحسن، ننھے خاں اور بابو ایاز بھی شریک تھے توشہ داں اصحاب توشہ دان کو واپس کر دیا کہ رات کو تو مجھے کچھ کھانا نہیں، تم کھاؤ یا بانٹو۔

عصر کے بعد مسجد میں زکریا کا مصافحہ ہوا اور پھر مولانا محمد عمر صاحب کی تقریر، مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپسی ہوئی، زکریا نے مولانا انعام صاحب، مفتی محمود، مولوی منور اور مولوی محمد عمر سے کہلا دیا کہ میں نے ہجوم کی وجہ سے مزار پر حاضری کا ارادہ ملتوی کر دیا، مگر آپ حضرات سب ضرور تشریف لے جائیں، عشاء کے بعد صوفی جی نے زکریا پر اصرار کیا مگر بدقسمتی سے حاضری نہیں ہو سکی کہ ہجوم بہت ہی آیا تھا، مولانا منور صاحب سے واپسی پر پوچھا، انہوں نے بڑے کوائف بیان کیے مگر سب لازمی تھے، یعنی ان کی ذات سے متعلق، انوار، تجلیات خاص ان کی ذات سے متعلق، مفتی محمود صاحب نے بیان کیا کہ اول میں نے سوال کیا کہ زکریا جا رہا ہے ہمارا کیا ہوگا؟ جواب ملا کہ وہاں سے خبر رکھے اور یہ کہ ہم تو یہاں موجود ہیں، پھر تبلیغ کے متعلق سوال کیا کہ مخالفین بہت ہو رہے ہیں، ارشاد ہوا کہ مخالفتوں کی پرواہ نہ کرو مگر اپنے لوگوں کی خبر رکھو کہ اصول سے باہر نہ ہوں، مولوی انعام نے بیان کیا کہ مجھے تو ایک ہی چیز کا ورد ہوتا رہا، سالماً غانماً سالماً غنماً۔

جمعہ ۷ نومبر صبح کو اپنی نماز اول وقت پڑھ کر اور اس کے بعد چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر بھائی کرامت کی کار میں زکریا مع ابوالحسن شاہد اور مولانا انعام الحسن صاحب اور دوسری گاڑی میں

مولانا انعام صاحب کے رفقاء مولوی محمد عمر، زبیر وغیرہ روانہ ہوگئے، میں نے تو سب کو روک دیا تھا کہ سب یہیں سے واپس ہوجائیں، ۵۰:۵ پر سرہند سے روانہ ہوئے بھائی کرامت نے بہت زور گاڑی چلانے میں دکھائے لیکن کرتار پور میں جا کر ان کی گاڑی کا ڈینمما خراب ہوگیا، اس کے بنوانے میں تقریباً سوا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا اور اس میں حاجی شفیع، سید خلیل، مولانا منور اور مفتی محمود بھی تھے اور سہارنپور سے بھائی شوکت کے دو جونگے جس میں شیخ اظہار، عبدالوحید مکی اور نا معلوم کتنے حضرات وہاں ملتے رہے، ہم لوگ تو حاجی شفیع کی گاڑی میں منتقل ہوگئے اور ان کی گاڑی کے افراد دوسری گاڑیوں میں منقسم ہوگئے اور بھائی کرامت کی گاڑی مع ڈرائیور کرتار پور ہی میں چھوڑ دی جو چار گھنٹے میں تیار ہوئی اور ظہر تک باڈر پہنچی۔

باڈر سے بھائی کرامت نے میری گاڑی کے دوسرے باڈر تک پہنچنے کی اجازت لے رکھی تھی اور امرتسر سے کسی افسر کو جوان کا دوست تھا باڈر پر بلا رکھا تھا، وہاں پہنچتے ہی میری گاڑی کو اور ساتھ ہی مولوی انعام صاحب کے رفقاء کی گاڑی کو اندر لے گیا اور کوڑ بند کر دیا گیا، میں تو کسی سے نہ سلام کر سکا نہ مصافحہ، یہی میں سرہند سے کہتا آرہا تھا کہ میں تو وہاں جا کر محبوس ہو جاؤں گا تم کیا کروگے جا کر، مولوی انعام صاحب نے فرمایا کہ وہ سب دروازہ پر کھڑے ہیں، میں جا کر دعاء کرا آؤں، میں نے کہا ضرور اور میرا سلام بھی کہہ دیجیو اور یہ بھی کہ اسی واسطے میں باڈر تک آنے کو منع کر رہا تھا، تقریباً ایک گھنٹہ وقفہ کے بعد باڈر کی جیپ ہمارے آگے آگے چلی، جس کو دیکھ درمیانی زنجیر کا قفل کھول دیا گیا اور اس کے پیچھے پیچھے ہماری دو گاڑیاں پاکی باڈر تک پہنچی۔

ہندی باڈر کے خاتمہ پر شور و شغب کی آواز آئی میں نے تو سمجھا نہیں کہ کیا بلا ہے، ابوالحسن وغیرہ نے کہا کہ گورنر پنجاب کی طرف سے تجھے فوجی سلامی دی جا رہی ہے، مجھے تعجب بھی ہوا کہ گورنر پنجاب کو کیا خبر؟ بعد میں معلوم ہوا کہ پنجاب میں تو اخباروں میں بھی میری روانگی چھپ گئی، پاکی باڈر پر آ کر ہندی افسر نے جس کی گاڑی ہمارے آگے تھی کہا کہ اگر آپ ان ہی گاڑیوں میں آگے جانا چاہیں تو ہمیں اعتراض نہیں مگر پاکی باڈر پر بیسیوں کاریں کھڑی تھیں اور بڑا ہجوم تھا ہندی باڈر پر اتنے پاسپورٹ وغیرہ کا اندراج ہوتا رہا وہاں کے افسران ایک ایک کر کے ملنے آتے رہے، بڑی کلفت ہوئی، خواہ مخواہ اخفا چاہا تھا، انہوں نے پوچھا کہ پاکستان سے کب واپسی ہوگی؟ ان سے کہہ دیا کہ حجاز جانا ہے، واپسی ادھر کو نہیں ہوگی۔

پاکی باڈر پر پہنچ کر میں مع شاہد، ابوالحسن اور احسان کے ڈاکٹر منیر کی گاڑی میں اور مولانا انعام صاحب مع زبیر اور مولوی عمر اور مولوی احمد لاٹ کے بھائی افضل کی گاڑی میں منتقل ہوگئے، مگر یہاں بھی پاسپورٹوں کے اندراج میں ایک گھنٹہ لگا اور اس دوران میں یہاں کے افسران نے بھی

خصوصی ملاقاتیں کیں، لاہور کا ویزا اہم لوگوں کا نہیں تھا، اس لیے دونوں کاریں بالا بالا ایک بجے رائے ونڈ پہنچ گئیں۔

راستہ میں ڈاکٹر منیر اور بھائی افضل دونوں سے لڑائی ہوگئی بھائی افضل کی گاڑی آگے تھی اور بہت آہستہ چل رہی تھی، ڈاکٹر منیر سے ابوالحسن وغیرہ نے اول تقاضا کیا کہ وہ گاڑی آگے نکال لیں مگر انہوں نے انکار کردیا کہ حضرت جی اور بھائی افضل سے آگے کیسے جا سکتا ہوں مگر جب میں نے ڈانٹ کر کہا کہ بھائی افضل آپ کے خسر ہیں میرے تو نہیں؟ اور حضرت جی کو بھی میں اپنے سے چھوٹا ہی سمجھتا ہوں اگر چہ وہ بہت بڑے ہیں، جب بھائی افضل کی گاڑی کے برابر چلا تو میں نے پوچھا کہ تم گاڑی چلانا کب سے بھول گئے یا نیند آ رہی ہے، تو انھوں نے کہا کہ سڑک بہت خراب ہے، بہر حال مجھے پیشاب کا بھی تقاضا تھا اور گرمی کی وجہ سے دماغ بھی گھوم رہا تھا، بہت تیزی سے چل کر رائے ونڈ اپنے قدیم کمرہ میں پہنچ گیا، جاتے ہی پیشاب کیا، پانی پیا، کچھ دماغ ٹھیک ہوا، وضو کر کے جمعہ کی نماز کے لیے اپنے ہی حجرے میں کہ وہاں تک صفوف آ گئی تھیں جمعہ ادا کیا۔

شاہد نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ باڈر پر چائے وغیرہ کا انتظام بھی رائے ونڈ والوں نے کر رکھا تھا، مگر اس کا وہاں موقع نہیں ملا، جمعہ کے بعد کھانے والوں نے کھانا کھایا اور میں یخنی پی کر لیٹ گیا، بارکی شام سے اجتماع بڑے زور وشور سے شروع ہوا، طلحہ قریشی اور محمد بنوری بھی پہنچ گئے تھے میں نے طلحہ سے اس کے نکاح کے متعلق سوال کیا اور مولوی انعام صاحب سے بھی، کہ اس کا نکاح یہاں جلسہ میں پڑھوا دیں تو اچھا ہے، انہوں نے کہا کہ اس کا مجوزہ خسر اچھن میاں کا معمول مجھ سے پہلے پہنچنے کا ہے مگر اس مرتبہ تو اب تک نہیں پہنچا، اس کے آنے پر مولوی انعام صاحب نے بھی اس سے گفتگو کی اور زکریا نے بھی کہا کہ مرا جی چاہتا ہے کہ جلسہ میں اس کا نکاح پڑھ دیں اور تم اور یہ نکاح کے بعد کراچی جا کر اس کی بیوی کو راولپنڈی پہنچا دو تا کہ اس کا ولیمہ ہم کھا کر جاویں اور زندگی رہے تو آئندہ سال عقیقہ بھی کھا کر جاویں۔

انہوں نے کہا کہ تعمیل حکم میں کوئی انکار نہیں جس طرح خوشی ہو مگر انہوں نے کہا کہ نہ تو ملک صاحب کو اس تجویز کی خبر ہے نہ اہلیہ قریشی صاحبہ کو، میں نے اسی وقت ان دونوں کے نام اسی مضمون کا زوردار خط لکھ کر مولوی احسان کے ذریعہ مستقل آدمی کے ذریعہ بھیجا، دوسرے دن صبح ان کا جواب آیا کہ ہماری خوشی تو یہ تھی کہ راولپنڈی میں نکاح ہو باقی تو جو تجویز کر دے انکار نہیں۔ مگر احسان میاں نے اتنے میں مولوی انعام صاحب سے اپنی مجبوریاں فوری رخصتی کی بیان کی، مولوی انعام صاحب نے کہا کہ ان کو یہ مجبوریاں ہیں، میں نے کہا کہ مجبور تو ہم بھی نہیں کرتے کم سے کم

نکاح تو پڑھ دیں، چنانچہ نکاح پڑھ دیا گیا۔

۲۵ ہزار مہر نصف معجّل اور نصف مؤجل طے ہوا اور بھی بہت سے نکاح پیر کے دن عصر کے بعد ہوئے، منگل کے دن دوپہر کو بحمد اللہ تعالیٰ جلسہ بہت ہی زور وشور کے ساتھ پورا ہوا، معلوم ہوا کہ اس اجتماع میں بہت سے جنات شریک تھے، جن میں صحابی اور تابعی بھی تھے، یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کافرین کی جانب سے بہت سے مضرات کی تجویز تھی، جس کی وجہ سے جلسہ کی حفاظت مسلم جنات کی طرف سے ہوتی رہی اور زکریا کے کمرہ میں بھی ایک محافظ رہا، جلسہ کی تفاصیل بہت لمبی چوڑی ہے جو شاہد کی ڈائری میں ہے مجھے اس کا نقل کرانا بہت مشکل ہے۔

قاری طیب صاحب بھی پاکستان دو تین دن پہلے لندن کے سفر سے پہنچے تھے اور ان کا پیام زکریا کو ملا کہ ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے، زکریا نے کہلا دیا کہ بہت اچھا موقع ہے رائے ونڈ کا اجتماع فلاں وقت سے فلاں وقت تک ہے میں بھی عمر بھر میں پہلی دفعہ شریک ہو رہا ہوں، آپ بھی شرکت فرمالیں تو بہت اچھا، ان کا پیام پہنچا کہ دل بہت چاہ رہا ہے مگر یہ تاریخیں تو میری دوسری جگہ گھر چکیں۔ جنات کے یہ واقعات اور بہت سے مزید ان کے ایک معمول سے معلوم ہوئے جو جنات کے کسی بڑے کے کہنے سے زکریا سے بیعت بھی ہوا، میں نے انکار بھی کیا کہ مولوی انعام صاحب سے ہو مگر ان کی طرف سے اصرار ہوا، اس لیے اس کو رائے ونڈ میں بیعت کرلیا معلوم ہوا کہ وہ لڑکا کراچی کا رہنے والا تھا۔

جلسہ کے اختتام تک مولوی انعام صاحب کی طبیعت بہت اچھی رہی مگر جلسہ ختم ہوتے ہی ان پر حرارت کا اثر ہوا جو میں نے تکان سمجھا، دو دن مزید رائے ونڈ قیام رہا، بدھ کی صبح کو ماموں شعیب اور ماموں محمد عمر نے پوچھ کر بھیجا تھا کہ تجھ سے ملنے کی کیا صورت ہے مجھے اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ لاہور کا ویزا نہیں ہے، میں نے کہلا دیا کہ یہاں سے نمٹ کر لاہور ہی جانا ہے، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کا ویزا نہیں ہے اس لیے بھائی غلام دستگیر کی گاڑی میں حاجی محمود کو بھیجا کہ وہ لے کر آئیں، چنانچہ بدھ کی صبح جو وہ آئے چلنے سے بالکل معذور، آتے وقت تو کچھ زیادہ اشکال نہیں ہوا مگر جب میری گاڑی پر وہ جانے لگے تو لوگوں نے گاڑی پہچان کر ان پر حملہ بول دیا، ہر چند لوگ کہتے رہے کہ شیخ نہیں ہیں مگر عوام نے ان کو ڈانٹ دیا کہ یہ گاڑی شیخ ہی کی ہے۔

چونکہ مولوی انعام صاحب کی طبیعت جلسہ کے بعد مضمحل اور حرارت کا اثر ہو گیا تھا اس لیے زکریا نے کہہ دیا کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ ڈھڈیاں نہ جائیں، رائے ونڈ سے پنڈی چلے جائیں میں بھی ڈھڈیاں سے پنڈی پہنچ جاؤں گا، مولوی انعام صاحب نے کہا کہ جیسا حکم ہو۔ میں نے کہا کہ حکم کی بات نہیں آپ کی علالت کی وجہ سے مشورہ تھا، جمعہ کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر

۶:۳۰ بجے رائے ونڈ سے چل کر جڑاں والہ کے قریب گاڑی کو روک کر گاڑی سے نیچے اترا کہ دوران سر شروع ہوگیا، مولوی انعام صاحب بھی میری وجہ سے اترے ۹:۱۰ پر لائل پور پہنچے۔
مفتی صاحب کے مدرسہ میں جاتے ہی میں تو لیٹ گیا مولوی انعام صاحب بھی لیٹ گئے، مفتی صاحب مجمع کو نمٹاتے رہے کوئی ۲۵ منٹ کے بعد اٹھ کر مدرسہ میں گیا، اتنے ہمارے رفقاء نے ناشتہ کیا زکریا نے بخاری کی ابتداء کی اور مولوی انعام صاحب نے مولوی جلیل کے لڑکے شفیق کا نکاح پڑھا اور وہاں سے رخصت ہوکر مفتی صاحب نے خود ہی روک دیا تھا، ۱۱:۳۰ پر روانہ ہوکر الحاج ابراہیم پہلوان کے مکان پر گاڑی ہی میں چند منٹ ٹھہر کر مولوی انیس الرحمٰن کی مسجد میں گئے، وہاں ان کا مزار ہے اور گاڑی پر ہی ان کی اہلیہ برقعہ اوڑھ کر آ گئی، وہیں ان کی تعزیت کی، اس کے بعد مسجد ہلال مرکزِ تبلیغ میں گئے، زکریا گاڑی ہی میں رہا اور مولوی انعام صاحب نے اتر کر دعاء کرائی۔
اس کے بعد سرگودھا روانہ ہوئے ۱:۳۰ بجے وہاں پہنچے جب کہ حافظ صاحب کی مسجد میں خطبہ کی اذان ہوچکی تھی، زکریا کو وضو تھا، اس لیے خطبہ میں شریک ہوگیا تھا مگر مولانا انعام صاحب کو استنجاء کی ضرورت ہوگئی، اس لیے جمعہ میں شرکت نہ ہوسکی اپنی ظہر پڑھی، تجویز سرگودھا چند منٹ ٹھہر کر جھاوریاں روانگی کی تھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ افضل نے علی الصباح حافظ صاحب کو ٹیلی فون کر دیا تھا کہ دو گاڑیاں جمعہ بھی پڑھیں گی اور کھانا بھی کھائیں گی، زکریا نے تو کھانا نہیں کھایا صرف یخنی پی اور مولوی انعام صاحب نے بھی علالت کی وجہ سے نہیں کھایا، بقیہ رفقاء حافظ صاحب کے مکان پر کھانا کھاتے رہے اور ہم لوگوں کے قیام کے لیے حافظ صاحب نے برابر کا مکان خالی کرا رکھا تھا، جس میں ایک کمرہ زکریا کا مستقل اور دوسرا انعام صاحب کا مستقل، شنبہ کی صبح کو چائے سے فراغت پر ڈھڈیاں کے لیے روانگی ہوئی، سرگودھا بھی اطلاع دو گاڑیوں کی تھی مگر ۸، ۱۰ جمع ہوگئیں۔
سرگودھا سے الوداعی مصافحہ کے وقت حافظ صاحب سے زکریا نے تخلیہ میں پوچھا کہ آپ نے عتیق کو اجازت دی ہے؟ انہوں نے کہا کہ اچھے چل رہے ہیں، میں نے کہا کہ تنقید مقصود نہیں تحقیق مقصود ہے، میری تمنا رائے پوری خانقاہ کی آبادی کی ہے، آپ کو معلوم ہے، اول آپ پر اصرار کیا مگر جب آپ نے فرمایا کہ میرا کوئی وعدہ نہیں تو حافظ عبدالرشید پر اصرار کیا، اس میں بھی ناکام رہا، معلوم ہوا کہ آپ نے مولوی عتیق کو تجویز کیا ہے، جب اجازت ہے تو مجھے بھی انکار نہیں مگر وہیں قیام کیا کریں، انہوں نے کہا کہ قیام وہیں کرتے ہیں، میں نے کہا کہ یہ غلط ہے، وہ مہینہ میں ایک دو دن کو آتے ہیں، انہوں نے کہا کہ وہ وہیں رہتے ہیں آپ کو معلومات نہیں، میں نے کہا کہ میں

چار ماہ رہ کر آیا ہوں، آپ کو معلومات نہیں، تقریباً آدھ گھنٹہ تخلیہ کے بعد رخصت ہوگیا۔

تقریباً ۹ بجے صبح کو ڈھڈیاں پہنچے، راستہ میں جھاوریاں پر قاضی محمود مع رفقاء کھڑے ملے، وہاں اتارنے کے لیے، مگر اشارہ سے انکار کردیا، دونوں گاڑیاں بہت تیزی سے چلی گئیں، وہاں جاکر ابراہیم پہلوان مع برادران دو دن پہلے گئے ہوئے تھے اور وہاں دعوت کا انتظام کر رکھا تھا اور ہمیشہ میرے جانے پر ہی نہیں بلکہ میرے علاوہ بھی جب وہاں خواص میں سے کوئی جاتا ہے یا جلسہ ہوتا ہے تو کھانے کا انتظام یہی لوگ کرتے ہیں، ظہر کی نماز پڑھ کر زکریا مزار پر پہنچ گیا اور مولوی محمد عمر صاحب سے کہا کہ آپ کام جاری کردیں انہوں نے تبلیغی تقریر شروع کردی، عصر کے قریب زکریا بھی مسجد میں پہنچ گیا اور مولانا محمد عمر صاحب کے پاس بیٹھ کر شاہد سے یہ اعلان کرایا کہ!

ایک ضروری اعلان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تبلیغ اور تصوف دو الگ الگ چیزیں ہیں، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ یہ علی العموم صحیح نہیں، کیونکہ میرا تعلق بذات خود تبلیغ سے بھی ہے اور بزرگی اور تصوف سے بھی، بعض مشائخ اپنے مریدوں کو تبلیغ میں لگنے سے منع کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ یہ توحید مطلب کے خلاف ہے یہ ان کا منع کرنا قاعدہ کلیہ اور اصول کلیہ نہیں ہے بلکہ مشائخ اور بزرگوں کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے یہ ان کا منع کرنا ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر حکیم کسی کو شکر کے استعمال سے روک دے، چنانچہ ذیابیطس میں روک دیتا ہے، بعض بیماروں کو نمک سے روک دیتا ہے، بعض کو پانی سے روک دیا جاتا ہے تو اس کو یہ سمجھ لینا کہ یہ ممانعت ہر شخص کے لیے ہے، بالکل غلط ہے، یا یہ کہ میرے چچا جان کو حکیم مسعود احمد نے پانی کو روک دیا تھا متواتر سات سال تک پانی نہیں پیا تو اس کو قاعدہ کلیہ سمجھ لینا یہ سب غلط ہوگا میں چونکہ حضرت قدس سرہٗ کا آدمی ہوں اور حضرت رائے پوری سے بھی مجھے اجازت ہے، اس لیے بڑے زور سے کہوں گا کہ جہاں تک ہوسکے تبلیغ میں وقت لگانا۔

ڈھڈیاں میں مولانا انعام صاحب کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہوگئی اور ۱۰۵ ڈگری تک بخار ہوگیا جس کی وجہ سے فکر ہوگئی، مغرب کے بعد ختم یٰسین کردیا گیا، قاضی صاحب نے بہت دردانگیز الفاظ میں دعاء صحت کرائی جس کی اجابت فوری محسوس ہوئی اور اسی وقت افاقہ شروع ہوگیا، مولانا کی شدت علالت کی وجہ سے مشورہ ہوا کہ بجائے کاروں کے ریل سے سیدھا پنڈی بھیج دیا جائے مگر فسٹ کلاس میں صرف ایک سیٹ مل سکی اس لیے ملتوی ہوگیا، پیر کی صبح کو ڈھڈیاں سے روانہ ہو کر جھاوریاں پہنچے، وہاں ناشتہ کیا، مولوی انعام صاحب علیحدہ کمرے میں رہے اور وہیں سے سیدھے افضل کی گاڑی میں بیٹھ کر تلاگنگ کے لیے روانہ ہوگئے زکریا اول مسجد میں گیا وہاں ایک نکاح مولوی عبدالوحید ڈھڈیاں نے قاضی صاحب کے حکم سے پڑھایا، قاضی صاحب نے دعاء

کرائی، وہاں سے دس بجے کے قریب چل کر پہاڑی راستہ سے ۲ بجے کے قریب تلاگنگ پہنچے۔
مولوی ظہور بن جنرل حق نواز نے پہلے سے وعدہ لے رکھا تھا، جنرل صاحب تو جماعت میں گئے ہوئے تھے، وہاں پھل وغیرہ کھائے اور پیشاب وضو کر کے ظہر کی نماز پڑھی اور ڈھائی بجے روانہ ہوئے پہلے سے معلوم تھا کہ راولپنڈی کا ویزا ہے اس پر ملک صاحب اور اہلیہ قریشی کو رائے ونڈ آنے سے روک دیا تھا، مگر عین رائے ونڈ سے روانگی کے وقت معلوم ہوا کہ ویزا شہر کا ہے چھاؤنی ممنوع الدخول ہے اسی لیے رانا اقبال کے مکان پر شہر میں قیام تجویز ہوا کہ بڑی جگہ ہے، زکریا نے حاجی محمود کا مکان تجویز کیا تھا، ان کا بھی اصرار تھا مگر اہل شوریٰ نے یہ کہہ کر کہ ان کا مکان چھوٹا ہے رد کر دیا لیکن جب تلاگنگ سے پنڈی کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو فتح جنگ پر حاجی محمود وغیرہ متعدد آدمی یہ مژدہ لے کر پہنچے کہ چھاؤنی میں جانے کی اجازت ہوگئی، اس لیے بجائے شہر کے وہیں سے چھاؤنی کا رخ کیا، مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ صرف زکریا مسجد میں اجتماع کرنے کی اجازت ملی ہے قیام کی نہیں۔
چنانچہ مولانا محمد عمر صاحب نے جاتے ہی مسجد میں قیام کیا اور مغرب کے بعد سے تقریر شروع کر دی، زکریا مع مولوی انعام قریشی کے مکان پر دو کمروں میں ٹھہر گئے، مولوی انعام صاحب سیدھے ملک صاحب سے ملے مگر انہوں نے پہچانا نہیں، زکریا نے پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ان سے دریافت کرایا انہوں نے کہا کہ تیرے آنے کی ضرورت نہیں میں خود آرہا ہوں، چنانچہ درمیانی کمرہ میں آگئے جو وسیع تھا زکریا کے ساتھ ہی نماز پڑھی پھر مولانا انعام صاحب کو دریافت کیا، میں نے کہا کہ وہ آتے ہی آپ سے مل چکے وہ مغرب تک زکریا کے پاس بیٹھے رہے، مغرب کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور زکریا اپنے کمرے میں چلا آیا اور اسی کمرے میں پردہ کرا کر مستورات آگئیں، سب سے پہلے ام طلحہ آئیں، زکریا نے کہا کہ میں نے تو چاہا تھا کہ جلسہ میں طلحہ کا نکاح کر دیں اور اتنے ہم یہاں پہنچیں وہ اپنی بیوی کو لے آئے اور ہم یہاں آکر ولیمہ کھالیں اور آئندہ سال عقیقہ کھالیں، وہیں عزیزی محمد کاندھلوی کی بہن ملیں اور محمد احمد تھانوی کی اہلیہ اور بہت سے رشتہ دار ملے، البتہ مولوی احتشام کی لڑکی نہ مل سکی اور بعد میں مستورات کا بہت جم غفیر ملا، انہوں نے اپنا تعارف کرایا، مگر زکریا کو کسی کا پتہ نہ چلا۔
عشاء کا وقت ہو جانے پر اول وقت اپنی نماز پڑھ کر جب کہ مسجد میں مولانا محمد عمر صاحب زوروں پر تھے ڈاکٹر منیر کی گاڑی میں قریشی صاحب کے مزار پر گئے وہاں ۲۰ منٹ بیٹھ کر ان کے مکان پر چلا گیا، قریشی صاحب کے مزار پر بہت یکسوئی سکون اور فرحت ہوئی بہت ہی برکات سے لبریز تھا اُٹھنے کو دل بالکل نہیں چاہتا تھا، مگر محض اس ڈر سے کہ اگر مولوی محمد عمر نے تقریر ختم کر دی تو

اتنا ہجوم ہو جائے گا کہ نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

رانا اقبال کے مکان پر پہنچ گئے، مولوی انعام صاحب سے میں نے کہہ دیا کہ ملک صاحب تمہیں پوچھ رہے ہیں، انہوں نے پہچانا نہیں تو وہ دوبارہ مل کر آئے اور میرے پہنچنے کے کچھ دیر بعد رانا اقبال کے گھر پہنچے، پنڈی میں سردی اتنی زیادہ تھی کہ قریشی صاحب کے مکان پر بھی دو ہیٹر جلائے گئے اور رانا صاحب کے مکان پر ہی صبح کو رفقاء نے رانا صاحب کے یہاں ناشتہ کیا، زکریا نے حاجی محمود سے وعدہ کر لیا تھا، اس لیے زکریا کی گاڑی میں شاہد، مولوی احسان وغیرہ حاجی محمود کے یہاں گئے آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہرے اور وہاں سے سیدھے ہوائی اڈہ پر نو بجے پہنچ گئے، وہاں بہت الگ کھڑے ہوئے تھے، مگر ہجوم نے یہاں بھی گھیر لیا پولیس والے بھی دق کرتے رہے اور مطاروں پر تو زکریا کی گاڑی ایسے موقع پر مطار کے احاطہ میں داخل ہو جاتی ہے، مگر یہاں نہ ہو سکی، بھائی افضل نے کہا تھا کہ تیری اور مولانا انعام صاحب کی گاڑی کی طیارہ تک اجازت ہو گئی، مگر معلوم ہوا کہ اجازت نہیں مل سکی تھی، اس لیے مطار کی کرسی پر طیارہ تک پہنچے اور میرے رفقاء میری کرسی لے کر ساتھ ساتھ، انہوں نے کہا میری کرسی کو قبول نہیں کیا۔

طیارہ پر بھی انہوں نے کہا کہ ان کی کرسی سے چڑھا جائے، مگر وہ ممکن نہ ہو سکا، اس لیے طیارہ سے اپنی کرسی پر منتقل ہو کر سب مسافروں سے پہلے زکریا کو فرسٹ کلاس کی اگلی سیٹ دے دی اور مولانا انعام صاحب کو اس کے بغل میں وہاں کپتان احمد حسن قادری سے ملاقات ہوئی، انہوں نے بہت کوشش کی کہ کپتان سے [illegible] دلہ کر لیں، مگر وہ راضی نہ ہوا، اس لیے ساتھ ہی کراچی تک پہنچے، ڈیڑھ گھنٹہ میں کراچی کے مطا[illegible] پر پہنچے، زکریا تو حسب معمول سیدھا مکی مسجد پہنچ گیا اور دوسری کار میں مولوی انعام صاحب اور بقیہ رفقاء سامان کے ساتھ دیر میں پہنچے معلوم ہوا کہ زکریا کا کموڈ گم ہو گیا بڑی مشکل پیش آئی، لاہور، پنڈی، سب جگہ برقیہ ٹیلی فون کیا گیا، مگر سب جگہ سے جواب ملا یہاں نہیں، اسی وقت کہیں سے قدیم لکڑی کا کموڈ منگایا گیا اور اس کا استعمال شروع ہوا، اگلے دن بڑی کوششوں کے بعد وہ کراچی کے مطار سے مل گیا۔

معلوم ہوا کہ جہاز والوں نے اس کو جہاز کا کوئی سامان سمجھ کر اپنے خزانہ میں ڈال دیا تھا اس کی ہیئت بھی ایسی ہی تھی، یہ کموڈ اس سفر میں خاص طور سے افضال نے ایسی طرح سے تیار کیا تھا کہ اندر پانی نہ جائے پہلے سے قرار یہ تھا کہ مطار سے سیدھے بھائی یوسف کے یہاں جانا ہے اور ان کے صاحبزادے کے ولیمہ کی قضاء کھانی ہے۔

بھائی یوسف نے اپنے لڑکے کے نکاح کا کارڈ وغیرہ قاضی صاحب کے کہنے پر اور ان کی اس تجویز پر کہ طیارہ سے آنا ہے، ۷ نومبر کو نکاح کا اعلان اور اگلے دن ولیمہ کا اعلان کر دیا تھا، مگر زکریا کا

باڈر سے آنا طے ہو گیا، اس لیے قاضی صاحب نے نکاح پڑھایا اور ہم لوگوں کی عدم شرکت کا قلق ہم سب کو ہی ہوا، اس لیے تجویز ہوا کہ کراچی پہنچ کر ان کے ولیمہ کی قضاء کرنی ہے۔

بھائی یوسف کے یہاں سے واپسی پر بھائی یحییٰ مدنی کے مکان پر پہنچے، یہ پہلے سے وعدہ تھا کہ کار سے نہیں اُتریں گے، اس لیے وہ کار ہی پر اپنی مستورات کو لے کر آئے اور ساتھیوں نے اس عرصہ میں کچھ کھایا پیا، اس کے بعد مکی مسجد گئے، پنڈی میں اس دن ترکی کا صدر آرہا تھا اس لیے زیادہ اہتمام پولیس وغیرہ کا تھا اگرچہ وہ صدر شام کو ۴ بجے آنے والا تھا مگر پولیس صبح ہی سے مسلط تھی اس وجہ سے تنگی کی گئی، عشاء کے بعد بھائی یوسف کے یہاں دعوت تھی، دوسرے دن ظہر کے وقت حاجی فریدالدین کی لڑکی کا نکاح پہلے طے ہو گیا، انہوں نے ڈھڈیاں ہی میں وقت مقرر کرالیا تھا، اس لیے بدھ کی صبح کو حاجی صاحب کی گاڑی میں اول مفتی شفیع صاحب کے مدرسہ میں جانا ہوا کیونکہ مفتی صاحب کی عیادت بھی اہم تھی۔

مفتی صاحب ضعف کی حالت میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، زکریا کو دیکھتے ہی بہت اظہارِ مسرت کیا، ایک گھنٹہ زکریا ان کے پاس برابر کی چارپائی پر لیٹا رہا، احباب ناشتہ وغیرہ کرتے رہے، وہ چارپائیاں برابر تھیں اور میں اور مفتی صاحب اس طرح لیٹے تھے کہ ایک چارپائی پر یہ ناکارہ اور دوسری پر مفتی صاحب سر دونوں کے آمنے سامنے اور پاؤں الگ الگ، مفتی صاحب نے اپنے مدرسہ کی بہت ہی شکایات کیں، طلبہ کی طرف سے حکومت کی طرف سے اور یہ کہ بعض طلبہ پڑھنا تو ان کا مقصود نہیں ہوتا، غیروں کے تنخواہ دار محض فساد ڈالنے کے لیے ہمارے مدرسہ میں طالب علم بن کر ہوتے ہیں، مفتی صاحب نے اس کی بہت سی جزئیات بتائیں۔

زکریا نے بڑے اہتمام سے ساری گفتگو سنی اور کہا کہ یہ اشکالات آپ ہی کے یہاں نہیں۔ ہم سب مدارس والوں کو پیش آتے ہیں۔ صورت میں کچھ تھوڑا بہت فرق ہو جاتا ہے ہمارے یہاں کے اسٹرائیک ۱۳۸۲ء میں اس کے بڑے تجربات ہوئے کہ مدارس بلکہ اسلام کے مخالف لوگوں نے بعض لوگوں کو تنخواہیں دے دے کر ہمارے اسٹرائیک میں شریک کیا۔ میرے نزدیک تو ان سب کا واحد علاج ذکر اللہ کی کثرت ہے کہ جب کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا نہ ہوگا تو قیامت قائم ہو جائے گی۔

جب اللہ تعالیٰ شانہ کا پاک نام ساری دنیا تھامے ہوئے ہے تو مدارس کی کیا حقیقت اور پھر مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد میں نے اس مضمون کو یاددہانی کے طور پر مفتی صاحب کو اور مولانا بنوری نوراللہ تعالیٰ مرقدھما کو الگ الگ لکھے جو خصوصی مضامین کے علاوہ مشترک مضمون دونوں میں یہ تھا:

مدارس کے روز افزوں فتن، طلبہ کی دین سے بے رغبتی بے توجہی اور لغویات میں اشتغال کے

متعلق کئی سال سے میرے ذہن میں یہ ہے کہ مدارس میں ذکر اللہ کی بہت کمی ہوتی جارہی ہے۔ بلکہ معدوم، بلکہ اس لائن سے تو بعض میں تنفر کی صورت دیکھتا ہوں۔ جو میرے نزدیک بہت خطرناک ہے ہندوستان کے مشہور مدارس دارالعلوم، مظاہر علوم شاہی مسجد مرادآبادی وغیرہ کی ابتداء جن اکابر نے کی تھی وہ سلوک میں بھی امام الائمہ تھے۔ ان ہی کی برکات سے یہ مدارس ساری مخالف ہواؤں کے باوجود اب تک چل رہے ہیں۔

میں اس مضمون کو کئی سال سے اہل مدارس منتظمین اور اکابرین کی خدمت میں تحریراً تقریراً کہتا اور لکھتا رہا ہوں میرا خیال ہے کہ آپ جیسے حضرات اس کی ساری توجہ فرمائیں تو مفید اور مؤثر زیادہ ہوگا۔ مظاہر علوم میں تو کسی درجہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہوں اور دارالعلوم کے متعلق جناب الحاج حضرت قاری محمد طیب صاحب سے بارہا تقریراً تحریراً عرض کرچکا ہوں اور بھی اپنے سے تعلق رکھنے والے اہل مدارس کو متوجہ کرتا رہتا ہوں۔ مدارس کے روزافزوں فتنوں سے بہت ہی طبیعت کو کلفت پہنچتی رہتی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ فتنوں سے بچاؤ کی صورت صرف ذکر اللہ کی کثرت ہے، جب اللہ کا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا تو دنیا ختم ہوجائے گی۔ جب اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو اتنی قوت ہے کہ ساری دنیا کا وجود اسی پر قائم ہے تو مدارس بے چارے ساری دنیا کے مقابلہ میں دریا کے مقابلہ میں قطرہ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو ان کی بقاء اور تحفظ میں جتنا دخل ہوگا وہ ظاہر ہے اکابر کے زمانے میں ہمارے ان جملہ مدارس میں اصحاب نسبت وذاکرین کی کثرت جتنی رہی ہے۔ وہ آپ سے بھی مخفی نہیں اور اب اس میں جتنی کمی ہوگئی ہے وہ بھی ظاہر ہے۔

بلکہ اگر یوں کہوں کہ اس پاک نام کے مخالف حیلوں بہانوں سے مدارس میں داخل ہوتے جارہے ہیں تو میرے تجربہ میں غلط نہیں اس لیے میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں کچھ ذاکرین کی تعداد ضرور ہوا کرے۔ طلبہ کے ذکر کرنے کے تو ہمارے اکابر بھی خلاف رہے ہیں اور میں بھی موافق نہیں، لیکن منتہی طلبہ یا فارغ التحصیل یا اپنے سے یا اکابرین سے تعلق رکھنے والے ذاکرین کی کچھ تعداد مدارس میں علی التبادل ضرور رہا کرے اور مدرسہ ان کے قیام کا کوئی انتظام کردیا کرے۔

مدرسہ پر طعام کا بار ڈالنا تو مجھے بھی گوارا نہیں کہ طعام کا انتظام تو مدرسہ کے اکابر میں سے کوئی شخص ایک یا دو اپنے ذمہ لے یا باہر سے مخلص دوستوں میں سے کسی کو متوجہ کرکے ایک ایک ذاکر کا کھانا اس کے حوالہ کردے جیسا کہ ابتداء میں مدارس کے طلبہ کا انتظام اسی طرح ہوتا تھا۔ البتہ اہل مدارس ان کے قیام کی کوئی صورت اپنے ذمہ لے لیں جو مدرسہ ہی میں ہو اور ذکر کے لیے ایسی مناسب تشکیل کریں کہ دوسرے طلبہ کا کوئی حرج نہ ہو۔ نہ سونے والوں کا نہ مطالعہ کرنے والوں کا۔

جب تک اس ناکارہ کا قیام سہارنپور میں رہا تو ایسے لوگ بکثرت رہتے تھے جو میرے مہمان

ہوکر ان کے کھانے پینے کا انتظام تو میرے ذمہ تھا لیکن قیام اہلِ مدرسہ کی جانب سے مدرسہ کے مہمان خانہ میں ہوتا تھا اور بدلتے سدلتے رہتے تھے، صبح کی نماز کے بعد میرے مکان پر ان کے ذکر کا سلسلہ ایک گھنٹہ تک ضرور رہتا تھا اور میری غیبت میں سنتا ہوں کہ عزیز طلحہ کی کوشش سے ذاکرین کی وہ مقدار اگرچہ نہ ہو مگر ۲۰، ۲۵ کی مقدار روزانہ ضرور ہو جاتی ہے۔

میرے سہارنپور کے قیام کے زمانہ میں سو، سوا سو تک پہنچ جاتی تھی اور غیبت کے زمانہ میں بھی سنتا ہوں کہ چالیس پچاس کی تعداد عصر کے بعد جمعہ کے دن ہو جاتی ہے ان میں باہر کے مہمان ہوتے، جو دس بارہ تک اکثر ہو جاتے ہیں۔ عزیز مولوی نصیر الدین سلمہٗ اللہ تعالیٰ اس کو بہت جزائے خیر دے ان کے کھانے کا انتظام میرے کتب خانہ سے کرتے رہتے ہیں اسی طرح میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں دو چار ذاکرین مسلسل ضرور رہیں کہ داخلی اور خارجی فتنوں سے بہت امن کی امید ہے، ورنہ مدارس میں جو داخلی اور خارجی فتنے بڑھتے جا رہے ہیں۔

اکابر کے زمانہ سے جتنا بعد ہوتا جائے گا اس میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس ناکارہ کو نہ تحریر کی عادت نہ تقریر کی آپ جیسا یا مفتی شفیع صاحب جیسا کوئی شخص میرے مافی ضمیر کو زیادہ وضاحت سے لکھتا تو شاید اہلِ مدارس کے اوپر اس مضمون کی اہمیت زیادہ پیدا ہو جاتی۔ اس ناکارہ کے رسالہ فضائل ذکر میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب الوابل الصیب سے ذکر کے سو (۱۰۰) کے قریب فوائد نقل کیے گئے ہیں، جن میں شیطان سے حفاظت کی بہت سی وجوہ ذکر کی گئی ہیں شیاطینی اثر ہی ساری فتنہ وفساد کی جڑ ہے۔ فضائل ذکر سے یہ مضمون بھی اگر آپ جناب سن لیں تو میرے مضمون بالا کی تقویت ہوگی اس کے بعد میرا مضمون تو اس قابل نہیں جو اہلِ مدارس پر کچھ اثر انداز ہو سکے آپ میری درخواست کو زوردار الفاظ میں نقل کرا کر اپنی یا میری طرف سے بھیج دیں تو شاید کسی پر اثر ہو جائے۔ دارالعلوم، مظاہر علوم، شاہی مسجد کے ابتدائی حالات آپ کو مجھ سے بھی زیادہ معلوم ہیں کہ کن صاحب نسبت اصحاب ذکر کے ہاتھوں ان کی ابتداء ہوئی ہے۔ ان ہی کی برکت سے یہ مدارس اب تک چل رہے ہیں یہ ناکارہ دعاؤں کا بہت محتاج ہے بالخصوص حسن خاتمہ کا کہ گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب

بقلم حبیب اللہ

۳۰ نومبر ۱۹۷۵ء "مکہ مکرمہ"

میرے اس خط کے جواب میں مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ جواب آیا۔

"مخدوم المحترم حضرت شیخ الحدیث صاحب متعنا اللہ تعالیٰ بطول حیاتہ بالعافیۃ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا کرم نامہ اتنی جلد خلاف وہم وگمان کے پہنچا اور بڑا تفصیلی پہنچا کہ حیرت ہوگئی، مگر حقیقت یہ ہے کہ عرصہ دراز سے آں مخدوم کے تمام ہی معاملات بالکل خرق عادت اور کرامات ہی کی قبیل سے نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو افاضہ خلق اللہ کے لیے دائم و باقی رکھیں۔ نظر اب لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں رہی۔ گرامی نامہ بھی عزیزوں سے پڑھوا کر بار بار سنا دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ آپ کے ارشادِ عالیہ کو ذرا شرح وبسط کے ساتھ لکھ کر خوب شائع کیا جائے مگر ابھی تک طبیعت اس قابل بھی نہیں ہوئی کہ دوسروں کو املا کرا سکوں خدا کرے کہ ذرا قوت، ہمت پیدا ہو جائے تو یہ کام پورا کراؤں۔ آپ کی شفقت وعنایت تو ہمیشہ سے ہیں۔ اس گرامی نامہ نے تو گویا مسحور ہی کر دیا متعنا اللہ بافاضاتکم۔

فضائل ذکر کا مطلوبہ حصہ احقر نے پورا سن لیا ہے اور ایک عنوان کے ساتھ اس کا مضمون بھی ذہن میں آرہا ہے، اللہ تعالیٰ آسان فرمائے تو تشریح کے ساتھ ورنہ پھر خود حضرت کا گرامی نامہ بعینہ شائع کر دینا بھی ان شاء اللہ تعالیٰ بہت مفید ہوگا۔ ایک امر عجیب ہے کہ اس مرتبہ جب مجھے دوسری مرتبہ دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال میں دو ہفتے رہنا پڑا جب وہاں سے فراغت کے بعد گھر آیا تو انتہائی ضعف کے باوجود دو باتیں بڑی قوت سے دل میں وارد ہوئیں جن کا خیال عرصہ تین سال سے تقریباً چھوٹا ہوا تھا۔

ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ میں مجھے پہلا دل کا دورہ شدید ہوا تھا اس سے شفاء کے بعد بھی طبیعت میں بھی زندگی سے ایک مایوسی تھی اور اس کی وجہ سے دارالعلوم کے معاملات میں یہ خیال بار بار آتا تھا کہ جب کسی اصلاحی امر میں اقدام کی ضرورت ہوئی تو نفس یہ کہتا تھا کہ اب تو مر رہا ہے اب کوئی نیا کام کرنے کا وقت نہیں۔ تیرے بعد جو لوگ اس کے متکفل ہوں گے وہ خود دیکھ لیں گے اور کر لیں گے۔

اس مایوسانہ خیال سے بہت سے کام رہ گئے مگر اب دوسرے دورہ میں جبکہ سب ڈاکٹروں کو بھی مایوسی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے حیات ثانیہ عطاء فرمادی تو بڑی قوت سے یہ خیال آیا کہ دارالعلوم میں جو خرابیاں تجھے نظر آرہی ہیں۔ آخری دم تک جتنی قوت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس کی اصلاح میں ضرور خرچ کرنا چاہیے۔ نتائج کی ذمہ داری بندہ پر نہیں اپنا کام مقدور کی حد تک ضرور کرنا چاہیے اور دوسری بات یہ ذہن میں آئی کہ میں دیکھتا ہوں کہ دارالعلوم کے طلبہ بلکہ اساتذہ اور تمام متعلقین میں نماز جماعت کی پابندی بہت کم ہوتی جارہی ہے۔ نماز کا اہتمام ہی گویا ذہنوں سے جا رہا ہے اس لیے اب میں سب مدرسین کو جمع کر کے علیحدہ اور طلبہ کو جمع کر کے علیحدہ اس کی پابندی کے لیے کہوں گا اس کا پہلا قدم تو اپنے گھر سے شروع کر دیا کہ اس معاملہ میں سست تھے ان کو اور سب گھر

والوں کو اس کا پابند کر دیا کہ اگر اب سے کسی کی کوئی نماز قضا ہوگئی ایک روپیہ جرمانہ کا صدقہ کرنا ہوگا اور جماعت قضا ہوگئی تو چار آنے کا۔

الحمدللہ تعالیٰ یہ نسخہ گھر میں تو کامیاب ہوگیا۔ مگر ابھی تک اتنی قوت نہیں آئی کہ طلبہ و مدرسین کو جمع کر کے خطاب کروں۔ امید کر رہا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں یہ بھی ہو جائے گا اور حضرت کا گرامی نامہ وصول ہونے کے بعد سے کچھ ایسے ذاکر شاغل لوگ جن کا مجھ سے تعلق ہے اور پہلے سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہم کچھ عرصہ دارالعلوم میں رہ کر ذکر شغل کریں میں اپنی بیماری اور عدم فرصت کا عذر کر کے دفع کر دیتا تھا۔ اب الحمدللہ تعالیٰ یہ کام شروع کر دیا ہے۔ دعاء فرمائیں اللہ تعالیٰ کامیابی عطاء فرمائے۔ اپنے لڑکوں میں سے جو دو عالم ہوئے ہیں ان دونوں کو احقر نے اصلاح ظاہر و باطن اور ذکر شغل سکھانے کے لیے ڈاکٹر عبدالحئی صاحب کے سپرد کیا ہے کیونکہ گھر کے اندر یہ کام ہونا چاہیے تاہم کچھ کام شروع ہوا ہے۔ آپ ان دونوں کے لیے خصوصی دعاء فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی مکمل توفیق عطاء فرمائے۔

والسلام

بندہ محمد شفیع

جمعرات ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ

بندہ نے اس گرامی نامہ کا یہ جواب لکھا تھا۔

مکرم و محترم حضرت مفتی صاحب! زادت معالیکم

بعد سلام مسنون!

اسی وقت شدید انتظار میں گرامی نامہ مورخہ ۱۴ ذی الحجہ حجازی ۲۴ ذی الحجہ کو پہنچا، مجھے بہت شدت سے اپنے اس خط کے پہنچنے کا انتظار تھا گرامی نامہ سے بہت ہی مسرت اور طمانیت ہوئی کہ جناب کو خود بھی اس کا احساس ہوا اور میرا عریضہ محرک ہوا یہ ناکارہ تو کئی سال سے خط بھی سننے میں اور لکھوانے میں دوسروں کا محتاج ہے، اس داعیہ سے کہ میرے خیالات کو آپ اپنے کلام میں شرح وبسط سے تحریر فرمائیں گے، بے حد مسرت ہوئی یقیناً وہ زیادہ مفید ہوگی، میری تحریر تو بے ربط و بے سروپا ہوتی ہے، نہ تحریر کی مشق نہ تقریر کی۔ میں نے تو خود بھی درخواست یہی کی تھی کہ اس مضمون کی روشنی میں جناب خود تحریر فرمادیں تو زیادہ مفید ہوگا۔

اس ناکارہ کو اپنے اکابر کے حالات سننے پڑھنے کا تو بچپن سے اشتیاق ہے شاید پہلے بھی لکھا ہوگا کہ ''اشرف السوانح'' ''اسیر مالٹا'' حضرت میاں صاحب کا تحریر فرمودہ ''حیات شیخ الہند'' جو چھپتی رہی ایک ایک رات میں دیکھتا رہا جب صحت اور شباب تھا تو ساری رات جاگنا بہت آسان

تھا اب اپنی محتاجگی اور معذوری نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔

فضائل ذکر کا مضمون آپ نے سن لیا اور ایک عنوان کے ساتھ جناب کے ذہن میں مضمون بھی آ گیا اس سے بہت مسرت ہوئی یہ زیادہ مفید ہوگا جناب نے پہلے قلبی دورہ کے بعد مایوسانہ خیال لکھا میں تو اس میں آپ کا ہم خیال نہیں ہوں۔ میرا تو خیال یہ ہے اس ضعف و پیری اور مایوسی عن الحیات میں بھی جو نیک خیال دل میں آئے اس کو ضرور شروع کر دیا جائے کہ بعد والوں کے لیے اسوہ بنے اور کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا سبب بنے۔

میرا خیال یہ ہے اور بہت قوت سے ہے کہ اکابر کی آنکھیں جنہوں نے دیکھی ہیں یا صحبت اٹھائی ہے۔ ان کو بعد میں آنے والوں کے لیے جو اکابر کی نگاہوں سے بھی محروم ہیں جو ہو سکے متن یا مسودہ کی طرح ضرور سامنے کر دینا چاہیے کہ کم سے کم ان کے لیے اس ماحول سے مناسبت تو رہے (میں تو) جناب کے دوسرے وعدہ دورہ کے بعد کے خیال کا ہم نوا ہوں۔

ضرور جو امور خیر بڑوں سے حاصل کیے ہیں، وہ ربط بے ربط بعد والوں کے لیے تحریراً تقریراً شروع کر جائیں۔ آپ نے نماز قضا ہونے پر جو جرمانہ تجویز کیا بہت مناسب ہے۔ اس کا شدت سے نفاذ کریں اور اس کا مطالبہ بھی فرمایا کریں کہ جرمانہ اداء کر دیا یا نہیں؟ آپ کے بعد یہی مقتداء اور آپ کے قائم مقام ہوں گے۔ احادیث سے بھی بکثرت اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ اس مژدہ سے بہت ہی مسرت ہوئی کہ آپ نے ذاکرین کے دار العلوم میں اجتماع کا اہتمام شروع فرمایا۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور موجب خیر فرمائے۔ آپ نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو ڈاکٹر عبدالحئی صاحب کے حوالے کر دیا، بہت اچھا کیا، مگر شرط یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ڈاکٹر صاحب کی محبت و وقعت پیدا ہو اور آپ خود بہت اہتمام سے اس کی نگرانی کیا کریں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے فرمودات پر اہتمام سے عمل بھی کریں اور وقعت بھی۔

مولویوں میں ایک خاص مرض یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں اپنی علمیت کے گھمنڈ میں اپنے سے جو اعظم نہ ہو اس کی وقعت کم ہوتی ہے اس سلسلہ میں ان بچوں کو یہ مضمون ضرور سناتے رہیں، رشید، قاسم نے حضرت حاجی صاحب سے بیعت کی اور جب لوگوں نے دونوں سے الگ الگ اعتراض کیا جو ان کی شان تھی وہی جواب دیا۔

حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ ہم میں علم تو زیادہ تھے مگر آگ جو حضرت حاجی صاحب میں تھی وہ ہم میں نہیں تھی اور حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ وہ عالم تو نہیں تھے مگر عالم گر تھے۔ (از زکریا)

اس مضمون کو میں تو نہ لکھوا سکا ہوں مگر آپ خوب سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ ناکارہ ان دونوں (بچوں) کے لیے دل سے دعاء کرتا ہے۔ مگر آپ کی دعائیں ان کے حق میں زیادہ قوی ہیں اور

نگرانی اس سے بھی زیادہ قوی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وقوت زیادہ سے زیادہ عطاء فرمائے کہ آپ کے فیوض وبرکات سے لوگوں کو بہت زیادہ نفع ہے۔ خدا کرے صاحبزدگان کو میری یہ تحریر گراں نہ ہوا۔ اس سے زیادہ سخت بات لکھوں جو میرے والد کا مشہور فقرہ ہے۔ جو سینکڑوں دفعہ کا سنا ہوا ہے اور اپنے اوپر کا تجربہ کیا ہوا بھی ہے۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ صاحبزادگی کا سور بہت دیر میں نکلتا ہے اور اس کی مصلحت سے وہ بے وجہ مجمع میں ضرب یضرب بھی مجھے کر دیتے تھے اور میرے چچا جان کا معاملہ میرا ساتھ باوجود ان کے چچا اور استاد اور نائب الشیخ ہونے کے ایسا رہتا تھا کہ میں اس سے خود شرمندہ ہو جاتا تھا۔ مگر اس سب کے ساتھ کبھی کبھی مجمع میں ڈانٹ بھی دیتے تھے۔

ایسے ہی ایک موقع پر حضرت رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان سے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی ناراضگی کی کوئی وجہ تو سمجھ میں آئی نہیں ہے۔ ہے تو گستاخی، تو چچا جان نے فرمایا تھا کہ آخر میں چچا بھی تو ہوں میں قصداً ایسا کرتا ہوں کہ کبھی اس کو اپنی مشیخت کی وجہ سے عجب نہ پیدا ہونے لگے میرے اکابر نے تو میری اصلاح کی بہت کوشش فرمائی، مگر افسوس کے کتے کی دم بارہ برس نلکی میں رکھنے کے بعد نکالی تو ٹیڑھی ہی نکلی اور اب تو مقدر سے کوئی ٹوکنے والا بھی نہ رہا۔ یہاں تک لکھ کر بہت دل بھر آیا۔ اس کے نظائر تو کئی یاد آئے مگر دل ودماغ میں ان سے لکھوانے کی گنجائش نہیں نہ وقت آپ بیتی میں پہلے بھی اسی قسم کے واقعات بہت آگئے ہیں۔ فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب

بقلم حبیب اللہ

۲۶ دسمبر ۷۵ء مکہ مکرمہ

جیسا کہ اوپر لکھا میں نے اپنے خط کا مضمون معمولی تغیر کے ساتھ حضرت مفتی صاحب اور مولانا بنوری دونوں حضرات کو لکھا حضرت مولانا بنوری نے میرے خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۹ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ

مخدوم گرامی مفاخر ہذہ العصور حضرت شیخ الحدیث رفع اللہ تعالیٰ درجاتہ وافاض علینا من برکاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

جب سے کراچی پہنچا ہوں عریضہ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں لیکن توفیق نہیں ہوئی، ایک طرف مشاغل کا ہجوم، دوسری طرف کسل کا ہجوم، آپ کو تو حق تعالیٰ نے نظم کی توفیق عطاء فرمائی ہے ہر کام وقت پر ہو جاتا ہے میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے آمین۔

عزیزم محمد سلمہ نے آپ کا مکتوب مبارک دیا بلکہ سنایا دوبارہ خود بھی پڑھا، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی عیادت وزیارت کے لیے دارالعلوم گیا تھا، وہاں بھی میں نے ذکر کیا فرمایا کہ زبانی بھی اس کا تذکرہ آیا تھا، اساتذہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کا شوریٰ کا اجلاس تھا، اس مجلس میں مکتوبِ مبارک سنایا گیا اور عمل کرنے کے لیے تدبیر ومشورہ پرغور بھی ہوا بات تو بالکل واضح ہے، ذکراللہ کی برکات وانوار سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی واضح ہیں اور میں اس کی تلافی کے لیے ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ ہر مدرسہ کے ساتھ ایک خانقاہ کی ضرورت ہے۔

ہمارے اکابر جو اخلاص اور تعلق مع اللہ کے مجسمہ تھے۔ وہ محتاج بیان نہیں، ان کی تدریس و تعلیم سے غیر شعوری طور پر ایسی تربیت ہوئی تھی اوران کی قوت نسبت سے اتنا اثر ہوتا تھا کہ درس سے فراغت کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ذاکر اعتکاف سے باہر آرہا ہے۔ بلاشبہ کاملین کا دور ختم ہوا تو اس کی تکمیل کے لیے اسی قسم کی تدابیر کی ضرورت ہے حق تعالیٰ جلد سے جلد عملی طور پر اس کی تشکیل کی توفیق نصیب فرمائے البتہ ایک اشکال ذہن میں آیا کہ ویسے تو علوم دین، تدریس کتب دینیہ سب ہی ذکراللہ کے حکم میں ہیں اگر اخلاص اور حسن نیت نصیب ہواور ذکراللہ بھی اگر خدانخواستہ ریاکاری سے ہوتو عبث بلکہ وبالِ جان ہے، لیکن اگر کسی درسگاہ میں تعلیم قرآن کریم کا شعبہ بھی ہے اور بچے قرآن اور حفظ قرآن میں مشغول ہیں۔ الحمدللہ کہ ایسے مدارس بھی ہیں جہاں معصوم بچے اور مسافر بچے شب وروز میں بلاشبہ بارہ گھنٹہ تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے ہیں۔ مقصد بھی الحمدللہ بہت اونچا اور نیت بھی صالح تو کیا یہ ذکراللہ ان ذاکرین کے ذکر کی جگہ پر نہیں کر سکتے؟

اور یہ سلسلہ اگر اس طرح جاری وساری ہے۔ تو الحمدللہ اچھا خاصا بدل مل جاتا ہے ظاہر ہے کہ عہدِ نبوت میں یہ سلاسل وطرق کا نظام تو نہیں تھا بلکہ تلاوتِ قرآن کریم مختلف اوقات واعمال کے اذکار وادعیہ پھر صحبتِ مقدسہ قیام لیل وغیرہ کی صورت تھی۔ بظاہر اگر اس قسم کی کوئی صورت مستقل قائم ہو تو شاید فی الجملہ بدل بن سکے گا۔ ہاں یہ درست ہے کہ ذکر ضمناً ہوگا۔ بصورتِ مشائخ طریقت ذاکرین کا سلسلہ شاید قصداً وارادۃً ہوگا۔ شاید کچھ فرق ملحوظ خاطر عاملہ ہوگا۔

بہرحال مزید رہنمائی کا محتاج ہوں۔ مجھے اپنے ناقص ہونے کا بے حد افسوس ہے کاش رسمی تکمیل ہوجاتی تو محض افادیت ونفع کی غرض سے متعارف سلسلہ بھی جاری کرتا اور اس طرح ایک خانقاہی شکل بھی بن جاتی یہ چیز واضح ہے کہ عام طور پر طلبہ تعلیم کے زمانہ میں اپنی تربیت واصلاح کی طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوئے اور یہ پہلو بے حد دردناک ہے، جب مدرسین بھی اس قوی نسبت سکینہ کے حامل نہ ہوں اور طلبہ بھی اپنی اصلاح سے غافل ہوں اذکار وادعیہ کا التزام بھی نہ ہو، دورفتنوں کا ہو

"حفت النار بالشهوات" کا منظر قدم قدم پر ہوتو ذکر اللہ کی کثرت کے بغیر چارہ کار نہیں، میں آپ کی خاص دعوات وتوجہات کا محتاج ہوں، وقت کے ضیاع کا صدمہ ہے، لایعنی باتوں میں مشغولیت کا خطرہ رہتا ہے۔　　　والسلام مع العرف الاحترام مسک الختام

محمد یوسف عفی عنہ

جواب از زکریا

باسمہ سبحانہٗ

المخدوم المکرم حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب! زادمجدہم بعد سلام مسنون!

طویل انتظار کے بعد رات عشاء کے بعد ۲۰ جنوری کی شب میں رجسٹری پہنچی، آپ کے مشاغل کا ہجوم تو مجھے بہت معلوم ہے اور آپ کی ہمت ہے کہ بیک وقت اتنے مشاغل کو کس طرح نمٹاتے ہیں، سیاسی، علمی اور اسفار اور مجھے یہ اندیشہ تھا کہ وہ رجسٹری کہیں گم ہوگئی ہو، عزیز محمد سلمہ کسی آنے والے کے ہاتھ آپ کی خدمت تک اس کا پہنچ جانا لکھ دیتا تو اطمینان ہوتا آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنی مجلس شوریٰ میں میرے عریضہ کو سنایا کم سے کم ان سب حضرات کے کانوں میں تو یہ مضمون پڑ گیا۔

خدا کرے کسی کے دل میں بھی یہ مضمون اتر جائے تقریباً دو سال ہوئے مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک خط آیا تھا، انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ تیری آپ بیتی میں مدرسین اور ملازمین کے لیے جو مضمون ہے مجھے بہت پسند آیا اور میں نے اپنے یہاں سب مدرسین اور ملازمین کو جمع کر کے بہت اہتمام سے اس کو سنوایا، عزیز محمد کے خط سے معلوم ہوا کہ جناب نے میرا خط اپنی تمہید کے ساتھ بینات میں طباعت کے لیے دیدیا مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اپنے عریضہ میں لکھا تھا کہ آپ اپنے الفاظ میں اس مضمون کو تحریر فرمائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ زیادہ موثر ہوگا، اس میں تو کوئی تواضع یا تصنع نہیں کہ میری تحریر بے ربط ہوتی ہے کہ بولنے کا سلیقہ نہ لکھنے کا، آپ نے اکابر کے متعلق جو لکھا وہ حرف بحرف صحیح ہے، بہت سے اکابر کی صورتیں خوب یاد ہیں۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے دور سے ان اکابر کو بہت کثرت سے دیکھنے کی نوبت آئی بلا مبالغہ صورت سے نور ٹپکتا تھا اور چند روز پاس رہنے سے خود بخود طبائع میں دین کی عظمت اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوئی تھی، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے متعلق بہت سے جاہلوں کو میں نے خود دیکھا کہ بیعت ہونے کے بعد تہجد نہیں چھوٹا اور بعض جاہلوں کو تو یہاں تک دیکھا کہ کوئی نیا مولوی اپنے وعظ میں کچھ اِدھر اُدھر کی کہہ دیتا تو وہ آکر پوچھتے کہ فلاں مولوی صاحب نے وعظ میں یوں کہا ہے۔

نانگل کے قریب ایک گاؤں تھا، اس وقت نام تو یاد نہیں رہا، میرے دوست کہتے ہیں کہ آپ بیتی

میں یہ قصہ آ گیا ہے، یہاں کے ایک رہنے والے جن کو میں شاہ جی کہا کرتا تھا ہر جمعہ کو سردی ہو یا گرمی یا بارش ہو ہر جمعہ کو ناگل سے پیدل چل کر جمعہ حضرت گنگوہی کے یہاں پڑھا کرتا تھا اور جمعہ کے بعد حضرت گنگوہی کی مجلس میں شریک ہو کر عصر سے پہلے چل کر عشاء کے بعد اپنے گھر پہنچ جایا کرتا تھا اور حضرت شیخ الہند کا قصہ تو مشہور ہے کہ جمعرات شام کو مدرسہ کا سبق پڑھا کر ہمیشہ پیدل گنگوہ تشریف لے جایا کرتے تھے اور شنبہ کی شب میں عشاء کے بعد یا تہجد کے وقت گنگوہ سے چل کر شنبہ کی صبح دیوبند میں سبق پڑھایا کرتے تھے، یہ مناظر آنکھوں میں گھومتے ہیں اور دل کو تڑپاتے ہیں، آپ نے جو اشکال کیا وہ بالکل صحیح ہے، مگر اس تالی کے ساتھ مقدم کا تحقق ہو جائے تو سب کچھ ہے یقیناً قرآن پاک کی اور حدیث کی تعلیم تو بہت اونچی ہے اور اس میں سب کچھ ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی چیز کیا کر سکتی ہے۔

مگر تابعین کے زمانہ سے قلبی امراض کی کثرت ہے، اس زمانے کے مشائخ کو ان علاجوں کی طرف متوجہ کیا جیسا کہ امراض بدنیہ میں ہر زمانے کے اطباء نے نئے نئے امراض کے لیے نئی نئی دوائیں ایجاد کیں، ایسے ہی اطبائے روحانی نے قلوب کے زنگ کے لیے ادویہ اور علاج تجویز کیے، میری نظر میں ایسے اشخاص گزرے ہیں جو دورہ سے فراغ پر صاحب نسبت ہو جاتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کی تاثیر سے دل کے غبار چھٹ جاتے تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے خود اعتراف کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن سے ہم نے ہاتھ بھی نہیں جھاڑے تھے کہ اپنے قلوب میں تغیر پانے لگے۔ او کما قال

اس قوت تاثیر کا نمونہ امت کے افراد میں بھی پایا گیا، چنانچہ حضرت سید صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے لوگوں میں بہت سے ایسے ہیں جن کو بیعت کے ساتھ ہی اجازت مل گئی، اس کے نظائر تو آپ کے علم میں مجھ سے زیادہ ہوں گے، حضرت میانجی صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ کے یہاں تلاوت قرآن کے درمیان میں یہ بہت سے مراحل طے ہو جایا کرتے تھے، مگر یہ چیز تو قوت تاثیر اور کمال تاثیر کی محتاج ہے جو ہر جگہ حاصل نہیں ہوتی کہیں یہ چیز حاصل ہو جائے تو یقیناً ذکر و شغل کی ضرورت نہیں، یہ طرق وغیرہ تو سارے مختلف انواع علاج ہیں، جیسا ڈاکٹری، یونانی، ہومیو پیتھک وغیرہ اطبائے بدنیہ نے تجربوں سے تجویز کیے ہیں۔

اسی طرح اطبائے روحانی نے بھی تجربات یا قرآن وحدیث کے استنباطات سے امراض قلبیہ کے علاج تجویز فرمائے کہ قرآن پاک واحادیث میرے خیال میں مقویات اور جواہرات ہیں لیکن جس کو پہلے معدہ کے صاف کرنے کی ضرورت ہو اس کو تو پہلے اسہال کے لیے ہی دوا دیں گے، ورنہ قوی غذائیں ضعف معدہ کے ساتھ بجائے مفید ہونے کے مضر ہو جاتی ہیں، آپ نے فرمایا کہ

مزید رہنمائی کا محتاج ہوں، میں آپ کی کیا رہنمائی کرسکتا ہوں:

او کہ خود گم است کرا رہبری کند

چونکہ طلبہ میں اب (جیسا کہ آپ نے بھی لکھا) بجائے تلاوت کے لغویات کی مشغولی رہ گئی، بلکہ بعض میں تو انکار اور استکبار کی نوبت آجاتی ہے، اسی لیے اس کی ضرورت ہے کہ قرآن وحدیث اور اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کے لیے کوئی لائحۂ عمل آپ جیسے حضرات غور سے تجویز فرمائیں پہلے ہر شخص کو اپنی اصلاح کا خود فکر تھا وہ خود ہی امراض کے علاج کے لیے اطباء کو ڈھونڈتے تھے۔

اب وہ امراضِ قلبیہ سے اتنے بیگانہ ہو چکے ہیں کہ مرض کو مرض بھی نہیں سمجھتے، کیا کہوں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا کرنے پر قادر بھی نہیں اور ان مہمانانِ رسول کی شان میں تحریر میں کچھ لانا بھی بے ادبی سمجھتا ہوں ورنہ اہلِ مدارس کو ان سب کے تجربات خوب حاصل ہیں کہ جماعت اور تکبیر اولیٰ کے اہتمام کے بجائے سگریٹ اور چائے نوشی میں جماعت ہی جاتی رہتی ہے، فالی اللہ المشتکی، آپ نے تو میرے مافی الضمیر کو خود ہی اپنی تحریر میں واضح فرمادیا۔

آپ جیسے ناقص تو ہم جیسے کاملوں سے بہت اُونچے ہیں میرا مطلب تو آپ اور مفتی شفیع صاحب وغیرہ بقیۃ السلف کو اس لائن کی طرف متوجہ کرنا تھا کہ یہ پہلو بھی آپ کے ذہن میں رہے تو اچھا تھا، میری بے ربط تحریرات تو اشاعت کے قابل نہیں ہوتیں، آپ حضرات اپنی حسنِ تدبیر، حسنِ رائے سے مدارس عربیہ کے طلبہ کو کم سے کم قرآن وحدیث کی عظمت اور اس سے محبت پیدا کرنے کی کوئی تجویز فرمائیں تو بہت حد تک اصلاح کی امید ہے، ورنہ آپ یہ دیکھ ہی رہے ہیں کہ قرآن وحدیث کے پڑھنے پڑھانے کا اسٹرائیکوں سے مقابلہ کیا جارہا ہے، فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب
بقلم حبیب اللہ

۲۰ جنوری ۷۶ء مدینہ طیبہ

اس پر مولانا بنوری کا جواب آیا:

۲۳ صفر ۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخدوم گرامی مآثر برکت ہذہ العصور حضرت شیخ الحدیث زادہم اللہ برکات وحسنات

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

"تحیۃ من عند اللہِ مُبارکۃ طیبۃ"

والا نامہ گرامی نے ممنون ومشرف فرمایا، جواب میں حسب عادت تاخیر ہوتی جاتی ہے، اب تو یہ

تقصیر عادت ہی بن گئی، الحمدللہ تعالیٰ کہ قلمی ہے قلبی نہیں، سابق مکتوب برکت مختصر تمہید کے ساتھ بینات'' میں شائع ہو گیا، آپ کے کلمات میں جو تاثیر ہو گی، ہماری روایت بالمعنی اور تشریح میں کہاں وہ برکت اس لیے ان کلمات کو بعینہا شائع کرنا قرین مصلحت سمجھا اور اس لیے ادباً تعمیل حکم سے قاصر رہا میں تو کسی کے جوتوں کے صدقہ کچھ لکھ لیتا ہوں ورنہ اردو کہاں اور ہم کہاں۔

خیر، حق تعالیٰ جزائے خیر عطاء فرمائے کہ تفصیلی جواب سے سرفراز فرمایا اور بہت کچھ باتیں آجاتی ہیں اور ہمیں اور دوسروں کو استفادہ کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن مخدوما! میرا مقصد طرق و سلاسل ومشائخ کے اذکار واعمال واشغال ومراقبات ومجاہدات کی افادیت میں ہر گز نہ تھا۔ الحمدللہ تعالیٰ کہ ان پر قلب مطمئن ہے کہ امراض نفوس کا بھی علاج ہے اور ان تدابیر کے سوا چارہ کار نہیں اور اگر امراض نہ ہوں تو شارع علیہ السلام نے جو غذائے روحانی مقرر فرمایا ہے اور فرض قرار دے دیا ہے وہی نسخہ شفاء مزید کی حاجت ہی نہیں۔ مقصد شبہ کا صرف اتنا تھا کہ ذکر اللہ کی برکات وانوار تو بہر حال درس قرآن حفظ، تلاوت قرآن سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ طلبہ کے نفوس کا علاج وہ نہیں بلا شبہ اس کے لیے مخصوص طرق علاج کی ضرورت ہے۔

اس لیے گزارش کی تھی کہ ہر درسگاہ کے ساتھ ایک خانقاہ کی بھی ضرورت ہے۔ جو طلبہ فارغ ہوں اس سے وابستہ ہوں اور کچھ عرصہ اس مقصد کے لیے اقامت بھی کریں۔ خدا کا شکر کہ آپ کی خواہش ذاکرین کے اجتماع اور اجتماعی ذکر کی تدبیر کی گئی۔ اس ہفتہ اس کا افتتاح بھی ہو جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ شب جمعہ کچھ طلبہ ہفتہ وار مکی مسجد بھی جایا کرتے ہیں۔ امسال جو طلبہ فارغ ہوں گے۔ تیرہ (۱۳) طلبہ نے ایک سال کے لیے تبلیغ میں وقت لگانے کا عزم کر لیا ہے اور نام بھی لکھوا دیئے ہیں اور ایک چلہ والے تو بہت ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اگر آپ کی دعائیں رہیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ مافات کی تلافی رہے گی آپ کا دوسرا گرامی نامہ بھی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے چند اساتذہ کے مجمع میں سنا دیا بہت محظوظ ہوئے وہ آپ کی تدبیر وتجویز پر عمل کرنا سوچ رہے ہیں۔ بہت عجلت اور تشویش خاطر میں چند سطریں گھسیٹ دی ہیں تا کہ مزید تاخیر نہ ہو۔

والسلام

محمد یوسف بنوری

جواب از زکریا۔

باسمہ سبحانہٗ

المخدوم المکرم حضرت مولانا الحاج محمد یوسف صاحب بنوری زادت معالیکم۔

بعد سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۳ صفر بذریعہ رجسٹری پہنچا اور بینات کا وہ پرچہ بھی پہنچ گیا۔ جس میں جناب نے اس ناکارہ کا وہ خط بھی طبع کر دیا۔ میں نے لکھا تھا کہ میرا مضمون بعینہ نہ چھاپا جائے بلکہ میرے مضمون کو اپنے الفاظ میں مفصل تحریر فرمائیں وہ محض تواضع نہیں تھی بلکہ تحریر وتقریر پر عدم قدرت منشاء تھا، مگر جناب کے گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ جناب نے ازراہِ محبت اس کو بعینہ شائع فرمادیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس محبت کو طرفین کے لیے دینی ترقیات کا ذریعہ بنائے اس سے بہت مسرت ہوئی کہ جناب نے اس ناکارہ کی درخواست پر خانقاہ کا افتتاح بھی فرمادیا۔ اللہ تعالیٰ برکت فرمائے مثمر ثمرات بنائے۔ میرے اس مضمون پر کوئی تائید یا تنقید کسی سے آئی ہو تو مطلع فرمائیں۔ کسی اور مدرسہ نے اس پر توجہ کی یا نہیں؟

یہ امنگیں تو میرے سینہ میں کئی سال سے چل رہی ہیں اور اپنی طرف سے تدبیریں بھی اس کی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں مگر ذکر کی طرف توجہ اب کم ہوتی جارہی ہے اور چونکہ اکابر کے زمانہ میں طلبہ کو اس سے الگ رکھا گیا اس لیے عام طور سے ذہنوں میں اس کی اہمیت بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ طلبہ کو الگ رکھنا تو میرے ذہن میں اب بھی ہے۔ لیکن مدرسوں میں اس کا سلسلہ قائم کرنے کی ضرورت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی بہت اہتمام سے اس پر لبیک فرمائی تھی اور شروع کرنے کا وعدہ بھی فرمالیا تھا آپ کی مساعی جمیلہ سے اگر مدرسوں کا ذکر کا سلسلہ شروع ہو گیا تو میرا خیال ہے کہ بہت سے فتنوں کا سد باب ہو جائے گا۔

مصر سے مولوی عبدالرزاق صاحب کا خط آیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ وہ (فتنہ مودودیت) کی تعریب کے کام میں مشغول ہیں انہوں نے شاہد کے نام ایک پرچہ بھیجا تھا جس میں اس کی روایات حدیث کا حوالہ لکھنے کو لکھا تھا عزیز شاھد ان کو لکھ رہا ہے۔ یہاں کتابیں کم ملتی ہیں۔ بلکہ زیادہ تر مصری ملتی ہیں۔ اس لیے اس کی تلاش میں دیر لگ رہی ہے۔ میرے مسودہ پر تو صفحات سب پر پڑے ہوئے ہیں مگر میرے مسودات میں کتابیں وہی ہوتی ہیں جو بہت قدیم چھپی ہوئی ہیں ان ہی میں پڑھا پڑھایا اور ان ہی سے دل چسپی ہے میری۔ ابوداؤد وہ ہے جس میں میرے والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۱۲ھ میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ابوداؤد شریف پڑھی۔ بہت قدیم نسخہ ہے۔ اسی میں انہوں نے پڑھایا وہی پھر میرے پاس رہا۔ نئی مطبوعات باوجود بہت واضح اور صاف ہونے کے مجھے مناسبت ان ہی کتابوں سے ہے جو بہت پرانی ہیں۔ نئی کتابیں میرے لیے ایسی ہی اجنبی ہیں جیسے ممالک عربیہ والوں کے لیے لیتھو کی طباعت۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے جناب کی صحت وقوت میں اضافہ فرمائے اور اپنی رضا ومرضیات پر زیادہ سے زیادہ کام لے۔

فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث
بقلم حبیب اللہ
۱۶/۶۔۶۲ء مدینہ طیبہ

اس موقع پر جہاں اہل مدارس سے درخواستیں کرر ہا ہوں اور کرتا رہتا ہوں وہاں ذاکرین حضرات کی خدمت میں بھی ایک بہت اہم بات دفعۃً لکھوانے کا خیال آ گیا۔ میری تحریرات تو بے ربط ہوتی ہیں اور اس آپ بیتی میں تو نہ معلوم کتنے مضامین مکرر آ چکے ہیں مگر اس وقت اکابر کے خطوط کے ذیل میں اس پر تنبیہ کرنے کا خیال پیدا ہو گیا۔

شیخ المشائخ قطب الارشاد حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ ایک دفعہ دوپہر کا کھانا تناول فرما کر مکان سے تشریف لائے۔ بہت استغراق میں تشریف لا رہے تھے۔ خانقاہ میں اپنی سہ دری میں پاؤں رکھنے کے بعد فرمایا کہ یہاں کون کون ہے؟ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے عرض کیا۔ یحییٰ، الیاس (میرے چچا جان) حضرت نے نہایت بھرائی ہوئی آواز میں زور سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا نام چاہے کتنی ہی غفلت سے لیا جائے اثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

اور بالکل سچ فرمایا مجھے بھی بہت تجربہ اس کا ہوا۔ رمضان میں جو ذاکرین جمع ہو جاتے ہیں صرف ایک ماہ میں ان پر ذکر کے اثرات بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ مگر رمضان کے بعد اپنے مشاغل میں لگ کر وہ اثرات جاتے رہتے ہیں۔ بہت کثرت سے رمضان کے بعد خطوط آتے ہیں کہ جو بات رمضان میں تھی وہ اب نہیں رہی۔ میں لکھتا رہتا ہوں کہ یہ تو ذکر کی پابندی کا اثر ہے۔ یہاں ماحول کی وجہ سے پابندی ہوتی ہے اور گھر جا کر اپنے مشاغل میں مشغولی ہو جاتی ہے۔ اس لیے ذاکرین کے لیے بھی بہت ضروری ہے کہ وہ ذکر کے اثرات اگر محسوس ہوں تو ان کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر تو ضرور ادا کریں مگر اس سے اگر ذرا سا عجب گھمنڈ اور کچھ وقعت دل میں آئی تو شیطان ایسی بری طرح دھکا دیتا ہے کہ پھر جو ذکر کے اثرات ہوئے تھے نہ صرف یہ کہ وہ ضائع ہو جاتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

میری تحریرات میں کثرت سے یہ مضمون کئی جگہ گزر چکا ہے اور ''لامع'' کے شروع ہی میں نزول وحی کی حدیث میں جس میں حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اقراء پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے حاشیہ پر بہت تفصیل سے میں نے یہ مضمون نقل کیا ہے کہ ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ نے تفسیر عزیزی میں تحریر فرمایا ہے کہ نسبت کی چار قسمیں ہیں۔

(۱)......انعکاسی جو ذکر شروع کرنے کے بعد جب ذکر کا اثر قلب پر پڑتا ہے تو شیخ کے قلب کا

اثر ذاکر کے قلب پر پڑتا ہے اس کو نسبت انعکاسی کہتے ہیں۔ یہ بہت ضعیف ہوتی ہے۔

(۲)......القائی، جب ذاکر کے قلب میں رسوخ پیدا ہو جائے۔ تو شیخ کی توجہ سے نسبت کا القاء ہوتا ہے۔ میرے اکابر کی زیادہ اجازتیں اسی نسبت پر ہوتی ہیں۔ یہ پہلی سے زیادہ قوی ہے اور تیسری سے بہت کم۔

(۳)......اصلاحی۔ یہ پہلی دونوں سے بہت زیادہ قوی ہوتی ہے اور دیرپا۔ اس کی مثال حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھی ہے کہ کوئی شخص چھوٹی نہر کھودے اور اس کو خوب صاف شفاف کردے اور کسی دریا سے اس کا جوڑ ملادے تو اس میں اگر کچھ معمولی عوارض بھی آجائیں پتے وغیرہ تو پانی کا بہاؤ ان کو بہالے جائے گا۔ بندہ کا خیال یہ ہے کہ قدماء کی اجازت زیادہ تر اسی پر ہوتی تھی۔

(۴)......اتحادی ہے اور بندہ کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی نسبت حاصل تھی۔ یہ سب سے زیادہ قوی ہوئی۔ میرے کاتب نے بتایا کہ یہ مضمون تو تفصیل کے ساتھ آپ بیتی نمبر ۵ میں آچکا ہے۔ اس وقت تو متنبہ کرنا اس پر ہے کہ بعض آدمی پہلی نسبت پر مطمئن ہو جاتے ہیں وہ بہت ضعیف ہے اور مشائخ بھی بعض مصالح کی بناء پر پہلی پر اجازت دے دیتے ہیں۔ اجازت ملنے کے بعد ذاکرین اپنے کو شیخ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے اس لیے ذاکرین کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے کہ ذکر کے اثرات سے کبھی عجب و گھمنڈ میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ اجازت ہونے کے بعد بھی جب اسباب اجازت زائل ہو جاتے ہیں تو وہ اجازت باقی نہیں رہتی۔ حضرت تھانوی نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ کا ایک مضمون اشرف السوانح جلد ثالث میں نقل کیا گیا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں۔

نمبر ۴: تنبیہ متعلق اجازت یافتگان میں نے مختلف اوقات میں جن صاحبوں کو بیعت لینے اور تعلیم و تلقین کی اجازت دی ہے ان میں سے بعض حضرات مجھ سے خط و کتابت اس قدر کم رکھتے ہیں کہ وہ ان کے حالات موجودہ کے اندازہ کرنے کے لیے کافی نہیں اور اجازت کی حالت کا (کہ ان کا حاصل حالاً درستی اور بنابر مناسبت مآلاً توقع رسوخ ہے) متغیر ہو جانا کچھ مستبعد نہیں ''فان الحی لا تومن علیه الفتنه'' بلکہ یہ احتمال بعد راسخ ہو جانے کے بھی محال نہیں اگر نادر بحکم معدوم ہے کیونکہ رسوخ واقعی کا جس میں تغیر عادتاً محال ہے علم قطعی کس کو ہو سکتا ہے اور ظن کی خود حقیقت جانب مخالف کے محتمل ہونے کو بتلا رہی ہے۔

اس لیے احتیاطاً سب مجازین کے متعلق بالخصوص مکاتبت نہ رکھنے والوں کے بارے میں عرض عام ہے کہ ان سے رجوع کرنے میں محض میری اجازت پر اعتماد نہ رکھیں بلکہ جو علامات احقر نے تعلیم الدین میں صاحب کمال کی لکھی ہیں ان پر منطبق کر کے عمل کریں۔ میں اپنے بعد اس کا بار

نہیں رکھنا چاہتا۔ تعلیم الدین میں شیخ کامل کے شرائط حضرت نے یہ تحریر فرمائے ہیں:
''اول علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو خواہ تحصیل سے یا صحبت علماء سے تاکہ فساد عقائد واعمال سے محفوظ رہے اور طالبین کو بھی محفوظ رکھ سکے۔ ورنہ مصداق!

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

کا ہوگا۔ دوم متقی ہو یعنی ارتکاب کبائر واصرار علی الصغائر سے بچتا ہو۔ سوم تارک دنیا، راغب آخرت ہو۔ ظاہری باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو۔ ورنہ طالب کے قلب پر برا اثر پڑے گا۔ چہارم مریدوں کا خیال رکھے کہ کوئی امر ان سے خلاف شریعت وطریقت ہو جائے تو ان کو متنبہ کرے پنجم یہ کہ بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو۔ ان سے فیوض و برکات حاصل کیے ہوں اور ضروری نہیں کہ اس سے کرامات اور خوارق بھی ظاہر ہوتے ہوں نہ یہ ضروری ہے کہ تارک کسب ہو بلکہ دنیا کا حریص وطامع نہ ہو۔ اتنا کافی ہے۔ (از قول جمیل)

اس ناکارہ نے اسی رسالہ کے شروع میں ارشاد الملوک سے شیخ کے شرائط تفصیل سے لکھے ہیں انہیں بھی اس کے ساتھ پڑھ لیا جائے۔

حضرت شاہ عبدالحق صاحب ردولوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح (صفحہ ۷۰) میں لکھا ہے کہ کسی شخص کو حلقہ ارادت میں لینے سے بیشتر آپ آزمالیتے تھے کہ ان میں غرور نفس، غلط قسم کی خودی، محنت سے عار، جھوٹی لگن تو نہیں ہے۔ اسی لیے یہ طریقہ بنالیا تھا کہ اصلاح نفس کے لیے طالب سے آٹھ دن خانقاہ کا پانی بھرواتے، لکڑی ڈھلواتے، جاروب کشی کرواتے اور دوسری خدمات لیتے، مرید کرنے کے بعد پرکھا اور جانچا کرتے کہ لغزش تو نہیں ہوئی، مرید کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس پر کوئی شرعی ذمہ داری تو نہیں ہوئی۔

مثلاً شیخ بختیار جونپوری نے حلقہ ارادات میں داخل ہونے کی گزارش کی، وہ ایک سوداگر کے غلام تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ جاکر اپنے آقا کی رضا حاصل کرو، اسی طرح مخلص شاہ صاحب سے فرمایا کہ اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادی بیاہ وغیرہ سے فراغت پانے کے بعد آؤ۔ ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔

مریدین اپنی شرعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآمد ہونے کے بعد طاعت وعبادت میں مشغول ہوتے تھے ہر صحت مند مرید محنت اور روزگار سے اپنے کنبہ کی پرورش کرتا تھا باقی وقت خانقاہ شریف میں گزارتا تھا۔

یہ مضمون تو بہت طویل ہے اور اسی آپ بیتی میں بہت سی جگہ آبھی چکا ہے اور میرے مخلص دوست صوفی اقبال نے میری آپ بیتی سے اس قسم کے مضامین یکجا جمع کر دیئے ہیں جس کا نام

''اکابر کا سلوک واحسان'' ہے یہاں ان مضامین کا لکھوانا طول کا سبب ہو جائے گا۔
میرا مقصد تو اس جگہ سالکین کو تنبیہ کرنا ہے کہ اجازت کے حاصل کے ہو جانے کے بعد بےفکر ہرگز نہ ہوں۔ نسبت ایک تعلق ہے اس کے بقاء بلکہ اضافہ کی کوشش ہر وقت کرتے رہیں اور اجازت پر بےفکر ہو کر کام نہ چھوڑ دیں ورنہ ہر وقت اس کے زائل ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ مضمون تو بیچ میں طویل ہو گیا۔ اصل قصہ تو مفتی شفیع صاحب سے ملاقات کا چل رہا تھا۔ مفتی صاحب کے مدرسہ سے نمٹ کر مولانا یوسف بنوری کے مدرسہ میں گئے۔ محمد بنوری نے اپنا کمرہ تجویز کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ابوالحسن کو دیکھنے کے لیے بھیجا۔ اس نے بہت پسند کیا۔ اس لیے اول ان کے مدرسہ میں گئے ناشتہ وغیرہ سارے رفقاء نے کیا۔ زکریا نے سادی چائے حسب وعدہ پی۔ پھر اس کے کمرہ میں گیا تو وہ واقعی بہت ہی پسندیدہ تھا۔
مولوی احسان نے رات ہی الٹی میٹم دے دیا تھا کہ شام کو عورتوں کا اجتماع ہے۔ کھانے کے بعد حاجی صاحب ہی کے یہاں سو جانا۔ مگر مجھے وہاں تکلف تھا۔ لیکن محمد کا کمرہ بہت پسند آیا اس لیے حاجی فرید کے یہاں سے وہیں آ گیا ظہر کی نماز پڑھ کر متصلاً جانا قرار پایا تھا۔ میرے لیے تو وہ اپنی گاڑی لے کر ظہر کے بعد محمد بنوری کے کمرہ میں پہنچ گئے اور میں سیدھا ان کے یہاں پہنچ گیا مولوی انعام صاحب علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔
قاری طیب صاحب اس وقت پنڈی سے طیارہ کے ذریعہ کراچی پہنچے اور مطار سے سیدھے حاجی صاحب کے مکان پر پہنچ گئے مولوی سالم بھی ساتھ تھے۔ قاری صاحب کا قیام مولوی طاہر مرحوم کے لڑکوں طاہر وغیرہ کے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ ۲ بجے حاجی صاحب کی لڑکی صفیہ کا نکاح ہوا۔ زکریا کی درخواست پر قاری صاحب نے نکاح پڑھایا۔ پاکستان میں نکاحوں کا دستور یہ ہے کہ ورقہ سے پہلے جملہ امور لڑکی کا نام اس کے باپ کا نام لڑکے اور اس کے باپ کا نام وغیرہ سب چیزیں درج ہوتی ہیں وہ ناکح کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔ وہ اس کے موافق نکاح پڑھا دیتا ہے۔
کھانے کے بعد زکریا کو حاجی صاحب زنانہ میں لے گئے وہاں عورتوں کو بیعت کیا، ہر ایک نے الگ الگ اپنے لیے دُعاء کو کہا، تقریباً ایک گھنٹہ اس میں لگ گیا، حاجی فرید صاحب میرے زنانہ سے اُٹھنے کے بعد یہ کہہ کر کہ قاری صاحب میرے انتظار میں باہر آ گئے اور ان کے لڑکے کے ساتھ محمد بنوری کے کمرے میں آ گیا اور سو گیا، پونے پانچ پر اپنی نماز پڑھ کر طلحہ قریشی کی گاڑی میں اچھن میاں کے مکان پر مبارک باد کے لیے گیا وہ خود تو اوپر کی منزل پر رہتے ہیں، مگر زکریا کی وجہ سے انہوں نے اپنے پڑوس کے نیچے کی منزل خالی کرالی تھی۔

معلوم ہوا وہ صاحب بھی سہارنپور کے رہنے والے تھے اور ہمارے مہتمم مولانا عنایت الٰہی صاحب نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ کے پوتے ہیں، انہوں نے اپنا تعارف بھی تفصیل سے کرایا مگر مجھے اس وقت یاد نہیں وہ اچھن میاں سے کہتے تھے کہ میری تو ہمت تھی نہیں کہ میں اپنے مکان پر آنے کی دعوت دوں، تمہاری برکت سے میرے مکان پر بھی آ گئے وہاں چائے وغیرہ پی کر ایسے وقت اُٹھے کہ مغرب کی نماز تک مکی مسجد پہنچ گئے اور سیدھے مسجد گئے، وہاں مولوی احمد لاٹ کی تقریر ہو رہی تھی زکریا کے پہنچنے پر ایک دم مجمع ٹوٹ پڑا۔

مجبوراً تقریر بند کرنی پڑی اور زکریا کو بھی سب کو ڈانٹنا پڑا، فرض پڑھتے ہی اپنے حجرے میں پہنچ گیا، عمر احمد تھانوی، قمر علی تھانوی وغیرہ سے ملاقات ہوئی، عمر نے وعدہ کیا کہ مفتی عبدالمالک کے صاحبزادے جو مولانا ظفر احمد کی سوانح لکھ رہے ہیں، زکریا نے تقاضا کیا طباعت کے بعد فوراً میرے پاس بھیجے مگر ڈاک سے ہرگز نہ بھیجیں، کسی معتبر کے ہاتھ یا مولانا بنوری کے پاس بھیج دیں، وہاں سے دستی رسائل میرے پاس پہنچتے رہتے ہیں، جمعرات کے دن صبح کو خصوصی ملاقاتوں کا زور رہا ایک مسماۃ کمرہ میں آ کر بیٹھ گئی اور کسی کے تقاضہ کرنے پر بھی نہیں اُٹھی آخر لوگوں کو بلا لیا گیا پھر بھی نہ اُٹھی تو مجبوراً احسان وغیرہ نے زبردستی اُٹھایا، ظہر کے بعد زکریا تو یخنی پی کر لیٹ گیا، احباب نے کھانا کھایا، عصر کے بعد مصافحہ تجویز تھا، مگر دس منٹ میں ہی مجمع بے قابو ہو گیا، تو یہ کہہ کر میں معذور ہوں مصافحہ نہیں کر سکتا، یہ کہہ کر اپنے کمرہ میں آ گیا۔

مغرب کے بعد حسب قرارداد حاجی فرید صاحب اپنی گاڑی لے کر چلے آئے اور پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر وضو کر کے ان کی گاڑی میں بیٹھ کر مطار آ گئے، زکریا اور مولوی انعام کی گاڑی حاجی فرید صاحب کی مساعی سے طیارہ تک پہنچ گئی اور وہیں اول وقت عشاء پڑھی اور نہایت اطمینان سے سواریوں کے داخل ہونے سے پہلے سے جدہ جانے والے جہاز کے اگلے حصہ پر ایک سیٹ پر میں شاہد، زبیر دوسرے پر مولوی انعام صاحب، مولوی عمر اور سلیمان جھانجی بہت اطمینان سے بیٹھ گئے جانے والوں نے الوداعی مصافحہ معانقہ کیا، ابوالحسن نے رونے کا شور مچا کر جہاز والوں کو اکٹھا کر دیا بڑی مشکل سے اس کو دھکیلا۔

قادری صاحب بھی ہمارے جہاز پر مشایعت کی نیت سے آئے ان کا نمبر نہیں تھا، مگر مردوں کے جانے کے بعد سیڑھی کے ہٹنے کے بعد جہاز میں کام کرنے والیاں مسمات کا دور دورہ شروع ہوا، انہوں نے اول مولانا انعام صاحب کی سیٹ خالی کرائی اور میرے پیچھے کی سیٹ پر منتقل کیا، میں تو یارب سلم سلم پڑھتا رہا، مگر اللہ کا شکر ہے کہ مجھ پر حملہ نہیں ہوا، جہاز کا کپتان تو روپوش ہو گیا اور لوگ جی حضور گردن جھکائے دیکھتے رہے، ۸:۱۰ پر پرواز کا وقت تھا مگر ۸:۳۰ پر پرواز ہوئی، دو گھنٹے بعد

کھانالایا گیا۔ زکریا نے بھی اپنی تپسی لے کرعزیزان زبیر شاھد کو دے دی کہ مجھے تو کھانا نہیں تھا، فیرینی مولوی محمد عمر کو دے دی، سالن کی رکابی مکمل بچ گئی جو واپس کردی، باقی ان دونوں نے نمٹادی، ظہران کے قریب جہاز کو نیچے اُتارا گیا اور کپتان نے اول زکریا کو حضرت شیخ الحدیث کے لفظ سے سلام کیا اور کہا کہ آپ کی وجہ سے جہاز کو نیچے کیا گیا ہے یہ جہاز کے دونوں طرف پیٹرول کے کنویں ہیں۔

زکریا کو بجز اس کے کچھ نظر نہ آیا کہ سینکڑوں کھمبے بجلی کے نظر آئے، شاہد نے بتایا کہ وہ بجلی نہیں تھی بلکہ آگ کے شعلے تھے جو کنویں سے نکل رہے تھے، ۱۲:۲۰ کے قریب جدہ کے مطار پر پہنچے اور اس سے پہلے تقریباً ۱۵ منٹ فضا میں چکر کاٹتے رہے، بعد میں معلوم ہوا کہ جدہ کے مطار پر ساٹھ جہاز تھے جن کی وجہ سے اُترنے کی جگہ نہیں تھی، اُترنے کے بعد بھی بیس منٹ تک قید میں رہے کہ سیڑھی نہ آئی بعد میں معلوم ہوا کہ کوئی سیڑھی خالی نہیں تھی ۲۰ منٹ کے بعد ایک سیڑھی آئی سب اسی سے اُترے البتہ اتنا معلوم ہوگیا تھا کہ ڈاکٹر ظفیر اور عزیز سعدی دونوں طیارہ پر ہیں جن سے بہت اطمینان ہوا۔

جہاز والوں نے زکریا سے کہہ دیا کہ آپ اطمینان سے بیٹھے رہئے، ان سب کو پہلے اُتر جانے دیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، البتہ دستی سامان سارا رفقاء نیچے سعدی اور ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں رکھتے رہے سب سے آخر میں زکریا اپنی کرسی پر اُترا اور رابطہ کی گاڑی میں جو عزیز سعدی کی مساعی سے آئی ہوئی تھی، سعدی کے گھر پہنچ گئے، عزیزان زبیر، شاہد سامان کے ساتھ کسٹم سے ہوکر بعد میں پہنچے، رابطہ کی گاڑی میں زکریا مولوی انعام حبیب اللہ و اسماعیل تھے، ڈاکٹر اسماعیل کی گاڑی بھی جس میں صوفی اقبال وغیرہ رفقاء تھے اور سعدی کی گاڑی بھی جس میں ماموں یامین وغیرہ تھے سعدی کے گھر پہنچے، زکریا نے کہا کہ پہلے طواف کرنا ہے، پیشاب وضو کرکے رابطہ ہی کی گاڑی میں حرم پہنچے، مولوی انعام صاحب سعدی ہی کے مکان میں سو گئے، تجویز ان کی صفا پر جانے کی تھی، مگر حفاریہ والے سب جدہ تھے، اس لیے وہ سعدی کے مکان پر لیٹ گئے، خالد، حکیم، اسرائیل وغیرہ بھی اسی کمرہ میں پہلے سے تھے۔

زکریا کو طواف عزیز حسان نے کرایا، عزیزان حبیب اللہ و اسماعیل وغیرہ بھی ساتھ تھے، ان سب کی خواہش تھی کہ سعی سے ابھی نمٹ جائیں مگر زکریا نے کہا کہ ساری رات ضائع ہوگی اس لیے واپس آگئے، جب طواف سے واپس آیا تو سعدی کے مکان پر عزیزان زبیر و شاہد مولوی محمد عمر وغیرہ پہنچ گئے، بقیہ سامان کو عزیز عبدالحفیظ تقریباً ایک گھنٹہ بعد لے کر آیا، صبح کی نماز سب نے سعدی کے مکان پر ہی پڑھی اور اس کے بعد پھر لیٹ گئے، تین بجے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر

عبدالحفیظ کی گاڑی میں مسعیٰ پہنچے اس لیے کہ سعی کرنی تھی، مولوی انعام صاحب نے وہیں قیام فرمایا اور جمعہ کے قریب وہاں سے آئے زکریا نے اول سعی کی جس میں شاہد اور مولوی اسماعیل بھی شریک تھے، مولوی اسماعیل اس رات کو مدینہ سے پہنچے تھے، مولوی حبیب اللہ پہلے سے مکہ میں مقیم تھے، سعی سے فارغ ہو کر عزیز سعدی کے خلوہ نمبر ۳۰۰ میں پہنچ گئے جو کئی سال سے اس نے لے رکھا ہے اور اس وقت صالح دہلوی کو دے رکھا تھا، ان کو سعدی نے اپنے مکان سے ٹیلیفون کر دیا تھا کہ زکریا سعی کے بعد خلوہ میں جائے گا، اس لیے انہوں نے اپنے لڑکے کو بٹھا رکھا تھا اس کے ساتھ خلوہ میں پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ عزیز سعدی کو بہت ہی جزائے خیر دے کہ اس کی وجہ سے بہت سی راحتیں مقامی اور عزیز عبدالحفیظ سلمہ جزاہُ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء کی وجہ سے ہر وقت ہر جگہ آنے جانے کی سہولت رہتی ہے کیونکہ وہ حرمین کے قیام میں مع گاڑی کے میرے لیے وقف رہتا ہے، جمعہ پڑھ کر مولوی انعام صاحب سمیت صولتیہ پہنچے، بھائی سلیم اُوپر تھے، زکریا نے زور سے کہا کہ آپ اُتریں گے تو مجھے تکلیف ہوگی، عشاء کے بعد کھانے پر ملاقات ہوگی، اللہ تعالیٰ بھائی سلیم کو بھی جزائے خیر دے کہ میری آمد پر وہ دیوان چھوڑ کر اُوپر تشریف لے جاتے ہیں، حالانکہ وہ بھی اب ٹانگوں سے معذور ہو گئے، ہر چند میں ان سے بار بار درخواست کرتا ہوں کہ میں دوسرے دیوان میں قیام کر لوں گا، مگر وہ اصرار کرتے ہیں کہ تیرا مستقر تو یہی ہے، یہی اکابر کا دیوان ہے۔

جمعہ کے بعد زکریا تو سو گیا اور احباب نے مولوی سعید خان کی دعوت کھائی جو مدرسہ میں آتی رہی، عصر مسجد مدرسہ میں پڑھ کر ملاقات کا وقت ہمیشہ کے دستور کے موافق رہا جس میں ہجوم آتا رہا مصافحہ کرتا رہا، ۱۱:۳۰ بجے حسبِ سابق وضو کر کے مسجدِ حرام باب العمرہ پر اپنی قدیم جگہ کنکریوں پر بیٹھ گیا، وہاں ایک دم ہجوم مصافحوں کا ہو گیا کہ ہنگامہ معلوم ہونے لگا، دو تین پولیس والے بھی آ گئے، زکریا سے کہا کہ یہاں ہجوم نہیں ہونا چاہیے، زکریا نے کہا کہ میں نے تو نہیں بلایا، آپ ذمہ دار ہیں ہجوم کے ہٹانے کے، آپ ان سب کو ہٹا دیں، مگر وہ بار بار زکریا پر تقاضا کرتے رہے۔

زکریا نے کہا کہ تم سے تو ہٹتے نہیں میں کیسے ہٹاؤں، لوگوں کو بھی پولیس والوں نے ہٹانا چاہا، مگر مصافحہ کا دستور یہ ہے کہ دو چار کو کوئی کرتا دیکھے تو سارے ہی اُمنڈ آویں، بڑی مشکل سے مغرب تک کا وقت گزرا مگر ہجوم نے گھیرے رکھا، ایک شرطہ نے کرسی پر بھی اعتراض کیا، ساتھیوں نے کہا کہ ورقہ موجود ہے، پھر بھی اس نے کہا کہ اس کرسی کو باہر رکھ دو، مغرب سے عشاء تک بھی لوگ چکر لگاتے رہے مگر زکریا نے نفلوں کی نیت باندھ لی عشاء پڑھ کر واپسی ہوئی، اس وقت بھی ہجوم نے گھیر لیا، اس لیے دوسرے دن سے کنکریوں پر قیام ملتوی کر کے عزیز سعدی کے خلوہ کے سامنے

اوپر کی منزل پر مغرب وعشاء کی نماز تجویز کی گئی کہ وہاں بڑا سکون تھا۔

البتہ شرطوں کی طرف سے گاڑی پر اعتراض وہاں بھی رہا، جس کی وجہ سے جاتے ہی گاڑی کو خلوہ میں رکھوانا پڑا اور واپسی میں نکال کر آنا پڑا، زکریا کا معمول حسب سابق شب کو سعدی کے یہاں اور دن کو صولتیہ میں رہا، مگر حجاج کے ہجوم کی وجہ سے طواف رات کو نہ ہوسکا، اس لیے عشاء پڑھ کر کھانے سے فراغ پر جلدی ہی سعدی کے یہاں جانا ہوتا ہے اور صبح کو سعدی کے یہاں صبح کی نماز پڑھنے کی نوبت آتی تھی کہ مسجد تک بھی جانا مشکل تھا دو بجے تک ناشتہ وغیرہ سے فراغ پر صولتیہ دو، ڈھائی بجے کے درمیان میں پہنچنا ہوتا تھا، یہاں پہنچ کر ساڑھے پانچ تک خطوط اور خصوصی ملاقات وغیرہ پر بیعت کا وقت مقرر تھا اور ۶ بجے ظہر کی تیاری، ظہر کے بعد شوربہ پی کر لیٹ جانا اور عزیز حسان کا حسب دستور سابق ظہر تک آجانا اور تیل مل کر جانا، عصر کے بعد آدھ گھنٹہ کوئی کتاب سننا جو اولاً تازہ ''الفرقان'' جو مولانا منظور صاحب نعمانی نے دیا تھا اور اس کے بعد متفرق کتابیں ہوتی رہیں۔

اس کے بعد ملاقات عامہ ۱۵:۱۱ بجے تک، سوا گیارہ پر حرم کی تیاری مولوی انعام صاحب کی پہلی شب تو سعدی کے یہاں گزری اور جمعہ کی نماز کے بعد صولتیہ میں عزیز شمیم کی کوٹھری میں جو میرے دیوان کے سامنے ہی ہے قیام رہتا ہے، مولوی انعام صاحب نے چونکہ سعی اور طواف نہیں کیا تھا، اس لیے جمعہ کے دن بعد مغرب کے طواف کیا اور عشاء کے بعد سعی اور دیوان میں کھانا کھا کر مسجد حفائر چلے گئے، یہی ان کا مستقل معمول رہا کہ عشاء کے بعد مسجد حفائر چلے جاتے اور صبح کو وہیں تبلیغی شوریٰ ہوتا تھا اور ظہر حرم میں پڑھ کر مدرسہ صولتیہ آجاتے، عصر صولتیہ کی مسجد میں پڑھتے اور قبیل مغرب حرم چلے جاتے۔

مگر ۴ ذی الحجہ سے حرم کا جانا میرا اور ان کا بالکل بند ہوگیا اور نمازیں صولتیہ میں ہونے لگیں کہ ہجوم بہت زیادہ تھا، زکریا جب ۷ ذی الحجہ کی شام کو جب سعدی کے یہاں گیا تو اپنا اور رفقاء کا سامان ساتھ لے کر گیا کہ حج کے لیے مسجد حفائر سے جانا زکریا نے ہی طے کیا تھا کہ صولتیہ سے چلنے میں گاڑی کے پھنسنے کا قوی اندیشہ تھا اور حفائر سے منیٰ کا راستہ سیدھا تھا، مولوی انعام صاحب کے رفقاء کئی تھے ان کو سعدی کے یہاں آنا مشکل تھا، اس لیے طے ہوا کہ میں صبح کو نماز کے بعد حفائر آجاؤں گا اور وہیں سے منیٰ جاؤنگا، میرا ارادہ تھا کہ نماز پڑھتے ہی حفائر مگر قاضی جی نے بجائے حفائر جانے کے مجھے فون کردیا کہ گاڑی حفائر نہیں پہنچی سعدی وغیرہ کی رائے ہوئی کہ حفائر جانے میں دقت ہوگی۔ جب وہاں سے فون آجائے گا کہ گاڑی پہنچ گئی جب جائیں گے مگر زکریا تین بجے حفائر عبدالحفیظ کی گاڑی میں مع اپنی کرسی قدمچہ کموڈ کے پہنچا اور

سعدی اپنی کار میں ساتھ ساتھ پہنچا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ لاری تو دو بجے سے کھڑی ہے اور سواق تقاضا بھی کر رہا ہے مگر اس کو ناشتہ وغیرہ کرا کر کہہ دیا گیا کہ ابھی ہمارے ساتھی جمع نہیں ہوئے جب ہی سعدی نے اپنے دوست کے مکان سے فون کیا کہ ہم پہنچ گئے اور گاڑی دو بجے سے کھڑی ہے اس پر قاضی جی اور دستگیر مع اپنی مستورات صولتیہ سے ٹیکسی میں روانہ ہوئے مگر وہ لائن میں پھنس گئی اس لیے پیدل پہنچے۔ بڑی دیر انتظار کے بعد سعدی اپنی گاڑی لے کر صولتیہ لینے گیا۔ مگر اس کی گاڑی بھی پھنس گئی تو سعدی عبدالحفیظ پاؤں چلے۔ راستہ میں قاضی صاحب ملے ان کے ہاتھ میں سامان بہت تھا وہ لے کر یہ لوگ حفائر پہنچے اسی لیت ولعل میں ۵ بجے رفقاء جمع ہوئے اور اسی وقت چل دیئے۔

سواق بہت بھلا آدمی تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جزائے خیر دے مگر بالکل ناواقف سودائی تھا۔ حج کو آیا تھا اس کو مکی مرزوقی نے کرایہ پر رکھ لیا۔ وہ منیٰ اس سے پہلے کبھی گیا نہیں تھا۔ البتہ اس کا ایک رفیق جو مکی نے ساتھ کیا تھا وہ راستہ سے واقف تھا۔ منیٰ پہنچ کر شرطوں نے بہت چکر دلائے اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر گشت کرتے ہوئے پونے آٹھ بجے منیٰ پہنچے۔ وہاں تین کمرے ساڑھے سترہ ہزار ریال میں کرایہ پر لے رکھے تھے جس میں تین کمرے تھے نمبر دو میرے لیے تجویز کر رکھا تھا۔ مع میرے رفقاء کے۔ اس سے چھوٹا مولوی انعام صاحب کے لیے جو میرے برابر تھا اور سب سے بڑا دستگیر کے لیے مع مستوارت۔

میں نے بھائی افضل کو پانچ ہزار ریال ابتداء میں دیئے تھے اور پانچ سو قربانی کے مد میں منیٰ کا کرایہ اور قربانی وغیرہ شامل تھی۔

قربانی کی گائے بارہ سو ریال میں آئی چالیس جزار کو دیئے۔ عزیزان خالد وغیرہ نے دوسرے دن قربانی کی جو عبدالحفیظ کے ساتھ خیمہ میں تھے۔ نو سو ریال میں ان کی گائے آئی اور دس ریال جزار کو دیئے۔ مولوی یوسف متالا بھی میرے کمرے میں تھے۔ مگر انہوں نے ایک ہزار ریال اپنے حساب میں جمع کیے تھے۔ ان کو ۱۳۸ ریال بعد فراغ حج واپس کیے اور ان کی قربانی مولوی انعام قاضی صاحب وغیرہ کی گائے میں تھی۔ میری گائے میں شاہد حبیب اللہ اسمٰعیل مولوی محمد عمر صاحب، زبیری مولوی سلیمان جھانجی تھے۔ میں نے اپنی قربانی خالد کی گائے میں کرائی۔ یہ گائے مستقل دم تمتع کی تھی یہ قربانی کا مسئلہ توضمناً آ گیا۔

نویں کی صبح کو عرفات کے لیے منیٰ سے ۲:۳۰ بجے کے قریب چل کر تقریباً ۴ بجے مکی کے خیمہ میں پہنچ گئے۔ وہاں آرام کیا اور جب مسجد میں خطبہ کی آواز آئی تو اپنے خیمہ میں جماعت کی۔ مولوی انعام صاحب زبیر وغیرہ نے ظہر کی نماز دیگر مبلغین کے خیمہ میں پڑھی۔ مسجد نمرہ میں نماز کی نوبت

ہم لوگوں کو نہیں آئی اس لیے امام کہ پتا نہیں چلتا کہ مقیم ہے یا مسافر، وہ دو ہی رکعات پڑھاتا ہے۔ خطبہ کے بعد مسجد میں اذان و با قامتین ظہر و عصر جمع ہوا کرتی ہے۔

حنفیہ مسلک کے نزدیک اذان خطبہ سے مقدم ہے۔ ہم نے عصر ۳۰:۱۰ پر اپنے اپنے خیموں میں پڑھی۔ غروب کے بعد عرفات سے چل کر ۳ بجے مزدلفہ بہت اچھی جگہ پہنچے۔ حکومت کے بہترین انتظامات میں اس سال مزدلفہ کے قیام کے لیے برابر، برابر سڑک کے دونوں طرف موقف بنادیئے گئے ہیں۔ جس میں ہر قافلہ اپنی گاڑی سمیت اتر سکتا ہے۔ مختصر قافلہ ہو تو وہ قافلے ایک موقف پر ٹھہر جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حکومت کی بہت مدد فرمائے کہ حجاج کی سہولت کے بہت انتظامات کرتی ہے۔ اگرچہ بعض امور میں کارندوں کی وجہ سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس سال معلمین کی تقسیم حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ جس میں بڑی گڑبڑ ہوئی کہ مرد ایک معلم کے یہاں ہو گیا اور بیوی دوسرے معلم کے یہاں جس کی وجہ سے حجاج کو مکہ مکرمہ پہنچ کر بہت تکلیف اٹھانی پڑی، ہم لوگ تو حجاج کی فہرست میں نہیں تھے۔ میرا تو اقامہ تھا اور باقیوں کے زیارت کے ویزے تھے۔ البتہ قاضی صاحب وغیرہ کو حج کا ویزا ہونے کی وجہ سے دقت ہوئی۔ مگر مکی مرزوقی کو اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے ہمیشہ سے ہم لوگوں کا معلم وہی رہا۔ اس نے ایک خیمہ میرے لیے ایک مولوی انعام کے لیے مستقل قائم کر رکھا تھا اس میں رہے۔

مزدلفہ میں بھی ہم سب حاجی اور غیر حاجی ایک موقف پر رہے۔ صبح کی نماز پڑھ کر بہت اہتمام سے اس کی کوشش کی کہ طلوع سے پہلے نکل جائیں۔ چنانچہ روانگی تو ہو گئی مگر راستہ میں شرطوں کی بے توجہی سے ٹریفک بہت ہی آہستہ رہا۔ ایک منٹ چل کر دس منٹ رکتا رہا۔ مولانا بنوری کا قیام بھی قاری سلیمان کے کمرے میں منیٰ میں ہمارے سامنے ہی تھا۔ ان کی کار تو مزدلفہ سے آتے ہوئے سیدھی نکل آئی، ہماری گاڑی کو شرطہ نے روک دیا۔ وہ بہت چکر کاٹ کر پہنچی۔ یہاں بھی منیٰ پہنچ کر تقریباً دو گھنٹے چکر کاٹتے ہوئے منیٰ پہنچے۔

منیٰ میں بھی اس سال حکومت نے رمی کا بہت بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ جمرات کے آس پاس کے مکان گرا کر بہت وسیع کر دیا اور رمی کی جگہ دو منزلی بنادی اور دو راستے بھی بنادیئے ایک جانے کا اور ایک آنے کا۔ مگر حجاج کی بے تمیزی سے کہ انہوں نے رمی کے نیچے کے حصے میں دونوں دیواروں اور بیچ میں قیام تجویز کر لیا۔ وہیں ان کے بستر ے کھانا پیشاب پاخانہ، جمعہ کے دن یعنی دس ذی الحجہ کو عین جمعہ کی نماز کے وقت زکریا نے رمی کی کہ فی الجملہ چھیڑ تھی اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور دوستوں کی حسن انتظام جمرہ عقبہ کے قریب جا کر اس کی رمی بہت سہولت سے ہو گئی۔

جمعہ کے بعد عصر کے قریب قربانی ہوئی اس لیے حلق میں دیر ہوئی اور عشاء کے بعد میرا حلق تو مولوی حبیب اللہ نے کیا اور بقیہ آپس میں ایک دوسرے نے کیا۔ مولوی انعام کا حلق صوفی عثمان نے اور زبیر کا بھی عزیز شاہد نے آپس میں ہم لوگوں سے حلق کرنا پسند نہ کیا۔ اس لیے دوریال میں حلاق سے کرا کر آئے۔ دوسرے تیسرے دن عصر کے بعد تینوں جمرات کی رمی بہت سہولت سے ہوگئی۔ جمرہ عقبہ کے قریب ہجوم زیادہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک شرطہ کے دل میں رحم ڈالا۔ اس نے میری کرسی کو پکڑ کر جمرہ کے قریب پہنچادیا۔ ۱۱، ۱۲ بجے کی درمیانی شب میں عزیز عبدالحفیظ کی گاڑی میں ہم لوگ طواف زیارت کے لیے آئے مگر غلطی سے کرسی پر طواف کرنے کا اجازت نامہ صولتیہ میں رہ گیا جس کو لینے کے لیے مولوی حبیب اللہ مولوی اسماعیل گئے اور ہم ان کے انتظار میں تقریباً ایک گھنٹہ باہر کھڑے رہے اس کی آمد پر اندر آئے اور کرسی پر طواف کیا جو دوستوں کی معاونت سے اور مفتی زین العابدین کی سرپرستی میں بہت سہولت سے ہوگیا۔ ہجوم اتنا تھا کہ ورقہ کو کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ خواہ مخواہ اس کی وجہ سے اتنی تاخیر بھی ہوئی مطاف ہی میں عزیز خالد سے بھی ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ اس کی مستورات بھی طواف کر رہی ہیں۔

طواف زیارت سے فارغ ہوکر عبدالحفیظ کے ساتھ اس کی گاڑی میں منیٰ گئے۔ راستہ تو دس منٹ میں طے ہوگیا۔ مگر منیٰ پہنچ کر پندرہ بیس منٹ کی تاخیر ہوگئی۔ طواف تو بہت سہولت سے ہوگیا مگر سعی میں دیر لگی کہ کرسی پر سعی کرنے والوں کی کثرت تھی کہ ٹریفک کی طرح سے وہ بھی کئی کئی منٹ رکی رہتی تھیں۔ صفا میں تو دعاء کا وقت مل جاتا تھا۔ مگر مروہ پر ایک جماعت حلقہ بنائے ہوئے گاڑیوں کو اوپر جانے سے روکنے کے لیے کھڑی رہتی تھی گاڑیوں کے ادھر آنے پر فوراً دوسری طرف منتقل کر دیتی ہے۔ اپنے حلقہ سے باہر نکلنے نہیں دیتی تھی۔

اس سال منیٰ میں آگ لگنے کا بہت شدید ترین واقعہ پیش آیا جمعہ کے دن جمعہ سے پہلے آگ لگنی شروع ہوئی اور آناً فاناً اتنی زور سے بھڑکی کہ اس کے شعلے آسمان تک پہنچے تھے۔ جہاں جہاں آگ لگ رہی تھی لوگ سامان وغیرہ چھوڑ کر پہاڑوں پر مع مستورات کے چڑھتے جارہے تھے۔ عزیز خالد اپنی مستورات کو لے کر دستگیر کے کمرہ میں ہمارے قریب پہنچ گیا۔ بہت ہی عبرت انگیز واقعہ ہوا اور عجیب مالک کی قدرت کے کرشمے سننے میں آئے کہتے ہیں کہ ایک ماشی حاجی پیاس کی شدت کی وجہ سے ایک معلم کے خیمہ میں گزرا اور اس نے بہت لجاجت سے پانی مانگا۔ اس نے انکار کر دیا۔ اس نے بہت لجاجت سے خدا اور رسول کا واسطہ دیا اس معلم نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی بے ادبی کا لفظ کہا کہ وہ بھی آجائیں تو پانی نہیں دوں گا۔

اس خیمہ میں چائے پک رہی تھی سب سے پہلے چولہا بھڑکا اور آس پاس جتنی گیس کی ٹنکیاں

تھیں وہ پھٹتی رہیں اور آگ بڑھتی رہی۔ سب سے زیادہ ایرانیوں کے خیمہ میں آگ لگی اور ہمارے مبلغین متفرق معلموں کے یہاں متفرق خیموں میں تھے۔ معلوم ہوا کہ کئی جگہ یہ شان قدرت نظر آئی کہ مبلغ کے خیمہ کے طرفین بالکل جل گئے اور یہ خیمہ محفوظ رہا۔ اسی طرح بہت سے خیمہ جلے اور ان میں قرآن پاک محفوظ رہا اور بھی عجائب قدرت بہت سننے میں آئے اللہ تعالیٰ کی شان ہے چونکہ روایات مبالغہ سے چلتی ہیں اس واسطے نقل نہیں کرتا۔ یہ واقعہ جو اوپر لکھا گیا متعدد لوگوں سے سننے میں آیا۔ ایرانیوں کے متعلق کثرت سے سننے میں آیا کہ زیادہ جانی مالی نقصان ان ہی کا ہوا۔

یہ بھی سنا کہ اسرائیلی ریڈیو نے سب سے پہلے یہ خبر نشر کی کہ سارا منیٰ جل گیا اور حجاج مر گئے۔ اس کی وجہ سے ہند پاکستان میں اور دیگر ممالک میں بہت تشویش پھیلی۔ بہت سے تار ٹیلی فون آئے۔ زکریا نے منیٰ سے واپسی پر حاجی یعقوب کو "ہم سب بخیریت منیٰ سے آگئے۔" کا تار ڈلوایا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ بھائی دہلوی نے اپنے بھائی نعمت کی خیریت ٹیلی فون سے پوچھی انہوں نے سب کی خیریت بتا دی جو تار سے بھی پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ اسی طرح سے اور بہت سی جگہوں کے تار اور فون کی خبریں سننے میں آئیں ہم لوگ ۱۳ ذی الحجہ کو رمی جمار کر کے واپس آئے۔ واپسی میں راستہ بالکل صاف ملا اور جلدی ہی حفائر پہنچ گئے۔

عصر کی نماز پڑھ کر بھائی شجاع اور عبدالحفیظ گاڑی میں جن کو آتے ہی فون کر دیا گیا سعدی کے گھر پہنچ گئے۔ بھائی شجاع فون پر اپنی گاڑی لے کر پہنچ گئے تھے اور عبدالحفیظ بھی شجاع کی گاڑی میں، میں شاہد مولوی اسماعیل عبدالحفیظ کی گاڑی میں سامان اور مولوی حبیب اللہ پہنچے۔ شب کو سعدی کے یہاں قیام رہا علی الصبح منگل کو مدرسہ پہنچے اور حسب معمول یہی قانون رہا۔ مدرسہ کے معمولات صبح کے وقت میں ڈاک وغیرہ۔ پانچ بجے تخلیہ والوں کا اور ۲، ۵۱ پر بیعت والوں کا وقت رہا جمعہ کے دن مصلح الدین کی کوششوں سے ایک نکاح حرم میں تجویز تھا مگر جمعہ کی شب میں زکریا دست کی وجہ سے حرم میں نہ جا سکا صولتیہ میں جمعہ پڑھا اور پھر ۷:۳۰ بجے پھر ۸ بجے پھر ۹ بجے تین دست صرف پانی کے آئے لنگی بھی خراب ہوئی۔

زکریا کا ارادہ حج سے پہلے ہی مدینہ جانے کا تھا اور پہلے نہ جانے کی صورت میں حج کے فوراً بعد۔ مگر تبلیغی جماعتوں کی روانگی پیر کے دن قرار پائی تھی۔ اس میں شرکت اور مولانا انعام صاحب کی معیت کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا، ۲۰ ذی الحجہ دوشنبہ کو جماعتوں کی روانگی [illegible] ہوئی۔ اجتماع تو بارے ہی شروع ہو گیا تھا۔ زکریا سعدی کے یہاں سے براہ راست مسجد حفائر ۲:۳۰ بجے پہنچ گئے۔ مولوی انعام بھی خبر سن کر نیچے آگئے تھے۔ ۵ بجے مصافحوں سے فراغ پر زکریا مع رفقاء کے

صولتیہ چلا گیا اور مولوی انعام صاحب اوپر چلے گئے۔ شنبہ کی شب میں قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں تیری گاڑی میں جاؤں گا۔ زکریا نے کہا کہ سر آنکھوں پر۔ مگر آپ تو نہیں جائیں گے اور پھر ہم بھی نہیں جاسکیں گے۔ شنبہ کی صبح قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں بالکل تیار ہوں سامان صبح سے رکھا جا رہا تھا۔ مولوی انعام صاحب بھی اپنی کار میں صولتیہ پہنچ گئے جب سوار ہونے لگے تو فرمایا کہ قاضی صاحب نے میری گاڑی حفائر بھیج دی ان کا پاسپورٹ افضل کے پاس ہے کار کی واپسی میں پتہ چلا کہ بھائی افضل نہیں ملے وہ موقف گئے ہیں۔

زکریا نے تجویز کیا کہ مولوی انعام صاحب کی کار میں سے ایک ہم اپنی کار میں بٹھالیں اور جب قاضی صاحب کا پاسپورٹ مل جائے تو مولوی انعام صاحب کی کار میں آجائیں۔ مگر قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں نے بھائی غلام دستگیر سے بات کرلی ہے۔ ان کی گاڑی میں آجاؤں گا۔ ہم لوگ سوا تین بجے مدرسہ صولتیہ سے چلے۔ مولانا انعام صاحب نے بہت ہی رقت انگیز دعاء کرائی جس میں سے بھائی سلیم بھی شریک ہوئے جو ۱۵ دن سے اوپر اپنے دفتر میں تھے نہ گھر گئے نہ نیچے اترے کہ طبیعت خراب تھی۔

دعاء کے بعد ہم لوگ بدر کے لیے روانہ ہوگئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ پٹرول لینے میں لگا اور اس کے بعد ۱۵ منٹ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے مزار پر قیام کر کے سوا سات بجے بدر پہنچے۔ سڑک پر ڈاکٹر اسماعیل انتظار کر رہے تھے، ان کے ساتھ مسجد عریش گئے۔ پہلے نماز پڑھی اس کے بعد کھانا کھایا، ڈاکٹر صاحب نے بہت بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ مرغ پلاؤ، مچھلی فرینی وغیرہ وغیرہ کئی چیزیں تھیں۔ دستر خوان بچھا ہی تھا کہ بھائی افضل اور مفتی صاحب کی مشترک گاڑی پہنچ گئی۔ کھانے میں وہ سب شریک ہوئے۔ آدھ گھنٹہ لیٹے پھر عصر کے بعد شہداء کی زیارت کے لیے حاضری ہوئی۔

معلوم ہوا کہ دروازہ کے بالمقابل دوسری جانب کی دیوار نیچی ہے۔ ادھر زکریا بھی حاضر ہوا۔ ایک گھنٹہ بعد واپسی ہوئی۔ واپسی آہی رہے تھے کہ قاضی صاحب بھی پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی گاڑی میں انہیں مسجد عریش تک لائے۔ گاڑی والا رات کو بدر ٹھہرنے پر راضی نہیں تھا۔ انہوں نے بھی خوشامد کی۔ مگر اس نے یہ عذر کر دیا کہ میں مدینہ میں عشاء کے بعد سواریاں لانے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ عشاء کے بعد دوبارہ کھانا کھایا گیا۔

مغرب کے قریب ایک صاحب نے جو وہاں کے امام بھی ہیں اور کسی مدرسہ کے مدیر بھی اور عشاء کے بعد کی تعلیم کے طالب علم بھی انہوں نے کل دوپہر کے کھانے پر اصرار کیا ہم نے کہا کہ ہم مدینہ کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اس پر انہوں نے صبح کے فطور پر اصرار کیا اور ان کے یہ کہنے پر کہ میں تو آنہیں سکوں گا۔ البتہ ناشتہ بھیج دوں گا۔ صبح کی نماز کے بعد دو بجے سب سو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے

اپنی عادت کے مطابق ناشتہ خوب زوردار کرایا۔ دعوت کا فطور بھی آگیا تھا۔ ناشتہ کے بعد قاضی مولانا انعام صاحب کی گاڑی میں اور مولوی محمد سلیمان جھانجی ہماری گاڑی میں۔

سوا تین بجے چل کر مسجد کے قریب سید آفتاب وغیرہ اپنی کار میں استقبالیہ ملے۔ پہلے بھی کئی دفعہ ایسا ہو چکا وہاں تو کار کو روکنے کی جگہ نہ تھی صرف مصافحہ کر کے اگلے قہوہ پر کار کو روکا اور ملاقات کی۔ قاضی صاحب نے ان لوگوں کی قہوہ پر چائے تواضع کی زکریا نے انکار کر دیا کہ دیر ہوگی میں تو جارہا ہوں تم پیتے آئیو۔ راستہ میں سید حبیب کے مکان پر ان سے ملاقات کرتے ہوئے بھائی یحییٰ کے جدید مکان پر پہنچے جس میں تھوڑا سا مغالطہ ہوا بھائی صوفی اقبال وغیرہ سے مکہ میں طے ہوا تھا کہ اس وقت وہاں قیام کرنا نہیں۔ وہاں جا کر دیکھا جائے گا۔ مگر عبدالحفیظ نے راستہ میں کہا کہ بھائی یحییٰ نے اپنے مکان پر چائے کا انتظام کر رکھا ہوگا اور انتظار کر رہے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے وہیں گئے۔ مگر وہاں دروازہ بند تھا۔ یہ سب حضرات صبح سے مدرسہ میں انتظار کر رہے تھے۔

بھائی راشد نے اپنی کار سے اتر کر کہا کہ میں نے اپنی کار قصداً کھڑی کر رکھی ہے۔ عبدالحفیظ اپنی گاڑی یہاں روک لے۔ آگے راستہ نہیں ہے وہاں سے اتر کر ۵ بجے مدرسہ پہنچ گیا اور رفقاء سامان لے کر پہنچے۔ نمازیوں کا ہجوم بقیع تک تھا۔ اس لیے سب نمازیں مدرسہ شرعیہ کی چھت پر ہوئیں مولوی انعام صاحب ایک گھنٹہ پہلے حرم میں پہنچ گئے تھے مگر نماز باب السلام سے باہر پڑھی اور ظہر کے بعد کہہ گئے کہ ہمارے بس کا تو نماز پڑھنا حرم میں ہے نہیں۔ نمازیں تو یہاں نہیں پڑھنی ہیں۔ عشاء کے بعد بھی ان کا انتظار کیا مگر معلوم ہوا کہ وہ آج نہیں آئیں گے۔

۲ جنوری ۷۶ء یکم محرم ۹۶ھ یوم جمعہ کی صبح کو عزیز سعدی کا ٹیلیفون مکہ سے پہنچا کہ ماسٹر محمود کی طبیعت رات سے زیادہ خراب ہے منہ سے خون بھی آیا۔ دوسرا ٹیلیفون جمعہ کے بعد آیا جمعہ کی نماز سے ۵ منٹ پہلے ماسٹر محمود کا انتقال ہوگیا۔ غسل وغیرہ میرے دیوان کے سامنے ہوا اور پہلی نماز جنازہ بھائی سلیم کی وجہ سے مدرسہ صولتیہ میں مولوی مالک بن ادریس کاندھلوی کی اقتداء میں ہوئی اور دوسری نماز حرم میں پہلے عزیز عبدالحفیظ کی گاڑی میں جنازہ لے جانا تجویز تھا مگر مجمع کثیر تھا۔ اس لیے کاندھوں پر ہی معلّٰی لے گئے اور حکیم نعیم مرحوم کی قبر میں تدفین ہوئی۔

۶ محرم ۷ جنوری کو عصر کے بعد جب مولانا انعام الحسن صاحب صلاۃ وسلام پڑھ رہے تھے اور سامنے حاجی کامل گنگوہی بھی پڑھ رہے تھے۔ انہیں غشی تھی یا شُرطوں کو مرعوب کرنے کے واسطے لوگوں کو رائے ثانی ہے۔ بندہ کے نزدیک نیت پر حملہ کی کوئی وجہ نہیں۔

۱۳ جنوری ۷۶ء مطابق ۱۲ محرم حجازی ۱۳۹۶ھ شب سہ شنبہ میں ۲۰ یوم کی علالت کے بعد حکیم یامین صاحب کا سہارنپور میں انتقال ہوگیا۔

۱۴ جنوری ۱۳ محرم کو عزیز خالد مع اپنی اہلیہ، دادی اور حکیم اسرائیل کے مدینہ سے روانہ ہوئے تھوڑی دیر بدر ٹھہرنے کے بعد ۳ بجے عزیزی سعدی کے گھر پہنچے۔

۱۷ جنوری ۷۶ء ۱۶ محرم ۹۶ھ مولانا انعام الحسن صاحب ملک عبدالغنی کی کار میں مدینہ سے روانہ ہوئے بقیہ رفقاء مختلف گاڑیوں میں اور ۱۱ بجے شام کو قبل مغرب صولتیہ پہنچے۔ جمعرات کو جدہ کے اجتماع میں شرکت کے بعد مکہ مکرمہ واپس آئے اور جمعہ کے دن دوبارہ جدہ بارادہ ہند روانہ ہوئے اور ۲۴ جنوری ۲۳ محرم کو عربی سوا گیارہ بجے طیارہ پر پہنچے۔ اتوار کے دن بھائی یوسف رنگ والوں کا تار پہنچا کہ بار کی دوپہر کو مولانا انعام الحسن صاحب بخیریت کراچی پہنچ گئے۔ مکی مسجد جانے کی اجازت نہ ہوئی۔ رات کو عشاء کے دو گھنٹے بعد مکی مسجد کی اجازت ہوئی اور وہاں سے منگل کی صبح کو بمبئی پہنچے۔

۲۱ جنوری بدھ کے دن خالد پارٹی جدہ سے بحری جہاز پر سوار ہوگئی، جمعرات ۲۹ کو بمبئی پہنچے اور بار اتوار کی درمیانی شب میں ریل سے سہارنپور کے لیے روانہ ہوئے اور پیر کی دوپہر کو سہارنپور پہنچ گئے۔

۱۲ فروری ۷۶ء کو بڑے امام صاحب مدینہ منورہ کوثر نیازی کی دعوت پر پاکستان گئے شاہ فیصل نے اسلام آباد میں جو مسجد کے لیے بڑی رقم دی تھی اس کی سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے ۲۵ فروری ۷۶ء ۲۵ صفر ۱۳۹۶ھ بروز بدھ کو مسجد نبوی میں رسالہ عربی زبان کی فضیلت کی بسم اللہ کی۔

۲۵ مارچ ۷۶ء کو مولانا بنوری کا خط پہنچا کہ محمد کو چند ماہ تیرے پاس رکھنا چاہتا ہوں زکریا نے معذرت لکھ دی کہ کوئی جگہ یکسوئی کی نہیں ہے۔ مگر مولانا نے زکریا کا جواب پہنچنے سے پہلے ہی عزیز موصوف کو بھیج دیا اور کئی ماہ سے زکریا کے ساتھ رہا اور زکریا کی روانگی از مکہ کے ایک دن بعد کراچی روانہ ہوا۔

۲ اپریل ۷۶ء ۳ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ سے تین دن تک عزیز عبدالحفیظ روضہ اقدس پر بہت الحاح اور دعاؤں کے ساتھ زکریا کے سہارنپور رمضان کے سلسلہ میں عرض معروض کرتا رہا اور تینوں دن یہی انکشاف ہوتا رہا کہ زکریا کا رمضان سہارنپور ہوگا۔ ہر سہ ایام کے مکاشفات تو بہت طویل ہیں۔

۱۱ ربیع الثانی ۱۰ اپریل ۷۶ء کو قاضی صاحب برائے پاکستان مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ پاکستان میں قدیم رفقاء تبلیغ کا اجتماع ہوتا ہے، اس میں قاضی صاحب کی شرکت بہت اہم ہوتی ہے۔

۱۴ اپریل ۷۶ء کو صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد مولانا اسعد صاحب کی دعوت پر دیوبند پہنچے

اور سیدھے حضرت مدنی کے مزار پر گئے وہاں سے فارغ ہوکر دارالعلوم آئے وہاں چائے پیش کی گئی قلمی کتابوں کا معائنہ کرایا گیا۔ ۱۱ بجے دار الحدیث میں جلسہ ہوا ۱۲، ۱ بجے مولانا اسعد صاحب کے یہاں کھانا ہوا پولیس کا پہرہ ہر وقت صدر کے ساتھ رہا۔ عوام کو شرکت کی اجازت نہیں ہوئی۔ صدر صاحب ۹:۳۰ بجے صبح کو ہیلی کاپٹر سے دیوبند پہنچے تھے اور شام کو ۵ بجے اسی سے واپس ہو گئے۔

۲۵ اپریل ۷۶ء کو مولانا انعام صاحب حاجی شفیع کی کار میں دہلی سے چلے اور راستہ میں صوفی افتخار صاحب ملے ان کی سرپرستی مظاہر علوم کی منظوری لی اور ۱۰ بجے سہارنپور پہنچے۔ دوروزہ اجتماع سرپرستان رہا جس میں صوفی افتخار اور عزیز عامر کی سرپرستی منظور کی گئی اسی دوران میں مولانا انعام صاحب سہارنپور کے قریب کسی جلسہ میں شرکت کے لیے بھی گئے۔

۲۹ اپریل ۷۶ء کو ظہر کی نماز کے ۱۵ منٹ بعد صلاۃ الکسوف بلا سابقہ اعلان کے پڑھی گئی۔ باربع رکوعات واربع سجدات مدینہ طیبہ۔

۱۴ جمادی الاول ۱۳۹۶ھ مئی ۱۹۷۶ء کو شب جمعرات مغرب کے بعد جنازہ کی نماز میں زکریا کی نکسیر جاری ہوگئی مگر پتہ نہیں چلا نماز کے بعد دیکھا تو کرتا لنگی وغیرہ سب خون آلود تھے۔ جمعرات کو دوبارہ اسی طرح آئی۔

۲۴ مئی کو مولانا عبید اللہ صاحب مدینہ طیبہ سے ارادہ ہند مکہ مکرمہ گئے وہاں سے ۲۵ کو جدہ سے ظہران وہاں سے ۲۶ کو کراچی، ۲۸ کو بمبئی اور ۲۹ کو دہلی گئے۔

۲۸ مئی کو جمعہ کی شب میں ۱۱ بجے حاجی محمد ایام صاحب امیر تبلیغ سہارنپور کا حادثہ انتقال۔ انتقال کے قریب تکیہ سر سے نکال دیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ہنستے ہوئے چل دیئے۔ اعلی اللہ تعالیٰ مراتبہ۔

اخیر مئی ۷۶ء میں حطیم کی قدیم دیوار توڑی گئی جدید پتھر لگائے گئے۔ سابقہ پتھروں پر تحریرات ترکوں کے زمانہ کی تھیں وہ سب محفوظ کر دی گئیں۔

۲ جون کو شمیم ملی کا ٹیلیفون آیا کہ لاہور سے حاجی محمود کا تار آیا ہے کہ پرسوں ماموں شعیب کا انتقال ہوگیا۔

قومی آواز ۷ جون میں لکھا ہے کہ حکومت ہند نے ۷۵ برس پہلے سے مخطوطات، مجسمات، تصاویر کی رجسٹری کرانی ضروری قرار دی ہے اور لائسنس حاصل کرنا ضروری قرار دیا۔ ۵ جولائی کے بعد بغیر لائسنس جس کے یہاں یہ چیزیں ہوں گی اس کو قید اور جرمانہ دونوں کی سزائیں

ہوں گی۔اس سال باب السلام سے بابِ عمر تک کا حصہ مکانات کا کثرت سے گرتا رہا اور اولاً امام ثالث نے نماز کے بعد اعلان کیا کہ یہ حصہ مسجد بنا دیا گیا۔اس میں خرید وفروخت جائز نہیں اور مساجد کے سارے احکامات جاری ہوں گے۔

......☆☆☆☆☆......
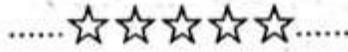
سفرِ ہند ۱۳۹۶ھ

۱۲ جون ۷۶ء مطابق ۱۴ جمادی الثانیہ ۱۳۹۶ھ شنبہ کے دن عصر کے بعد بھائی یحییٰ صوفی اقبال، ڈاکٹر اسماعیل کی گاڑی میں بدر روانہ ہوئے کہ آج شام کو بعد میں بھائی یحییٰ کی طرف سے دعوت ہوگی اور ہم لوگ عشاء پڑھ کر بدر روانہ ہوگئے۔ ملک عبدالغنی کی گاڑی ایئر کنڈیشن میں مسجد نبوی سے عشاء کی نماز پڑھتے ہی روانہ ہوئے اور ۲ بجے بدر پہنچے۔ صوفی اقبال صاحب مسجد عریش کے میدان میں دری بچھا رہے تھے کہ پشت کی جانب کھڈ میں گر گئے۔ ہم لوگوں کو اس وقت اطلاع نہ ہوسکی کھانے میں معلوم ہوا کہ صوفی جی شریک نہیں ہیں۔ جب حادثہ کا علم ہوا تو جبھی ہسپتال بھیجا گیا اور سر میں ٹانکے لگے۔

اتوار کی صبح کو نماز کے بعد آدھ گھنٹہ شہداء پر حاضری کے بعد مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے۔ ۳:۳۰ بجے سعدی کے مکان پر پہنچے، تجویز یہ تھی کہ پہنچتے ہی سو جائیں گے۔ مگر اہلیہ سعدی نے صولتیہ ٹیلیفون کردیا جس پر ماموں یامین وغیرہ سعدی کے گھر پہنچ گئے اور سعدی نے دسترخوان بچھا دیا۔ شام تک سعدی کے مکان پر قیام رہا، بعد عصر ۱۱ بجے رفقاء وسامان حرم پہنچے زکریا کو حرم میں اتار کر رفقاء صولتیہ میں سامان رکھنے گئے اور بعد عشاء بھائی سلیم کی دعوت کھا کر عمرہ کیا اور عزیز سعدی کے گھر جاکر آرام کیا مکہ کا معمول حسبِ دستور صبح کا ناشتہ کے بعد صولتیہ آنا اور عشاء کے بعد کھانے سے فراغ پر طواف کر کے سعدی کے گھر جانا۔

۲۱، ۲۲ جون ۷۶ء کی درمیانی شب میں نظام الدین میں عزیز شاہد کے لڑکا پیدا ہوا محمد صالح نام تجویز ہوا مگر ہمیں مکہ میں ایسے وقت اطلاع ہوئی کہ ہند کو روانگی ہورہی تھی۔ مگر ماموں یامین کی مساعی جمیلہ نے ایک دنبہ عقیقہ کا روانگی کا ذبح کردیا جس کا گوشت نظام الدین تک پہنچ گیا۔ بمبئی پہنچتے ہی اس ناشتہ دان کو بھائی عبدالکریم کے فریج میں رکھ دیا اور وہاں سے جاتے ہوئے نکال لیا۔ اور ساتھ نظام الدین لے گئے۔

حسبِ تجویز ۲۹ جون کو عشاء کے بعد کھانے کے بعد طواف وداع کر کے ۵ بجے جدہ بھائی شجاع کے گھر پہنچ گئے ان کا کئی سال سے اصرار تھا مگر زکریا کبھی گیا نہیں تھا۔ انہوں نے اس سال اصرار کیا تھا کہ میں نے نیچے کا مکان تیرے لیے خالی کرادیا۔ وہاں پہنچے تو واقعی بڑی راحت کا مکان ملا میرا اور میرے رفقاء کا کمرہ الگ سامان کا الگ کھانے کا الگ ۸:۳۰ عربی اٹھ کر تہجد اور ضروریات سے فارغ ہوکر صبح کی نماز شجاع کے مکان پر پڑھ کر مطار پر گئے ڈاکٹر ظفیر صاحب مطار پر گئے۔

رفقاء اللہ تعالیٰ ان کو بہت جزائے خیر دے سامان وغیرہ لے کر نماز سے پہلے ہی مطار پر چلے گئے تھے۔ مطار پر پہنچ کر مطار ہی کی گاڑی میں ڈاکٹر ظفیر کی مساعی سے طیارہ پر پہنچے اا بجے طیارہ روانہ ہوا ایک بجے ظہران پہنچے۔ دو بجے وہاں سے چل کر ۳ بجے دبئی پہنچے۔ وہاں بڑا مجمع مع مولوی تقی وغیرہ مشائخ ابوظہبی۔ مطار پر موجود تھے۔ انہوں نے اترنے پر بہت اصرار کیا کہ بمبئی برقیہ کریں گے۔ مگر زکریا نے عذر کیا کہ بمبئی کے مطار پر اتنا مجمع مختلف بلاد کا مجمع ہوگا **لاتعدو لا تحصی**۔

۴ بجے وہاں سے چل کر عربی ۷ بجے بمبئی پہنچے۔ بمبئی کے وقت کے اعتبار سے ۴:۳۰ بجے، طیارہ سے سفر تو بارہا کرنے کی نوبت آئی۔ مگر اس مرتبہ دبئی کے بعد اس زور کا چکر آیا کہ بمبئی پکڑنا مشکل ہوگیا۔ مجھے تو امید نہیں رہی تھی کہ زندہ بمبئی پہنچ سکوں گا۔ بمبئی کے مطار پر بہت بڑا مجمع موجود تھا۔ مولانا محمد عمر صاحب اور عزیز ابوالحسن بدھ کی صبح کو بمبئی پہنچ چکے تھے۔ یہ ناکارہ اپنی نااہلیت کی وجہ سے جب مولانا انعام الحسن صاحب یا علی میاں ساتھ نہیں ہوتے تو مولانا محمد عمر صاحب کو تکلیف دیا کرتا ہے کہ میرے طیارے سے پہلے بمبئی پہنچ جائیں تاکہ وہاں کے مجامع کی دعائیں نمٹائیں، چونکہ ظہر کی نماز اپنے اعذار کی وجہ سے اب تک نہیں پڑھی تھی مطار پر پہنچتے ہی اپنا کموڈ منگایا اور فوراً روانہ ہوکر مطار سے دو تین میل دور جاکر ایک جنگل میں پیشاب وضو کر کے ظہر پڑھی۔ اور چونکہ عصر کا وقت قریب تھا۔ اس لیے آدھ گھنٹہ انتظار کر کے عصر بھی پڑھی جگہ تو بہت دور مطار سے تجویز کی تھی مگر وہاں بھی مجمع بڑھتا ہی چلا گیا۔ عصر پڑھ کر بھائی عبدالکریم کے مکان پر پہنچے۔ رفقاء کسٹم سے نمٹ کر مغرب کے وقت پہنچے معلوم ہوا کہ کسٹم میں تو دس منٹ ہی دیر لگی اس نے صرف اتنا سوال کیا کہ کیمرہ وغیرہ کوئی چیز ہے؟

رفقاء نے کہہ دیا کہ یہ لغویات ہمارے ساتھ نہیں ہوتیں۔ ایک دو صندوق دیکھ کر سب پاس کردیئے۔ حاجی یعقوب صاحب نے مطار پر ہی طلحہ کو برقیہ اور مولانا انعام صاحب کو ٹیلیفون سے پہنچنے کی اطلاع کردی۔ تین دن بمبئی قیام کے بعد ۴ جولائی اتوار کے دن صبح کو ۶:۳۰ پر بمبئی سے دہلی روانہ ہوئے دہلی میں بھی مجمع بہت زیادہ تھا۔ مگر حسب دستور زکریا تو بھائی کرامت کی کار میں سیدھا چلا گیا۔ بچے کچے اور مجمع جو مطار پر جمع تھا وہ آہستہ آہستہ ظہر تک نظام الدین پہنچتا رہا۔ ملاقات بچوں سے بھی نظام الدین میں ہوئی۔ گرمی بہت شدید تھی اور زکریا کو نظام الدین پہنچ کر استفراغ کثرت سے ہوا کہ بمبئی میں آم اور مچھلی متفرق اوقات میں کھانا ہوا تھا۔

دہلی سے براہ میرٹھ سہانپور جانا طے تھا مگر بخار استفراغ کی وجہ سے دہلی سے ننے خاں کو ٹیلیفون کرادیا کہ اب بجائے میرٹھ کے سیدھے کاندھلہ ہوکر سہارنپور جانا طے ہوگیا کاندھلہ کے اڈہ پر صوفی افتخار مع اپنے مریدین کے موجود تھے، مصافحہ ہوا ابرار نے اصرار کیا کہ اتنے تو مصافحہ کرے

اتنے رفقاء چائے پی لیں زکریا نے کہا کہ اگر اڈہ پر پلاؤ تو پی لیں گے۔ مگر معلوم ہوا کہ اس نے چائے کا انتظام تو اپنے باغ میں رکھا ہے اور رفقاء کو باغ لے جانے پر اصرار کیا۔ زکریا تو شرط کے خلاف ہونے کی وجہ سے اڈہ سے سیدھا سہارنپور روانہ ہوگیا۔ بعض رفقاء نے چائے پی اور بعض نے نہیں پی۔ عزیز ابرار اسلم سب چائے وغیرہ چھوڑ کر زکریا کی کار میں اڈہ سے سوار ہوگیا۔ رفقاء کی کاریں یکے بعد دیگرے پہنچتی رہیں۔

زکریا کی طبیعت دہلی تا سہارنپور میں بھی خراب رہی دورانِ سفر چکر کثرت سے آتے رہے۔ جلال آباد میں مولانا مسیح اللہ خاں صاحب کی خدمت میں حاضری کا ارادہ تھا مگر نہیں جا سکے۔ ۸ جولائی مطابق ۹ رجب کو ۸ بجے صبح کو سہارنپور پہنچے، اول مدرسہ کی مسجد میں تحیۃ المسجد اور وہاں کے احباب سے مصافحہ وغیرہ کر کے اول حکیم ایوب سے ملاقات پھر حکیم یامین مرحوم کے گھر ذوالنون کی تعزیت کے لیے گیا۔ پردہ کرا کر تھوڑی دیر گھر میں بیٹھا۔ پھر واپس اپنے گھر آیا۔ اعلان مصافحوں کا حسب دستور عصر کے بعد دار جدید میں تھا۔ مگر مکان پر بھی مصافحوں کا سلسلہ چلتا ہی رہا۔ دارِ جدید جاتے ہوئے راستہ میں حضرت ناظم صاحب کے پاس دس پندرہ منٹ ٹھہرا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ اب تیرا سہارنپور قیام بہت ضروری ہوگیا۔

دار الطلبہ جدید میں حسب دستور مصافحوں کا انتظام تو صحن میں تھا مگر گرمی کی شدت کی وجہ سے اندر ہی مصافحے ہوئے۔ جب عصر کے بعد دار جدید میں دعاء ہو رہی تھی کہ کس نے فوارہ کے سامنے جو بُت تھا اس کو توڑ دیا۔

شنبہ کی صبح کو حاجی نصیر اور وصفِ الٰہی کی کاروں میں دیوبند حاضری ہوئی۔ حضرت مدنی کے گھر اطلاع بھیج دی کہ حاضری کا تو ارادہ تھا مگر بہت چکر آ رہے ہیں۔ اس لیے معذوری ہے بھائی سعید سے بھی کار میں بیٹھے ہوئے ملاقات ہوئی۔ اتوار کی صبح کو باوجود بہت اخفاء کے کچھ نہ کچھ شیوع ہو ہی گیا صبح کی نماز کے بعد سہارنپور سے چل کر رائے پور باغ میں حاضری ہوئی۔ رائے پور پہنچ کر اس قدر زوردار بارش ہوئی کہ نہ تو نیچے کا راستہ رہا اور نہ پُل کے اوپر، پٹرول نے قفل نہیں کھولا۔ مگر راؤ عطاء الرحمٰن صاحب زادہ عزیزم حافظ انیس الرحمٰن کو اللہ تعالیٰ بہت جزائے خیر دے کہ اس نے اس تیز بارش میں پٹرول سے کنجی لے کر قفل کھول کر ہمیں آگے چلتا کر دیا۔ بارش شدت سے ہو رہی تھی رفقاء کی گاڑیاں بھی بارش کی وجہ سے دیر میں پہنچیں۔ مگر رائے پور پہنچ کر اتنی زوردار بارش ہوئی کہ مزار پر حاضری کی صورت نہ ہوئی۔ کار ہی میں تھوڑی دیر بیٹھ کر فوراً واپس ہوگئے۔

مولوی حشمت صاحب سے رڑھی ٹھہرنے کا وعدہ بھی تھا مگر اتنی زور سے بارش ہو رہی تھی کہ مدرسہ تک پہنچنا ناممکن تھا۔ سوا سات بجے کچے گھر پہنچے، سہارنپور پہنچنے کے بعد سردی سے بخار کا

سلسلہ خوب بڑھ گیا۔

۶ رجب ۱۳۹۶ء، ۵ جولائی ۱۹۷۶ء کو عزیز سلمان کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ساتویں دن عقیقہ کا نظام نہ ہو سکا چودھویں دن عقیقہ ہوا۔ بھائی جمیل سہارنپوری کی دماغی کیفیت آج کل بہت خراب ہو رہی تھی ناظم صاحب کا پیام پہنچا کہ ان کو مدرسہ میں آنے دیا جائے۔ بہت مشکل سے ان کو مجنونوں کے ہسپتال بھیجا۔

۱۴ جولائی کو ۷۶ء کو قاری طیب صاحب مولانا فخر الحسن صاحب وغیرہ ملاقات کے لیے تشریف لائے اور تخلیہ میں ماسٹر پلان پر خوب گفتگو ہوتی رہی زکریا اپنے مشورے پیش کرتا رہا۔

۱۴ جولائی کو مولانا بنوری پر دل کا دورہ پڑا جو بہت سخت تھا، ۱۶ جولائی ۷۶ء جمعہ کی دوپہر کی مجلس میں عزیز سلمان کے لڑکے عزیز عثمان کا پارہ نمبر ۲ شروع ہوا۔

۲۳ جولائی ۷۶ء مطابق ۲۴ رجب ۱۳۹۶ھ کو جمعہ کی صبح کو مسلسلات ہوئی یہ بھی سننے میں آیا کہ طلبہ بجائے مسلسلات میں شرکت کے سندوں کے چکر میں پھرتے رہے، فیاللاسف حکیم نو گنگوہی بھی مسلسلات کے دوران میں آئے تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے، ملاقات کا وقت نہیں ملا۔

۲۴ جولائی کو بخاری شریف ختم ہوئی۔

اس مرتبہ گنگوہ حاضری میں بہت تاخیر ہوئی کہ مولانا انعام صاحب کی آمد پر موقوف تھی تجویز یہ ہوا کہ ۲۴، ۲۵ جولائی کو جھنجھانہ میں تبلیغی اجتماع ہے اس سے فارغ ہو کر مولانا انعام صاحب سہارنپور آئیں گے، پھر گنگوہ جائیں، مگر جھنجھانہ میں مجمع اتنا زیادہ ہو گیا کہ وہاں کے غیر مسلم گھبرا گئے اور مظفر نگر میں ڈپٹی سے ممانعت جلسہ کی منظوری لے لی یہ تو بڑی لمبی چوڑی تفصیلات ہیں، اہل جھنجھانہ، کیرانہ، کاندھلہ وغیرہ کے حضرات کی دوڑ دھوپ سے منظوری ہوگئی اور جلسہ ہو گیا۔

اتوار کی شام کو مولانا انعام صاحب سہارنپور پہنچ گئے اور پیر کی صبح کو گنگوہ حاضری ہوئی، سید خلیل مفتی محمود سے طے ہو گیا تھا کہ پیر کی صبح کو سیدھے گنگوہ پہنچیں گے، مگر بارش اتنی ہوئی کہ سارا وقت مزار کی مسجد میں گزرا۔

پیر جی شریف کے صاحب زادہ کا صوفی رشید کی بھتیجی سے نکاح بھی ہماری آمد پر اسی دن طے ہو گیا تھا اور قاری طیب صاحب لڑکے والوں کی طرف سے مدعو تھے وہ دس بجے پہنچ گئے، زکریا ان کی خبر سن کر حجرہ سے ۱۲ بجے صوفی جی کے مکان پر پہنچ گیا اور آدمی بھیج کر قاری صاحب کو بلایا ایک بجے بعبارت قاری طیب صاحب صوفی جی کے مکان پر نکاح ہوا، گرمی بہت شدید تھی زکریا نے صوفی جی سے درخواست کی کہ آپ چھوہارے بانٹتے رہیں، مگر ہمیں کیوں محبوس کر رکھا ہے، انہوں نے ہمیں اجازت دے دی قاری صاحب اپنے مستقر پر چلے گئے اور ہم سب قاری شریف کے مدرسہ میں

ظہر کی نماز پڑھ کر مولانا انعام صاحب نے مشکوۃ شریف ختم کرائی اور دُعاء کرائی اس سے فراغ پر سہارنپور کے لیے فوراً روانہ ہوگئے۔

مزار پر چونکہ مجمع بہت زیادہ ہوگیا تھا، عزیز محمد کاندھلوی بھی ساتھ تھا، اس نے زکریا سے کہا کہ اگر تو اجازت دے تو میں مجمع سے بات کرلوں اس نے مزار کی مسجد میں ایک گھنٹہ تقریر کی۔

مولانا انعام صاحب منگل کی صبح دہلی روانہ ہوگئے۔

بارش کی کثرت کی وجہ سے یکم شعبان کی شب میں رؤیت نہیں ہوئی تھی مگر آنے والوں مہمانوں کی کثیر تعداد نے اور اس کے بعد مقامی دو آدمیوں نے رویت کی گواہی دی اس لیے ۱۳ شعبان کو مدرسہ اور قاضی صاحب کی طرف سے ۱۳ کو ۱۴ کا اعلان کر دیا، شہر والوں نے خوب گالیاں دی کہ اب حلوہ پکنے کا نہیں رہا، فللّٰہ الحمد۔

۱۰ اگست ۷۶ء مطابق ۱۲ شعبان ۱۳۹۶ھ کو مفتی صاحب اور قاضی صاحب بھوپالی تشریف لائے اور نس بندی کے سلسلہ میں بڑی طویل گفتگو رہی دونوں حضرات بہت زوروں پر تھے، مگر زکریا نے مکی مدنی دور کی تفصیل ذکر کی وہ علی الصباح دیوبند چلے گئے، آج کل ہندوستان میں نس بندی کے سلسلہ میں بڑے ہنگامے، بڑے جبر، گرفتاری وغیرہ ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے کانگریس سے عام نفرت بڑھتی جا رہی ہے، ۱۳ شعبان کو الیاس انچولی سرہند جاتے ہوئے مولوی وقار سے ملنے کے لیے سہارنپور اترے تو معلوم ہوا کہ میرٹھ بلند شہر وغیرہ میں اس کی بہت شہرت ہے کہ زکریا ۱۵ شعبان سرہند گزارے گا، اس لیے بہت سی موٹریں کاریں بسیں براہِ راست سرہند جا رہی ہیں، بہت سی مراد آباد دہلی کی کاریں بھی پہنچ گئیں اور جب زکریا ۱۵ شعبان کو وہاں نہیں پہنچا تو سب واپسی میں سہارنپور پہنچے سب سے پہلے جمعہ کے دن سرہند سے ایک لاری ۶۰ نفر کی سہارنپور پہنچی اور عشاء تک مہمانوں کی واپسی ہوتی رہی، اللہ تعالیٰ مولوی نصیر کو بہت جزائے خیر دے، دین و دنیا کی راحت، چین نصیب کرے، عشاء کے بعد تک مہمانوں کے کھانے کا انتظام کرتے رہے، سنا گیا ہے کہ سرہند میں اس غلط روایت پر دو ہزار سے زیادہ مجمع جمع ہوگیا تھا۔

۱۶ شعبان ۱۳۹۶ھ ایک ہفتہ سے مفتی محمود کی آنکھ میں شدت سے تکلیف ہو رہی ہے، زکریا کے اصرار پر اول علی گڑھ گئے اور پھر رمضان کے بعد کلکتہ گئے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ کلکتہ کے علاج سے بہت فائدہ ہوا بھائی جمیل کلکتوی کے اصرار پر کلکتہ جانا ہوا تھا، زکریا نے اول تو ان کے اصرار کو مفتی صاحب کے کلکتہ لے جانے کا بہانہ سمجھا تھا، مگر تکمیل علاج کے بعد معلوم ہوا کہ ان کا اصرار بڑے اخلاص پر مبنی تھا اور بہت فائدہ ہوا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مفتی صاحب علاج سے بہت انکاری تھے مگر زکریا کے بار بار اصرار پر انہوں نے قبول فرمالیا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

۲۰ شعبان ۱۳۹۶ھ ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کو حلیم بن شمیم مکی کراچی سے بذریعہ طیارہ دہلی پہنچا اور تعجب ہے کہ اختر علی سہارنپوری بھی اسی طیارہ میں تھا مگر ملاقات نظام الدین جا کر ہوئی اور اتوار ۲۲ اگست کو مولوی انعام و محمد کاندھلوی اور ابرار کے ساتھ کاندھلہ گیا، وہاں حسب ہدایت شمیم اس کو سیر کرائی گئی دعوتیں بھی خوب ہوئیں۔

۲۵ اگست کو صوفی افتخار کے ساتھ سرہند گیا اور ۲۶ اگست کو واپسی ہوئی۔

۳ رمضان کو جاوید کے ساتھ نظام الدین گیا، ۱۸ رمضان کو سہارنپور آیا۔

۲۱ شعبان ۹۶ھ مطابق ۱۹ اگست ۷۶ء کو مولانا عبدالحمید صاحب نائب ناظم تعلیمات مظاہر علوم جو عرصہ سے بہت بیمار تھے اور تقریباً معذور سے تھے اول مدرس فارسی کئی سال رہے پھر ناظم تعلیمات رہے، بہت نیک آدمی تھے اپنے گاؤں مہیسری میں ۶ بجے صبح کو انتقال فرما گئے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے بڑی خوبیوں کے مالک تھے، جناب الحاج حافظ قمر الدین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں خادم خاص رہے تھے

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں

فارسی کے بہت اچھے مدرس تھے، قاری مظفر صاحب ان کی تجہیز و تکفین کے لیے تشریف لے گئے۔

۲۳ شعبان ۲۵ اگست کو اجتماع سرپرستان تجویز تھا، زکریا اور عاقل کی تجویزات بھی اہم تھیں جن کے لیے وقت نہیں ملا تو وہ عامر اور صوفی افتخار کے حوالہ کر دی گئی کہ شروع شوال میں مولوی انعام صاحب اور حاجی شفیع کو سنا کر دوبارہ غور ہو، حاجی عبدالعلیم صاحب حسب دستور ماہِ مبارک کے لیے ٹھہر گئے اور دارِ جدید اپنے حجرے میں منتقل ہو گئے حاجی صاحب کی وجہ سے ہر سال مراد آباد والوں کی آمد کثرت سے رہتی ہے۔

یکم رمضان ۱۲۸ اگست شنبہ کو ہوئی۔

اسماعِ دارِ جدید، عشرہ اولی، سلمان، ثانیہ خالد، ثالثہ زبیر بن مولانا انعام الحسن صاحب دار الطلبہ قدیم، مختار حفید ناظم صاحب حسب دستور روزانہ تین پارے، مدرسہ قدیم، محمد افریقی، گورا جامع مسجد شہر۔

طلحہ حسب دستور ٹال مولوی نصیر، دار العلوم دیوبند مولوی سالم۔

قاری طیب صاحب نے رمضان بمبئی میں گزارا، ۲۳ شعبان کو بمبئی چلے گئے تھے۔

شاہد نے زکریا کے مکان میں شروع کیا تھا مگر تین چار دن کے بعد بیمار ہو گیا حافظ صدیق نے گھر میں پورا کیا، (ابوالحسن کے گھر سنانے کے بعد)۔

حضرت حافظ عبدالعزیز گمتھلوی نے ۷۲ء اور ۷۳ء کے رمضان لاہور میں گزارے اور اس سے پہلے اور اس کے بعد لائل پور میں۔

نظام الاوقات

اس سال زکریا کے دوران سر کی شکایت کی وجہ سے بجائے دو پارے کے ایک ہی رہ گیا، بعد مغرب وسحور وضحیٰ وسنن ظہر، اسماع بعد ظہر مولوی احمد لولات وضحیٰ کے وقت بجائے بالنظر کے مولوی اسماعیل کو سنانا کہ بالنظر پڑھنا مشکل تھا۔

بعد مغرب طعام وغیرہ سے فراغت کے بعد بجائے گفتگو کے صوفی اقبال کی کتاب ''اکابر کا سلوک'' وغیرہ اذان عشاء سے قبل بیعت، بعد تراویح فضائل رمضان وغیرہ مگر چونکہ حکام کی طرف سے یہ اعلان تھا کہ ۱۱ بجے کے بعد جو ملے گا اس کی نس بندی کر دی جائے گی، اس لیے تراویح کے بعد مقامی لوگوں کو فوراً بھیج دیا جاتا تھا ۱۲ سے ۳ تک دار جدید منتقل، جس میں معتکفین کے مسجد کے بالائی حصہ سے چائے وغیرہ خریدنے کے قصے پیش آتے رہے ۳ بجے سے سحور اول آدھ گھنٹہ تیاری میں ۳:۳۰ سے اذان فجر سے آدھ گھنٹہ قبل تک اطعام اضیاف، اس کے بعد قرآن کی تلاوت اور نوافل وغیرہ صبح کی اذان کے بعد نماز اور اس کے بعد ۹ بجے تک اکثروں کا سونا، بعض کا مشغول رہنا، ۱۰ سے ۱۱ تک حسب معمول وعظ مولوی عبیداللہ صاحب وغیرہ بعد ظہر ختم خواجگان ذکر جہر، مجمع رمضان کے شروع سے ہی ایک ہزار کے قریب پہنچ گیا تھا اور اخیر رمضان میں اٹھارہ سو تک۔

خصوصی آمد

قاضی عبدالقادر صاحب جو ۲۷ رمضان کو پاکستان تشریف لے گئے، محمد بنوری، صوفی اقبال، ڈاکٹر اسماعیل، بھائی یحییٰ کراچوی، زبیر وشاہد کراچویان، مولوی احسان الحق، قاضی محمود، مولوی یوسف تتلی مع جماعت افریقہ، احمد ناخدا، مولوی عبدالحفیظ، عبدالوحید مکیان، عطاء الرحمٰن، یعقوب مدنیان، بھائی حبیب اللہ دہلوی مدنی، ڈاکٹر ظفیر اخیر رمضان میں پہنچے، مفتی محمود حسب سابق جمعرات کو آمد اور بار کو واپسی، مگر اخیر عشرہ کا اعتکاف زکریا کے اصرار پر چھتہ کی مسجد میں، مولوی رشید پورا رمضان۔

افتخار فریدی مرادآبادی حسب تجویز زکریا کئی سال سے رمضان رائے پور میں گزار رہے تھے مگر اس سال مقامی خرخشہ کی وجہ سے نہیں جا سکے۔

علی میاں اور مدرسین دارالعلوم ندوہ تین شب کے لیے آئے۔

مولوی انعام الحسن صاحب اس سال علالت کی وجہ سے نہیں آسکے، مولوی محمد عمر وغیرہ تین شب

کے لیے اور مولوی اظہار الحسن صاحب ایک عشرہ کے لیے آئے۔

۲۵ رمضان کو بعد ظہر مولانا اسعد مدنی کا بچہ مسعود اور عزیز ارشد کا لڑکا امجد اور رشید الدین تینوں کے قرآن پاک کا افتتاح دارِ جدید کی مسجد میں ان حضرات نے حکم بھیجا تھا کہ ان کا افتتاح تو کرا۔

یکم شوال ۲۶ ستمبر اتوار کے دن رویت عامہ سے عید ہوئی، دارِ جدید میں عزیز سلمان نے دار الطلبہ قدیم میں قاری نسیم نے، ناظم صاحب نے اپنے حجرہ میں بامامت گورا۔ دیوبند میں قاری طیب صاحب نے علالت کی وجہ سے نماز نہیں پڑھائی، مولوی سالم نے پڑھائی قاری صاحب رکشا سے عید گاہ گئے۔

مولانا انعام صاحب کی اس سال رمضان میں طبیعت زیادہ خراب رہی ۳ شوال منگل ۲۸ ستمبر کو صبح ۱۰ بجے عزیز ارشد کاندھلوی کا نکاح بعبارت قاری طیب صاحب اور مولوی محمود پیڑوی کے لڑکے کا نکاح بعبارت مولوی اسعد صاحب دارِ جدید کی مسجد میں ہوا۔

۹ شوال کو نجم الحسن بن مولانا ظہور الحسن صاحب کا نکاح کاندھلہ میں مولوی طاہر کی لڑکی سے ہوا عزیز طلحہ نے شرکت کی۔

۱۰ شوال ۹۶ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۷۶ء منگل کی رات میں مفتی محمد شفیع صاحب کا کراچی میں انتقال۔

۹ شوال ۱۳۹۶ھ کو مولوی حبیب اللہ چمپارنی کا نکاح ان کے وطن میں مہر فاطمی پر بعبارت مولوی ریاض الحق ہوا۔

۱۸ شوال کو عزیز حماد کا نکاح بعد عصر حکیم ذوالنون کی لڑکی سے بعبارت مفتی محمود سے مسجد موچیان میں ہوا۔

۲۳ شوال کو مظفر نگر میں نس بندی پر فساد شروع ہوا۔

۲۴ شوال ۱۹ اکتوبر کو بھائی جمیل کے ساتھ مفتی محمود صاحب کلکتہ بسلسلہ قدح چشم گئے۔

۲۸ شوال ۲۳ اکتوبر کو قاری شریف کے مدرسہ میں زکریا نے مشکوٰۃ کی ابتداء کرائی کہ مولانا انعام صاحب کی طبیعت خراب تھی، یکم ذیقعدہ پیر کے دن مولوی انعام صاحب دہلی کے لیے روانہ ہو گئے، مولانا عبدالحکیم صاحب رمضان کے بعد میری روانگی تک قیام کے ارادہ سے ٹھہرے ہوئے تھے، ۴ ذیقعدہ کی شب میں ان کے کسی مخلص کا خط آ گیا کہ آپ کے لیے حج کا انتظام ہو گیا، مولانا اسی وقت روانہ ہو گئے اور ۱۹ نومبر کو بمبئی سے جدہ روانہ ہو گئے۔

زکریا کے لیے پاکی احباب شوال سے ویزے کی کوشش میں تھے مگر حاصل نہ ہو سکا۔

حکیم عبدالمجید منگلوری نے خواب پر ذیقعدہ میں زکریا کے گھٹنوں کا علاج شروع کیا بہت محنت

کی مگر گھٹنوں پر پھنسیاں نکل آئیں اور علاج بیچ میں چھوڑ نا پڑا کہ سفر شروع ہو گیا۔
مولوی یوسف تتلی گجرات سے آئے تھے مگر زکریا کی پریشانی دیکھ کر وہ رائے ونڈ کے اجتماع میں شرکت کے لیے گئے اور کہا کہ میں رائے ونڈ کے اجتماع سے فارغ ہو کر تجھے لینے واپس آؤں گا، مگر اہل پاکستان نے ان کو روک لیا کہ زکریا کا ویزا ملنے کی امید ہے اسے لے کر جانا۔
۳ نومبر ۷۶ء ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۹۶ھ کی شب میں زکریا نے خواب دیکھا کہ حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند کچے گھر میں تشریف فرما ہیں اور ہندوستان کے حالات حاضرہ پر مشورہ کر رہے ہیں کہ اس زمانہ میں نس بندی کے ہنگامہ چل رہے تھے، مگر اُٹھنے کے بعد کوئی بات یاد نہ رہی۔
۷ نومبر ۱۴ ذیقعدہ کی شب میں عزیز عاقل کے گھر میں بہت سہولت سے لڑکا پیدا ہوا، اس سال زکریا کے یہاں حکام شہر اور وزراء وغیرہ کی کثرت سے آمد رہی جس سے بہت فکر رہا مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ کوئی بات پیش نہیں آئی۔
مولوی حبیب اللہ کی روانگی میں اس سال بہت مشکلات پیش آئیں دہلی اور بمبئی کا سفر کرنا پڑا، ۲۵ ذیقعدہ ۱۸ نومبر ۷۶ء کی شب میں عزیز زبیر کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا، زہیر نام رکھا گیا۔

......☆☆☆☆☆......
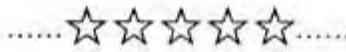
روانگی از ہند برائے حجاز ذیقعدہ ۹۶ھ

شعبان سے پاکی حضرات کا بہت شدید اصرار تھا کہ حج کو جاتے ہوئے مولانا انعام صاحب کے ساتھ رائے ونڈ کے اجتماع میں زکریا شریک ہوکر جاوے، مفتی زین العابدین صاحب نے شعبان میں بہت اطمینان دلایا تھا کہ اب ویزے مل جائیں گے، مولوی انعام صاحب کے رفقاء زکریا مع رفقاء جتنے بھی ہوں گے سب کے ویزے مل جائیں گے، مگر شوال میں بھائی عبدالوہاب کا دستی خط پہنچا کہ سب کے ویزوں کا انکار ہوگیا، وجہ انکار باوجود کوشش کے نہ معلوم ہوسکی البتہ مولوی عبیداللہ صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب کا ویزا مل گیا تھا وہ اجتماع میں شریک ہوگئے، مولانا انعام صاحب نے تو سفر ملتوی کردیا، مگر زکریا کو حجاز آنا تھا۔

مولوی تتلی نے رمضان سہارنپور گزارا تھا مگر مولوی حبیب اللہ کے بی فارم کا جھگڑا چل رہا تھا میرے ساتھ مولوی اسماعیل تنہا رہ گئے اس لیے مولوی یوسف تتلی وعدہ کر گئے تھے کہ رائے ونڈ کے اجتماع سے فارغ ہوکر تجھے لینے آؤں گا مگر اہل پاکستان نے ان کو میرے ویزے کی امید پر روکے رکھا، اگرچہ زکریا کو بمبئی سے آنے میں بڑی سہولت تھی مگر ظہران کے کسٹم کا قصہ بڑی مشکلات کا سبب ہوتا ہے اس لیے اس سال براہ کراچی آنا تجویز کیا تھا پی آئی اے سے کہ اس میں ظہران کا قصہ نہیں ہوتا، پاکی احباب بہت کوشش کرتے رہے کہ زکریا کو عبور کا ویزا دو چار دن کا مل جائے مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی مولوی تتلی کے پاکستان سے برابر خطوط آتے رہے کہ میں ہر وقت آنے کو تیار ہوں، مگر یہ حضرات روکتے ہیں ویزا ملنے کی امید ہے، لیکن مایوسی کے بعد ۱۵ نومبر ۷۶ء ۲۲ ذیقعدہ ۹۶ھ کی صبح کو سہارنپور سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی زکریا کو رمضان کے بعد سے بخار کی شدت تھی اس دن بخار شدید تھا دہلی تک دو لنگیاں خراب ہوئیں، دہلی کے قیام میں کچھ کھانے کی نوبت نہیں آئی۔

سہارنپور سے روانگی کی شب میں مولوی یوسف تتلی کراچی سے عبوری ویزا چار دن کا لے کر پہنچ گئے اس لیے ۲۵ ذیقعدہ ۱۸ نومبر کو عصر کے بعد رفقاء سامان لے کر مطار پر پہنچے اور مغرب کی نماز پڑھ کر زکریا بھائی کرامت کی کار میں سیدھے طیارہ پر پہنچا اور ۷ بج کر ۱۰ منٹ پر پاکی طیارہ سے روانہ ہوئے اور ۸ بج کر ۵۰ منٹ پر کراچی کے مطار پر پہنچے، وہاں حسب دستور حاجی فریدالدین صاحب مع اپنی گاڑی کے طیارہ پر تشریف فرما تھے وہ مجھے اپنی کار میں بٹھا کر مکی مسجد پہنچا گئے، رفقاء کسٹم سے نمٹ کر ایک گھنٹہ کے بعد پہنچے، چونکہ پہلے سے اتوار پیر کی درمیانی شب میں کراچی سے

روانگی تجویز تھی اور اسی طیارہ سے دہلی سے جدہ کے لیے ایک صاحب آرہے تھے، ان کو صولتیہ کا ٹیلیفون نمبر اور چند ریال دیئے، ریال لینے سے تو انہوں نے شدت سے انکار کیا مگر مکی مسجد پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہمیں صرف ۷۲ گھنٹے ٹھہرنے کی اجازت ہے۔

سابقہ اطلاع منسوخ ہر چند احباب نے کوشش کی کہ جہاز کی روانگی کے وقت تک مکی مسجد ٹھہرنے کی اجازت دی جائے مگر اجازت نہ مل سکی اور شنبہ کے دن مغرب کے بعد مکی مسجد سے مطار پر آنا پڑا اور یہ رات مطار کے ہوٹل میں گزارنی پڑی، دو کمرے کرائے پر لیے گئے، ایک میں زکریا احسان، حبیب اللہ، اسماعیل چار آدمیوں کی اجازت تھی، دوسرے کمرہ میں پہلوان ابراہیم، بھائی صغیر لاہوری وغیرہ نے لیا تھا، مگر لیٹنے کے بعد پہلوان بھی ہمارے ہی کمرے میں آگیا اور نیچے لیٹ گیا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے نہایت راحت وآرام سے رات گزری اتوار کی صبح کو حاجی فریدالدین صاحب اپنی گاڑی لے کر ہوٹل پہنچ گئے اور وہاں سے مطار پہنچے، مگر طیارہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہمارے ٹکٹ جو ساڑھے آٹھ بجے والے جہاز سے تھے وہ منسوخ کر دیئے گئے اس لیے کہ وقت سے پہلے سامان نہیں پہنچے تھے۔

اللہ تعالیٰ حاجی فریدالدین صاحب کو جزائے خیر دے کہ وہ مجھے تو طیارہ پر بٹھا گئے اور فرما گئے کہ تمہارے ٹکٹ ابھی لاتا ہوں، عین وقت پر قاضی صاحب اور مولوی یوسف تتلی بھی اسی میں آگئے، ۸ بج ۳۰ منٹ پر کراچی سے چل کر ۱ بج کر دس منٹ پر جدہ پہنچ گئے، چونکہ زکریا کو بخار کا سلسلہ ہو رہا تھا اس لیے نہ احرام باندھا نہ مکہ جانے کا ارادہ تھا، اس لیے جدہ میں بھائی شجاع کے مکان پر قیام رہا، تین گھنٹے بعد میرے رفقاء مولوی اسماعیل، حبیب اللہ کسٹم وغیرہ سے نمٹ کر بھائی شجاع کے مکان پر پہنچے۔

علی میاں پہلے سے مکہ پہنچے ہوئے تھے مگر مطار نہ پہنچ سکے مغرب کے وقت بھائی شجاع کے گھر پہنچے جدہ میں اول مولوی اسعد مدنی کا ٹیلیفون مدینہ میں ہجوم ہے، مدرسہ علوم شرعیہ تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں اس لیے یہاں آنے کا ارادہ نہ کریں دوسرا ٹیلیفون بھائی حبیب اللہ دہلوی کا پہنچا کہ مدینہ اس وقت بالکل نہ آویں مگر ایسی حالت میں عمرہ کرنا زکریا کے بس کا نہیں تھا، اس لیے جدہ سے پیر کی صبح کو یوسف کی بیجو میں زکریا مولوی حبیب اللہ، مولوی اسماعیل، قاضی جی روانہ ہوئے عزیز عبدالحفیظ نے گاڑی چلائی، ۱۲ بج کر ۵۰ منٹ پر جدہ سے روانہ ہوئے اور ۴ بجے بدر پہنچے۔ مگر وہاں سے جدہ کی تین گاڑیاں مسلط ہو گئیں وہ آگے آگے آہستہ آہستہ چل رہی تھیں کہ کوئی گاڑی قطار سے باہر نہ نکلے، ۶ بجے مدینہ پہنچے، سید حبیب صاحب کے مکان پر مولوی اسعد صاحب سے

ملنے کے لیے گاڑی روکی مولوی اسعد تو حرم جا چکے تھے سید حبیب صاحب سے ملاقات ہوئی اور ۶ بج کر ۳۰ منٹ پر مسجد نور پہنچے، عصر میں مولوی اسعد اور مولوی ارشد بھی مسجد نور پہنچے، رات کو ۴ بجے عبدالحفیظ نے کہا اس وقت سامان آسانی سے جا سکتا ہے ہم لوگ مدرسہ شرعیہ پہنچا آتے ہیں صبح کو تیرا جانا آسان ہوگا کہ جہاں تک گاڑی جا سکے گی گاڑی، اس کے بعد تو اپنی کرسی پر چلے جایئے۔

یکم ذی الحجہ ۹۶ھ ۲۳ نومبر کو اُم القریٰ میں پیر کی یکم اور منگل کا حج شائع ہوا تھا کہ اُم القریٰ کی تاریخ ہی پر یہاں مدار ہوتا ہے، مگر مدینہ پہنچ کر پہلے اعلان ہوا کہ بدھ کو حج ہوگا، جمعہ کو پھر اعلان ہوا کہ حج منگل ہی کو ہوگا۔

۵ ذی الحجہ کو قاضی صاحب عزیز عبدالحفیظ کے ساتھ حج کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے ہجوم کی وجہ سے بقیع جانے کی بھی نوبت نہیں آئی خیال تھا کہ ۸ ذی الحجہ کو ہجوم ختم ہو جائے گا تو بقیع جائیں گے مگر معلوم ہوا کہ بقیع بند ہو گیا صرف جنازہ کے وقت کھلتا ہے اور مخصوص آدمیوں کو جانے دیتے ہیں۔

۱۰ ذی الحجہ کو صبح کی نماز کے بعد اجتماعی تکبیرات تشریق جو ہمیشہ تک مکہ میں معمول تھی مگر مکہ والوں نے اب اس کو روک رکھا ہے، مدینہ میں اب بھی جاری ہے، قاضی صاحب نے لندنی احباب کے ساتھ ان ہی کے خیمہ میں حج کیا، ان ہی کے ساتھ آئے، زکریا نے تو اس سال امراض کی وجہ سے حج نہیں کیا تھا اللہ تعالیٰ ہی معاف کرے۔

سہارنپور دارِ جدید میں عیدالاضحیٰ میں قاری مظفر کی امامت میں مختصر جماعت قربانی کی وجہ سے ۷:۳۰ بجے ہوئی اور دارالطلبہ قدیم میں قاری نسیم کی امامت میں ۹:۳۰ بجے۔

۱۳ ذی الحجہ کی شب میں ڈاک خانہ میں آگ لگی دس ہزار خطوط جل گئے مدینہ میں دو ہفتے کے لیے مسجد نبوی اس سال ساری رات کھلی رہی ہجوم کی کثرت تھی۔

۱۵ ذی الحجہ کی شب میں علی میاں عشاء کے بعد پہنچے نور ولی کے مکان پر حجاج کا قیام تھا اس لیے مولوی امجد اللہ مرحوم کے لڑکے نے اپنے مکان پر قیام کرایا۔

۱۶ ذی الحجہ کو قبیل مغرب جب کہ نمازی کثرت سے مسجد آ رہے تھے بھائی حبیب اللہ دہلوی کے مکان کے قریب ایک بوسیدہ دیوار گری جس سے ۱۵ آدمی شہید ہو گئے اور بہت سے زخمی۔

۹ دسمبر ۷۶ء کی شب میں مولانا قاسم صاحب شاہ جہان فتح پور میں شب کے ۱۲ بجے انتقال فرما گئے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، اس ناکارہ پر تو بڑی شفقت تھی اور مظاہر علوم کی اسٹرائیک کے زمانہ میں جب کہ وہ مظفر نگر کے ایک جلسہ میں شرکت کے لیے جا رہے تھے سہارنپور کے اسٹیشن پر جب انہیں اس ناکارہ کی پریشانی اور اسٹرائیک کا حال معلوم ہوا تو سہارنپور کے اسٹیشن ہی سے

ایک آدمی مظفر نگر بھیج دیا کہ میں نہیں آ سکتا اور ایک ہفتہ تک مسلسل قیام فرمایا اور اپنے سارے پروگرام منسوخ کر دیئے، مدینہ پاک میں مرحوم کے لیے دعاؤں اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا، مولانا مرحوم سے بہت قدیم تعلقات تھے اور جب بھی دیوبند یا قرب وجوار میں جلسہ میں تشریف لاتے تو آتے جاتے ضرور سہارنپور قیام فرماتے، یہ ناکارہ مولانا کے احسانات کا بدلہ دعاء اور ایصال ثواب کے سوا کیا کر سکتا ہے۔

علی میاں مدینہ منورہ میں ایک ہفتہ قیام کے بعد واپس تشریف لے گئے یمن والوں کا اصرار تھا کہ وہاں تشریف لے جائیں مگر باوجود کوشش کے وہاں کا ویزا نہ مل سکا۔

۶ محرم ۱۳۹۷ھ ۲۷ دسمبر ۷۶ء کو دارالعلوم بولٹن کا پہلا سالانہ جلسہ ہوا زیر صدارت مولانا اسعد مدنی۔

۸ محرم ۹۷ھ کو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں حفاظ قرآن کا مقابلہ ہوا جن میں پانچ آدمی نمبر اول تھے ان میں عزیز عطاء الرحمن بھی تھا ڈیڑھ ہزار ریال انعام تجویز ہوا۔ ۱۴ صفر ۹۷ھ ۴ فروری ۷۷ء کی شب میں عزیز خالد سہارنپور کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا۔

۲۲ ماہ کی ایمرجنسی کے بعد اندرا کے الیکشن میں ہارنے کی وجہ سے آج ۲۱ مارچ ۷۷ء کو ایمرجنسی ختم ہوگئی، کانگریس ۳۰ سالہ دور میں پہلی دفعہ اس سال نس بندی کے مظالم کی وجہ سے تقریباً سارے ہی صوبہ جات ہند میں ناکام ہوگئی۔

پاکستان میں الیکشن اور اس کے بعد نہایت کثرت سے مظالم ہوتے رہے جب کہ ہندوستان میں اندرا نے اپنی ہار مان کر وزارت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

۱۸ اپریل ۷۷ء کو ابراہیم پہلوان لائل پوری کا لڑکا جو جلوس میں جا رہا تھا، شہید ہو گیا اور بہت ہی کثرت سے شہادتیں اور قید و بند اور زخمیوں کی خبریں پاکستان سے پہنچ رہی ہیں، اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے۔

ملک خالد جو لندن اپنی ٹانگ کے علاج کے لیے گئے ہوئے تھے دو ماہ دس دن قیام کے بعد ۳۰ اپریل شنبہ کی شام کو ریاض پہنچے ریاض سے کئی طیارے لندن استقبال کے لیے گئے ہوئے تھے ان کی آمد کی خوشی میں لا تعد و لا تحصیٰ چراغاں ہوئے جس نے ہندوستان کی دیوالی کو بھی مات کر دیا چھوٹے چھوٹے مکانات پر ایک ایک ہزار قمقمے جلے باب عثمان کے برابر جو ہوٹل ہے اس پر کئی ہزار قمقمے آتے ہوئے جلتے ہوئے نظر آتے تھے جو رات بھر جلتے تھے، فیاللاسف، مکہ مدینہ کی سڑکوں پر بہت کثرت سے گیٹ بنائے گئے حالانکہ ملک صاحب کا حرمین میں اس وقت آنا تجویز نہیں تھا بلکہ سیدھا ریاض جانا تجویز تھا۔

۲ مئی کی شب میں حکیم ذوالنون کی والدہ صاحبہ کا انتقال فجائی ہوا۔

۴ مئی کو قاضی صاحب پاکستان تشریف لے گئے کہ وہاں کے اہم اجتماعات شوریٰ وغیرہ کے موقوف تھے، قاضی صاحب نے ٹیلیفون کی کوشش کی مگر ہنگامہ کی وجہ سے ٹیلیفون تو نہیں مل سکا، ٹیلکس سے حالات معلوم کیے، احباب نے تو بہت زور سے قاضی صاحب کے آنے کا تقاضا کیا، مگر معلوم ہوا کہ ۷ مئی کو پیر پگاڑو کی قیادت میں ۲۰ لاکھ کا جلوس نکلنے والا ہے، اس زمانہ میں بھٹو کے خلاف بہت ہنگامے ہو رہے تھے، مارشل لاء اور قیدیں بہت زوروں پر تھیں۔

۵ مئی کو ایک صاحب تشریف لائے اور کہا کہ میں تیری ٹانگوں کے علاج پر مامور ہوا ہوں کب آؤں؟ میں نے بہت شکریہ کے ساتھ عرض کیا کہ میں خود ہی تکلیف دوں گا، انہوں نے اصرار کیا کہ میں مامور ہوں، زکریا نے اس وقت معذرت کر دی اور بعد میں احباب سے اور مولانا عبدالحق صاحب نقشبندی وغیرہ سے تحقیق کی تو انہوں نے کچھ زیادہ معتبر نہیں بتایا۔

۷ مئی آج حرم نبوی کی دھوپ گھڑی جو سینکڑوں سال سے حرم کی کنکریوں کے اوپر نصب تھی، اکھاڑ کر مصلی الجنائز کے آگے رکھ دی گئی، اس لیے کہ کنکریاں اُٹھائی جانی اور اس کی جگہ پتھر لگانا تجویز ہوئے ہیں اس لیے کہ عورتیں کنکریاں اُٹھا کر بچوں کو پیشاب پاخانہ کرا کر کنکریاں اُوپر رکھ دیتی تھیں۔

۱۴ مئی، آج عزیز زبیر الحسن سلمہ کی داہنی آنکھ کا آپریشن ہوا اور ڈاکٹروں نے آپریشن کے بعد کمرہ میں پاؤں پاؤں پہنچا دیا۔

۲۴ مئی آج عزیز محمد سعید رحمت اللہ کا مکہ سے خط آیا کہ آپ کی دعاء کی برکت سے جو درخواست جلالۃ الملک کو بھیجی تھی (بسلسلہ تابعیہ زکریا) ابھی ابھی اس کی منظوری کی اطلاع آ گئی پندرہ بیس روز میں ریاض سے معاملہ مکہ میں آئے گا اور اس کی تکمیل میں کم سے کم پندرہ روز مکہ میں لگیں گے، اخیر رجب امید ہے کہ تکمیل ہو جائے گا، اگر ہند کے سفر کا ارادہ ہو تو اس سے پہلے نہ کریں۔

۲۷ مئی آج رباط بھوپالی میں دفعۃً آگ لگی سب سے نیچے کی منزل میں پاکستانی ہوٹل کا مطبخ تھا اسی سے آگ کی ابتداء ہوئی بہت مشکل سے رباط کے آدمیوں کو نکالا گیا۔

۳۱ مئی آج لکھنؤ سے حیات خلیل کا پہلا نسخہ بذریعہ ڈاک پہنچا۔

۳ جون کی شب جمعہ میں مولانا شریف صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند کا حادثۂ انتقال۔

......☆☆☆☆☆......

سفرِ ہند ۱۳۹۷ھ

جمادی الثانی

زکریا کا معمول ہمیشہ سے یہ ہے کہ ہندوستان سے واپسی پر پہلے ہی دن سے آیندہ رمضان کے لیے استخارہ شروع کر دیتا ہے، اس سال بھی اولاً ممانعت آئی تھی، مگر ۲۴ جمادی الثانیہ کو ایک صالح آدمی کے مکاشفہ میں جو کئی دن سے ہو رہا تھا یہ الفاظ حضور اقدس کے پہنچے رحلۃ سعیدۃ، موفقۃ، مبارکۃ ومقبولۃ ان شاء اللہ تعالیٰ تقریباً چھ مرتبہ یہ الفاظ فرمائے، جن میں ایک دو مرتبہ مقبولۃ فرمایا اور بقیہ اس کے بغیر اس پر ارادہ کر لیا اور ۲۴ جمادی الثانیہ کو مکہ روانگی ہوگئی۔

مغرب بدر میں پڑھی، عشاء تک قیام رہا، صوفی اقبال، ڈاکٹر اسماعیل، بھائی یحیٰی کی مشترک دعوت ہوئی، صبح کی نماز کے بعد شہداء پر حاضری ہوئی، ایک گھنٹہ قیام رہا، ایک بجے بدر سے چل کر ۴ بجے سعدی کے گھر پہنچ گئے اور حسبِ معمول مغرب سے پہلے حرم شریف میں پہنچ گئے، عشاء کے بعد حسبِ معمول بھائی سلیم کے یہاں زوردار دعوت ہوئی اس کے بعد عمرہ کیا اور عزیز سعدی کے گھر جا کر سو گئے، عزیز سعدی نے کہا کہ تمہارے کاغذات تابعیہ کے آگے گئے ہیں، مگر دفتر جانا ضروری ہے، دو پہر کو عزیز حلیم کی کار میں بھائی شمیم کے ساتھ دفتر پہنچے عزیز سعدی پہلے جا چکا تھا، اس کی تلاش میں آدھ گھنٹہ دھوپ میں رہنا پڑا، اس کے بعد جوازات کار ہی پر آگئے، بہت معذرت کی کہ میں تو تکلیف نہ دیتا مگر حلف نامہ میں سامنے ہونا شرط ہے، دس منٹ میں میری کارروائی پوری ہوگئی اور میں واپس آگیا، عزیزان سعدی اور شمیم اس کی تکمیل کراتے رہے۔

۵ رجب ۲۱ جون کو تابعیہ مجھ تک پہنچ گیا، اس پر ہجرت کی نیت کر لی، میں نے تو دو سال پہلے اولاً مولانا ابوالحسن علی میاں سے اور ثانیاً عزیز عبدالحفیظ سے کہا تھا کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ ہماری حکومت نہ معلوم کب میرا پاسپورٹ ضبط کر لے، مجھے تابعیہ دلوا دو، مگر ان دونوں نے بڑے زور سے مخالفت کی تھی کہ اقامہ میں زیادہ سہولت ہے نہ نسبت تابعیہ کے، میں نے تو ارادہ ملتوی کر دیا تھا، مگر عزیز سعدی سے بھی تذکرہ آیا تھا، اس نے اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر دے، خود ہی درخواست دے کر اس مسئلہ کو نمٹا دیا کہ آں عزیز کو اللہ تعالیٰ فلاحِ دارین نصیب فرمائے، میرے حجازی کام ہمیشہ اسی نے نمٹائے اور بلا کسی مشقت کے، ۲۸ رجب ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۴ جولائی ۷۷ء کو ۴ بجے عربی صولتیہ سے دعاء کرا کر سعدی کے گھر گئے، بھائی سلیم کی طبیعت ناساز تھی، وہ دعاء میں شریک نہ ہو سکے۔

سعدی کے یہاں سے اپنی عصر پڑھ کر سعدی کی گاڑی میں جدہ کے لیے روانگی ہوئی، قیام بھائی شجاع کے یہاں ہوا، جمعہ کی صبح کو عزیز عبدالحفیظ، ڈاکٹر ظفیر وغیرہ سامان لے کر مطار پر گئے، جس جہاز سے جانا تھا وہ نیروبی سے آتا تھا، اس میں تاخیر بھی ہو جاتی ہے، جہاز کی کمپنی کا منیجر گھر آ کر کہہ گیا تھا کہ آپ بے فکر رہیں، جہاز جب آئے گا تو آپ کو اس وقت مطلع کر دیں گے، ایک بجے عربی مطار پر پہنچے، جہاز کے آتے ہی سعدی کی گاڑی میں جہاز تک جا کر اطمینان سے سوار ہو گئے، عبدالحفیظ کے تقاضے پر تین ٹکٹ درجہ اولیٰ کے لیے گئے، ایک عبدالحفیظ کے لیے جو پہنچانے دہلی تک جا رہا تھا، ایک زبیر لائل پوری کے لیے اور ایک نوکر کے لیے۔

جدہ سے روانگی کے ایک گھنٹہ بعد کیپٹن عثمان کا پیام پہنچا کہ مجھے بیعت ہونا ہے، کل کس وقت حاضر ہوں، میں نے کہہ دیا کہ اب اگر آ سکتے ہو تو آ جاؤ، وہ اپنا نائب مقرر کر کے آ گیا، میں نے اپنے اعذار پیش کیے اور کہا کہ پاکستان میں بہت سے مشائخ موجود ہیں، اس نے کہا کہ دل قبضہ کا نہیں، چنانچہ اس کو بیعت کر لیا، اس نے کہا یہ پہلی نظیر ہو گی کہ جہاز پر بیعت کیا، میں نے کہا کہ بالکل صحیح۔

جہاز چونکہ لیٹ تھا اس لیے بجائے جمعہ کے دو گھنٹہ بعد پہنچا، جہاز سے اترتے ہی حاجی فرید کی گاڑی میں مکی مسجد پہنچ گئے اور وہاں اپنا جمعہ پڑھا اور بقیہ رفقاء بعد میں پہنچے، مفتی شفیع صاحب کی قبر اور مدرسہ میں بار کی صبح کو گئے، وہاں سے واپسی پر بھائی یوسف رنگ والوں کے یہاں ناشتہ کیا اور پھر اچھن میاں کے گھر گئے وہاں والدہ طلحہ قریشی سے ملاقات ہوئی اس نے اصرار کیا کہ آپ لڑکی سے براہِ راست بات کر لیں وہ تیار ہے میں نے لڑکی کو اور اچھن میاں کو اور اس کی اہلیہ سے الگ الگ بات کی کوئی راضی نہیں تھا اس لیے والدہ طلحہ قریشی سے معذرت کر کے چلا آیا کہ ان میں سے کوئی راضی نہیں، پیر کے دن میں ظہر کا وضو کر رہا تھا کہ حاجی فریدالدین صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ اسی وقت مکہ سے ٹیلیفون آیا ہے کہ رات بھائی سلیم کا انتقال ہو گیا زکریا نے ظہر کی نماز میں بھی عصر کی نماز میں بھی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کے لیے اعلانات کرائے اور چلنے کے وقت تک اکثر مجلس میں یہ اعلانات ہوتے رہے۔

عزیز سعدی سے خط سے حادثہ کی تفصیل معلوم ہوئیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سانس کی تکلیف ان کو عرصہ سے چل رہی تھی ایک حالت پر زیادہ دیر نہیں رہ سکتے تھے، کبھی لیٹتے تھے، کبھی بیٹھتے تھے جس رات کو انتقال ہوا طبیعت بہت اچھی تھی کھانا سب کے ساتھ کھایا ہنستے بولتے رہے ۳:۳۰ بجے سب کو حکم دیا کہ اپنے اپنے بستروں پر سب جا کر آرام کریں سب چلے گئے آرام کیا ۹ بجے صبح کو والدہ شمیم کی آنکھ کھلی تو سردی سی محسوس ہو رہی تھی، انہوں نے کولر بند کیا اور قریب جا کر دیکھا تو بے

سدھ سورہے ہیں سانس وغیرہ کی آواز نہیں ہے، انہوں نے آوازیں دیں ہلایا مگر کوئی حرکت وآواز نہیں وہ شمیم کو بلا کر لائیں تو انہوں نے آکر دیکھا تو وہ چل دیئے، صبح کی اذان پر بھائی شمیم کا ٹیلیفون آیا کہ ابا جان رات کو کسی وقت چل دیئے جنازہ کا وقت عصر کی نماز میں طے ہوا، ہجوم صبح ہی سے شروع ہوگیا تھا۔

ظہر کے بعد اوپر کی منزل سے مدرسہ کی درمیانی منزل میں اتار کر غسل دیا گیا مولوی غلام رسول اور مولوی عطاء المہیمن بن عطاء اللہ شاہ بخاری نے غسل دیا اس کے بعد مردوں عورتوں کو آخری زیارت کرانے کے بعد جنازہ کو نیچے اُتارا گیا مدرسہ کے نیچے کے ہال میں شیخ حسن نشاط نے اول نمازِ جنازہ پڑھائی اور عصر کی نماز کے بعد حرم میں دوبارہ نمازِ جنازہ ہوئی، جنازہ میں بہت ہجوم تھا سید علوی مالکی کے بعد یہ دوسرا جنازہ تھا جو حرم سے جنت المعلیٰ تک ذکر بالجہر کرتا ہوا گیا، ۹:۴۵ بجے معلیٰ اپنے احاطہ میں پہنچے حکیم نعیم کی قبر میں دفن کیا گیا، اسی میں شیخ الدلائل شیخ عبدالحق بھی مدفون ہیں۔

پیر کی شام کو محمد بنوری کے ولیمہ کی دعوت میں ان کے مکان پر گئے، منگل کی صبح کو دوبارہ مولانا بنوری کے اصرار پر ان کے مدرسہ جانا ہوا، پیر کی شام کو قاری طیب صاحب کا پیام ملا کہ پہلے سال یہیں ملاقات ہوئی تھی، ان کو دس بجے کا وقت دے دیا، مولانا بنوری کو جاتے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے قاری صاحب سے ملنا ہے صرف پون گھنٹہ ٹھہروں گا، پھر ناشتہ کیا پھر طلبہ دورہ حدیث کو بخاری شریف کی پہلی حدیث سن کر اجازت دی، حضرت قاضی عبدالقادر صاحب نے دعاء کرائی، وہاں سے فارغ ہوکر سوا نو بجے مکی مسجد آیا تاکہ قاری صاحب کو انتظار نہ کرنا پڑے مگر کسی بیوقوف نے میری طرف سے قاری صاحب کو یہ پیام دے دیا کہ میں آج مولانا بنوری کے یہاں جارہا ہوں ملاقات نہیں ہوسکتی۔

حاجی فریدالدین صاحب نے اس کی اطلاع دی، میں نے فوراً کہا کہ آپ قاری صاحب کو جاکر اطلاع کردیں کہ میں آپ کی وجہ سے مکی مسجد آگیا ہوں، قاری صاحب کی تو دعوت تھی مگر وہ دعوت سے پہلے مکی مسجد آگئے، آدھ گھنٹہ قیام کے بعد دعوت میں گئے، میں نے اپنی عادت کے موافق پھل وغیرہ بہت سے رکھوائے انہوں نے کہا کہ میری تو دعوت ہے، میں نے کہا کہ یہ میرا فریضہ تھا کھانے پر اصرار نہیں اپنے ساتھ اُٹھالیں مگر قاری صاحب نے اٹھانے سے انکار کردیا کراچی میں حسب معمول بہت سے مدارس والوں نے اپنے یہاں لے جانے پر اصرار کیا، مگر بندہ نے اپنی معذوری کی وجہ سے انکار کردیا، پیر کے دن عصر کی نماز مطار پر پڑھنی تجویز تھی مگر حاجی فرید نے کہا کہ رفقاء پہلے جائیں اور آپ نماز پڑھ کر میری گاڑی میں جائیں مطار پر پہنچ کر بہت راحت

سے فرسٹ کلاس میں بیٹھ گیا، مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ بلگرامی نے میرے چار ساتھیوں احمد بن مولانا اسعد مدنی، حبیب اللہ، حسان، سہیل بن ڈاکٹر اسماعیل چاروں کے ٹکٹ باوجود ساری کارروائی پہلے سے بکنگ ہونے کے کینسل کرا دیئے اور اپنے کسی آدمی کو جو اسی جہاز سے جانا چاہتے تھے دے دیئے۔

حاجی فرید صاحب طیارہ کے افسر کو ساتھ لے کر بلگرامی کے پاس آئے اس سے بحث و مباحثہ طویل ہوا اس نے کہہ دیا کہ لسٹ میں ان کا نام نہیں ہے، حاجی صاحب نے کہا کہ ان کا نام تو جدہ سے منظور ہوا ہے، اس ردوقدح میں جہاز کی روانگی میں بھی دس منٹ کی تاخیر ہوگئی بالآخر اس نے مانا نہیں اور یہ چاروں رہ گئے، دہلی کے مطار پر مولوی اسعد بھی احمد کو لینے پہنچے تھے مگر اس کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے سامان لے کر چلے گئے دوسرے دن احمد حبیب اللہ اور حسان کے ساتھ نظام الدین پہنچ گیا، مولوی اسعد نے سارے دن ٹیلیفون کرنا چاہا مگر لائن نہ ملی، سہیل تنہا کراچی رہ گیا اس کو براہ بمبئی نہیں جانے دیا اس لیے کہ اس کا دخول براہ دہلی تھا، اس لیے زکریا نے بھائی یوسف رنگ کو تار دیا کہ سہیل کو یحییٰ مدنی کے ہاتھ مدینہ منورہ واپس بھیج دو تنہا ہندوستان نہ بھیجو مگر ان کو تار نہیں پہنچا، چہارشنبہ کی شام کو وہ تنہا آیا زکریا کی روانگی از دہلی شنبہ کو طے تھی۔

چنانچہ حسب تجویز اپنی جماعت سے فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہوگیا اس سال غازی آباد میں چونکہ حاجی شفیع صاحب کے لڑکے نے گھڑی کی فیکٹری کھولی تھی اس لیے وہاں چائے بھی پی نفل بھی پڑھے اور میرٹھ کے لیے روانہ ہوگیا میرٹھ میں حاجی شفیع صاحب کے سابقہ کارخانہ میں بھی تھوڑی دیر قیام کیا لالہ جی تو تھے نہیں ان کے کارندے تھے اس نے اصرار کیا کہ اس کے اصرار پر ایک بوتل پی لی اس نے ٹیلیفون کیا کہ میں ابھی آتا ہوں مگر اس سے معذرت کر کے آگے چل دیئے۔

ننھے خان کے یہاں پہنچے ایک گھنٹہ وہاں قیام رہا زکریا نے بیعت کرائی، رفقاء نے ناشتہ کیا وہاں سے حضرت میرٹھی کے مزار پر ہوتے ہوئے دیوبند حاضری ہوئی، یہاں پہنچ کر بھائی کرامت کی گاڑی جس میں ہم آرہے تھے خراب ہوگئی، اطمینان سے مزار پر حاضری رہی تقریباً دو گھنٹے وہاں قیام رہا، دیوبند سے چل کر تلہیڑی تک پہنچے تھے کہ گاڑی میں آگ لگ گئی، اس لیے کے دیوبند کے مستری نے تار غلط جوڑ دیا تھا، بہت مشکل سے دوسری گاڑی میں منتقل ہوکر سہارن پور پہنچ کر زکریا حاجی نصیر کی کار میں آیا، بھائی کرامت اپنی گاڑی کو درست کرا کر کہ ایک مستری سہارنپور سے اور ایک دیوبند سے پہنچ گیا تھا، بعد میں سہارنپور پہنچے۔

سہارنپور کے قریب شیخ سعید کے کارخانہ میں زکریا اترا اور ان کا شکریہ مظلوم لڑکے کی حمایت میں ادا کیا، دو مٹھائی کے ڈبے پیش کیے، ایک ان کے لیے ایک ان کے بھائی کے لیے جو دہلی سے

ساتھ تھے، ابوالحسن دلی سے میرے ساتھ تھا، عافیت کے ساتھ ظہر کی نماز کے قریب سہارنپور پہنچ گئے، مگر تکان اور وقت کی قلت کی وجہ سے ظہر گھر پر ہی پڑھی خصوصی مصافحے ہوتے رہے۔

عصر سے ایک گھنٹہ پہلے ناظم صاحب سے ملتے ہوئے دار الطلبہ جدید پہنچ گئے وہاں عام مصافحوں کا اعلان صبح سے کردیا گیا تھا، اول عصر کے بعد مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی نے دعاء کرائی اس کے بعد مصافحے ہوتے رہے، قبیل مغرب فارغ ہوکر کچے گھر میں آئے، وہاں پیشاب وضو وغیرہ سے فارغ ہوکر مدرسہ قدیم کی مسجد میں آ گئے۔

اس مرتبہ جاتے ہی یہ قانون بنا دیا تھا کہ مغرب سے عشاء تک کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی آجائے تو اطلاع نہ کی جائے اس کے باوجود دوسرے دن مولانا اسعد صاحب مع اپنی والدہ محترمہ کے آئے تو اپنا نظام تغیر کرنا پڑا دوسرے دن اپنی فجر پڑھ کر گنگوہ کے لیے روانہ ہوئے، صوفی رشید گنگوہی نے بہت حلفیہ اطلاع دی تھی کہ میں آج ہی راستہ دیکھ کر آیا ہوں کہ راستہ صاف ہے معلوم ہوا کہ جھوٹ بولا، مزار تک راستہ خراب تھا کہ لکھنوئی والی سڑک پر اتنا پانی بھرا تھا کہ نہ میری کار جا سکتی تھی نہ کسی اور کی دونوں کاروں کو چھوڑ کر جونگوں میں بڑی مشکل سے مزار تک پہنچے، کاروں کو حکیم نہو کے گھر بھیج دیا۔

مزار سے دس بجے اُٹھ کر حکیم نہو کے یہاں ایک گھنٹہ ٹھہر کر دونوں خانقاہوں قدوسیہ اور سعیدیہ میں حاضری دیتے ہوئے قاری شریف کی اس غلط روایت پر کہ شہر کا سیدھا راستہ خطرناک ہے گھر کے راستہ سے لے گیا، ایک گھنٹہ اپنے یہاں خلافِ وعدہ ٹھہرایا آم وغیرہ کا اس نے انتظام کررکھا تھا، وہاں سے مولوی ایوب کے یہاں پہنچے چونکہ ان کی اہلیہ دہلی میں تھیں اور وہاں ملاقات ہوچکی تھی اس لیے مولوی ایوب بھی صوفی جی کے یہاں پہنچ گئے، صوفی جی نے جاتے ہی کھانے سے فارغ کردیا، مگر حسبِ دستور سابق کھانے کے بعد مستورات کی جھاڑ پھونک ہوتی رہی۔

ظہر کے بعد قاری شریف کے مدرسہ میں مفتی محمود صاحب نے مشکوۃ شریف ختم کرائی مولانا عبدالحفیظ صاحب مکی نے دعاء کرائی مولانا انعام صاحب اس لیے ساتھ دہلی سے نہ آسکے کہ ان کو شاملی کے قریب کسی اجتماع میں جانا تھا۔

گنگوہ سے روانگی کے بعد شاہ نور کی مسجد میں جانے کا خیال تھا مگر سہارنپور کے قریب شدید بارش تھی کہ میری کار تو اسلامیہ اسکول پر نہ جاسکی چکر کاٹ کر شاخ پر آ گئی مگر دونوں جونگے اسکول پر پہنچ گئے دوسرے دن حسبِ تجویز اپنی نماز پڑھ کر ۵ بجے رائے پور روانہ ہوئے ۶ بجے مزار پر پہنچ گئے، ۸ بجے وہاں سے سہارنپور کے لیے روانہ ہوئے، مگر مولانا ابرار صاحب ہردوئی والے کی کار کو باغ کے مدرسہ والوں نے روک لیا کہ ان سے امتحان لینے کا وعدہ تھا۔

راستہ پر شاہ زاہد حسین صاحب کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے راستہ میں ریڑھی کے مدرسہ میں بھی جانے کا خیال تھا مگر رائپور میں معلوم ہوا کہ مولوی حشمت کو ریڑھی والوں نے الگ کر دیا۔ اس لیے وہاں جانا ملتوی کر دیا اور عافیت کے ساتھ دس بجے سہارنپور پہنچ گیا رائے پور میں ۴، ۵ بچوں کا ختم قرآن مجید بھی کرایا۔

۹ شعبان ۹۷ء مطابق ۲۷ جولائی ۷۷ھ میں جب عصر کا وضو کر کے نماز کے لیے گھر سے نکل رہا تھا کہ عزیز مولوی سالم دیوبندی، مولوی نصیر، مولوی معراج وغیرہ کی کار پہنچی۔ مسجد میں مولوی سالم کا پیام پہنچا کہ چند منٹ ضروری بات کرنی ہے نماز کے بعد مسجد ہی میں بیٹھ کر آدھ گھنٹہ تخلیہ میں بات ہوئی۔ جس میں انہوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اس رسالہ کا ذکر کیا۔ جس میں حضرت گنگوہی، حضرت نانوتوی، حضرت مدنی اور تبلیغ والوں کو خوب لتاڑا تھا، انہوں نے کہا کہ حضرات دیوبند کا خیال اس کا جواب لکھوا کر اور جملہ مدارس کے اکابر سے دستخط کرا کر شائع کرانے کا ہے۔ میں نے بھی اس کی تائید کی اور کہا کہ بہت ضروری ہے انہوں نے کہا کہ قاری طیب صاحب کی آمد کے بعد اس کی تکمیل ہوگی، جو پاکستان کے سفر پر گئے ہوئے تھے، میں نے کہا کہ مسودہ کل کو مفتی محمود کے ہاتھ بھیج دیں مگر میرے قیام ہندوستان میں وہ نہیں پہنچ سکا۔

۱۰ شعبان ۲۸ جولائی کو مسلسلات اور بخاری کا ختم کرایا۔

۱۲ شعبان ۳۰ جولائی عزیز زبیر دوسری آنکھ کے آپریشن کے لیے ہسپتال میں داخل ہوا۔ بار کی صبح کو آپریشن ہوا۔

عزیزم مولوی حبیب اللہ ۲۷ جولائی ۹ شعبان کو اعجاز کے ساتھ سہارنپور لینے آیا ہوا تھا گھر گیا۔

۱۲ شعبان ۲۳ جولائی اپنے سسرال گئے اور ۱۳ شعبان کی شام کو رخصتی ہوئی۔

۱۲ شعبان کو شمیم نیرانوی کے قلم سے خوش خط اعلان مدرسہ کے بورڈ پر لگوا دیا۔

۱۔ جو احباب مسلسلات میں شرکت کے لیے آتے ہیں مگر اس میں شریک نہیں ہوتے سند وغیرہ کے لکھواتے میں مشغول رہتے ہیں بغیر پڑھے اجازت یا سند کوئی معتبر نہیں میری طرف سے ایسے لوگوں کو اجازت نہیں۔

۲۔ جو حضرات کسی بھی مدرسہ کی اسٹرائیک میں شریک ہو چکے ہوں ان کو نہ میری طرف سے اجازت حدیث ہے نہ اجازت بیعت اور جو بیعت کے بعد اسٹرائیک میں شریک ہوئے ہوں ان کی بیعت بھی منسوخ ہے ہندوستان میں مشائخ حقہ کی کمی نہیں جدھر چاہیں رجوع کر لیں میری طرف سے اجازت ہے۔

اس سال ۹۷ھ رمضان کا ہجوم بہت پہلے سے بڑھ رہا تھا مدرسہ قدیم میں جگہ نہیں رہی تھی اس

لیے ۲۸ شعبان ہی کو دارِجدید میں منتقل ہوگیا۔ رویت عامہ منگل کی شام کو ہوکر بدھ کو یکم رمضان ہندی شمار ہوا۔ اور حجاز میں یکم رمضان دوشنبہ کو ہوا۔

دارِجدید میں حسبِ دستور تین قرآن ہوئے پہلا اور تیسرا سلیمان کا دوسرا خالد کا، دار الطلبہ قدیم میں مختار حفید ناظم صاحب نے بھی تین قرآن پڑھے۔ جامع مسجد میں قاری گورا، مدرسہ قدیم میں محمد افریقی نے طلحہ نے حسبِ دستور مولوی نصیر کی ٹال میں سنائے۔ دیوبند میں حضرت مدنی کی مسجد میں عزیز مولوی ارشد نے اور دار العلوم کی مسجد میں مولوی سالم نے قرآن سنایا۔ قاری طیب صاحب نے بمبئی میں رمضان گزارا۔

نظام الدین میں مسجد میں مولوی یعقوب نے اور مولانا انعام صاحب نے گھر میں پڑھا اس سال رمضان میں خصوصی لوگ قاضی عبدالقادر صاحب، عبدالحفیظ، عبدالوحید مکیان حاجی عبدالعلیم مع مراد آبادی حضرات جو بدلتے رہے، عزیزم مولوی رشید الدین حسبِ دستور سابق، ڈاکٹر اسماعیل، حافظ عبدالستار صاحب، مولوی یوسف تلی متعدد رفقاء افریقہ کے ساتھ، مولوی یوسف متالا و مولوی ہاشم لندنیان، مولوی فقیر محمد انڈمانی مع خدام مستورات، اس سال مدینہ منورہ میں زکریا کے حجرہ کے برابر والے حجرہ کے مہمانوں کی وجہ سے بجلی کے تار میں آگ لگی۔ عطاء الرحمٰن نے بہت کوشش جلد آگ بجھوادی۔

۲۷ رمضان کو قاضی صاحب عید پڑھانے کے لیے پاکستان تشریف لے گئے اور اسی رات پہلوان ابراہیم لائل پوری سہارنپور پہنچا۔

دار الطلبہ جدید میں عید کی نماز سلمان نے پڑھائی اور دار الطلبہ قدیم قاری نسیم نے۔

۲ شوال کو مولوی اسعد مع چند خلفاء حضرت مدنی تشریف لائے۔ ابوالحسن نے چائے اور لوازمات فوراً کردیئے۔

اس سال حاجی شاہ صاحب کا عرس دھوم دھام سے کیا گیا۔ اشتہار بازی ہوئی اور قوالی بھی اور نہ معلوم کیا کیا خرافات۔

۲ شوال مطابق ۷ استمبر آج شب میں بھٹو دوبارہ مع اپنی جماعت کے گرفتار ہوا۔

۷ شوال کو رائے پور مزار پر حاضری ہوئی۔ مفتی عبدالعزیز کے مدرسہ میں قصبہ میں بھی گئے۔ محمد کاندھلوی نے دعاء کرائی۔ اس کے بعد مزار پور گئے وہاں جدید مدرسہ کی بنیاد رکھی کہ پہلا مدرسہ بہت تنگ ہوگیا تھا۔ واپسی میں شاہ صاحب کے مزار پر ٹھہرتے ہوئے سہارنپور آگئے۔

حاجی نصیر علی گڑھی کے لڑکے پرویز کا نکاح مولوی انعام کی آمد پر ۶ شوال کو تجویز تھا مگر مولانا انعام صاحب کی عدم آمد کی وجہ سے اس دن ملتوی ہوگیا تھا اور ۱۰ شوال کو نکاح ہوگیا۔

اب کے رمضان میں حضرت خواجہ صاحب کلیری صابر کا سلام و پیام پہنچا تھا۔اس کی شرم میں شروع شوال میں کلیر حاضری ہوئی۔

اس کے بعد گنگوہ حاضری ہوئی، وہیں مولوی عبدالمالک کے لڑکے مظفر کا نکاح قاری شریف کی لڑکی سے ہوا۔حکیم نہو نے مہرِ فاطمی پر نکاح پڑھایا۔ان سفروں کی تفاصیل روزنامچہ میں ہے۔

۲۳ شوال ۹۷ھ کی رات کو حافظ فرقان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔

۲۴ شوال مطابق ۱۹ اکتوبر کو مفتی محمود صاحب افریقہ کے لیے روانہ ہوئے۔

......☆☆☆☆☆......

واپسی از ہند

ذیقعد ۹۷ھ مطابق اکتوبر ۷۷ء

۱۷ اکتوبر کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر زکریا سہارنپور سے چلا اور متفرق کاریں آگے پیچھے چلتی رہیں نانوتہ پہنچ کر زکریا تو کار میں رہا اور رفقاء حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے مزار پر گئے اس سال مزار پر چاردیواری مسقّف بن گئی وہاں سے واپسی سے تھانہ بھون مولانا ظہور الحسن صاحب کے مکان پر ان سے مل کر ان کو فالج پڑا ہوا تھا، پھر بیریوں میں حافظ ضامن صاحب اور حضرت تھانوی کے مزار پر حاضری کے بعد جھنجانہ ظہر سے پہلے پہنچے اس سال راستہ میں کاریں خراب ہوتی رہیں۔ جھنجانہ ظہر کی نماز پڑھ کر کار میں بیٹھ کر آدھ گھنٹہ مصافحے ہوئے وہاں سے چل کر سیدھ کاندھلہ عیدگاہ پہنچے زکریا تو عیدگاہ پر رہا رفقاء سب نے قصبہ میں آکر صوفی جی کے یہاں کھانا کھایا پھر لوگ عیدگاہ واپس آگئے اور کچھ قصبہ میں ٹھہرے رہے زکریا عصر پڑھ کر مکان آیا اور مغرب کے بعد مصافحوں کا انتظام کیا گیا تھا مگر قابو میں نہیں آیا اس لیے ملتوی کردیا عشاء کے بعد زکریا حسبِ دستور اپنے چبوترہ پر اور بقیہ لوگ دوسرے مقامات پر ٹھہرے۔

۱۸ منگل کی صبح کو چائے کے بعد کار میں بیٹھ کر مصافحے ہوئے پھر کیرانہ کے اڈہ پر بھی آدھ گھنٹہ مصافحے ہوئے اور وہاں سے پانی پت کے مزارات پر حاضر ہوتے ہوئے زکریا نے اعلان کردیا تھا کہ میں تو براس نہیں جاسکوں گا جس کا جی چاہے ہو کر آئے میں سیدھا سرہند جاؤں گا اور ظہر کے بعد ایک گھنٹہ بعد سرہند پہنچ گیا دورانِ سر اس سفر میں خوب رہا سرہند پہنچ کر تاخیر سے اپنی ظہر پڑھی۔

سجادہ صاحب اس سال وہیں تھے خبر سنتے ہی میرے مکان پر جو گزشتہ سال والا ابوالحسن نے اترتے ہی انتخاب کرلیا تھا آگئے اور بہت اعزاز و اکرام سے پیش آئے ہر چند زکریا ان کو اصرار کرتا رہا کہ آپ تشریف لے جائیں۔ مگر نہیں مانے عصر مسجد میں پڑھی اور مغرب تک مصافحے ہوئے مغرب کے بعد اپنے مستقر پر جاکر کیواڑ بند کرلیے، ہجوم بہت زیادہ رہا عشاء کے بعد سجادہ صاحب کی برکت سے مزار مقدس کے کیواڑ کھل گئے اور ان کی نگرانی میں ہجوم نہ ہوسکا اور زکریا اپنے چند رفقاء کے ساتھ گیا زکریا تو دو گھنٹے باہر کے حصہ میں بیٹھ کر آگیا۔ بقیہ رفقاء اندر بیٹھے رہے۔ دو گھنٹے کے بعد اپنے مستقر پر آیا تھوڑی دیر بعد مولوی احسان، قاضی محمود، زبیر سیدھے کار

میں ۱۸ اکتوبر کو مغرب کے بعد سہارنپور سے چلے اور سیدھے سرہند پہنچے کہ ان کا ویزا کاندھلہ سرہند کا نہیں تھا۔

وہاں پہنچتے ہی ان کو بھی حجرہ شریف میں بھیج دیا اور ان کے حجرہ میں جاتے ہی پولیس کے آدمی تحقیقات کے لیے پہنچ گئے۔ ان سے کہہ دیا کہ یہاں تو کوئی پاکستانی نہیں ہے، وہ باہر تحقیقات کرتے رہے۔

۱۹ کی صبح کو اپنی نماز پڑھ کر زکریا ابوالحسن وغیرہ اپنی کار میں بورڈ پر چلے گئے۔

مگر رات میں بھائی کرامت کے بھائی کا ٹیلیفون پہنچا کہ مولوی انعام صاحب ریل سے امرتسر آرہے ہیں اس لیے اسی وقت محمد کاندھلوی ایک دو کاروں کو ساتھ لے کر امرتسر اسٹیشن پر پہنچ گیا۔

سرہند کے قیام میں مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے انتقال کا حال ٹیلیفون سے معلوم ہوا۔ بورڈ پر پہنچ کر یہ خیال ہوا کہ مولوی انعام صاحب کا باہر ہی انتظار کیا جائے مگر اتنا ہجوم ہوگیا کہ بورڈ والوں نے کہا کہ آپ اپنی کار لے کر اندر چلے جائیں۔ جب مولانا انعام صاحب کی کار پہنچ گئی تو زکریا نے ان سے کہلایا کہ میں اور آپ اپنی اپنی کاروں سے نہ اتریں، رائے ونڈ میں ملاقات ہوگی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ رائے ونڈ پہنچ کر چونکہ مولانا انعام صاحب کی طبیعت زیادہ خراب تھی، اس لیے ان کو حجرہ میں ٹھہرا دیا اور منع کر دیا کہ کوئی اندر نہ جائے، نہ مصافحہ نہ دعاء۔ بھائی غلام دستگیر کو ان کے کمرہ کا پہرہ دار بنا دیا۔ زکریا عصر کے بعد اپنے حجرہ سے باہر نکل کر بیعت مصافحہ وغیرہ کرتا اور عشاء کے بعد جب مولوی محمد عمر کی تقریر قریب الختم ہوتی تو جلسہ گاہ میں پہنچ جاتا اور دعاء کے بعد تشکیل سے پہلے اپنے حجرہ میں واپس آجاتا۔ اس سفر میں سلمان شاہد بھی تھے۔ سلمان کی تو کئی ماہ سے کوشش ہو رہی تھی کہ ماموں شعیب اپنے بینک والے روپے میں اپنا اور اس کا نام لکھ گئے تھے، اس لیے روپے نکالنے کے لیے سلمان کی ضرورت تھی۔ کئی ماہ سے حاجی صاحب کوشش کر رہے تھے اور زکریا کی سہارنپور سے روانگی سے ایک دو روز پہلے اس کو ویزا ملا تھا، مگر خالد نے چپکے چپکے اپنا ویزا وغیرہ بنالیا تھا۔ عین وقت پر معلوم ہوا کہ وہ بھی جا رہا ہے، مگر ان لوگوں کو صرف لاہور کا ویزا تھا، نہ ایبٹ آباد کا نہ کراچی کا۔

۲۶ اکتوبر کو لاہور سے ہم سب کراچی روانہ ہوئے، سلمان خالد لاہور ہی میں ٹھہر گئے کہ ان کے پاس کراچی کا ویزا نہیں تھا۔ ماموں داؤد مرحوم ان کی وجہ سے لاہور ٹھہر گئے۔ مگر خالد کو لاہور میں بخار وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوگیا، جس کی وجہ سے سب پریشان ہوگئے۔ بڑی مشکل سے ایبٹ آباد کا ویزا ملا۔ ہماری روانگی کے بعد شاہد بھی کراچی سے لاہور ان کے پاس ہی آگیا اور پھر ان کے ساتھ

ایبٹ آباد جا کر ۸ نومبر کو سہارنپور واپس آیا۔ کراچی کے قیام میں اول مولانا بنوری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے مزار پر حاضری ہوئی اور بہت جی لگا، تقریباً دو گھنٹے قیام رہا۔ لوگوں نے تو بہت کچھ دیکھا، مگر زکریا کو کچھ نظر نہیں آیا۔

محمد بنوری سے کہہ دیا تھا کہ کھانا بھی رات کو تیرے یہاں کھاؤں گا اور اسی وقت مستورات سے ملوں گا۔ رات کو مولانا مرحوم کے مدرسہ کے متعلق شوریٰ ہوتے رہے۔ کراچی میں حاجی فرید الدین صاحب نے ابوالحسن سے کہا کہ تو شیخ کو یہیں سے چلتا کر دے گا؟ ابوالحسن نے کہا کہ ویزا آپ دے دیجئے۔ حاجی فرید صاحب نے کہا ڈالر تو دے دے، ویزا میں دے دوں گا۔ مولوی یوسف تتلی جو سہارنپور سے ساتھ تھے، انہوں نے کہا کہ ڈالر میں دے دوں گا۔ حاجی صاحب ڈالر لے کر ویزا کی کوشش کی۔ چنانچہ ویزا مل گیا اور ابوالحسن اپنی گھر والی کو سسرال والوں کے ساتھ چھوڑ کر جدہ روانہ ہو گیا۔

۳۰ اکتوبر کو کراچی سے ۱۰:۳۰ بجے پاکی وقت سے چلے اور جدہ کے وقت سے ۱۲:۳۰ بجے پہنچے چونکہ طلوع و غروب کا فرق ہے۔ اسی لیے راستے کے اوقات میں تغیر ہوا۔ جدہ پہنچ کر دو شب و روز شجاع کے مکان پر ٹھہرے، اس لیے عزیز شمیم نے رمضان ہی میں تقاضے کیے تھے کہ اس سال سیدھے مدینہ نہ جانا کہ والدہ بہت اصرار کر رہی ہیں۔ مگر زکریا نے کہہ دیا تھا کہ اس ہجوم میں مکہ جانا میرے بس کا نہیں، اس لیے شمیم ماموں یامین وغیرہ جدہ ہی رہے۔

یکم نومبر منگل کو زکریا مدینہ کے لیے روانہ ہوا اور اس کے تھوڑی دیر بعد مولانا انعام صاحب مکہ کے لیے بدر میں ٹھہرتے ہوئے عصر کی نماز کے بعد مسجد نور پہنچے۔ حبیب اللہ اسماعیل بھی جدہ سے ساتھ تھے چونکہ مدرسہ شرعیہ پہنچنا ہجوم کی وجہ سے ممکن نہیں تھا، اس لیے رات کو ۳:۳۰ بجے مدرسہ پہنچے۔

مولوی انعام صاحب ۲ بجے جدہ سے چل کر سعدی کے مکان پر اس کے اہل و عیال سے ملتے ہوئے صولتیہ پہنچے اور اسی وقت پیشاب وضو سے فارغ ہو کر حرم گئے اور عمرہ کیا طواف پاؤں کیا اور سعی گاڑی پر۔ مولانا انعام صاحب کا مکہ میں نظام یہ رہا عربی ۵:۳۰ بجے مسجد حفائر سے حرم جاتے۔ ظہر کی نماز پڑھ کر صولتیہ، وہاں کھانا کھا کر دیوان میں آرام کرتے۔ بعد عصر خصوصی ملاقات کرتے سوا گیارہ بجے اٹھ کر پیشاب وضو کر کے حرم جاتے۔ مغرب سے عشاء تک بیٹھ کر نوافل پڑھتے۔ بعد عشاء حرم سے سیدھے حفائر جاتے اور اگلے دن ۵ بجے تک وہیں قیام رہتا اور تبلیغ کے مشورے ہوتے۔

قاضی صاحب کے ویزا میں کچھ گڑبڑ ہوئی جس کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہ آ سکے اور ۲ نومبر کو

کراچی سے جدہ پہنچے۔اقبال خلجی کے یہاں قیام رہا۔۳ نومبر کو عربی ۴ بجے جدہ سے مکہ گئے۔۶ نومبر کو طیارہ سے مدینہ طیبہ تشریف لے آئے۔

ایامِ حج میں ہجوم بقیع تک پہنچا ہوا ہے۔اس لیے مدرسہ شرعیہ کی چھت پر ہی نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔عشاء کی نماز کے دو گھنٹے بعد مخصوص دوستوں کے ساتھ مسجد سے مواجہہ شریف کی سمت میں چند دن حاضری ہوتی رہی پھر مصلی الجنائز میں اقدام عالیہ کی طرف حاضری ہوتی ہے۔عزیز عبدالحفیظ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ وہ اپنے مکاشفات سناتا رہتا ہے،جس سے جی خوش ہوتا ہے۔روزانہ کی مصروفیات کی تو نقل کی ضرورت نہیں۔البتہ ۴ نومبر کی شب کا مکاشفہ عزیز عبدالحفیظ نے سنایا کہ تو مجلس میں حاضر ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذرا اونچی جگہ پر تشریف فرما ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے متعدد کتب ایسی خوشنما جلد کی رکھی ہیں کہ نگاہ بھی نہ جمے۔ان میں سب سے اوپر فضائلِ حج،پھر فضائلِ درود،پھر حکایا صحابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے نیچے دوسری کتب،اسی میں تھوڑی دیر میں مولانا بنوری نہایت خوش پوشاک ہنستے ہوئے تشریف لائے۔سر پر ان کے پشاوری عمامہ گول سا بندھا ہوا۔ان کو آنے پر تو اٹھا اور معانقہ کیا،مولانا نہایت خوش ہیں،تو نے پوچھا کہ کیا گزری؟ انہوں نے حضور کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کی برکت سے بہت اچھی گزری۔تو نے کہا کہ آپ کی برکتیں تو سب پر ہیں۔

حضور تم دونوں کی گفتگو سن رہے ہیں اور تبسم فرما رہے ہیں۔ چند روز کے بعد اس نے دوسرا مکاشفہ بیان کیا کہ تو کی مجلس میں بیٹھا ہوا ہے۔حضور کی طرف سے کچھ عطایا ہو رہے ہیں اور تو کچھ کھا رہا ہے۔اسی دوران میں ابوالحسن تجھے کوئی دوا پلانے کے لیے آیا اور تجھے وہ دوا دی تو نے پی لی۔حضور نے اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:''اکرمک اللّٰہ تعالیٰ کما اکرمتنی باکرامک ھذا'' ہذا میں تیری طرف اشارہ تھا۔اللہ جل شانہ عزیز مولانا عبدالحفیظ صاحب کو بہت بلند درجات عطاء فرمائے کہ ان کی برکات سے مبشرات بہت سننے میں آتے ہیں۔

۴ نومبر ۷۷ھ جمعہ کو مولوی اکبر علی سہارنپوری کا کراچی میں انتقال ہوا۔

۲۸ ذیقعد مطابق ۱۱ نومبر کو جمعہ کی نماز کے بعد ملک خالد کی طرف سے تمام مملکت میں دوشنبہ کو صلوۃ الاستسقاء کا اعلان کیا گیا۔کرنے والے نے بہت لمبی تقریر میں استسقاء کی اہمیت اور صدقہ و توبہ کی فضیلت بیان کی۔۱۴ نومبر پیر کے دن نمازِ استسقاء پڑھی گئی۔

۱۴ ذی الحجہ کو ٹیلیویژن وغیرہ پر اعلان ہوا کہ تاریخ بدل گئی اور اب حج بجائے ۲۰ نومبر کے ۱۹ نومبر کو ہوگا۔

ذی الحجہ کے پہلے ہفتہ میں جنوبی ہند حیدرآباد دکن، میسور، آندھرا پردیش میں طوفانی ہوا ایک ہفتہ تک بڑے زوروں پر رہی۔ سمندروں کی لہریں آسمان سے باتیں کرتی تھی، پانی اچھل کر آبادیوں پر آتا تھا۔ سمندر میں ہزاروں لاشیں مچھلی کی طرح تیر رہی تھیں۔ لاکھوں آدمی اور حیوانات ضائع ہوئے۔ اخبارات والے لکھتے ہیں کہ ایسا طوفان کبھی سننے میں نہیں آیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ آندھی کے ساتھ زلزلہ بھی تھا۔

۵ ذی الحجہ مطابق ۱۶ نومبر کو قاضی صاحب مع رفقاء کے طیارہ سے حج کے لیے روانہ ہوئے۔ ۵ ذی الحجہ کو مولوی اسعد لندن سے جدہ ہوتے ہوئے مدینہ طیبہ پہنچے۔ دوروز قیام کے بعد ۷ ذی الحجہ کو سیدھے منٰی گئے۔ پھر ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ کی درمیانی شب میں پھر مدینہ واپس آ گئے۔ سید حبیب صاحب نے مستقل ٹیکسی ساتھ کر دی تھی۔

۱۶ نومبر بدھ کو شب میں عزیز سعدی سلمہ کے گھر میں دوسرا لڑکا آپریشن سے پیدا ہوا۔

۱۸ نومبر کو سہارنپور میں حافظ فرقان پارچہ فروش کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ ۱۲ ذی الحجہ کی شب منٰی میں دو جگہ آگ لگی۔ ایک ملک صاحب کے خیمہ کے سامنے اور دوسری جگہ بھی۔

۲۴ نومبر کو پنڈی سے ٹیلیفون آیا کہ ۳ نومبر کو ملک دین محمد صاحب کا انتقال ہوگیا۔

۱۶ ذی الحجہ کو سعدی کا ٹیلیفون آیا کہ مکہ میں محلّہ جیاد میں قبل فجر سے آگ لگی ہوئی ہے بہت مشکل سے عصر کے وقت قابو پایا گیا۔

۲۰ ذی الحجہ کو مفتی محمود صاحب مع اپنے پانچ رفقاء افریقی کے پہنچے۔ فندق الحرمین میں قیام ہوا۔

۲۳ ذی الحجہ کو مولوی انعام صاحب مع رفقاء مکہ سے چلے، رابغ والوں سے پہلے وعدہ تھا۔ ایک شب وہاں قیام کیا۔ رات کو مولانا محمد عمر صاحب کا بیان ہوا۔ فجر کے بعد فوراً چلے بدر میں اول شہداء کی زیارت کی۔ پھر ناشتہ کر کے وہاں سے چلے اور ۵:۳۰ بجے مسجد نور۔ پہنچے زکریا نے مولانا انعام صاحب کو منع کر دیا تھا کہ میری ملاقات کو آنے کی ضرورت نہیں ہیں خود کل صبح کو آجاؤں گا مگر مولانا انعام صاحب ظہر سے پہلے ہی پہنچ گئے بعد ظہر مسجد نور گئے۔ زکریا منگل کی صبح مسجد نور گیا۔ صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا وہیں ہوا۔ خیال شام تک ٹھہرنے کا تھا، مگر لوگوں نے کہا ہجوم بہت ہو جاتا ہے، اس لیے ظہر کے بعد کھانا کھا کر چلے آئے۔

۲۴ ذی الحجہ مطابق ۵ دسمبر ماموں داؤ دکا لڑکا احمد مولوی غلام رسول کے ساتھ آیا، اہلیہ بھی ساتھ تھی، اس کو ہوٹل میں ٹھہرایا اور عشاء کے بعد کا کھانا میرے ساتھ کھایا، ماموں داؤ د اور ماموں یامین کے خطوط ساتھ لایا تھا، اس سے یہ طے ہوا کہ کھانا ہمارے ساتھ کھایا کرے اور ناشتہ دان میں اہلیہ کا کھانا لے جایا کرے، دس دن کے بعد مکہ واپس گیا اور بہت رطب اللسان، زکریا چونکہ بیمار تھا اور

کئی ڈاکٹروں کا علاج چل رہا تھا، مگر دسویں شب میں ڈاکٹروں نے خود اس کو شریک کرلیا۔

اس سال زکریا کی طبیعت شروع ہی سے خراب تھی، ۴ محرم ۹۸ھ کو مکہ میں زبردست بارش ظہر کے وقت ہوئی، شمیم کے خط سے معلوم ہوا کہ اے موٹریں بہہ گئیں، حرم کے تہہ خانوں میں پانی بھر گیا، جدہ، ریاض، مدینہ تینوں مطار کئی گھنٹے بند رہے، ۶:۳۰ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک زور سے بارش ہوتی رہی۔

۶ محرم کو حکیم اسرائیل پہنچے، انہوں نے کہا کہ کئی دن سے کوشش کر رہا تھا، ابھی سعدی نے ٹیلیفون سے بتایا یہ ایک دوست کی گاڑی جارہی ہے، جانا چاہو تو فوراً چلے جاؤ، سب سامان چھوڑ کر فوراً چلا آیا۔

۶ محرم ۹۸ھ مطابق ۱۶ دسمبر ۷۷ء کو سہارنپور میں عزیز زبیر کے لڑکا پیدا ہوا۔

۲۲ دسمبر کو مفتی محمود گنگوہی بار ادہ لندن مولوی یوسف متالا کے کئی سال کے اصرار پر روانہ ہوئے، ۲۷ کی شام کو ۸:۳۰ بجے لندن پہنچے اور فوراً دار العلوم کے لیے روانہ ہوئے، ان کے اس قیام کے دوران میں علمی مذاکرے رہے، متفرق مقامات پر مواعظ بھی ہوئے اور مولوی یوسف وغیرہ کے اصرار پر آنکھ بنی تجویز ہوگئی اور ۵ جنوری ۷۸ء کو ہسپتال میں داخل ہوگئے، ۶ کو آپریشن ہوا، ۱۱ جنوری کو ہسپتال سے واپس آکر ۱۶ فروری کو لندن سے سیدھے کلکتہ گئے کہ آنکھ قابو میں نہیں آئی۔

۲۸ دسمبر کو سفیر عراق اسلامیہ اسکول سہارنپور کی دعوت پر گیا، اسلامیہ اسکول پر اعتراض تھا کہ نام تو اسلامیہ اسکول اور عربی پڑھائی نہیں جاتی، ان لوگوں نے مظاہر علوم کا ذکر کیا، عصر کے وقت مظاہر علوم پہنچے، قاری مظفر تو سفر میں تھے، مولوی یونس، مولوی محمد اللہ وغیرہ نے مدرسہ دکھایا، تعلیم کا وقت تو نہیں تھا، عمارت دیکھ کر چلا آیا۔

۲۴ تا ۲۶ دسمبر الہ آباد میں اجتماع ہوا، جس میں مولوی عبید اللہ کی طلب پر طلحہ اور شاہد بھی گئے، آخری تقریر شاہد کی ہوئی، دو ہفتہ کا یہ سفر رہا جس میں مختلف جگہوں کا دورہ ہوا۔

۳ جنوری ۷۸ء کو مولانا انعام صاحب مدینہ سے روانہ ہوئے، صبح کی نماز سے پہلے سامان رکھ کر نماز کے بعد فوراً روانہ ہوگئے، ۸ بجے مکہ پہنچے، حفائر میں قیام رہا۔

زکریا کا ارادہ مولانا انعام صاحب کے ساتھ جانے کا تھا، مگر ایک تو دائیں ہاتھ میں درد چل رہا تھا، دوسرے علی میاں کے کئی خط آئے کہ مجھے تجھ سے ضروری باتیں کرنی ہیں، اس لیے انتظار کیا، ۲ جنوری کی شب میں مدینہ پہنچے، علی میاں اور قاضی صاحب کے ساتھ ۷ جنوری کو زکریا بھی مکہ چلا گیا، ۱۶ جنوری کو مولانا انعام صاحب کراچی کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۸ کو کراچی سے دہلی زبیر

اپنے اصرار سے ٹھہر گیا اور ساتھ ہی مدینہ واپس آ گیا۔ زکریا مکہ سے ۱۷ جنوری کی صبح کو مدینہ واپس آ گیا۔

۹ جنوری ۷۸ء کو فرقان پارچہ فروش کا دوسرا نکاح سہارنپور میں ہو گیا۔

۱۰ جنوری، آج حکیم اسرائیل کا جہاز جدہ سے چلا اور ۹ کی شام کو بمبئی پہنچا۔

۱۳ جنوری آج کاندھلہ کی عیدگاہ جمعہ کی نماز ہوئی، فقیروں نے تو لکھا کہ ہمارے خلاف تقریر ہوئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ تجدید عیدگاہ کے لیے تقریر ہوئی، مخصوص حضرات کو ایک ایک ہزار کا ذمہ دار بنادیا اور ایک لاکھ کی اپیل کی گئی۔

۲۶ جنوری کو ابوالحسن مدینہ سے مکہ ہوتے ہوئے کراچی روانہ ہوئے۔

۵ فروری کی شب میں روضۂ مقدس کے اندر کے حصہ کی چہاردیواری کی اصلاح کی گئی، مٹی نکال کر سنگِ مرمر لگایا گیا، تعمیر رات میں کواڑ بند ہونے کے بعد ہوتی تھی اور ملبہ صبح باہر نکالا جاتا تھا اور کسی باغ میں کنویں میں دفن کیا جاتا تھا۔

۵ فروری آج سے سعودی عرب کے مدارس میں دو ہفتہ کی چھٹی پہلی دفعہ ہوئی، کہتے ہیں یہ موسم بہار کی چھٹی ہوئی ہے۔

۲۵ فروری آج زبیر مولوی عبدالحفیظ کے ساتھ مکہ برائے ہند روانہ ہوا، عزیز عبدالحفیظ نے دہلی پہنچانے کا وعدہ کرلیا تھا، ۲۸ فروری کو دہلی پہنچا۔

۳ مارچ کو جمعہ کی نماز کے بعد ماموں داؤد کو قلب کا دورہ پڑا اور اتوار کی صبح کو ۸:۳۰ بجے دوبارہ شدید دورہ پڑا اور اسی میں انتقال فرما گئے، عصر کے بعد تدفین عمل میں آئی۔

۱۰ مارچ آج مولانا انعام صاحب کی دہلی سے گودھرا کے لیے روانگی ہوئی، گودھرا کا اجتماع بہت معرکۃ الآراء ہوا، لاکھوں کا مجمع تھا، بہت مبشرات بھی نظر آئے، پولیس اور غیر مسلم حیران تھے کہ کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔

۱۴ مارچ کی شب میں بھائی عبدالوہاب کے والد کا انتقال لاہور کے ہسپتال میں ہوا، رائے ونڈ میں تجہیز و تکفین کے بعد اپنے وطن بورے والا میں تدفین ہوئی۔

۱۸ مارچ کو دہلی میں طوفانی بارش اور زلزلہ جس میں ۴۰، ۵۰ آدمی ہلاک ہوئے۔

۲۹ مارچ بدھ کی شب میں بابو اعجاز کاندھلوی کا گھنٹہ بھر کی قلبی بیماری کے بعد انتقال ہو گیا، ایک بجے دورہ پڑا سوا بجے شب میں انتقال ہو گیا۔

۲ اپریل کو ابوبکر بن بھائی عبدالکریم بمبئی کا نکاح محلّہ کی مسجد میں ہوا، مدینہ منورہ بھی ولیمہ کرایا گیا اور سہارنپور بھی۔

۲ تا ۱۳ اپریل کو ڈھڈیاں کا چودھواں جلسہ۔
۱۸ اپریل کو تہجد کے وقت نظام الدین میں والدہ محمد کاندھلوی کا انتقال ہوا، بعد ظہر تدفین عمل میں آئی، اس لیے کہ اس دن مولانا انعام صاحب ڈھاکہ سے اجتماع سے واپس آنے والے تھے۔
یکم تا ۱۳ اپریل اجتماع ڈھاکہ۔
۲۵ اپریل کو قاضی صاحب با ارادہ سفر پاکستان مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ رائے ونڈ کے پرانوں کے جوڑ کے بعد گھر تشریف لے گئے اور واپسی میں سرگودھا کے بعد کار لاری سے ٹکرا گئی، سب ساتھیوں ڈاکٹر اسلم وغیرہ کو چوٹیں آئیں، اولاً سرگودھا کے ہسپتال میں داخل ہوئے پھر لاہور منتقل ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے جان بچالی حادثہ بڑا سخت تھا۔
۲۶ اپریل کو بھائی مظہر علی راجپوری کا پشاور میں انتقال ہو گیا۔
۲۸ اپریل سے افغانستان میں سخت اضطراب، قتل وقتال ہوا، حکومت میں انقلابات آئے، روس نواز پارٹی غالب آ گئی، سابق صدر داؤد کو قتل کر دیا گیا اور اسلام پسندوں کے خلاف سخت کارروائی کی گئی۔
۵ مئی کی شب میں باب مجیدی کے سامنے سونے کی دکان میں چوری ہوئی، ۵۰ کلو سونا چوری ہو گیا، اس کے بعد چند سپاہیوں کی ڈیوٹی ۲۴ گھنٹے ان دکانوں کے سامنے لگ گئی، برابر کے ہوٹل میں ایک ایرانی ٹھہرا تھا، اس نے رات میں دیوار توڑ کر اندر ہی اندر چوری کر لی، دکاندار فوراً پاگل ہو گیا، کئی دن بعد اُردن کی سرحد پر چور پکڑا گیا۔
۷ مئی کو آج رات اہم رجسٹری اعتراضات کے جوابات کی بھیجی گئی اور متعدد خطوط ہندی کارڈ ان کو لکھے گئے کہ صرف اس کی رسید چاہیے، خط و کتابت بعد میں ہوتی رہے گی۔
۲۳ مئی کو شب میں مسجد خلیل جدہ میں چند مقیمین تھے، سب کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور ۶ بجے رات کو بھائی داؤد ساعاتی کو ان کے گھر سے معلوم ہوا کہ مکہ مدینہ میں بھی گرفتاریاں ہوئیں مگر تبلیغی نہیں، باوجود سعی بلیغ کے یہ نہیں پتہ چلا کہ گرفتاری کس وجہ سے ہوئی، یہ سنا گیا کہ اُوپر سے آرڈر آیا تھا، اصل گرفتاری سلفیوں کی ہے، دوسرے لوگ دھوکہ میں پکڑے گئے۔
۲۷ مئی شنبہ کی شب میں مولوی سعید خان ظہران سے سیدھے مدینہ طیارہ سے پہنچے، دن میں ان کی بھی تحقیقات ہوتی رہی، مگر گرفتاری نہیں ہوئی۔
۳۱ مئی جوہر آباد میں مولوی جلیل کی لڑکی کا چھت گر جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا اور دو برس کا جولڑ کا ساتھ تھا زندہ رہا۔
۴ جون کو مغرب کے وضو میں زکریا کے منہ سے بہت سا خون نکلا، جو نکسیر تو نہیں تھا سینہ سے گیا

تھا اور اس کا سلسلہ پھر چلتا ہی رہا، دائیں ہاتھ میں درد کا سلسلہ حج کے بعد سے چل رہا تھا مگر مالش وغیرہ سے کچھ افاقہ ہوجاتا ہے۔

۶ جون کو ابوالحسن کا تار ڈاکٹر اسماعیل کے نام آیا کہ میرا ٹکٹ فوراً بھیج دو، ۷ بجے کی صبح کو ٹیلکس کے ذریعہ بھیج دیا اور تار بھی کر دیا کہ فوراً آجاؤ، جس کی وجہ سے ہندوستان میں تشویش پیدا ہوئی، چند روز بعد بھائی شمیم کے پاس کرامت کا ٹیلیفون آیا کہ زکریا کی خیریت بتاؤ، شمیم نے کہہ دیا طبیعت اچھی ہے فکر کی بات نہیں ہے۔

یکم رجب کو حاجی یعقوب کو پرچہ لکھا کہ سہارنپور کا رمضان ملتوی ہو گیا، احباب کو اطلاع کر دیں اور خصوصی احباب کو تاکید کر دیں، رمضان اپنی اپنی جگہ کریں۔

۹ جون دو جمعے حجرہ میں پڑھنے کے بعد سب کی رائے سے مسجد جانا ہوا، مگر سایہ کی جگہ کہیں نہیں ملی، باب السلام کے سامنے مظلات (چھپر) میں جمعہ پڑھا، گرمی بہت سخت تھی، نماز کے بعد زکریا کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی، آتے ہی حجرہ میں پڑ گیا، ۱۴ جون اعجاز کی ہومیو پیتھک کی دوا شروع ہوئی، چند دن بعد گر جانے کی وجہ سے چونکہ دوسرا علاج شروع ہو گیا اس لیے یہ دوا چھوٹ گئی۔

۱۵ جون، آج ابوالحسن کا تار ڈاکٹر اسماعیل کے نام پہنچا کہ میں پیر کو آرہا ہوں، جدہ سے بھی سیٹ کا انتظام کر دو، انہوں نے اسی وقت بھائی خلجی کو ٹیلیفون کر دیا، چنانچہ رات کو بھائی اقبال خلجی ہی کے یہاں ٹھہرا۔

۲۰ جون کو طیارہ سے ابوالحسن جدہ سے مدینہ پہنچا، رات عشاء کے بعد طیارہ سے جدہ پہنچا تھا، ۱۹ جون کو جدہ پہنچا اور ۲۰ جون کی صبح کو مدینہ۔

۱۴ جون کی شب میں عبدالحفیظ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، صلاۃ وسلام کے بعد عرض کیا کہ حضرت بہت فکر مند ہیں کہ کس منہ سے سامنا ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انہ حبیبنا'' پھر فرمایا: ''انہ من حزبنا المفلحین الغر المحجلین۔''

پھر تھوڑی دیر کے بعد جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خوبصورت صندوقچہ ہے اس پر تہہ کیا ہوا خوبصورت عمامہ ہے، جس پر سفید رنگ کی کڑھائی ہوئی ہے جو بہت چمک دار ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت پیار سے اس کی تہہ کو کھولتے ہیں اور ہاتھ پھیرتے ہیں پھر اسی طرح تہہ فرما کر رکھ دیتے ہیں اور مسکرا کر فرمایا کہ یہ ان کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

۱۵ کی شب میں عبدالحفیظ نے دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جیسے چار زانو تشریف فرما ہیں اور جیسے مدرسہ شرعیہ کی طرف کوئی نورانی دروازہ کھلا ہے، جہاں حضرت شیخ چارپائی پر مضطرب نظر

آرہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف دیکھ کر فرمایا: ''انه مضطرب للقائنا و رؤيتنا و نحن في شوق اليه وحنين والأمر للّٰه تعالیٰ۔''

۱۶ جون چین اور پاکستان کے درمیان میں شاہراہ قراقرم جو عرصہ سے بن رہی تھی، اس کا افتتاح ہوا، افتتاح کی صورت یہ ہوئی کہ ایک لمبا فیتہ باندھا گیا، جس کو دونوں سربراہوں نے قینچی سے کاٹا اور دونوں کی کاریں ادھر سے اُدھر چلی گئیں۔

۱۷ جون آج اہلیہ مولانا بنوری مستقل طور سے کراچی سے سکھر چلی گئیں وجہ باوجود تحقیق کے معلوم نہ ہوسکی، زکریا نے تو دونوں فریق کو ڈانٹا کہ بہت نامناسب ہوا۔

۲۱ جون آج علی میاں بمبئی سے چل کر نصف شب میں جدہ پہنچے، دوسرے دن جمعرات کو مغرب سے پہلے جدہ سے بذریعہ طیارہ مدینہ پہنچے، قیام بستان نور دلی میں ہوا، زکریا نے عصر کے بعد سعید الرحمٰن سے کہلوادیا تھا (جو کئی دن پہلے سے قاہرہ سے مدینہ آگئے تھے) کہ کھانے میں انتظار ہوگا، اس لیے علی میاں بھی مدرسہ آگئے، کھانے کے بعد ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ ان کا اجتماع پیر سے شروع ہوگا، علی میاں نے کہا کہ اجتماع کے بعد تو مشکل ہوتا، دودن پہلے تم سے ملنے آگیا، بن باز بھی پہلے آگئے تھے اور مکہ وجدہ میں حکومت کی طرف سے گرفتاریاں عام ہورہی تھیں، جن میں ہمارے چند مبلغین حضرات بھی جدہ، مکہ، طائف سے گرفتار ہوئے، اس طرح کہ لوگوں کو بلاتے تھے کہ کام ہے اور حوالات میں کردیتے تھے باوجود تفتیش کے کچھ پتہ نہیں چلا۔

علی میاں نے بن باز سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تبلیغ والوں کو گرفتار کرنا مقصود نہیں، کوئی خاص شخص کسی جھوٹی شکایت سے گرفتار ہوگیا ہوگا، بہت ردوقدح اور خفیہ تفتیش کے بعد ۴۳ دن کے بعد چھوٹنے شروع ہوگئے، علی میاں ۳۰ جون کو مکہ گئے اور ۵ جولائی کو کراچی اس لیے کہ اس سال رابطہ کا اجتماع بجائے مکہ کے کراچی میں طے پایا تھا، اس میں قاری طیب، مولوی منظور نعمانی اور مولوی اسعد بھی شریک تھے، اجتماع کے دنوں میں یکجائی ہوٹل میں قیام کیا اور اجتماع کے بعد اپنی اپنی جگہ منتقل ہوگئے۔

۲۹ جون کو مفتی محمود کی آنکھ کا آپریشن دوبارہ کلکتہ میں ہوا، اس سے پہلے لندن میں ہوا تھا۔

۳۰ جون کو قاری طیب صاحب امریکا سے سیدھے دیوبند گئے اور ایک دن ٹھہر کر رابطہ کے اجتماع میں شریک ہونے کے لیے کراچی گئے۔

۵ جولائی، آج صبح کو عربی پونے تین بجے مولانا عبدالحفیظ صاحب کے مطبع کا افتتاح زکریا نے کیا اور پہلی کتاب جو مولانا کے مطبع میں چھپنی تجویز ہوئی وہ ''اسباب السعادہ'' ہے، پہلا ورق فالتو چھپوا کر سہارنپور طلحہ شاہد کے نام بھیجے گئے۔

آج محمد اسلم کا تار مولوی یوسف متالا کے متعلق پہنچا کہ جو تو نے اجازت خلافت دے رکھی ہے، اسے فوراً واپس لے لے، اس مضمون کی نقل یوسف کو بھیجی کہ اس کی کیا حقیقت ہے اور تار دینے والے کو خط لکھا کہ میں نے آپ کے کہنے سے اجازت نہیں دی تھی کہ آپ کے کہنے سے واپس لے لوں، اپنے حکم نامہ کی وجوہ لکھئے تا کہ اس پر غور کروں مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا، بعد میں مولوی یوسف رمضان میں آئے تو بتایا کہ چند وجوہ سے اس کا مدرسہ سے اخراج کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اس نے تار دیا، پہلے بھی کئی دفعہ اس کو علیٰحدہ کر دیا تھا مگر وہ معافی مانگ لیتا تھا۔

۴ جولائی کو مولانا سعید صاحب مدینہ سے مکہ اور تین دن کے بعد عمان اور وہاں سے مولانا انعام صاحب سے لندن کے سفر کے لیے مل گئے، مولوی انعام صاحب ۸ جولائی کو روانہ ہوئے تھے، ایک دن کراچی ٹھہر کر عمان، وہاں تین دن کا اجتماع تھا، اس کے بعد لندن، وہاں بھی کئی جگہ کا دورہ ہوا، منگل یکم اگست کو جدہ پہنچے۔

بدھ کی صبح کو عربی ۴ بجے پہنچے اور مدینہ منورہ سے اگلی بدھ ۹ اگست کی صبح کو عربی ۳ بجے جملہ رفقاء مکہ روانہ ہوئے اور دن بھر صولتیہ میں آرام کیا اور عشاء کے بعد عمرہ کرنے کے بعد مسجد حفائر پہنچے۔

۱۴ اگست کو کراچی، وہاں دو شب قیام کے بعد ۱۶ اگست چہار شنبہ کو دہلی پہنچے، حافظ عبد العزیز صاحب کراچی کسی تقریب میں آئے تھے، مختلف جگہ قیام رہا اور روانگی ۱۸ جولائی کو ہوئی، روانگی سے دو ہفتہ قبل مدرسہ نیو ٹاؤن میں قیام ہوا، مدرسہ میں اس کے دو تین مرید ہیں، ان کی سعی سے مدرسہ کے مکان میں قیام ہوا، عصر کے بعد مغرب تک مجلس ہوتی تھی۔

۱۹ جولائی، ابرار کے ولیمہ کی شرکت میں سعدی آیا تھا اور خود اسی نے ولیمہ بھی کیا، جس میں معلوم ہوا کہ ساڑھے تین ہزار ریال خرچ ہوئے، زکریا نے تو ابرار پر بھی نکیر کی، مجھ سے تو اخفاء کیا تھا، کھانا بہت بچ گیا، ایک دیگ سلیق کی زنانہ میں اور ایک مردانہ میں، ماموں یامین بھی زکریا کی عیادت کی مد میں آئے تھے اور سعدی ہی کے ساتھ واپس ہوئے۔

۲۰ جولائی کی شب میں عزیز مولوی احسان، قاضی محمود جدہ اُتر کر سیدھے مدینہ منورہ آئے اور عید کے بعد ۶ ستمبر کو مدینہ سے مکہ اور تین دن وہاں قیام کرنے کے بعد کراچی روانہ ہوئے۔

۲۳ جولائی کو قاری مظفر نے طباخوں پر ناراض ہو کر سب کو علیٰحدہ کر دیا اور تین دن تک مزدوروں سے کام لیا، پھر عارضی طباخ رکھے، وجہ ناراضگی معلوم نہ ہوئی، عتیق کی تو آنکھ میں بہت دنوں سے پانی اُتر آیا ہے۔

۲۵ جولائی کی شب میں مولوی ظہور الحسن کا جو عرصہ سے مفلوج تھے انتقال ہو گیا۔

۲۸ شعبان ہندی ۴ اگست کو مولوی منور مع اپنے داماد انوار کے رمضان سہارنپور گزارنے کے

لیے پہنچے، زکریا نے پہلے اس کو سہارنپور آنے سے منع کر دیا تھا کہ کٹھیار میں ہی رمضان کریں اس کے جواب میں مولوی منور کا تار آیا تھا کہ میں رمضان سہارنپور کروں گا تو بھی للہ ضرور آ، سہارنپور میں شروع میں معتکف تھے اور اخیر میں دس، مہمان پچاس تک ہو گئے تھے۔

مدرسہ قدیم کی مسجد میں اعتکاف ہوا، محمد بن مفتی یحییٰ نے قرآن سنایا، مولوی سلمان نے قاضی صاحب کی مسجد میں خالد نے فرخ کی مسجد میں، خالد کی مسجد شروع سے بھر گئی تھی، مولوی طلحہ نے ٹال میں، شاہد نے بغیر سامع کے زکریا کے گھر میں، جعفر اور عمار نے حکیم کی مسجد میں، مسجد کلثومیہ میں مختار بن مولوی محمد اللہ نے، دارِ جدید میں مفتی عبدالعزیز نے قرآن سنایا، دیوبند میں سالم نے، مولانا اسعد صاحب کے یہاں ارشد نے، مولانا اسعد صاحب کے یہاں شروع میں سو (۱۰۰) اور اخیر میں دوسو (۲۰۰) تک مہمان ہو گئے اور معتکف ۷۵ ہو گئے تھے، مسجد چھتہ میں ۶ آدمی مفتی محمود کے لوگوں نے اعتکاف کیا۔

مدینہ طیبہ میں مدرسہ شرعیہ کے حجرہ میں زکریا کی بیماری کی وجہ سے مولوی محمد افریقی اور زبیر لائل پوری نے حجاز کے دستور کے موافق دونوں نے مل کر ایک قرآن پڑھا، مولوی یوسف متالا نے مع اپنے تین چار مریدوں کے مولوی حبیب اللہ کے یہاں قیام کیا، مولوی ہاشم مع اپنی اہلیہ کے پہلے آگئے تھے اور بنگالی رباط میں مستقل کمرہ لے لیے تھا، حکیم سعید رشید افریقہ کے دورہ سے ۴ رمضان کو آگئے، افریقی چند حضرات مولوی یوسف تتلی وغیرہ پانچ چھ آگئے تھے، قاضی صاحب ۲۹ ویں شعبان مطابق ۱۳ اگست کو رمضان گزارنے کے لیے قاضی صاحب پاکستان سے مدینہ پہنچے تھے اور ۲۷ رمضان کو جھاوریاں میں عید کرنے کے لیے تشریف لے گئے، مکہ میں عید پڑھ کر اسی دن جہاز سے کراچی چلے گئے، وہاں ۲۸ رمضان تھا۔

ہندوستان میں رمضان میں بارشوں کی بہت کثرت رہی، دہلی سہارنپور کے درمیان میں ریل اور بسیں بند ہو گئیں، بعض مواقع پر بہت بربادی ہوئی، اخبار والوں نے ایک کروڑ آدمیوں کا بے گھر ہونا لکھا تھا، اعجاز بہاری نے بتایا کہ اس کے پاس کے کئی گاؤں بہہ گئے۔

۱۵ اگست کو مولوی سعید خان کے سینہ میں درد محسوس ہوا ڈاکٹر نے دیکھ کر خطرناک بتایا اور وہ ہسپتال میں داخل ہو گئے، ۲۰ کو ہسپتال والوں نے اجازت دے دی، مگر احتیاط کی تاکید کی، ہسپتال کے زمانہ میں بہت زیادہ پہرہ رہا، بہت خاص خاص آدمیوں کو ملنے کی اجازت تھی۔

۲۱ اگست جو سردار جدہ والے سخت بیمار ہوئے ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے ایک ہفتہ بعد انتقال ہو گیا، تدفین جنت المعلیٰ میں ہوئی۔

۲۶ اگست کو پاکستان میں مولانا عبدالہادی صاحب دین پوری کا انتقال ہو گیا۔

۷ اگست کو مفتی محمود رنگونی لندن سے سیدھے مدینہ پہنچے، تین دن قیام کے بعد کراچی اور پھر دہلی سہارنپور ہوتے ہوئے واپس رنگون چلے گئے۔

۳ ستمبر کی شب میں اذان حسبِ معمول ۲ بجے ہوئی ڈاکٹر اسماعیل نے اسی وقت کہا کہ ٹیلیویژن پر چاند کا اعلان ہوگیا، اذان کے بعد گولے اتنے کثرت سے چھٹے اوراس سے زیادہ مسجد نبوی میں تالیاں پیٹی گئیں، اس کے بعد امام صاحب نمبر ۲ نے فرضوں کے بعد تقریر کی اور خوب ڈانٹا، جنہوں نے ابتداء تالیوں کی کی تھی وہ دو مصری تھے وہ پکڑ لیے گئے۔

۲۷ رمضان کی شب میں جنرل ضیاء الحق حاکم عسکری پاکستان مکہ میں رہے ساری رات طواف کیے اور ۲۸ کی شب مدینہ میں گزاری، تراویح اور تہجد کی نفلوں میں شریک رہے۔

کئی دن سے طبیعت بہت خراب ہے، اس لیے اب تو اسی پر ختم کرتا ہوں اور کئی دفعہ پہلے بھی ختم کر چکا ہوں، مگر جیسا کہ بار بار لکھا، نہ تو احباب چھوڑتے ہیں اور مجھے بھی کوئی اکابر کا قصہ یاد آجائے تو سر کھجانے لگتا ہوں، لہٰذا اب تو اس حصہ کو ختم کرتا ہوں مقدر میں ہے تو پھر دیکھا جائے گا۔

واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین و صلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و الہ و صحبہ و بارک و سلم تسلیما کثیرا۔

محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی

یکم ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق ۵ فروری ۱۹۸۱ھ مدینہ طیبہ

......☆☆☆☆☆......

مخدوم ومکرم حضرت اقدس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسن الندوی دامت برکاتہم

علالت کا تسلسل، وفات حسرت آیات

طویل علالت اور سفرِ ہندوستان:

حضرت شیخ کی علالت کا سلسلہ بہت طویل تھا اور سالہا سال ممتد رہا، اس میں بار بار ایسے مرحلے آئے کہ اہلِ تعلق اور معالجین کی طرف سے سخت خطرہ اور تشویش اور بعض اوقات مایوسی ہونے لگتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کو ابھی ارشاد وتربیت، اپنے مشائخ اور مربیوں کے علوم وتحقیقات کی اشاعت، ان کی علمی وتصنیفی یادگاروں کی حفاظت اور توسیع تبلیغی جماعت کی نگرانی اور سرپرستی اور زیرِ تربیت افراد کی تکمیل کا جو کام لینا تھا، اس کے لیے بار بار اس فوری خطرہ اور تشویش کو دور فرماتا رہا اور اہلِ تعلق کی آس بندھتی رہی۔

علالت وضعف کی اسی حالت میں ۵ محرم ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۲ نومبر ۸۱ء کو حضرت شیخ مدینہ طیبہ سے ہندوستان تشریف لائے اور ۲۰ روز تک دہلی قیام رہا، مرض کا اشتداد اور ضعف کا شدید غلبہ ہوا اور صحت بہت نازک مرحلے پر پہنچ گئی، اہلِ تعلق اور اہلِ رائے کا مشورہ اور اصرار ہوا کہ دہلی میں کسی ایسے ہسپتال میں داخل کیا جائے جہاں پوری ذمہ داری وہمدردی کے ساتھ علاج ہوتا ہو، چنانچہ ہولی فیملی (Holy Family) میں داخل کرنے کا مشورہ ہوا، وہاں مکمل طبی معائنہ، ضروری ایکسرے اور ہر طرح کے امتحانات ہوئے۔

معالجین کو کینسر کا شبہ تھا، کئی بار ضعف کی وجہ سے خون چڑھانے کی نوبت آئی اور متعدد بار امید وبیم کی حالت پیدا ہوئی، ناچیز راقم سطور، مولانا محمد منظور صاحب اور رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ جن میں عزیزان محمد ثانی، مولوی معین اللہ، مولوی طاہر وغیرہ تھے، زیارت وعیادت کے لیے دہلی گیا، وہاں شیخ کے شدید ضعف وعلالت کی شدت کو دیکھ کر شدت سے قلب میں اس بات کا تقاضا ہوا کہ کسی طرح حضرت شیخ کو مدینہ طیبہ پہنچایا جائے مبادہ کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جس پر ہمیشہ قلق وندامت ہو اور مخالفین ومعاندین کو شماتت کا موقع ملے، اس رائے میں مولانا سید اسعد مدنی صدر جمیعۃ علماء ہند جو برابر حالات کا مطالعہ کر رہے تھے اور وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے تھے، نہ صرف شریک بلکہ اس رائے اور مشورہ میں ہم لوگوں سے کچھ آگے ہی تھے۔

بالآخر راقم سطور اور مولانا نے بڑی صفائی اور ایک حد تک جرأت وجسارت کے ساتھ منتظمین و

تیمارداروں کی خدمت میں اپنی رائے پیش کی، حالات کا تقاضا تھا کہ ایک دن کی بھی تاخیر نہ کی جائے، لیکن ذمہ داروں اور تیمارداروں نے (جن میں شیخ کے خادم خاص الحاج ابوالحسن پیش پیش تھے) اس سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ ابھی تو شیخ کو سہارنپور لے جانا ہے اور وہاں قیام کرانا ہے، جس کی شیخ کو خواہش بھی ہے اور کئی بار اشارے بھی فرمائے۔

ہم لوگ اس سے زیادہ اصرار نہیں کر سکتے تھے، ان حضرات کے احترام میں ''توکلاً علی اللہ'' خاموشی اختیار کی۔

ہولی فیملی سے شیخ حافظ کرامت اللہ صاحب کی کوٹھی میں تشریف لائے، جہاں آرام وعلاج کی سب سہولتیں تھیں، ۴ صفر ۱۴۰۲ھ مطابق ۲ دسمبر ۸۱ء کو سہارنپور تشریف لے گئے، اسی عرصہ میں ہم لوگوں کی دوبارہ حاضری ہوئی اور دیکھا تو دہلی سے بہتر حالت پائی، لیکن اطمینان اب بھی نہ تھا۔

مدینہ طیبہ واپسی

آخر اللہ نے ان کی آرزو اور مخلصین کی دعائیں قبول فرمائیں اور شیخ اپنے خدام و رفقائے خاص کے ساتھ ۱۸ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۶ جنوری ۸۲ء کو براہ کراچی جدہ کے روانہ ہوئے اور وہاں سے الحمدللہ بخیریت مدینہ طیبہ پہنچ گئے، علالت اور علاج کا سلسلہ جاری رہا، خدام کو ہندوستان میں کبھی تشویشناک اطلاعیں اور کبھی امید افزا خبریں ملتی رہیں۔

آخری ملاقات

اس عرصہ میں ۲۹ ربیع الاول ۱۴۰۲ھ مطابق جنوری ۱۹۸۲ء کو رابطہ عالم اسلامی کی ''المجلس الأعلیٰ للمساجد'' اور ''المجمع الفقهي'' کی شرکت کے لیے میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء کی معیت میں مکہ معظمہ حاضر ہوا، حضرت شیخ حسنِ اتفاق سے مکہ معظمہ ہی میں بھائی سعدی صاحب کے مکان پر فروکش تھے اور ہمارا قیام اس سے متصل ہی ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی کے مکان پر تھا جس کا صرف چند گز کا فاصلہ ہے، حضرت شیخ ہمیشہ معمول کے مطابق بڑی بشاشت وشفقت سے پیش آئے، ضعف بہت تھا لیکن دماغ اسی طرح بیدار و حاضر تھا، میرے ساتھ ازراہِ شفقت جو معاملہ مدینہ طیبہ کے قیام میں فرماتے تھے، اس کا اعادہ فرمایا۔

بھائی ابوالحسن سے کہا کہ علی میاں کو مدینہ طیبہ میں جو خمیرہ کھلاتے تھے وہ روزانہ دیا کرو، ٹھنڈے پانی کو بھی بار بار پوچھتے اور ہدایت فرماتے، اس وقت سب سے زیادہ حضرت کے قلب و دماغ پر جو چیز طاری اور حاوی تھی، وہ دارالعلوم دیوبند کا قضیہ تھا، دن میں دو مرتبہ حاضری ہوتی کوئی

حاضری ایسی یادنہیں جس میں دارالعلوم کی کوئی نئی خبر دریافت نہ فرمائی ہو اور اس کے اختلاف کے بارے میں اپنی دلی تشویش وفکر مندی کا اظہار نہ فرمایا ہو۔

میں نے عزیز محمد ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ایک نیاز نامہ بھی دیا اور عرض کیا کہ جب موقع ہو سن لیا جائے فرمایا نہیں ابھی سنوں گا، غالباً مولوی طلحہ صاحب نے پڑھ کر سنایا، فرمایا اس کا جواب بھی لکھواؤں گا، اس وقت کیا معلوم تھا کہ صرف دو ڈھائی مہینے کے فصل سے خادم ومخدوم اور مرید و مرشد اللہ کے یہاں پہنچ جائیں گے۔

ایک یادگار تعزیتی مکتوب

فروری کو ہم دونوں کی بمبئی واپسی ہوئی، یہاں ہندوستان پہنچ کر عزیز موصوف محمد ثانی مرحوم کا وہ حادثہ جاں گداز پیش آیا جس نے دل ودماغ کو مجروح اور اعصاب کو جھجوڑ کر رکھ دیا، عجیب بات یہ ہے کہ ۱۶ فروری کو دن کے ۱۱، ۱۲ بجے یہ حادثہ پیش آیا اور اسی دن عصر کی نماز سے پیشتر حضرت شیخ کو مدینہ طیبہ میں ٹیلیفون کے ذریعہ اطلاع مل گئی، حضرت نے اس پر جو تعزیتی مکتوب میرے نام تحریر فرمایا، وہ ایک یادگار تاریخی مکتوب ہے، جس سے حضرت کی حاضر دماغی، حافظہ کے صحیح طور پر کام کرنے، اس کے ساتھ شدتِ تعلق کا پورا اظہار ہوتا ہے اور اس میں لطیف طریقہ پر اپنے سفر کے قرب کی طرف سے بھی اشارہ ملتا ہے وہ مکتوب یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔

باسمہ سبحانہ

المخدوم المکرّم حضرت الحاج علی میاں صاحب زادمجدکم۔

بعد سلام مسنون، کل ۱۶ فروری ۱۹۸۲ء کو ظہر کی نماز کے بعد عزیزی مولوی حبیب اللہ نے حادثہ جانکاہ کی خبر سنائی کہ ظہر سے پہلے جب کہ میں سو رہا تھا، نور ولی صاحب کا ملازم آیا اور یہ خبر بتا گیا کہ آج ساڑھے گیارہ بجے دن میں محمد ثانی حسنی کا انتقال ہو گیا۔

''انا للّٰه و انا اليه راجعون، 'اللّٰهم أجرنا فی مصيبتنا و عوضنا خيرا منها للّٰه ما أخذ و له ما اعطى و كل شى عنده بمقدار

إن العين تدمع و القلب يحزن و لا نقول إلا ما يرضى ربنا و إنا بفراقک يا محمد لمحزونون۔''

ترجمہ: ''آنکھ نمناک ہوتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے مگر ہم وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو راضی کرے اور اہم اے محمد، تمہاری جدائی پر غمزدہ ہیں۔''

علی میاں! حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ شعر یاد آرہا ہے جوانہوں نے حضرت امام عبد الرحمٰن بن مہدی کو ان کے صاحبزادہ کی تعزیت میں لکھا تھا۔

إني معزيك لا أني على ثقة

من الحياة ولكن سنة الدين

فما المعزى بباق بعد ميته

ولا المعزى ولو عاشا الى حين

ترجمہ: میں تم سے تعزیت دین کی پیروی میں کر رہا ہوں، نہ کہ اس یقین پر کہ مجھے زندگی کا بھروسہ ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ وفات پا جانے والے کے بعد جن سے تعزیت کی جارہی ہے نہ وہ باقی رہنے والے ہیں اور نہ تعزیت کرنے والے ہی کو بقاء ہے، اگرچہ ایک مدت تک زندہ رہے۔

علی میاں! حادثہ جانکاہ کی خبر سن کر دل پر کیا گزری بیان نہیں کر سکتا، ادھر آپ کی پیرانہ سالی اور پے در پے حادثات کا تسلسل اور بھی موجب رنج وقلق ہے، مگر محض رنج وقلق سے نہ تو جانے والے کو فائدہ، نہ رہنے والے کو سکون، میں نے خبر سنتے ہی اپنے دستور کے موافق دوستوں کو ایصال اور دعائے مغفرت کی تاکید شروع کر دی کہ میرے یہاں اصل یہی تعزیت ہے اور اس کے بہت سے واقعات میری ''آپ بیتی'' میں بھی گزر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اجر جزیل عطاء فرمائے اور پسماندگان کو خصوصاً آپ کو صبرِ جمیل۔

اس وقت رہ رہ کر عزیز مرحوم کی خوبیاں اور باتیں یاد آرہی ہیں اور آپ کا خیال بھی بار بار آرہا ہے کہ آپ پر کیا گزری ہوگی۔

قربان جایئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ ہر حرکت وسکون کے اعمال کو ہمارے لیے بیان فرما گئے اور اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ومحدثین کو جو ان سب چیزوں کو محفوظ فرما گئے، اس وقت بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک تعزیتی مکتوب جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کو لکھوایا تھا نقل کرا رہا ہوں، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے کا انتقال ہوگیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مکتوب مبارک لکھوایا۔

''من محمد رسول الله إلى معاذ بن جبل سلام الله عليك، فإني أحمد الله الذي لا إله إلا هو، أما بعد !فعظم الله لك الأجر و ألهمك الصبر، ورزقنا وإياك الشكر، ثم أن انفسنا و أموالنا و أهالينا و أولادنا من مواهب الله

عزوجل الهنئة و عواريه المستودعه متعک الله به فی غبطة و سرور، وقبضه بأ جر کبیر، الصلوة و الرحمة والهد ی إن احتسبته"۔

"یا معاذ إفا صبر و لا یحبط جزعک أجرک فتندم علی ما فاتک و اعلم الجزع لا یر دمیتا ولا یرفع حزنا، فلیذهب أسفک علی ما هو نازل بک فکان قد"

والسلام

اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام:

ترجمہ: میں پہلے اس اللہ کی تم سے حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، (بعد ازاں دُعاء کرتا ہوں) اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ کا اجر عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطاء فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے، حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال اور ہمارے اہل وعیال یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اُٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور اب اس امانت کو اُٹھالیا، اس کا بڑا اجر دینے والا ہے، اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت کی تم کو بشارت ہے، اگر تم نے ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت سے صبر کیا"۔

"پس اے معاذ! ایسا نہ ہو کہ جزع فزع تمہارے اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو اور یقین رکھو کہ جزع فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے دل کا رنج وغم دور ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم نازل ہوتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے، بلکہ یقیناً ہو چکا ہے"۔

اور یہ حدیث مشہور ہی ہے:

"ما یزال البلاء بالمؤمن والمؤمنة فی نفسه وولده وما له حتی یلقی الله تعالیٰ وما علیه خطیئة"۔

"مرد وعورت برابر جان و مال اور اولاد میں مصیبت سے دوچار ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملتے ہیں کہ ان پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔"

پھر:

"أشد الناس بلاءً الأنبیاء ثم الأمثل، فالأمثل، یبتلی الناس علی قدر دینهم فمن ثخن دینه اشتد بلأوة، ومن ضعف دینه، ضعف بلاؤه۔"

"وان الرجل لیصیبه البلاء حتی یمشی فی الارض ما علیه خطیئة۔"

ترجمہ: "سب سے زیادہ مصیبتوں سے انبیاء کو دوچار ہونا پڑتا ہے پھر جو ان کے جتنا قریب ہوتا ہے، لوگوں کی آزمائش ان کے دین کی مناسبت سے ہوتی ہے جس کا دین مضبوط ہوگا ہے،

اس کی آزمائش بھی سخت ہتی ہے، جس کا دین کمزور ہوتا ہے، اس کی آزمائش بھی ہلکی ہوتی ہے اور آدمی برابر مصیبت میں مبتلا رہتا ہے حتیٰ کہ زمین پر اس طرح چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں رہ جاتا ہے۔''

یہ بھی آپ کے اور آپ کے اہل خاندان کے حسب حال ہے:

اپنی بیماری اور معذوری میں یہ مختصر خط لکھوایا ہے اسی کو عزیز مرحوم کی والدہ، اہلیہ اور بچوں کو بھی پڑھوادیں اور اپنے دیگر اعزہ کو بھی ہر اک کو الگ الگ لکھوانا میرے لیے اس حال میں بہت مشکل ہے، اخیر میں اس بدوی کے دوشعروں پر ختم کرتا ہوں، جو اس نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وفات پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بطور تعزیت سنائے تھے۔

"اصبر نكن بک صابرین فانماصبر الرعیة بعد صبرا لراس"

''آپ صبر کیجئے تو ہم بھی آپ کی اتباع میں صبر کریں گے، کیونکہ رعایا اسی وقت صبر کرتی ہے جب بادشاہ صبر سے کام لے۔''

خیر من العباسأجرک بعده

واللّٰہ خیر منک للعباس

''حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے انتقال سے آپ کا اجر زیادہ باعث خیر ہے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں آپ کے لیے اللہ زیادہ بہتر ہے''۔

عزیز حمزہ اس کی والدہ، عزیز انم محمد رابع، محمد واضح، مولانا معین اللہ صاحب، مولوی سعید الرحمٰن صاحب اور دیگر اعزہ سے سلام مسنون کے بعد مضمون واحد۔

فقط والسلام حضرت شیخ الحدیث صاحب

بقلم: حبیب اللہ

مدینہ طیبہ ۷ افروری ۱۹۸۲ء

علالت کا اشتداد اور زندگی کے آخر ایام

مارچ، اپریل اور وسط مئی تک حضرت شیخ کی علالت وصحت وضعف قوت کے بارے میں اسی طرح کی مختلف ومتضاد خبریں آتی رہیں، جیسا کہ مہینوں سے معمول تھا، مئی ۸۲ کی ابتدائی تاریخوں میں راقم السطور عزیز سید سلمان ندوی سلمہ کے ساتھ سری لنکا کے سفر پر روانہ ہوا، وہاں غالباً ۱۴ یا ۱۵ مئی کو واپسی سے ایک شب پہلے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ تشریف رکھتے ہیں، مجھے دیکھ کر

فرمایا کہ علی میاں، تمہیں معلوم نہیں کہ میں اتنا بیمار ہوں، تم دیکھنے نہیں آئے میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس کی بالکل خبر نہیں ہوئی، مجھے اس عرصہ میں کوئی خط نہیں ملا۔

میں نے عرض کیا کہ اس حادثہ کا ہمارے پورے خاندان پر بڑا اثر ہے، خاص طور پر محمد ثانی کی والدہ پر اب دیکھا تو حضرت شیخ وہاں پر موجود نہیں تھے، اس پر وہیں ماتھا ٹھنکا اور آنے والے واقعہ کا دھڑکا پیدا ہو گیا، میں نے دہلی آتے ہی پوچھا کہ حضرت شیخ کا مزاج کیسا ہے؟ کوئی تار یا اطلاع ملی؟ ہمارے میزبان حافظ کرامت صاحب نے کہا کہ ابھی کل ہی بھائی سعدی کا ٹیلی فون آیا ہے کہ حالت اطمینان بخش نہیں ہے، غشی بھی کبھی کبھی طاری رہتی ہے اور معالجین صحت کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں پھر میری موجودگی میں مکہ کے ٹیلی فون آئے اور معلوم ہوا کہ تشویش قائم ہے اور صحت میں بہتری پیدا نہیں ہوئی۔

خبر صاعقہ اثر

۱۸ مئی کو ہم لوگ لکھنؤ واپس آ گئے، ۲ شعبان ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۹۸۲ء کو دہلی سے بذریعہ ٹیلی فون اور مدینہ طیبہ سے مولوی سعید الرحمن ندوی کے تار سے جو اس وقت وہاں موجود تھے، حادثہ فاجعہ کی اچانک اطلاع ملی۔

ایتھا النفس اجملی جزعا
ان الذی تحذرین قد وقعا

آخری ایام وساعات

اب اس کے بعد کی تفصیلات محب گرامی ڈاکٹر اسماعیل صاحب کے مکتوب سے اخذ کر کے انہیں کے الفاظ میں درج کی جاتی ہیں وہ حضرت شیخ کے مخلص ومحب خادم اور ہر وقت کے حاضر باش معالج تھے، وہ اپنے اس مکتوب میں جو انہوں نے مخصوص اہل تعلق کو بھیجا ہے، لکھتے ہیں:

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کی علالت کا سلسلہ تو کئی سال سے چل رہا تھا، ۱۲ مئی کی چہار شنبہ سے قبل صحت نسبتاً اچھی تھی، کھانا بھی تناول فرماتے تھے، گفتگو بھی ٹھیک طرح سے فرماتے تھے پوچھنے پر مشورہ بھی حسب سابق دیتے تھے، مولانا عاقل صاحب مسلم شریف کی تقریر کا جو علمی کام کر رہے ہیں وہ روزانہ کا کام بعد عشاء حضرت کو سناتے حضرت غور سے سنتے اور ضروری مشورہ بھی دیتے تھے، گویا صحت اچھی تھی، البتہ ضعف بہت تھا، جس کی وجہ سے حرم شریف صرف ایک نماز کے لیے تشریف لے جاتے شروع میں ظہر کی نماز میں اور پھر دھوپ میں تیزی ہو جانے کی وجہ سے عشاء کی نماز میں حرم شریف جانے کا معمول تھا۔

چہار شنبہ ۱۲ مئی کو حضرت کو بخار ۱۰۲ ڈگری تک ہو گیا، علاج وغیرہ سے بخار اُتر گیا، لیکن ضعف میں بہت اضافہ ہو گیا اور حرم شریف جانا چھوٹ گیا، استغراق زیادہ رہنے لگا، ۱۴ مئی کو نماز جمعہ حرم شریف کی جماعت کے ساتھ مدرسہ علوم شرعیہ کے صدر دروازہ میں ادا فرمائی، جہاں تک حرم شریف کی صفوں کا اتصال رہتا ہے، بخار کے بعد سے کھانا تقریباً چھوٹ گیا، (مشروبات کا پینا کسی نہ کسی درجہ میں جاری رہا) جمعہ ۱۴ مئی سے روزانہ صبح وشام گلوکوز وغیرہ کی بوتلیں رگ میں دی جاتی رہیں جن کا سلسلہ وصال کے دن تک جاری رہا، دیگر علاج انجکشن وغیرہ بھی دیئے جاتے رہے۔

شنبہ ۱۵ مئی کو آنکھوں میں اور پیشاب میں یرقان محسوس ہوا، خون کا معائنہ کرایا گیا، جس سے جگر اور گردہ میں مرض معلوم ہوا اور دونوں اعضاء کے عمل میں خلل کا بھی پتہ چلا، یکشنبہ ۱۶ مئی کی شب میں نیم بے ہوشی تھی، دوسرے روز فجر سے مکمل بے ہوشی ہوگئی اور اتوار کا سارا دن مکمل بے ہوشی میں گزرا کہ جس کروٹ لٹایا جاتا اسی پر رہتے، نہ آواز دیتے، نہ حرکت نہ کھانسی وغیرہ نبض اور بلڈ پریشر دیکھ کر اطمینان ہوتا کہ فوری خطر نہیں ہے، علاج وغیرہ مختلف تدبیریں ہوتی رہیں، اتوار کی شام بخاری شریف کا ختم کرایا گیا، جو اتوار پیر دو روز میں مکمل ہوا، جس کے بعد صاحبزادہ مولانا طلحہ صاحب نے بہت الحاح کے ساتھ دعاء کرائی مکہ مکرمہ میں شیخ محمد علوی مالکی کے یہاں بھی یٰسین شریف کا ختم ہوا۔

دوشنبہ ۱۷ مئی کو بے ہوشی تو تھی، لیکن کل جیسی نہیں تھی بلکہ ہیجانی کیفیت تھی، صبح تو ''اللہ اللہ'' فرماتے رہے، ظہر کے بعد سے ''یا کریم یا کریم'' یا ''اوکریم اوکریم'' فرماتے رہے، کبھی کبھی ''یا حلیم یا کریم'' بھی فرماتے رہے۔ یا کریم کی یہ آوازیں اخیر وقت تک وقتاً فوقتاً دیتے رہے، علاج کے سلسلہ میں یہ ناکارہ دیگر ڈاکٹروں سے بھی برابر مشورہ کرتا رہا، بالخصوص ڈاکٹر اشرف صاحب، ڈاکٹر ایوب صاحب، ڈاکٹر سلطان صاحب، ڈاکٹر منصور عبد الاحد وغیرہ، خون وغیرہ کے معائنہ کے لیے ڈاکٹر انصرام صاحب بہت تعاون فرماتے رہے، البتہ جگر اور گردہ کا عمل برابر کمزور ہوتا گیا، خون، پیشاب کا معائنہ اور علاج و دیگر تدابیر ہوتی رہیں، غذا تقریباً بند تھی، رگ میں بوتلوں کے ذریعہ ہی غذا پانی اور گلوکوز وغیرہ دیا جاتا رہا، ۲۱ مئی کو نماز جمعہ حرم شریف کی جماعت کے ساتھ مدرسہ شرعیہ کے صدر دروازہ میں ادا فرمائی۔

اتوار ۲۳ مئی کی صبح تک بظاہر طبیعت کچھ ٹھیک رہی، ۲۳ مئی کو بعد ظہر سوء تنفس کی تکلیف ہوئی جس کی فوری تدبیر کر لی گئی، مغرب آدھ گھنٹہ قبل جب یہ ناکارہ مطب میں تھا حضرت کے خادم مولوی نجیب اللہ نے ٹیلی فون پر بتلایا کہ حضرت کی طبیعت خراب ہے، چنانچہ میں فوراً حاضر ہوا

تو دیکھا کہ سوءِ تنفس کی تکلیف بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے حضرت کو بے چینی ہے، سانس لینے میں بہت دقت محسوس ہو رہی ہے، بندہ نے معائنہ کر کے ضروری انجکشن لگائے جس کے بعد چند منٹ کے بعد سکون مل گیا اور سانس طبعی حالت پر آ گیا، عشاء کے بعد بندہ کے گھر جانے تک طبیعت نسبتاً ٹھیک تھی۔

۲۴ مئی فجر کے وقت بھی طبیعت ٹھیک تھی اور حضرت گفتگو بھی تھوڑی تھوڑی فرماتے رہے، البتہ تشویش کی بات یہ پیش آئی کہ کل ظہر کے بعد سے پیشاب بالکل نہیں آیا، صبح ۸ بجے دوبارہ سوءِ تنفس کی تکلیف شروع ہوئی، اس کے لیے اور پیشاب کے لیے تدبیر کی جانے لگیں، جس سے ظہر عصر کے درمیان پیشاب تو آ گیا تنفس کے لیے انجکشن آکسیجن وغیرہ لگائے گئے، بارہ بجے دوپہر تک بے چینی رہی، کبھی فرماتے بٹھاؤ، کبھی فرماتے لٹاؤ، کبھی فرماتے دوا لاؤ، وقتاً فوقتاً ''یا کریم'' اور ''او کریم'' بھی بلند آواز فرماتے رہے، یہ ناکارہ چونکہ مسلسل پاس ہی بیٹھا رہا تو کبھی کبھی اس ناکارہ کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دباتے، تقریباً گیارہ بجے جب کہ الحاج ابوالحسن نے تکیہ اونچا کیا تو بندہ کی طرف دیکھ کر فرمایا ڈاکٹر صاحب ہیں؟

ابوالحسن نے کہا، ہاں یہ ڈاکٹر اسماعیل ہیں یہ سن کر بندہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے یہ آخری گفتگو تھی، جو حضرت نے فرمائی اس کے بعد ''یا کریم''، ''او کریم'' فرماتے رہے، ظہر تک یہ کیفیت رہی، ظہر کے بعد سے مکمل سکون ہو گیا، جو آخری وقت تک رہا، یہ ناکارہ بار بار نبض و بلڈ پریشر وغیرہ دیکھتا رہا، رُوح پرواز کرنے سے کچھ قبل صاحبزادہ مولانا طلحہ صاحب نے بندہ سے پوچھا کہ کیا یہ آخری وقت ہے؟ بندہ نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے بلند آواز سے اللہ اللہ کہنا شروع کر دیا، اسی حال میں حضرت نے دو مرتبہ آخری ہچکیاں لیں، جس سے آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور روح پرواز کر گئی، اس وقت ٹھیک ۵ بج کر ۴۰ منٹ ہوئے تھے، یعنی مغرب سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل۔

''اِنا للّٰہ و انا الیہ راجعون''

اللّٰھم اجرنا فی مصیبتنا وعوضنا خیرا منھا و انا بفراقک یا شیخ لمحزونون

جس کی ساری عمر، اتباعِ سنت میں گزری، اس کو تکوینی طور پر یہ اتباع بھی نصیب ہو گیا کہ دو شنبہ کی عصر مغرب کے درمیان وصال ہوا۔

اس وقت حاضرین کا جو حال تھا، وہ بیان نہیں کیا جا سکتا، وصال کے وقت پاس موجود ہونے والوں میں صاحبزادہ مولانا محمد طلحہ صاحب، مولانا عاقل صاحب، ان کے صاحبزادہ جعفر، الحاج ابو الحسن، مولوی نجیب اللہ، صوفی اقبال، مولانا یوسف متالا، حکیم عبدالقدوس، مولوی اسماعیل، مولوی نذیر، ڈاکٹر ایوب، حاجی دلدار اسعد، عبدالقدیر اور یہ ناکارہ تھے۔

فوراً ہی تجہیز و تکفین کے انتظامات شروع ہوگئے، ڈاکٹر ایوب کو ہسپتال کا ورقہ لینے کے لیے اسی وقت بھیج دیا گیا، صاحبزادہ محمد طلحہ صاحب، مولانا عاقل صاحب و دیگر متعلقین و خدام کا مشورہ ہوا کہ تدفین عشاء کے بعد ہو یا فجر کے بعد؟ کیونکہ بعض مخصوص احباب و اعزہ کے مکہ مکرمہ سے پہنچنے کی اطلاع تھی، چونکہ ان کی وہاں کی روانگی کا وقت معلوم تھا، جس کے پیش نظر ان کا عشاء تک پہنچ جانا گویا یقینی تھا، اس پر یہ طے ہوا کہ عشاء میں ہی نماز جنازہ ہو جانی چاہیے اور فجر تک مؤخر نہ کیا جائے، اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔

لیکن اس کا بھی برابر افسوس رہے گا کہ وہ اعزہ جن کی آمد کا ہمیں شدت سے انتظار تھا، راستہ میں گاڑی خراب ہو جانے کی وجہ سے بروقت نہ پہنچ سکے اور چونکہ عشاء کا اعلان ہو چکا تھا، اس لیے عین وقت پر تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی، ہر جگہ ٹیلیفون سے اطلاع کر دی گئی، مغرب کے بعد غسل دیا گیا جو مولانا عاقل اور مولانا یوسف متالا صاحب کی ہدایات اور مشوروں سے دیا گیا، غسل کے وقت خدام کا بڑا مجمع موجود تھا، ہر شخص کی خواہش تھی کہ اس مبارک عمل میں شریک ہو، غسل میں شرکت کرنے والوں میں یہ حضرات قابلِ ذکر ہیں

مولانا یوسف متالا، الحاج ابوالحسن، مولوی نجیب اللہ، حکیم عبد القدوس، عزیز جعفر، شاہ عطاء المہیمن ابن مولانا شاہ عطاء اللہ بخاری، صوفی اسلم، مولوی صدیق، مولوی احسان، قاضی ابرار اور عبد المجید وغیرہ۔

ڈاکٹر محمد ایوب جو ورقہ لینے گئے تھے پورے دو گھنٹے کے بعد آئے اور بتایا کہ ورقہ حاصل کرنے میں کچھ قانونی رکاوٹ ہو رہی ہے اور صاحبزادہ محمد طلحہ کا جانا ضروری ہے، چنانچہ مولانا طلحہ صاحب کو بھی ان کے ہمراہ بھیجا گیا، قبرستان والوں سے قبر کھودنے کو کہا گیا تو انہوں نے کہا کہ جب تک ہسپتال کا ورقہ نہ آجائے، ہم قبر نہیں کھود سکتے، اس وقت عشاء میں صرف پون گھنٹہ باقی تھا۔

دوبارہ مندرجہ بالا حضرات نے مشورہ کیا کہ اب بظاہر عشاء تک قبر تیار ہونا دشوار ہے، لہٰذا فجر میں جنازہ ہو، اس کے فوراً بعد سید حبیب صاحب تشریف لائے، انہوں نے فرمایا کہ میں خود جا کر قبر کی جگہ تیار کرا آیا ہوں اور قبر کھودنا شروع ہوگئی ہے، تقریباً بیس (۲۰) منٹ بعد ہسپتال کا ورقہ بھی آ گیا اور قبر تیار ہو جانے کی اطلاع مل گئی، نیز قبرستان والے مخصوص چارپائی بھی لے آئے۔

گویا عشاء کی اذان سے پندرہ منٹ قبل جنازہ بالکل تیار تھا، لہٰذا پہلے مشورہ کے مطابق جنازہ باب السلام سے حرم شریف لے جایا گیا، عشاء کے فرضوں کے متصل بعد یہاں کی عام روایت کے مطابق حرم شریف کے امام شیخ عبد اللہ زاحم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع کی طرف باب جبرائیل سے نکل کر چلے، ہجوم بے پناہ تھا، ایسا ہجوم کسی اور کے جنازہ میں شاید ہی دیکھا ہو، قبر

شریف حضرت کی منشاء کے مطابق اہلِ بیت کے احاطہ اور حضرت سہارنپوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی قبر شریف کے قریب کھودی گئی تھی، صاحبزادہ مولانا طلحہ اور الحاج ابوالحسن قبر شریف کے اندر اُترے اور اس کو بند کیا، اس طرح حضرت اقدس کی دیرینہ تمنا بھی پوری ہوئی۔

ایک خاص بات یہ دیکھی کہ وصال سے ایک روز قبل حضرت والا ہر ایک سے فرداً فرداً دریافت فرماتے رہے کہ کیا تم کیا کام کرتے ہو؟ صوفی اقبال صاحب سے، الحاج ابوالحسن صاحب سے، اس ناکارہ سے براہ راست دریافت فرمایا، صاحبزادہ مولانا طلحہ دوسرے کمرے میں تھے تو خادم کو بھیجا کہ طلحہ سے پوچھ کر آ کہ تو کیا کام کر رہا ہے؟ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ پڑھنے، ذکر، تلاوت وغیرہ کا جواب دیا تو سکوت فرمایا، بندہ سے دریافت فرمایا بندہ سے قبل ابوالحسن نے جواب دیا کہ یہ تو ابھی مطب جا کر مریضوں کا علاج کریں گے، تو فرمایا یہ بھی کوئی کام ہے؟ گویا آخری وقت تک بھی اپنے لوگوں کے متعلق فکر تھی کہ کیا کرتے ہیں۔

تدفین کے بعد حضرت نوراللہ مرقدہٗ کے ایک مجاز نے دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے:

''فتح له أبواب الجنة الثمانية''

یعنی ان کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے گئے۔

ایک اور صاحب نے دوسرے دن صبح روضۂ اقدس پر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہوئے محسوس کیا، گویا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ تمہارے شیخ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دی گئی ہے، ایسا انسان لاکھوں کروڑوں میں کوئی کوئی ہوتا ہے۔

ایک مرثیہ کے چند اشعار

اس موقع پر کاندھلہ کے قادرالکلام وخوش گو شاعر شبیر صاحب جذبی کاندھلوی کے مرثیہ کے چند منتخب اشعار لکھے جاتے ہیں، جو صورت واقعہ کی صحیح تصویر اور زخمی دلوں کی صحیح ترجمانی اور تعبیر ہیں:

ایک جنازہ جا رہا ہے دوشِ عظمت پر سوار
پھول برساتی ہے اس پر رحمت پروردگار

غیرتِ خورشید عالم ہے کفن کا تار تار
ابر گوہر بار کے اندر ہیں دُرّ شاہ وار

نوحہ خواں ہیں مدرسے اور خانقاہیں سوگوار
آفتابِ علم و تقویٰ چھپ گیا زیرِ مزار

اللہ اللہ ذوق و شوقِ آمد ماہِ صیام
مصحفِ حق کی تلاوت روز وشب اور صبح وشام

صحنِ مسجد میں ہزاروں ذاکروں کا اژدہام
وقت افطار و سحر ہر تشنہ لب بادہ بجام

شمع محفل بجھ گئی باقی ہے پروانوں کی خاک
اب نہ تڑپے گی کبھی محفل میں دیوانوں کی خاک

عمر بھر کرتا رہا وہ خدمتِ دینِ رسول
جان ودل میں بھر رہی تھی اُلفتِ دینِ رسول

عشق نے ہوکر فنا پائے مقامات بلند
عشق ہے دونوں جہاں میں کامیاب وارجمند
اے خوشا قسمت کہ ہجرت ہوگئی اس کی قبول
تا ابد سوئے گا عاشق زیرِ دامانِ رسول
خواب گاہ عشق ہوگی سبز گنبد کے قریب
میٹھی نیند آئے گی اصحابِ محمد کے قریب
حشر تک جب بھی مدینے میں ہوا لہرائے گی
بوئے زُلف مصطفٰے اس کی لحد میں آئے گی
درد مندوں کی دوا ہے عشقِ محبوبِ خدا
کاش مل جائے مجھے بھی عشقِ نورِ مصطفٰے
جان و دل کا نور ہو شمع شبستان رسول
رات دن چھبتے رہیں سینہ میں یثرب کے ببول
جدہ شاہ کر بلا کی یاد میں روتا رہوں
خونِ دل کا سیل ہو اور غرق میں ہوتا رہوں
اے خدائے دو جہاں اے مالکِ عرش عظیم
اے کریم کارساز اے رب رحمٰن و رحیم
رحم تیرا بے کراں ہے فضل تیرا بے حساب
بخش دے جذبی کو بھی کچھ دردسوز واضطراب

حلیہ اور پسماندگان

شیخ بڑے حسین وجمیل تھے، حسن وجمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خصوصی وجاہت بھی عطاء فرمائی تھی، رنگ سُرخ وسپید، چہرہ گلاب کی طرح کھلتا ہوا، جسم گداز فربہی مائل، قدمیانہ، عربی مشلح پہن لیتے اور عمامہ باندھ لیتے تو ہزاروں میں ممتاز نظر آتے، مجھے یاد ہے کہ میوات کے ایک جلسہ (غالباً مالب کے جلسہ میں) ڈاکٹر ذاکر حسین خان مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) نے ان کو پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھ سے فرمایا کہ 'شیخ بڑے شاندار آدمی ہیں'، آخر میں بیماریوں نے نحافت پیدا کردی تھی، پھر بھی چہرا ویسا ہی دمکتا ہوا نظر آتا تھا اور قلب ودماغ دونوں بیدار۔

حضرت شیخ نے اپنے پسماندگان میں اہلیہ محترمہ، ایک صاحبزادہ، مولوی محمد طلحہ اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑی جن کی ضروری تفصیل یہ ہے:

اہلیہ محترمہ حضرت مولانا الحاج انعام الحسن صاحب زادمجدہ، ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۰ء میں ان کی پیدائش ہوئی، حضرت نور اللہ مرقدہٗ اس وقت حضرت سہارنپوری نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ اپنے پہلے سفر حجاز پر تشریف لے جاچکے تھے، ۳ محرم ۱۳۵۴ھ مطابق ۷ اپریل ۱۹۳۵ء میں آپ کا نکاح ہوا، مولوی محمد زبیر سلمہ آپ ہی کے صاحبزادہ ہیں۔

اہلیہ محترمہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ، ۱۳۴۷ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۲ اپریل ۴۶ء میں موصوفہ کی شادی مولوی سعید الرحمٰن ابن مولانا لطیف الرحمٰن صاحب کاندھلوی سے ہوئی۔ ۱۹ اپریل ۶۶ھ میں مولوی سعید الرحمٰن کا انتقال ہوا۔ بعد ازاں موصوفہ کا دوسرا نکاح ۱۹ ربیع الثانی ۶۹ھ مطابق ۸ فروری ۵۰ھ چہار شنبہ میں حضرت

مولانا محمد یوسف صاحب سے ہوا۔ کوئی اولاد آپ کے نہیں ہے۔

اہلیہ محترمہ مولانا الحاج حکیم محمد الیاس صاحب (فرزند مولانا حکیم محمد ایوب صاحب) ۹ ذیقعد ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۳۴ء میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ چہارشنبہ میں آپ کا نکاح بعبارۃ حضرت مدنی مہر فاطمی پر ہوا۔ یہ مولوی محمد شاہد، حافظ محمد راشد، حافظ محمد سہیل اور محمد ساجد سلمہم کی والدہ ہیں۔

مولوی محمد طلحہ صاحب سلمہ آپ زوجہ محترمہ ثانیہ سے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۹۴۱ء شنبہ کے روز پیدا ہوئے، اولاً قرآن پاک حفظ کیا، جس کا اختتام ۱۶ رجب ۱۳۷۵ھ میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کی مجلس مبارک میں ہوا۔ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۶۵ء میں سہارنپور میں فارسی تعلیم کا آغاز ہوا۔ یکم شعبان ۱۳۷۶ھ میں فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کی ابتدائی تعلیم کے لیے نظام الدین گئے۔ وہاں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے ۱۳۸۱ھ میں واپس سہارنپور آئے اور جامعہ مظاہر العلوم میں داخلہ لے کر شرح جامی، ہدایہ اولین، مقامات حریری وغیرہ پڑھیں۔ دورۂ حدیث آپ نے ۱۳۸۳ھ میں مدرسہ کاشف العلوم میں پڑھا۔ بخاری شریف آپ نے حضرت مولانا انعام الحسن صاحب سے اور طحاوی حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے ترمذی و مسلم مولانا عبیداللہ صاحب سے ابوداؤد شریف مولانا اظہار الحسن صاحب سے پڑھی ہے۔

دینی تعلیم سے فراغت پا کر حضرت رائے پوری سے بیعت ہوئے اور پھر اپنے والد ماجد مخدوم الکل کی سرپرستی میں رہ کر ذکر و شغل میں مستعدی کے ساتھ مصروف ہوئے ماہ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے اجازت بیعت مرحمت فرمائی۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کے بعد شوال ۱۴۰۲ھ میں ان کی جگہ مظاہر علوم کے سرپرست بنائے گئے۔

اہلیہ محترمہ مولانا محمد عاقل (ابن مولانا حکیم محمد ایوب صاحب) یہ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی دوسری اہلیہ محترمہ کے بطن سے پہلی صاحبزادی ہیں۔ ۶ رمضان ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئیں۔ ۸ ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹ ستمبر ۱۹۶۱ء میں آپ کا نکاح ہوا۔ حضرت رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی شرکت کے خیال سے اس نکاح کی مجلس رائے پور میں ہوئی۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے مہر فاطمی پر نکاح پڑھایا۔ حافظ محمد جعفر سلمہٗ حافظ محمد عمیر، محمد عادل، محمد عاصم سلمہم کی آپ والدہ ہیں۔

اہلیہ محترمہ مولانا سلمان صاحب (ابن مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب) ۲۹ صفر ۱۳۸۰ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ۲ ذیقعد ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۹۶۷ء میں بعبارۃ حضرت مولانا انعام الحسن

صاحب مہر فاطمی پر آپ کا نکاح ہوا۔ حافظ محمد عثمان حافظ محمد نعمان سلہما آپ کی اولاد ہیں۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے سب داماد حضرت مولانا محمد یوسف صاحب، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب، مولانا حکیم محمد الیاس صاحب، مولانا محمد عاقل صاحب، مولانا محمد سلمان صاحب، جید عالم، صاحب درس وافادہ اور صاحب تصنیف ہیں۔

مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا انعام الحسن صاحب کے متعلق تو کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ اول الذکر کی مساعی جمیلہ اور کمالات وہبیہ عالم آشکارا ہیں اور آپ کے تذکرہ میں ایک پوری ضخیم کتاب ''سوانح حضرت مولانا یوسف کاندھلوی'' (تالیف مولوی سید محمد ثانی حسنی مرحوم) موجود ہیں اور ثانی الذکر (بارک اللہ فی حیاتہ ومساعیہ) کی ذات جماعت تبلیغ کی امیر اور اس کی عالمی تحریک وجدوجہد کی سرپرست ونگراں ہیں۔

مولانا محمد الیاس مظاہر العلوم کے ممتاز فضلاء میں ہیں۔ شعبان ۱۳۷۱ھ میں فراغت پائی۔ بخاری شریف آپ نے حضرت شیخ سے پڑھی اور ایک علمی ودینی ادارہ کتب خانہ اشاعت العلوم کے نام سے قائم کیا، جس کے ذریعے بہت سی دینی کتابیں اور حضرت شیخ کی متعدد نادر تصفیفات منظر عام پر آئیں، شیخ کی مشہور ومعروف تصنیفات ''لامع الدراری'' اور ''الکوکب الدری'' وغیرہ کے اولین ایڈیشن آپ کی ہی توسط سے دہلی میں شائع ہوئے۔

آپ کے دوسرے خویش مولانا محمد عاقل صاحب نے ۱۳۸۰ھ میں مظاہر العلوم سے فراغت حاصل کی۔ بخاری شریف حضرت شیخ سے پڑھی۔ ذہانت وفطانت اور بلند پایہ علمی استعداد کے مالک ہیں۔ ۱۳۸۱ھ میں مظاہر العلوم کے استاد منتخب ہوئے۔ ۱۳۸۷ھ میں دورۂ حدیث کے استاد بن کر پہلی مرتبہ ابوداؤد شریف پڑھائی۔ اس وقت سے ابوداؤد کا درس آپ ہی سے متعلق ہے۔ شیخ کی جانب سے آپ کو اجازت بیعت بھی ہے۔ آپ شیخ کے تصنیفی وتالیفی سلسلہ میں معاون رہے ہیں، ''الکوکب الدری علی جامع الترمذی'' پر آپ کا ایک طویل مقدمہ ہے، جو ۱۳۹۴ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا محمد سلمان صاحب نے ۱۳۸۶ھ میں دورہ حدیث پڑھا۔ درس بخاری میں شیخ کے یہاں اکثر وبیشتر آپ ہی قراءت کرتے تھے۔ شوال ۱۳۸۷ھ میں تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۳۹۶ھ میں اساتذہ حدیث کے سلک میں منسلک ہوئے۔ مشکوۃ شریف کا درس آپ ہی سے متعلق ہے شیخ کی عربی تصنیفات وتالیفات کی تکمیل وترتیب میں مولانا محمد عاقل صاحب اور مولانا محمد سلمان صاحب رفیق وشریک رہے۔ رمضان میں شیخ کی مجلس اعتکاف میں قرآن مجید سنانے کی ذمہ داری آپ نے بڑی مستعدی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی۔

حضرت شیخ کے سب نواسے بھی جو سن بلوغ کو پہنچ چکے ہیں اور تکمیل علوم کر چکے ہیں، ماشاء اللہ عالم وفاضل اور علمی ودینی خدمت میں مشغول ومنہمک ہیں۔ ان میں آپ کے نواسے اور مولانا محمد الیاس صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد شاہد صاحب مظاہری ممتاز ہیں۔ وہ جید عالم، رواں قلم مصنف اور علمی وتحقیقی ذوق رکھنے والے نوجوان فاضل ہیں۔ ''مکتوب علمیہ'' اور علمائے مظاہر علوم اوران کی علمی وتصنیفی خدمات اور'' تاریخ مظاہر العلوم'' (جلد دوم) وغیرہ ان کی تصنیفی ذوق اور قلم کی روانی کے شاہد ہیں۔ حضرت شیخ کی ان پر خاص شفقت تھی اور نہیں کی توجہ اور محنت سے شیخ کے کئی قلمی مسودات اور خطوط کے مجموعے منظر عام پر آئے۔

آپ کے دوسرے نواسے مولوی محمد زبیر صاحب ابن مولانا انعام الحسن صاحب بھی مظاہر العلوم کے فاضل ہیں۔ تکمیل کے بعد حضرت شیخ کے زیر ہدایت وتربیت ذکر وشغل میں مصروف ہوئے اور شیخ نے ان کو مدینہ منورہ میں اجازت بھی مرحمت فرمائی، وہ اپنے والد ماجد کے زیر سایہ مرکز تبلیغ نظام الدین میں دعوت وتبلیغ اور وہاں کے مدرسہ کاشف العلوم میں درس وتدریس میں مصروف ہیں۔ ''بارک اللہ فی حیاته''

دوسرے خورد سال نواسے حفظ قرآن کی سعادت سے بہرہ ور اور تحصیل وتکمیل علم میں مشغول ہیں، جن میں حافظ محمد جعفر سلمہٗ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو حضرت شیخ کے آخری سفر حجاز میں ہمرکاب اور مدینہ کے آخری قیام میں حاضر باش رہے۔ ''بارک اللہ فی حیاتهم''

حضرت کی حیات میں آپ کی جو اولاد ذخیرہ آخرت بنی وہ یہ ہے۔

صاحبزادی زکیہ مرحوم: یہ ۴ شعبان ۱۳۳۷ھ مطابق ۵ مئی ۱۹۱۹ء شب دوشنبہ میں تولد ہوئیں۔ یہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی سب سے پہلی صاحبزادی تھیں۔ ۳ محرم الحرام ۱۳۵۴ مطابق ۱۷ اپریل میں مظاہر علوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ان کا نکاح حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ ہوا۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ مطابق ۳ جون ۱۹۳۹ء کو بعد عصر رخصتی ہوئی۔ طویل عرصہ تک تپ دق میں مبتلاء رہ کر ۲۹ شوال ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء بروز شنبہ مغرب کی نماز پڑھتے ہوئے سجدہ کی حالت میں انتقال ہوا۔ مولانا محمد ہارون صاحب مرحوم آپ ہی کے بطن سے تھے۔

محمد موسیٰ: رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ تقریباً سات، آٹھ ماہ حیات رہ کر ۹ ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ میں انتقال ہوا۔

صاحبزادی شاکرہ مرحومہ: یہ حضرت کی تیسری صاحبزادی تھیں۔ ماہ صفر ۱۳۴۵ھ میں پیدا ہوئیں۔ اپنے ایک خاندانی عزیز مولوی احمد حسن کاندھلوی سے ۱۹ جمادی الاول ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۴۶ء یوم دوشنبہ میں نکاح ہوا، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے مہر فاطمی پر نکاح پڑھایا۔

۱۴ رجب ۱۳۶۹ھ مطابق یکم مئی ۱۹۵۰ء دوشنبہ میں وفات ہوئی۔ حادثہ انتقال کی کیفیت حضرت شیخ اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

''اتفاق سے مولانا یوسف صاحب سہارنپور آئے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ گھر میں گیا، تو مرحومہ نے یٰسین شریف پڑھنے کی فرمائش کی۔ مولانا یوسف نے پڑھی اور جب ''سَلَامٌ قَوْلاً مِنْ رَبٍّ رَحِیْم'' پر پہنچے تو نہ معلوم مولانا یوسف صاحب مرحوم پر ایک جذبہ اور جوش آیا اور اس آیت شریفہ کو تین دفعہ پڑھا۔ تیسری کے درمیان میں میری مرحومہ کی روح پرواز کرگئی''۔

محمد ہارون: رجب ۱۳۴۹ھ میں ان کی ولادت ہوئی۔ مختصر سی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔

خالدہ مرحومہ: ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ میں تولد ہوئیں۔ بچپن میں ہی انتقال ہو گیا۔

محمد یحییٰ: ۶ جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور کچھ عرصے بعد وفات پائی۔

صفیہ: یہ پہلی زوجہ مرحومہ سے آخری اولاد ہے۔ ان کی ولادت ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ میں ہوئی۔ ایک سال بعد ۱۲ محرم ۱۳۵۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

عبدالحئی: یہ دوسری اہلیہ محترمہ سے پہلے صاحبزادہ ہیں۔ ۱۸ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ایک ماہ حیات رہ کر ۲۱ جمادی الاولیٰ میں وفات ہوئی۔ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ اپنے مشاغل عالیہ کے وجہ سے نہ خبر ولادت پر دہلی پہنچ سکے اور نہ خبر وفات پر۔

حضرت کی ایک ہی ہمشیرہ تھیں۔ جن کا نام عائشہ خاتون تھا۔ ان کی شادی ۹ صفر ۱۳۳۲ھ میں مطابق ۱۹۱۴ء میں جناب ماموں شعیب صاحب سے ہوئی تھی۔ ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۵ دسمبر ۱۹۴۴ء میں کاندھلہ میں ان کا انتقال ہوا۔ عمر تقریباً چالیس سال ہوئی۔ ان کی ایک لڑکی یادگار ہیں۔ جو مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب کی اہلیہ محترمہ (یعنی والدہ مولوی محمد سلمان والدہ مولوی محمد خالد سلہما ہیں۔

مولوی محمد طلحہ صاحب: صاحبزادہ عزیز گرامی قدر مولوی محمد طلحہ شیخ کی زندگی ہی میں حافظ و عالم، ذاکر شاغل اور صاحبِ اجازت ہو گئے اور ان پر شروع سے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی خاص نگاہ شفقت تھی اور بعض اوقات حضرت نے ان کی خاطر اپنے سفر کا پروگرام ملتوی فرما دیا اور فرمایا ''طلحہ نے مجھے روک دیا'' ویسے بھی تمام معاصر بزرگوں اور شیخ کے یہاں آنے جانے والے صلحاء علماء کی ان پر نظر خاص رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو انتظامی صلاحیت، توازن واعتدال تواضع اور خدمت کا جذبہ اور اصابت رائے کا جوہر عطاء فرمایا، جو ان کی پدری میراث بھی ہے۔ حضرت شیخ کے سہارنپور میں رمضان گزارنے کے آخر میں وہی بڑے محرک تھے۔ شیخ سے تعلق رکھنے والوں اور جن سے شیخ کو تعلق تھا، کے مراتب کو وہ دوسروں سے زیادہ

پہچانتے ہیں اوراسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، شیخ نے ان کی خصوصی تربیت فرمائی اور امکانی حد تک ان کی اندر صاحبزادگی اور مخدومیت کی بُونہیں پیدا ہونے دی۔ اسی لیے ان کے دوروں اور شیخ کے اہلِ تعلق میں جانے کو ہمیشہ ناپسند کرتے رہے اور خود بھی اس سے محترز رہے۔

شیخ کے آخری زمانہ قیام مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے مع والدہ صاحبہ کے ان کو حضرت شیخ کے پاس پہنچادیا اور ان کو خدمت کا پورا موقع دیا۔ شیخ کی وفات پرانہوں نے اسی صبر وتحمل اور وقار وسکینت کا مظاہرہ کیا اور دوسرے کے لیے باعث تقویت وتسلی بنے۔ جیسے خود شیخ اپنی زندگی میں تعزیت کرنے والوں کے لیے بن جاتے تھے۔

''اطال اللہ حیاتہ ونفع بہ المسلمین''

اللہ

''نور السموات والارض''

......☆☆☆☆☆☆☆......